ترجمہ

زاد المعاد فی ھدی خیر العباد

امام ابن قیم الجوزیہ

۶۹۱ـ۷۵۱ھ ـ ۱۲۹۲ـ۱۳۵۰ء

ناشر

توحید و سنت فاؤنڈیشن

حیدرآباد ـ آندھرا پردیش (انڈیا)

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب: ۲۱)
تمھارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین اسوہ ہے۔

توشۂ آخرت

ترجمہ

زاد المعاد فی ھدی خیر العباد

تصنیف
امام، محدث، مفسر، فقیہ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابو بکر الزرعی الدمشقی

ابن قیم الجوزیہ

(۶۹۱-۷۵۱ھ) —— (۱۲۹۳-۱۳۵۰ء)

جلد اوّل

تحقیق، تخریج، تعلیق
شعیب الأرنؤوط   عبدالقادر الأرنؤوط

ترجمانی
عبدالمجید اصلاحی

نظرثانی
انعام اللہ قاسمی، رفیق احمد سلفی، محمد مستقیم سلفی

ناشر

توحید وسنت فاؤنڈیشن

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ انڈیا

سلسلہ مطبوعات ——— ۲۷
نام کتاب ——— توشۂ آخرت (ترجمہ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد)
تالیف ——— علامہ ابن قیم الجوزیہ
مترجم ——— عبدالمجید اصلاحی
کتابت ——— کفیل احمد قاسمی
صفحات ——— ۴۲۸
قیمت ——— 240/-

ناشر

توحید وسنت فاؤنڈیشن

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ انڈیا

انتساب

استاذنا العلام جامع المعقول والمنقول مولانا نذیر احمد رحمانی رحمہ اللہ
کے نام جن کی غیرت وحمیت اور خودداری ضرب المثل بن چکی ہے
تقسیمِ ملک کے بعد سرزمینِ ہند میں کتاب وسنّت اور عقیدہ ومنہج سلفِ
صالح پر کہیں سے بھی کوئی حملہ ہوا تو اس عظیم ہستی کا قلم اس کے لیے
شمشیر بے نیام ہوگیا۔
آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اس عظیم کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت
سے سب سے زیادہ خوش ہوتے۔

رحمہ اللہ وغفرلہ وجعل الجنّة مثواہ

فہرست مضامین

عبادات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیّبہ ۱۳۵

زکوٰۃ اور صدقات کا بیان ۳۶۹

عرضِ ناشر

الحمد لله الذی اصطفیٰ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم من ولد آدم، فأرسلہ للناس بشیرًا ونذیرًا وجعل الإسلام دینہ القویم الذی ارتضاہ خاتمۃ الأدیان إلی یوم القیامۃ، والصلاۃ والسلام علی أشرف المرسلین محمد بن عبد اللہ النبی الأمی وعلی آلہ وصحبہ إلی یوم الدین. أما بعد!

زیرِ نظر کتاب آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مجدّد و مصلح شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ (۶۶۱ — ۷۲۸ھ) کے شاگردِ رشید علامہ حافظ ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱ — ۷۵۱ھ) کی شہرۂ آفاق تصنیف "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" کا اردو ترجمہ ہے جسے "اسلامک سائنٹفک ریسرچ اکیڈمی" اپنے زیرِ اہتمام شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہی ہے۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوگی۔ إن شاء اللہ۔

اکیڈمی کے قیام کے مقاصد میں قرآن، حدیث، توحید، فقہ، سیرت، تاریخ، لغت، ادب اور عصری موضوعات پر مستقل کتابوں کی تصنیف و تالیف نیز اہم کتابوں کی صحیح ترجمانی اور ان کی نشر و اشاعت بھی ہے، یہ گراں قدر پیش کش اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کا کامل ترین نمونہ تھے، آپ کی حیاتِ طیبہ قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے، آپ کی کتابِ زندگی کا ہر ہر ورق اپنے اندر ایسی روح پرور اور نشاط افزا نسیم کی تاثیر رکھتا ہے جس کے بہار آفریں جھونکے قیامت تک انسانیت کے چمن کو سرسبز و شاداب رکھیں گے، قرآن کریم نے آپ کی سیرتِ طیبہ کو انسانیت کے لیے ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اسی لیے سیرتِ پاک پر تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ عہدِ صحابہ ہی سے جاری ہے، محدّثین، اصحابِ سیر، فقہاء، مؤرخین اور دوسرے اصحابِ قلم نے جس عقیدت و احترام کے ساتھ آپ کی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک منفرد باب ہے۔

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے جن لوگوں نے کتابیں تصنیف کیں ان میں عروہ بن زبیر، شرحبیل بن سعد اور وہب بن منبہّ کے نام قابلِ ذکر ہیں، اس کے بعد جب علوم و فنون کی تدوین کا عہد آیا تو سیرت نگاری نے بھی ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی اور سینکڑوں وقیع تصنیفات وجود میں آگئیں، متقدمین کی مؤلفات میں سیرت ابن اسحاق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ سیرت ابن ہشام جو اس موضوع پر ایک اہم مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اسی سیرت ابن اسحاق کی تلخیص و تہذیب ہے، قاضی عیاض مالکی کی "شفاء" اور امام ترمذی کی "شمائل" بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔

بعد کی صدیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر جو سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف منظرِ عام پر آئی وہ علامہ ابن قیم الجوزیہ کی یہی وقیع اور عدیم النظیر کتاب "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" ہے۔

مؤلف رحمہ اللہ نے اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایسے اچھوتے انداز میں بحث کی ہے کہ عقائد و عبادات اور معاملات سے لے کر اخلاق و عادات تک زندگی کے ہر ہر شعبہ سے متعلق آپ کا

اسوۂ حسنہ سامنے آگیا ہے، اور ان کی یہ کتاب اسلامی عقائد و تعلیمات اور احکام کا ایک انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے۔

زاد المعاد در حقیقت ارشاد ربانی " لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" اور ارشاد نبوی " إني أوتيت القرآن ومثله معه" اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان "کان خلقه القرآن"، کی شرح و تفصیل ہے۔ امام ابن قیم الجوزیہ نے اس کتاب کی تالیف میں اپنی ساری امکانی صلاحیتیں صرف فرمادی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اپنے موضوع پر مرتب شکل میں ایسی کوئی کتاب کسی زبان میں اب تک وجود میں نہ آسکی۔

کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر اکیڈمی نے اسے اردو میں منتقل کرنے اور اعلیٰ معیاری انداز پر شائع کرنے کا پروگرام کئی سال قبل مرتب کیا تھا، ہماری خواہش تھی کہ ہم جلد از جلد اس عظیم کتاب کا مکمل ترجمہ پیش کر دیں، لیکن وسائل و امکانیات کی کمی اور گوناگوں مسائل کے سبب ہم ایسا نہ کر سکے اور کتاب کے قدر دانوں کو غیر معمولی انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑی جس کے لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

اگرچہ رئیس احمد جعفری اور مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری کے قلم سے اس کتاب کے اردو ترجمے بہت پہلے علی الترتیب نفیس اکیڈمی کراچی اور ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک نئے ترجمہ کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ ان دونوں ترجموں میں ترجمانی کا صحیح حق ادا نہیں کیا گیا ہے، جعفری صاحب نے بہت سی عبارتوں کے ترجمے چھوڑ دیئے ہیں جب کہ بجنوری صاحب نے غیر ضروری تعلیقات و حواشی سے سیرت کی اس اہم کتاب پر ایک خاص فقہی مکتب فکر کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے جس سے کتاب کی اصل روح مجروح ہو کر رہ گئی ہے۔

ان دونوں ترجموں کے علاوہ چند کتابیں اس عظیم کتاب کی تلخیصات اور مختصرات کے ترجمہ کی شکل میں منظر عام پر آئی ہیں۔ لیکن ان کو " زاد المعاد" کی تلخیص یا اختصار کہنا اس کتاب کے ساتھ زیادتی ہے۔

اس ترجمہ میں کتاب کے تمام مشمولات کو رواں اور سلیس زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ترجمے کے لیے شعیب ارناؤط کے ایڈٹ کردہ نسخے کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ کتاب میں وارد روایات کی استنادی حیثیت بھی کسی حد تک ناظرین کے سامنے آجائے۔

ہماری دلی خواہش تھی کہ ہم مجدد عصر امام المحدثین علامہ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ و تولاہ کی تحقیقی کتاب " التعليقات الجياد على أحاديث زاد المعاد"، سے استفادہ کرتے ہوئے زاد المعاد میں منقول احادیث اور ساری ہی روایات (احادیث رسول اور آثار صحابہ) کی استنادی حیثیت واضح کر دیتے لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود ہم " التعليقات الجياد" کا مخطوطہ یا اس کا فوٹو حاصل کرنے میں ناکام رہے کتاب کی اشاعت میں تاخیر کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے، اللہ کی نصرت و تائید اور اس کی توفیق شامل حال رہی تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔

ہمارے سامنے اس اہم اور بنیادی کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کے دو اہم محرک ہیں:

۱۔ خاتم النبیین رسول اکرم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے والہانہ لگاؤ اور آپ کی ذات گرامی سے گہری محبت۔ اور آپ کی سیرت پاک بے کم وکاست انسانیت کے سامنے پیش کرنے کا جذبہ۔

۲۔ اردو پڑھنے، سمجھنے اور بولنے والے نہ صرف برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش اور نیپال میں بہ کثرت آباد ہیں (اور ان میں بہت بڑے حصہ کے باشندوں کی مادری زبان اردو ہے) بلکہ ان کی ایک معتد بہ تعداد عرب دنیا بالخصوص خلیجی ممالک میں بھی آباد ہے، اسی طرح یورپ بالخصوص برطانیہ نیز امریکہ کے بیشتر علاقوں، آسٹریلیا کے متعدد شہروں، نیز جزائر، فیجی اور موریشش وغیرہ میں ان کی خاصی تعداد ہے۔ مگر یہ ایک بڑا حادثہ ہے کہ اردو داں طبقہ دین سمجھنے کے لیے جن کتابو

کے مطالعہ پر انحصار کرتا ہے وہ یا تو عقل پرستوں کی تصنیفات ہیں یا سیاسی طالع آزماؤں کی، یا تصوف زدہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی، عقائد و احکام اور معاملات و اخلاق پر مشتمل اردو کا بیشتر لٹریچر یا تو ضعیف و موضوع روایات، خرافات اور غیر مستند قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے یا نصوص صریحہ کو نظر انداز کرنے والے غیر اسلامی ماحول کے پروردہ، دینی عقائد و احکام کے تحقیقی علم سے دور ناپختہ لوگوں کی عقلی تاویلات پر مبنی۔

ماضی میں اردو میں قرآن، تفسیر، سنت و سیرت اور صحیح اسلامی فقہ پر ترجمہ و شرح اور فقہ و استنباط کا جو کام ہوا وہ انتہائی اہم اور معیاری کام تھا لیکن یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ سلفی عقیدہ و منہج کے حاملین کی موجودہ نسل حتیٰ کہ ان کے علماء اور ذمہ داران اس بنیادی کام کی نشر و اشاعت سے غافل ہو چکے ہیں اور ان کے جمود کی وجہ سے ان کا ایک طبقہ غیر سلفی تنظیموں بلکہ عقیدہ و منہج سلف کے مخالفین کی صفوں میں چلا گیا ہے، اور یہی طبقہ سب سے زیادہ اسلام کی صحیح اور بنیادی تعلیمات کی جڑ کھودنے میں لگا ہوا ہے، کیونکہ وہ مرعوبیت کا شکار ہے اور مرعوب ذہن ہمیشہ پسپائی کی راہ اپناتا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جنھیں ملک اور بیرون ملک کے اپنے اسفار کے درمیان یہ گنہگار محسوس کرتا، دیکھتا اور اپنی علمی و عملی کمزوریوں کی بناء پر کچھ نہ کر سکنے کی وجہ سے کڑھتا رہا، دوستوں اور بزرگوں سے عاجز نے بار بار اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ دو اہم موضوعات پر بنیادی تصنیفات آنی ضروری ہیں:

۱- اسلام کیا ہے؟ (حدیث جبریل کی روشنی میں) ایک آسان لیکن مختصر کتاب بچوں کے لیے، ایک آسان تفصیلی کتاب عوام کے لیے

۲- ایک علمی و فکری کتاب غیر مسلموں اور تشکیک زدہ مسلمان مفکروں کے لیے۔ اسی طرح سیرت رسول پر (کان خلقه القرآن کی روشنی میں) مختصر، متوسط اور علمی کتابیں۔

جہاں تک سیرت رسول کا تعلق ہے تو اس باب میں "رحمۃ للعالمین" اور "اصح السیر" خاص طور پر اول الذکر انتہائی نفیس اور عمدہ کتاب ہے، لیکن وہ ایک خاص ماحول اور خاص ذہن کو سامنے رکھ کر تصنیف کی گئی ہے، اس کے مصنف کے جذبہ کی گرمی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بے پایاں محبت نے اسے قبول عام کی سند سے نوازا، پھر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع و کامل سیرت کی ضرورت باقی ہے۔

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا"

(الاحزاب: ۲۱)

تم میں سے اس شخص کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جو اللہ اور روز قیامت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

اور

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" (الحشر: ۷)

اور رسول جو کچھ تم کو دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک

لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته، يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه، فيقول: لا أدري، ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه۔ (ابوداؤد و ترمذی)

نہ پاؤں میں تم میں سے کسی کو کہ وہ اپنے چھپر کھٹ پر مسند لگائے بیٹھا ہو اور میرا کوئی حکم یا میری کوئی نہی اس کے پاس آئے

اور وہ یہ کہے: میں اسے نہیں جانتا ہم تو صرف اس کی پیروی کریں گے جو اللہ کی کتاب میں پائیں گے۔

کی روشنی میں مرتب سیرتِ رسول پر ایک جامع کتاب کی شدید ضرورت اردو زبان میں تھی۔ یوں تو دواوین سنّت: صحیحین، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد بن حنبل، مسند بقی بن مخلد، سنن کبریٰ بیہقی، مستدرک حاکم وغیرہ مذکورہ بالا آیات واحادیث کی شرح وتفصیل ہیں، لیکن مرتب ومنظم انداز میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آپ کی وفات تک کے تقریباً سارے حالات (عقائد وعبادات، اخلاق ومعاملات، حرب وصلح، بود وباش اور زندگی کے دوسرے سارے شعبوں میں آپ کے اسوۂ حسنہ) پر مشتمل ایک جامع کتاب جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول سے ماخوذ ہو اور جس میں قرآن کریم اور دواوین سنّت سے اختصار وجامعیت کے ساتھ آپ کی پوری اعتقادی وعملی اور اخلاقی سیرت اکٹھا کر دی گئی ہو۔ مجھے پوری اسلامی تاریخ میں "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" جیسی کوئی کتاب نظر نہیں آتی، اسلام اور سیرتِ رسول سے متعلق جن دو کتابوں کے مختصر، متوسط اور مفصّل شکل میں تالیف کی ضرورت کا میں نے اپنے بزرگوں سے تذکرہ کیا ہے، ان کی ضرورت اب بھی باقی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کتاب وسنّت اور عقیدۂ ومنہج سلف کا حامل اہم معیاری ادارہ اس ضرورت کی تکمیل نہیں کر دیتا، لیکن اس کے انتظار میں بیٹھے رہنا اور اردو داں طبقہ کو عقلی تاویلات اور ضعیف وموضوع روایات اور تصوف اور بدعات وخرافات پر مبنی کتابوں یا سیاسی طالع آزماؤں کے تیار کردہ لٹریچر کی تاریکیوں میں ڈوبتے رہنے کے لیے چھوڑ دینا انصاف کی بات نہیں ہوگی، اسی لیے فیصلہ کیا گیا کہ اس موضوع کی اس جامع کتاب کا ترجمہ پہلے اردو میں پھر ملک اور بیرونِ ملک کی دوسری زبانوں میں منتقل کر کے شائع کیا جائے تاکہ عربی نہ جاننے والے اپنے عقیدۂ وفکر، عبادات واحکام اور اخلاق ومعاملات کی اصلاح کے لیے اس کتاب کو رہنما بنا سکیں اور ان غیر معتبر کتابوں سے بچ سکیں جنھوں نے امتِ مسلمہ کو کتاب وسنّت کی صراطِ مستقیم کے بجائے تاویل وتحریف یا تصوف وبدعات اور ضعیف وموضوع روایات اور خرافات کی دلدل میں پھنسا دیا ہے۔

یہ ہے وہ بنیادی سبب جو اس کتاب کے اردو ترجمہ اور اس کی اشاعت کا محرک بنا ہے۔

جہاں تک کتاب کی اردو میں ترجمانی کا معاملہ ہے ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ترجمہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور معیاری ہو، اس کے لیے ہم نے اپنی دانست میں ایک اچھے مترجم کا انتخاب کیا، اس کے بعد مرکز کے امین اور معتمد، باصلاحیت اساتذہ کی ایک ٹیم نے اس پر نظرِ ثانی کی، ان حضرات نے جس وقت بھی ضرورت محسوس کی اس بے علم سے بھی مشورہ کیا، پھر یہ ترجمہ سعودی عرب کے ایک مستند ادارہ کو بھیجا گیا، اس کے ٹرانسلیشن ڈپارٹمنٹ نے اس پر نظرِ ثانی کی، اور اس پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈالنے کی سفارش کی، چنانچہ سہ بارہ بھی اس پر گہری اور تحقیقی نظر ڈالی گئی، اس کے بعد اب یہ کتاب منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ ہمیں اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہے، ہم اس ترجمہ اور اس کی طباعت کے معیار کی بابت فیصلہ کتاب کے باذوق قارئین پر چھوڑتے ہیں، اس سلسلہ میں ہر مشورہ اور تعمیری تنقید کا ہم استقبال کریں گے۔

بحمد اللہ اس ترجمہ سے ہماری خواہش نہ تو کسی نام ونمود کی ہے، نہ کسی مالی منفعت کی، پھر بھی آئندہ ایڈیشنوں میں اس کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ہم اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔

ہم بارگاہ رب العزت میں سراپا شکر وسپاس ہیں کہ اس نے ہمیں اس عظیم اور مہتم بالشان کتاب کے ترجمہ وطباعت کی توفیق بخشی۔ إن شاء اللہ یہ کتاب عوام وخواص سب کے لیے بالخصوص اردو داں طبقہ کے لیے ایک نادر اور قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو حسنِ قبول کی دولت سے نوازے اور اردو داں حضرات کو اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق بخشے، اور اس کے مؤلف، مترجم، مصححین اور ناشرین سب کو اخلاص کی دولت بے پایاں سے نوازے۔

بارالہا! ہماری فروگذاشتوں سے درگذر فرما، ہمیں اپنے دین کی صحیح خدمت کی توفیق بخش اور ہمارا خاتمہ بالخیر فرما۔ آمین۔
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

عبدالحمید رحمانی

امام ابن قیم الجوزیۃ

۶۹۱ھ — ۷۵۱ھ
۱۲۹۳ء — ۱۳۵۰ء

امام ابن القیم شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی ۶۹۱ھ / ۱۲۹۳ء میں دمشق میں ایک ایسے خانوادہ میں پیدا ہوئے جو علم و فضل میں معروف تھا۔ ان کے والد ابو بکر بن ایوب "المدرسۃ الجوزیۃ" کے قیم (مہتمم) تھے اسی بنا پر ابتداء میں انھیں ابن قیم الجوزیہ کہا جاتا تھا جو بعد میں صرف ابن القیم رہ گیا۔

آپ کی پرورش اور نشو و نما علمی اور دینی ماحول میں ہوئی، قرآن مجید کے حفظ کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنے والد اور دیگر اساتذۂ دمشق سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ ۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء میں جب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ مصر سے مراجعت کر کے دمشق میں مقیم ہوئے تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء شیخ الاسلام کی وفات تک متواتر ان کے پاس رہے، اس طویل استفادہ کا ثمرہ یہ نکلا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کا رنگ ان پر غالب آگیا۔ وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اور ان کے علوم کے صحیح معنی میں حامل بن گئے۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد ان کی کتابوں کی تہذیب و ترتیب اور نشر و اشاعت انھیں کی بدولت ہوئی۔ ۷۲۳ھ میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو مدرسۂ جوزیہ کی ذمہ داری بھی ان کے سر آگئی۔ زیارت قبور، توسل، استغاثہ بغیر اللہ، رکعات تراویح، ایک مجلس کی تین طلاقوں وغیرہ مسائل کی بابت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی رائے جمہور علماء سے مختلف تھی۔ امام ابن القیم ان مسائل میں اپنے استاذ کے ہم نوا تھے۔ علماء وقت نے ان مسائل کی بنا پر کئی دفعہ امام ابن تیمیہ کے خلاف ہنگامے کھڑے کیے۔ ان فتنوں کی وجہ سے انھیں بارہا جیل جانا پڑا، اور ان کی شعوری زندگی کا ایک تہائی حصہ جیل کی نذر ہو گیا۔

سب سے آخری بار شیخ الاسلام کو ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں دمشق کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اس قید میں ان کے ہمراہ ابن القیم بھی تھے۔ ابن تیمیہ کی وفات (۲۰ ذی الحجہ ۷۲۸ھ) کے بعد انھیں قید سے رہائی نصیب ہوئی۔ لیکن ابن تیمیہ کے مسلک کی حمایت و تائید کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی کے آخری سانس تک یہ مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

آپ مدرسۂ صدریہ میں درس دیتے تھے اور مدرسۂ جوزیہ کی مسجد میں امامت کرتے تھے، درس و تدریس اور امامت کے بعد جو وقت بچتا تھا اس کو تصنیف و تالیف میں صرف فرماتے تھے۔

امام ابن قیم الجوزیہ تقلیدِ شخصی کے سخت مخالف تھے، اس سلسلہ میں ان کا میلان اپنے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرح امام احمد بن حنبل کی طرف تھا جو اصول و عقائد، فروع و احکام اور سلوک و اخلاق اور دوسرے سارے امور و معاملات میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی پابندی اور عزیمت و استقامت میں تمام ائمہ و فقہاء میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔

معتزلہ کے اٹھائے ہوئے فتنۂ "خلق قرآن" سے نبرد آزما ہونے میں جنھوں نے انبیاء کی یاد تازہ کر دی تھی اور جن کی بابت صاحبِ کتاب "الحیدۃ" امام عبدالعزیز کنعانی جیسی عظیم شخصیت نے یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا تھا کہ فاذا احمد وخسرنا، احمد

بن حنبل اس آزمائش میں کامیاب رہے اور ہم ناکام، امام احمد بن حنبل کی اسی عزیمت کی وجہ سے ان کی بابت سلف کا متفقہ قول ہے کہ: " حُبّ احمد بن حنبل علامة اهل السنة" احمد بن حنبل کی محبت اہلِ السنت والجماعت کی پہچان ہے۔ امام احمد بن حنبل سنت و حدیث اور عزیمت کے سلسلۃ الذھب کی ایک سنہری کڑی تھے، جسے سلف نے سلسلۂ حدیث و سنت کے تناظر میں سلسلۃ الذھب کا نام دیا ہے، یعنی احمد بن حنبل امام شافعی قرشی کے شاگرد ہیں اور شافعی امام دارالہجرۃ مالک بن انس کے اور امام مالک نافع کے اور نافع ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

ابن القیم اپنے استاذ ابن تیمیہ کی طرح فلاسفہ، معتزلہ، حشویہ اور قائلین وحدۃ الوجود کے سخت مخالف تھے اور کلام، عقائد اور تصوف کے مسائل میں سلف صالحین کے نقطۂ نظر کے حامی تھے، وہ بدعات و محدثات کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور مسلمانوں کو ابتدائی دور کے سادہ اور خالص اسلام کی طرف لوٹانا چاہتے تھے، عیسائیوں اور یہودیوں کے عقائدِ باطلہ کی تردید میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ انھیں ہر فن سے شغف تھا، ہر قسم کی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ ان کو کتابوں کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے الدرر الکامنۃ میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے پاس اتنی کتابیں جمع ہوگئی تھیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد ایک زمانہ تک ان کتابوں کو فروخت کرتی رہیں۔

وہ بے حد خلیق اور متواضع انسان تھے، مزاج میں تیزی بالکل نہیں تھی، اس لیے مخالفین بھی ان کی قدر و عزت کرتے تھے۔

ان کی تحریریں مرتب، مربوط اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھیں۔

امام ابن القیم نے ۶۰ برس کی عمر میں ۱۳ رجب ۷۵۱ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۳۵۰ء کو دمشق میں وفات پائی۔

انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں بیشتر دستبردِ زمانہ کے باعث ضائع ہوچکی ہیں، ان کی تصنیفات جن کا عام طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے ۴۵ ہیں۔ یوں ان کی تصنیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بروکلمان نے اپنی تاریخ ادبیات عربی میں ابن قیم کی ۵۲ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

چند اہم مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ اعلام الموقعین من رب العالمین، دہلی ۱۳۱۳ھ۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مشہور اہلحدیث عالم و خطیب مولانا محمد جوناگڑھی رحمہ اللہ نے کیا ہے جو دینِ محمدی کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اور مولانا ابوالکلام جیسے عبقری انسان نے مولانا محمد جوناگڑھی کے اس ترجمہ پر انھیں تحریری خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

۲۔ اغاثة اللهفان، مصر ۱۳۲۲ھ

۳۔ التبیان فی اقسام القرآن

۴۔ کتاب الروح، حیدرآباد ۱۳۱۸ھ

۵۔ زاد المعاد فی هدی خیر العباد

۶۔ الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة

۷۔ الشافیة فی الفرقة الناجیة

۸۔ مدارج السالکین فی منازل العارفین

۹۔ بدائع الفوائد

۱۰۔ الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی

۱۱۔ الوابل الصیب

١٢- التفسیر القیم کے نام سے مولانا محمد اویس ندوی نے ابن قیم کی تحریرات سے قرآن مجید کی تفسیر مرتب کی ہے
(مکہ مکرمہ ۱۳۶۸/۱۹۴۹ء)

عصرِ حاضر میں امام ابن قیم الجوزیۃ کی تصنیفات کو ایڈٹ کرنے اور ان کی تحقیق و شرح و تعلیق اور ان کی معیاری طباعت واشاعت کا سہرا مشہور اہلحدیث محقق عالم ڈاکٹر بکر عبداللہ ابوزید کے سر بندھتا ہے جو سعودی عرب میں وزارۃ العدل میں ڈپٹی منسٹر تھے اور اب "ہیئۃ کبار العلماء" کے سکریٹری ہیں، انھوں نے "موسوعۃ ابن القیم" کے نام سے امام ابن القیم کی ساری مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف کو اکٹھا کر کے شائع کرنے کا عظیم پروگرام کئی سال قبل شروع کیا تھا جو اب تکمیل کے مرحلہ میں ہے۔
جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

حَسۡبِیَ اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ

تعریف اس اللہ کی جو تمام کارگہ ہستی کا پروردگار ہے، حسن انجام اور عاقبت ان خوش بختوں کے لیے جو خارزار ہستی سے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ دامنِ حیات کا کوئی تار معصیت کے کانٹوں سے الجھنے نہیں پاتا۔ انجامِ بد مقدّر ان کا جن کا شیوۂ حیات ظلم وفساد اور حق تلفی کے سوا کچھ نہیں، جز ذاتِ الٰہی کوئی لائق عبادت نہیں، وہ معبود ہے اگلے اور پچھلے تمام انسانوں کا، تمام آسمان و زمین اسی کے سہارے قائم، جزا و سزا کے دن کا مالک صرف وہی، کامیابی اور فیروزمندی صرف اسی کی اطاعت میں، عزت اور سربلندی صرف اسی کی عظمت کے آگے سرنگوں ہونے میں، غناء اور توانگری کا راز صرف اسی کی رحمت کا محتاج بن کر رہنے میں، راہ یابی صرف اسی کی روشنی کے ذریعہ جستجوئے حق میں، زندگی ہے تو صرف اسی کی رضاء اور خوشنودی میں، نعمتوں کا کوئی تصور ہے تو اسی کے تقرّب میں، قلب و رُوح کی درستگی اور کامرانی ہے تو صرف اسی ذات برحق کے بے پایاں خلوص اور صرف اسی کی محبّت میں، یہ وہ ذات ہے کہ اس کے آگے سرِنیاز خم ہو تو اعتراف کرتی ہے اور اس کی نافرمانی ہو تو مائل بہ کرم ہو کر دامنِ عفو میں چھپالیتی ہے، پکاری جائے تو سنتی ہے، عمل ہو تو ثواب سے نوازتی ہے۔

ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، ساری مخلوقات جس کی ربوبیت کی گواہ ہیں اور تمام مصنوعات جس کی الوہیت کی معترف ہیں، نیز اپنے اندر فطرت کی صنّاعیوں اور کرشمہ سازیوں کی بناء پر پکار پکار کر کہتی ہیں کہ بس وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس کی ذات پاک کی تعریف کرتا ہوں اتنی جتنی اس کی مخلوقات ہیں، جتنی اس کی مرضی ہے، جتنا اس کے عرش کا وزن ہے، جتنی اس کے فیصلوں کی روشنائیاں ہیں۔

اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس کی الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں، جس طرح ربوبیت میں اس کا کوئی سہیم نہیں، نہ کوئی اس جیسا ذات میں، نہ افعال میں، نہ صفات میں، اللہ ہی سب سے بڑا ہے، تعریف اس کی بیش از بیش، پاکی بیان کرتے ہیں ہم اس کی صبح و شام، پاک ہے وہ جس کی تسبیح میں تمام آسمان اور اس کی بادشاہتیں، ستارے اور اس کے محوَر، بزمِ گیتی اور اس پر رہنے والے سمندر اور اس کی مچھلیاں، کواکب و کوہسار، حیوانات و اشجار، ٹیلے اور رہ گذار، خشک و تر اور زندہ و مردہ سبھی زمزمہ سنج ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ‌ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۴۴)

ساتوں آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے نیز ہر چیز اس کی تعریف میں تسبیح خواں ہے، تم ان کی تسبیحات کی زبان سمجھتے نہیں، وہ نہایت حلم والا بے حد بخشنے والا ہے۔

اور گواہی دیتا ہوں کہ "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ" وہ عظیم الشان کلمہ ہے جس کے سہارے ارض و سما قائم، جس

کی خاطر تمام مخلوقات کا وجود، جسے دے کر اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور جس کے لیے اپنی کتابیں نازل کیں، اور اسی پر اپنی شریعتیں قائم فرمائیں، اسی کی خاطر عدل و انصاف کی میزانیں قائم کی گئیں، اور نامہ ہائے اعمال رکھے گئے، اسی کی وجہ سے جنت اور جہنم کا بازار لگا، اسی کی بنیاد پر مخلوق کے اندر مومن و کافر اور نیک و بد کی تقسیم، یہی باعثِ تخلیق، یہی باعثِ امر، یہی وجہ ثواب، یہی وجہ عذاب، یہی وہ حق جس کی خاطر مخلوقات عالم کا وجود، سوال و حساب کا تعلق اسی کلمہ اور اس کے تقاضوں سے، اسی پر ثواب و عقاب کا وقوع اور یہی وجہ قیامِ قبلہ، اسی پر ملت کی اساس، اسی کے لیے جہاد کی شمشیریں بے نیام اور یہی بندوں پر اللہ کا حق بھی، لہٰذا یہی کلمہ اسلام اور جنت کی کنجی ہے، اور اوّلین و آخرین سے اسی کا سوال ہوگا، بندوں کے قدم اللہ کے سامنے سے ہٹ نہیں سکتے تاوقتیکہ دو باتوں کی بابت ان سے سوال نہ کر لیا جائے:

۱- عبادت کس کی کرتے تھے؟

۲- اللہ کے رسولوں کو تم نے جواب کیا دیا؟

پہلے سوال کا جواب اذعان، یقین اور اقرار و عمل کی پوری کیفیت کے ساتھ "لا الٰہ الا اللہ" کا اثبات ہوگا۔

اور دوسرے سوال کا جواب معرفت و یقین، اقرار و اطاعت اور تسلیم و رضا کی موجودگی میں "محمد رسول اللہ" کا اثبات ہوگا۔

اور دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول، وحی الٰہی کے امین، مخلوقات میں چیدہ، اللہ اور بندوں کے درمیان سفارت کار، جو دینِ حق اور زندگی کی صحیح راہ عمل لانے والے ہیں، اللہ نے آپ کو رحمت اللعالمین، متقیوں کا امام اور تمام مخلوقات پر حجت بنا کر بھیجا، رسولوں کے ایک وقفہ کے بعد آپ کی بعثت فرمائی ــــ اور آپ کے ذریعہ صحیح تر اور واضح تر راہ دکھائی، بندوں پر آپ کی اطاعت، تائید، نصرت، احترام، محبت اور آپ کے حقوق فرض کیے، جنت میں دخول کے تمام راستوں کو بند فرما کر راہ صرف وہی باز فرمائی جو آپ کی ہے، اس کے لیے آپ کا شرح صدر فرمایا، آپ کا ذکر بلند کیا، آپ کا بوجھ اتارا، ذلت و رسوائی ان کا مقدر بنایا جو آپ کی اطاعت سے مُنہ موڑیں، مسند امام احمد میں ابو مُنیب جُرَشی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

بُعِثْتُ بِالسَّيْفِ بين يدي الساعة حتى يعبد الله وحده لاشريك له، وجعل رزقي تحت ظل رمحي وجعل الذلة والصغار على من خالف أمري ومن تشبه بقوم فهو منهم[1]

قیامت کے بالکل قریب مجھے تلوار دے کر بھیجا گیا ہے یہ تلوار اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک اللہ واحد لاشریک لہ کی عبادت قائم نہ ہو جائے اور میرا رزق میرے نیزہ کے زیر سایہ رکھا گیا ہے اور ذلت و رسوائی ان کے لیے مقدر کی گئی جو میرے امر کی مخالفت کریں گے، نیز جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انھیں میں شمار ہوگا۔

اور ذلت و ادبار جس طرح نصیبہ ان کا قرار پایا جو آپ کے دین کے مخالف ہیں اسی طرح عزت و سربلندی ان کے حصہ میں ہے جو آپ کے اطاعت گذار اور پیرو کار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

---

[1] یہ حدیث امام احمد کی مسند ج ۲ ص ۵۰ و ۹۲ میں وارد ہے اور اس کی سند حسن ہے، علامہ ابن تیمیہ نے "الاقتضاء" ص ۳ میں اس کی سند کو عمدہ قرار دیا ہے اور حافظ عراقی نے "الإحیاء" میں اسے صحیح اور حافظ ابن حجر نے "الفتح" ج ۱۰ ص ۲۳۰ میں اسے حسن کہا ہے، آخری فقرہ کی تخریج ابوداؤد نے حدیث (۴۰۳۱) میں کی ہے، بخاری نے اس کے ایک حصہ کو اپنی صحیح ۶/۹۸ میں تعلیقاً نقل کیا ہے، امام اوزاعی سے بروایت سعید بن جبلہ عن النبی، ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کا ایک مرسل شاہد بھی نقل کیا ہے جس کی سند حسن ہے۔

ہمت ہارو نہ آزردہ خاطر ہو، تم ہی سربلند رہو گے بشرطیکہ تمھارے اندر ایمان موجود ہو۔
ایک اور جگہ ارشاد ہے:
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (المنافقون : ۸)
اور عزت و شوکت تو بس اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کا حصہ ہے۔
دوسری جگہ ارشاد ہے:
فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ (محمد : ۳۵)
پس ہمت ہار کر صلح کی جانب دعوت نہ دو، تم ہی سربلند رہو گے۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے۔
ایک اور جگہ فرمایا:
يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الأنفال : ۶۴)
اے نبی! تمھارے لیے اور جو مسلمان تمھاری اتباع کریں ان کے لیے اللہ کافی ہے۔
یعنی صرف اللہ تیرے اور تیرے پیرو کاروں کے لیے کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمھیں اور کسی کی حاجت نہیں۔
مذکورہ آیت کی دو نحوی ترکیبیں ہیں۔

۱۔ "مَنْ" بواسطہ واو عاطفہ اور "کَ" مجرور کا معطوف ہے اور مذہب مختار کے مطابق اعادۂ جار کے بغیر بھی ضمیر مجرور پر عطف کرنا جائز ہے اس کی نظیریں بکثرت ہیں۔ اس کے ممنوع ہونے کے جتنے شکوک و شبہات ہیں وہ سب کمزور ہیں۔
۲۔ واو بمعنی "مع" ہے اور "من" محل پر عطف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے کیونکہ "حسبك" "کافيك" کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تیرے لیے کافی ہے اور تیری اتباع کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔ جیسا کہ عرب بولتے ہیں "حسبك وزيدا درهم" (تمھارے لیے اور زید کے لیے ایک درہم کافی ہے) شاعر کہتا ہے ؎

اذا كانت الهيجاء وانشقت العصا — فحسبك والضحاك سيف مهند

(جب میدان کارزار گرم ہوتا ہے اور اتحاد کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر تیرے اور ضحاک کے لیے بس ہندی تلوار کافی ہوتی ہے)
دونوں ترکیبوں میں زیادہ صحیح یہی ہے۔
آیت کی ایک تیسری ترکیب بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "من" محل رفع میں ہے ابتدا کی وجہ سے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی "وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَحَسْبُهُمُ اللّٰهُ"، یعنی اور مسلمان جو تیری اتباع کریں ان کے لیے اللہ کافی ہے۔
آیت کی ایک چوتھی ترکیب بھی بیان کی جاتی ہے جو مفہوم کے اعتبار سے غلط ہے وہ یہ کہ اسم "الله" پر عطف ہونے کی وجہ سے "من" محل رفع میں ہے لہٰذا مفہوم ہوگا "حَسْبُكَ اللّٰهُ وَاَتْبَاعُكَ" یعنی تیرے لیے اللہ اور تیرے متبعین کافی ہیں۔ اس ترکیب کے گو بعض حضرات قائل ہیں مگر بالکل غلط ہے۔ آیت کو اس پر محمول کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ توکل، تقویٰ اور عبادت کی طرح "حسبیت" اور "کفایت" بھی اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الأنفال : ۶۲)
اگر ان حضرات کا ارادہ تجھے فریب دینے کا ہے تو تیرے لیے اللہ کافی ہے، اسی نے اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ تجھے طاقت بخشی۔
یہاں اللہ نے "حسب" اور "تائید" کے درمیان فرق کیا ہے۔ حسب (کفایت) کو صرف اپنے لیے اور تائید کا تعلق اپنی اور اپنے بندوں کی نصرت سے رکھا، کفایت کو اللہ کے لیے خاص کرنے کی وجہ سے اللہ نے اہل توحید اور اہل توکل بندوں کی تعریف فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ○ (آل عمران : ۱۷۳)

یہ وہ ہیں کہ ان سے جب لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے تمہارے مقابلہ کے لیے اکٹھا کر رکھا ہے، لہٰذا ان سے ڈرو، تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور بولے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔ وہ کیا ہی بہتر وکیل ہے۔

یہاں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ "ہمارے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے"۔ جب ان اہل توحید اور اہل توکل کا یہ قول ہے اور اس پر رب تعالیٰ نے ان کی تعریف بھی فرمائی تو پھر وہ اپنے رسول سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ اللہ اور تیرے متبعین تیرے لیے کافی ہیں۔ اور آپ کے متبعین کفایت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر چکے ہیں اور اس باب میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو شریک نہیں کیا ہے، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول کے لیے کافی ہونے میں اللہ ان بندوں کو اپنے ساتھ شریک کرلے۔ یہ انتہائی محال اور بالکل باطل ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّھُمْ رَضُوْا مَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَرَسُوْلُہٗ اِنَّا اِلَی اللّٰہِ رَاغِبُوْنَ ○ (توبہ : ۵۹)

کاش یہ اس بات پر مطمئن اور راضی رہتے جو اللہ اور اس کا رسول انھیں دیدے اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے، وہ ہم پر اپنا فضل کرے گا اور اس کا رسول، یقیناً ہمیں اللہ ہی کی رغبت ہے۔

غور کرو "ایتاء" یعنی دینے کی نسبت کس طرح اللہ اور اس کے رسول کی جانب کی گئی ہے، "دینا" تو اللہ اور اس کے رسول دونوں کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ (الحشر : ۷) اور رسول جو تمھیں دے اسے لے لو۔

مگر کفایت (آیت کے اندر) صرف اپنے لیے مخصوص کیا، چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ "اور وہ کہتے کہ ہمارے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے" بلکہ اس "کفایت" کو اس نے صرف اپنا حق قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے (اِنَّا اِلَی اللّٰہِ رَاغِبُوْنَ) (توبہ:۵۹) "یقیناً ہمیں اللہ کی رغبت ہے"، یہ نہیں فرمایا کہ "اور اس کے رسول کی بھی"، بلکہ رغبت کا تعلق صرف اپنی ذات سے رکھا جیسا کہ ارشاد ہے۔ (فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ○ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ○ الانشراح: ۷،۸) جب فرصت ملے تو سیدھے ہوجا اور اپنے رب کی رغبت کر۔

پس رغبت، توکل، انابت اور کفایت کا اطلاق صرف اللہ کے حق میں ہے، جیسا کہ عبادت، تقویٰ، سجدہ، نذر، قسم سب محض اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (الزمر : ۳۶) کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے؟

پس "حسب" بمعنی کافی ہے، جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بتایا کہ صرف وہی اپنے بندہ کے لیے کافی ہے۔ پھر اس کفایت میں اللہ کے ساتھ آپ کے متبعین کیسے شریک کیے جاسکتے ہیں۔ الغرض اس فاسد تاویل کے باطل ہونے کے دلائل اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا بیان یہاں ممکن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جس طرح ہدایت، کامرانی اور نجات رسول کی اتباع کے مطابق ملتی ہے اسی طرح عزت، کفایت اور نصرت بھی اس کی اتباع کے مطابق حاصل ہوگی۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دونوں جہان کی سعادت اور خوش بختی آپ کی پیروی سے وابستہ کی ہے اور دونوں جہان کی شقاوت اور بدبختی آپ کی مخالفت میں رکھی ہے۔ پس جو آپ کے پیروکار ہیں انھیں کو ہدایت بھی ملے گی اور سلامتی بھی، کامرانی بھی، عزت بھی، کفایت بھی، نصرت بھی، ولایت بھی، تائید بھی اور دنیا و آخرت

کے اندر خوش عیشی اور راحت بھی مگر جن کا طرزِ عمل آپ کے خلاف ہوگا انھیں ذلت بھی ملے گی اور رسوائی بھی، خوف بھی، گمراہی بھی، بے توفیقی بھی، اور دونوں جہانوں میں بدبختی اور بدنصیبی بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر فرما چکے ہیں "لایومن احدکم حتی یکون ھو احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین[1]" تم میں کوئی اس وقت تک رتبۂ ایمان تک پہنچ نہیں سکتا جب تک اس کے نزدیک اولاد، والد اور تمام لوگوں کے مقابلے میں آپ محبوب ترنہ ہوجائیں۔

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ ایسا شخص رتبۂ ایمان حاصل نہیں کرسکتا جو تمام نزاعات کے اندر آپ کو اپنا حکم نہ بنائے پھر جو فیصلہ آپ فرمادیں اس کے آگے برضا ورغبت سرِتسلیم خم نہ کردے نیز اس فیصلہ کے بارے میں اپنے اندر ذرا بھی تنگی محسوس نہ کرے[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الأحزاب: ۳۶)

کسی مسلمان مرد اور عورت کو زیبا نہیں کہ اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو اس کے خلاف وہ اپنے معاملہ کے خود مختار رہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول کے فیصلہ کے بعد اختیار کو ختم کردیا ہے اس لیے کسی بھی مومن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ آپ کے فیصلہ کے بعد اپنا کچھ اختیار رکھے بلکہ آپ کا فیصلہ قطعی ہے البتہ جہاں آپ کی بات پردۂ خفاء میں ہو وہاں کسی دوسرے کے قول کو قبول کرلینے کا اختیار ہے۔ بشرطیکہ وہ غیر آپ کے امر اور آپ کی سنّت کا جاننے والا ہو، ان شرائط کے ساتھ دوسروں کا قول جائز الاتباع تو ہے واجب الاتباع نہیں، لہٰذا آپ کے قول کے سوا کسی غیر کے قول کی اتباع کسی پر واجب نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ غیر کی اتباع جائز ہے اور اگر غیر کا قول ترک کردے تو اللہ ورسول کا نافرمان نہیں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا حیثیت کا حامل اس (امت کا کوئی بھی فرد) رسول کے مرتبہ کو کیسے پہنچ سکتا ہے جس کی اتباع تمام مکلفین پر واجب، جس کی مخالفت حرام، اور جس کے قول کے روبرو ہر ایک کا قول ترک کردینا واجب، جس کے سامنے کسی کا کوئی حکم چل نہیں سکتا، جس کے آگے کسی کا قول کوئی قول نہیں، جس طرح اس کی شریعت کے سوا کسی اور کا قانون کوئی قانون نہیں، آپ کے سوا جو لوگ بھی ہیں ان کا قول واجب الاتباع تب ہی ہے جب وہ حکم آپ کے حکم کے مطابق اور ممانعت آپ کی ممانعت کے مطابق ثابت کریں، ان کی حیثیت صرف مبلغ کی ہے مؤسس اور ربانی کی نہیں، اربابِ علم کے اقوال اور ان کے

---

[1] اس حدیث کو احمد نے مسند ج ۳ ص ۲۰۷، بخاری نے صحیح ج ۱ ص ۵۴ و ۵۵ کتاب الایمان، باب حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مسلم نے کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر من الأھل والولد والوالد والناس اجمعین، حدیث ۴۴، نسائی نے ج ۸ ص ۱۱۴ و ۱۱۵ کتاب الایمان وشرائعہ، باب علامۃ الایمان اور ابن ماجہ نے مقدمہ کے باب فی الایمان حدیث ۶۷ کے تحت نقل کیا ہے، ان تمام بزرگوں کے یہاں روایت حضرت انس بن مالک سے ہے، بخاری ونسائی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ سے بھی یہی الفاظ نقل کیے ہیں، ابن بطال اور قاضی عیاض وغیرہ فرماتے ہیں محبت تین طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جس میں احترام اور تعظیم کا پہلو ہوتا ہے جیسے بچے کی باپ سے محبت، ایک وہ جس میں شفقت اور رحمت کا پہلو ہوتا ہے جیسے بیٹے سے محبت، ایک وہ جس میں ہم نظری اور بنظر استحسان دیکھنے کا پہلو ہوتا ہے جیسے تمام انسانوں سے محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت جملہ اقسام کی محبتوں کو شامل ہے۔ آپ کے ارشاد "لایومن" میں نفی کمال ہے ورنہ اصل ایمان تو اسے بھی حاصل ہوتا ہے جو مذکورہ وصف کا حامل نہ ہو۔

[2] اشارہ سورۃ نساء کی آیت ۶۵ کی جانب ہے۔ جس میں ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○

پس نہ، قسم ہے تیرے پروردگار کی وہ ایمان کے رتبہ پر فائز نہیں ہوسکتے تا وقتیکہ اپنے درپیش تنازعہ کے اندر تم کو اپنا حکم نہ بنائیں، اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے اندر کسی طرح کی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ جوں کا توں تسلیم کریں۔

اپنے فہم اور تاویل کے مطابق وضع کردہ اصول وضوابط امت پر واجب الاتباع اور فیصلہ کن تب ہی ہوں گے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ شریعت کے مطابق وموافق ہیں۔ نیز ان کی حقانیت اور صحت کی شہادت بھی شریعت سے ملتی ہو ایسی صورت میں یہ اصول مقبول ورنہ مردود قرار پائیں گے اور اگر ان کے اندر دو باتوں میں سے ایک کی تعیین مشکل ہو رہی ہو تو توقف کیا جائے گا، اس سلسلہ میں بہتر راہ یہ ہے کہ فیصلہ وفتویٰ اور عدم فتویٰ دونوں کو جائز رکھا جائے رہی بات واجب اور متعین ہونے کی تو یہ ہرگز ممکن نہیں۔

تسبیح وتحمید، شہادت وتسلیم کے بعد یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی تنہا خالق اور مخلوقات میں سے تنہا منتخب کرنے والا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ (القصص: ۶۸) تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا اور انتخاب کرتا ہے۔

یہاں اختیار سے مراد ارادہ نہیں جس کی جانب متکلمین "ھوالفاعل المختار" سے اشارہ کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ گو فاعل مختار ہے مگر اختیار سے مراد آیت کے اندر یہ مفہوم نہیں ہے یہ اختیار تو اللہ کے قول "يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ" میں داخل ہے کیونکہ تخلیق وہ اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے، اور اس کے قول "مَا يَشَاءُ" میں بھی داخل ہے کیونکہ مشیت ہی کا دوسرا نام اختیار ہے اصل میں اختیار یہاں اجتباء اور اصطفاء (انتخاب کرنا، چننا، برگزیدہ کرنا) کے مفہوم میں آیا ہے جو بعد از تخلیق ہوا کرتا ہے اور اختیار عمومی ایک ایسا اختیار ہے جو قبل از تخلیق ہوتا ہے، یہ نسبتاً عام ہے اور (فعل پر) مقدم ہوتا ہے، آیت زیر بحث کے اندر اختیار خاص ہے جو بعد میں ہوتا ہے بایں صورت اس کا مفہوم مخلوقات سے انتخاب کرنے کا ہے جب کہ اول نفس تخلیق کے لیے ارادہ ہوتا ہے، یہاں صحیح تر قول یہ ہے کہ "ویختار" وقف تام اور "ماکان لھم الخیرۃ" کو نفی مانا جائے، مفہوم یہ ہوگا کہ اختیار وانتخاب کی بات اللہ کے ماسوا کسی کو حاصل نہیں بلکہ اس کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جس طرح وہ اکیلا تخلیق کرتا ہے اسی طرح مخلوقات سے انتخاب بھی اکیلا ہی کرتا ہے کسی اور کو حق حاصل نہیں کہ پیدا کرے اور انتخاب کرے کیونکہ یہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون کون سے مواقع انتخاب کے ہیں کون سے مقامات رضاء کے ہیں، کیا انتخاب کے لائق ہے کیا نہیں ہے۔ اس باب میں دوسرا کوئی کسی پہلو اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔

بعض غیر محقق اور بے علم حضرات کا خیال ہے کہ "وماکان لھم الخیرۃ" میں "ما" موصولہ اور "ویختار" کا مفعول ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ جو شے ان کے لیے بہتر ہے اللہ اسے اختیار کرتا ہے۔ یہ مفہوم حسب ذیل وجوہ سے غلط ہے:

۱۔ ایسی صورت میں ("ما" موصولہ کا) صلہ "عائد" سے خالی رہتا ہے کیونکہ "الخیرۃ" "کان" کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع اور "لھم" خبر ہے، لہٰذا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ "اور اللہ وہ شے منتخب کرتا ہے جو اختیار ان کا ہے"۔

اگر کہا جائے کہ اس کی تصحیح یوں ممکن ہے کہ عائد محذوف مان کر ترکیب یوں سمجھی جائے "ویختار الذی کان لھم الخیرۃ فیہ" یعنی وہ اس شے کو منتخب کرتا ہے جس کے انتخاب میں ان کو اختیار حاصل ہے۔

جواب تو کہا جائے گا کہ یہ دوسرے پہلو سے فاسد ہے، یہاں ایسا نہیں ہے جس میں عائد کو محذوف ماننا جائز ہوتا ہے، کیونکہ ضمیر عائد اس وقت محذوف ہوتی ہے جب کسی ایسے حرف سے مجرور ہو جس کے مشابہ حرف کے ذریعہ موصول کو جر دیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اتحاد معنی بھی ضروری ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: "يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ۔ (المومنون: ۳۳) وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

اس کی اور مثالیں بھی ہیں۔ اس کے برعکس (عربی زبان میں) "جاءنی الذی مررت" اور "رأیت الذی رغبت" وغیرہ

کہنا جائز نہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا مفہوم اگر مراد لیں تو لفظ "الخیرۃ" کو منصوب اور صلہ کے فعل کو ایک ایسی ضمیر سے مشغول ماننا پڑے گا جو موصول کی طرف لوٹے اس طرح "ویختار ماکان لھم الخیرۃ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ انتخاب وہ اسی کا کرتا ہے جو بعینہ ان کا اختیار ہے۔

اس تقدیر کے مطابق عبارت کی شکل وہی بنتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے مگر اس طرح کی کوئی قرأت نہیں ہے۔

۳۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اولاً یہ بیان کر رہا ہے کہ انتخاب کے باب میں ارباب کفر خود اپنی تجویز رکھتے ہیں ان کی خواہش ہے کہ اختیار انھیں کو حاصل ہو پھر اس کی تردید میں فرمارہا ہے کہ یہ حق صرف میرا ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل نہیں، جیساکہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (الزخرف: ۳۱، ۳۲)

اور ان کا کہنا ہے کہ دونوں بستیوں کی کسی عظیم شخصیت پر یہ قرآن کیوں نہ اتارا گیا، آیا وہ تیرے رب کی رحمت بانٹنے والے ہیں یہ ہم ہیں کہ ہم نے دنیوی زندگی میں ان کے درمیان روزی تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے پر مختلف رتبوں میں فوقیت دی ہے تاکہ ایک کا دوسرے پر قابو رہے تیرے پروردگار کی رحمت جو شے وہ اکٹھا کر رہے ہیں اس سے بہتر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارباب کفر وشرک کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ اختیار وانتخاب کا حق انھیں بھی حاصل ہے، اور فرمایا کہ اس کا تعلق ان حضرات سے نہیں بلکہ اس ذات سے ہے جس نے ان کے درمیان روزی اور مدتہائے حیات پر مشتمل معیشت تقسیم کی، اسی طرح بتایا کہ وہی اہل فضل کے درمیان اپنا فضل تقسیم کرتا ہے، کیونکہ مواقع اختیار کا علم اسی کو ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون لائق انتخاب ہے اور کون نہیں، اسی نے ایک کو دوسرے پر رتبوں میں فوقیت بخشی ہے۔ اسی نے ان کے درمیان معاش اور کمال کے درجات قائم کیے، لہٰذا وہی اور صرف وہی تقسیم کرنے والا ہے۔ بایں طور اس آیت کے اندر یہ وضاحت آگئی کہ تخلیق وانتخاب کا مالک تنہا وہی ہے اور وہ اپنی انتخابی مواقع سے زیادہ واقف ہے، جیساکہ اس کا ارشاد ہے:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام: ۱۲۴)

اور جب ان کے یہاں کوئی حکم آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ہرگز ایمان نہیں لاسکتے تاوقتیکہ ہمیں بھی وہ شے نہ مل جائے جو انبیاء کو ملی تھی۔ اللہ کو بخوبی علم ہے کہ اپنی رسالت کا مقام کہاں بنائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو وہ مقام معلوم ہے جو اس کے انتخاب اور شرف بخشی کے لائق، رسالت ونبوت کی خصوصیت عطا کرنے کے قابل ہے، دوسروں کو نہیں۔

۴۔ یہ بات کہ تجویز وانتخاب کا حق انسانوں کو حاصل ہے مقتضائے شرک ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں اس مقتضائے شرک سے خود کو پاک اور منزہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (القصص: ۶۸)

اختیار انھیں نہیں ہے، پاک ہے اللہ کی ذات، اور بلند تر ہے ان کے شرک سے۔

مشرک اللہ کے سوا کسی دوسرے خالق کے قائل نہ تھے، لہٰذا یہاں اس کی تردید کی ضرورت نہ تھی، یہ بات انتہائی باریک

ہے لہذا اس پر نظر غائر رکھو۔

۵۔ یہ آیت نظیر ہے سورہ حج کی آیات ۷۳، ۷۴ کی۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ○ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○

جن حضرات کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی تو نہ پیدا کر سکیں گے خواہ اس کے لیے متحدہ کوششیں ہی کیوں نہ کر ڈالیں اور مکھی اگر ان سے کچھ چھین لے تو اس کو اس سے بچا بھی نہیں سکتے، طالب و مطلوب دونوں کمزور ہیں۔ انھوں نے جیسا کہ حق ہے اللہ کی قدر نہ کی، بے شک اللہ طاقتور اور غالب ہے۔

آگے فرمایا:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ○

اللہ فرشتوں میں سے رسول منتخب کرتا ہے اور لوگوں میں سے بھی، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے روبرو اور ان کے پیچھے ہے، تمام امور اللہ ہی کی جانب لوٹیں گے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول "وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ" کی نظیر ہے (القصص: ۶۹) نیز سورہ انعام آیت ۱۲۴ کی بھی نظیر ہے۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ — اللہ کو بخوبی علم ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تمام آیات میں اپنے اس علم کی بابت خبر دی ہے جس کی وجہ سے ان انتخابی مقامات کی تخصیص ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کون لائق انتخاب ہے کون نہیں۔ غور کرنے پر آیات کے سیاق سے یہ مفہوم صاف واضح ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۶۔ آیت زیر بحث اللہ تعالیٰ کے حسب ذیل ارشاد کے معاً بعد آئی ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ○ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ○ فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ○ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ

(القصص: ۶۵-۶۸)

اور اس دن وہ انھیں پکار کر پوچھے گا کہ رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؛ تو اس دن خبریں ان پر روپوش ہوں گی، چنانچہ ایک دوسرے سے دریافت بھی نہ کر سکیں گے، باقی جو توبہ کرلے، ایمان لائے، اور نیکوکار بن جائے تو ہو سکتا ہے اس دن کامیاب لوگوں کے صف میں ہو، تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا اور انتخاب کرتا ہے۔

جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندوں کا تنہا خالق ہے، اسی طرح ان میں سے ان خوش بختوں کا انتخاب بھی کرتا ہے جو توبہ، ایمان اور عمل صالح کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوں، یہ اللہ کے ممتاز، منتخب اور برگزیدہ بندے ہوتے ہیں اور یہ انتخاب اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ مشرکین کے انتخاب اور تجویز پر، پاک ہے اللہ کی ذات، بلند و بالاتر ہے ان کے شرک سے۔

منتخب اور برگزیدہ مخلوقات اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ

مخلوقاتِ الٰہی پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انتخاب اور انتخابی خصوصیت، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ربوبیت، وحدانیت، کمالِ حکمت، علم اور قدرت پر واضح اور کھلی ہوئی دلیل ہے، نیز اس حقیقت کی غماز بھی کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت ہے نہ اس کا کوئی شریک

ہے، جو اسی کی مانند تخلیق یا انتخاب اور کائنات عالم میں تدبیر و تصرّف کا مالک ہو، یہ انتخاب و تدبیر نیز وہ تخصیص جس کے آثار و مظاہر پوری کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، وحدانیت، صفات کمال اور رسولوں کی صداقت اور سچائی کی بیّن دلیلیں ہیں، ہم یہاں کچھ کی جانب تھوڑا سا اشارہ کریں گے۔ جس سے ماورا پر روشنی بھی پڑے گی اور ماسوا کا پتہ بھی چلے گا۔

اونچے آسمان کا انتخاب اللہ نے آسمان سات پیدا کیے مگر ان میں جو سب سے بلند ہے اسے منتخب فرما کر مقرب فرشتوں کا مقام قرار دیا، نیز اپنی کرسی اور عرش سے اسے قربت دے کر خصوصیت بخشی، یہاں اپنی جو مخلوق چاہی آباد کر دی، پس دیگر آسمانوں کے مقابلہ میں اس کی فضیلت اور امتیاز کے لیے کچھ بھی نہ سہی بس اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب اسے حاصل ہے۔

مادی اعتبار سے تمام آسمانوں کے یکساں اور مساوی ہونے کے باوصف یہ فضیلت اور خصوصیت بخشی، یہ کمالِ حکمت، کمال قدرت اور اس حقیقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے برگزیدہ بناتا ہے۔

جنّت الفردوس تمام جنتوں پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جنت الفردوس کو یہ فضیلت اور خصوصیت بخشی کہ اسے اپنے عرش کے زیرِ سایہ رکھا[1] اور بعض آثار میں ہے کہ بلاشبہ اللہ سبحانہ نے جنت الفردوس کو اپنے ہاتھوں سے لگایا اور اسے منتخب کر لیا اپنی مخلوقات کے برگزیدہ لوگوں کے لیے۔

فرشتوں سے انتخاب فرشتوں میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کچھ کو برگزیدہ بنایا جبرئیل، اسرافیل اور میکائیل کا نام ان میں سرِفہرست ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اللھم رب جبرئیل و میکائیل و اسرافیل فاطر السموٰت والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فی ما کانوا فیہ یختلفون، اھدنی لما اختلف فیہ من الحق باذنك انك تھدی من تشاء الی صراط مستقیم۔[2]

بارالٰہ! جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل کے پروردگار آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے، غائب و حاضر کا علم رکھنے والے تو بندوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے، جس امر میں اختلاف ہے اپنے حکم سے حق کی جانب میری رہنمائی فرما، بیشک جسے تو چاہتا ہے صراط مستقیم کی رہنمائی فرماتا ہے۔

آپ نے ان تینوں فرشتوں کا تذکرہ ان کے کمالِ رتبہ، کمالِ خصوصیت اور اللہ تعالیٰ سے کمالِ قربت کی بنیاد پر فرمایا ہے، آسمانوں میں بہت سارے فرشتے موجود ہیں، مگر ان میں مذکورہ بالا تینوں فرشتوں ہی کا نام آپ نے لیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل وحی لانے کے ذمہ دار ہیں جو قلب و رُوح کو زندگی سے معمور کرتی ہے، میکائیل بارش کے ذمہ دار ہیں، جس سے زمین، حیوانات اور نباتات کے اندر زندگی کی رَو دوڑتی ہے، اسرافیل صور پھونکنے کے ذمہ دار ہیں جس سے باذنِ الٰہی مردے زندہ

---

[1] بخاری ج ۳ ص ۱۳۴۹ کتاب التوحید باب "وکان عرشہ علی الماء" بروایت ابوہریرۃ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں سو درجے ہیں یہ سب مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے مخصوص ہیں، دو درجوں کے درمیان فاصلہ زمین و آسمان کا ہے تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ یہ سب سے عمدہ اور اعلیٰ جنت ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلی ہیں۔

[2] یہ روایت مسلم کی ہے جسے انھوں نے اپنی صحیح ۷ رقم ۷۷۰ کے اندر کتاب صلوۃ المسافرین کے باب "الدعاء فی صلوۃ اللیل وقیامہ" میں نقل کیا ہے، روایت حضرت عائشہ کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ سے پوچھا "شب کی صلاۃ کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بات سے فرماتے تھے؟ اس پر آپ نے فرمایا رات میں صلاۃ کا آغاز آپ اس طرح فرماتے تھے "اللھم رب جبرئیل و میکائیل ......"

ہوکر قبروں سے نکل پڑیں گے۔

انبیاء کا انتخاب

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اولادِ آدم میں انبیاء علیہم السلام کا انتخاب فرمایا جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے احمد اور صحیح ابن حبان[1] میں حضرت ابوذر کی روایت کے مطابق ان میں تین سو تیرہ رسول ہیں، ان رسولوں میں پانچ اولوالعزم ہیں جن کا ذکر سورۂ احزاب اور سورۂ شوریٰ میں آیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (الاحزاب: ۷)

یاد رکھو اس عہد وپیمان کو جو ہم نے پیغمبروں سے لیا ہے تم سے بھی، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ: ۱۳)

اور اس نے تمہارے دین کے لیے وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے اب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ یہ کہ دین قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

پھر انبیاء ورسل میں سے دو خلیل منتخب فرمائے وہ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

منجملہ اختیارات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انسانی خاندانوں میں خاندانِ اسماعیل کو پھر ان میں خزیمہ کی عظیم شاخ کنانہ کو، کنانہ میں قریش کو، قریش میں خاندانِ ہاشم کو اور خاندانِ ہاشم میں اولادِ آدم کے سردار احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا۔

ایسے ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انسانوں میں آپ کے صحابہ کو، صحابہ میں السابقون الأولون کو، ان میں بھی جنگِ بدر اور بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کو منتخب فرمایا۔ اور ان کے لیے مذاہب وشرائع اور نظامہائے اخلاق میں بھی اس مذہب، شریعت اور نظامِ اخلاق کو منتخب فرمایا جو اکمل تر، افضل تر، پاکیزہ تر اور بے نظیر وبے مثال ہے۔ اور تمام اقوامِ عالم میں امتِ محمدیہ کو جو سربلندی اور برگزیدگی بخشی۔ مسند احمد وغیرہ میں بہز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

أنتم موفون سبعين أمة أنتم خيرها وأكرمها على الله[2]

تمہیں نے کر اب ستر امتیں ہو جائیں گی، ان میں اللہ کے نزدیک تم سب سے بہتر اور باعزت ہو۔

علی بن مدینی اور احمد فرماتے ہیں: بہز بن حکیم کی حدیث بروایت عن ابیہ عن جدہ صحیح ہے اس انتخاب اور برگزیدگی

---

[1] مسند احمد ج ۵، ص ۱۷۸، ۱۷۹، سند میں تین ضعیف راوی ہیں، ابن حبان رقم ۹۴ میں یہ حدیث تفصیلاً آئی ہے اس کی سند میں ابراہیم بن ہشام غسانی ہے جسے ابو حاتم وغیرہ نے کذاب کہا ہے، مسند احمد ج ۵، ص ۲۶۵، ۲۶۶ میں حدیث کی تخریج ابو امامہ کی روایت سے ہوتی ہے اس کے اندر بھی تین ضعیف راوی ہیں، حاکم نے مستدرک ج ۲، ص ۲۶۲ میں ابو امامہ کی حدیث نقل کی ہے جس میں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا (یا رسول اللہ! کیا آدم نبی تھے؟) فرمایا ہاں "انہیں تعلیم ہوئی تھی اور ان سے کلام بھی کیا گیا تھا" پھر پوچھا "ان میں اور حضرت نوح میں کتنا فاصلہ تھا؟" فرمایا "دس صدیاں" پھر پوچھا: حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی درمیانی مدت کیا تھی؟ فرمایا "دس صدیاں" پھر اور لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! رسولوں کی تعداد کیا ہے؟ فرمایا "تین سو پندرہ کا ایک جم غفیر" مسلم کی شرط پر حاکم کے نزدیک یہ سند صحیح ہے، ذہبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔

[2] مسند احمد ج ۵، ص ۵ میں الفاظ "انکم وفيتم سبعين أمة" وارد ہیں۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ رقم (۴۲۸۸) کتاب في الزهد باب أمة محمد صلى الله عليه وسلم، "انكم تتمون سبعين أمة" کے الفاظ وارد ہیں۔ اور اس کی سند حسن ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

کے آثار ونتائج اس امت کے اعمال، اخلاق، عقائد، توحید، نیز منازل بعث ومقامات موقف سے ظاہر ہیں کیونکہ یہ امت تمام لوگوں سے بلند ایک اونچے مقام پر ہوگی جہاں سے وہ سب کو دیکھے گی، ترمذی میں بریدہ بن حصیب اسلمی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اهل الجنة عشرون ومأة صف ثمانون منها من هذه الأمة، واربعون من سائر الامم [۱]

اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی۔ اسّی صفیں اس امت کی بقیہ چالیس صفیں دیگر امتوں کی۔

ترمذی کے قول کے مطابق یہ حدیث حسن ہے اور صحیح مسلم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دوزخی گروہ کی حدیث کے ضمن میں ابوسعید خدری سے مروی ہے۔

والذی نفسی بیده انی لاطمع ان تکونوا شطر اهل الجنة [۲]

قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری خواہش ہے تم اہل جنت میں آدھے ہو جاؤ۔

آپ نے نصف سے زیادہ نہیں فرمایا اس موقع پر یا تو یہ کہا جائے گا کہ صحیح تر تعداد یہی ہے یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ آپ کی امت آدھی ہو، (اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے منظور کیا ساتھ ہی اپنی رحمت سے اضافہ بھی فرمایا)۔ اور خبر دی کہ ایک سو بیس صفوں میں اسّی صفیں اسی امت کی ہوں گی [۳] بایں انداز ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امت محمدیہ کی ایک فضیلت اور برگزیدگی یہ بھی ہے کہ علم اور حلم کی جو بات اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے کسی اور امت کو نہیں دی۔ مسند بزار وغیرہ میں ابو درداء سے روایت ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم (رسول اللہ) صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

ان الله تعالى قال لعیسی بن مریم: انی باعث من بعدك امة ان اصابهم مایحبون حمدوا وشکروا وان اصابهم مایکرهون احتسبوا وصبروا ولاحلم ولا علم، قال یارب کیف هذا ولاحلم ولا علم؟ قال اعطیهم من حلمی وعلمی [۴]

اللہ نے عیسیٰ بن مریم سے کہا، میں تیرے بعد ایک ایسی امت برپا کروں گا جو خوشی اور مسرت کے موقع پر حمد وشکر اور مصیبت پر صبر واحتساب سے کام لے گی۔ اس وقت دنیا میں علم وحلم عنقا ہو چکا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا پروردگار! یہ کیسے ہوگا جب کہ علم وحلم باقی نہ رہے گا؟ فرمایا میں اس امت کو اپنے علم اور حلم کا کچھ حصہ عطا کر دوں گا۔

---

[۱] - سنن ترمذی (۲۵۴۹) فی صفة الجنة: باب ماجاء فی کم صف اهل الجنة۔ اسے انھوں نے حسن کہا ہے۔ مسند احمد ج ۵، ص ۳۴۷، ابن ماجہ رقم (۴۲۸۹) فی الزهد: باب صفة امة محمد صلی الله علیه وسلم۔ کئی سندوں سے مروی ہے۔ سند صحیح ہے، ابن حبان اور حاکم ج ۱، ص ۸۲ نے اسے صحیح کہا ہے۔ طبرانی میں اس باب کی بروایت ابن عباس وابن مسعود وابوموسیٰ اور احادیث بھی مذکور ہیں۔

[۲] - یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے، جس کو مسلم نے اپنی صحیح کی حدیث (۲۲۲) میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے کتاب الایمان باب قوله: یقول الله لآدم: اخرج بعث النار من کل الف تسعمائة وتسعة وتسعین " میں درج فرمایا ہے، اس باب میں ابن مسعود سے بھی ایک روایت ہے، جسے بخاری نے ج ۱۱، ص ۳۳۵، اور مسلم نے حدیث ۲۲۱ میں نقل کیا ہے۔

[۳] - حافظ "الفتح" ج ۱۱، ص ۳۳۶ میں رقمطراز ہیں " ایسا لگتا ہے کہ آپ نے رحمت الٰہی سے جب یہ امید باندھی کہ آپ کی امت نصف ہو تو اللہ نے اس کی تکمیل کی اور اضافہ بھی فرمایا۔"

[۴] - مسند احمد ج ۶، ص ۴۵۰، میں بھی یہ حدیث آئی ہے، روایت ابو درداء سے ہے اور سند حسن ہے۔ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" ج ۱۰، ص ۶۷ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احمد اور بزار نے "الکبیر" اور "الاوسط" میں طبرانی نے اسے نقل کیا ہے، احمد کے تمام راوی سوائے حسن بن سوار اور ابوالحلبس یزید بن میسرہ کے صحیح کے راوی ہیں پھر بھی یہ دونوں ثقہ ہیں۔

مکّہ کے فضائل اور اس کی خصوصیات

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام مقامات اور ملکوں میں سب سے عمدہ اور اشرف مقام کا انتخاب فرمایا اور وہ ہے مکۃ المکرمۃ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا، مکۃ المکرمۃ کی تمام جگہوں کو مقاماتِ عبادت قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا کہ دور ونزدیک کی تمام لمبی اور کشادہ گذرگاہوں سے اس کی زیارت کریں، یہاں داخل ہوں تو اس طرح کہ ان پر خشوع وخضوع اور سرافگندگی کی کیفیت طاری ہو، سر کھلے ہوئے، دنیاوی لباس سے تجرد ہو کر، اللہ نے اسے حرم آمن (امن دینے والا) بنایا ہے۔ یہاں خون بہایا جاسکتا ہے نہ درخت کاٹا جاسکتا ہے، نہ شکار کیا جاسکتا ہے، نہ یہاں کے شاداب پودے اکھیڑے جاسکتے ہیں۔ یہاں کا لقطہ (گری پڑی چیز) ملکیت کے لیے نہیں صرف اعلان کی خاطر اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہاں کے حج وزیارت کی عبادت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پچھلی تمام لغزشوں اور غلطیوں کی تلافی اور خطاؤں کا کفارہ بنایا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اتی هذا البیت فلم یرفث ولم یفسق، رجع کیوم ولدته امه [1]

جو اس گھر کا قصد کرے پھر شہوت رانی کرے نہ بدعملی تو واپس اس دن کی طرح ہوگا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا ہے۔

اس گھر کی زیارت کرنے والے کا ثواب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک جنت سے کم نہیں ہے، سنن میں عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

تابعوا بین الحج والعمرة، فانهما ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید والذهب والفضة، ولیس للحجة المبرورة ثواب دون الجنة [2]

حج کرو تو عمرہ بھی اور عمرہ کرو تو حج بھی کیونکہ دونوں مل کر فقر وفاقہ اور گناہوں کا ازالہ اس طرح کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کا زنگ دور کر دیتی ہے۔ حج مبرور کا ثواب جنت سے کم نہیں۔

صحیحین میں ابوہریرہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

العمرة الی العمرة کفارة لما بینهما والحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة [3]

عمرہ، دوسرے عمرہ تک کے عرصہ کی گناہوں کا کفارہ ہے، حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔

بلد امین (مکۃ المکرمۃ) اللہ کے نزدیک سب سے بہتر، پسندیدہ اور محبوب ترین مقام نہ ہوتا تو اس کے میدان مقاماتِ عبادت قرار نہ پاتے، جن کی زیارت بندوں پر فرض ہوئی، اور اسے نہایت تاکید کے ساتھ فرائض اسلامی میں داخل کیا گیا، دو جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر اس کی قسم کھائی ہے ایک سورہ "التین" میں "وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ" (التین: ۳) (اور

---

[1] صحیح بخاری ج ۳، ص ۳۰۲، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، نیز ج ۴، ص ۱۷، باب قول الله عزوجل (فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج) اور مسلم حدیث ۱۳۵۰، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرة ویوم عرفة۔ یہاں الفاظ مسلم کے ہیں۔

[2] ترمذی، کتاب الحج، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرة حدیث ۸۱۰، نسائی ج ۵، ص ۱۱۵، کتاب الحج، باب فضل المتابعة بین الحج والعمرة، مسند احمد حدیث (۳۶۶۹) سند حسن ہے، احمد اور ابن ماجہ میں بالترتیب ص ۱۶۷ و ۲۸۸۷ میں اس حدیث کا ایک شاہد بھی ذکر ہوا ہے، روایت حضرت عمر کی ہے، نسائی ج ۵ ص ۱۱۵ میں اس کا ایک اور شاہد بھی ہے، ان دونوں شاہدوں کی موجودگی میں حدیث صحت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

[3] بخاری ج ۳، ص ۴۷۶، کتاب الحج، باب وجوب العمرة، مسلم حدیث ۱۳۴۹ کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرة ویوم عرفة۔

یہ شہر امین بھی) دوسری جگہ سورہ "البلد" میں یعنی " لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ " [1] (البلد : ۱) (میں اس شہر کی قسم کھا کر کہتا ہوں) روئے زمین پر اس خطۂ پاک کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں جس کی جانب دوڑ لگانا اور جو گھر اس کے اندر موجود ہے اس کا طواف کرنا ہر قدرت رکھنے والے پر فرض ہو، یہاں حجر اسود اور رُکن یمانی کے نام سے جو مقامات موجود ہیں ان کے سوا کوئی ایسا مقام ہرگز نہیں جسے چومنا اور بوسہ دینا مشروع ہو اور جس سے گناہوں اور خطاؤں کا ازالہ وابستہ ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ مسجد حرام میں ایک صلاۃ ادا کرنا ایک لاکھ صلاۃ کے ثواب کے برابر ہے، سنن نسائی اور مسند میں صحیح سند سے عبد اللہ بن زبیرؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

صلاۃ فی مسجدی ھذا افضل من الف صلاۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام وصلاۃ فی المسجد الحرام افضل من صلاۃ فی مسجدی ھذا بمأۃ صلاۃ ۔[2]

میری اس مسجد میں صلاۃ ادا کرنے کا ثواب مسجد حرام کو چھوڑ کر ہر مسجد میں صلاۃ ادا کرنے کے ثواب سے ہزار گنا زیادہ ہے مسجد حرام میں صلوٰۃ ادا کرنے کا ثواب میری مسجد میں صلاۃ ادا کرنے کے ثواب سے سو گنا زیادہ ہے

ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہے کہ تمام روئے زمین پر مسجد حرام کلیۃً سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ ہے، اور اسی لیے اس کی جانب سفر فرض قرار پایا اور اس کے علاوہ (مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ) کا سفر مستحب۔ مسند احمد، جامع ترمذی اور سنن نسائی میں حضرت عبد اللہ بن عدی بن الحمراء سے یہ روایت ہے کہ مکہ کے مقام حزورہ میں انھوں نے اپنی سواری کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے سنا ہے۔

واللہ انک لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولولا انی اُخرجتُ منکِ ما خرجتُ۔

اللہ کی قسم تو اللہ کا سب سے عمدہ اور محبوب ترین مقام ہے اگر میں یہاں سے نکالا نہ جاتا تو نہ نکلتا۔

ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے [3]

خانہ کعبہ کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تمام دنیا والوں کا قبلہ ہے۔ اس کے علاوہ روئے زمین پر کوئی دوسرا قبلہ نہیں ہے۔ اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ قضائے حاجت کے موقع پر اسے کوئی اپنے روبرو کر سکتا ہے نہ پیچھے۔ دوسرے مقامات کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ صحیح مسلک کے مطابق کھلی فضا ہو یا چہار دیواری، کہیں بھی خانہ کعبہ کا استقبال واستدبار

---

[1] - حافظ ابن جوزی "زاد المسیر" میں رقمطراز ہیں کہ اللہ کے ارشاد (لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ) کا مفہوم زجاج کے نزدیک قسم کا ہے، اور لا بطور تاکید ہے، جیسا کہ (لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتَابِ : الحدید : ۲۹) میں لا بطور تاکید آیا ہے، ابن کثیر نے مجاہد کا ایک تفسیری قول نقل کیا ہے، جس کے مطابق "لا" منکرین کا رد کرنے کے لیے ہے اور " اقسم " سے قسم کی ابتداء کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ام القریٰ کی قسم اس کی اس حالت کے اندر کھائی ہے، جس میں لوگ یہاں حج وزیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، اس سے بحالت احرام کعبہ کی عظمت اور منزلت کا اظہار مقصود ہے۔

[2] - سنن نسائی کے مطبوعہ نسخہ میں یہ روایت نہیں ہے، ممکن ہے یہ "سنن صغریٰ" جو مطبوع و رائج ہے کے بجائے "سنن کبریٰ" کے مخطوطہ میں ہو۔ احمد کے نزدیک مسند ج ۴، ص ۵ میں یہ صحیح سند سے مروی ہے، ابن حبان (۱۰۲۷) نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔
بروایت ابو ہریرہ صحیحین اور ان کے علاوہ میں موجود ہے، مسلم نے اور امام احمد نے قدرے زیادتی کے ساتھ ابن عمر سے بھی روایت کیا ہے۔ اس روایت کے مختلف طرق اور شواہد ہیں، جو متعدد صحابہ سے منقول ہیں۔ (ملاحظہ ہو : الثمر المستطاب فی فقہ السنۃ والکتاب) (مراجعین)

[3] - مسند احمد ج ۴، ص ۳۰۵، ترمذی حدیث (۳۹۲۱) کتاب المناقب، باب فضل مکۃ، ابن ماجہ حدیث (۳۱۰۸) کتاب المناسک، باب فضل مکۃ، سند صحیح ہے، ابن حبان (۱۰۲۵) نے اس کو صحیح کہا ہے۔

روا نہیں ہے اس مسلک کے دس سے زیادہ دلائل موجود ہیں جو دوسرے مقام پر مذکور ہیں۔ کھلی فضا اور چہار دیواری کے درمیان فرق کرنے والوں کے پاس جو دلائل ہیں وہ ان دلائل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اس پر مستزاد کھلی فضا اور چہار دیواری کی تعیین میں ان کا اختلاف بھی ہے مگر یہاں طرفین کے دلائل پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔

اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہی وہ مسجد ہے جو دنیا میں سب سے پہلے تعمیر ہوئی۔

عن ابی ذر قال : سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اول مسجد وضع فی الارض ؛ فقال: "المسجد الحرام" قلت "ثم ای؟" قال: "المسجد الاقصیٰ" قلت كم بينهما ؛ قال: "اربعون عاما"۔

صحیحین میں حضرت ابوذر سے روایت ہے، فرماتے ہیں دنیا میں سب سے اوّل تعمیر ہونے والی مسجد کے بارے میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "مسجد حرام"، پوچھا پھر؟ تو فرمایا "مسجد اقصیٰ" پوچھا دونوں کی تعمیر میں فاصلہ کی مدت؟ فرمایا "چالیس سال"۔[1]

اور اس شخص پر یہ حدیث مشکل ہو گئی جس نے اس کی مراد سمجھے بغیر یہ کہا کہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام جو مسجدِ اقصیٰ کے معمار ہیں ان کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے مگر یہ قول اس قائل کی بے خبری کی دلیل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تو مسجد اقصیٰ کی تجدید فرمائی ہے، تاسیس میں اصل معمار حضرت یعقوب بن اسحٰق علیہما السلام ہیں جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کعبہ سے چالیس سال بعد اس کی بنیاد ڈالی تھی۔

فضیلت مکّہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ام القریٰ ہے پس تمام بستیاں اس کے تابع اور اس کی فرع ہیں اور وہ تمام بستیوں کی اساس، لہٰذا ضروری ہے کہ بستیوں میں وہ بے نظیر ہو جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ ام القرآن[2] ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتبِ الٰہیہ کے اندر اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو یہاں بار بار آنے کی ضرورت نہ پیش آتی ہو ان کا یہاں بغیر احرام داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ یہ وہ امتیاز ہے جو کسی اور مقام کو حاصل نہیں۔ یہ مسئلہ لوگوں کو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے معلوم ہوا۔ آپ سے ناقابلِ احتجاج سند سے مرفوعاً روایت ہے۔ "لايدخل أحد مكة الا باحرام من اهلها ومن غير اهلها" کہ مکّہ کے اندر خواہ وہاں کا باشندہ ہو یا نہ ہو بغیر احرام کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ ابواحمد بن عدی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر حجاج بن ارطاۃ اور ان سے پہلے ایک اور راوی سند کے اندر ضعیف راویوں میں شمار ہیں۔ مسئلہ کے اندر فقہاء کے تین اقوال

---

[1] - بخاری ج ۶، ص ۲۹۰ / ۲۹۱ "أحاديث الأنبياء" باب قوله تعالیٰ (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا)، مسلم حدیث (۵۲۰) اول کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ۔ حافظ ابن حجر "الفتح" میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر ہے "إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ" فرماتے ہیں بیت سے عام گھر نہیں خانۂ عبادت مراد ہے، اسحٰق ابن راہویہ اور ابن ابی حاتم کی صحیح سند سے بصراحت اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر سے پہلے بھی مکانات موجود تھے مگر یہ پہلا گھر ہے جو عبادت الٰہی کے لیے تعمیر ہوا۔

[2] - صحیح مسلم رقم (۳۹۵) فی الصلاۃ : باب وجوب قرأة الفاتحة، عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم ارشاد ہے جو ایسی صلاۃ ادا کرے جس میں ام القرآن کی قرات نہ کرے تو وہ صلاۃ ناقص ہوگی" "خداج" کا لفظ تین بار ادا فرمایا یعنی ناتمام۔ احمد ۵/۱۱۴ ترمذی (۳۱۲۴) فی التفسیر، النسائی ج ۲، ص ۱۳۹ فی الصلاۃ، باب تاویل۔ قوله تعالیٰ (وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ) بروایت ابوهريرة عن ابی بن كعب۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ نے تورات و انجیل میں ام القرآن جیسی چیز نازل نہیں فرمائی۔ یہ سبع مثانی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان تقسیم شدہ ہے میرا بندہ جو مانگے گا وہ پائیگا۔ سند صحیح ہے ابن حبان (۱۷۱۴) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ہیں۔ (۱) بغیر احرام کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ (۲) بغیر احرام ہر شخص داخل ہوسکتا ہے۔ (۳) بیرون میقات رہنے والے احرام کے ساتھ اور اندرون میقات رہنے والے بغیر احرام کے داخل ہوسکتے ہیں۔ آخری قول ابوحنیفہ اور پہلے دونوں اقوال احمد اور شافعی کے ہیں۔

حرم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ خواہ مرتکب نہ ہو پھر بھی بدی کا محض ارادہ کر لینے پر یہاں انسان کا مواخذہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (الحج: ۲۵)

اس مسجد میں جو بھی ظالمانہ طور پر بے راہ روی کا ارادہ کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

غور کرو! کس طرح یہاں فعل ارادہ "ب" کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے، اُرِدتُ بکذا اسی وقت کہیں گے جب ارادہ فعل "ھمّ" کا مفہوم ادا کرتا ہو۔ کیونکہ استعمال "هَمَمْتُ بكذا" کی شکل میں ہوتا ہے۔ دھمکی دی گئی کہ جو اس مقام پر ظلم کا ارادہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ دردناک عذاب کا مزہ چکھائے گا۔

اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں بدیوں کی مقدار کیت کی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ عام طور پر بدی جیسی کچھ ہوتی ہے سزا بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ بڑی بدی کی سزا بڑی اور چھوٹی کی چھوٹی۔ مگر حرم الٰہی کے اندر ایسا نہیں ہے، یہاں برائیوں کی شناعت بڑھ جاتی ہے کیونکہ دار السلطنت کے اندر بادشاہ کی نافرمانی دور دراز علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ عقاب کا باعث ہوتی ہے۔ حرم کے اندر برائیوں کی شدّت اور گھناؤنے پن کے دوچند ہوجانے کے بارے میں یہ مثال فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مکّہ کے فضائل اور خصوصیات کا منظر دیکھنا ہو تو دیکھو کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے کیا کچھ کشش، کیسا عشق اور کیسی محبّت موجود ہے دلوں کے لیے اس کی کشش مقناطیسی کشش سے بھی بڑھ کر ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

محاسنه هيولیٰ كل حسن ومقناطيسُ أفئدة الرجال

اس کے محاسن کیا ہیں۔ ہر حسن کا مادہ اور دلوں کا مقناطیس ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے لوگوں کا جائے قرار بنایا، یہاں سال کے سال لوگ پوری دنیا سے کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور قیام کرتے ہیں قیام کرتے ہوئے ان کی طبیعتیں سیر بھی نہیں ہوتیں، بلکہ اس شہر کی جتنی بار زیارت ہوتی ہے اتنا ہی اس کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔

لايرجع الطرف عنها حين ينظرها حتى يعود إليها الطرف مشتاقا

نگاہ اسے دیکھ کر نیچے نہیں ہوتی کہ اشتیاق میں دوبارہ اٹھ جاتی ہے۔

دیکھو تو سہی اس کی خاطر کتنے قتل ہوگئے، کتنے لٹ گئے، کتنے زخمی ہوگئے، اس کی محبّت میں کتنی دولتیں خرچ ہوگئیں، کتنی ہستیاں قربان ہوگئیں، عاشقوں نے گوارا کر لیا کہ اہل وعیال اور جگر گوشے جدا ہوجائیں، احباب و رفقاء اور ملک چھوٹ جائیں، سامنے ہلاکت وتباہی کے خطرات اور اندیشے ہوں تو پرواہ نہیں، مشقتیں اور کلفتیں آئیں تو سب شہد و شکر کے گھونٹ، دل کے اندر عشق ومحبّت کا طوفان برپا ہو تو اس گھر کی راہ میں خطرات ومصائب اور مشقتیں سب لذیذ تر، نظر میں خوش گوار، کام ودہن کی ساری لذتیں ہیچ، بے وقعت اور حقیر تر۔

وليس محبا من يعدّ شقاءه عذابا اذا ما كان يرضی حبيبه

عاشق وہ نہیں جو رضائے محبوب کی راہ میں بدبختیوں کو عذاب سمجھنے لگے۔

یہ سب کیا ہے ؟ یہ سب " وَطَهِّرْ بَيْتِيَ " (الحج : ۲۶) (اور میرا گھر پاک رکھو) کا راز ہے۔ اللہ کی جانب اس گھر کی نسبت کیا ہوئی کہ تعظیم و محبت کا بحر بیکراں امنڈ پڑا اور کیوں نہ ہو کہ اس انتساب کا خاصہ بھی یہی ہے۔ رسول کی نسبت اللہ کی جانب ہوئی تو موقر و محترم قرار پاتے، مومنوں کی اضافت اس کی جانب ہوئی تو سرخرو ہو گئے، جس کسی چیز کا انتساب پروردگار کی جانب ہو گیا فضیلت و شرف کا اسے وہ تمغہ ملا جس نے انتخاب اور برگزیدگی کے مقام تک اسے پہنچا کر دم لیا۔

اس نسبت سے اسے ایک اور فضیلت، ایک اور خصوصیت، ایک اور عظمت و جلالت کا مقام ملا جو اسے اس نسبت سے قبل حاصل نہ تھا۔ اس حقیقت تک رسائی اسے کیونکر ہو سکتی ہے جو زمان و مکان اور ذوات و افعال کے اندر مساوات کا قائل ہو اور عقیدہ رکھتا ہو کہ ایک چیز کو دوسری چیز پر کوئی فضیلت اور شرف حاصل نہیں ہے۔ یہ مجرد ترجیح بلا مرجح ہے۔ ہمارے نزدیک چالیس سے بھی زیادہ وجوہ سے یہ خیال باطل ہے۔ اس کی تفصیل ہم کسی اور مقام پر پیش کر چکے ہیں۔ فاسد ہونے کے لیے اس باطل تصور کا تصور ہی کافی ہے۔ کیونکہ جس تصور کے نتیجہ میں پیغمبروں کا اپنے دشمنوں کے مانند ہونا لازم آتا ہو وہ فاسد ہی ہوگا کسی معاملہ میں شرف و فضیلت کا تعلق اس بات سے تو نہیں ہوتا کہ ذات ایسی خوبیوں اور صفات سے آراستہ ہو جو دوسروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح کسی خطہ کے اندر بذات خود کوئی خوبی نہیں ہوتی، یہاں جو نیکوکاریاں پیش کی جاتی ہیں انھیں کی بدولت وہ ممتاز اور معزز قرار پاتا ہے۔ مکہ مکرمہ، مسجد حرام، منیٰ، عرفہ اور مشاعر میں فضیلت بذات خود نہیں بلکہ فضیلت کا تعلق ایسے امور سے ہے جو خارج از ذات ہیں[1]

مذکورہ غلط اور باطل تصور کی تردید خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ (الانعام : ۱۲۴)

انھیں جب کوئی حکم پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ تاوقتیکہ ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے جیسا کہ اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے ہم ایمان نہ لائیں گے۔

جواب میں فرمایا گیا۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ (الانعام: ۱۲۴) اللہ بخوبی جانتا ہے کہ اس کے پیغام کی جگہ کیا ہے۔

یعنی ہر کس و ناکس اس کی پیغمبری کا اہل نہیں۔ بلکہ کچھ مخصوص مقامات ہیں وہی پیغامبری کے لائق اور انھیں کے اندر اس کی صلاحیت ہوتی ہے، ان مقامات کا تم سے زیادہ اللہ کو علم ہے، ان حضرات کے مطابق تمام شخصیتیں اگر یکساں ہوتیں تو یہاں اس تصور کے تردید کی ضرورت نہ ہوتی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ (الانعام : ۵۳)

اور اسی طرح ہم نے ایک دوسرے کو ذریعۂ آزمائش بنایا ہے تاکہ وہ کہیں کہ آیا یہی وہ حضرات ہیں جن پر ہمارے درمیان سے اللہ نے اپنا فضل کیا۔ کیا اللہ شکر گذاروں کو نہیں جانتا ؟۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ کون اس کی نعمت پر شکر گزار ہے، چنانچہ فضل و کرم سے اسے نوازتا ہے،

---

[1] یعنی یہ تصور کہ کسی چیز کی خوبی اور برتری صرف اس کے اندر موجودہ اچھے اوصاف و کمالات کی وجہ سے ہوتی ہے بجائے خود کوئی چیز افضل و برتر نہیں ہوتی، خانۂ کعبہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفہ، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور قبا وغیرہ کو بجائے خود کوئی شرف و فضیلت حاصل نہیں بلکہ ان کے اندر عمل صالح کرنے کی وجہ سے ان کو فضیلت و شرف حاصل ہوتا ہے یہ تصور بالکل باطل ہے۔ جن مقامات اور شخصیات کو رب العالمین نے فضیلت اور شرف عطا فرمایا ہے وہ بہر حال افضل و اشرف ہیں، خواہ ان کے اندر خارجی خوبیاں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں۔ (مراجعین)

اور کون شکر گذار نہیں ہے اسے وہ محروم کر دیتا ہے۔ پس ہر مقام شکر گذاری کی صلاحیت رکھتا ہے نہ ہی اللہ کا بار احسان اٹھانے کا اہل ہے اور نہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ فضل و شرف کا اسے تمغہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے جن اشخاص، ذوات اور مقامات وغیرہ کو منتخب اور برگزیدہ فرمایا ہے وہ ایسے امور اور صفات سے متصف ہیں جو خود انھیں کی ذات سے قائم ہیں۔ غیر سے ان میں نہیں آئیں۔ ہاں ان کے انتخاب کی وجہ بس یہی ہے۔ مذکورہ صفات ہی کے باعث اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں فضیلت بخشی اور برگزیدہ فرما کر خصوصیت عطا فرمائی۔ یہ ہے اس کی تخلیق اور یہ ہے اس کا انتخاب۔

"وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ" (القصص: ٦٧) اور آپ کا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔

اس رائے کا باطل ہونا نہایت واضح ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہو کہ بیت الحرام کا مقام دوسرے عام مقامات کے برابر اور حجر اسود کی ذات زمین کے تمام پتھروں کے مساوی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی دوسرے انسانوں کی ذات جیسی ہے۔

فضیلت اور فوقیت کا باعث کچھ ایسے امور ہیں جو ذات اور ذات سے وابستہ صفات کی حدود سے خارج ہیں۔ یہ اور اس طرح کے اقوال وخیالات دراصل متکلمین کی مجرمانہ غلطیاں ہیں جو ان سے شریعت کے سلسلہ میں سرزد ہوئیں اور ان کو انھوں نے شریعت کی طرف منسوب کر دیا، حالانکہ شریعت کا دامن بالکل پاک ہے۔ متکلمین کے یہاں اس دلیل کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ امر عام میں تمام اعیان و ذوات مشترک ہوا کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ باعث مساوات نہیں۔ کیونکہ ذاتی اعتبار سے اختلاف کے باوجود ظاہراً عمومی حیثیت سے مختلف چیزوں میں اشتراک بھی ہو سکتا ہے۔ مشک اور پیشاب کو ذاتی اعتبار سے اللہ نے کبھی مساوی قرار نہیں دیا ہے، اسی طرح آگ اور پانی کے اندر بھی مساوات نہیں۔ مقدس وغیر مقدس مقامات، نیز افضل اور غیر افضل اشخاص کے اندر جو کھلا ہوا فرق مرتبہ ہے وہ مذکورہ مثال سے بھی زیادہ اہم ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں جو فرق ہے وہ مشک اور گوبر کے فرق سے بھی بڑھا ہے۔ اسی طرح نفس کعبہ اور قصر سلطانی کے درمیان جو تفاوت ہے وہ بھی اس فرق سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ یہ بات کیونکر ہو سکتی ہے کہ دونوں خطے حقیقت میں برابر ہوں اور فضیلت کا دارومدار محض وہاں انجام دی جانے والی عبادتوں، دعاؤں اور اذکار پر ہو؟ حقیقت میں اس غلط اور باطل مذہب کا پورے طور پر رد مقصود نہیں، مقصود صرف اس کا تذکرہ ہے۔ انصاف پسند اور ارباب عقل و دانش خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیصلہ نہ بھی کر سکیں تو اللہ اور اس کے بندوں کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شے کو فضل و شرف کا خصوصی مقام دیتا ہے تو اس کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تخصیص کا دینے والا وہی ہوتا ہے کیونکہ اسی نے پیدا کیا ہے اور پیدا کرنے کے بعد انتخاب بھی کیا ہے۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

بعض ایام اور مہینوں کی افضلیت

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نزدیک سب سے اعلیٰ اور اشرف دن وہ ہے جسے ہم "یوم النحر" کہتے ہیں۔ یوم النحر ہی کو یوم حج اکبر[1] بھی کہتے ہیں۔ سنن میں آپ کا ارشاد منقول ہے "افضل الایام عند الله یوم النحر ثم یوم القر[2]" "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل "یوم النحر" پھر "یوم القر" ہے" ایک قول یہ بھی ہے کہ عرفہ کا دن "یوم النحر" سے افضل ہے شافعی حضرات کے نزدیک یہی قول مشہور ہے وہ کہتے ہیں کہ یہی حج اکبر کا دن ہے اس دن صوم رکھنا دو سال کے گناہوں[3] کا کفارہ ہے اس دن سے زیادہ گردنیں اللہ تعالیٰ کسی اور دن آزاد نہیں[4] کرتا۔ نیز اس دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب آجاتا ہے اور اپنے فرشتوں سے فخر کرتا ہے کہ ذرا "موقف" والوں کی شان تو دیکھو۔ مگر صحیح تر پہلا قول ہے کیونکہ اس کے حق میں جو حدیث وارد ہے اس کے پایہ کی کسی اور حدیث کا اس سے تعارض نہیں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یوم النحر ہی حج اکبر کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ (توبہ : ۳) اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن عام لوگوں کے سامنے اعلان ہے۔

صحیحین سے ثابت ہے کہ یہ اعلان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرفہ کے دن[5] نہیں نحر کے دن کیا ہے۔ سنن ابوداؤد میں صحیح ترین سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "یوم الحج الاکبر یوم النحر[6]" حضرت ابوہریرہ

---

[1] یوم نحر کو یوم حج اکبر اس لیے کہتے ہیں کہ حج اور مناسکِ حج کے بیشتر بڑے کام اسی دن کیے جاتے ہیں۔

[2] اصل کتاب اور مسند امام احمد میں لفظ "النفر" ہے۔ مگر یہ تحریف ہے۔ "یوم القر" "یوم النحر" کا اگلا دن ہے یعنی ۱۱ ذی الحجہ، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دن لوگ طوافِ افاضہ اور قربانیوں سے فارغ ہو کر منیٰ میں آرام کرتے ہیں۔ حدیث کی تخریج ابوداؤد نے حدیث (۱۷۶۵) فی الحج : باب فی الھدی اذا عطب قبل ان یبلغ اور احمد نے ج ۴، ص ۳۵۰ میں عبداللہ بن قرط الثمالی کی روایت سے کی ہے۔ سند صحیح ہے۔ حاکم نے ج ۴، ص ۲۲۱ میں اسے صحیح لکھا ہے اور ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

[3] صحیح مسلم حدیث (۱۱۶۲) فی الصیام : باب استحباب ثلاثة أیام من کل شھر وصوم یوم عرفة میں ابوقتادہ انصاریؓ کی روایت : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرفہ کے صوم رکھنے کے تعلق سے پوچھا گیا تو فرمایا "یکفر السنة الماضیه والباقیة" (گذشتہ اور آئندہ دونوں سالوں کا کفارہ ہو جاتا ہے)۔

[4] صحیح مسلم (۱۳۴۸) فی الحج : باب فضل الحج والعمرة، نسائی ج ۵، ص ۲۵۰ فی الحج : باب ماذکر فی یوم عرفة، ابن ماجہ (۳۰۱۴) فی المناسك : باب الدعاء یوم عرفة میں حضرت عائشہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مامن یوم أکثر من أن یعتق الله فیه عبدا من النار من یوم عرفة وانه لیدنو ثم یباهی بهم الملائکة فیقول ما أراد هولاء" یوم عرفہ کے مقابلہ میں کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ اس کثرت سے بندوں کو آزاد کرتا ہو اس دن وہ قریب ہو کر فرشتوں سے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ میرے بندے کیا چاہتے ہیں؟"

[5] بخاری ج ۸، ص ۲۴۰ فی التفسیر : باب قوله تعالیٰ "فسیحوا فی الأرض أربعة اشهر" اور مسلم (۱۳۴۷) فی الحج : باب لایحج البیت مشرك ـ میں حمید بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے مجھ سے فرمایا "اس حج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے اعلان کرنے والوں میں بھیجا۔ آپ نے انھیں یوم النحر کو منیٰ میں یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے اور نہ بیت اللہ کا طواف کوئی ننگا ہو کر کرے۔ حمید کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی ابن طالب کو پیچھے لگا دیا اور حکم دیا کہ برات کا اعلان کریں۔ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ علی نے "یوم النحر" کو منیٰ میں حاضرین کے سامنے برات کا اعلان کیا اور کہا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے اور نہ بیت اللہ کا طواف کوئی ننگا ہو کر کرے۔

[6] ابوداؤد (۱۹۴۵) فی الحج : باب یوم الحج الاکبر، ابن ماجہ (۳۰۵۸) فی المناسك : باب الخطبة یوم النحر۔ حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے اور سند صحیح ہے بخاری نے صحیح ج ۳، ص ۴۶۱ میں اس کا تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

رضی اللہ عنہ اور صحابہ کی ایک پوری جماعت کا بھی یہی خیال ہے۔ "یوم عرفہ" کا جہاں تک تعلق ہے یہ "یوم النحر" کا دیباچہ ہے کیونکہ عرفہ کے دن وقوف، توبہ، استغفار، تضرع اور طلب عفو جیسے اعمال انجام پاتے ہیں۔ مگر "یوم النحر" خانہ کعبہ میں آنے اور اس کی زیارت کا دن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دن خانہ کعبہ کے طواف کو طواف زیارت کہتے ہیں، عرفہ کے دن حجاج جب گناہوں سے دھل دھلا کر پاک وصاف ہو جاتے ہیں تو نحر کے مبارک دن میں انھیں اللہ کے گھر کی زیارت اور اس میں داخلہ کی اجازت ملتی ہے چنانچہ اس مبارک موقع پر وہ قربانیاں بھی پیش کرتے ہیں۔ سر بھی منڈاتے ہیں اور "رمی جمار" اور حج کے بڑے بڑے ارکان بھی ادا کرتے ہیں۔

عرفہ کے دن جو اعمال انجام پاتے ہیں ان کی حیثیت "یوم النحر" کی تیاری کے لیے وضو اور غسل کی ہوتی ہے[1]

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت

عشرۂ ذی الحجہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک افضل ترین ایام ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

مامن ایام العمل الصالح فیھا احب الی اللہ من ھذہ الایام العشر۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل صالح جتنا زیادہ عشرۂ ذی الحجہ میں محبوب ہے اتنا اور دنوں میں نہیں۔

صحابہ نے دریافت فرمایا۔ "جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟" فرمایا :

ولا الجھاد فی سبیل اللہ الا رجل خرج بنفسہ ومالہ ثم لم یرجع من ذلک بشیٔ[2]

---

[1] "یوم الحج الاکبر یوم النحر" عرفہ جس سال جمعہ کے دن واقع ہو اس کے بارے میں عوام میں مشہور ہے کہ وہ حج اکبر ہے، یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ کتاب وسنت میں اس خیال کا کوئی ثبوت نہیں۔ قرآن مجید میں وارد" واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر" آیت کریمہ میں "یوم الحج الاکبر" کی تفسیر "یوم النحر" سے کی گئی ہے، مفسرین میں امام ابن جریر طبری، امام ابن کثیر اور امام شوکانی نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں جو احادیث ذکر کی ہیں سب میں "یوم الحج الاکبر" سے "یوم النحر" مراد ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الحج باب : ۱۳۲ میں تعلیقاً اور سنن ابی داؤد کتاب المناسک، باب : ۶۶ اور سنن ابن ماجہ کتاب المناسک، باب : ۷۶ میں حضرت عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے۔" ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف یوم النحر بین الجمرات فی الحجۃ التی حج فقال : ای یوم ھذا؟ فقالوا : یوم النحر، قال : ھذا یوم الحج الاکبر" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں یوم النحر کو جمرات کے مابین وقوف کرتے ہوئے فرمایا یہ کون سا دن ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا یوم النحر۔ آپ نے فرمایا یہی حج اکبر کا دن ہے۔)
اسی طرح صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورہ "براٴۃ" ۹ اور سنن ابی داؤد کتاب المناسک، باب : ۶۶ میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے "بعثنی ابوبکر فیمن یوذن یوم النحر بمنی ان لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان، ویوم الحج الاکبر یوم النحر والحج الاکبر : الحج۔ (یعنی منی میں یوم النحر کو یہ اعلان کرنے والوں میں سے میں بھی تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی ننگا طواف نہ کرے اور حج اکبر کا دن "یوم النحر" ہے اور حج اکبر سے مراد صرف حج ہے۔)
مذکورہ دونوں احادیث کا ماحصل یہ ہوا کہ "یوم الحج الاکبر" سے مقصود عید اکبر، عید النحر اور عید الاضحیٰ ہے۔ خواہ وہ کسی دن بھی واقع ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ میں حج اکبر سے مقصود صرف حج ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے اور یہ عمرہ — جسے حج اصغر کہا جاتا ہے — کے بالمقابل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ "حج اکبر" قران اور "حج اصغر" افراد کو کہتے ہیں، اسی طرح یوم عرفہ کو بھی۔ "یوم الحج الاکبر" کہا گیا ہے، مگر دلائل وبراہین کی رو سے "یوم النحر" والا قول راجح ہے۔

[2] بخاری ج ۲، ص ۳۸۲، ۳۸۳۔ فی العیدین : باب فضل العمل فی ایام التشریق میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت بایں لفظ ہے۔ "ما العمل فی ایام افضل منھا فی ھذہ، قالوا، ولا الجھاد؟ قال : ولا الجھاد الا رجل خرج یخاطر بنفسہ ومالہ فلم یرجع بشیٔ" مؤلف نے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ ابو داؤد (۲۴۳۸) فی الصوم : باب فی صوم العشر، ترمذی (۷۵۷) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں۔ البتہ جو شخص اپنی جان اپنا مال سب کچھ لے کر نکلے اور ان میں سے کچھ بھی لے کر واپس نہ ہو۔
یہ وہی ایام عشر ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قسم کھائی ہے۔
وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ (الفجر : ۱) قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی۔
یہی وجہ ہے کہ ان دنوں میں کثرت سے "اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ اور الحمد للہ" کہنا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ فاکثروا فیھن من التکبیر والتھلیل والتحمید[1] پس ان دنوں میں کثرت سے تکبیر، تہلیل اور تحمید کیا کرو۔ تمام دنوں کے مقابلہ میں ان دنوں کا مقام و مرتبہ وہی ہے جو تمام دنیا میں مقامات مقدسہ کا ہے۔

ماہِ رمضان، عشرۂ اخیرہ اور شبِ قدر کی فضیلتیں

تمام مہینوں میں ماہ رمضان کو، تمام راتوں میں عشرۂ اخیرۂ رمضان کو اور ہزار مہینوں پر شب قدر کو فوقیت حاصل ہے۔
رہا یہ مسئلہ کہ عشرۂ ذی الحجہ اور رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں سے افضل کون ہے یا شبِ قدر اور شبِ معراج میں افضل کون ہے؟
جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے صحیح یہ ہے کہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی راتوں کو عشرۂ ذی الحجہ کی راتوں پر فضیلت حاصل ہے اور عشرۂ ذی الحجہ کے ایام کو رمضان کے عشرۂ اخیرہ کے ایام پر فضیلت حاصل ہے۔ ایسی صورت میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ جاتا۔ دلیل یہ ہے کہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی راتوں کی فضیلت شبِ قدر کی وجہ سے ہے اور عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت اس کے دنوں کے اعتبار سے ہے کہ اس میں قربانی، عرفہ اور ترویہ کے دن ہیں۔
دوسرے سوال کے جواب میں ہم شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کی تصریحات پیش کریں گے۔ شیخ کے سامنے دو شخصوں کا دعویٰ پیش کیا گیا۔ ایک کا کہنا تھا کہ شبِ معراج شبِ قدر سے افضل ہے اور دوسرے کا دعویٰ اس کے برعکس تھا۔ شیخ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:
الحمد للہ۔ جو شخص شبِ قدر کے مقابلہ میں شب معراج کی افضلیت کا قائل ہے اس کی مراد یہ ہے کہ جس شب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی اور اس کے بعد ہر سال کی وہ شب جو شبِ معراج کے موافق ہو بایں معنی افضل ہیں کہ ان میں ذکر و فکر، دعا و عبادت اور قیام و قعود کو شبِ قدر سے افضلیت حاصل ہے۔ تو یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اس کا مسلمانوں میں کوئی قائل نہیں۔ اسلام سے اس حقیقت کا چونکہ دور کا تعلق بھی نہیں اس لیے اس کا فاسد ہونا واضح ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ بھی اس مفروضہ کی بنیاد پر ہے کہ معراج کی شب متعین ہو مگر یہاں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ رات کس مہینہ میں، کس عشرہ میں ہے اور تعین کے ساتھ کون سی ہے۔ اس سلسلے میں جو روایات منقول ہیں وہ باہم متعارض اور سند کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی حتمی نہیں ہے۔ اور جس شب کو شبِ معراج کہا جاتا ہے اس میں قیام وغیرہ کی کوئی خصوصیت شریعت سے ثابت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی الصوم : باب ماجاء فی العمل فی ایام العشر اور ابن ماجہ (۱۷۲۷) فی الصیام : باب صیام العشر، میں وارد ہے سند صحیح ہے۔

[1] کبیر طبرانی ۳/۱۱۰/۱ میں یہ حدیث عبداللہ بن عباس سے بایں سند حدثنا معاذ بن المثنی، حدثنا مسدد، حدثنا خالد عن یزید بن أبی زیاد عن مجاھد مرفوعاً روایت ہے۔ اس میں آپ کا ارشاد تفصیل سے یوں ہے" مامن ایام اعظم عند اللہ ولا احب الی اللہ العمل فیھن من ایام العشر، فاکثروا فیھن من التسبیح والتحمید والتھلیل والتکبیر"۔ یزید بن ابی زیاد کے علاوہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ یزید محل نظر ہیں اور" فاکثروا فیھن من التسبیح والتحمید والتھلیل والتکبیر" میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے۔ بایں ہمہ منذری نے" الترغیب والترہیب" ج ۲، ص ۲۴ میں اس کی سند کو عمدہ بتایا ہے اور ہیثمی نے" المجمع" میں لکھا ہے کہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

نہیں۔ برخلاف ازیں صحیحین میں شب قدر کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے۔

تحروا لیلۃ القدر فی العشر الاواخر من رمضان [1]

رمضان کے اخیر عشرہ میں شب قدر کو تلاش کرو۔

صحیحین ہی کی روایت سے یہ ارشاد بھی منقول ہے۔

من قام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا غفر لہ ماتقدم من ذنبہ [2]

شب قدر میں جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب کی خاطر قیام کرے اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

پھر یہ بھی ہے کہ قرآن نے اس رات کو ایک ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ اسی رات قرآن کا نزول ہوا، اور اگر دعویدار کی مراد یہ ہے کہ جس متعین رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی اس میں جو کچھ ملا دیگر راتوں میں وہ آپ کو نہ مل سکا۔ بغیر اس کے کہ اس شب میں قیام اور عبادت وغیرہ کی مشروعیت مانی جائے تو یہ صحیح ہے۔ مگر بایں ہمہ کوئی ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مقام پر یا کسی زمانہ میں کوئی رتبہ بخشے تو وہ زمانہ اور جگہ بھی تمام زمانوں اور جگہوں کے مقابلہ میں افضل قرار پائے۔ پھر اس کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا جو انعام ہوا وہ شب قدر کی نعمت قرآنی اور دیگر انعامات کے بالمقابل افضل ہے۔ اس طرح کے مسائل میں ضروری ہے کہ انعامات کی مقدار اور معاملات کے حقائق کا علم ہو۔ اور یہ علم صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب ہمیں اس باب میں کوئی قطعی علم نہیں تو پھر لب کشائی مناسب نہیں۔

پھر کہیں سے ثابت بھی نہیں کہ تمام راتوں بالخصوص شب قدر کے مقابلہ میں شب معراج کی افضلیت کا کوئی قائل ہو۔ اور صحابہ و تابعین شب معراج کا کوئی خصوصی اہتمام نہیں کرتے تھے اور نہ اس کا ذکر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ معراج کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم فضائل میں سے ہونے کے باوجود یہ تعیین نہ ہو سکی کہ وہ کس شب میں ہوئی۔ جب کہ اس زمان و مکان کے لیے کوئی مخصوص عبادت بھی مشروع نہیں کی گئی۔ خود غار حرا، جہاں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی اور نبوت سے پہلے جس کا قصد آپ فرماتے تھے نبوت کے بعد پورے قیام مکہ کے زمانہ میں آپ نے نہ کسی صحابی نے کبھی اس کا قصد کیا جس دن پہلی وحی اتری اس دن کو بھی کوئی عبادتی خصوصیت وغیرہ حاصل نہیں ہوئی۔ جس جگہ اور جس زمانہ میں وحی کی ابتداء ہوئی اسے کسی طرح کا امتیاز نہیں دیا گیا۔ جو حضرات مقامات و ازمنہ کو مذکورہ امور وغیرہ کے پیش نظر عبادات کے ساتھ خاص کرتے ہیں وہ ان اہل کتاب کے مشابہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مختلف اوقات مثلاً یوم ولادت اور یوم تعمید (بپتسمہ کا دن) وغیرہ کو عبادات اور تہواروں کی حیثیت دے دی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار دیکھا کہ کچھ لوگ صلوٰۃ ادا کرنے کے لیے ایک جگہ لپک رہے ہیں، تو پوچھا "یہ کیا ہے؟" بولے "یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ ادا فرمائی تھی"۔ فرمایا "کیا تم اپنے انبیاء علیہم السلام کے نقوش و آثار کو مساجد بنانا چاہتے ہو؟ اگلے وقتوں کے لوگ اسی لیے تو ہلاک ہوئے۔ یہاں جس صلاۃ کا وقت آ جائے اسے پڑھ لے ورنہ آگے بڑھے [3]

---

[1] ۔ صحیح بخاری ج ۴/ص ۲۲۵، فی الصوم: باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر، مسلم (۱۱۶۹) فی الصوم: باب فضل لیلۃ القدر۔ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی۔

[2] ۔ صحیح بخاری ج ۴/ص ۹۸، ۲۲۱، فی الصوم: باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ، ومسلم (۷۵۹) فی الصلوٰۃ: باب الترغیب فی قیام رمضان۔ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی۔

[3] ۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۸۴/۱ بسند صحیح ہے۔

بعض علماء کے نزدیک "شبِ اسراء" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں شبِ قدر سے اور شبِ قدر امت کے حق میں "شبِ اسراء" سے زیادہ افضل ہے۔

یوم جمعہ اور یوم عرفہ میں افضل کون ہے؟

اس سلسلہ میں صحیح ابن حبان کے اندر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لاتطلع الشمس ولا تغرب علی یوم أفضل من یوم الجمعة [۱]

جمعہ سے زیادہ افضل دن پر آفتاب طلوع وغروب نہیں ہوتا۔

صحیح ابن حبان ہی کے اندر ایک اور حدیث اوس بن اوس سے مروی ہے۔

خیر یوم طلعت علیہ الشمس یوم الجمعة [۲] سب سے عمدہ دن جس پر آفتاب چمکے وہ جمعہ کا دن ہے۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے یوم جمعہ کو یوم عرفہ پر فوقیت دی ہے۔ امام احمد کا ایک قول قاضی ابویعلیٰ کی روایت سے یہ ہے کہ شبِ جمعہ شبِ قدر سے بھی زیادہ افضل ہے مگر صحیح یہ ہے کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے تمام دنوں میں اور یوم عرفہ اور یوم النحر سال کے تمام دنوں میں افضل ہے۔ اسی پر شبِ قدر اور شبِ جمعہ کو بھی قیاس کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یوم عرفہ کو جمعہ پڑتا ہے تو دیگر ایام کے مقابلہ میں اسے کئی گنا خصوصیت حسبِ ذیل متعدد اسباب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

۱۔ دو ایسے دنوں کا اکٹھا ہو جانا جو افضل ایام ہیں۔

۲۔ یہ وہی دن ہے جس میں قبولیت دعا کی ایک لازمی گھڑی آتی ہے۔ زیادہ تر اقوال کے مطابق یہ گھڑی عصر [۳] کے بعد کی آخری گھڑی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ موقف (عرفہ) والے سب کے سب دعاء، تفرع اور گریہ وزاری میں مصروف ہوتے ہیں۔

۱۔ صحیح ابن حبان (۵۵۱) سند صحیح ہے۔

۲۔ حدیث کے الفاظ مسلم (۸۵۴) فی الجمعة، ترمذی (۴۸۸) اور نسائی ج ۳، ص ۸۹، ۹۰ کے اور روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اوس بن اوس کی حدیث کے الفاظ صحیح ابن حبان (۵۵۱) میں یوں ہیں۔ ان من افضل ایامکم یوم الجمعة، فیہ خلق اللہ آدم، وفیہ قبض، وفیہ النفخة، وفیہ الصعقة، فاکثروا علی من الصلاة فیہ، فان صلاتکم معروضة علی؛ قالوا: وکیف تعرض صلوتنا علیک، وقد أرمت ای: بلیت فقال: "ان اللہ جل وعلا حرم علی الارض ان تاکل اجسامنا" "تمھارے دنوں میں سب سے افضل جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن حضرت آدم پیدا ہوئے اسی دن ان کی وفات ہوئی۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی دن قیامت کی بیہوشی طاری ہوگی۔ لہٰذا اس دن کثرت سے مجھ پر درود بھیجو کیونکہ تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ نے کہا "ہمارے درود کیونکر آپ پر پیش ہوں گے جب کہ آپ بوسیدہ ہو چکے ہوں گے؟" فرمایا "اللہ جل وعلا نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ ہمارے بدن کو اپنی خوراک بنائے"
حدیث کی سند صحیح ہے۔ ابوداؤد (۱۰۴۷) اور نسائی نے ج ۳، ص ۹۱ میں اس کی تخریج کی ہے۔

۳۔ ابوداؤد نے (۱۰۴۸) فی الصلاة: باب الاجابة ایة ساعة هی فی یوم الجمعة اور نسائی نے ج ۳، ص ۹۹، ۱۰۰۔ فی الجمعة: باب وقت الجمعة میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے" یوم الجمعة ثنتا عشرة یرید ساعة" — لایوجد مسلم یسأل اللہ عزوجل شیئاً الا آتاہ اللہ عزوجل، فالتمسوها آخر ساعة بعد العصر"۔ "جمعہ کے دن بارہ (گھڑیاں) ہیں۔ جو مسلمان بھی کوئی چیز اللہ عزوجل سے مانگتا ہے اسے وہ دے کر رہتا ہے۔ لہٰذا اسے عصر کے بعد کی آخری گھڑی میں تلاش کرو"
اس حدیث کی سند جید ہے۔ حاکم نے ج ۱، ص ۲۷۹ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ نووی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے حسن قرار دیا ہے۔ ترمذی (۴۸۹) میں اس حدیث کا شاہد انس بن مالک کی روایت سے وارد ہے جس کے الفاظ یوں ہیں "التمسوا الساعة التی ترجی فی یوم الجمعة بعد العصر الی غیبوبة الشمس" "اس گھڑی کو تلاش کرو جمعہ کے دن عصر کے بعد سے غروب تک۔ شواہد کے اعتبار سے حدیث کی سند حسن ہے۔ ۱۲۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دن (عرفہ میں) وقوف فرمایا وہ یہی دن تھا۔

۴۔ یہی وہ دن ہے جس میں روئے زمین کے لوگ اپنے اپنے یہاں خطبہ سننے اور ادائیگی جمعہ کے لیے مجتمع ہوتے ہیں بمقام عرفہ میں بھی اہلِ عرفہ، عرفہ کے دن مجتمع ہوتے ہیں۔ اس طرح دعا وعبادت کے لیے مساجد و موقف میں ہر جگہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک ہی دن اجتماع ہوتا ہے، یہ سعادت کسی اور دن کو نصیب نہیں ہوئی۔

۵۔ جمعہ کا دن عید کا دن ہے۔ ایسے ہی عرفہ والوں کے لیے عرفہ کا دن بھی عید کا دن ہے۔ اسی لیے عرفہ میں موجود ہر شخص کے لیے صوم رکھنا مکروہ ہے۔ سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا حسبِ ذیل بیان منقول ہے۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صوم يوم عرفة بعرفة [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے دن عرفہ میں صوم رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

اس حدیث کی سند محلِ نظر ہے۔ کیونکہ مہدی بن حرب عبدی غیر معروف ہے، سند کا دارومدار اسی پر ہے مگر صحیح بخاری کے اندر ام فضل کی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ ان کے یہاں عرفہ کے دن کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صوم کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ آج آپ صوم سے ہیں، بعض کا دعویٰ تھا کہ صوم سے نہیں ہیں۔ ام فضل فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ بھیجا، عرفہ میں اس وقت آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے۔ دودھ کا پیالہ پہنچا تو آپ نے اسے نوش فرمالیا۔ [۲]

عرفہ کے دن صوم نہ رکھنے کی اصل حکمت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے وہ اس لیے تاکہ دعا وعبادت کی طاقت بحال رہے، یہ خیال خرقی وغیرہ کا ہے، ایک گروہ جس میں شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہ بھی ہیں۔ کہتا ہے کہ چونکہ یہ عرفہ والوں کے لیے عید کا دن ہے اس لیے اس دن صوم رکھنا مستحب نہیں ہے، دلیل کے طور پر یہ گروہ وہ حدیث پیش کرتا ہے جو سنن میں وارد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں يوم عرفة ويوم النحر وايام منى عيدنا اهل الاسلام [۳] یوم عرفہ، یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) اور ایام منیٰ (ایام تشریق) ہم مسلمانوں کی عیدیں ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یوم عرفہ، اہلِ عرفہ کے لیے عید اس وجہ سے ہے کہ اسی دن اہلِ عرفہ سب کے سب یہاں مجتمع ہوتے ہیں، دیگر ممالک والوں کا اجتماع چونکہ یوم النحر میں ہوتا ہے اس لیے ان کے حق میں یوم النحر عید کا دن ہوتا ہے۔

۱۔ ابوداؤد (۲۴۴۰) فی الصیام : باب فی صوم عرفة، ابن ماجہ (۱۷۳۲) فی الصیام : باب الصیام یوم عرفة، احمد ج ۲، ص ۳۰۴ و ۴۴۶۔ جیسا کہ مصنف نے تصریح کی ہے اس کی سند مہدی بن حرب عبدی کے غیر معروف ہونے کے باعث ضعیف ہے۔

۲۔ موطا امام مالک ج ۱، ص ۳۷۵ فی الحج : باب صیام یوم عرفة، بخاری ج ۴، ص ۲۰۶ فی الصوم : باب صوم یوم عرفة، مسلم (۱۱۲۳) فی الصیام : باب استحباب الفطر للحاج یوم عرفة، ترمذی (۷۵۱) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان منقول ہے کہ ان سے صوم یوم عرفہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا تو آپ نے اس دن صوم نہیں رکھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو انھوں نے بھی نہیں رکھا، عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو انھوں نے بھی نہیں رکھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو انھوں نے بھی نہیں رکھا۔ میں بھی اس دن صوم نہیں رکھتا نہ رکھنے کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں"۔ حدیث کی سند صحیح ہے۔

۳۔ احمد ج ۴، ص ۱۵۲، ابوداؤد (۲۴۱۹) فی الصوم : باب صیام ایام التشریق۔ الفاظ یہ ہیں "يوم عرفة ويوم النحر وايام التشريق عيدنا اهل الإسلام وهي ايام اكل وشرب" (یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق ہم اہل اسلام کی عیدیں ہیں۔ یہ کھانے پینے کے دن ہیں) سند صحیح ہے۔ ترمذی نے (۷۷۳) کتاب الصوم میں اس کی روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حاکم ج ۱، ص ۴۳۴، نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی ان کے مؤید ہیں۔

حاصل یہ کہ جب عرفہ جمعہ کے دن پڑجائے تو دو عیدیں ایک ہی دن میں اکٹھا ہو جاتی ہیں۔

۶۔ یہی دن امّتِ محمدیہ کے لیے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا دن ہے۔ صحیح بخاری کے مطابق مرفوعًا ثابت ہے کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے یہاں آکر ایک یہودی نے کہا: "امیرالمومنین! آپ اپنی کتاب کے اندر ایک ایسی آیت بھی پڑھتے ہیں کہ اگر ہم یہودیوں پر نازل ہوتی اور یومِ نزول ہمیں اس کا معلوم ہوتا تو یقینًا ہم اسے عید کا دن قرار دیتے۔" فرمایا "وہ کون سی آیت ہے؟" یہودی نے کہا: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" (المائدہ: ۳)۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے وہ دن معلوم ہے جس دن یہ آیت اتری ہے، وہ جگہ معلوم ہے جہاں یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ آیت عرفہ میں جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس وقت آپ کے ساتھ ہم عرفہ میں کھڑے تھے"[۱]

۷۔ یہی وہ دن ہے جس دن سب سے بڑا مجمع اور سب سے عظیم موقف یعنی قیامت کا دن ہوگا۔ قیامت جمعہ کے دن ہی برپا ہوگی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

خير يوم طلعت عليه الشمس يوم الجمعة، فيه خلق آدم، وفيه أدخل الجنة، وفيه اخرج منها، وفيه تقوم الساعة، وفيه ساعة لا يوافقها عبد مسلم يسأل الله خيرا الا أعطاه اياه۔[۲]

سب سے عمدہ دن جس پر آفتاب طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم پیدا ہوئے، اسی دن جنت میں داخل کیے گئے، اسی دن اس سے نکالے گئے، اسی دن قیامت برپا ہوگی، اسی دن کے اندر وہ مبارک گھڑی ہے جس میں جو بندۂ مسلم بھی جس خیر کو بھی اللہ سے مانگتا ہے اللہ اسے دے کر رہتا ہے۔

اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندوں کے لیے ایک ایسا دن مشروع قرار دیا ہے جس میں وہ جمع ہوں اور جمع ہو کر دنیا وآخرت اور جنت وجہنم کو یاد کریں۔ امّتِ محمّدیہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کو ذخیرہ کر رکھا تھا کیونکہ اسی دن دنیا کی ابتدا ہوئی اور اسی دن قیامت بھی آئیگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دن فجر کی نماز میں "سورۂ سجدہ" اور "سورۂ دہر" تلاوت فرمایا کرتے تھے[۳]۔ کیونکہ ان دونوں سورتوں کے اندر اس دن کا ماضی اور مستقبل، تخلیقِ آدم، مبدا ومعاد اور دخولِ جنت وجہنم پر مشتمل مضامین بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس دن آپ لوگوں کو گذرے ہوئے یا پیش آمدہ واقعات وحوادث کو یاد دلاتے تھے۔ اسی طرح یوم عرفہ جو دنیا کا سب سے عظیم اجتماع ہے، پروردگار کے یہاں بعینہٖ اسی دن برپا ہونے والے موقفِ اعظم کی یاد دلاتا ہے۔ اس دن نصف یوم گذرنے سے پہلے پہلے جنتی اور دوزخی اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پہنچیں گے۔

۸۔ جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن نیکو کاری کے جو کام مسلمان کرتے ہیں وہ دیگر ایّام کے بمقابلہ زیادہ ہوتے ہیں حتّٰی کہ بدعملی

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱، ص ۹۷، فی الایمان: باب زیادۃ الایمان ونقصانہ و ج ۸، ص ۲۰۳ فی التفسیر اول سورۃ المائدۃ و ج ۱۳، ص ۲۰۸ فی الإعتصام۔ صحیح مسلم (۳۰۱۷) فی التفسیر۔

[۲] مؤطا امام مالک ج ۱، ص ۱۰۸ فی الجمعۃ: باب ماجاء فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ، مسلم (۸۵۲) و (۸۵۴) فی الجمعۃ: باب فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ، وباب فضل یوم الجمعۃ، ابوداؤد (۱۰۴۶) فی الجمعۃ: باب فضل یوم الجمعۃ، ولیلۃ الجمعۃ۔ ترمذی (۴۸۸) فی الجمعۃ: باب فضل صلاۃ الجمعۃ۔ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔

[۳] بخاری ج ۲، ص ۳۱۴ فی الجمعۃ: باب مایقرء فی صلاۃ الفجر یوم الجمعۃ، مسلم (۸۸۰) فی الجمعۃ: باب مایقرء فی یوم الجمعۃ، نسائی ج ۲، ص ۱۵۹، روایت حضرت ابوہریرہ سے، مسلم (۸۷۹)، ترمذی (۵۲۰)، ابوداؤد (۱۰۷۴)، نسائی ج ۲، ص ۱۵۹، احمد ج ۱، ص ۳۴۳ روایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے۔

اور بدکرداری کے اکثر عادی بھی اس دن اور اس شب کا احترام کرتے ہیں۔ انھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ آج جو شخص بھی معصیت کا مرتکب ہوگا اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بلا مہلت جلد ہی سزا ملے گی۔ تجربات اور واقعات ایسے رونما ہو چکے ہیں جن سے اس مذکورہ حقیقت کا یقین ہو چکا ہے۔ اس دن کی عظمت و جلالت اور برگزیدگی کا نتیجہ ہے کہ بلاشبہ اس دن وقوف کرنا دوسرے دن کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے۔

۹۔ جنت میں ایک ایسا دن بھی ہے جسے "یوم مزید" کہتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جنتی سب کے سب ایک کشادہ وادی میں جمع ہوں گے۔ ان کے اعزاز میں، موتی، سونے اور زمرد و یاقوت کے منبر مشک کے ٹیلوں پر سجائے جائیں گے۔ پروردگار عالم یہاں ان کے رو برو آئے گا اسے سب جنتی کھلی آنکھوں دیکھ سکیں گے[۱] اس مبارک ترین منظر سے شاد کام سب سے پہلے وہی خوش قسمت ہوں گے جو مسجد میں سب سے جلد پہنچتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے قریب تر وہی ہوگا جو امام سے قریب تر ہوگا۔

چنانچہ اہل جنت کو یہاں یوم مزید کا بڑا اشتیاق ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں وہ خاص شرف و عزت پائیں گے۔ یوم مزید بھی جمعہ ہی کا دن ہوگا۔ اب یہی دن عرفہ کا بھی ہو تو اسے ایک ایسا امتیاز حاصل ہو جاتا ہے جو کسی اور دن کو نہیں ہوتا۔

۱۰۔ یوم عرفہ کی شام، پروردگار عالم اہل موقف سے قریب ہو کر فرشتوں سے فخریہ انداز میں فرماتا ہے:

ما اراد هؤلاء، اشهدکم انی قد غفرت لهم[۲]

میرے بندے کیا چاہتے ہیں، تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انھیں بخش دیا۔

یہاں بندوں سے اللہ کی قربت کے علاوہ قبولیت کی وہ گھڑی بھی ہوتی ہے جس میں کسی خیر کی دعا کرنے والے کی

۱۔ اسی طرح کی روایت امام شافعی نے کتاب الام ج ۱، ص ۱۸۵ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ سند کے اندر ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمی متروک ہے۔ موسیٰ بن عبیدہ ربذی بھی ضعیف ہے۔ طبری نے حدیث کی تخریج جامع البیان ج ۲۶، ص ۱۷۵ میں ذرا تفصیل سے کی ہے۔ مگر سند کے اندر عثمان بن عمیر بجلی ضعیف ہے۔

۲۔ مسلم نے (۱۳۴۸) فی الحج: باب فضل الحج والعمرة میں حضرت عائشہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ مگر اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ " أشهدكم أني قد غفرت لهم "۔ ابن خزیمہ ج ۱۷/۲۷۹ / ۲" ابن حبان (۱۰۰۶) اور بغوی نے شرح السنة (۱۹۳۱) میں جو ہماری تحقیق سے شائع ہوئی ہے۔ حضرت جابر کی روایت حسب ذیل الفاظ میں پیش کی ہے " قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كان يوم عرفة ان الله ينزل الى السماء الدنيا، فيباهي بهم الملائكة فيقول: انظروا الى عبادي اتوني شعثا غبرا ضاحين من كل فج عميق اشهدكم اني قد غفرت لهم " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نچلے آسمان پر نزول فرماتا ہے اور فرشتوں سے فخریہ کہتا ہے! دیکھو میرے ان بندوں کو میرے یہاں پراگندہ، غبار آلود، دور دراز راہوں سے گرمی اور تکان کی مشقت برداشت کر کے آئے ہیں۔ میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ انھیں بخش دیا ہے۔ اس کے راویوں میں ابو زبیر کے علاوہ سب ثقہ ہیں۔ ابو زبیر مدلس ہے۔ منذری نے ترغیب و ترہیب ج ۲، ص ۱۲۸ میں انس بن مالک سے یہ روایت درج کی ہے " وقف النبي صلى الله عليه وسلم بعرفات وكادت الشمس ان تؤوب فقال يا بلال: أنصت لي الناس، فقام بلال فقال: انصتوا لرسول الله صلى الله عليه وسلم. فانصت الناس، فقال: معاشر الناس، اتاني جبريل آنفا فأقرأني من ربي السلام وقال: إن الله غفر لأهل عرفات واهل المشعر، وضمن عنهم التبعات، فقام عمر بن الخطاب فقال" يا رسول الله هذا لنا خاصة؟ قال هذا لكم ولمن أتى من بعدكم إلى يوم القيامة۔ فقال عمر بن الخطاب كثر خير الله وطاب " (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں وقف فرمایا۔ سورج اس وقت ڈوبنے کے قریب تھا۔ فرمایا: بلال، لوگوں کو خاموش کرو، بلال نے کھڑے ہو کر کہا: لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرمانا چاہتے ہیں خاموش ہو جاؤ، لوگ خاموش ہوئے تو فرمایا، لوگو! جبریل نے ابھی آکر مجھے پروردگار کا سلام پہنچایا اور کہا: " اللہ نے اہل عرفات اور اہل مشعر سب کو بخش دیا۔ اور ان کی تمام مسؤلیتوں کی ضمانت بھی لے لی ہے " عمر بن خطاب نے کھڑے ہو کر فرمایا " رسول اللہ! کیا صرف ہمارے لیے یہ خاص ہے؟ فرمایا: تمھارے لیے بھی اور تمھارے بعد آنے والوں کے لیے بھی۔ قیامت تک۔ عمر بن خطاب نے فرمایا " بڑا زیادہ اللہ کا کرم اور خوب ہے "۔ سند صحیح ہے۔

درخواست اللہ مسترد نہیں کرتا۔

اس طرح ذکر و فکر اور دعا و تضرع کے ذریعہ اس ساعت میں بندے اللہ سے قریب ہو جاتے ہیں اور بندوں سے اللہ کی قربت بھی دو طرح کی ہو جاتی ہے۔ ایک یہ کہ اس مبارک ساعت میں وہ بندوں کی دعا کو شرف قبول بخشنے کے لیے قریب ہو جاتا ہے۔ دوسری خصوصی طور پر اہلِ عرفہ سے اس کی قربت اور ان کے بارے میں فرشتوں سے فخر و مباہات ہے۔ غرض اس مبارک دن میں اہل ایمان کے قلوب مذکورہ تمام سعادتوں سے معمور ہو جاتے ہیں۔ انھیں طاقت پر طاقت ملتی ہے، خوشی و مسرت، فرحت و انبساط اور فضلِ الٰہی سے امیدیں وابستہ کرنے کا عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔

مذکورہ وجوہ و اسباب کی بنا پر یوم جمعہ کا وقفہ یقیناً دیگر ایام کے وقفوں کے مقابلہ میں افضل ہے۔ باقی عوام الناس کا یہ کہنا کہ اس دن کا حج بہتّر حج کے برابر ہے، باطل ہے۔ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ کسی صحابی سے، نہ کسی تابعی سے۔ واللہ اعلم۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی ہر جنس سے اسی کو منتخب اور اپنے لیے مخصوص فرمایا ہے جو پاکیزہ اور طیب ترین ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاکیزہ ہی کو پسند کرتا ہے۔ قول و عمل اور صدقہ و خیرات میں قبولیت کا تمغہ اس شئے کو حاصل ہوتا ہے، جو پاکیزہ ہوتی ہے، پس قاعدہ کے مطابق ہر پاکیزہ شئے اللہ کی پسندیدہ اور چیدہ ہوا کرتی ہے۔ باقی اللہ کی مخلوقات دونوں ہی نوعیتوں کی ہوتی ہیں۔ اسی سے بندہ کی سعادت اور شقاوت کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ پاکیزہ کو مناسبت پاکیزہ ہی سے ہوگی۔ اسی سے اسے خوشی، اسی سے سکون اور اسی پر اس کے دل کو اطمینان بھی ہوگا، گفتار میں بہر حال وہ ایسے ہی پاکیزہ کلام کو پسند کرے گا جس کے ماسوا بارگاہ ایزدی میں اور کسی کلام کو رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ بدگوئی، بدزبانی، دریدہ دہنی، کذب بیانی، غیبت، چغلخوری، بہتان طرازی، جھوٹی شہادت اور ہر ناروا اور گندی بات سے یقیناً اسے سخت نفرت ہوگی۔

اسی طرح اعمال میں بھی اسے پاکیزہ اعمال ہی سے اُنس ہوگا۔ اور یہ اعمال وہی ہیں جن کے حسن پر شریعتِ نبویہ کے ساتھ فطرتِ سلیمہ بھی ہم آہنگ ہو اور عقلِ صحیح نے انھیں پاکیزہ قرار دیا ہو گویا فطرت، شریعت اور عقل کو ان کے حسن پر اتفاق ہے مثلاً یہ کہ الٰہ واحد کی عبادت کرے کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائے۔ اپنی مرضی پر اللہ کی مرضی کو ترجیح دے۔ حتی الامکان اللہ کے یہاں محبوبیت کا طالب ہو اور اس کی مخلوقات کے ساتھ حسبِ طاقت حسن سلوک کرے، معاملہ ان کے ساتھ ویسا ہی کرے جیسا خود اپنے لیے اُن سے چاہے اور نصیحت انھیں وہی کرے جو خود اپنے حق میں پسند کرے، فیصلہ بھی وہی دے جو اپنے حق میں دینا پسند کرے، ان کا بوجھ اٹھالے مگر اپنا بار ان پر ڈالنا پسند نہ کرے۔ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور ان کی جانب سے کی گئی آبروریزی کا مقابلہ آبروریزی سے نہ کرے۔ ان کی خوبیوں کا چرچا کرے مگر خامیوں کو چھپانے کی کوشش کرے۔ اللہ کے کسی امر و نہی اور شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو تو حتی الامکان ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر انھیں معذور سمجھے۔ اس کے اخلاق بھی انتہائی پاکیزہ اوصاف ستھرے ہوں۔ حلم، وقار، صبر، رحم، وفاداری، صداقت، نرم روی، خوش خلقی، شفقت، عفت، شجاعت، سخاوت اور مروت کا مرقع ہو، بغض و حسد، دشمنی اور کینہ پروری کے جذبات سے سینہ کو پاک رکھے، ایمان والوں کے حق میں نرم، منکسر اور متواضع، اللہ کے دشمنوں کے خلاف نہایت سخت، اللہ کے ماسوا دوسروں کے آگے اپنی آن کا محافظ، غرض ان تمام اوصاف سے متصف ہو جنھیں عقل و شریعت اور فطرتِ سلیم کی بارگاہ سے سندِ تحسین حاصل ہو۔

اسی طرح غذاؤں کے اندر بھی وہ پاکیزہ اشیاء ہی کو پسند کرے، یعنی حلال اور طیب غذائیں جو خوش گوار ہوں، بلا مشقت معدہ کے اندر اتر جاتی ہوں، جسم و روح کے لیے بہترین غذائیت کی حامل ہوں اور بندہ ان کی پاداش سے محفوظ بھی ہو۔

رشتے ناطے بھی پاکیزہ اور صاف ستھرے اختیار کرے، خوشبو بھی پاکیزہ ترین اور خوش گوار تر ہو۔ اور دوست و احباب بھی پاک ہوں۔ غرض اس کی رُوح بھی پاک، جسم بھی پاک، اخلاق بھی پاک، عمل بھی پاک، گفتگو بھی پاک، غذا بھی پاک، لباس بھی پاک، قرابت داری بھی پاک، ظاہر بھی پاک، باطن بھی پاک، معاد بھی پاک اور معاش بھی پاک، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○
(النحل : ۳۲)

جن کی رُوح فرشتے اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ السلام علیکم، تم جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے سبب۔

یہ وہ لوگ ہیں جن سے پاسبانِ فردوس بایں طور ہم کلام ہوں گے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ (الزمر : ۷۳)

السلام علیکم۔ تم مزہ میں رہو، سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔

فادخلوھا میں فاء کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی پاکیزگی کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ○
(النور : ۲۶)

گندی عورتیں (ہمیشہ) گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں، اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔

آیت کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ گندی باتیں گندے انسانوں کی اور پاکیزہ باتیں پاکیزہ لوگوں کی ہوتی ہیں۔ اور دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ اور گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے۔ مگر آیت کا مفہوم عام ہے۔ پاکیزہ گفتگو، پاکیزہ اعمال اور پاکیزہ عورتیں ان کے مناسبِ حال پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں۔ ناپاک گفتگو، ناپاک اعمال، ناپاک عورتیں ان کے مناسب ناپاک انسانوں کا نصیب ہیں۔ یہی حقیقت بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام پاکیزہ چیزوں کو جنات الفردوس اور تمام ناپاک اشیاء کو جہنم میں رکھا ہے۔ اس طرح تین مقامات ہو گئے۔ ایک وہ جو صرف پاکیزہ لوگوں کے لیے مخصوص ہے اور ناپاکوں کے لیے حرام اور وہ جنت ہے۔ دوسرا وہ جو صرف ناپاکوں کے لیے مخصوص ہے اور پاکبازوں پر حرام ہے اور وہ دوزخ ہے۔ تیسرا وہ جہاں پاک و ناپاک سب مخلوط ہیں وہ یہی دنیا ہے۔ چونکہ یہاں دونوں طرح کے انسان مخلوط رہتے ہیں اس لیے حکمتِ الٰہی کے تقاضا میں ابتلا و آزمائش کا قانون یہاں نافذ ہوا۔ آگے دوسری دنیا کے اندر پاک اور ناپاک دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا جائے گا۔ پاک کو الگ جگہ ملے گی جہاں ان کے سوا اور دوسرے نہ ہوں گے، ناپاکوں کو الگ جگہ ملے گی جہاں ان کے علاوہ اور کوئی نہ رہے گا۔ اس وقت صرف دو ہی مقامات ہوں گے۔ ایک جنت جو پاک انسانوں کا مقام، دوسرا جہنم جو ناپاکوں کا مقام ہو گا۔ دونوں گروہوں کے جو اعمال ہوں گے انھیں پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہو گا۔ چنانچہ پہلے گروہ کے پاکیزہ اعمال و اخلاق بعینہ ان کے لیے نعمتیں اور لذتیں قرار پائیں گے اُن اعمال و اخلاق سے اللہ تعالیٰ ان کے لیے سرور و نعمت کے مکمل ترین اسباب فراہم کرے گا۔ اسی طرح دوسرے گروہ کے ناپاک اعمال و اخلاق بعینہ ان کے حق میں مصائب و آلام ثابت ہوں گے۔ ان اعمال و اخلاق سے اللہ تعالیٰ ان کے لیے عذاب و آلام کے عظیم ترین اسباب پیدا کرے گا۔ یہ انجام غایت درجہ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی بالادستی پر مبنی ہے۔

تاکہ بندگانِ حق ایک جانب اللہ کے کمالِ ربوبیت، کمالِ حکمت، کمالِ علم، کمالِ رحمت اور کمالِ عدل کے مظاہر دیکھ لیں تو دوسری جانب دشمنانِ حق کو یہ نظر آجائے کہ افترا پرداز اور جھوٹے وہ خود تھے نہ کہ تقدس مآب اور صداقت شعار اللہ کے پیغمبر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ۙ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝ (النحل: ۳۸-۳۹)

اور ان لوگوں نے بڑا زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھائیں کہ جو مرجاتا ہے اللہ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ کیوں نہیں، زندہ کرے گا۔ اس وعدے کو تو اللہ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے، مگر اکثر لوگ یقین نہیں لاتے تاکہ جس بات میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کے روبرو اس کا اظہار کر دے اور تاکہ کافر یقین کے ساتھ جان لیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بختی اور بدبختی کے لیے ایک ایسا عنوان بنایا ہے جس سے دونوں گروہوں کو پہچانا جا سکتا ہے، چنانچہ بندۂ نیک بخت اور پارسا کے شایانِ شان صرف پاک شے ہوگی وہ پاکیزہ مقام پر آئے گا پاکیزہ افعال ہی اس سے صادر ہوں گے، پاکیزہ معاشرت ہی میں رہنا پسند کرے گا۔ مگر ناپاک بدبخت کے لائق صرف ناپاک شے ہی ہوگی۔ ناپاک ہی مقام پر وہ آئے گا، ناپاک ہی اعمال انجام دے گا۔ خبیث کے قلب سے خباثت ہی پھوٹ کر ظاہر ہوگی۔ اور مردِ پاک کے قلب سے پاکیزگی ہی ابھر کر زبان اور اعضا پر ظاہر ہوگی۔ کبھی ایک ہی شخص کے اندر دونوں مادے ہوتے ہیں۔ مگر جس مادے کا غلبہ ہوتا ہے وہ اسی مادہ کے لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ بھلائی منظور ہوتی ہے تو اپنے یہاں آنے سے پہلے اسے خبیث مادہ سے پاک و صاف کر دیتا ہے، اس طرح وہ قیامت کے روز پاک و صاف اور مطہر حالت میں اللہ کے حضور پہنچے گا۔ جہنم کے ذریعہ اسے پاک کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اسے اسی دنیا کے اندر توفیق دے دیگا کہ وہ سچی توبہ اور نیکوکاریوں کے ذریعہ نیز مصائب و آلام کی بھٹی میں تپ کر ایسا کندن بن جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پہنچے تو اس پر گناہ اور خطا کاریوں کا کچھ بھی زنگ باقی نہ رہے اور اگر اللہ کی رضامندی اس کے ساتھ بہتری کی نہیں ہے تو تطہیری ذرائع اس سے روک دیتا ہے حتیٰ کہ قیامت کے روز جب دونوں مادوں کے ساتھ (خبیث و طیب) یہ بندہ اللہ سے ملاقات کرے گا تو اس کی حکمت کو یہ منظور نہ ہوگا کہ کوئی اس کے گھر میں اپنی خباثتوں کے ساتھ داخل ہو۔ اس لیے اسے پاک و صاف کرنے کے لیے جہنم میں داخل کرے گا اور جب گناہوں کے میل کچیل سے اس کا جوہرِ ایمان نکھر کر بالکل پاک و صاف ہو جائے گا تو اللہ کے جوار میں جگہ پانے اور پاکیزہ بندوں کی صف میں شامل ہونے کا اہل ہو سکے گا۔ یہ لوگ جہنم میں اسی وقت تک رہیں گے جب تک ان کی ناپاکیاں دور نہ ہو جائیں۔ جن لوگوں کی گندگیاں جلد دور ہو جائیں گی وہ جلد اور جن کی دیر میں دور ہوں گی وہ دیر میں اس سے نکل سکیں گے۔ پورا پورا بدلہ ہوگا۔ ذرہ برابر بھی ظلم و ناانصافی کی کوئی بات نہ ہوگی۔ مشرکین چونکہ اپنے جوہر اور اپنی ذات سب میں خبیث ہوتے ہیں اس لیے جہنم بھی ان کی خباثت دور نہیں کر سکے گی جیسے کتا دریا میں نہا لینے کے بعد بھی کتا ہی رہے گا۔ پاک نہ ہوگا۔ اس لیے جنت ان پر حرام ہے۔ مومن چونکہ خباثتوں سے پاک و صاف اور مطہر ہوتا ہے اس لیے جہنم اس پر حرام ہے۔ کیونکہ اس میں خباثت اور ناپاکی کا کوئی ایسا شائبہ موجود نہیں جسے آگ کے ذریعہ زائل کرنے کی ضرورت ہو۔

پاک ہے وہ ذات جس کی حکمت حیرت انگیز ہے اور جس کے حق میں فطرت و دانش گواہی دیتے ہیں کہ احکم الحاکمین وہی، رب العالمین وہی اور وہی وہ ہستی ہے کہ جس کے ماسوا کوئی اور لائق عبادت نہیں۔

رسولوں کی بعثت ـــ ضرورت اور اہمیّت

یہیں سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہر ضرورت سے بڑھ کر بندوں کی ضرورت یہ ہے کہ رسول اور آپ کے لائے ہوئے دین کی معرفت حاصل کریں، جن امور کی آپ نے خبر دی ہے ان کی تصدیق اور جو احکام آپ نے دیئے ہیں ان میں آپ کی اطاعت کریں۔ کیونکہ دنیا و آخرت میں فلاح و سعادت کی کوئی سبیل ہے تو صرف وہی ہے جو رسولوں کے ہاتھوں کھلی ہے۔ پاک و ناپاک کی تفصیلی معرفت صرف انہی سے حاصل ہو سکتی ہے، قطعی طور پر رضائے الٰہی کا حصول صرف انہی کی ذات پر موقوف ہے۔ پاک اعمال و اقوال اور اخلاق صرف انہی کی سیرت اور انہی کی لائی ہوئی شریعت میں ہیں۔ انھیں کے اقوال و اعمال اور اخلاق پر دوسروں کے اقوال و اعمال اور اخلاق تولے جائیں گے۔ انھیں کی اطاعت و پیروی سے اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز ہوگا۔ پس بندوں کو ان کی جو ضرورت ہے وہ بدن کو رُوح کی، آنکھ کو روشنی کی اور روح کو زندگی کی ضرورت سے بھی بڑھ کر ہے۔ الغرض کوئی ضرورت بھی فرض کی جائے بندوں کے لیے رسولوں کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ کیا خیال ہے اس ہستی کے بارے میں کہ ایک لمحے کے لیے بھی تم سے اس کا اسوہ اور لایا ہوا نظامِ اطاعت اوجھل ہو جائے تو تمھارا قلب فاسد اس مچھلی کے مانند ہو جائے جو پانی سے نکل کر مچھیرے کی ٹوکری میں چلی جائے۔ رسولوں کے لائے ہوتے طریقوں سے جدا ہو کر دل کا حال ایسا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر، مگر اس کا احساس زندہ دلوں ہی کو ہو سکتا ہے، مردہ دلوں پر اس کا کیا اثر ؎

مالجرح بمیّت إیلام[1] (کسی مردہ کو زخموں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔)

اس جہانِ آب و گل اور جہانِ آخرت دونوں میں فلاح و سعادت کا مدار چونکہ اسوۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے لہٰذا جو بھی اپنے حق میں خیر خواہی اور نجات و خوش بختی کا خواہاں ہے اس کے لیے لازم ہے کہ آپ کے اسوہ کا، سیرت کا اور حالاتِ طیّبہ کا مطالعہ کرے۔

اور اس حد تک مطالعہ کرے کہ جہالت کی تیرگی سے نکل کر علم کی روشنی میں آجائے۔ اور اس علم کی روشنی میں اپنی زندگی کو روحانیت اور حیات کے ولولوں سے معمور کر کے متبعین کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ اس باب میں لوگ تین طرح کے ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ کوئی محروم۔ والفضل بید اللہ یوتیہ من یشاء۔

یہ چند کلمات پیشِ خدمت ہیں۔ جو انسان بھی اپنے نبی، نبی کی سیرت اور اس کے لائے ہوئے نظامِ حیات سے واقف ہونے کا کچھ بھی حوصلہ رکھتا ہو وہ ان کلمات کی معرفت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

یہ کلمات بے بضاعتی اور بے سروسامانی کے باوجود حضر میں نہیں، حالتِ سفر میں اس عاجز گنہگار بندے کے قلم سے نکلے ہیں، حال یہ ہے کہ قلب کی ہر وادی میں ایک دراڑ موجود، حوصلے بکھرے ہوئے مراجع مفقود، جو لوگ درِ علم وا کر سکتے تھے وہ غیر موجود، سعادتِ دارین کا ضامن "علم نافع" اپنی بہار کھو چکا، اب وہاں ویرانی کا راج ہے، عالم کی زبان، مریضانِ قلب و نظر سے کشمکش کرتے کرتے تشنہ لب اور اس کے نیچے شفاء روحانی کا جو مورد تھا وہ انحراف و تحریف کی کثرت سے

---

[1] یہ "متنبی" کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے پہلا مصرعہ یہ ہے:
من یھن یسھل الھوان علیہ (جو انسان فی نفسہٖ ذلیل ہوتا ہے اس کے لیے ذلت برداشت کر لینا آسان ہوتا ہے۔
یہ شعر "دیوانِ متنبی" ج ۴، ص ۲۷۷ کے اس قصیدے کا ہے جس میں "ابو الحسین علی بن احمد مری خراسانی" کی تعریف کی گئی ہے۔

زہر بن چکا لہذا صبرِ جمیل کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ اللہ ہی کا سہارا ہے، وہی اس کا حامی و ناصر ہے وَھُوَ حَسْبُنَا وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب

آپ کا نسب تمام انسانوں میں سب سے بہتر، سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف ہے اس کی شہادت دشمن بھی دیتے تھے۔ شاہِ روم کے دربار میں آپ کا دشمن "ابو سفیان بن حرب" اس کی شہادت دے چکا ہے۔ سب سے اشرف آپ کی قوم، سب سے اعلیٰ آپ کا قبیلہ اور اس قبیلے کی سب سے افضل وہ شاخ ہے جس میں آپ پیدا ہوئے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اسماعیل ہی ذبیح ہیں

عدنان تک ماہرینِ انساب کا اتفاق اور ان سے اوپر کی بابت اختلاف ہے۔ مگر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عدنان اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ صحابہ و تابعین اور ما بعد کے علماء کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا دعویٰ بیس سے زائد وجوہ سے غلط ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ اس دعویٰ کا ماخذ اہلِ کتاب ہیں۔ دعویٰ کے غلط ہونے کی صراحت ان کی کتاب کے اندر صاف طور پر موجود ہے پھر بھی حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا ہے۔ تورات کے اندر ایک جگہ واضح طور پر آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پہلوٹھی اولاد ذبح کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت کے مطابق پہلوٹھی کے بجائے "اکلوتی اولاد" کے الفاظ وارد ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ "اہلِ کتاب" کو بھی اس حقیقت میں شک نہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی آپ کی پہلوٹھی اولاد ہیں۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے قائلین کو دھوکہ اصل میں اس وجہ سے ہوا کہ تورات کا جو نسخہ ان کے یہاں موجود ہے اس میں یوں آیا ہے۔

"اذبح ابنك اسحٰق" اپنے بیٹے اسحٰق کو ذبح کرو۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں "یہ اضافہ اہلِ کتاب کی تحریف اور کذب بیانی ہے۔ کیونکہ اس طرح کی صراحت مذکورہ بالا توراتی بیان "پہلوٹھی یا اکلوتی اولاد" کی تصریح کے خلاف ہے۔ مگر بنو اسماعیل کے اس شرف پر یہود کو حسد ہوا اور انھوں نے چاہا کہ یہ شرف عربوں کے بجائے ان کو حاصل ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں۔ اس کی مرضی تو یہ ہے کہ فضل و کمال ان کو ملے جو اس کے مستحق ہیں آخر حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینا کیونکر مناسب ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی والدہ کو "اسحٰق" اور ان کے بعد ان کے بیٹے "یعقوب" کی بشارت بیک وقت دی تھی۔ فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب فرشتوں نے خوشخبری دی تو یہ کہا:

لہ۔ صحیح بخاری ج ۱، ص ۳۲ میں ابوسفیان کی گفتگو کی پوری تفصیل آئی ہے۔ اس کا ایک جزو یہ ہے: پہلی بات جو اس نے (شاہِ روم نے) دریافت کی وہ یہ تھی "تم میں اس کا نسب کیسا ہے؟" میں نے کہا "ہم میں وہ صاحبِ نسب ہے۔"

لَاتَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ[۱] ۝ (هود : ۷۰، ۷۱)

ڈرو نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی تھیں، وہ یہ سن کر ہنس دیں، پھر ہم نے اسے اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔

ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ زوجۂ ابراہیم کو بیٹے کی بشارت دے پھر اسے ذبح کا حکم دے جب کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام بھی بشارت میں بلاشبہ داخل ہیں، حضرت اسحٰق علیہ السّلام اور حضرت یعقوب علیہ السّلام دونوں کی بشارتیں آیت میں یکجا موجود ہیں۔ کلام کا یہی ظاہری مفہوم بھی ہے اور یہی اس کے سیاق سے عیاں بھی ہے۔

ایک اعتراض جو بات تم کہہ رہے ہو وہ اگر صحیح ہوتی تو یعقوب اسحٰق پر عطف ہو کر مجرور رہتا اور قرأت یوں ہوتی۔ " وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ " یعنی " وَيَعْقُوْبَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ " ؟

جواب رفع کی قرأت سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام مبشَّر بہ قرار نہ پائیں۔ کیونکہ بشارت مخصوص قول ہے اور یہ نام ہے "اولین خوشکن اور سچی خبر کا"۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد " وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ " ایک ایسا جملہ ہے جو بشارت کے لیے مطلوبہ سارے اوصاف کو شامل ہے۔ لہٰذا یہ جملہ بشارت (خوشخبری) ہوا۔ بلکہ بشارت اصل میں جملہ خبریہ ہی ہے اور چونکہ بشارت ایک قول ہے لہٰذا اس جملہ کا محل اعراب حکایت بالقول کی بنیاد پر نصب ہوگا۔ گویا معنیٰ یہ ہوگا کہ وَقُلْنَا لَهَا : " مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ "، (اور ہم نے اس سے کہا کہ اسحٰق کے بعد یعقوب) جب یہ کہا جاتا ہے کہ : " بشّرتُ فلانا بقدوم أخيه وثقله في اثره " (فلاں کو میں نے اس کے بھائی کے آنے کی خوشخبری دی اور اس کا سامان اس کے پیچھے ہے)، تو لامحالہ یہاں دونوں باتوں کی خوشخبری ایک ساتھ سمجھی جائے گی۔ اس میں کوئی سمجھ دار آدمی شک نہیں کر سکتا۔ پھر ایک وجہ اور ہے جس کے باعث جر کی قرأت ضعیف ہے " مررت بزيد ومن بعده عمرو " کا جملہ مثال کے طور پر سامنے رکھو۔ اس میں ضعف ہے کیونکہ "حرفِ عطف" یہاں "حرفِ جر" کا قائم مقام ہے اس لیے جس طرح "حرفِ جر" اور مجرور کے مابین فصل نہیں ہو سکتا اسی طرح اس جگہ حرفِ عطف اور مجرور کے درمیان فصل نہیں ہوگا۔

حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے ذبیح ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ سورہ صافات میں جہاں ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے ذبیح فرزند کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (صافات : ۱۰۳-۱۱۱)

آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا، اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں یقیناً یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں

---

[۱] "یعقوب" میں قرأتوں کا اختلاف ہے۔ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو، کسائی اور ابوبکر کی قرأت عاصم کے حوالہ سے رفع کی ہے اور ابن عامر، حمزہ اور حفص کی قرأت انہی عاصم کے حوالہ سے نصب کی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ رفع کی صورت میں (عربی قواعد کے لحاظ سے) دو ترکیبیں ہوں گی ایک یہ کہ یعقوب مبتدا موخر یعنی تقدیم ہے یعنی اسحٰق کے بعد یعقوب ہوں گے، دوسری ترکیب میں "یعقوب" فعل محذوف کا فاعل ہوگا یعنی وثبت لها من وراء اسحٰق يعقوب۔ جن لوگوں نے یعقوب کو منصوب پڑھا ہے انھوں نے معنی پر محمول کیا ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے انھیں بطورِ ہبہ اسحٰق اور بطورِ ہبہ یعقوب دیئے۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۱۳۲)

دی، اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی، سلام ہے ابراہیم پر، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں، وہ ہمارے مومن بندوں میں تھا۔

اس کے بعد

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (صافات: ۱۱۲)

اور ہم نے اسے اسحٰق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔

یہ بشارت اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صبر و ثبات کے صلہ میں دی گئی تھی کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں جس بیٹے کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی جارہی ہے وہ پہلا بیٹا نہیں ہے، آیت کے اندر یہ حقیقت تقریباً صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

اعتراض دوسری بشارت تو حضرت اسحٰق علیہ السلام کے نبی ہونے کی ہے۔ یعنی باپ نے جب حکمِ الٰہی پر صبر کیا اور بیٹے نے سرِ تسلیم خم کر دیا تو بیٹے کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔

جواب یہاں خوشخبری دونوں کی ہے، بیٹے کے وجود کی بھی اور اس بات کی بھی کہ وہ نبی ہوں گے۔ اسی لیے حال مقدّر کے طور پر "نَبِیًّا"، منصوب ہے۔ یعنی ان کی نبوت بھی مقدر ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بشارت اصل کے مطابق آئی ہو مگر اسے ایسی حالت سے مخصوص کر دیا جائے جو بطور اضافہ کے ہو۔ کلام میں اس طرح کی تعبیر ناممکن ہے۔ یہاں بشارت اگر نبی ہونے کی ہے تو وجود کی کہیں زیادہ اولیٰ اور انسب ماننا پڑے گی۔

پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ قربان ہونے والا بچہ مکہ میں تھا۔ یوم النحر کو مکہ کے اندر قربانیاں دینے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جیسا کہ سعی بین الصفا و المروہ اور رمی جمرات بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی یاد اور ذکرِ الٰہی کا نظام قائم کرنے کے لیے مشروع ہے۔ ظاہر ہے مکہ میں یہی دونوں تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی والدہ یہاں کب آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قربانی کی جگہ اور زمانہ بھی خانہ کعبہ سے متصل ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں مشترکہ طور پر عمل میں آئی، مکہ میں قربانیاں اس گھر کے حج و زیارت کا تکملہ ہیں جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی جگہ اور اسی زمانہ میں تعمیر فرمایا تھا۔ اہلِ کتاب اور ان کے مؤیدین کے مطابق اگر قربانی کا واقعہ سرزمینِ شام میں پیش آیا ہے تو قربانیاں مکہ میں نہیں شام میں دی جاتیں۔

ایک اور پہلو سے غور کیجیے! اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ذبیح کو حلیم کہا ہے، مگر حضرت اسحٰق علیہ السلام کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں انھیں علیم کی صفت سے یاد کیا ہے۔ اس لیے کہ اس شخص سے زیادہ بردبار کون ہو سکتا ہے جو اپنے رب کی فرماں برداری میں اپنا نفس ذبح کے لیے پیش کر دے۔

ارشادِ باری ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○ (الذاریات: ۲۴، ۲۵)

کیا ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمھیں پہنچی ہے جب اندر آئے اس کے پاس کہا آپ کو سلام ہے اس نے کہا آپ لوگوں کو بھی سلام ہے۔ کچھ ناآشنا سے لوگ ہیں۔

آگے فرمایا:

قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○ (الذاریات: ۲۸)

انھوں نے کہا ڈریئے نہیں اور اسے ایک ہوشیار لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔

بلاشبہ یہ حضرت اسحٰق علیہ السّلام ہی ہیں۔ کیونکہ بیوی سے پیدا ہی ہوئے، یہاں خوشخبری بیوی کو دی جا رہی ہے، حضرت اسماعیل علیہ السّلام تو لونڈی کی اولاد ہیں[1]۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کی بیوی کو بشارت بڑھاپے میں اور تولید کی صلاحیت سے مایوس ہو جانے کی حالت میں دی جا رہی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السّلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ پہلے پیدا ہو چکے تھے۔

ایک دوسرا پہلو اور ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ پہلوٹھی اولاد سے والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے۔ پروردگار سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جب اولاد کی دعا کی اور وہ قبول ہوئی تو نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچّے کی محبت ان کے نہاں خانۂ قلب میں جاگزیں ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ خلیلیّت وہ منصب ہے جو محبت میں ایک ہی محبوب کا متقاضی ہے اس محبّت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ مگر نومولود بچّے نے باپ کے دل کا ایک گوشہ جب حاصل کر لیا تو غیرتِ خلیلیّت نے قلبِ خلیل سے اس گوشہ کو چھین لینا چاہا۔ چنانچہ ذبحِ محبوب کا حکم ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دل میں بیٹے کی محبّت اللہ کی محبّت کے مقابلہ میں ہیچ تھی، چنانچہ بیٹے کو ذبح کر دینے کا اقدام فرمایا تو خلیلیت ہر شائبہ سے پاک ہو کر آشکارا ہوگئی۔ لہٰذا ذبح کی اب کوئی ضرورت نہ رہی کیونکہ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ عزم ہو جائے اور نفس آمادہ، چنانچہ مقصود پورا ہوا۔ اس لیے حکم منسوخ، ذبح کا فدیہ دیا گیا، خلیل نے خواب کو سچ کر دکھایا، پروردگار کی رضا حاصل ہوئی۔ ظاہر ہے یہ آزمائش پہلی اولاد کے موقع ہی پر پیش آئی۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ خلیلیت کو طیش پہلی اولاد کو چھوڑ کر

---

[1] اہلِ کتاب سیدہ ہاجرہ کے درجہ کو گھٹانے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ لونڈی تھیں۔ "صحیح بخاری" "کتاب الھبہ/۳۶" میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : ھاجر ابراھیم بسارۃ فاعطوھا ھاجر فرجعت فقالت اشعرت ان اللہ عزوجل کبت الکافر واخدم ولیدہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم وسارہ ہجرت کر کے گئے تھے وہاں سارہ کو ہاجرہ ہبہ میں ملی اور سارہ نے حضرت ابراہیم سے آکر کہا آپ کو خبر ہے کہ اللہ نے کافر کو ذلیل کیا اور ہم کو ایک لڑکی خدمت کے لیے دی) وقال ابن سیرین عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخدمھا ھاجر۔ (ابن سیرین نے ابوہریرہ سے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ (شاہ مصر) نے ہاجرہ کو خدمت کے لیے دیا تھا۔ مذکورہ حدیث سے یہ سمجھنا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں بالکل ہی بعید ہے۔ تفصیل کے لیے ہم درج ذیل کلمات کا اضافہ مناسب سمجھتے ہیں :۔

یہودیوں کے زبردست مفسّرِ توراۃ " ربی سلوموا سحٰق" نے باب ۱۶ کتاب پیدائش کی تفسیر میں حضرت ہاجرہ کی بابت مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں۔" ابث برعہ ھاثبا کشترالنسیم شغسوا سارہ اھموا طاب شتّھا بتّی شفحہ بیت زِہ ولوکبیرہ بیت اخیر" (براھین باھرہ فی حریۃ ھاجرہ مولوی غلام رسول چریا کوٹ) وہ فرعون کی بیٹی تھی جب اس نے کرامات کو دیکھا جو بوجہ سارہ واقع ہوئی تھیں تو کہا کہ میری بیٹی کا اس گھر میں خادمہ ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ مذکورہ شہادت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ (۱) ہاجرہ شاہِ مصر کی دختر تھیں (۲) شاہ مصر پر سارہ کی عظمت اس قدر طاری ہوگئی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو بطور خادمہ ان کے ساتھ کر دینا اپنے اور اپنے خاندان کے لیے فخر وعزت کا باعث سمجھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاجرہ کو لونڈی قرار دینا اس بنیاد پر کہ توراۃ میں حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کو (امتی) کہا ہے۔ صحیح نہیں ہے کیونکہ عبرانی زبان میں لونڈی غلام کی مختلف حالتوں کے لیے مختلف الفاظ موجود ہیں۔ حضرت ہاجرہ کے لیے توراۃ میں جہاں (امتی) کا لفظ مذکور ہے اس کا تعلق لونڈی غلام کے کسی بھی ایسی حالت سے نہیں جس سے ہاجرہ کے لونڈی ہونے کو ثابت کیا جا سکے۔ اسی طرح کتاب پیدائش کے ۳۹ باب میں مذکور ہے کہ "یوسف کے آقا کی جورو کی آنکھ یوسف پر لگی" پھر باب بالا کے ۱۹/۲ میں ہے کہ "تیرے غلام نے مجھ سے یوں کہا"

کیا مذکورہ عبارت میں آقا اور غلام کے استعمال سے فی الواقع یوسف علیہ السّلام غلام ہی بن گئے تھے، اگر یہ صحیح ہے کہ فوطیفار کے خرید لینے سے حضرت یوسف فی الواقع غلام نہیں ٹھہرے۔ تو یہ بھی صحیح ہے کہ سارہ کے ساتھ آنے سے ہاجرہ فی الواقع لونڈی نہیں بن گئی تھیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ سارہ کے کہہ دینے سے بھی ہاجرہ فی الواقع لونڈی نہیں ٹھہری تھیں۔ (ملخص از رحمۃ للعالمین ج دوم ص ۴۵ — ۴۷)

دوسری پر آئے۔ بلکہ دوسری اولاد کے موقع پر خلیلیت کو اتنا طیش آیا ہی نہیں جس کے نتیجہ میں بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم صادر ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بالکل کھلی ہوئی ہے۔

داستانِ ابراہیم علیہ السّلام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کی بیوی حضرت سارہ، حضرت ہاجرہ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السّلام سے بہت زیادہ رشک و غیرت کرتی تھیں۔ کیونکہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں، اور جب ان کے بطن سے حضرت اسماعیل بھی پیدا ہوگئے، اور حضرت ابراہیم نے اس پہلی اولاد سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی کیا تو ان کی آتشِ غیرت اور بھڑک اٹھی۔ لہٰذا اللہ کا حکم ہوا کہ ابراہیم ہاجرہ اور ان کے فرزند کو ان سے دور ہٹا کر مکہ میں آباد کریں۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ حضرت سارہ کی آتشِ غیرت سرد پڑ جائے، یہ ان کے حال پر اللہ کی رحمت اور بے پایاں شفقت تھی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ انھی حضرت سارہ کے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم کیسے دے دیا جاتا اور کیونکر لونڈی زادے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا؟ جب کہ ایک طرف ان پر رحمت الٰہی سایہ فگن بھی ہے۔ ان کے سوکن کی مصیبت بھی دور کرا دینی مقصود ہے اور ان کے حالِ زار کا ازالہ بھی مطلوب ہے۔ گہری حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ لونڈی کی اولاد کو ذبح کا حکم ہو۔ تاکہ سیّدہ کے قلب میں کنیز اور کنیز زادہ کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جاتے، غیرت کی تندی رحمت میں تبدیل ہو جائے، لونڈی اور لونڈی زادہ کی برکتوں کا وہ تماشہ دیکھیں، اور اس حقیقت کا مشاہدہ کرلیں کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو برباد نہیں کر سکتا جس کے افراد میں یہ لونڈی اور اس کا بیٹا شامل ہوں، نیز اللہ کے بندوں کی نگاہوں میں یہ منظر بھی آجائے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ٹوٹنے کے بعد دل کو جوڑتا ہے اور شدّت کے بعد لطفِ عمیم کی بارش کرتا ہے۔ نیز یہ کہ ہاجرہ اور ان کے فرزند کا دور ہو جانا، تنہائی، غربت اور بیکسی کا عالم، قربان ہو جانے کے لیے تیار ہو جانا، یہ ساری باتیں ان کا وہ صبرِ عظیم تھیں جس نے اصحابِ ایمان کے حق میں ان کے نقوشِ پا کو قیامت تک کے لیے مناسکِ عبادت کی شان بخشی، اللہ کی یہ دائمی سنت ہے کہ ذلت و محرومی اور بے کسی کے بعد بندوں میں جس کا مقام بلند کرنا چاہتا ہے اس پر اسی طرح کی لطف کی بارش کرتا ہے، ارشاد ہے:

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (قصص: ۵)

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان پر جو زمین میں ذلیل بنا کر رکھے گئے تھے، اور انھیں پیشوا بنادیں اور وارث۔

ولادت، پرورش اور بعثت

سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت مکہ میں اور "عام الفیل" کو ہوئی۔ "واقعہ فیل" دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور فتح مکہ کا مقدمہ تھا۔ ورنہ کہاں اصحاب الفیل جو اس وقت روئے زمین پر سب سے عمدہ دین اور عیسائیت کے علمبردار تھے اور کہاں مکہ کے لوگ، جو بتوں کے پجاری تھے مگر مکہ والوں کے لیے اہل کتاب کے خلاف اللہ کی وہ تائید و نصرت ہوئی جو کسی انسانی کرشمہ سے باہر تھی یہ سب کچھ رسالتِ عظمیٰ کی اوّلین تاسیس، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد اور خانۂ کعبہ کی عظمت و جلالت کے اظہار کا مقدّمہ تھا۔

مورخین کا اختلاف ہے کہ آپ کے والد عبداللہ کی وفات کب ہوئی۔ بطن مادر ہی میں تھے یا آپ کی ولادت ہو چکی تھی۔ صحیح تر قول یہ ہے کہ آپ بطن مادر ہی میں تھے، دوسرے قول کے مطابق آپ کی عمر اس وقت سات ماہ کی تھی۔ والدہ کی وفات بالاتفاق مکہ اور مدینہ کے مابین بمقام "ابواء"[1] ہوئی، والدہ اس وقت ننہال سے ملک مکہ واپس آرہی تھیں۔ اس وقت آپ عمر کی

[1] ۔ شہر مدینہ کا ایک گاؤں ہے۔ مدینہ سے قریبی گاؤں جحفہ اور ابواء کے درمیان ۲۳ میل کا فاصلہ ہے۔

ساتویں منزل میں تھے۔ ماں کے بعد کفالت کا بار آپ کے دادا عبدالمطلب نے اٹھایا۔ ان کی بھی وفات ہوگئی، اس وقت آپ آٹھ سال کے ہوچکے تھے۔ بعض روایات کے مطابق چھ اور بعض کے مطابق عمر دس سال تھی۔ دادا کے بعد چچا ابوطالب نے کفالت کا بوجھ اٹھایا۔ عمر کی بارہویں منزل میں داخل ہوئے تو ایک بار چچا آپ کو لے کر شام روانہ ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت آپ کی عمر نو سال تھی، اسی سفر کے دوران بحیرہ راہب کی نگاہ آپ پر پڑی تو چچا سے کہا "انھیں شام لے کر نہ جائیں" کیونکہ یہود سے خطرہ ہے۔ چچا نے آپ کو اپنے بعض غلاموں کے ساتھ مکہ واپس کیا۔

ترمذی[1] وغیرہ کی روایت یہ ہے کہ چچا نے بلال کے ساتھ آپ کو واپس کیا۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ بلال کا اس وقت وجود بھی نہ تھا اور تھا تو چچا کے ساتھ تھے نہ ابوبکر کے ساتھ تھے۔ بزّار نے اس حدیث کو اپنی "مسند" کے اندر درج کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ چچا نے آپ کے ساتھ بلال کو بھیجا بلکہ یہ لکھا ہے کہ ایک شخص کو روانہ کیا۔

پچیس سال کی عمر میں بغرض تجارت آپ نے شام کا سفر کیا۔ بُصریٰ[2] پہنچے اور واپس تشریف لائے واپسی کے بعد خدیجہ بنت خویلد سے شادی کی، ایک روایت کے مطابق شادی آپ نے بعمر تیس سال، ایک اور روایت کے مطابق بعمر اکیس سال کی۔ خدیجہ کی عمر اس وقت چالیس سال تھی۔ یہ پہلی خاتون ہیں جن سے آپ نے شادی کی اور پہلی بیوی ہیں جنھوں نے ازواج مطہرات میں سب سے پہلے وفات پائی۔ ان کی موجودگی میں آپ نے کسی اور خاتون سے نکاح نہیں کیا۔ انھیں حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے آپ کے ذریعہ پروردگار کا سلام پہنچایا۔[3]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلوت پسند اور عبادتِ الٰہی کا خوگر بنا دیا۔ چنانچہ کئی کئی دن غار حرا کی تنہائی میں رہ کر مصروف عبادت رہتے۔[4] بتوں اور آبائی مذہب سے اس حد تک متنفر ہوگئے کہ آپ کے نزدیک اس سے زیادہ نفرت انگیز کوئی اور شے نہ تھی۔ عمر عزیز کی چالیسویں منزل میں آپ پر آفتاب نبوّت کا نور چمکا، خلعت رسالت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا اور اپنی مخلوق کے لیے آپ کی بعثت فرمائی، آپ کو اپنے کرم سے مخصوص فرمایا اور اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آپ کو اپنا امین بنایا۔ آپ کی بعثت بلا اختلاف دوشنبہ کے دن ہوئی۔ مہینہ کے باب میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر روایتوں کے مطابق یہ تاریخ ۸/

---

[1] ترمذی (۳۶۲۴) فی المناقب : باب ماجاء فی بدء نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، روایت ابوموسیٰ اشعری سے، سند صحیح ہے۔ حافظ ابن حجر نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی سب ثقہ ہیں، مگر اس میں بلال اور ابوبکر کا تذکرہ غیر محفوظ ہے، بزار نے اپنی مسند کی روایت میں لکھا ہے "وارسل معہ رجلا" (آپ کے ساتھ چچا نے ایک آدمی بھیجا) دیکھیے "البدایہ" مؤلفہ ابن کثیر ج ۲، ص ۲۸۵ اور ۲۸۶۔

[2] بُصریٰ بوزن حُبلیٰ، دمشق کے جنوب مشرق میں اس سے ۱۲۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر آباد ہے۔ یہ کورہ حوران کا ایک قصبہ ہے۔

[3] صحیح بخاری ج ۷، ص ۱۰۵ فی المناقب : باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجة وفضلها میں ابوہریرہ کی حدیث ہے۔ "اتی جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال : یارسول اللہ هذه خدیجة قد اتتک معها إناء فیه إدام او طعام أو شراب فاذا هی أتتک فاقرأ علیها السلام من ربها ومنی وبشرها ببیت فی الجنة من قصب لؤلؤة مجوفة واسعة کالقصر المنیف لاصخب فیه ولا نصب" (جبرئیل علیہ السّلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا : یہ خدیجہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لا رہی ہیں، آجائیں تو انھیں پروردگار کا اور میرا سلام کہیے۔ اور جنت میں ان کے لیے ایک ایسے گھر کی خوشخبری دے دیجیے جو بڑے مجوف موتیوں کا بنا ہے، اس میں کوئی شور و ہنگامہ ہوگا اور نہ تکان لاحق ہوگی۔

[4] یہ ایک لمبی حدیث کا ایک حصہ ہے جو بخاری ج ۱، ص ۲۱، فی الایمان : باب بدء الوحی، اور مسلم (۱۶۰) فی الایمان، میں عائشہ کی روایت سے وارد ہے۔ "اول ما بدء به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم، فکان لایری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح، ثم حبب إلیه الخلاء، وکان یخلو بغار حرا، فیتحنث فیه، وهو التعبد اللیالی ذوات العدد..." (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی سب سے پہلے ابتدا نیند میں رویائے صادقہ سے ہوئی۔ چنانچہ جو خواب دیکھتے وہ پو پھٹنے کی صورت ظاہر ہو جاتا۔ اس کے بعد خلوت پسند ہوگئے۔ غار حرا کی تنہائی اختیار فرمائی۔ یہاں آپ کئی کئی دن عبادت فرماتے۔

ربیع الاول ۴۱ عام الفیل تھی۔ مگر بعض روایتوں کے مطابق ماہِ رمضان کی کوئی تاریخ تھی۔ استدلال اللہ کے اس ارشاد سے کیا گیا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (بقرہ: ۱۸۵) رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

یہ گروہ کہتا ہے کہ آپ پر نبوت کی اولین نوازش نزولِ قرآن سے ہوئی اور قرآن کا نزول ماہِ رمضان میں ہوا۔ یہی ایک جماعت کا مذہب ہے جس میں یحییٰ صرصری[1] بھی ہیں۔ اپنے "قصیدۂ نونیہ" میں انھوں نے ایک شعر کہا ہے:

وأتت علیہ أربعون فأشرقت   شمس النبوۃ منہ فی رمضان

چالیس سال کے ہوتے تو ماہِ رمضان میں آپ کا آفتابِ نبوت طلوع ہوا۔

پہلا گروہ کہتا ہے کہ قرآن رمضان کی شبِ قدر میں پورا کا پورا یک وقت "بیت عزت" میں اترا۔ پھر حالات کے مطابق وہاں سے ۲۳ برسوں تک بتدریج (نجماً نجماً) نازل[2] ہوتا رہا۔

ایک دوسری جماعت کے نزدیک "اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ" کی تفسیر یہ ہے کہ رمضان کے بارے میں یعنی اس کے صیام کی فرضیت اور اس ماہ کی عظمت وجلالت کے بارے میں قرآن نازل کیا گیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی بعثت ماہِ رجب میں ہوئی۔

مراتبِ وحی کی تکمیل

مراتبِ وحی کی تکمیل کئی مرحلوں میں ہوئی۔

۱۔ سچے خواب:۔ وحی کی ابتدا سچے خواب کی شکل میں ہوئی۔ جو خواب آپ دیکھتے وہ پو پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہو جاتے۔

۲۔ الہام:۔ فرشتہ قلب میں القا کرتا، آپ اسے دیکھتے نہ ہوتے، خود آپ کا ارشاد ہے:

ان روح القدس نفث فی روعی أنہ لن تموت نفس حتی تستکمل رزقہا فاتقوا اللہ وأجملوا فی الطلب ولا یحملنکم إستبطاء الرزق علی أن تطلبوہ بمعصیۃ اللہ فان ما عند اللہ لا ینال الا بطاعتہ[3]

۱۔ یہ شیخ جمال الدین ابوزکریا یحییٰ بن یوسف بن یحییٰ صرصری ہیں۔ "صرصر" بغداد سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے، علامہ حافظ اور صاحب زبان تھے۔ زبان اور عمدہ شعر میں انتہائی کمال حاصل تھا۔ آپ کا دیوان اور مدحیہ قصائد سب مقبول ہوئے۔ اپنے زمانہ کے حسان کہے جاتے تھے۔ ۶۵۶ھ ہجری میں بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہوا جنھوں نے اپنے حملہ ہی کے دن ان کو قتل کر دیا، شذرات الذہب ج ۵، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

۲۔ ابن جریر ج ۲، ص ۱۴۴ اور مستدرک حاکم ج ۲، ص ۵ میں ارشاد باری تعالیٰ "إنا انزلناہ فی لیلۃ القدر" کی تفسیر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بیان سے "أنزل القرآن فی لیلۃ القدر جملۃ واحدۃ الی سماء الدنیا وکان بموقع النجوم فکان اللہ ینزلہ علی رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم بعضہ فی اثر بعض قال عز وجل: (وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذلک لنثبت بہ فوادک ورتلناہ ترتیلا) "شب قدر میں قرآن بیک وقت سب سے قریبی آسمان تک اترا، یہ جگہ ستاروں کی گذرگاہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یکے بعد دیگرے نازل فرماتا رہا۔ اللہ کا ارشاد ہے (اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں: قرآن کیوں نہیں اس پر ایک ہی دفعہ نازل ہو گیا، ہم اسی طرح (نجماً نجماً) اتارتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ تیرے دل کو ثبات عطا کریں اور اسے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیں) سند صحیح ہے، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے تائید کی ہے، سیوطی نے "الدر المنثور" ج ۶، ص ۳۷۰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی نسبت ابن الفریس، ابن المنذر، ابن ابی حاتم ابن مردویہ اور بیہقی کی جانب ہے جنھوں نے اسے "الدلائل" میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ حدیث اپنے شواہد سمیت صحیح ہے۔ "الحلیہ" لابی نعیم ج ۱، ص ۲۶، ۲۷ میں ابوامامہ کی سند سے یہ حدیث آئی ہے۔ سند میں عفیر بن معدان ضعیف ہے۔ باقی اور راوی ثقہ ہیں، ہیثمی نے "مجمع الزوائد" ج ۴، ص ۷۲ میں اسے درج کیا ہے اور اسے "الکبیر" للطبرانی کی جانب منسوب کیا ہے سند میں عفیر بن معدان کے آجانے سے معلول قرار دیا ہے۔ مگر حاکم ج ۲، ص ۴ میں عبداللہ بن مسعود کی روایت سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈالی کہ کوئی زندہ مر نہیں سکتا تاوقتیکہ اپنی روزی پوری نہ کرلے، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور طلب رزق میں خوبصورت (جائز و حلال ذرائع) پہلو اختیار کرو۔ رزق میں تاخیر ہو تو ایسا نہ ہو کہ معصیت کی راہ چل کر اس کی جستجو میں لگ جاؤ۔ کیونکہ اللہ کے یہاں تمہارا جو کچھ ہے وہ حاصل صرف اسی کی طاعت سے ہو سکتا ہے۔

۳۔ فرشتہ بصورتِ انسان آکر آپ کو مخاطب کرتا :۔ جو کہتا اسے آپ محفوظ کر لیتے، کبھی کبھی صحابہ اس فرشتہ کو دیکھ بھی لیتے[۱]

۴۔ گھنٹی بجنے کی صورت :۔ وحی کا یہ مرحلہ انتہائی سخت ہوتا۔ فرشتہ آپ میں اس طرح پیوست ہو جاتا کہ سخت ٹھنڈک[۲] میں بھی آپ کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ اونٹنی پر ہوتے تو بوجھ سے وہ زمین پر بیٹھ جاتی[۳]۔ وحی ایک بار اس طرح آئی کہ آپ کا زانو اس وقت زید بن ثابت کے زانو پر تھا۔ زید بن ثابت کو ایسا معلوم ہوا جیسے ران اب کچل کر رہ جائے گی[۴]

۵۔ فرشتہ کو آپ اس کی اصلی صورت میں دیکھتے۔ اس طرح کا واقعہ عمر بھر میں صرف دو بار پیش آیا ہے۔ سورۂ نجم (۱۳) میں اللہ نے اس کیفیت کا تذکرہ فرمایا ہے[۵]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس کی ایک شاہد موجود ہے، نیز ایک شاہد ابن ماجہ ۲۱۴۴، ابن حبان (۱۰۸۴)، (۱۰۸۵) حاکم ج ۲، ص ۴، ج ۴، ص ۳۲۵، الحلیہ لابی نعیم ج ۳، ص ۱۵۶، ۱۵۷ میں جابر کی روایت سے، اور ایک تیسری شاہد بزار کے یہاں "مجمع الزوائد"، ج ۴، ص ۷۱ میں حذیفہ کی روایت سے بھی ہے۔ ان شواہد کی موجودگی میں حدیث صحت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔

[۱]۔ صحیح مسلم (۸) فی اول کتاب الایمان میں عمر کی روایت دیکھیے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمر سے ارشاد ہے۔ "عمر! جانتے ہو پوچھنے والا کون تھا؟ عمر نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، فرمایا "جبریل" تھے۔ تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے"۔ نسائی نے صحیح سند سے عبداللہ بن عمر کی روایت درج کی ہے۔ "جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دحیہ کلبی کی صورت میں آئے تھے"۔

[۲]۔ احمد ج ۶، ص ۱۵۸ و ۱۶۳ و ۲۵۷، مالک ج ۱، ص ۲۰۶، بخاری ج ۱، ص ۲۰ فی بدء الوحی۔ ج ۶، ص ۱۲۲ فی بدء الخلق "باب ذکر الملائکۃ" اور مسلم (۲۳۳۳) فی الفضائل باب عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم"، نسائی ج ۲، ص ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۹ فی الافتتاح باب جامع ماجاء فی القرآن، ترمذی (۳۶۳۸) فی المناقب روایت حضرت عائشہ کی ہے۔ فرماتی ہیں: "ان الحارث بن ھشام سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یارسول اللہ کیف یاتیک الوحی؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس، وھو أشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول، قالت عائشۃ: ولقد رأیتہ ینزل علیہ الوحی فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنہ وان جبینہ لیتفصد عرقا"۔ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول! آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: گاہے گھنٹی بجنے کی صورت آتی ہے، یہ انتہائی سخت ہوتی ہے جب یہ کیفیت ختم ہوتی ہے تو وحی کے ذریعہ جو کچھ کہا گیا ہوتا ہے وہ سب بخوبی ذہن نشین رہتا ہے۔ گاہے فرشتہ میرے سامنے انسان کی صورت میں آتا ہے۔ مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور میں اس کی کہی ہوئی باتوں کو ذہن میں بٹھا لیتا ہوں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں "انتہائی سخت سرد دن تھا۔ اس دن آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھا۔ کیفیت ختم ہوئی تو آپ کی پیشانی عرق آلود تھی۔

[۳]۔ امام احمد ج ۶، ص ۱۱۸، روایت حضرت عائشہ کی ہے فرماتی ہیں "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان إذا اوحی إلیہ وھو علی ناقتہ وضعت جرانھا فلم تستطع ان تتحرک۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی جب اس حال میں آتی کہ آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے تو اونٹنی بیٹھ جاتی اور حرکت کی سکت باقی نہ رہتی"۔
حاکم ج ۲، ص ۵۰۵ نے اسے صحیح لکھا ہے، ذہبی نے ان کی تائید کی ہے، احمد ج ۶، ص ۴۵۵ میں اس حدیث کی ایک شاہد اسماء بنت یزید کی روایت سے موجود ہے، احمد ہی میں ایک اور شاہد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے وارد ہے۔ ۱۲

[۴]۔ بخاری ج ۸، ص ۱۹۶ باب التفسیر میں یہ حدیث زید بن ثابت کی روایت سے وارد ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذیل کی آیت مجھے املا کروا رہے تھے (لایستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدون فی سبیل اللہ) اسی دوران ابن ام مکتوم آگئے، بولے "رسول اللہ! میں آپ کے ساتھ جہاد کر سکتا تو ضرور کرتا" یہ اندھے تھے چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی فرمائی۔ اس وقت آپ کی ران میری ران پر تھی۔ مجھ پر اتنا بوجھ پڑا کہ ران کے کچل اٹھنے کا اندیشہ ہوا"۔ کیفیت دور ہوئی تو وحی کے الفاظ معلوم ہوئے، اور وہ تھے۔ (غیر اولی الضرر)

[۵]۔ صحیح مسلم ۱۷۷ میں حضرت عائشہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب ذیل ارشاد درج ہے۔ "قال: لم ارہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔ شبِ معراج میں جب آسمانوں کے اوپر تھے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی صلاۃ وغیرہ کی فرضیت نازل فرمائی۔
۷۔ اللہ کا آپ سے فرشتہ کے واسطہ کے بغیر کلام فرمانا:۔ فرشتہ کے بغیر موسیٰ علیہ السّلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ سے براہِ راست کلام کیا۔ موسیٰ علیہ السّلام کے حق میں تو وحی کی یہ صورت نص قرآنی سے ثابت ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا ثبوت اسرا کی حدیث میں ہے۔ (معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم کلامی کا شرف بخشا) بعض علماء نے ایک آٹھویں صورت بھی بیان کی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے روبرو بغیر پردہ کلام فرمایا۔ یہ صورت ان حضرات کی رائے کے مطابق ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کو آپ نے دیکھا ہے۔
اس مسئلہ کے اندر گو جمہور صحابہ بلکہ تمام صحابہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہیں جیسا کہ اس بارے میں عثمان بن سعید دارمی نے صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔ پھر بھی یہ سلف وخلف کا اختلافی مسئلہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ

ختنہ کے باب میں تین اختلافی اقوال ہیں:
۱۔ پیدائشی طور پر آپ مختون ومسرور تھے (یعنی ختنہ سے تھے اور ناف کٹی ہوئی تھی) اس سلسلہ میں ایک حدیث روایت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) (یعنی جبرئیل) علی صورته التی خلق علیها غیرهاتین المرتین رأیته منهبطا من السماء سادًا عظم خلقه مابین السماء الی الارض۔" میں نے انھیں (جبرئیل) کو ان کی اصلی صورت میں صرف یہی دو مرتبہ دیکھا ہے میں نے دیکھا کہ آسمان سے اتر رہے ہیں، ان کے عظیم ڈھانچہ سے آسمان سے لے کر زمین تک کا خلا پُر تھا۔ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں احمد نے وضاحت کی ہے کہ پہلی بار آپ نے انھیں اس وقت دیکھا جب ان سے آپ نے ان کی اصل صورت میں دیکھنے کی فرمائش کی تھی، اور دوسری بار معراج کے موقع پر۔ ترمذی (۳۲۷۴) مسروق کی روایت سے عائشہ کا بیان ہے "محمد نے جبرئیل علیہ السّلام کو صرف دو بار دیکھا ایک دفعہ "سدرۃ المنتہیٰ" پر اور دوسری دفعہ "اجیاد" میں۔

۱۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ سے پوچھا: "اے ام المومنین! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" وہ بولیں «سبحان الله! تیرے اس سوال سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تین باتیں کیونکر ممکن ہیں؟ جو تجھ سے ان کا تذکرہ کرے وہ جھوٹا ہے۔»

(۱) جو یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا وہ جھوٹا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی " لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ○ (الانعام: ۱۰۳) " نگاہیں اسے گرفت میں نہیں لے سکتیں وہ نگاہوں کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ وہ نہایت باریک بیں خبر رکھنے والا ہے" وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ○ (الشوریٰ: ۵۱) "کسی انسان کے شایانِ شان نہیں کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر ہاں اس طرح کہ وحی ہو، یا پس پردہ یا فرشتہ بھیجے جو اس کے حکم سے وحی کرے۔ اللہ بہت بڑا اور حکمت والا ہے۔

(۲) جو کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کل کی بات جانتے تھے وہ جھوٹا ہے (پھر یہ آیت پڑھی) وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○ (لقمان: ۳۴) کوئی نہیں جانتا کہ کل اس پر کیا گذرے گی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا۔ اللہ بڑے علم والا ہے۔

(۳) جو کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں سے کچھ چھپا لیا ہے وہ جھوٹا ہے، (پھر یہ آیت پڑھی) يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ○ (المائدہ: ۶۷) اے رسول! جو کچھ تیرے رب نے تجھ پر نازل کیا ہے پہنچا دے۔ اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو سمجھا جائے گا تو نے اس کا پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اللہ تجھے لوگوں کے شر سے بچائے گا اور بیشک اللہ کفر والوں کو ہدایت نہیں دے گا۔

کی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ابوالفرج ابن الجوزی نے اسے اپنی کتاب "موضوعات" میں ذکر کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صحیح حدیث اس باب میں نہیں ملتی اور یہ آپ کی امتیازی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ بہیترے انسان مختون پیدا ہوئے ہیں۔

میمونی فرماتے ہیں "میں نے ابوعبداللہ سے کہا" مجھ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا ہے "ختنہ کرنے والے ایک شخص نے کسی بچہ کا ختنہ کیا مگر پورے طور پر نہیں کیا" انھوں نے فرمایا "جب ختنہ نصف سپاری (حشفہ) سے اوپر چلا جائے تو دوبارہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ سپاری (حشفہ) بڑی ہوتی رہتی ہے اور جیسے جیسے بڑی ہوتی ہے ختنہ شدہ کھال اوپر کو ہٹتی جاتی ہے۔ لیکن نصف سے کم ہو تو میرے خیال میں دوبارہ کر دینا ضروری ہے"۔ میں نے کہا "دوبارہ میں تو بڑی تکلیف ہوگی۔ حتیٰ کہ ہلاکت کا اندیشہ بھی ہے"۔ فرمایا "مجھے نہیں معلوم" پھر فرمایا "یہاں ایک آدمی کے یہاں مختون بچہ پیدا ہوا تو وہ بہت غمگین ہوا۔ میں نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم کو مشقت سے بچا لیا تو غم کس بات کا؟"

ہمارے ایک دوست بیت المقدس کے محدث ابوعبداللہ محمد بن عثمان خلیلی نے بتایا کہ وہ مختون پیدا ہوئے تھے، ان کے گھر والوں نے ان کا ختنہ نہیں کیا۔ جو بچے مختون حالت میں پیدا ہوتے ہیں عوام میں یہ مشہور ہے کہ ان کا ختنہ چاند نے کر دیا ہے مگر یہ خرافات ہے۔

۲۔ دائی حلیمہ کے یہاں جس دن فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اسی دن آپ کا ختنہ بھی ہوا تھا۔

۳۔ دادا عبدالمطلب نے ساتویں دن آپ کا ختنہ کروایا اور محمد نام رکھا اس موقع پر ایک دعوت بھی دی۔

امام ابو عمر بن عبدالبر (الاندلسی) کے قول کے مطابق اس باب میں ایک غریب حدیث بھی وارد ہے جس کا سلسلہ روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے (سند یوں ہے) حدثنا احمد بن محمد بن احمد حدثنا محمد بن عیسی حدثنا یحیی ابن ایوب العلاف حدثنا محمد بن ابی السری العسقلانی حدثنا الولید بن مسلم عن شعیب عن عطاء الخراسانی عن عکرمة عن ابن عباس۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ ساتویں دن عبدالمطلب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کیا، اس موقع پر دعوت دی، اور محمد نام رکھا[1] یحیٰی بن ایوب کہتے ہیں کہ ہر چند میں نے اس حدیث کی جستجو کی مگر سوائے ابن ابی السری کے کسی اور اہل حدیث کے یہاں جس سے میری ملاقات ہو سکی نہیں ملی۔ مسئلہ کے اندر دو فاضل علماء نے موافق اور مخالف بحثیں کی ہیں، ایک نے اپنی کتاب کے اندر دعویٰ پیش کیا ہے کہ آپ پیدائشی طور پر مختون تھے۔ دلیل میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جو بے سر، پیر ہیں۔ یہ مصنف کمال الدین بن طلحہ ہے، اس پر تنقید کرتے ہوئے کمال الدین ابن العدیم نے لکھا ہے، "آپ کا ختنہ عربوں کے دستور کے مطابق ہوا، اور چونکہ عربوں میں اس کا عام رواج تھا اس لیے کسی متعین بیان کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

---

[1] سلسلۂ روایت میں محمد بن ابی السری العسقلانی بھی ہیں، جو ابو حاتم کے مطابق "لین الحدیث" اور ابن عدی کے مطابق "کثیرالغلط" ہیں، نیز سند میں ولید بن مسلم بھی ہیں جو "مدلس" ہیں، انھوں نے عن، عن کرکے روایت کی ہے۔ لہذا حدیث صحیح نہیں ہے۔

مائیں جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا

۱۔ ثویبہ[1]۔ ابو لہب کی لونڈی، اس نے چند دن آپ کو دودھ پلایا، دودھ میں شریک ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی اور چچا حمزہ بھی تھے۔ اس وقت ثویبہ کی گود میں ان کا بچہ مسروح تھا۔ ثویبہ کے مسلمان ہونے کے باب میں اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ حلیمہ سعدیہ۔ ثویبہ کے بعد حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا۔ اس وقت گود میں ان کا بچہ انیسہ اور جدامہ (شیما) کا بھائی عبداللہ تھا۔ یہ سب کے سب حارث بن عبدالعزیٰ بن رفاعہ سعدی کی اولاد تھے۔ آپ کے رضاعی والدین کے اسلام کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔ حلیمہ سعدیہ نے آپ کے ساتھ آپ کے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے مگر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوگئے اور عمدہ مسلمان ثابت ہوئے۔ آپ کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ خاندان بنو سعد بن بکر میں دودھ پی رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حلیمہ سعدیہ کے یہاں تھے تو ایک دن حمزہ رضی اللہ عنہ کی رضاعی ماں نے آپ کو دودھ پلایا۔ اس طرح حمزہ رضی اللہ عنہ دو جہتوں سے آپ کے دودھ میں شریک ہوئے۔ ایک ثویبہ اور دوسری بنو سعد کی خاتون کی جہت سے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گود میں کھلانے والی خواتین

آپ کو جن ماؤں نے گود میں کھلایا۔ ان میں حسب ذیل خواتین شامل تھیں۔

۱۔ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب۔

۲۔ ثویبہ، ۳۔ حلیمہ سعدیہ، ۴۔ شیما، حلیمہ سعدیہ کی بیٹی اور آپ کی رضاعی بہن۔ ماں کے ساتھ یہ بھی آپ کو گود کھلاتی تھیں یہ وہی شیما ہیں جو ہوازنی وفد کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ تو آپ نے ان کے حق کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی چادر مبارک بچھا کر انھیں اس پر بٹھایا۔

۵۔ فاضلہ جلیلہ ام ایمن برکہ حبشیہ یہ والد سے وراثت میں ملی تھیں۔ آپ کی یہ دایہ بھی تھیں۔ زید بن حارثہ سے آپ نے ان کی شادی کردی تھی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ انہی کے بچے ہیں۔ یہ وہی ام ایمن ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد رو رہی تھیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے یہاں آکر تعزیت کی اور پوچھا "ام ایمن کیوں رو رہی ہو؟ اللہ کے یہاں جو کچھ ہے وہ اس کے رسول کے لیے بہتر ہے۔ بولیں: بخوبی جانتی ہوں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس کے رسول کے لیے بہتر ہے لیکن اس لیے رو رہی ہوں کہ آپ کی وفات سے آسمانی خبروں کا سلسلہ

---

[1] بخاری ج ۹، ص ۱۲۴۔ فی النکاح: باب (وامھاتکم اللاتی أرضعنکم) میں عروہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "ثویبہ ابولہب کی لونڈی تھی جسے اس نے آزاد کردیا تھا۔ اس لونڈی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا۔ جب ابولہب مرگیا تو گھر والوں میں کسی نے خواب کے اندر اسے بری حالت میں دیکھ کر پوچھا کیا ہوا؟" ابولہب نے کہا تمھارے بعد چین سے نہ رہ سکا۔ لیکن ثویبہ کو جو میں نے آزاد کیا تھا اس کی وجہ سے میرے انگوٹھے کے نیچے یہ ایک گڈھا سا ہے، اسی میں مجھے تھوڑی سی سیرابی ملتی ہے۔

(وحی) منقطع ہو گیا ہے"۔ اس پر وہ دونوں بھی بے اختیار رو پڑے [1]

بعثتِ نبوی اور سب سے پہلی وحی

عمر چالیس سال ہوگئی تو اللہ نے پیغمبر بنا کر آپ کو مبعوث فرمایا۔ اس عمر میں آدمی کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اسی عمر میں پیغمبروں کی بعثت ہوتی رہی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ قول کہ آپ کو بعمر ۳۳ سال آسمان کی جانب اٹھالیا گیا تھا کسی متصل حدیث سے ثابت نہیں ہے کہ اس پر کوئی بنیاد رکھی جا سکے۔

نبوت کی ابتدا سب سے پہلے خواب سے ہوئی۔ چنانچہ آپ کو جو خواب نظر آتے وہ پو پھٹنے کی صورت ظاہر ہو جاتے [2]۔ ایک قول کے مطابق یہ کیفیت چھ ماہ رہی۔ آپ کی نبوت کی کل مدّت ۲۳ سال ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے خوابوں کا زمانہ کل نبوت کا چھیالیسواں حصّہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کے فرقِ مبارک پر نبوت کا تاج رکھا۔ فرشتہ غارِ حرا میں جہاں آپ خلوت گزینی پسند کرتے تھے آیا اور سب سے پہلی وحی نازل کی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (علق: ۱) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

یہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور جمہور کا قول [3] ہے۔ مگر جابر رضی اللہ عنہ کے مطابق سب سے پہلی وحی "یَاأَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ" [4] ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کا قول بوجوہ ذیل صحیح ہے۔

۱- آپ کا ارشاد "ما انا بقاری" (مجھے پڑھنا نہیں آتا) صراحت سے اس حقیقت کا غماز ہے کہ قبل ازیں آپ نے کچھ نہ پڑھا تھا۔

۲- قرأت کا حکم ترتیب میں حکم "انذار" سے پیشتر ہونا چاہیے۔ کیونکہ پڑھنے کے بعد ہی انذار ہوگا۔ لہذا قرأت کا حکم پہلے بعدہٗ انذار کا ہوگا۔

۳- جابر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ پہلی وحی "یاأیها المدثر" ہے خود ان کا اپنا قول ہے۔ مگر عائشہ رضی اللہ عنہا۔ خود رسول اللہ

---

[1] مسلم (۲۴۵۴) فی الفضائل : "باب من فضائل أم أیمن"۔

[2] بخاری ج ۱، ص ۲۱ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سب سے پہلے نیند میں سچے خواب سے ہوئی۔ چنانچہ جو خواب بھی دیکھتے پو پھٹنے کی صورت ظاہر ہو جاتے۔

[3] بخاری ج ۲، ص ۵۵۱، ۵۵۲ و ۵۵۳۔ فی تفسیر سورة "اقرأ باسم ربك الذی خلق" وفی بدء الوحی: باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وفی الانبیاء : باب (واذکر فی الکتاب موسیٰ) وفی التعبیر : باب اول مابدئ به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویاء الصالحة. مسلم (۱۶۰) فی الایمان: باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. ترمذی (۳۶۳۶) فی المناقب : باب اول مابدئ به صلی اللہ علیہ وسلم الرویاء الصادقة، مسند احمد ج ۶، ص ۱۵۳ و ۲۳۲۔

[4] بخاری ج ۲، ص ۵۵۰ فی تفسیر سورة المدثر، وفی تفسیر سورة "اقرأ باسم ربك الذی خلق"۔ وفی بدء الوحی : باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وفی بدء الخلق : باب ذکر الملائکة، مسلم (۱۶۱) فی الایمان : باب بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. مسند احمد ج ۳، ص ۳۰۶ و ۳۹۲۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کی خبر دے رہی ہیں۔

۴۔ جابر رضی اللہ عنہ کی جس حدیث سے دلیل پیش کی جاتی ہے اس میں خود یہ تصریح موجود ہے کہ "یاایہا المدثر" کے نازل ہونے سے پہلے فرشتہ آچکا تھا۔ گھر واپس آکر "زملونی۔ دثرونی" (مجھے چادر اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ) کہا تو یہ آیت نازل ہوئی "یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ" آپ اس سے پہلے خبر دے چکے ہیں کہ غار حرا میں جو فرشتہ آیا تھا اس نے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" نازل کیا تھا۔ پس جابر کی حدیث میں خود اس بات کی دلیل موجود ہے کہ "یاایہا المدثر" کا زمانۂ نزول بعد کو ہے۔ دلیل ان کی روایت ہوگی نہ کہ ان کی رائے۔ واللہ اعلم۔

دعوتِ نبوی کی ترتیب

دعوتِ نبوی حسبِ ذیل مراحل سے گذری۔

پہلا مرحلہ : نبوت
دوسرا مرحلہ : قریب ترین خاندان والوں کو انذار
تیسرا مرحلہ : قوم کو انذار
چوتھا مرحلہ : تمام عربوں کو انذار۔ جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا۔
پانچواں مرحلہ : جن و انس جن تک بھی دعوت پہنچے انھیں قیامت تک انذار۔

اعلانِ دعوت

نبی ہونے کے بعد تین سال تک آپ نے چھپ کر دعوت الی اللہ دی پھر یہ حکم آیا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (الحجر : ۹۴) جس بات کا تم کو حکم ہے اس کا کھل کر اعلان کرو اور مشرکین سے اعراض کرو۔

چنانچہ آپ نے علانیہ دعوت دی۔ پہلو بہ پہلو قوم مخالفت اور دشمنی پر اتر تی گئی۔ ان کی اذیتیں اور بد سلوکیاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ اس حد تک بڑھیں کہ اللہ نے مسلمانوں کو "دونوں ہجرتوں[1]" کی اجازت دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمارِ گرامی

آپ کے تمام نام بطور صفت ہیں۔ خاص علم کے طور پر مجرد تعریف کے لیے نہیں، یہ ان صفات سے مشتق ہیں جن سے

---

[1] مراد "حبشہ" کی دونوں ہجرتیں ہیں۔

آپ کی ذات گرامی خود متصف تھی۔ ان ناموں سے مدحت و ستائش اور کمال کے پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ مُحَمَّدٌ :۔ سب سے مشہور اور متعارف نام ہے۔ یہی نام صراحت سے تورات میں بھی مذکور ہے۔ ہم نے "جلاء الأفہام فی فضل الصلوۃ والسلام علی خیر الأنامﷺ" کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس میں مذکورہ حقیقت کو نہایت واضح دلیل سے پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بے شمار فوائد اور معانی کی حامل اور اپنی نوعیت کی واحد اور غیر مسبوق کتاب ہے۔ اس میں ہم نے ان احادیث کی تشریح و توضیح بھی کی ہے جو آپ پر درود و سلام کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کی صحت، علت اور ان کے حسن سے بھی بحث کی ہے۔ معلول احادیث کے اسقام و علل کا تشفی بخش اظہار بھی کیا ہے، نیز اس دعا (درود و سلام) کی فضیلت، اس کے اسرار و نکات اور حکمت و افادیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وضاحت سے بیان کیا ہے کہ درود کے مقامات کیا کیا ہیں، واجب کی مقدار اور مقدار کے باب میں اصل علم کا اختلاف کیا ہے۔ راجح و مرجوح کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے، کتاب کی معنویت بیان سے باہر ہے۔[1] یہاں صرف اتنا بیان مقصود ہے کہ آپ کا اسم گرامی صراحت سے تورات کے اندر موجود ہے۔ اہلِ کتاب کے اہلِ ایمان علماء بھی اس حقیقت کے مویّد ہیں۔

۲۔ أحمد :۔ یہ نام حضرت مسیح نے رکھا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟ اس سے بھی ہم نے مذکورہ کتاب کے اندر پردہ اٹھایا ہے۔

۳۔ متوکّل، ۴، ماحی ۵، حاشر ۶، عاقب ۷، مُقفّی ۸، نبی التوبہ ۹، نبی الرحمۃ ۱۰، نبی الملحمہ ۱۱، فاتح ۱۲، امین۔ انہی کے ساتھ حسبِ ذیل اسماء بھی ملحق ہیں:۔

۱۔ شاہد۔ ۲۔ مبشر۔ ۳۔ بشیر۔ ۴۔ نذیر۔ ۵۔ قاسم۔ ۶۔ ضحوک۔ ۷۔ قتال۔ ۸۔ عبداللہ۔ ۹۔ سراج منیر۔ ۱۰۔ سید ولد آدم۔ ۱۱۔ صاحبِ لواء الحمد۔ ۱۲۔ صاحبِ مقام المحمود وغیرہ۔ کیونکہ آپ کے اسماء چونکہ مدحیہ اوصاف ہیں اس لیے آپ کے ہر وصف نے نام کی شان اختیار کر لی ہے۔ بایں ہمہ یہ فرق بھی ضروری ہے کہ کون سا وصف آپ کے ساتھ خاص ہے یا غالب ہے جس سے آپ کا نام مشتق ہوا اور کون سا مشترک ہے۔ وصف مشترک سے آپ کا کوئی اسم خاص نہ ہوگا۔

"جبیر بن مطعم" فرماتے ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام ہمیں گنائے ہیں۔ فرمایا:

انا محمد وانا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر وانا الحاشر الذی یُحشر الناس علی قدمی والعاقب الذی لیس بعدہ نبی۔[2]

میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعہ اللہ کفر مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں کہ میرے قدموں پر لوگ جمع کیے

۱۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور صلوۃ وسلام کے بارے میں سب سے جامع کتاب ہے۔ اس سے قبل اس موضوع پر اسحاق القاضی نے "باب فضل الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے ایک بہترین مختصر اور جامع کتاب لکھی تھی جو محدث العصر علامہ "ناصر الدین البانی" کے حواشی اور تحقیقات کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ (مراجعین)

۲۔ بخاری ج ۸، ص ۴۹۲۔ فی تفسیر سورۃ الصف وفی الأنبیاء: باب ماجاء فی اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ مسلم (۲۳۵۴) فی الفضائل؛ باب فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ترمذی (۲۸۴۲) فی الأدب: باب ماجاء فی اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مسند احمد ج ۴، ص ۸۰، ۸۱ و ۸۴، حدیث جبیر بن مطعم، اس حدیث کا آخری جز "الذی لیس بعدہ نبی" بعض راویوں کی جانب سے عاقب کی تفسیر کے طور پر اضافہ ہے، مسلم اور احمد میں ہے کہ معمر کہتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا: "عاقب کسے کہتے ہیں؟" فرمایا "جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو" مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "وانا العاقب الذی لیس بعدہ أحد" اور ترمذی کی روایت میں "وانا العاقب الذی لیس بعدہ نبی" دیکھیے "فتح الباری" ج ۶، ص ۴۰۶۔

جائیں گے ، میں عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

آپ کے نام دو قسم کے ہیں

۱۔ خصوصی نام، جس میں کوئی اور پیغمبر شریک نہیں ہے۔ مثلاً محمد، احمد، عاقب، حاشر، مقفی، نبی الملحمہ۔
۲۔ وہ اسماء جن کے مفہوم میں دیگر پیغمبر بھی شریک ہیں۔ مگر کمال صرف آپ کو حاصل ہوا۔ گویا خصوصیت اصل کے بجائے کمال کے باعث ہوئی۔ جیسے رسول اللہ، نبی اللہ، عبد اللہ، شاہد، مبشر، نذیر، نبی رحمت، نبی توبہ۔

آپ کے ہر وصف کو اگر نام کا درجہ دیا جائے تو پھر ناموں کی تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ جیسے صادق، مصدوق، رووف، رحیم وغیرہ۔ اسی اعتبار سے بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار اسماء ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک ہزار[۱]۔ یہ ابو الخطاب بن دحیہ[۲] کا قول ہے۔ ان کی مراد اوصاف محمدی سے ہے۔

اسماء نبوی کے معانی کی تشریح

محمد "حمد" سے اسم مفعول ہے یعنی بکثرت لائق تعریف، اوصاف وعادات کا حامل۔ یہ محمود کے مقابلہ میں مبالغہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ کیونکہ محمود ثلاثی مجرد سے ہے مگر محمد مبالغہ کے لیے ثلاثی مزید سے آیا ہے۔ یعنی وہ ذات جو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ محمود ہو۔ یہی وجہ ہے (واللہ اعلم) کہ تورات میں آپ کا نام "محمد" ہے۔ کیونکہ اس میں آپ، آپ کے لائے ہوئے دین اور آپ کی امت کے اوصاف حمیدہ اتنی کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی امت محمدیہ کے ایک فرد ہونے

۱۔ "مولوی اشرف علی تھانوی" رحمہ اللہ نے معانی قرآن کے اپنے ترجمہ کے اخیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننانوے نام ذکر کیے ہیں جن میں الاول، الآخر، الظاہر، الباطن تک ہیں۔ یہ ایک طرح اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کے مقابل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ننانوے نام ثابت کر کے شعوری یا غیر شعوری طور پر اللہ کی برابری کا تصور پیدا کرنے کی سعی نامحمود ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ خود ابو الخطاب ابن دحیہ کچھ ایسے قابل اعتبار آدمی نہیں ہیں کہ ان کی بات کا کوئی وزن ہو اور لگتا ہے کہ ان کے یہاں بھی محرک یہی ہے کہ جتنے نام اللہ کے ہیں اتنے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت کریں۔
اسی طرح مولوی اشرف علی تھانوی اور بعض دوسرے علماء کی ادب وتعظیم کے نام سے اللہ کے بارے میں ترجمہ میں جمع کا صیغہ لانا (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بخشیں گے وغیرہ) ادب واحترام کی افادیت سے کہیں زیادہ شائبہ شرک کے نقصانات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اللہ کے احترام کا تقاضا ہے کہ اس کی وحدانیت کا اظہار ہر ہر لفظ سے ہو واحد کا صیغہ وحدانیت کی تعبیر میں جمع کے صیغے سے کہیں بہتر ہے۔ (ترجمہ اشرف الشان کی طرف رجوع کیا جائے)۔

۲۔ عمر بن حسن بن علی بن محمد ابو الخطاب بن دحیہ کلبی (۵۴۴ھ — ۶۳۳ھ) ادیب ومورخ اور حافظ حدیث تھے اندلس کے اندر "بلنسیہ" ایک مقام ہے وہیں کے باشندہ تھے۔ "دانیہ" کے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ مراکش، شام، عراق اور خراسان کے سفر پر بھی گئے۔ اور اقامت بالآخر مصر میں اختیار کی۔ علماء اور ائمہ پر کثرت سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ جواب میں بعض معاصرین نے ان کی جانب بے التفاتی کی اور الزام لگایا کہ دحیہ کلبی کی جانب انتساب میں وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ دحیہ کلبی نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ مشہور شاعر ابن عنین نے ان کی ہجو کی۔ وفات قاہرہ میں ہوئی۔ تصانیف میں "المطرب من اشعار أهل المغرب"، "الآيات البينات"، "نهاية السول فی خصائل الرسول"، "التحرير فی مولد السراج المنير" وغیرہ مشہور ہیں۔

کی آرزو پیدا ہوئی۔ اس موقع پر ہم نے اس مفہوم کے دلائل بھی پیش کیے ہیں اور واضح کر دیا ہے کہ ابوالقاسم سہیلی[1] کا جنھوں نے برعکس موقف اختیار کرتے ہوئے آپ کا توراتی نام "احمد" ثابت کیا ہے بیان غلط ہے۔ احمد۔ افعل التفضیل کے وزن پر اسم ہے۔ یہ بھی حمد سے مشتق ہے۔ اس کے بارے میں اہلِ زبان کا اختلاف ہے کہ کیا یہ فاعل کا صیغہ ہے یا مفعول کا۔ ایک گروہ کہتا ہے فاعل کے معنی میں ہے۔ یعنی دوسروں کے مقابلہ میں اللہ کی زیادہ حمد کرنے والا۔ گویا اس کا مفہوم "احمد الحامدین" کا ہوا۔ اس گروہ کے خیال میں اس مفہوم کو ترجیح دینے کی بنیاد افعل التفضیل کا قیاس ہے اس کے مطابق "افعل" کا صیغہ مفعول پر واقع ہونے والے فعل سے نہیں فاعل کے فعل سے بنتا ہے۔

وہ کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عرب "ما اضرب زیدا" اور "ولا زید اضرب من عمرو" بایں اعتبار نہیں بولتے کہ "ضرب" کا فعل "زید" پر واقع ہوا ہے، اسی طرح "ما اشربه للماء" "وما اکله للخبز" بھی نہیں بولتے۔ ان کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ افعل التفضیل اور فعل تعجب۔ فعل لازم سے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فَعَلَ مفتوح العین اور فَعِلَ مکسور العین سے فَعُلَ مضموم العین کی جانب نقل مقدر مانا جاتا ہے اور "همزة تعدية الى المفعول" کے لیے لایا جاتا ہے چنانچہ اس میں ہمزہ تعدیہ کے لیے ہے۔ مثلاً "ما اظرف زیدا"، "ما اکرم عمروًا" اصلاً "ظَرُف" اور "کَرُم" سے ہیں۔ اس گروہ کے نزدیک "متعجب منہ" اصل میں فاعل ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا فعل غیر متعدی ہو۔ باقی "ما اضرب زیدًا لعمرو" کی مثال میں فَعَل مفتوح العین سے فَعُل مضموم العین کی جانب انتقال ہے۔ اور اسی حالت میں بذریعہ ہمزہ اسے متعدی کر دیا گیا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ مثال میں لام لانا پڑا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی "ما اضرب زید العمرو" کہہ سکے۔ اگر فعل کو لازم کے بجائے متعدی رہنے دیا جاتا تو یوں کہتے "ما اضرب زیدًا اعمروًا" کیونکہ ایک کی جانب تو خود ہی متعدی ہے۔ دوسر کی جانب متعدی بذریعہ ہمزہ ہوا۔ چنانچہ ہمزہ تعدیہ کے بعد دوسرا متعدی لام کے ذریعہ لانا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "افعل التفضیل" اور "فعل تعجب" کو فاعل کے فعل سے صیغہ مانتے ہیں، مفعول پر واقع ہونے والے فعل سے نہیں۔

دوسرا گروہ احتجاجاً کہتا ہے کہ فاعل کا فعل ہو یا مفعول پر واقع ہونے والا فعل، دونوں سے تفضیل اور تعجب کے صیغے بن سکتے ہیں۔ عربوں سے بکثرت ایسا ہی سنتے ہیں، جو اس کے جائز ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ عرب یوں بولتے ہیں۔ "ما اشغله بالشئ" یہ "شُغِلَ" سے ہے جس کا مفعول مشغول بنتا ہے، اسی طرح "ما اولعه بالشئ" بھی ہے یہ "أُولِعَ بالشئ" سے بنا ہے جس کا مفعول "مُولَع بالشئ" ہوگا۔ فقط فعل مجہول ہے۔ ایسے ہی "ما اعجبه بکذا" ہے، یہ بھی "أُعْجِبَ به" سے ہے۔ نیز "ما أَحبّه الیّ" میں مفعول کے فعل یعنی محبوب ہونے سے تعجب کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔

اسی طرح "ما أبغضه الیّ" اور "ما أعقته الیّ" کی مثالیں بھی ہیں۔

یہاں ایک مشہور مسئلہ اور ہے جس کا ذکر سیبویہ نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ما أبغضنی له، ما أحبنی له، ما أعقتنی له"

---

[1] ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد خثعمی اندلسی سہیلی مالقی۔ (۵۰۸ — ۵۸۱ھ) حافظ تھے۔ زبان اور تاریخ وسیر پر عبور حاصل تھا۔ مالقہ میں پیدا ہوئے۔ بعمر سترہ سال اندھے ہوگئے، قابلیت کا شہرہ سن کر شاہِ مراکش نے اپنے یہاں جگہ دی اور بڑی عزت سے پیش آیا۔ تاحین حیات مراکش میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔
سہیل مالقہ کا ایک گاؤں ہے اسی کی نسبت سے سہیلی کہے جاتے ہیں۔ انھیں کے اشعار کا یہ مشہور مطلع ہے ؎

"یا من یریٰ ما فی الضمیر ویسمع — انت المعدّ لکل ما یتوقع"

اے وہ کہ جو مافی الضمیر دیکھتا اور سنتا ہے، تیرے ہی یہاں آنے والی مصیبت کو دور کرنے کا سامان ہے۔
السیرة النبویة لابن هشام کی شرح "الروض الانف"، "الایضاح والتبیین لما أبهم من تفسیر الکتاب المبین" اور "نتائج الفکر" وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔

ہیں بغض، محبت اور نفرت کرنے والے تم ہوا اور متعجب منہ فاعل کا فعل ہے، مگر "ما أبغضني اليه، ما أعقتني اليه، ما أحبني اليه،" جیسی مثالوں میں مبغوض، متنفر منہ اور محبوب تم ہو۔ اور متعجب منہ مفعول پر واقع ہونے والا فعل ہے۔ لہٰذا جہاں لام آتا ہے وہاں فعل فاعل کے لیے اور جہاں "الی" آتا ہے وہاں مفعول کے لیے ہوا کرتا ہے۔ مگر اکثر نحوی اس طرح کی تعلیل نہیں کرتے۔ اس کی تعلیل واللہ اعلم یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے لام فاعل کے لیے آتا ہے جیسے "لمن هذا؟" کے جواب میں "لزید" کہا جاتا ہے۔ اور الی باعتبار معنی مفعول کے لیے لایا جاتا ہے چنانچہ "الی من یصل هذا الکتاب" کے جواب میں "الی عبد الله" کہتے ہیں۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ "لام" ملک، اختصاص اور استحقاق کے مفہوم میں آتا ہے۔ اور ملک واستحقاق اسی فاعل کا ہوتا ہے جو اصل میں مالک اور مستحق ہوتا ہے۔ مگر "الی" انتہائے غایت کے لیے اور غایت اقتضائے فعل کا منتہیٰ ہوتی ہے۔ اس لیے مفعول کے لیے "الی" انسب ہے کہ مقتضائے فعل کا کمال ہے۔

فعل مفعول سے تعجب کی مثال حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا وہ شعر ہے جسے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا تھا۔

فلهو اخوف عندی إذ أكلمه ــــ وقيل انك محبوس ومقتول

من خادر من ليوث الاسد مسكنه ــــ ببطن عثر غيل دونه غيل [۱]

آپ سے ہمکلامی کے وقت جب کہ علم ہو چکا ہے کہ قید کر کے قتل کر دیا جاؤں گا میرے نزدیک "آپ" اس شیر نیستاں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جس کا مسکن وادی "عثر" میں کچھار در کچھار ہے۔

"اخوف" شعر کے اندر "خيف فهو مخوف" سے ہے۔ "خاف" سے نہیں۔ ایسے ہی "ما اجن زیدًا" میں "أجنّ" "جُنّ فهو مَجنونٌ" سے ہے۔ یہ کوفیوں اور ان کے موافقین کا مذہب ہے۔

بصریوں کا کہنا ہے کہ یہ مثالیں شاذ ہیں۔ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے نہ ہی ان کی وجہ سے زبان کے اصول وقواعد میں کسی طرح کی بے ضابطگی گوارہ کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جو کچھ سنا گیا ہے اسی پر انحصار کرنا ہوگا۔

کوفیوں کا جواب یہ ہے کہ عربوں کے نثری اور شعری مجموعوں میں کثرت سے ایسی مثالوں کی موجودگی شاذ ہونے کا مفہوم نہیں رکھتی۔ کیونکہ شاذ کے درجہ میں کلام وہی ہوتا ہے جو عربوں کے استعمالات اور ان کی عام تعبیرات کے برعکس ہو۔ مذکورہ مثالیں اس نوعیت کی نہیں ہیں۔ تحکم زبردستی ہے اس کی کوئی کوفیوں کے مطابق فعل لازم کی تقدیر اور اسے فعُل کی جانب منتقل کر دینا دلیل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہمزہ کے ذریعہ "تعدیہ" کے ضابطہ کی تفصیل اول تا آخر بلا دلیل ہے۔ اس ترکیب میں ہمزہ "تعدیہ" کے لیے نہیں محض اظہار تعجب اور اظہار افضلیت کے لیے آیا ہے۔ جیسے فاعل میں الف، مفعول میں میم اور واؤ، افتعال میں تا اور مطاوعت وغیرہ وہ زوائد ہوا کرتے ہیں جو مجرد کے بالمقابل ثلاثی مزید میں لاحق شدہ اضافہ کے اظہار کے لیے آتے ہیں۔ اس ہمزہ کا سبب بھی یہی ہے۔ اس کا مقصود فعل کو متعدی بنانا نہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جس فعل کو آپ بذریعہ ہمزہ متعدی تسلیم کر چکے ہیں۔ اسے حرف جر اور مزید کے ذریعہ بھی متعدی کر دینا جائز ہے۔ مثلاً "جلستُ به"، "اجلسته"، "قمتُ به"، "اقمته" وغیرہ یہاں ہمزہ کا قائم مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا لہٰذا معلوم ہوا کہ ہمزہ مجرد تعدیہ کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بار تعدیہ کے ساتھ بھی آتا ہے مثلاً "أكرِمْ به وأحسِن به" اور یہ ضابطہ ہے کہ فعل پر دو تعدیہ مجتمع نہیں ہو سکتے۔

پھر زبان وادب کے اندر "ما اعطاه للدراهم" اور "ما اکساه للثیاب" جیسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ یہ "أعطا"

---

[۱] یہ دونوں اشعار "دیوان کعب بن زہیر" ص ۲۱ کے اس قصیدے کے ہیں جس میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی ہے۔

اور "کسا"، متعدی میں سے ہیں۔ نہ کہ "عطو" بمعنی تناول کی تقدیر بان کر ہمزہ تعدیہ داخل کیا گیا ہے۔ ایسا کرنا صحیح نہیں۔ اس سے معنی میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ تعجب "اعطاء" سے ہے نہ کہ "عطو" بمعنی تناول سے ظاہر ہے ہمزہ اس میں تعجب اور تفضیل کے لیے آیا ہے۔ باقی اصل فعل کا ہمزہ محذوف ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہمزہ کو تعدیہ کے لیے ماننا صحیح نہیں ہے۔ باقی یہ کہ "ما اضربه لزید" وغیرہ مثالوں میں "لام تعدیہ" کے لیے ہے۔ کیونکہ لام یہاں جب کہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ لزومِ فعل کے لیے آیا ہے ایسا نہیں بلکہ تقویتِ فعل کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ غیر منصرف ہونے نیز عام افعال کے طریقوں سے ہٹ جانے کے سبب فعل کا اقتضاء اور عمل دونوں ہی میں ضعف آگیا ہے۔ لہٰذا لام کے ذریعہ قوت پہنچائی گئی ہے۔ ایسا ہی اس کی فرعیت کے موقع پر اور اس وقت بھی اختیار کرتے ہیں جب اس کا معمول مقدم ہو جاتا ہے یہی مذہب جیسا کہ ظاہر ہے قوی اور راجح ہے۔

مقصد کی طرف "احمد" پہلے گروہ کے مطابق "احمد الناس لربه" (اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا) اور دوسرے گروہ کے مطابق "احق الناس واولاهم بان یحمد" (تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سزاوار حمد و ستائش) کے مفہوم میں ہوگا۔ اس مفہوم کے مطابق معنوی اعتبار سے گویا "محمد" کے مرادف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "محمد" حامل اوصافِ حمیدہ کو کہیں گے، اور "احمد" اس ذات کو جو دوسروں کے بالمقابل زیادہ لائق تعریف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کثرت اور کمیت کے اعتبار سے آپ "محمد" اور صفت و کیفیت میں "احمد" ہیں۔ حمد و ستائش کا استحقاق آپ کو دوسروں کے مقابل زیادہ ہے۔ تعریف آپ کی سب سے زیادہ بھی ہوگی اور سب سے عمدہ بھی۔ پس دونوں ہی اسماء مفعول پر واقع ہیں جس سے مدح و توصیف میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اور کمال کا بھی۔ اگر مراد بمعنی فاعل ہوتی تو "احمد" کے بجائے آپ کا نام "حمّاد" ہوتا۔ یعنی بکثرت حمد کرنے والے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پروردگار کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ مگر "احمد" کے نام میں یہ مفہوم ہوتا تو انسب یہی تھا کہ نام "حمّاد" ہوتا۔ جیسا کہ امت بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ دونوں نام آپ کے انہی اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ سے مشتق ہیں جن کے تحت آپ کو "محمد" اور "احمد" جیسے اسماء کا استحقاق حاصل ہوا۔ آپ وہ ہیں کہ کیا آسمان کیا زمین۔ کیا دنیا کیا آخرت۔ تمام ہی جہانوں کے لوگ بے شمار اور ان گنت اوصافِ حمیدہ کے باعث آپ کے ثناخواں ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب کے اندر جو صلوٰۃ و سلام کے موضوع پر ہے اس مفہوم پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں سفر اور پریشانی خاطر میں ہم نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے۔ وباللّٰہ المستعان وعلیہ التکلان۔

متوکّل صحیح بخاری کے اندر عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ایک روایت ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ تورات کے اندر میں نے آپ کی صفت یوں پڑھی ہے۔

محمد رسول اللہ عبدی ورسولی سمیتہ المتوکل، لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب فی الاسواق و لا یجزی بالسیئۃ السیئۃ، بل یعفو ویصفح ولن اقبضہ حتی اقیم بہ الملۃ العوجاء بان یقولوا لا الٰہ الا اللہ[1]

---

[1] بخاری ج ۸، ص ۴۵۰، فی تفسیر سورۃ الفتح : باب "انا ارسلنک شاهدا ومبشرا ونذیرا"، وفی البیوع : باب کراهیة السخب فی السوق"، مسند احمد ج ۲، ص ۱۷۴، اس کے الفاظ مکمل طور پر حسب ذیل ہیں۔ "یا ایها النبی انا ارسلنک شاهدا و مبشرا ونذیرا وحرزا للامیین، انت عبدی ورسولی، سمیتک المتوکل، لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب فی الاسواق ولا یدفع بالسیئة السیئة ولکن یعفو ویصفح ولن یقبضه الله حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولوا لا اله الا الله فیفتح بها اعینا عمیا وآذانا صما وقلوبا غلفا۔" اے نبی! میں نے تجھے شاہد، مبشر، نذیر، امیوں کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

محمد اللہ کے رسول، میرے بندے، میرے رسول۔ میں نے ان کا نام متوکل رکھا ہے، نہ سخت نہ درشت، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا جواب بدی سے نہ دیں گے بلکہ معاف کریں گے اور درگذر سے کام لیں گے۔ میں ان کی روح اس وقت تک قبض نہ کروں گا جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی ملت کو لا الٰہ الا اللہ کہلا کر سیدھا نہ کر دوں۔

اس نام کے سب سے زیادہ مستحق آپ ہیں کیونکہ اقامت دین کی راہ میں آپ کے توکل کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ماحی، حاشر، مقفی، عاقب

ان اسماء کی تفسیر جبیر بن مُطعم کی حدیث میں آچکی ہے۔ "ماحی" وہ ذات جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر مٹائے۔ اور یہی حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ آپ کے ذریعہ کفر کی جس طرح بیخکنی کی گئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی روئے زمین کے سارے لوگ اس وقت کفر پر تھے ہی۔ صرف اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ تھے جن میں ایمان کی روشنی تھی، باقی یا تو بت پرست تھے، یا مغضوب علیہم (یہود) یا گمراہ (نصاریٰ) یا دہریئے (اللہ اور آخرت کے تصور سے ناآشنا فرقہ صابئہ) یا کواکب کے پجاری یا آتش پرست یا ایسے فلاسفہ اور حکماء جو نہ انبیائی شریعتوں سے واقف تھے اور نہ اسے مانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس صورت حال کو مکمل محو کر کے رکھ دیا۔ اللہ کا دین ہر دین پر غالب آیا اور اللہ کا دین دنیا کے ان گوشوں تک پہنچا جہاں تک شب و روز کا تصور ہے اور آپ کی دعوت دنیا کے ان گوشوں تک پہنچی جہاں تک سورج کی روشنی پہنچ سکتی ہے۔

"حاشر" میں حشر کا مفہوم ہے۔ حشر سمیٹنے اور اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے، آپ ہی کے قدموں پر سمیٹ کر لوگوں کو مجتمع کیا جائیگا۔ گویا آپ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع کیے جائیں۔

"عاقب" اسے کہتے ہیں جو پیغمبروں کے پیچھے آتے۔ اس کے بعد کوئی اور پیغمبر نہ ہو۔ کیونکہ عاقب ہی آخر ہوتا ہے، تو عاقب بمنزلہ خاتم ہوا۔ آپ کا نام علی الاطلاق عاقب ہے۔ یعنی انبیاء کے پیچھے انبیاء کے بعد آنے والے۔

"مقفیؔ" کا مفہوم بھی عاقب ہی کا ہے۔ یعنی وہ نبی جو پیغمبران قدیم کے آثار پر آئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو انبیاء سابقین کے آثار پر لے آیا ہے۔ یہ لفظ قفو سے مشتق ہے قفا یقفو کے معنی مؤخر ہو جانے کے ہیں۔ اسی لیے قافیۃ الراس (سر کا پچھلا حصہ) اور قافیۃ البیت (شعر کا قافیہ) ہے، مقفی وہ ہوگا جو پیش رو پیغمبروں کے پیچھے آئے۔ تو آپ انبیاء کے خاتم اور آخری پیغمبر ہوئے۔

نبی توبہ

وہ نبی جس کے ذریعہ اللہ زمین والوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھول دے۔ آپ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے توبہ و استغفار کے ایسے مواقع فراہم کیے کہ کاہے کو دنیا نے آپ سے پہلے اس کی مثال دیکھی ہوگی۔ آپ بکثرت توبہ و استغفار فرماتے حتیٰ کہ ایک ہی مجلس میں "رب اغفرلی وتب الیّ، انك انت التواب الرحیم الغفور[1]" کا سو بار ورد آپ کی زبان سے سنا گیا۔ فرماتے تھے۔

یاایھا الناس توبوا الی اللہ ربکم فانی اتوب الی اللہ فی الیوم مأة مرة[2]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ تو میرا بندہ ہے، میرا رسول ہے، تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ نہ سخت ہے نہ درشت نہ بازاروں میں شور کرنے والا نہ بدی کا جواب بدی سے دے گا بلکہ معاف اور درگذر کرے گا، اللہ اسے اس وقت تک قبض نہ کرے گا جب تک کہ اس کے ذریعہ لا الٰہ الا اللہ کہلوا کر ٹیڑھی ملت کو سیدھی نہ کر دے۔ اس کلمہ کے ذریعہ وہ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھول دے گا۔

[1] ترمذی (۳۴۳۰) فی الدعوات: "باب مایقول اذا قام من مجلسہ"۔ ابوداؤد (۱۵۱۶) فی الصلوٰۃ: "باب الاستغفار"، ابن ماجہ (۳۸۱۴) فی الادب: "باب الاستغفار"، مسند احمد ج ۲، ص ۸۴، روایت عبداللہ بن عمر، سند صحیح ہے، ابن حبان (۲۴۵۹) نے اسے صحیح لکھا ہے، ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مسلم (۲۷۰۲) فی الذکر والدعا: باب استحباب الاستغفا والاستکثار منہ۔ ابوداؤد (۱۵۱۵) فی الصلوٰۃ: باب فی الاستغفار۔ اس میں ایک دوسری روایت اس طرح آئی ہے "انہ لیغان علی قلبی وانی لاستغفر اللہ فی کل یوم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لوگو! اپنے پروردگار اللہ سے توبہ کرو۔ کیونکہ اللہ سے میں دن میں سو بار توبہ کرتا ہوں۔

امت محمدی کی توبہ بھی باقی تمام امتوں کی توبہ سے کامل تر ہے، آسانی سے کی بھی جاسکتی ہے اور جلد قبول ہوجاتی ہے۔ یہ توبہ امت محمدیہ سے پہلے بے حد دشوار تھی۔ گئو سالہ پرستی سے بنو اسرائیل کو توبہ کرائی گئی تو اس کے لیے انھیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم ہوا مگر امت محمدی کی توبہ اس کے احترام و عظمت میں یہ رہی کہ فقط کردہ گناہوں پر ندامت ہو اور آئندہ معصیت سے اجتناب۔

نبی ملحمہ وہ نبی جنھیں اللہ کے دشمنوں کے خلاف مجاہد بنا کر بھیجا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کی امت نے اللہ کی راہ میں جو جہاد کیا وہ کسی اور نبی اور اس کی امت نے نہیں کیا۔ بڑے بڑے معرکے جو آپ کی امت اور کفار کے درمیان پیش آئے اور پیش آئیں گے، پیشتر اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، کیونکہ آپ کی امت ہر زمانہ میں کافروں کو قتل کرے گی۔ عملاً ایسے ایسے معرکے پیش آچکے ہیں جس کی نظیر پیش کرنے سے دوسری امتیں قاصر رہی ہیں۔

نبی رحمت اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ چنانچہ کیا مومن، کیا کافر، تمام انسانوں کے حق میں آپ رحمت ہیں۔ مسلمان تو مسلمان، کافروں کو بھی اس کا حصہ ملا۔ اہل کتاب آپ کے زیر سایہ اور آپ سے کیے گئے معاہدہ کے تحت عمر بھر عافیت سے رہے۔ ان کے علاوہ جو کافر آپ اور آپ کی امت کے ہاتھوں قتل ہوئے وہ بھی اپنے ٹھکانوں پر جلد جا پہنچے، ورنہ دنیا کی طویل زندگی آخرت میں ان کے لیے مزید عذاب کا باعث بنتی۔

فاتح وہ نبی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر رشد و ہدایت کا بند دروازہ کھول دے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے طفیل اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کے دروازے کھول دیئے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ دنیا میں کافروں کے ملک اور آخرت میں جنت کے دروازے کھول دیئے، علم نافع اور عمل صالح کی راہیں باز فرمائیں۔ دنیا بھی، آخرت بھی، قلوب بھی، سمع و بصر کی صلاحیتیں بھی، امصار و ممالک بھی، سبھی فتح فرمائے۔

امین دنیا میں سب سے زیادہ اس نام کے مستحق آپ ہیں، آپ وحی الٰہی کے امین ہیں، اللہ کے دین کے امین، آسمان والوں کے امین، زمین والوں کے امین، نبوت سے پیشتر لوگ آپ کو امین ہی کے لقب سے پکارتے تھے۔

ضحوک، قتال دونوں ناموں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ ضحوک (ہنس مکھ) مسلمانوں کے حق میں ہیں، ان پر غصہ نہیں ہوتے، ان کے ساتھ ترش روئی سے پیش نہیں آتے۔ مگر اللہ کے دشمنوں کے حق میں قتال (بے حد قاتل) ہیں۔ ان لوگوں کے باب میں آپ کسی لومۃ لائم کی پرواہ کرنے والے نہیں ہیں۔

بشیر طاعت گذاروں کو ثواب کی بشارت دینے والے۔

نذیر معصیت شعاروں کو سزا کی وعید سنانے والے۔

عبداللہ اپنی کتاب کے اندر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختلف مقامات پر عبداللہ (اللہ کا بندہ) کہہ کر پکارا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مائۃ مرۃ" (میرے دل پر غفلت طاری ہوجایا کرتی ہے اس لیے دن میں سو بار اللہ سے استغفار کرتا ہوں، یہ دوسری روایت ابوداؤد کے اندر بھی آئی ہے۔ دونوں کے راوی اغر بن یسار مزنی رضی اللہ عنہ ہیں۔

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ (الجن : ۲۰) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا۔

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ (الفرقان : ۱) نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندہ پر نازل کیا۔

فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (النجم : ۱۰) تب اس نے اپنے بندہ کو وحی پہنچائی جو بھی وحی پہنچانی تھی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (البقرة : ۲۳)

اور اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے۔

سیّد ولد آدم صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد منقول ہے۔

وأناسيّد ولد آدم [يوم القيامة] ولا فخر[1] فخر کی بات نہیں، قیامت کے دن، میں اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔

سراج منیر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سراج منیر (روشن چراغ) سے موسوم کیا ہے۔ آفتاب کو "سراج وہاج" کہا جاتا ہے منیر وہ چراغ جو بغیر جلائے روشنی دیتا ہے۔ مگر وہاج میں جلائے جانے اور بھڑکنے کا مفہوم داخل ہے۔

پہلی اور دوسری دونوں ہجرتوں کا بیان

مسلمانوں کی تعداد جب کثرت سے بڑھی اور دنیائے کفر میں اسی کے ساتھ ہلچل بھی پیدا ہو گئی تو کافروں کی اذیتوں اور بدسلوکیوں میں اور زیادہ اضافہ ہونے لگا۔ ان کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

"ان بها ملكا لا يُظلم الناس عنده" (یہاں ایک بادشاہ ہے جس کے یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔)

اجازت پا کر سولہ[16] مسلمانوں، بارہ[12] مرد اور چار عورتوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ ہجرت کرنے والوں میں سب سے پہلے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اپنی بیوی رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر نکلے۔ حبشہ میں یہ لوگ بڑے آرام سے رہے۔

---

[1] ترمذی (۳۶۱۸) فی المناقب: "باب فضل النبی صلی الله علیه وسلم" ابن ماجہ (۴۳۰۸) مسند احمد ج ۳، ص ۲۔ روایت ابو سعید خدری، احمد میں مکمل الفاظ حدیث کے حسب ذیل ہیں۔ "أنا سيد ولد آدم يوم القيامة ولا فخر، وبيدي لواء الحمد ولا فخر، وما من نبي يومئذ آدم فمن سواه الا تحت لوائي. وانا اول من تنشق عنه الارض ولا فخر" (فخر کی بات نہیں قیامت کے دن میں اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ فخر کی بات نہیں میرے ہاتھوں میں حمد کا پرچم ہوگا، اس دن کوئی نبی آدم ہوں کہ کوئی اور سب میرے پرچم کے تلے ہوں گے، فخر کی بات نہیں، میں پہلا شخص ہوں گا جو زمین سے نکل کر باہر آئے گا) اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہیں۔ باقی راوی ثقہ ہیں۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۴۴ میں انس کی روایت سے اس کی ایک نظیر بھی ہے۔ نیز اسی مسند احمد ج ۵، ص ۱۳۸ میں ابی بن کعب کی روایت سے بھی ایک اور نظیر ہے۔ ان دونوں نظیروں سے حدیث صحت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بخاری ج ۸، ص ۳۰۰، فی التفسیر: باب ذرية من حملنا مع نوح میں ابوہریرہ کی روایت سے حسب ذیل الفاظ نقل کیے ہیں "انا سيد الناس يوم القيامة . . ." یہ وہی شفاعت کی مشہور لمبی حدیث ہے۔ اسی طرح کی روایت مسلم (۱۹۴) فی الایمان: "باب ادنى اهل الجنة منزلة" میں بھی ہے۔ اسی مسلم (۲۲۷۸) فی الفضائل: "باب تفضيل نبينا صلى الله عليه وسلم" میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اس طرح کے الفاظ بھی نقل ہوتے ہیں۔ "انا سيد ولد آدم يوم القيامة، واول من ينشق عنه القبر، واول شافع واول مشفع" (میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں، سب سے پہلے قبر سے نکلوں گا، سب سے پہلا شفاعت کرنے والا، سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی)۔

ایک دن انھیں خبر پہنچی کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ خبر جھوٹی تھی۔ اسے سن کر مکہ واپس آئے، مگر راستہ میں معلوم ہوا کہ حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہے۔ کچھ تو راستہ ہی سے واپس لوٹ گئے، کچھ مکہ میں داخل ہوئے۔ انھیں قریش نے پہلے سے بھی زیادہ ستانا شروع کیا، مکہ میں داخل ہونے والوں میں عبداللہ بن مسعود بھی تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، چنانچہ اس دفعہ عمار (ان کے بارے میں شبہ ہے) سمیت تراسی[۸۳] مردوں اور اٹھارہ[۱۸] عورتوں نے ہجرت کی۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے جوار میں انھیں بڑا سکون ملا۔ قریش کو جب اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کی قیادت میں ایک وفد روانہ کیا تاکہ مسلمانوں کو کسی بہانہ واپس لائیں۔ مگر اللہ نے ان کی سازش ناکام بنا دی۔ ناکامی سے چڑھ کر قریش والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور زیادہ ستانا شروع کیا۔ آپ کو اور آپ کے خاندان کے تمام افراد کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔ یہ حصار تین سال اور بعض روایتوں کے مطابق دو سال رہا۔ اُنچاس سال اور بقول بعض روایات اڑتالیس سال کی عمر میں آپ اس حصار سے باہر نکلے۔ اس واقعہ کے چند ہی مہینوں بعد آپ کے چچا ابوطالب بعمر ستاسی سال وفات پا گئے۔ عبداللہ بن عباس اسی شعب ابی طالب میں پیدا ہوئے۔ چچا کی وفات کے بعد کافروں نے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ اذیتیں دینی شروع کیں۔ کچھ دنوں بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال کر گئیں۔ قریش کی اذیتیں اب اور بڑھ چکی تھیں دعوتِ اسلام پہنچانے کے لیے آپ اور زید بن حارثہ طائف تشریف لے گئے۔ وہاں چند دن قیام فرمایا۔ مگر آپ کی دعوت پر کسی نے کان نہ دھرا۔ بلکہ ستایا اور نکال باہر کیا۔ کچھ اوباشوں کو پیچھے لگا دیا۔ جنھوں نے آپ کو پتھر مارے، حتیٰ کہ آپ کے ٹخنے لہولہان ہو گئے۔ آپ مکہ کو واپس ہوئے۔ راستہ میں "عداس نصرانی" نے ایمان قبول کیا اور آپ کی تصدیق کی۔ واپسی میں بمقام "نخلہ" جنوں کی ایک جماعت جو باشندگان "نصیبین" کے سات افراد پر مشتمل تھی، آپ کی جانب مائل ہوئی۔ قرآن سنا اور اسلام قبول کیا[۱]۔ اسی راستہ میں اللہ نے پہاڑوں کے فرشتہ کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ جو حکم دیں اسے وہ نافذ کرے۔ چاہیں تو مکہ کے دونوں پہاڑ اخشب کے مابین ان کی قوم پیس کر رکھ دی جائے۔ مگر آپ نے فرمایا۔

لا بل استانی بہم، لعل اللہ یخرج من أصلابہم من یعبدہ لا یشرك بہ شیئا[۲]

---

[۱] ۔ تفسیر ابن جریر ج ۲۶، ص ۳۰ میں عبداللہ بن عباس کی روایت، آیت (واذ صرفنا الیك نفرا من الجن یستمعون القرآن ...) کے ضمن میں "قال کانوا سبعة نفر من اهل نصیبین فجعلهم رسول الله صلی الله علیه وسلم رسلا الی قومهم" (یہ باشندگان نصیبین کے سات افراد پر مشتمل تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنی قوم کا پیغامبر بنا کر بھیجا) سند حسن ہے۔

[۲] ۔ یہ بخاری ج ۶، ص ۲۲۴، ۲۲۵ - فی بدأ الخلق : باب ذکر الملائکة، وفی التوحید : وکان الله سمیعًا بصیرًا، مسلم (۱۷۹۵) فی الجهاد : باب مالقی النبی صلی الله علیه وسلم من أذی المشرکین والمنافقین - میں نقل شدہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث حسب ذیل ہے :

"ان عائشة رضی الله عنها قالت : یارسول الله هل أتی علیك یوم کان أشد من یوم أحد فقال : "لقد لقیت من قومك وکان أشد مالقیت منهم یوم العقبة إذ عرضت نفسی علی ابن عبد یالیل بن عبد کُلال، فلم یجبنی إلی ما أردت، فانطلقت وأنا مهموم علی وجهی فلم أستفق الا بقرن الثعالب، فرفعت راسی، فاذا انا بسحابة قد أظلتنی، فنظرت، فاذا فیها جبرئیل - فنادانی - فقال ان الله عزوجل قد سمع قول قومك لك . وماردّوا علیك، وقد بعث الیك ملك الجبال لتامره بماشئت فیهم، قال : فنادانی ملك الجبال، وسلم علی ثم قال : یامحمد ان الله قد سمع قول قومك لك، وانا ملك الجبال، وقد بعثنی ربك إلیك لتامرنی بأمرك فماشئت إن شئت أن أطبق علیهم الاخشبین، فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم : بل أرجو أن یخرج الله من اصلابهم من یعبد الله وحده لایشرك به شیئًا"، (عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا : یا رسول اللہ ! جنگ احد کے دن سے بھی زیادہ آپ کی زندگی میں کوئی سخت دن آیا ہے؟

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں۔ میں جلدی نہیں کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا کرے جو اس کی عبادت کرے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائے۔

اسی راستہ میں آپ نے وہ مشہور دعا فرمائی جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں :

اللهم إليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي . . . الحديث[1]

الٰہی ! تجھی سے شکوہ ہے اپنی طاقت کے ضعف اور اپنی تدبیر کے عجز کی . . . الحديث۔

اسراء اور معراج

بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے اندر مطعم بن عدی کی پناہ میں داخل ہوئے۔ پھر اسراء کا واقعہ پیش آیا۔ شب میں آپ کی رُوح اور جسم دونوں مسجد اقصیٰ پہنچے۔ پھر یہاں سے آسمانوں پر جسم اور روح سمیت معراج ہوئی۔ اللہ عزوجل کے حضور پہنچے۔ اللہ نے آپ کو مخاطب فرمایا۔ صلوٰۃ فرض کی۔ فرضیت کا واقعہ ایک ہی بار پیش آیا۔ اسراء اور معراج کی مذکورہ صورت صحیح ترین روایت کے مطابق ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ واقعات خواب میں پیش آئے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ نہ خواب نہ بیداری اسے صرف اسراء کہیے ایک قول یہ بھی ہے کہ بیداری میں بیت المقدس اور خواب میں آسمان پر پہنچے۔ ایک اور قول کے مطابق اسراء کا واقعہ دو بار پیش آیا۔ ایک بیداری میں ایک خواب میں۔ ایک اور خیال کے مطابق یہ واقعہ تین بار پیش آیا۔ واقعہ ایک بار پیش آیا ہو یا دو بار یا تین بار بہر حال بالاتفاق بعثت کے بعد پیش آیا۔

قاضی شریک بن عبداللہ[2] اپنی حدیث کے اندر اسراء و معراج کے واقعات کو قبل از وحی کے واقعات قرار دیتے ہیں مگر یہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فرمایا "تمہاری قوم کی جانب سے وہ دن بھی آچکا ہے۔ میرے ساتھ ان کا سب سے بُرا سلوک عقبہ کے دن اس وقت رہا جب میں نے ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا۔ مگر اس نے قبول نہیں کیا۔ میں وہاں سے سر جھکائے نہایت غمگین حالت میں روانہ ہوا۔ چپ و راست کی خبر اس وقت ہوئی جب قرن الثعالب پہنچا۔ میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ ایک بدلی سایہ کیے ہوئے تھی۔ اس میں سے یکایک جبرئیل علیہ السلام برآمد ہوئے۔ پکار کر مجھ سے کہا: "آپ کی قوم نے آپ سے جو کچھ کہا اور جو جواب دیا اسے اللہ نے سنا ہے، آپ کی خدمت میں اس نے پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے کہ اسے جو چاہیں حکم دیں۔ پہاڑوں کے فرشتہ نے مجھے پکارا۔ سلام کیا اور کہا: "محمد! آپ کی قوم نے آپ سے جو کچھ کہا اسے اللہ نے سنا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ مجھے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ جو چاہیں مجھے حکم دیں اگر چاہیں تو دونوں اخشب کے مابین انھیں پیس کر رکھ دوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ امید ہے کہ اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو پیدا کرے جو صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔)

[1] بعض علماء نے اسے دعاء طائف سے بھی موسوم کیا ہے۔ اس کے تمام الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"اللهم إليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا أرحم الراحمين، أنت أرحم الراحمين وأنت رب المستضعفين، إلى من تكلني إلى عدو بعيد يتجهمني ام الى صديق قريب ملكته امري إن لم يكن بك غضب علي فلا أبالي، غير ان عافيتك اوسع لي، اعوذ بنور وجهك الذي أضاءت له السماوات، وأشرقت له الظلمات، وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة أن ينزل بي غضبك او يحل بي سخطك، ولك العتبى حتى ترضى، ولاحول ولاقوة إلا بك"

(الٰہی! اپنی کمزوری۔ بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترش رو کے یا قریبی دوست کے جو میرے کام پر قابو رکھے۔ لیکن مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس دشمن کی کچھ پرواہ نہیں۔ کیونکہ تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام اسی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے۔ یا تری نارضامندی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے۔ اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔)

اس دعا کی تخریج طبرانی نے "المجمع" ج ۶، ص ۳۵ میں عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ اس کے راوی ابن اسحٰق جو مدلس ہے کے سوا تمام ثقہ ہیں۔

[2] شریک ابن عبداللہ ابن ابی نمر ابوعبداللہ مدنی سچے تھے۔ مگر بھولتے تھے۔ صحیح بخاری ج ۱۳، ص ۳۹۹ و ۴۰۶ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی آٹھ غلطیوں میں سے ایک ہے۔ انھیں اسراء کی حدیث یاد نہ رہی[1]۔ حدیث کی تاویل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسراء کے ضمن میں یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اسے قبل از نبوت حالتِ خواب کا اسراء کہیں گے۔ باقی حالتِ بیداری کے اندر اسراء وہی ہے جس کا واقعہ بعد از نبوت پیش آیا ہے۔ ایک تاویل یہ بھی ہے کہ شریک کی حدیث میں لفظ وحی مقید ہے۔ اس سے مراد وحی مطلق نہیں۔ جس سے آغازِ نبوت ہوا کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ "اسراء" کے بارے میں کچھ وحی کرنے سے پہلے بغیر کسی آگاہی کے اچانک "اسراء" کا واقعہ پیش آیا۔ واللہ اعلم۔

بیعتِ عقبہ

مکہ میں جب تک قیام رہا قبائل کو آپ اللہ کے دین کی دعوت دیتے رہے۔ حج اور دیگر تمام مناسبات میں آپ اپنے کو قبائل کے سامنے پیش فرماتے کہ وہ آپ کو پناہ دیں تاکہ آپ اپنے رب کا پیغام پہنچا سکیں۔ صلے میں اللہ انھیں جنت دے گا۔ مگر اس دعوت پر کسی خاندان نے کان نہیں دھرا۔ یہ شرف تو اللہ تعالیٰ نے انصارِ مدینہ کے حق میں مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب اللہ نے چاہا کہ اپنے دین کو غالب کرے، اپنا وعدہ پورا کرے، اپنے نبی کی مدد کرے، اپنا کلمہ بلند کرے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے تو انصار کو شرف عطا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ آپ کو انصار کے یہاں لے آیا۔ آپ ان میں سے ایک جماعت کے پاس پہنچے جن کی تعداد چھ، بقول بعض روایات آٹھ تھی۔ یہ سب لوگ "منیٰ" کی گھاٹی میں ادائے مناسک کے بعد اپنے سر منڈوا رہے تھے۔ آپ یہاں آ کر بیٹھ گئے۔ آپ نے اللہ کا پیغام سنایا۔ قرآن کی آیات تلاوت فرمائیں۔ انصار نے دعوت قبول کی۔ مدینہ واپس ہوئے تو قوم کو بھی دعوتِ اسلام سے روشناس کیا۔ حتیٰ کہ سارے مدینہ میں یہ آواز پھیل گئی۔ ہر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہونے لگا۔ مدینہ کی وہ پہلی مسجد جس میں قرآن کی تلاوت ہوئی مسجد "بنی زریق" تھی۔ دوسرے سال مدینہ سے بارہ اشخاص مکہ آئے۔ جن میں پانچ انہی چھ خوش بختوں میں سے تھے جن سے پہلے آپ نے ملاقات فرمائی تھی۔ عقبہ کے پاس انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں والی بیعت کی[2]۔

پھر مدینہ واپس آ گئے۔ دوسرے سال تہتر مرد اور دو عورتیں آئیں۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کے لوگ ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ آپ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنی بیویوں، بچوں اور خود اپنی کرتے ہیں۔

ہجرتِ مدینہ

بعد ازاں آپ اور آپ کے صحابہ نے مدینہ کی جانب کوچ کیا۔ صحابہ میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ سردار منتخب فرمائے۔ اور اپنے صحابہ کو ہجرت کی اجازت دی۔ چنانچہ مختلف ٹولیوں میں چھپ کر مدینہ روانہ ہونے لگے۔ ایک روایت کے مطابق مکہ چھوڑ کر مدینہ سب سے پہلے جانے والے ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق مصعب بن عمیر تھے[3]۔ مدینہ پہنچ کر یہ لوگ جب انصار کے گھروں پر اترے تو انھوں نے ان کی مدد کی اور پناہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میں ان کی روایت سے اسراء کی جو حدیث وارد ہے اس میں اضطراب ہے، اچھی طرح اسے وہ ضبط نہ کر سکے۔

[1] حافظ ابن حجر نے "الفتح" ج ۱۳، ص ۳۹۹ میں "قبل أن یوحی" (قبل از وحی) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے خطابی، ابن حزم، عبدالحق، قاضی عیاض اور نووی نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ نووی کے الفاظ حسب ذیل ہیں: "وقع فی روایۃ شریک۔ یعنی ھذہ أوھام انکرھا العلماء، احدھا: قبل أن یوحی الیہ وھو غلط لم یوافق علیہ وأجمع العلماء علی أن فرض الصلوۃ کان لیلۃ الاسراء فکیف یکون قبل الوحی؟ وانظر بقیۃ الأوھام فیہ"۔ (شریک کی اس روایت میں کچھ اوہام ہیں جس کی علماء نے تردید کی ہے۔ ایک قبل از وحی کا وہم ہے۔ یہ غلط ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ صلوٰۃ کی فرضیت شبِ اسراء میں ہوئی ہے پھر یہ قبل از وحی کیونکر ہو سکتی ہے۔ بقیہ اوہام کی تفصیل مطلوب ہو تو نووی کا مطالعہ فرمائیں۔

[2] "بیعۃ النساء" سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اسی طرح حفاظت و مدد کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی اپنے گھروں میں کرتے ہیں۔ مدینہ کے اندر کوئی آپ پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اور "بیعت قتال" یہ ہے کہ کسی سے اس بات کے لیے بیعت کی جائے کہ اس کی جان و مال کی حفاظت کے لیے دشمن سے بیعت کرنے والا قتال بھی کرے گا۔

[3] بخاری ج ۷، ص ۲۰۳، فی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "باب مقدم النبی صلی اللہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دی۔ صحابہ کا مدینہ پہنچنا تھا کہ اسلام بڑی سرعت سے پھیلنے لگا۔ اللہ نے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہجرت کی اجازت دی۔ چنانچہ دوشنبہ کے دن، ماہ ربیع الاول[1] ایک قول کے مطابق ماہ صفر میں آپ مکہ سے باہر نکلے۔ اس وقت آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، ان کا غلام "عامر بن فہیرہ"، اور دلیل راہ "عبداللہ بن اریقط لیثی" تھا۔ سب سے پہلے آپ اور حضرت ابوبکر غار ثور میں داخل ہوئے۔ یہاں تین دن قیام فرمایا۔ پھر ساحلی راستہ اختیار کر کے مدینہ کی راہ لی۔ مدینہ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کے دن پہنچے۔ ہجرت کی تاریخ اور دن کے سلسلے میں اس کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی ہیں (جن کے ذکر کی ضرورت نہیں)

سب سے پہلے مدینہ کے بالائی مقام قباء میں آمد ہوئی۔ یہاں "بنی عمرو بن عوف" کے مہمان ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق یہاں "کلثوم بن ہدم"، بعض کے مطابق "سعد بن خثیمہ" نے آپ کی میزبانی کی۔ مشہور پہلی روایت ہے۔ یہاں آپ نے چودہ دن قیام فرمایا۔ اس عرصہ میں "مسجد قباء" کی بنیاد رکھی۔ جمعہ کے دن یہاں سے روانہ ہوئے۔ آگے بنوسالم میں جمعہ کا وقت آگیا۔ چنانچہ یہیں مسلمانوں کے ساتھ جن کی تعداد ایک صد تھی جمعہ کی صلوٰۃ ادا فرمائی۔ پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ راستہ میں مدینہ کے لوگ اپنے یہاں اترنے کی درخواست پیش کرتے۔ آگے بڑھ کر اونٹنی کی مہار بھی تھام لیتے مگر آپ فرماتے "اسے چھوڑ دو یہ اللہ کے حکم سے" چل رہی ہے[2]

چنانچہ اونٹنی آپ کو لے کر وہاں بیٹھی جہاں آج مسجد نبوی ہے۔ یہ جگہ "بنو نجار" کے دو بچوں "سہل" اور "سہیل" کا کھلیان[3] تھی۔ سواری سے اتر کر آپ ابو ایوب انصاری کے مہمان ہوئے۔ کھلیان کے مقام پر اپنی مسجد خود اپنے ہاتھوں اور صحابہ نے مل کر کھجور کی شاخوں اور اینٹ و پتھر سے تعمیر کی[4]۔ بعد ازیں مسجد کے پہلو میں اپنا اور اپنی بیویوں کے لیے مکانات تعمیر فرمائے۔ آپ کے مکان سے سب سے قریب تر حضرت عائشہ کا مکان تعمیر ہوا۔ سات ماہ کے بعد ابو ایوب کے یہاں سے اٹھ کر تعمیر شدہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) علیہ وسلم وأصحابہ المدینۃ" وفی تفسیر سورۃ سبح اسم ربك الاعلی، وفی فضائل القرآن: "باب تالیف القرآن" الفاظ براء بن عازب کے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہمارے یہاں سب سے پہلے آنے والوں میں مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم تھے۔ پھر عمار بن یاسر اور بلال آئے۔

[1] واقعہ ہجرت کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے، صحیح بخاری ج ۷، ص ۱۸۰ و ۱۹۳ میں حضرت عائشہ کی حدیث۔

[2] یہ واقعہ بیہقی کی "الدلائل" سے ماخوذ ہے، اس میں انس کا بیان ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ جب ہم مدینہ میں داخل ہوئے تو انصار اپنے اپنے افراد خاندان مردوں اور عورتوں کو لے کر آتے رہے اور درخواست کرتے رہے کہ رسول اللہ ہمارے یہاں قیام فرمائیں۔ مگر آپ فرماتے کہ "اونٹنی کو چھوڑ دو۔ یہ مامور ہے۔ چنانچہ چلتے چلتے وہ ابو ایوب کے دروازے پر بیٹھ گئی۔ . . ."۔ اس حدیث کی سند میں ابراہیم بن صرمہ ہے جس کو دارقطنی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن معین نے اسے کاذب کہا ہے، ابن عدی کہتے ہیں "اس کی تمام حدیثیں سند اور متن دونوں کے اعتبار سے منکر ہیں۔" "الدلائل" بیہقی کے حوالہ سے ابن کثیر نے "البدایہ" ج ۳، ص ۲۰۲ میں سعید بن منصور کی حدیث درج کی ہے جس میں وہ عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ کی اونٹنی جعفر بن محمد کے گھر اور حسن بن زید کے گھر کے درمیان بیٹھ گئی۔" لوگوں نے آکر کہا رسول اللہ! گھر چلیں، اونٹنی فوراً آپ کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے، اونٹنی آپ کو لے کر اس مقام پر آئی جہاں آج مسجد نبوی کا منبر ہے۔ یہاں بیٹھ گئی۔ یہیں ایک چھپر تھا جس میں لوگ اٹھتے بیٹھتے اور دھوپ سے بچتے تھے۔ اونٹنی سے یہاں اتر کر سایہ میں آئے۔ اس وقت ابو ایوب آپ کی خدمت پہنچے اور فرمایا: رسول اللہ! آپ سے قریب تر مکان میرا ہے۔ کجاوا میرے یہاں لے چلیں۔ آپ نے فرمایا "ہاں" اور پھر کجاوا ابو ایوب کے گھر لے گئے۔ پھر ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "رسول اللہ! آپ کہاں رہیں گے؟ فرمایا "آدمی وہیں رہتا ہے جہاں اس کا کجاوا ہو" دیکھیے "طبقات ابن سعد" ج ۱، ص ۲۳۶ و ۲۳۷۔

[3] لفظ "مربد" ہے جس کا ترجمہ ہم نے کھلیان کیا ہے۔ یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کھجوریں خشک کی جاتی ہیں، اصمعی کہتے ہیں مربد ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اونٹ یا بکری باندھے جاتے ہیں۔ "مربد بصرہ" وہ مقام جہاں بصرہ میں اونٹوں کا بازار لگتا ہے۔

[4] بخاری ج ۷، ص ۱۹۲ کی طویل حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے جو "فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونزول النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ابی ایوب" میں وارد ہے، مسلم نے اس کی تخریج ج ۳، ص ۱۶۲۳ فی الأشربہ میں کی ہے۔

حجروں میں آ گئے۔

جو صحابہ پہلے ہجرت کر کے حبشہ جا چکے تھے انھیں ہجرت مدینہ کی خبر ملی تو تینتیس افراد کی ایک جماعت نے مدینہ کا قصد کیا۔ راستہ میں مکہ والوں کے ہاتھوں ان میں سات قید ہو گئے باقی مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پہنچ جانے میں کامیاب ہوئے۔

حبشہ کے اندر موجود باقی مسلمانوں نے بھی ۷ھ میں بذریعہ کشتی سمندری راستہ سے مدینہ ہجرت کی۔[1]

اولاد

۱۔ قاسم۔ سب سے پہلی اولاد ہیں۔ انہی کے نام پر آپ کی کنیت ابو القاسم ہے، بچپن میں انتقال فرمایا، بعض روایتوں کے مطابق عمر کی اس منزل میں داخل ہو چکے تھے جس میں انھوں نے سواری کی اور تیز رفتار اونٹنی پر سفر کیا۔

۲۔ زینب، دوسری اولاد ہیں۔ ایک روایت کے مطابق قاسم سے بڑی تھیں۔

۳۔ رقیہ۔

۴۔ ام کلثوم۔

۵۔ فاطمہ۔

بالترتیب ہیں۔ بعض روایتوں کے مطابق ہر ایک اپنی دو بہنوں سے بڑی تھیں۔ عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ رقیہ سب سے بڑی تھیں۔ اور ام کلثوم سب سے چھوٹی۔

۱۔ بخاری ج ۷، ص ۱۷۳ فی المغازی: "باب غزوۃ خیبر" میں ابو موسیٰ اشعری کا بیان: عن ابی موسی الاشعری قال: بلغنا مخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونحن بالیمن، فخرجنا مہاجرین إلیہ أنا وأخوان لی، أنا اصغرھم، أحدھما ابو بردۃ۔ والأخر ابو رھم، إما قال: بضعا وإما قال: فی ثلاثۃ وخمسین.... الحدیث (یمن میں ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر ملی۔ چنانچہ میں اور میرے دو بھائی جن میں سب سے چھوٹا میں تھا۔ ایک ابو بردہ، دوسرے ابو رہم، یہ سب ہجرت مدینہ کے مقصد سے روانہ ہوگئے۔ آگے آپ نے چند کہا یا ترپن کی تعداد بتائی) قوم کے یہ لوگ ایک کشتی پر سوار ہوئے، اتفاق سے کشتی کا رخ حبشہ میں نجاشی کی جانب ہوگیا۔ چنانچہ یہاں "جعفر بن ابی طالب" سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے آپ کے ساتھ قیام کیا۔ اور پھر سب کے سب روانہ ہوئے۔ فتح خیبر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ لوگ ہم کشتی والوں سے کہنے لگے۔ دیکھو ہم نے تم سے پہلے ہجرت کی ہے۔ اسماء بنت عمیس جو ہمارے ساتھ آئی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں بغرض ملاقات گئیں۔ حبشہ ہجرت کر کے جانے والوں میں یہ بھی تھیں۔ حفصہ کے یہاں وہ موجود تھیں کہ عمر آ گئے، اسماء کو دیکھ کر پوچھا: یہ کون ہے؟ فرمایا اسماء بنت عمیس، عمر نے پوچھا "حبشہ ہجرت کر کے جانے والی اور براہ سمندر آنے والی؟" اسماء نے کہا "ہاں" فرمایا "ہم نے تم سے پہلے ہجرت کی ہے۔ لہٰذا تمھارے مقابلہ میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ حق دار ہیں"۔ اس پر غضبناک ہو کر بولیں "ہرگز نہیں۔ قسم اللہ کی! تم لوگ رسول اللہ کی معیت میں تھے، تمھارے اندر جو بھوکے تھے انھیں آپ کھلاتے تھے، جو جاہل تھے انھیں وعظ فرماتے تھے۔ مگر ہم دور دراز نامناسب جگہ حبشہ میں تھے۔ یہ بُعد منزل ہم نے صرف اللہ اور اللہ کے رسول کی راہ میں اختیار کی تھی۔ قسم اللہ کی! نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کر لوں، ہمیں اذیت پہنچتی رہی، ہم برابر خطروں کی زد پر رہے، اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کروں گی اور دریافت کروں گی، قسم اللہ کی! جھوٹ بولوں گی نہ کجی اختیار کروں گی نہ مبالغہ سے کام لوں گی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو بولیں اللہ کے نبی! عمر نے ایسا ایسا کہا ہے: آپ نے فرمایا "تم نے کیا جواب دیا" انھوں نے کہا "ایسا ایسا جواب دیا" فرمایا "میرے حق دار تم سے زیادہ وہ نہیں ہیں۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ایک ہجرت کی ہے۔ مگر تم اہل کشتی نے دو ہجرتیں کی ہیں۔

۶۔ عبداللہ۔ ولادت نبوت سے پیشتر ہوئی یا بعد میں۔ مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ بعض علماء کی تحقیق ہے کہ بعد از نبوت ہوئی۔ انہی کو طیب اور طاہر بھی کہتے ہیں یا "طیب" و "طاہر" الگ الگ آپ کی دوسری اولادیں ہیں؛ صحیح یہ ہے کہ "طیب" و "طاہر" انہی عبداللہ کے دو لقب تھے۔ واللہ اعلم۔

یہ ساری اولادیں خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ خدیجہ کے علاوہ کسی اور بیوی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۷۔ ابراہیم۔ ۸ھ ہجری میں آپ کی لونڈی "ماریہ قبطیہ" کے بطن سے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ولادت کی خوشخبری آپ کو آپ کے غلام "ابورافع" نے دی، اس پر انھیں ایک غلام عطا فرمایا۔ ایام رضاعت ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کی صلوٰۃ جنازہ کے باب میں اختلاف ہے۔ فاطمہ کے سوا آپ کی تمام اولادیں آپ سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔

فاطمہ کی وفات آپ کے چھ ماہ بعد ہوئی[۱]۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر اور احتساب کی وجہ سے ان کے درجے بلند فرمائے اور وہ دنیا کی عورتوں سے افضل قرار دی گئیں۔ آپ کی تمام صاحبزادیوں میں علی الاطلاق وہ افضل ہیں۔ ایک قول کے مطابق دنیا کی تمام عورتوں پر بھی انھیں فوقیت ملی۔ مگر ایک قول کے مطابق یہ افضلیت ان کی ماں خدیجۃ الکبریٰ اور ایک قول کے مطابق عائشہ کو حاصل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مسئلہ متوقف فیہ ہے۔

چچا اور پھوپھیاں

۱۔ حمزہ بن عبدالمطلب۔ اسداللہ و اسدالرسول، سیدالشہداء۔ ۲۔ عباس۔ ۳۔ ابوطالب کنیت ہے۔ نام عبدمناف ہے۔ ۴۔ ابولہب کنیت ہے۔ نام عبدالعزیٰ۔ ۵۔ زبیر۔ ۶۔ عبدالکعبہ۔ ۷۔ مقوم۔ ۸۔ ضرار۔ ۹۔ قثم۔ ۱۰۔ مغیرہ۔ لقب حجل۔ ۱۱۔ غیداق، نام مصعب، بعض روایتوں کے مطابق نوفل۔ ۱۲۔ عوام۔ بعض روایتوں کے مطابق چچاؤں کی فہرست میں ان کا بھی نام ہے۔

حمزہ اور عباس رضی اللہ عنہما کے سوا ان میں کوئی بھی مشرف بہ اسلام نہ ہوا۔

پھوپھیاں حسب ذیل تھیں:

۱۔ صفیہ رضی اللہ عنہا زبیر بن العوام کی ماں۔ ۲۔ عاتکہ۔ ۳۔ برہ۔ ۴۔ اروی۔ ۵۔ امیمہ۔ ۶۔ ام حکیم البیضا۔ صرف "صفیہ" مسلمان ہوئیں۔ "اروی" اور "عاتکہ" کے اسلام میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے "اروی" کے مسلمان

---

[۱] بخاری ج ۸، ص ۱۰۳ میں عائشہ کا بیان "قالت: دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاطمۃ فی شکواہ الذی قبض فیہ، فسارّھا بشیء فبکت، ثم دعاھا فسارّھا بشیء فضحکت فسألنا عن ذلک۔ فقالت: سارّنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ یقبض فی وجعہ الذی توفی فیہ، فبکیت ثم سارّنی فاخبرنی أنی أول اھلہ یتبعہ فضحکت"۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فاطمہ کو بلا کر کان میں کچھ کہا تو وہ رو پڑیں۔ دوبارہ بلا کر کان میں کچھ کہا تو ہنس پڑیں۔ دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چپکے سے فرمایا کہ اس تکلیف میں وفات پا جائیں گے اس پر میں رو پڑی۔ پھر چپکے سے فرمایا: خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آملو گی اس پر میں ہنس پڑی۔" بخاری ج ۶، ص ۴۶۲ کی ایک روایت میں آپ کا ارشاد اس طرح ہے "تم اس بات پر خوش نہیں کہ جنتی یا مسلمان عورتوں کی سردار تم ہوگی" اس پر وہ ہنس پڑیں۔ صحیح مسلم (۱۷۵۹) (۵۴) میں عائشہ کا بیان ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ چھ ماہ زندہ رہیں"۔

ہونے کی تصدیق کی ہے۔

چچاؤں میں سب سے بڑے "حارث" اور سب سے چھوٹے "عباس" تھے۔ عباس سے بکثرت اولادیں ہوئیں حتیٰ کہ تمام روئے زمین پر چھا گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مامون کے زمانہ میں ان کی مردم شماری ہوئی تو تعداد چھ لاکھ تک پہنچی۔ مگر اس روایت میں مبالغہ ہے۔ ابوطالب، "حارث" اور "ابولہب" سے بھی بکثرت اولادیں ہوئیں۔ بعض راویوں نے "حارث" اور "مقوم" اور بعض نے "غیداق" اور "حجل" کو ایک ہی قرار دیا ہے۔

ازواج مطہرات

۱۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد قرشیہ اسدیہ (قریش میں بنو اسد کی) سب سے پہلی بیوی ہیں۔ قبل از نبوت ان سے نکاح ہوا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ ان کی وفات تک آپ نے اور کوئی شادی نہیں کی۔ "ابراہیم" کے سوا تمام اولادیں انہی کے بطن سے ہیں۔ یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے بارِ نبوت سنبھالنے میں آپ کے ساتھ تعاون کیا۔ مشقتیں اور مصائب جھیلیں، جان و مال سب کچھ آپ پر نچھاور کیا۔ جبرئیل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام بھیجا۔ یہ خصوصیت دنیا کی کسی خاتون کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہجرت سے تین سال پیشتر وفات پائی۔

۲۔ سودہ بنت زمعہ قرشیہ۔ خدیجہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح فرمایا۔ یہ وہی بیوی ہیں جنھوں نے اپنی باری حضرت عائشہ کو ہبہ کر دی تھی۔

۳۔ عائشہ ام عبداللہ کنیت، صدیقہ لقب، ابوبکر صدیق کی صاحبزادی۔ ساتوں آسمانوں کے اوپر سے ان کی برات نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی۔ نکاح سے پہلے فرشتہ نے ریشمی ٹکڑے میں رکھ کر انھیں آپ کی خدمت میں پیش کیا اور خبر دی کہ یہ آپ کی بیوی ہیں[1]۔ شوّال کے مہینہ میں ان سے نکاح ہوا۔ اس وقت عائشہ کی عمر چھ سال تھی، سلہ ھ ماہ شوّال میں بعمر نو سال رخصت ہو کر آپ کی خدمت میں آئیں۔ ان کے سوا آپ نے کسی اور کنواری سے شادی نہیں کی۔ نیز آپ کے علاوہ کسی اور بیوی کے لحاف میں وحی کا نزول نہیں ہوا۔ ساری مخلوق میں سب سے زیادہ یہی محبوب تھیں۔ آپ کی برأت کی خبر آسمان سے اتری، امت کا اتفاق ہے کہ آپ پر تہمت لگانے والا کافر ہے۔ علمی اور فقہی اعتبار سے تمام ازواج کیا امت کی تمام خواتین میں آپ کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ اکابر صحابہ آپ کا قول معلوم کرتے اور فتوے طلب کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ حمل سے بھی ہوئیں مگر اسقاط ہو گیا۔ مگر روایت ثابت نہیں ہے۔

---

[1] بخاری ج ۱۲، ص ۳۵۲ فی التعبیر، مسلم (۲۴۳۸) میں عائشہ کا بیان ہے "أریتك فی المنام مرتین اذا رجل یحملك فی سرقة (شقة من حریر أبیض) من حریر فیقول: هذه إمرأتك فاكشفها فاذا هی أنتِ فاقول: إن یكن هذا من عند الله یمضه" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خواب میں تم مجھے دوبار نظر آئیں ایک آدمی تمھیں ایک ریشمی ٹکڑے میں لیے کہہ رہا تھا" یہ آپ کی بیوی ہیں" کھولا تو تجھے پایا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ بات منجانب اللہ ہے تو ایسا ضرور ہوگا" سات سال کی عمر میں ان سے شادی اور نو سال کی عمر میں رخصتی کی روایت ہے۔ دیکھیے بخاری ج ۹، ص ۱۶۳، فی النکاح: باب انکاح الرجل ولدہ الصغار، مسلم (۱۴۲۲) فی النکاح: باب تزویج الاب البکر الصغیرة۔

۴۔ حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہا ابوداؤد کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں طلاق دے دی تھی پھر رجوع فرمالیا[1]

۵۔ زینب بنت خزیمہ بن حارث القیسیہ۔ خاندان بنوہلال بن عامر سے تھیں۔ حبالۂ عقد میں آنے کے دو ماہ بعد آپ کے یہاں انتقال ہوا۔

۶۔ ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ قرشیہ مخزومیہ۔ ابوامیہ کا نام حذیفہ بن مغیرہ ہے، ازواجِ مطہرات میں سب کے بعد انتقال ہوا۔ ایک روایت کے مطابق سب سے آخر میں وفات پانے والی صفیہ ہیں۔

اختلاف ہے کہ نکاح میں ان کا ولی کون تھا۔ ابن سعد طبقات میں رقمطراز ہیں۔ "سلمہ بن ابی سلمہ کے سوا ان کی خاندان کا کوئی اور فرد ولی نہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمہ بن ابوسلمہ کی شادی جب امامہ بنت حمزہ سے کردی، یہ وہ خاتون تھیں جن سے شادی کے خواہشمند علی، جعفر اور زید رضی اللہ عنہم بھی تھے تو آپ نے فرمایا "سلمہ کو ان کا بدلہ میں نے دے دیا[2]"۔ یعنی یہی وہ سلمہ تھے جو ام سلمہ سے آپ کی شادی کے موقع پر ولی بن کر آتے۔ ان کے خاندان سے ان کے علاوہ کوئی نہیں آیا۔

ابن سعد نے اس واقعہ کا تذکرہ سلمہ کے حالاتِ زندگی میں کیا ہے۔ ام سلمہ کے حالات بھی جہاں انھوں نے قلمبند کیا ہے وہاں واقدی کے حوالہ سے درج ذیل سند سے "الواقدی عن مجمع ابن یعقوب عن ابی بکر بن محمد بن عمر بن ابی سلمہ عن ابیہ" یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ سے پیغام نکاح ان کے صاحبزادہ عمر بن ابوسلمہ کو بھیجا تو انھوں نے ان کی شادی آپ سے کردی۔ اس وقت وہ ننھے بچے تھے[3]

مسند امام احمد میں ام سلمہ سے ایک روایت بایں سند "احمد عن عفان عن حماد عن ثابت عن ابن عمر ابن ابی سلمہ عن ابیہ عن ام سلمہ" منقول ہے۔ جس میں وہ کہتی ہیں کہ ابوسلمہ کی وفات کے بعد جب ان کی عدت پوری ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انھیں پیغام ملا، پیغام کو مرحبا کہتے ہوئے فرمایا "میں خوددار عورت ہوں۔ گود میں بچہ ہے۔ اس وقت کوئی ولی اپنا موجود نہیں ہے"۔ روایت کے اندر یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے بچے عمر سے کہا: "جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیاہ دو"۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی شادی کردی[4]

یہ بیان محلِ نظر ہے۔ کیونکہ ابن سعد کی تصریح کے مطابق عمر ابن ابی سلمہ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت نو سال تھی۔ ام سلمہ سے آپ کا نکاح شوال ۴ھ میں ہوا اس کا مطلب یہ ہے کہ عمر ابن ابی سلمہ کی عمر اس وقت تین سال تھی۔

تین سال کا بچہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ولی بن سکے۔ ابن سعد وغیرہ نے بھی یہی تبصرہ کیا ہے امام احمد سے جب اس

---

[1] ابوداؤد (۲۲۸۳) فی الطلاق: باب فی المراجعۃ۔ سند صحیح ہے۔ اس کی روایت ابن ماجہ (۲۰۱۶) فی الطلاق: باب فی الرجعۃ اور نسائی نے بھی ج ۶، ص ۲۱۳ فی الطلاق: باب الرجعۃ میں کی ہے۔

[2] حافظ "الاصابۃ" ج ۳، ص ۱۱۷ میں سلمہ بن ابوسلمہ بن عبدالاسد کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق نے فرمایا "مجھ سے ایک ایسے راوی نے یہ حدیث بیان کی جو میرے نزدیک متہم نہیں۔ انھوں نے عبداللہ بن شداد سے روایت کرتے ہوئے فرمایا "ام سلمہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرنے والے ان کے صاحبزادہ سلمہ بن ابوسلمہ ہیں۔ ان کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امامہ بنت حمزہ سے کردی۔ یہ دونوں نوعمر تھے۔ یکجا ہونے سے پہلے دونوں نے وفات پائی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سلمہ کو بدلہ دے دیا نا؟"

[3] طبقات ابن سعد ج ۸، ص ۹۸، روایت واقدی سے، یہ وسعتِ علم کے باوجود متروک ہیں۔

[4] مسند احمد ج ۶، ص ۳۱۳، نسائی ج ۶، ص ۸۱، فی النکاح: باب إنکاح الابن أمہ، طبقات ابن سعد ج ۸، ص ۸۹، سند صحیح ہے۔ حافظ نے "الاصابۃ" ج ۴، ص ۴۴۰ میں نسائی کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی سند صحیح قرار دی ہے۔

سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کون کہتا ہے عمر اس وقت بچہ تھے؟ ابو الفرج ابن الجوزی کہتے ہیں کہ امام احمد نے یہ بات اس وقت کہی ہے جب وہ عمر کی عمر سے واقف نہیں تھے۔ فرمایا۔ مؤرخین کی ایک پوری جماعت نے جس میں ابن سعد وغیرہ بھی شامل ہیں عمر ابن ابی سلمہ کی عمر وہی متعین کی ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس حدیث کی تاویل میں ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنے والے ام سلمہ کے عم زاد عمر ابن الخطاب ہیں۔ حدیث کے اندر "قم یا عمر فزوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سے یہی مخاطب ہیں۔ عمر اور ام سلمہ دونوں کا سلسلۂ نسب کعب پر مل جاتا ہے۔ دونوں کا نسب نامہ اس طرح ہے۔

عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن رباح بن عبد اللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب۔ ام سلمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ بن مرۃ بن کعب۔

اتفاق سے بیٹے کا نام بھی عمر تھا۔ چنانچہ بعض راویوں کو دھوکہ ہوا اور عمر کو ام سلمہ کا بیٹا عمر سمجھ لیا گیا۔ روایت میں "وقالت لابنہا" کے الفاظ داخل کر کے روایت بالمعنیٰ کر ڈالی گئی ہے۔ یہ خیال نہیں ہوا کہ وہ تو انتہائی صغیر السن تھے۔

اسی طرح اس حدیث کے اندر بعض فقہاء کو یہ وہم بھی ہو گیا ہے کہ روایت میں الفاظ "فقال رسول اللہ صلی اللہ وسلم قم یا فلاں / غلام فزوج أمك" (اے فلاں یا بچے! جاؤ اپنی ماں کی شادی کر دو) وارد ہیں۔ ابو الفرج ابن جوزی لکھتے ہیں کہ حدیث میں اس فقرہ کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہے۔ اگر ثابت بھی ہو تو یہ ممکن ہے کہ بچہ سے بطور ملاطفت فرمایا ہو کیونکہ اس وقت اس کی عمر تین سال تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شادی ۴ھ میں کی تھی، آپ کی وفات کے وقت عمر بن ابی سلمہ نو سال کے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے لیے کسی ولی کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ابن عقیل کہتے ہیں کہ امام احمد کی گفتگو سے ایسا لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں کسی ولی کی شرط نہ تھی۔ یہ بات آپ کی من جملہ خصوصیات تھی۔

۶۔ زینب بنت جحش۔ خاندان بنو اسد بن خزیمہ کی خاتون۔ آپ کی پھوپھی امیمہ کی صاحبزادی۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا (احزاب: ۳۷)

پھر زید جب اس سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا نکاح تم سے کر دیا۔

اپنے باب میں وحی الٰہی کی اسی بنیاد پر دیگر ازواج مطہرات سے فخریہ فرماتیں کہ تمہاری شادی تو تمہارے لوگوں نے کیا مگر میری شادی ساتوں آسمانوں کے اوپر اللہ نے کیا[1] ان کی خصوصیات میں یہ بات تھی کہ اللہ تعالیٰ خود ان کا ولی تھا جس نے ان کی شادی اپنے رسول سے آسمانوں کے اوپر سے کی۔ خلافت فاروقی کی ابتدا میں وفات پائی۔ آپ کا نکاح پہلے زید بن حارثہ سے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ انھوں نے جب طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ان سے کر دی تاکہ امت میں منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کا طریقہ رائج ہو جائے۔

---

[1] بخاری ج ۱۳، ص ۳۴۷، فی التوحید۔ انس کا بیان "قال جاء زید بن حارثۃ یشکو فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اتق اللہ وامسك علیك زوجك" (زید بن حارثہ شکایت کرنے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے "اللہ سے ڈرو، اپنی بیوی کو باقی رکھو) انس فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ چھپا سکتے تو یہی چھپاتے" آگے فرماتے ہیں "زینب دیگر ازواج مطہرات سے فخریہ فرماتیں "تمھیں تمھارے لوگوں نے بیاہا ہے مگر مجھے اللہ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر سے بیاہا ہے" ترمذی (۳۲۱۰) نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔

۷ - جویریہ بنت حارث بن ابی ضرار مصطلقیہ - خاندان بنو مصطلق کی کنیز تھیں - اپنی آزادی کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعانت کی طالب ہوئیں تو آپ نے آزادی کی جملہ رقم ادا فرمادی پھر ان سے شادی کرلی -

۸ - ام حبیبہ - نام رملہ بنت ابوسفیان صخر بن حرب، قرشیہ امویہ اور بقول بعض روایت نام ہند ہے - حبشہ ہجرت کرکے جانے والی خواتین میں شامل تھیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کرلی - حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے چارسو دینار آپ کی جانب سے بطور مہر ادا کیے - حبشہ ہی سے آپ کی خدمت میں آئیں - وفات بھائی امیر معاویہ کے دورِ حکومت میں ہوئی - جہاں تک اصل واقعہ کا تعلق ہے اربابِ سیر وتاریخ کے مطابق وہ مذکورہ بالا ہے، اور اصحابِ سیر وتاریخ کے یہاں اس کی حیثیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے مکہ میں خدیجہ، مدینہ میں حفصہ اور فتح خیبر کے بعد صفیہ کے نکاح کی رہی - باقی عکرمہ بن عمار کا یہ بیان کہ " ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین درخواستیں پیش کی تھیں - اور تینوں کی تینوں آپ نے منظور فرمائی تھیں - ان میں سے ایک یہ تھی کہ میرے پاس عرب کی حسین ترین دوشیزہ ام حبیبہ ہے - اس کو میں آپ سے بیاہ دینا چاہتا ہوں[۱] " سراسر غلط ہے - اس کا غلط ہونا بھی بالکل واضح ہے - ابومحمد بن حزم نے اس حدیث کو موضوعات میں داخل کیا ہے - اسے عکرمہ بن عمار کا کذب وافتراء قرار دیا ہے -

اس حدیث پر ابن جوزی تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ بعض راویوں کا یقیناً وہم ہے - اس وہم کا الزام انہی عکرمہ بن عمار پر عائد کیا ہے - کیونکہ تمام اصحابِ تاریخ کا اجماع ہے کہ ام حبیبہ عبداللہ بن جحش کی اہلیہ تھیں - ان سے اولاد بھی ہوئی - دونوں مسلمان تھے - انھیں لے کر عبداللہ بن جحش نے حبشہ کی ہجرت کی تھی - مگر وہاں انھوں نے عیسائیت قبول کرلی - ام حبیبہ بدستور اسلام پر قائم رہیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے یہاں ان سے نکاح کا پیغام بھیجا - چنانچہ نجاشی نے ان کا نکاح آپ سے کردیا، مہر بھی اپنی جانب سے ادا کردی - یہ ۶ھ کا واقعہ ہے، زمانۂ صلح میں ایک دفعہ ابوسفیان ان کے یہاں آئے تو اس خیال سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر نہ بیٹھ سکیں آپ نے اسے موڑ دیا - ابوسفیان اور معاویہ نے بلا اختلاف ۸ھ میں فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا ہے -

علاوہ ازیں اس حدیث کے اندر ابوسفیان کی یہ درخواست اور اس پر آپ کی منظوری بھی ثبت ہے - کہ " جس طرح میں مسلمانوں کے خلاف سالارِ جنگ کی حیثیت سے لڑتا تھا اسی طرح کافروں کے خلاف بھی مجھے سالارِ جنگ بنایا جائے "

---

[۱] - مسلم (۲۵۰۱) فی الفضائل : باب من فضائل ابی سفیان بن حرب - سلسلۂ روایت عکرمہ بن عمار - ابوزمیل - عبداللہ بن عباس - عبداللہ بن عباس کا بیان ہے : مسلمان ابوسفیان کی جانب دیکھتے تھے نہ انھیں اپنی مجلسوں میں جگہ دیتے تھے - چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اللہ کے نبی ! تین باتیں منظور فرمالیں - آپ نے فرمایا " اچھا " انھوں نے کہا : " میرے یہاں عرب کی سب سے حسین وجمیل دوشیزہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان ہے، میں اسے آپ سے بیاہ دینا چاہتا ہوں - آپ نے فرمایا " ٹھیک ہے " انھوں نے کہا " جس طرح میں مسلمانوں کے خلاف سالارِ جنگ تھا اسی طرح کافروں کے خلاف بھی جنگ کا سالار مجھے بنادیں " آپ نے فرمایا " ٹھیک ہے " ، ابوزمیل کہتے ہیں " اگر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست نہ کی ہوتی تو انھیں کبھی منظوری نہ ملتی - کیونکہ جو درخواست بھی انھوں نے کی اس پر آپ نے " نعم " (ٹھیک ہے، اچھا ہے) فرمایا - جن حدیثوں کا اشکال مشہور و معروف ہے انہی میں یہ حدیث بھی ہے - اس میں اشکال یہ ہے کہ ابوسفیان نے اسلام قبول ۸ھ یوم فتح مکہ کو کیا ہے یہ بالکل معروف ومشہور ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے - ام حبیبہ سے شادی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بہت پہلے کی ہے - آپ نے ان سے شادی ۶ھ اور بقول بعض روایت ۷ھ میں کی - البتہ یہ اختلاف ہے کہ شادی کہاں ہوئی ؟ ایک قول یہ ہے کہ جب وہ حبشہ سے واپس مدینہ آگئی ہیں تو یہیں شادی ہوئی - مگر جمہور کہتے ہیں کہ شادی سرزمین حبشہ میں ہوئی - دیکھیے ابوداؤد (۲۰۸۶) فی النکاح: باب فی الولی نیز " جلاء الافہام " ص ۱۸۵ - ۱۹۵ مؤلفہ ابن قیم -

آپ نے اس درخواست پر "نعم" فرمایا۔ مگر تاریخ کے کسی ورق میں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سالارِ جنگ مقرر کیا ہو۔

اس حدیث پر علماء نے کثرت سے اور مختلف پہلوؤں سے تبصرے کیے ہیں بعضوں نے کہا ہے کہ حدیث کے پیش نظر آپ نے واقعی ام حبیبہ سے شادی فتح مکہ کے بعد ہی کی ہے۔

کیونکہ مؤرخین کی بنا پر حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ فکر و نظر کا یہ انداز ان لوگوں کی نگاہوں میں قطعاً غلط ہے جنھیں سیرت اور ماضی کے تاریخی واقعات کا تھوڑا بہت بھی علم ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ ابوسفیان نے اپنی دلداری کے لیے تجدید عقد کی درخواست کی تھی کیونکہ آپ نے ان کی مرضی کے بغیر ام حبیبہ سے نکاح کیا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس طرح کی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی نہ ہی ابوسفیان کی عقل کے شایانِ شان ہی یہ بات ہے۔ یہ سب کچھ نہیں ہوا۔

ایک دوسرا گروہ جس میں بیہقی اور منذری بھی ہیں کہتا ہے، ہوسکتا ہے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہو جب ابوسفیان حالتِ کفر میں اپنے کسی دورہ پر مدینہ آئے ہوں۔ اور انھیں حبشہ میں ام حبیبہ کے شوہر کی وفات کی خبر ملی ہو۔ مگر اس پوری داستان کا یہ پہلو بھی اس گروہ کے سامنے آیا کہ ابوسفیان نے سالارِ جنگ بننے اور اپنے بیٹے کو کاتبانِ وحی میں شامل کرنے کی درخواست بھی کی تھی تو تاویل کے طور پر انھیں کہنا پڑا کہ ابوسفیان کی یہ دونوں درخواستیں ہوسکتا ہے فتح مکہ کے بعد رہی ہوں اور راوی نے سب کو ایک ہی حدیث کے اندر شامل کر دیا ہو۔ اس کلام میں جو تکلف اور بلاوجہ کی تاویل ہے وہی خود اس کی تردید ہے۔

ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حدیث کو ایک مناسب مفہوم میں رکھ کر دیکھنا صحیح ہوگا۔ وہ یہ کہ "میں راضی ہوں اب وہ آپ کی بیوی ہیں، پہلے مرضی نہ تھی مگر اب راضی ہوں۔ لہٰذا درخواست کرتا ہوں کہ آپ کی بیوی ہیں۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری تاویلوں سے دفتر کے دفتر سیاہ نہ ہوتے اور لوگوں کے سینوں میں یہ تاویلات محفوظ نہ ہوتیں تو ہم ان کا تذکرہ بھی نہ کرتے۔ کیونکہ اس طرح کی باتوں کو لکھنے کا نہیں موقع ہے نہ سننے کا، نہ اس پر غور کرنے کا، کیونکہ یہ محض اوہام ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے ایلاء کیا تو ابوسفیان کو یہ خبر پہنچی کی آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے، انھیں یہ گمان ہوا کہ آپ نے دوسری بیویوں کے ساتھ ام حبیبہ کو بھی طلاق دیدی ہے یہی سن کر وہ مدینہ آئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ام حبیبہ کے بارے میں گفتگو کی جس کا حدیث میں تذکرہ آیا ہے۔ یہ بھی مذکورہ نوعیت کا تبصرہ ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے۔ حدیث تو صحیح ہے مگر ام حبیبہ کے نام میں کسی راوی کو وہم ہوگیا ہے، ابوسفیان نے ان کی بہن رملہ سے شادی کی پیش کش کی تھی۔ جمع بین الاختین کی حرمت کا جو قانون ہے بعید نہیں کہ ان سے پردۂ خفا میں رہا ہو کیونکہ خود ان کی صاحبزادی سے بھی جو ان سے بھی زیادہ فقیہ اور عالمہ تھیں یہ حرمت پوشیدہ رہی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا "کیا آپ میری بہن، ابوسفیان کی صاحبزادی میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "کیسی دلچسپی؟" بولیں "اس سے نکاح کرنے کی،، فرمایا "تھیں بھی پسند ہے؟" بولیں "میں آپ کی اکلوتی بیوی تو نہیں ہوں۔ اور بھی سوکنیں ہیں پھر اسی خیر کے اندر میری بہن بھی شریک ہو جائے تو اس سے بڑھ کر پسندیدہ بات میرے نزدیک اور کیا ہوگی۔ آپ نے فرمایا "وہ میرے لیے جائز نہیں ہے[1]" (حدیث بالا میں مذکورہ خاتون ام حبیبہ نہیں)۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ اصل میں رملہ ہے جسے ابوسفیان نے آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مگر راویوں نے خود سے انھیں ام حبیبہ قرار دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رملہ کی کنیت بھی ام حبیبہ تھی۔ یہ جواب صحیح ہوتا بشرطیکہ حدیث کے اندر یہ فقرہ نہ ہوتا کہ ابوسفیان نے جو درخواست کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمالی۔ ایسی شکل میں اس جگہ راوی کا وہم ماننا پڑے گا۔ اصل میں اسے یہ کہنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بعض درخواستوں کو شرف قبول بخشا، مگر راویوں نے اس بنیاد پر مطلقاً روایت کردی کہ مخاطب خود سمجھ لے گا کہ آپ نے ابوسفیان کی انھیں درخواستوں کو منظور فرمایا جنھیں منظور کرنا جائز تھا۔ واللہ اعلم۔

۹۔ صفیہ بنت حی بن اخطب۔ حی بن اخطب قبیلہ بنونضیر کے سردار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون بن عمران کی اولاد میں سے تھے۔ اس طرح یہ نبی زادی بھی تھیں اور نبی کی بیوی بھی (یعنی ان کی ددھیال بھی نبی کے خاندان کی تھی اور سسرال بھی) مالِ غنیمت سے یہ آپ کے حصہ میں آئی تھیں اور یہ دنیا کی حسین ترین عورتوں میں سے تھیں۔ آپ نے انھیں آزاد کردیا تھا اور ان کی آزادی ہی کو مہر قرار دیدیا۔ امت کے لیے اب قیامت تک آپ کا یہ عمل سنت ہے کہ لونڈی کو آزاد کردیا جائے اور اس کی آزادی کو مہر قرار دیدے تو اس سے شادی کرلی جائے۔ چنانچہ آقا جب یہ کہدے کہ میں نے اپنی کنیز کو آزاد کیا اور آزادی کو اس کی مہر قرار دیدی۔ یا یہ کہدے کہ اپنی کنیز کی آزادی کو اس کی مہر قرار دیدی تو یہ آزادی اور نکاح دونوں صحیح ہوگا۔ اور اس کی کنیز بغیر ولی اور بغیر تجدید عقد اس کی بیوی ہوجائے گی۔ یہی احمد اور اکثر اہل حدیث کا مذہب ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس طرح کا نکاح صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ امت کے حق میں صحیح نہیں ہے۔ یہ باقی تینوں ائمہ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے۔ مگر پہلا قول صحیح ہے۔ کیونکہ اصل عدم اختصاص ہے۔ جسے کوئی مضبوط دلیل ہی توڑ سکتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہبہ میں آئی ہوئی خاتون سے جہاں نکاح کی خصوصیت آپ کو بخشی وہاں صاف طور پر فرمادیا ہے۔ "خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ" (احزاب: ۵۰) (یہ رعایت خالصۃً تمھارے لیے ہے دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں ہے، مگر آزاد کردہ کنیز کے بارے میں نہ اللہ نے نہ اللہ کے رسول نے ایسی کوئی بات فرمائی ہے کہ جس کی وجہ سے امت اسے اسوہ نہ بنائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مُنہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا آپ کے لیے مباح فرمایا۔ کہ امت کے لیے یہ اسوہ بنے کہ مُنہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ جب بھی کوئی نکاح فرمائیں گے وہ امت کے لیے اسوہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس سلسلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے بصراحت کسی اختصاص کی نشاندہی نہ کی گئی ہو یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ جہاں تک اس مسئلہ کو تفصیل سے اور ان دلائل کے ساتھ جو اصول وقیاس کے دائرہ میں آتے ہیں پیش کرنے کا تعلق ہے اس کا موقع نہیں یہاں ہم نے صرف اس کی طرف اشارہ کیا ہے

۱۰۔ میمونہ بنت حارث ہلالیہ۔ یہ آخری خاتون ہیں جن سے آپ نے نکاح فرمایا۔ صحیح روایت یہ ہے کہ جب آپ عمرۃ قضا سے فارغ ہوکر حلال ہوئے تو مکہ میں ان سے شادی کی۔ عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ شادی کا واقعہ عمرۃ قضا سے

لہ۔ (حاشیہ صفحہ گذشتہ) بخاری ج ۹، ص ۱۳۷، فی النکاح: باب وامھاتکم اللاتی أرضعنکم، وباب وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن وباب: وان تجمعوا بین الأختین الاما قد سلف وباب عرض الانسان ابنته او اخته علی اھل الخیر، وفی النفقات باب المراضع من الموالیات وغیرھن، مسلم (۱۴۴۹) فی الرضاع: باب تحریم الربیبة واخت المرأة، ابوداؤد (۲۰۵۶) فی النکاح: باب یحرم من الرضاعة مایحرم من النسب، ابن ماجہ (۱۹۳۹) فی النکاح: باب یحرم من الرضاع مایحرم من النسب، حدیث ام حبیبہ۔

حلال ہونے کے پہلے (حالتِ احرام) کا ہے۔ مگر یہ عبداللہ ابن عباس کا وہم ہے۔ کیونکہ نکاح کے سلسلہ میں آپ دونوں کے مابین جو سفارت کار تھے وہ تمام لوگوں کے مقابلہ میں اس واقعہ سے زیادہ واقف تھے۔ سفارت کار ابورافع تھے وہ خود فرماتے ہیں کہ شادی آپ نے حلال ہونے کے بعد کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں "میں آپ دونوں کے درمیان سفیر تھا"۔ ابن عباس کی عمر اس وقت دس سال تھی یا اس سے کچھ زیادہ تھی، موقع پر وہ موجود بھی نہ تھے۔ ابورافع بالغ تھے اور شادی کا واقعہ انھیں کے ہاتھوں انجام پایا اس لیے اس داستان سے بخوبی وہی واقف رہے ہیں اور یہ واضح ہے کہ اس طرح کی ترجیح تقدیم کا موجب ہوتی ہے۔

امیر معاویہ کے دورِ حکومت میں وفات پائی۔ قبر سرف میں واقع ہے (یہ تنعیم کے قریب ایک مقام ہے)۔

ایک روایت کے مطابق ازواجِ مطہرات کی فہرست میں ریحانہ بنت زید نضریہ بعض روایت کے مطابق قرظیہ بھی شامل تھیں۔ بنو قریظہ کا واقعہ پیش آیا تو گرفتار ہو کر آپ کے حصہ میں آئیں۔ آپ نے انھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ بعد میں طلاق بھی دی پھر رجوع کر لیا۔ مگر ایک گروہ کے نزدیک یہ ہمیشہ کنیز رہیں۔ اپنی وفات تک ملک یمین کے طور پر ان سے زن وشو کا تعلق قائم کرتے رہے۔ پہلا قول واقدی کا ہے، شرف الدین دمیاطی موید ہیں، فرماتے ہیں اہلِ علم کے نزدیک زیادہ صحیح یہی ہے مگر یہ خیال محلِ نظر ہے، کیونکہ مشہور یہ ہے کہ ریحانہ آپ کے کنیزوں میں تھی۔ واللہ اعلم۔

یہ ہیں آپ کی وہ مشہور بیویاں جو آپ کے حبالۂ نکاح میں داخل ہوئیں باقی جن خواتین کو آپ نے پیغام نکاح بھیجا مگر شادی نہیں کی۔ اور جنھوں نے آپ کی خدمت میں خود کو ھبہ کیا مگر آپ نے قبول نہیں فرمایا ان کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ بعض روایت کے مطابق تیس ہے مگر آپ کی سیرت اور حالاتِ طیبہ سے جنھیں واقفیت ہے انھیں اس آخری تعداد کی خبر نہیں ہے۔ بلکہ وہ تردید کرتے ہیں۔ اہلِ علم کے نزدیک حقیقت بھی اتنی ہی ہے کہ "جونیہ" کے یہاں آپ پیغام نکاح لے کر پہنچے تو اس نے پناہ مانگی، آپ نے اسے پناہ دیدی، شادی نہیں کی۔ یہی واقعہ "کلبیہ" کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح وہ خاتون تھی جن کی کمر میں سفیدی دیکھی تو مباشرت نہیں فرمائی۔ ایسے ہی وہ خاتون جنھوں نے خود کو ہبہ کر دیا تھا مگر آپ نے اس کی شادی قرآن کی چند سورتوں پر دوسرے سے کر دی۔ تاریخ وسیرت کے سفینہ میں بس اتنا ہی محفوظ ہے۔ واللہ اعلم۔ وفات کے وقت بلا اختلاف نو بیویاں موجود تھیں۔ ان میں آٹھ وہ تھیں جن کے یہاں باری باری شب گزارتے تھے۔ یہ نو بیویاں حسبِ ذیل تھیں۔

عائشہ، حفصہ، زینب بنت جحش، ام سلمہ، صفیہ، ام حبیبہ، میمونہ، سودہ، جویریہ۔

آپ کی وفات کے بعد سب سے پہلے زینب بنت جحش ۲۰ھ میں، اور سب سے آخر میں ام سلمہ نے ۶۲ھ یزیدی دورِ حکومت میں وفات پائی۔ واللہ اعلم۔

کنیزیں

ابو عبیدہ لکھتے ہیں کنیزیں چار تھیں۔

۱۔ ماریہ، آپ کے صاحبزادے ابراہیم کی ماں۔

۲۔ ریحانہ۔

۳۔ وہ خوبصورت کنیز جو قید ہو کر آئی تھی۔

۴۔ وہ کنیز جسے زینب بنت جحش نے آپ کو ہبہ کیا تھا۔

غلام

۱۔ زید بن حارثہ بن شراحیل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، انھیں آزاد کر کے اپنی کنیز ام ایمن سے شادی کردی تھی۔ اُسامہ انھیں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ۲۔ اسلم۔ ۳۔ ابو رافع۔ ۴۔ ثوبان۔ ۵۔ ابو کبشہ سُلیم۔ ۶۔ شقران نام صالح۔ ۷۔ رباح نُوبی۔ ۸۔ یسار نوبی، جنھیں عرینہ والوں نے قتل کر دیا تھا۔ ۹۔ مِدعم[1]۔ ۱۰۔ کرکرہ نوبی[2]، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفش بردار، معرکہ خیبر میں جنگ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری یہی تھامے ہوئے تھا۔ صحیح بخاری میں وارد ہے کہ یہی وہ غلام تھا جس نے اس دن چادر چرالی تھی اور قتل ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا تھا: "چادر اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے[3]۔" موطا کے مطابق چادر چرانے والا مدعم[4] تھا۔ یہ دونوں خیبر میں قتل ہوئے۔ واللہ اعلم۔

دوسرے غلاموں کے اسماء حسبِ ذیل ہیں:

انجشہ حادی[5]، سفینہ بن فروخ نام مہران، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفینہ نام اس لیے رکھا تھا کہ سفر میں صحابہ اس سے اپنے سامان لادنے کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک موقع پر کہا: "انتَ سفینة[6]" ابو حاتم کہتے ہیں کہ رسول اللہ

---

[1] خاندان بنو ضبیب کے ایک فرد رفاعہ بن زید نے ہدیتہً اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ چادر چرانے کا جو واقعہ کرکرہ کا ہے بعینہ وادیٔ قریٰ میں اس غلام کا بھی ہے۔ دیکھیے بخاری ج ۷، ص ۳۷۵، فی غزوۃ خیبر، مسلم (۱۱۵) فی الایمان: باب غلظ تحریم الغلول۔ حدیث ابوہریرہ۔

[2] یہ ہوذہ بن علی حنفی، سردار یمامہ کا ہدیہ تھا۔

[3] مصنف نے مدعم اور کرکرہ کے واقعات کو یہاں خلط ملط کر دیا ہے، آپ کا ارشاد " انها لتلتهب عليه نارًا" (یہ چادر اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے)، کرکرہ کا واقعہ نہیں ہے۔ پھر اس نے چادر نہیں عبا چرائی تھی۔ چادر چرانے کا واقعہ مدعم کا ہے، مدعم کا یہ واقعہ بخاری ج ۷، ص ۳۷۵، اور مسلم (۱۱۵) کے اندر موجود ہے، مسلم نے مدعم کا نہیں بلکہ اس کا ذکر کیا ہے جس نے اسے ہدیہ بھیجا تھا یعنی رفاعہ بن زید۔ شیخین کے یہاں قصہ کی روایت ابوہریرہ سے ہے۔ مدعم نے وادی قریٰ میں چادر چرائی تھی۔ آپ نے فرمایا "خیبر کے دن جو چادر اس نے لی تھی وہ اسباب غنیمت کی تھی اور تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں " ان الشملة لتلتهب عليه نارًا"، اس میں تفصیل سے پوری حدیث موجود ہے، کرکرہ کو غزوۂ خیبر میں جو مال غنیمت ملا تھا اس میں سے تقسیم سے پہلے عبا چرائی تھی۔ اس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا۔ " هو في النار" (وہ جہنم میں ہے) پوری حدیث دیکھیے بخاری ج ۶، ص ۱۳۰، فی الجهاد: باب القليل من الغلول " هو في النار" کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی معصیت کے سبب اس پر عذاب ہو رہا ہے۔ یا یہ کہ اللہ نے معاف نہ کیا تو وہ جہنم میں ہوگا۔

[4] موطا ج ۲، ص ۴۵۹، فی الجهاد: باب ماجاء في الغلول۔ سند صحیح ہے۔

[5] بخاری ج ۱۰، ص ۴۹، مسلم (۲۳۲۲) روایت انس بن مالک کی۔ فرماتے ہیں: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے، ایک غلام جو عورتوں کے پیچھے انھیں لیے چلتا تھا انجشہ نام کا تھا۔ آپ نے فرمایا " انجشہ! یہ شیشے ہیں ذرا آہستہ لے چلو۔"

[6] روایت مسند امام احمد ج ۵، ص ۲۲۱، حدیث سعید بن جمہان فرماتے ہیں " میں نے سفینہ سے کہا "تمھارا نام کیا ہے" اس نے کہا "نہیں بتاؤں گا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام سفینہ رکھا ہے۔ میں نے کہا " سفینہ کیوں رکھا ہے" اس نے کہا " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، سامان زیادہ تھا، آپ نے فرمایا " اپنی چادر پھیلاؤ" چنانچہ میں نے اپنی چادر پھیلا دی۔ صحابہ نے اس میں اپنے سامان رکھ دیئے اور باندھ کر مجھ پر لاد دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم لے چلو، تم سفینہ ہو" اگر اس دن ایک یا دو یا تین یا چار یا پانچ یا چھ یا سات اونٹوں کا بوجھ بھی مجھ پر لاد دیا جاتا تو گراں نہ گزرتا۔ الا یہ کہ وہ خود ہلکا کر دیں۔ (مسند میں يخففوا کی جگہ يجفوا ہے مگر یہ تصحیف ہے)۔ سند حسن ہے۔ ابونعیم نے الحلیہ ج ۱، ص ۳۶۹ میں اسے بسند حسن نقل کیا ہے۔ مسند احمد ہی کے ج ۵، ص ۲۲۲ میں سفینہ سے مختصراً روایت آئی ہے۔ جس میں اس کا بیان ہے "ہم ایک سفر میں تھے، جب بھی کوئی تھک جاتا اپنا بوجھ ڈھال یا تلوار مجھ پر لاد دیتا۔ اس طرح بہت سارا سامان مجھ پر لاد دیا گیا تو یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " تو سفینہ ہے" اس کی بھی سند حسن ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ دوسرے کہتے ہیں کہ آزاد ام سلمہؓ نے کیا تھا۔

انسہ کنیت ابو مشرح افلح، عبید، طہمان اسے کیسان بھی کہتے تھے۔ ذکوان، مہران، مروان، ایک روایت کے مطابق یہ طہمان کے مختلف نام ہیں۔ واللہ اعلم۔

حنین، سندر، فضالہ یمانی، مابور خصی، واقد، ابو واقد، قسام، ابو عسیب، ابو مُویہبہ۔

عورتوں میں سلمٰی ام رافع، میمونہ بنت سعد، خضرۃ، رضوی، رزینہ، ام ضُمیرہ، میمونہ بنت ابی عسیب، ماریہ اور ریحانہ ہیں۔

خُدّام

انس بن مالک۔ آپ کی ضروریات پر مامور تھے۔

عبداللہ بن مسعود۔ آپ کی نعل مبارک اور مسواک کے محافظ تھے۔

عقبہ بن عامر جہنی۔ سفروں میں آپ کے خچّر کے قائد تھے۔

اسلع بن شریک۔ آپ کی سواری کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔

بلال بن رباح۔ (مؤذن)

سعد۔

دونوں ابوبکر کے آزاد کردہ غلام تھے۔

ابوذر غفاری۔

ایمن بن عبید، ام ایمن (ایمن کی ماں) دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ تھے۔ ایمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوائج ضروریہ، غسل اور وضو پر مامور تھے۔

کاتبین

ابوبکر، عمر، عثمان، علی، زبیر، عامر بن فہیرہ، عمرو بن العاص، اُبیّ بن کعب، عبداللہ بن ارقم، ثابت بن قیس بن شماس، حنظلہ بن ربیع اُسیدی، مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن رواحہ، خالد بن ولید، خالد بن سعید بن العاص، کہا جاتا ہے کہ خالد بن سعید ہی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مقرر ہوئے۔ معاویہ بن ابو سفیان، زید بن ثابتؓ یہ خاص طور پر اس خدمت پر مامور تھے۔

لہ۔ ابو داؤد (۳۹۳۲) فی العتق: باب فی العتق علی الشرط۔ روایت سفینہ کی، "میں ام سلمہ کا غلام تھا۔ انھوں نے فرمایا "میں تمھیں اس شرط پر آزاد کرتی ہوں کہ زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرو گے"۔ میں نے کہا "آپ یہ شرط نہ بھی لگاتیں تو بھی زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہ رہتا"۔ چنانچہ انھوں نے مشروط طور پر مجھے آزاد کر دیا"۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن ماجہ نے بھی (۲۵۲۶) فی العتق: باب من اعتق عبدًا واشترط خدمتہ میں مختصراً اس کی روایت کی ہے۔

سلہ۔ حافظ، دانشور، ذی علم اور صاحب خرد تھے۔ خود انہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تورات کا علم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ یہود آپ کے یہاں مراسلت کریں تو تورات پڑھ کر آپ کو سنا سکیں۔ تورات انھوں نے پندرہ دنوں میں سیکھ لی تھی۔ صحیحین میں انس کی روایت کے مطابق آپ کا شمار ان قرا میں ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسلامی قوانین پر مشتمل آپ کے فرمان جو اہلِ اسلام کو روانہ کیے گئے

صدقات کے بارے میں ایک تحریر حضرت ابوبکر کے یہاں محفوظ تھی۔ انس بن مالک کو بحرین کی عملداری پر روانہ فرمار ہے تھے تو اس وقت اسے نقل کر کے ان کے سپرد کی تھی۔ اسی پر جمہور کا عمل ہے۔[1]

دوسرا فرمان جو یمن والوں کو بھیجا گیا۔ یہ ابوبکر بن عمرو بن حزم کی روایت سے ماخوذ ہے۔ حاکم نے مستدرک میں، نسائی وغیرہ نے اور ابوداؤد وغیرہ نے مرسلاً[2] اس کی روایت کی ہے۔ یہ نہایت عظیم الشان فرمان ہے، اس میں زکوٰۃ، دیت، احکام،

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میں قرآن کے جمع و ترتیب کا کام کیا تھا۔ بہت مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ نے وحی کی کتابت فرمائی، یمامہ کی جنگ میں شریک ہوئے جس میں آپ کو ایک تیر لگا مگر زخمی نہ ہوئے۔ ابوبکر صدیق نے آپ ہی کو حکم دیا تھا کہ قرآن تلاش کرو تاکہ جمع کیا جا سکے۔ ان سے فرمایا تم نوجوان خردمند ہو، ہمارے نزدیک پاک اوصاف بھی ہو، کاتب وحی بھی رہ چکے ہو لہٰذا قرآن تلاش کر کر کے لاؤ تاکہ جمع کر دوں۔ صدیق نے جو حکم دیا اس کی انھوں نے تعمیل فرمائی۔ چنانچہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ ان کے ہاتھوں انجام پایا۔ حج کے لیے جاتے ہوئے عمر نے انھیں دوبار مدینہ میں اپنا قائم مقام بنایا۔ شام کے سفر پر روانہ ہوئے تو اس وقت بھی یہی قائم مقام ہوئے۔ اسی طرح عثمان بھی انہی کو مدینہ پر اپنا قائم مقام مقرر کرتے تھے۔ علی کو آپ سے بے حد محبت تھی وہ بھی علی کے بے حد قدرداں تھے۔ مگر آپ کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ ۴۵ھ میں علی کے بعد وفات پائی۔ مصاحف جنھیں عثمان بن عفان نے تمام ممالک محروسہ میں بھیج کر جاری کیا اور جن کے رسم الخط کے مطابق تلاوت و ترتیل متفقہ قرار پائی کے لکھنے والوں میں آپ کا شمار بھی ہے۔

[1] بخاری ج ۳، ص ۲۴۷، فی الزکوٰۃ: باب العرض فی الزکوٰۃ۔ وباب لایجمع بین متفرق ولایفرق بین مجتمع وباب ماکان من خلیطین فانهما یتراجعان بینهما بالسویة وباب من بلغت عنده صدقة بنت مخاض ولیست عنده وباب زکوٰة الغنم وباب لاتوخذ فی الصدقة هرمة ولاذات عوار ولاتیس الا ماشاء المصدق و فی الشرکة: باب ماکان من خلیطین فانهما یتراجعان بینهما بالسویة فی الصدقة. و فی الحیل: باب الزکوٰة وان لایفرق بین مجتمع ولایجمع بین متفرق خشیة الصدقة۔ حدیث عبداللہ بن مثنیٰ۔ بیان انس کا۔ عبداللہ بن مثنیٰ مختلف فیہ ہیں، مگر ابوداؤد (۱۵۶۷) میں حماد بن سلمہ نے ان کی متابعت کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ثمامہ سے روایت کی ہے۔ مسند احمد (۷۲) میں وارد ہے کہ ابوکامل نے، انھوں نے حماد سے یہ روایت کی ہے، جس میں حماد فرماتے ہیں کہ میں نے یہ فرمان ثمامہ بن عبداللہ بن انس سے پایا، انھوں نے انس سے، یہ کہ ابوبکر... اور پھر پوری حدیث کا ذکر ہے۔

[2] مالک نے ج ۲، ص ۸۴۹، کتاب العقول کے شروع میں اس کی تخریج اختصار سے مرسلاً کی ہے، پوری حدیث تفصیل کے ساتھ نسائی نے ج ۸، ص ۵۷، ۵۸ فی القسامة: باب ذکر حدیث عمرو بن حزم فی العقول میں، حاکم نے ج ۱، ص ۳۹۷ میں، دارقطنی نے ص ۲۷۶ میں، ابن حبان نے (۷۹۳) میں، بیہقی نے ج ۴، ص ۸۹ میں حکم بن موسیٰ کی حدیث سے بروایت یحییٰ بن حمزہ عن سلیمان فرماتے ہیں زہری نے محمد سے حدیث بیان کی، انھوں نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے انھوں نے والد سے انھوں نے دادا سے روایت کی ہے۔ ابن ترکمانی کا بیان "الجوهر النقی" میں ہے کہ "الکمال" مؤلفہ حافظ عبدالغنی میں دارقطنی کا یہ قول موجود ہے کہ ان سے یعنی سلیمان سے ایک روایت، عن الزهری عن ابی بکر بن حزم ہے۔ جو ان سے ثابت نہیں ہے۔ ابن مدینی نے انھیں منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ لکھتے ہیں کہ تنہا ہوں تو ان کی روایت قابلِ استدلال نہیں ہوتی۔ نسائی نے یہ حدیث یحییٰ بن حمزة عن سلیمان بن داؤد عن الزهری، پھر یحییٰ ہی سے عن سلیمان بن ارقم عن الزهری روایت کرتے ہوئے کہا ہے، یہ صحت سے زیادہ قریب تر ہے، سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہیں۔ مزی نے اطراف میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ ابوداؤد نے اسے مراسیل کے اندر عن هارون بن محمد عن ابیه عن محمد، کلاهما عن یحیی بن حمزة عن سلیمان بن ارقم عن الزهری روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابن ہبیرہ کہتے ہیں: میں نے یحییٰ بن حمزہ کی اصل میں اس طرح دیکھا ہے حدثنی سلیمان بن ارقم باسناده نحوه وعن الحکم بن موسیٰ، عن یحیی بن حمزه، عن سلیمان بن داؤد عن الزهری نحوه۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ حکم کو وہم ہو گیا یعنی ابن داؤد کہہ گئے، "میزان" مؤلفہ ذہبی میں ابوزرعہ دمشقی کا قول ہے کہ صحیح سلیمان بن ارقم ہے۔ ابوالحسن ہروی فرماتے ہیں، یحییٰ بن حمزہ کے اصل مسودہ میں حدیث عن سلیمان بن ارقم ہے۔ حکم سے غلط بیانی ہو گئی۔ ابن مندہ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن حمزہ کی کتاب میں جسے انھوں نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ عن سلیمان بن ارقم عن الزهری رقم ہے، اور یہی صحیح ہے۔ صالح جزرہ فرماتے ہیں کہ دحیم نے ہم سے حدیث (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کبائر، طلاق، عتاق، ایک ہی کپڑے میں صلوٰۃ کے احکام، احتباء، مس مصحف وغیرہ بہت سارے فقہی مسائل آگئے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں، بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمان لکھوایا تھا۔ دیتوں کی جو مقدار اس میں بیان ہوئی ہے تمام فقہاء اسی سے استدلال کرتے ہیں۔

تیسرا وہ فرمان جو بنو زہیر کو بھیجا گیا۔

چوتھا وہ فرمان جو حضرت عمر کے پاس تھا اس میں زکوٰۃ وغیرہ کے نصاب کا ذکر ہے۔

مکتوبات اور قاصدین جو شاہان عالم کو روانہ کیے گئے

حدیبیہ سے واپس ہوئے تو دنیا کے بادشاہوں کو خطوط اور قاصد روانہ فرمائے۔ شاہ روم کے نام مکتوب گرامی قلمبند کرواتے وقت کہا گیا کہ بادشاہوں کے عام دستور کے مطابق خط وہی پڑھا جاتا ہے جس پر مہر ثبت ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک روپہلی مہر منگوا کر اس پر تین سطروں کا نقش بنوایا۔ محمد ایک سطر، رسول ایک سطر[۲] اور اللہ ایک سطر، پھر بادشاہوں کو جو خطوط ارسال فرمائے اس پر یہ مہر ثبت کرائی۔ ایک ہی دن ماہ محرم ۷ھ میں چھ قاصد روانہ ہوئے۔

سب سے پہلے عمرو بن امیہ ضمری کو نجاشی کے یہاں روانہ فرمایا۔ نجاشی کا نام اصحمہ بن ابجر تھا۔ اصحمہ کے معنی عربی میں عطیہ کے ہیں۔ نجاشی نے آپ کے نامۂ مبارک کی بے حد قدر کی، کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوا، انجیل کا سب سے بڑا عالم تھا۔ حبشہ میں اس کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں غائبانہ صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ علماء کی ایک جماعت جس میں واقدی وغیرہ بھی شامل ہیں اسی کی قائل ہے، مگر ایسا ہے نہیں، کیونکہ اصحمہ نجاشی جس کی آپ نے صلوٰۃ جنازہ پڑھی دراصل وہ نہیں ہے جس کے نام آپ نے خط بھیجا تھا۔ یہ اصحمہ دوسرا ہے جسے آپ نے خط بھیجا۔ اس کا مسلمان ہونا معلوم نہیں ہے۔ پہلے اصحمہ کا حالتِ اسلام میں انتقال ہوا[۳]۔ صحیح مسلم میں قتادہ کی روایت سے انس کا بیان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر، نجاشی غرض ہر جابر و قاہر کو دعوت الی اللہ پر مشتمل خطوط بھیجے، یہ نجاشی وہ نہیں ہے جس کی صلوٰۃ جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی[۴]۔ ابو محمد بن حزم کہتے ہیں کہ جس نجاشی کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا تھا۔ اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ پہلا قول ابن سعد وغیرہ کا ہے مگر صحیح قول ابن حزم کا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بیان کی فرماتے ہیں یحییٰ کے اصل مسودہ میں صدقات کے باب میں عمرو بن حزم کی حدیث دیکھی تو وہاں سلیمان بن ارقم درج تھا۔ صالح فرماتے ہیں چنانچہ یہ کلام مسلم بن حجاج کی روایت سے لکھ لیا گیا۔ ذہبی فرماتے ہیں۔ راجح یہی ہے کہ حکم کو یقیناً وہم ہوگیا ہے لہٰذا ایسی صورت میں حدیث ضعیف الاسناد قرار پاتی ہے۔

[۱] ابوداؤد (۱۵۶۸) ترمذی (۶۲۱) ابن ماجہ (۱۷۹۸) حدثنا سفیان بن حسین عن الزهری عن سالم عن ابیه عبدالله بن عمر۔

[۲] بخاری ج ۱۰، ص ۲۷۳، فی اللباس : باب الخاتم فی الخنصر، ص (۲۷۶) : باب قول النبی صلی الله علیه وسلم "لاینقش علی نقش خاتمه" حدیث انس۔

[۳] بخاری ج ۳، ص ۱۶۳، فی باب الجنائز : باب التکبیر علی الجنائز اربعًا۔ روایت ابوہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی کی خبر وفات اسی دن ملی جس دن اس کا انتقال ہوا تھا۔ آپ صحابہ کو لے کر مصلیٰ پر آئے، صف لگائی اور چار تکبیریں فرمائیں۔

[۴] مسلم (۱۷۷۴) فی الجهاد : باب کتب النبی صلی الله علیه وسلم الی ملوك الكفار یدعوهم الی الله عزوجل۔ ترمذی فی الاستئذان (۲۸۵۹)۔ کسریٰ ایرانی، قیصر رومی اور نجاشی حبشی بادشاہوں کا لقب تھا۔

شاہِ روم قیصر کے یہاں آپ نے دحیہ بن خلیفہ کلبی کو بھیجا۔ قیصر کا نام ہرقل تھا۔ اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ بھی کیا، مگر توفیق نہیں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق اسلام قبول کر لیا تھا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ابو حاتم ابن حبان نے اپنی صحیح میں انس بن مالک کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب ذیل ارشاد نقل کیا ہے۔ "قیصر کو میرا خط کون لے جائے گا اللہ اسے جنت دے گا"۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا "خواہ قبول نہ کرے"۔ فرمایا "خواہ قبول نہ کرے"۔ یہ شخص خط لے کر قیصر کے پاس پہنچا۔ اس وقت وہ بیت المقدس آرہا تھا۔ راستہ میں اس کے لیے مخصوص فرش بچھایا گیا تھا جس پر اس کے سوا اور کسی کو پیر رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ قاصد نے خط فرش پر ڈال دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ قیصر جب یہاں پہنچا تو نامہ مبارک اٹھا لیا اور پکار کر پوچھا "یہ خط کون لایا ہے؟ اسے امان دی جاتی ہے"۔ نامہ بر نے خود کو ظاہر کیا تو اس نے کہا جب یہاں واپس آؤں تو حاضر ہونا۔ چنانچہ واپسی میں نامہ بر اس کے پاس حاضر ہوا۔ قیصر نے تمام دروازے بند کر دیئے جانے کا حکم دیا اور اعلان کروا دیا کہ اس نے محمد کی پیروی قبول کر لی ہے اور عیسائیت کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اس پر مسلح افواج آگے بڑھی اور اسے گھیر لیا۔ قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے قاصد سے کہا "دیکھا۔ مجھے اپنی مملکت کے چلے جانے کا اندیشہ ہے"۔ پھر منادی کو حکم دیا کہ یہ اعلان کر دے "قیصر تم سے راضی ہے اس کا مقصد تو یہ تھا کہ دیکھے تم اپنے دین پر ثابت قدم رہتے ہو یا نہیں۔ لہٰذا اب واپس ہو جاؤ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب میں لکھا کہ میں مسلمان ہوں، اس کے ساتھ کچھ دینار بھی بھیجے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کا دشمن جھوٹا ہے وہ مسلمان نہیں ہے بدستور عیسائیت پر قائم ہے۔ دیناروں کو آپ نے تقسیم فرما دیا۔[۱]

کسریٰ کے یہاں آپ نے عبداللہ بن حذافہ سہمی کو روانہ فرمایا۔ اس کا نام پرویز بن ہرمز بن نوشیروان تھا۔ نامۂ نبوی کے اس نے پرزے اڑا دیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الٰہی! اس کا ملک پرزہ پرزہ کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے اس کی اور اس کی سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے۔[۲]

حاطب بن ابی بلتعہ کو مقوقس کے یہاں روانہ فرمایا۔ مقوقس کا نام جریج بن مینا تھا۔ یہ اسکندریہ کا بادشاہ اور قبطی قوم کا سردار تھا۔ اس نے جواب میں بہتر کلمات کہے۔ اسلام کے قریب ہوا مگر قبول نہ کر سکا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ماریہ اور اس کی دو بہنیں سیرین اور قیسری کو بطور ہدیہ بھیجا۔ ماریہ کو آپ نے اپنی کنیزوں میں داخل کر لیا اور سیرین کو آپ نے حسان بن ثابت کو ہدیہ دیا۔ مقوقس نے دوسری بار ایک کنیز اور اس کے ساتھ ایک ہزار مثقال سونا، مصر کے بیس قباطی پارچے، ایک سفید خچر دلدل، ایک سفید گدھا عفیر، ایک خصی غلام مابور (ایک قول کے مطابق وہ ماریہ کا چچازاد بھائی تھا) ایک گھوڑا لزاز، شیشہ کا ایک پیالہ اور شہد ہدیہ بھیجا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خبیث کو اپنی سلطنت کی لالچ ہے مگر باقی نہ رہے گی۔[۳]

۱۔ صحیح ابن حبان (۱۶۲۸) سند صحیح ہے۔

۲۔ بخاری ج ۹۷، ص ۱۹۰، فی کتاب المغازی: باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر اور مسند احمد ج ۱، ص ۲۴۳، و ۳۰۵ میں اس طرح آیا ہے، "جب اس نے اسے پڑھا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا"۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابن مسیب نے کچھ ایسا کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بددعا دی اور کہا کہ اس کے پرخچے اڑا دیئے جائیں۔ حافظ نے "الفتح" میں لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ "ابن مسیب نے کچھ ایسا کہا" کا فقرہ زہری کا ہے۔ مذکورہ سند میں متصلاً اور باقی تمام سندوں میں مرسلاً آیا ہے، ہو سکتا ہے ابن مسیب نے عبداللہ بن حذافہ سے جو صاحب قصہ رہے ہیں یہ سنا ہو۔ کیونکہ ابن سعد نے ان کی حدیث کا نہیں تذکرہ کیا ہے کہ انھوں نے کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ اسے پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے اسے لے کر پھاڑ دیا۔ حافظ کہتے ہیں اور آپ کا یہ ارشاد بھی کہ "انھیں ریزہ ریزہ کر دیا جائے"۔ عبداللہ بن حذافہ کی حدیث میں وارد ہے "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا "بار الٰہا!" اس کے ملک کو ریزہ ریزہ کر دے"۔

۳۔ طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۲۶۰، و ۲۶۱، فی ذکر بعثۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الرسل بکتبہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شجاع بن وہب اسدی کو حارث بن ابوشمر غسانی شاہ بلقا کے یہاں روانہ فرمایا یہ ابن اسحٰق اور واقدی کا بیان ہے۔ ایک روایت ہے کہ جبلہ ابن ایہم اور ایک روایت کے مطابق دونوں کی جانب روانہ ہوئے۔

تیسری روایت یہ ہے کہ ہرقل اعظم کے یہاں دحیہ بن خلیفہ کی معیت میں روانہ ہوئے، واللہ اعلم۔

سلیط بن عمرو کو آپ نے یمامہ میں ہوذہ بن علی حنفی کے پاس بھیجا جس نے ان کی تکریم کی۔ ایک روایت کے مطابق وہ ہوذہ اور ثمامہ بن اثال حنفی دونوں کے یہاں بھیجے گئے۔ ثمامہ بعد میں مسلمان ہوئے مگر ہوذہ نے اسلام قبول نہیں کیا۔

یہ چھ افراد ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سبھوں کو ایک ہی دن روانہ فرمایا۔

عمرو بن العاص کو آپ نے عمان میں جیفر ازدی اور عبداللہ ازدی کے یہاں ذی قعدہ ۸ھ میں روانہ کیا۔ یہ دونوں جُلندی ازدی کے بیٹے تھے۔ دونوں مسلمان ہوئے اور تصدیق کی صدقہ کی تحصیلداری اور امور باہمی کا فیصلہ کرنا انھوں نے عمرو بن العاص کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ عمرو بن العاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

علاء بن حضرمی کو آپ نے جعرانہ[1] سے واپسی سے قبل اور ایک روایت کے مطابق فتح مکہ سے پہلے شاہ بحرین منذر بن ساوی عبدی کے یہاں بھیجا۔ شاہ بحرین بھی مسلمان ہوا اور آپ کی تصدیق کی۔

یمن میں حارث بن عبد کلال حمیری کے پاس مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بھیجا۔ اس نے جواباً کہا "اپنے بارے میں غور کروں گا" تبوک سے واپسی کے بعد آپ نے ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل کو یمن روانہ فرمایا۔ ایک روایت کے مطابق یہ روانگی ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں ہوئی۔ دونوں بزرگ دعوتِ اسلام کی مہم پر روانہ ہوئے ان کی کوششوں سے عام یمنیوں نے بغیر کسی جنگ وجدال کے خوشی خوشی اسلام قبول کیا۔ پھر یہاں آپ نے علی بن ابی طالب کو بھیجا۔ علی بن ابی طالب نے وہاں سے واپس آکر حجۃ الوداع کے موقع پر آپ سے مکہ میں ملاقات کی۔

جریر بن عبداللہ بجلی کو ذوالکلاع حمیری اور ذوعمرو کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ دونوں مسلمان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک جریر بن عبداللہ انہی کے یہاں رہے۔ عمرو بن امیہ ضمری کو آپ نے ایک خط دے کر مسیلمہ کذاب کے یہاں بھیجا۔ اسی کے یہاں ایک دوسرا خط دے کر زبیر کے بھائی سائب بن عوام کو بھی روانہ فرمایا۔ مگر وہ مسلمان نہیں ہوا۔

فروہ بن عمرو جُذامی کو بھی آپ نے دعوت اسلام بھیجی۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے کوئی دعوت اس کے یہاں نہیں بھیجی۔ فروہ معان میں قیصر کا گورنر تھا۔ یہ مسلمان ہوا۔ اپنے اسلام کی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی اور مسعود بن سعد کے ساتھ کچھ تحفے بھیجے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے . . . . .

۱۔ سفید خچر ایک عدد، نام فضہ۔ ۲۔ گھوڑا ایک عدد، نام ظرب۔ ۳۔ گدھا ایک عدد، نام یعفور۔ ایک گروہ کا یہی قول

(بقیہ صفحہ گذشتہ) الی الملوک یدعوھم الی الاسلام، حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" میں جہاں حاطب بن ابی بلتعہ کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں وہاں کہا ہے کہ یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب بن ابی بلتعۃ عن ابیہ عن جدہ کے واسطے سے ابن شاہین نے اس واقعہ کی تخریج کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شاہ اسکندریہ مقوقس کے یہاں بھیجا، چنانچہ آپ کا خط لے کر اس کے پاس پہنچا . . . . . دیکھیے "الفتح" ج ۷، ص ۹۷۔

[1] جعرانہ: بالاتفاق پہلا حرف مکسور ہے، آگے اصحاب الحدیث عین پر کسرہ اور راء کو مشدد پڑھتے ہیں، ارباب علم وادب اسے غلط کہتے ہیں، وہ عین کو ساکن اور راء کو مخفف مانتے ہیں، امام شافعی کا ارشاد ہے کہ محدثین جعرانہ کو مشدد اور حدیبیہ کو مخفف پڑھنے میں برسرحق نہیں ہیں، جعرانہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ یہ مکہ سے زیادہ قریب ہے۔ غزوۂ حنین سے واپس ہوتے ہوئے ہوازن سے حاصل شدہ اسباب غنیمت تقسیم کرنے کے لیے آپ یہاں فروکش ہوئے اور یہیں سے احرام باندھا تھا۔ یہاں آپ کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی ہے۔

ہے۔ مگر صحیح قول "واللہ اعلم" یہی ہے کہ عفیر اور یعفور ایک ہی نام ہیں، عفیر یعفور کی تصغیر ترخیم ہے۔ ۴۔ کچھ پارچے۔ ۵۔ زربفتی قبائے حریر۔

آپ نے ہدیہ قبول فرمایا، مسعود بن سعد کو ساڑھے بارہ اوقیے عنایت فرمائے۔ عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی کو ایک خط دے کر خاندان حمیر کے حارث، مسروح اور نعیم بن عبد کلال کے یہاں روانہ فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذنین

مؤذنوں کی تعداد چار تھی : مدینہ کے اندر : بلال بن رباح یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے مؤذن ہیں اور عمرو بن ام مکتوم قرشی عامری، یہ اندھے تھے، ایک قبا کے اندر عمار بن یاسر کے آزاد کردہ غلام سعد القرظ اور ایک مکہ کے اندر : ابومحذورہ، ان کا نام اوس بن مغیرہ جمحی تھا۔ مؤذنوں میں ابومحذورہ اذان میں ترجیع فرماتے اور اقامت دوہری کہتے۔ بلال اذان میں ترجیع نہیں فرماتے، اقامت اکہری کہتے تھے۔ چنانچہ امام شافعی اور اہل مکہ نے اذان ابومحذورہ کی اور اقامت بلال کی، امام ابوحنیفہ اور اہل عراق نے اذان بلال کی اور اقامت ابومحذورہ کی، امام احمد رحمہ اللہ، اہل الحدیث اور اہل مدینہ نے اذان اور اقامت دونوں بلال کی اختیار کی۔ امام مالک رحمہ اللہ نے دونوں جگہوں پر مخالفت کی، نہ وہ اعادۂ تکبیر کے قائل ہوئے نہ تثنیۂ اقامت کے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امراء

باذان بن ساسان۔ بہرام جور کی اولاد میں تھے، کسریٰ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سارے اہل یمن کا امیر بنایا۔ چنانچہ اسلام میں یہ یمن کے سب سے پہلے امیر اور شاہان عجم میں سب سے پہلے مسلمان ہونے والے بادشاہ ہیں۔
باذان کی موت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادہ شہر بن باذان کو صنعاء اور مضافات صنعاء کا امیر بنایا۔ یہ قتل ہوگئے تو آپ نے خالد بن سعید بن العاص کو صنعاء کا امیر بنا کر بھیجا۔

لہ۔ ابوداؤد (۵۰۲)، ابن ماجہ (۷۰۹) سلسلۂ روایت ہمام۔ عامر الاحول مکحول۔ عبداللہ بن محیریز۔ ابومحذورہ ہے۔ کہا "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے انیس اور اقامت کے سترہ کلمات سکھائے"۔ حدیث میں ابومحذورہ نے کلمات اذان کی تشریح کردی ہے۔ تکبیر اول چار بار، اسی میں ترجیع، اقامت بھی اسی طرح، البتہ اقامت میں "قد قامت الصلوٰۃ" دوبار کا اضافہ کیا۔ ترمذی نے (۱۹۲) اور نسائی نے ۲ج، ص ۱۰۳ میں اس کی مختصر اتخریج کی ہے۔ اس میں انھوں نے لفظ اذان اور اقامت کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ نسائی کہا ہے کہ "ابومحذورہ نے پھر اسے انیس اور سترہ کلمہ شمار کیا۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے، صحیح ابن خزیمہ (۳۷۷) میں ایں یوں ہیں "چنانچہ آپ نے انھیں اذان اور اقامت دو دو بار سکھائی"۔ اسی طرح کی روایت ابن حبان (۲۸۸) میں بھی ہے۔ ابن دقیق " میں کہتے ہیں "یہ سند صحیح کی شرط پر ہے" ابوداؤد اور طحاوی کے یہاں یہ دو اور طریقوں سے مروی ہے۔ بلال کی حدیث صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ حکم دیا کہ اذان دوبار اور اقامت ایک بار کہیں، علاوہ "قد قامت الصلوٰۃ" کے بخاری ۲ج، روایت انس۔

مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو کِندہ اور صَدِف کا حکمراں بنایا۔ وہ ابھی روانہ نہ ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔ بعد میں ابوبکر نے انھیں کچھ مرتدین کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔

زیاد بن امیہ انصاری کو آپ نے حضرموت کا گورنر بنایا۔

ابوموسیٰ اشعری کو زبید، عدن اور ساحل کی ولایت دی۔

معاذ بن جبل کو جَنَد کا حکمراں بنایا۔

ابوسفیان صخر بن حرب کو نجران کا والی بنایا۔

ان کے بیٹے یزید کو تیماء کی ولایت سپرد فرمائی۔

عتاب بن سید کو ۸ھ میں جب کہ ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی مکہ کا والی اور مسلمانوں کا امیر حج بنا کر بھیجا۔

علی بن ابی طالب کو اخماس یمن کی ولایت اور عہدۂ قضا سپرد فرمایا۔

عمرو بن العاص کو عمان اور مضافات عمان کا گورنر بنایا۔

صدقات کی تحصیلداری پر بہت سے لوگوں کو مقرر کیا۔ کیونکہ ہر قبیلہ کا ایک حاکم ہوتا جو صدقات وصول کرتا تھا۔ چنانچہ صدقات کے عاملین بکثرت ہوئے۔

ابوبکر کو ۹ھ میں امیر حج بنایا۔ [1] کے پیچھے علی کو بھیجا کہ لوگوں کو سورۂ برأت پڑھ کر سنا دیں۔ اس کی وجہ ایک قول کے مطابق یہ ہے کہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب کہ ابوبکر حج کو روانہ ہو چکے تھے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ عربوں کے دستور میں معاہدہ توڑنے اور باندھنے کا حق صرف سردار یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو حاصل تھا۔ ایک تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ انھیں آپ نے ابوبکر کا معاون بنا کر بھیجا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابوبکر نے علی سے دریافت کیا "آپ امیر ہیں یا مامور؟" تو فرمایا "مامور[1]"

اللہ کے رافضی دشمن کہتے ہیں کہ آپ نے ابوبکر کو معزول کر دیا تھا اور ان کی جگہ حضرت علی کو امیر بنا کر بھیجا تھا۔ ان حضرات کی بہتان طرازی اور افترا پردازی کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔

اختلاف ہے کہ یہ حج ماہ ذی الحجہ میں ہوا یا نسئی کے باعث ذی القعدہ میں؟ ایک گروہ ذی الحجہ کا قائل ہے اور ایک ذی القعدہ کا۔ واللہ اعلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین

سعد بن معاذ۔ یہ معرکۂ بدر میں جس وقت آپ جھونپڑی میں آرام فرماتے تھے آپ کا [پہرہ] کرتے رہے۔

محمد بن مسلمہ۔ معرکۂ احد میں آپ کے نگہبان رہے۔

---

[1] نسائی ج۵، ص ۲۴۷ - ۲۴۸، فی الحج: باب الخطبة قبل یوم التروية۔ دارمی ج ۲، ص ۶۶ و ۶۷، دارمی کے [الفاظ یہ ہیں: "امیر ہیں یا قاصد؟"] فرمایا "امیر نہیں بلکہ قاصد ہوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۂ برأت دے کر بھیجا ہے کہ حج کے مقامات پر [لوگوں کو سناؤں]۔ آگے پوری حدیث ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

زبیر بن العوام۔	خندق کی جنگ میں یہ آپ کے محافظ رہے۔
عباد بن بشر۔	آپ کی حفاظت پر مامور تھے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے آپ کی حفاظت کی۔ مگر جب اس آیت کا نزول ہوا۔
وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ : ۶۷) اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔
باہر نکل کر لوگوں کو اس آیت کی اطلاع دی اور محافظوں کو واپس فرما دیا[1]۔

آپ کے روبرو جن لوگوں نے گردنیں ماریں

علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، مقداد بن عمرو، محمد بن مسلمہ، عاصم بن ثابت بن ابی اقلح، ضحاک بن سفیان کلابی۔
قیس بن سعد بن عبادہ انصاری کی حیثیت آپ کے یہاں وہی تھی جو کسی حکمراں کے یہاں داروغہ کی ہوتی ہے[2]۔ مغیرہ بن شعبہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے پیچھے شمشیر بکف کھڑے رہے۔

آپ کے اخراجات، انگوٹھی، نعل اور مسواک کے منتظمین اور باریابی کی اجازت دینے والے

اخراجات کی فراہمی	بلال
انگوٹھی	معیقیب بن ابی فاطمہ دوسی
نعل اور مسواک	ابن مسعود
باریابی کی اجازت دینے والے	آپ کے دونوں غلام رباح اسود اور انسہ نیز انس بن مالک اور ابو موسیٰ اشعری۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شعراء اور خطیب

شعراء جو اسلام کا دفاع کرتے تھے : کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور حسان بن ثابت۔

۱۔ ترمذی نے (۳۰۴۹) فی التفسیر، میں عائشہ کا بیان نقل کیا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی جاتی تھی مگر جب یہ آیت (وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ) نازل ہوئی تو آپ نے قبہ سے اپنا سر نکالا اور ارشاد فرمایا "لوگو! واپس جاؤ، اللہ مجھے اپنی حفاظت میں لے چکا ہے" طبری ج ۱۰، ص ۴۶۹ میں بھی یہ حدیث منقول ہے۔ حاکم نے ج ۲، ص ۳۱۳ میں اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔ حافظ نے "الفتح" ج ۶، ص ۶۰ میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے موصول اور مرسل ہونے میں اختلاف ہے۔
۲۔ بخاری ج ۱۳، ص ۱۱۹، فی الاحکام : باب الحاکم یحکم بالقتل علی من وجب علیہ، ترمذی (۳۸۴۹) حدیث انس رضی اللہ عنہ۔

کافروں پر سب سے زیادہ یلغار کرنے والے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور کفر و شرک پر عار دلانے والے کعب بن مالک تھے۔ خطیب ثابت بن قیس بن شماس[1] تھے۔

حُدی خوان جو سفر میں آپ کے سامنے حُدی خوانی کرتے تھے

عبداللہ بن رواحہ، انجشہ، عامر بن اکوع، سلمہ بن اکوع (عامر کے چچا) صحیح مسلم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نہایت خوش آواز حدی خوان تھا۔ اس سے آپ نے فرمایا "انجشہ! ذرا آہستہ، آبگینوں (عورتوں) کو توڑ نہ دینا[2]"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوے، وفود اور سریّے

سارے غزوے، وفود اور سریے ہجرت مدینہ کے بعد دس سال کے عرصہ میں پیش آئے۔ غزوات کی تعداد ستائیس، بقول بعض پچیس، بعض کے بقول انتیس اور بقول بعض دیگر ہے۔ نو میں جنگوں کی نوبت پیش آئی۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔
بدر، احد، خندق، قریظہ، مصطلق، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف۔ بعضوں کے مطابق حسب ذیل غزوات میں بھی معرکے ہوئے۔

بنو نضیر، غابہ، وادی قری جو خیبر کے مضافات میں ہے۔ سریوں اور وفود کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے۔
معرکۃ الآراء اور اہم غزوات کی تعداد سات ہے۔
بدر، احد، خندق، خیبر، فتح مکہ، حنین، تبوک۔

ان تمام غزوات کے سلسلہ میں قرآنی آیات نازل بھی ہوئیں۔ چنانچہ سورۂ انفال پوری سورۂ بدر ہے۔ جنگ احد کے باب میں سورۂ آل عمران کی آیت (وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ)(۱۲۱) سے لے کر سورہ کے خاتمہ سے کچھ پیشتر تک کا حصہ اور غزوۂ خندق، قریظہ اور خیبر کے باب میں سورۂ احزاب کی ابتدائی آیات وارد ہیں، سورۂ حشر پوری بنو نضیر کے باب میں اور حدیبیہ اور خیبر کے باب میں سورۂ فتح نازل ہوئی اس میں فتح مکہ کی جانب بھی اشارہ ہے۔ فتح مکہ کا ذکر صراحت کے ساتھ سورۂ نصر میں آیا۔

صرف ایک غزوہ یعنی غزوۂ احد میں آپ زخمی ہوئے۔ بدر، حنین کے معرکوں میں فرشتوں نے آپ کی معیت میں جنگ

---

[1] ابن زہیر بن مالک انصاری خزرجی، خطیب انصار، احد اور مابعد کے دیگر معرکوں میں شریک رہے۔ ابوبکر کے دور خلافت میں معرکۂ یمامہ کے اندر شہید ہوئے۔ اسد الغابہ ج ۱، ص ۲۷۵۔

[2] بخاری ج ۱۰، ص ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱۔ فی الادب: باب مایجوز من الشعر والرجز والحداء۔ ومایکره منه، باب ماجاء فی قول الرجل: ویلك، باب من دعا صاحبه فنقص من اسمه حرفا، وباب المعاريض مندوحة عن الكذب، مسلم (۲۳۲۳) (۷۳) فی الفضائل: باب رحمة النبی صلی الله علیه وسلم للنساء، دارمی ج ۲، ص ۲۹۵ فی الاستئذان۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۰۷، ۱۱۷، ۱۸۶، ۲۲۷، ۲۵۴، ۲۸۵۔ حدیث انس رضی اللہ عنہ۔

کی۔ معرکۂ خندق میں فرشتوں کا نزول ہوا تو مشرکوں پر زلزلہ سا طاری ہوگیا۔ انھیں شکست ہوئی آپ نے ان کے چہروں پر کنکریاں پھینکیں اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بدر و حنین کے معرکوں میں آپ کو فتح حاصل ہوئی۔ صرف ایک غزوہ یعنی غزوۂ طائف میں منجنیق کا استعمال ہوا اور ایک غزوہ یعنی غزوۂ احزاب میں خندق کھود کر بچاؤ کیا۔ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلحے اور اثاثے

آپ کے پاس نو تلواریں تھیں۔
ماثور۔ پہلی شمشیر ہے جسے آپ نے اپنے والد سے وراثت میں پائی تھی۔
عضب۔ ذوالفقار (فا مکسورہ و فا مفتوحہ) یہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا قبضہ، کنارۂ قبضہ، حلقہ، علاقہ، چھلے، زیرین اور میان سب چاندی کے تھے۔ قلعی، بتار، حتف، رسوب، مخذم، قضیب، آپ کی شمشیروں کے زیرین میان چاندی کے اور ان کا مابین رُوپہلے حلقے ہوا کرتے تھے۔
آپ کی شمشیر ذوالفقار معرکۂ بدر میں بطور نفل غنیمت آپ کے حصہ میں آئی تھی یہ وہی شمشیر ہے جس کے بارے میں آپ نے خواب دیکھا تھا۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کی شمشیر سونے چاندی سے مرصّع تھی۔
زرہیں سات تھیں۔
ذات الفضول۔ یہ وہی زرہ ہے جسے اہل و عیال کے لیے تیس صاع جَو کے عوض آپ نے ابوشحم یہودی کے یہاں رہن رکھا تھا۔ یہ قرض ایک سال تک رہا۔ زرہ لوہے کی تھی۔ اس کے علاوہ زرہوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔ ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، بتراء، خرنق۔
کمانیں چھ تھیں۔
زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم (معرکۂ احد میں یہ ٹوٹی تو اسے قتادہ بن نعمان نے لے لیا) سداد۔
ایک ترکش تھا جسے کافور کہتے تھے۔ ایک چرمی پیٹی تھی جس میں مختلف مقامات پر تین نقرئی چھلے لگے ہوئے تھے۔ بکسوا نقرئی اور کنارے بھی نقرئی تھے۔ ایسا ہی بعض روایتوں میں آیا ہے۔ مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں "ہمیں کہیں سے اس بات کی تصدیق نہ ہوسکی کہ آپ نے کمر پر کبھی پیٹی باندھی تھی۔
آپ کے پاس ایک ڈھال زلوق نامی اور دوسری فتق نامی تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق ایک ڈھال آپ کو ہدیہ میں ملی جس پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ تصویر پر آپ نے دستِ مبارک رکھا تو اللہ نے اسے زائل کردیا۔
پانچ نیزے تھے۔ ایک مُثوِی، دوسرا مُثنی نامی۔ ایک چھوٹا نیزہ نبعہ۔ ایک بڑا نیزہ بیضاء نامی تھا۔ ایک نہایت چھوٹا نیزہ چھڑی کے مانند تھا۔ اسے عنزہ کہتے تھے۔ تہواروں کے موقع پر آپ اسے روبرو لے کر چلتے اور آگے گاڑ دیتے۔ اسے آپ سُترہ بنا لیتے تھے۔ کبھی کبھی اسے لے کر راستہ بھی چلتے۔
ایک آہنی خود تھی جسے مُوشّح کہتے تھے۔ یہ پیتل سے مرصّع تھی۔ ایک اور خود بھی تھی جس کا نام سبوغ یا ذوالسبوغ تھا۔
تین جبے تھے جنھیں آپ جنگوں میں زیب تن فرماتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں ایک جبہ ہرے ریشم کا تھا۔ مگر مشہور یہ ہے کہ

عروہ بن زبیر کے پاس دیبا کی ایک قبا تھی جس کا استر ہرے ریشم کا تھا۔ امام احمدؒ کی روایت جنگوں میں ریشمی لباس کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں۔

آپ کے پاس ایک سیاہ پرچم بھی تھا جسے عُقاب کہتے تھے۔ سنن ابوداؤد میں ایک صحابی کا بیان ہے۔"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کو زرد دیکھا" آپ کے پاس کچھ سفید پرچم بھی تھے۔ گاہ اسی میں سیاہ بھی ہوتا۔

ایک خیمہ بھی تھا جو "کن" کے نام سے موسوم تھا۔ ایک گز کا یا اس سے کچھ لمبا ایک خمیدہ سر ڈنڈا تھا جسے لے کر چلتے اور سوار ہوتے۔ اونٹ پر بیٹھ جاتے تو اپنے سامنے اسے لٹکا لیتے۔ ایک تازیانہ عرجون نام کا تھا اور شوحط (ایک پہاڑی درخت) کی لکڑی سے بنی ایک چھڑی تھی جو ممشوق کے نام سے موسوم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی چھڑی ہے جو خلفاء کے پاس یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔

ایک پیالہ تھا جو ریّان اور مغنی دو ناموں سے موسوم تھا۔ ایک اور پیالہ نقرئی زنجیر سے مرصع تھا۔ ایک پیالہ شیشہ کا اور ایک لکڑی کا تھا۔ لکڑی کا رات میں پیشاب کے لیے آپ کے تخت کے نیچے رکھ دیا جاتا۔ صادر نام کا ایک کوزۂ آب بھی تھا۔ پتھر کا بنا ہوا پانی کا ایک برتن بھی تھا۔ جس سے آپ وضو فرماتے۔

پیتل کی ایک لگن، ایک چھوٹا پیالہ سقہ نام کا۔ غسل کے لیے پیتل کا ایک تختہ، تیل کا ایک برتن اور ایک ڈبہ بھی تھا جس میں آئینہ اور کنگھی رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کنگھی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی۔ ایک سرمہ دانی تھی جس سے سوتے وقت دونوں آنکھوں میں سلائی سے تین بار سرمہ لگاتے۔ اور ایک ڈبے کے اندر دو قینچیاں اور مسواک ہوا کرتی تھی۔ ایک بہت بڑا پیالہ غراء نام کا جس میں چار چھلے تھے اسے چاروں طرف سے چار آدمی اٹھاتے تھے۔ ایک صاع، ایک مد، ایک کمبل، ایک تخت جس کے پائے ساج (ساکھو) کے بنے ہوئے تھے اسے اسعد بن زرارہ نے آپ کو ہدیہ دیا تھا نیز ایک چرمی بستر تھا جس میں کھجور کی پتیاں بھری ہوئی تھیں۔

آپ کے پاس یہ تھے جملہ سامان جو احادیث کے اندر متفرق طور پر مذکور ہیں۔ طبرانی نے معجم میں عبداللہ بن عباس کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے جو آپ کے برتنوں کے باب میں جامع کہی جا سکتی ہے اس حدیث میں ابن عباس فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تلوار تھی جس کا دستہ اور کنارۂ دستہ نقرئی تھا۔ اسے ذوالفقار کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ایک کمان سداد نام کی ایک ترکش جمع نامی ایک پیتل سے مرصّع زرہ ذات الفضول، ایک چھوٹا نیزہ نبعاء، ایک خمیدہ سر ڈنڈا دقن نامی، ایک سفید ڈھال موجز نامی، ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا اسکب نامی۔ ایک زین داج نامی، ایک سفید خچر دلدل، ایک اونٹنی قصواء، ایک گدھا یعفور، ایک فرش کن نام کا، ایک بکری قمرہ، ایک کوزہ صادرہ، ایک قینچی موسوم بہ جامع، ایک آئینہ اور درخت شوحط سے بنی ہوئی ایک چھڑی تھی جسے موت کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانور

حسب ذیل ناموں کے گھوڑے تھے۔

سکب، کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا گھوڑا تھا جو آپ کی ملکیت میں آیا جس اعرابی سے آپ نے اسے دس اوقیہ میں خرید تھا اس کے یہاں اس کا نام ضرس تھا۔ پچکلیان تھا مگر دایاں پیر خالی از سفیدی کمیتی (سرخی اور سیاہی مائل) رنگ کا اور بقول بعض

روایت سیاہ رنگ کا تھا۔

مُرتجز۔ یہ سفید رنگ کا تھا۔ یہ وہی ہے جس کے بارے میں خزیمہ بن ثابت نے گواہی دی تھی۔

لُحیف، لِزاز، ظَرِب، سَبحۃ، وَرد، باتفاق یہ سات گھوڑے آپ کی ملکیت میں تھے۔ امام ابو عبداللہ محمد بن اسحاق بن جماعۃ الشافعی نے انھیں ایک شعر میں یوں جمع کیا ہے۔

والخیلُ سَکبٌ لُحَیفٌ سَبحَۃٌ ظَرِبٌ   لِزَازٌ مُرتَجزٌ وَرَدٌ لہا اسرارٌ

اپنے والد کے اس شعر کی خبر مجھے امام عزالدین عبدالعزیز ابوعمرو نے دی تھی۔ اللہ انھیں اپنے تمغۂ اطاعت سے سرخرو فرمائے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس ان کے علاوہ پندرہ گھوڑے اور بھی تھے۔ مگر یہ اختلافی قول ہے۔ آپ کی زین کے دونوں حصے کھجور کی پتیوں سے پر ہوتے تھے۔

خچروں میں ایک دلدل نام کا تھا جو سفید تھا اور جسے مقوقس نے آپ کو ہدیہ دیا تھا۔ ایک دوسرا فضہ نام کا تھا جسے فروہ جذامی نے ہدیہ کیا تھا، ایک اور سفید خچر تھا جسے ایلہ کے حکمراں نے بھیجا تھا۔ اور ایک وہ تھا جسے دومۃ الجندل کے حاکم نے ہدیہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بقول بعض روایت حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بھی ایک خچر ہدیہ میں بھیجا تھا جس پر آپ سواری فرمایا کرتے تھے۔

گدھوں میں ایک عُفیر نام کا سفید گدھا تھا جسے قبطیوں کے بادشاہ مقوقس نے ہدیہ کیا تھا، دوسرا وہ تھا جسے فروہ جذامی نے ہدیہ بھیجا تھا۔ مروی ہے کہ سعد بن عبادہ نے بھی آپ کو ایک گدھا بطور عطیہ دیا تھا جس پر آپ سوار ہوتے تھے۔

قصواء نام کی ایک اونٹنی تھی، کہا جاتا ہے اس پر سوار ہو کر آپ نے ہجرت فرمائی۔ نیز عضباء اور جدعاء نام کی دو اونٹنیاں اور تھیں۔ عضباء کان پھٹی اور جدعاء ناک کٹی کو کہتے ہیں، مگر اونٹنیاں ایسی نہ تھیں۔ یہ محض ان کے نام تھے۔ ایک قول کے مطابق عضباء نام کی اونٹنی کان پھٹی تھی اسی لیے اس نام سے موسوم ہوئی۔ دونوں ناموں کی اونٹنیاں ایک ہی ہیں یا دو؟ اس میں اختلاف ہے۔ عضباء وہی اونٹنی ہے جس سے رفتار میں کوئی جانور آگے نکل نہیں پاتا تھا۔ مگر ایک بار ایک بدو قعود نام کی اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور دوڑ میں عضباء سے آگے نکل گیا۔ یہ بات مسلمانوں پر شاق گزری۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان حقا علی اللہ أ لا یرفع من الدنیا شیئًا الا وضعہ[1]

اللہ پر یہ حق ہے کہ دنیا کی جس چیز کو بلند کرے اسے پست بھی کر دے۔

معرکۂ بدر میں آپ نے ابوجہل کا ایک مہری اونٹ (مہرہ بن حیدان کی جانب نسبت ہے) غنیمت میں پایا تھا اس کی ناک میں نقرئی نکیل تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اسے قربانی کے لیے بھیج دیا تاکہ مشرکین دیکھ کر تاؤ کھائیں[2]۔

پینتالیس دودھاری اونٹنیاں تھیں۔ ایک مہری اونٹنی بھی تھی جسے سعد بن عبادہ نے خاندان بنوعقیل کے اونٹوں میں سے چُن کر آپ کو ہدیہ کیا تھا۔

---

[1] بخاری ج ۱۱، ص ۲۹۲، فی الرقاق: باب التواضع، وفی الجھاد: باب ناقۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ و ابوداؤد (۴۸۰۲) فی الادب: باب کراھیۃ الرفعۃ فی الامور۔ نسائی ج ۶، ص ۲۲۷ فی الخیل: باب السبق۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۰۳ و ۲۵۳۔ حافظ "الفتح" ج ۶، ص ۵۶ میں رقمطراز ہیں، حدیث میں یہ ہے کہ سواری اور مقابلہ کے لیے اونٹ پالے جائیں، اس میں زہد فی الدنیا کی تعلیم بھی ہے کیونکہ اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی جو شئی بھی بلند ہوتی ہے پست ہو کر رہتی ہے، نیز اس میں تواضع اور منکسر المزاجی کی تاکید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن خلق، تواضع اور صحابہ کے سینوں میں آپ کی محبت اور عظمت کا اظہار بھی ہے۔

[2] احمد ج ۱، ص ۲۶۱، ابوداؤد (۱۷۴۹) حدیث عبداللہ بن عباس سند صحیح ہے۔ ترمذی (۸۱۵) ابن ماجہ (۳۰۷۶) حدیث جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ۔ سند صحیح ہے۔

سو بکریاں تھیں۔ آپ چاہتے تھے کہ ان کی افزائش نہ ہو، چنانچہ چرواہا جب بھی کسی بچّہ کے پیدا ہونے کی خبر دیتا اس کی جگہ ایک بکری ذبح کر دیتے۔ عطیہ کی سات بکریاں بھی تھیں جنھیں ام ایمن چراتی تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس

ایک عمامہ سحاب نامی تھا۔ جسے آپ نے علی کو دیا۔ اسے آپ استعمال کرتے تھے۔ اس کے نیچے ٹوپی پہنتے۔ ٹوپی آپ عمامہ کے بغیر اور عمامہ ٹوپی کے بغیر بھی استعمال کرتے تھے۔ عمامہ باندھنے کے بعد شملہ دونوں شانوں کے درمیان لٹکا لیتے۔ صحیح مسلم میں عمرو بن حریث کا بیان ہے۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر پر دیکھا۔ آپ کے سر پر ایک سیاہ عمامہ تھا جس کا شملہ اپنے دونوں شانوں کے درمیان نکال رکھا تھا"[1]

مسلم ہی میں جابر بن عبداللہ سے ایک روایت ہے۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا"[2]

جابر کی حدیث میں (ذؤابۃ) کا لفظ وارد نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شانوں کے درمیان شملہ کا لٹکانا دائمی معمول نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ فوجی لباس میں تھے۔ خود سر پر تھی۔ چنانچہ لباس ہر جگہ وہی ہوتا جو اس جگہ کے لیے موزوں ہوتا۔

شیخ ابو العباس ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ فی الجنۃ۔ شملۂ عمامہ کے باب میں ایک انوکھی حکمت بیان فرماتے تھے۔ وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جو خواب دیکھا تھا اس کی صبح آپ نے شملہ لٹکایا تھا۔ کیونکہ رب العزت تبارک وتعالیٰ نے اس خواب میں آپ سے پوچھا "محمد! ملأ اعلیٰ مخاصمت کس بات پر کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "میں نے جواب دیا۔ نہیں معلوم۔ چنانچہ اللہ نے میرے دونوں شانوں[3] کے درمیان اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس وقت ارض وسماء کی ساری باتیں مجھ پر روشن ہو گئیں"[4]

یہ حدیث ترمذی[5] میں آئی ہے۔ بخاری سے اس کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا "صحیح ہے" شیخ فرماتے ہیں کہ اسی وقت سے

---

[1] مسلم (۱۳۵۹) فی الحج : باب جواز دخول مکۃ بغیر إحرام۔ ابو داؤد (۴۰۷۷) فی اللباس : باب فی العمائم۔ نسائی ج ۸، ص ۲۱۱، فی الزینۃ ، باب لبس العمائم الحرقانیۃ۔ ابن ماجہ (۱۱۰۴) فی الإقامۃ : باب ماجاء فی الخطبۃ یوم الجمعۃ و (۲۸۲۱) فی الجھاد : باب لبس العمائم فی الحرب۔ مسند احمد ج ۴، ص (۳۰۷) حدیث عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ۔

[2] مسلم (۱۳۵۸) فی الحج : باب جواز دخول مکۃ بغیر إحرام۔ ترمذی (۱۶۷۹) فی الجھاد : باب ماجاء فی الالویۃ و (۱۷۳۵) فی اللباس : باب ماجاء فی العمامۃ السوداء۔ ابو داؤد (۴۰۷۶) فی اللباس : باب فی العمائم۔ نسائی ج ۵، ص (۲۰۱) فی الحج : باب دخول مکۃ بغیر احرام و ج ۸، ص ۲۱۱ فی الزینۃ : باب لبس العمائم السود۔ ابن ماجہ (۲۸۲۲) فی الجھاد : باب لبس العمائم فی الحرب۔ مسند احمد ج ۳، ص ۳۶۳ و ۳۸۷، حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما۔

[3] علامہ علی قاری فرماتے ہیں یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے مزید فضل خاص سے مشرف اور مخصوص طور پر اپنی بارگاہ سے فیضیاب فرمایا کیونکہ یہ دستور ہے کہ جو استاذ اپنے شاگرد سے محبت رکھتا ہے اس کے دونوں شانوں کے درمیان شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے، یہ اس باب کی علامت ہے کہ استاد کے دل میں شاگرد کی قدر و منزلت اور اس کی حوصلہ افزائی کی خواہش موجود ہے۔

[4] یعنی ارض وسماء کے درمیان جو ملائکہ وغیرہ ہیں ان کا آپ کو اللہ نے علم بخشا یہ اشارہ اس علم کی وسعت کا ہے جس کا دروازہ آپ پر اللہ نے کھول دیا۔ مطلقاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ آسمان و زمین کی تمام کائنات کا آپ کو علم ہو گیا۔

[5] رقم (۳۲۳۳) فی تفسیر سورۃ ص، حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔ یہ خواب کی مشہور طویل حدیث ہے۔ اسے عالم بیداری کا واقعہ قرار دینا غلط ہے۔ اس کی تشریح حافظ ابن رجب حنبلی نے اپنی ایک جزء میں جس کا نام انھوں نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شملۂ عمامہ دونوں شانوں کے درمیان آپ نے لٹکایا۔ جہلا کی زبانیں اور دل اس بات کو باور نہیں کریں گی۔ اس طرح کا افادہ مجھے اور کہیں نہیں ملا۔ جسم مبارک پر قمیص ہوتی تھی جو انتہائی پسند خاطر تھی۔ اس کی آستینیں صرف ہاتھ کے گٹوں تک ہوتی تھیں جبہ، قبا نما پوشاک، فرجیہ اور قبا بھی زیب تن فرمائی ہے۔ سفر میں تنگ آستینوں کا جبہ، تہہ بند اور چادر بھی استعمال فرمائی۔ واقدی فرماتے ہیں آپ کی چادر چھ ہاتھ لمبی اور ساڑھے تین ہاتھ چوڑی تھی۔ ازار عمان کی بنی ہوئی ساڑھے چار ہاتھ لمبی اور ڈھائی ہاتھ چوڑی تھی۔

سرخ حُلّہ بھی استعمال فرمایا۔ حُلّہ ازار اور چادر کو کہتے ہیں۔ اسے حُلّہ اسی وقت کہیں گے جب دونوں کپڑے ایک ساتھ استعمال ہوں۔ جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آپ نے خالص سرخ رنگ کا حلہ استعمال فرمایا ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ سرخ حلہ دراصل دو یمنی دھاری دار کپڑے تھے جو عام یمنی کپڑوں کی طرح سیاہ اور سرخ دھاگوں سے ملا کر بُنے گئے تھے۔ چونکہ ان کے اندر سرخ دھاریاں بن جاتی تھیں اس لیے اسی نام سے معروف تھے ورنہ خالص سرخ رنگ کا استعمال نہایت ممنوع ہے۔ صحیح بخاری کے اندر وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ گدّے سے منع فرمایا ہے[1]۔ سنن ابو داؤد میں عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جسم پر سرخ رنگ کی ایک چادر دیکھ کر فرمایا "یہ چادر تمھارے اوپر کیسی ہے"! میں یہ سمجھ گیا کہ آپ کو ناپسند ہے۔ چنانچہ گھر آیا۔ گھر والوں نے تندور دہکا رکھا تھا۔ اسی میں یہ چادر پھینک دی، دوسرے دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا "عبداللہ! وہ چادر کیا ہوئی؟" میں نے ماجرا سنایا تو آپ نے فرمایا "گھر میں کسی کو دیدیا ہوتا۔ کیونکہ عورتوں کے لیے اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے[2]"۔ صحیح مسلم میں انہی عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر دو سرخ رنگ کے کپڑے دیکھے تو فرمایا۔ یہ کافروں کا لباس ہے اسے نہ پہنو[3]"۔ صحیح مسلم ہی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک

(بقیہ صفحہ گذشتہ) "اختیار الأولی فی شرح حدیث اختصام الملاء الاعلی" رکھا ہے فرمائی ہے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے اور احمد نے اپنی مسند ج ۵، ص ۲۴۳ میں حدیث معاذ کی روایت صحیح سند سے کی ہے۔ طبرانی، حاکم، محمد بن نصر وغیرہ نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ ترمذی (۳۲۳۱) اور مسند احمد ج ۱، ص ۳۶۸ میں یہ عبداللہ بن عباس اور دارمی اور بغوی کی "شرح السنۃ" میں عبدالرحمن بن عائش کی روایت سے آئی ہے۔

ملاء اعلی مقرب فرشتوں کو کہتے ہیں ان کی مخاصمت کا مفہوم یا تو یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو آسمان تک پہنچانے میں ایک دوسرے سے بازی لینے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ کہ ان اعمال کی فضیلت پر باہمی مباحثہ کرتے ہیں۔ اسے مخاصمت سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ مخاصمت میں سوال وجواب کا انداز ہوتا ہے گویا اس میں ایک طرح کے باہمی مناظرہ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لیے مخاصمت کا لفظ انتہائی موزوں ہے۔

[1] حدیث براء بن عازب، بخاری ج ۱۰، ص ۲۵۹ فی اللباس : باب المیثرۃ الحمراء و باب لبس القسی وباب خواتیم الذهب وفی الجنائز : باب الامر باتباع الجنائز، وفی المظالم : باب نصر المظلوم وفی النکاح : باب حق إجابة الولیمة والدعوة وفی الأشربة : باب آنیة الفضة وفی المرضیٰ : باب وجوب عیادة المرضی وفی الادب : باب تشمیت العاطس اذا حمد الله وفی الاستیئذان : باب إفشاء السلام وفی الأیمان والنذور : باب قول الله عزوجل : وأقسموا بالله جهد أیمانهم، ومسلم (۲۰۶۶) فی اللباس : باب تحریم استعمال الذهب والفضة علی الرجال والنساء، ترمذی (۲۸۱۰) فی الأدب : باب ماجاء فی کراهیة لبس المعصفر، نسائی ج ۴، ص ۵۴، فی الجنائز : باب الأمر باتباع الجنائز، مسند احمد ج ۴، ص ۲۸۷ و ۲۹۹۔ ترمذی اور نسائی کے اندر لفظ "الحمر" (سرخ) نہیں ہے۔

حدیث میں "المیاثر الحمر" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عجمیوں کی حریر و دیبا سے بنی ہوئی گدیوں کو کہتے ہیں، سرخ کی قید سے مطلق ریشم کے مقابلہ میں خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ گدیاں ریشمی ہوں تو ممنوع ہیں مگر سرخ بھی ہوں تو ممانعت میں اور شدت پیدا ہوجاتی ہے۔

[2] ابو داؤد (۴۰۶۶) فی اللباس : باب فی الحمرة، ابن ماجہ (۳۶۰۳) فی اللباس : باب کراهیة المعصفر للرجال، مسند احمد ج ۲، ص ۱۹۲، سند حسن ہے۔

[3] مسلم (۲۰۷۷) فی اللباس : باب النهی عن لبس الرجل الثوب المعصفر، نسائی ج ۸، ص ۲۰۳ فی الزینة : باب النهی عن لبس المعصفر، مسند احمد ج ۲، ص ۱۶۲ و ۱۶۴ و ۱۹۳ و ۲۰۷ و ۲۱۱۔

روایت ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ لباس پہننے سے منع فرمایا ہے[1]"۔ بعض سنن میں وارد ہے کہ کسی سفر میں صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے کجاووں پر ایسی چادریں دیکھیں جن پر سرخ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ فرمایا "دیکھ رہا ہوں کہ یہ سرخی تم پر غالب آچکی ہے"۔ صحابہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر اتنی تیزی سے اٹھے کہ بعض اونٹ ہمارے بدک اٹھے، ہم نے چادروں کو کجاووں سے کھینچ کر ہٹا دیا۔ یہ ابوداؤد کی روایت ہے[2]۔

سرخ سوتی اور اونی وغیرہ کپڑوں کے استعمال کا جواز محل نظر ہے۔ کراہیت کی شدت میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں۔ پھر کیونکر یہ بات سوچی جا سکتی ہے کہ آپ نے خالص سرخ رنگ کا کپڑا استعمال فرمایا ہے۔ اصل میں حلۂ حمراء (سرخ سوٹ) کے لفظ سے شبہ ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

دھاری دار اور سادہ کملم، نیز سیاہ کپڑا بھی استعمال فرمایا ہے پوستین بھی جس کے چاروں طرف ریشمی گوٹ لگی تھی پہنی ہے۔ امام احمد اور ابوداؤد نے اپنی سندوں سے انس بن مالک کی روایت پیش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاہِ روم نے ایک ریشمی مستقہ ہدیہ کی تو آپ نے اسے استعمال فرمایا گویا کہ آستین آپ کے دونوں ہاتھوں پر لہراتے ہوئے میں دیکھ رہا ہوں[3]۔ اصمعی کہتے ہیں کہ مستقہ لمبی آستین والے پوستین کو کہتے ہیں۔ خطابی فرماتے ہیں ہو سکتا ہے یہ پوستین خالص ریشم کی نہ رہی ہو بلکہ چاروں طرف ریشمی گوٹ سے مزین رہی ہو۔ کیونکہ پوستین بجائے خود ریشم کی نہیں ہوا کرتی۔

دیگر پوشاکیں

آپ نے ایک پائجامہ خریدا، بظاہر استعمال کرنے ہی کے لیے خریدا تھا۔ دوسری کئی روایتوں کے مطابق آپ نے استعمال بھی فرمایا۔ آپ کی اجازت سے صحابہ پائجامہ استعمال کرتے تھے۔

آپ نے موزہ اور تاسومہ نام کا جوتا بھی پہنا ہے۔

انگوٹھی بھی استعمال فرمائی ہے۔ دائیں یا بائیں دونوں ہاتھوں میں استعمال کرنے کی روایتیں وارد ہیں اور سند کے اعتبار سے صحیح ہیں۔

خوذہ نام کی خود اور زردیہ نام کی زرہ بھی پہنی ہے۔ معرکۂ احد میں آپ اوپر نیچے دو زرہیں پہن کر نکلے تھے۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق اسماء بنت ابی بکر کا بیان ہے "یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ" انھوں نے ایک جبہ نکال کر دکھایا جو ایرانی طرز کا عجمی جبہ تھا، اس کی کلی ریشمی تھی، دونوں چاک پر ریشمی گوٹ چڑھی ہوئی تھی۔ آگے فرمایا "یہ عائشہ کے یہاں ان کی عمر بھر رہا۔ انتقال کے بعد میں نے حاصل کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہنا کرتے تھے۔ ہم اسے دھو کر مریضوں کو بطور علاج پلاتے ہیں[4]"۔

---

[1] مسلم (۲۰۷۸) فی اللباس : باب النھی عن لبس الرجل الثوب المعصفر۔ ابوداؤد ۴۰۴۲ و ۴۰۴۵ و ۴۰۴۷ و ۴۰۵۰ و ۴۰۵۱، فی اللباس : باب من کرہ لبس الحریر۔ نسائی ج ۸، ص ۲۰۴، فی الزینۃ : باب النھی عن لبس المعصفر۔

[2] ابوداؤد (۴۰۷۰) فی اللباس : باب فی الحمرۃ۔ مسند احمد ج ۳، ص ۴۶۳، حدیث رافع بن خدیج۔ اس روایت میں ایک راوی کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔

[3] احمد ج ۳، ص ۲۵۱، ابوداؤد (۴۰۴۷) سلسلۂ روایت میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہیں۔ مطبوعہ نسخہ میں "بادیتان" کا لفظ تحریف ہے۔

[4] یہ مسلم (۲۰۶۹) فی اللباس : باب تحریم استعمال إناء الذھب والفضۃ علی الرجال والنساء (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ کے پاس دو سبز چادریں، ایک سیاہ کمبل، ایک سرخ جمایا ہوا۔ اور ایک بال کا بنا ہوا کمبل بھی تھا۔
آپ کی قمیص سوتی، طول میں کم، آستین تنگ اور چھوٹی تھی، یہ لمبی چوڑی ہتھیلیوں کے مانند کشادہ آستینیں نہ تو آپ نے ہی استعمال فرمائی اور نہ کبھی کسی صحابی نے۔ ان کا استعمال سنت کے خلاف ہے۔ جواز ان کا محل نظر ہے۔ کیونکہ اس طرح کی پوشاک سے غرور و تمکنت کی بو آتی ہے۔
آپ کا پسندیدہ لباس قمیص اور ایک قسم کی چادر حبرۃ تھی جس میں تھوڑی سرخی ہوا کرتی تھی۔ سفید رنگ بے حد پسند تھا۔ ارشاد ہے "یہ تمھارا بہترین لباس ہے۔ اسے پہنو اور اسی میں اپنے مردوں کو کفن دو[1]۔"
صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک گلیم اور ایک موٹی ازار نکال کر فرمایا "انہی دونوں کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قبض ہوئی[2]۔"
سونے کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی مگر پھر پھینک دی اور صحابہ کو سونے کی انگوٹھیوں سے منع فرمایا۔ اس کے بعد نقرئی انگوٹھی پہنی۔ اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ ابوداؤد کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ باتوں کی ممانعت فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ حکمراں کے علاوہ ہر ایک کو انگوٹھی کا استعمال ممنوع ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ حدیث کیا ہے اور کیسی ہے[3]۔ واللہ اعلم۔
آپ اپنی انگوٹھی کا نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھتے، ترمذی کے مطابق آپ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو انگوٹھی اتار دیتے۔ اس روایت کو انھوں نے صحیح مگر ابوداؤد نے منکر قرار دیا ہے[4]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کی ایک لمبی حدیث کا جز ہے۔ مطبوعہ میں بیشتر تحریفات موجود ہیں۔

[1] ابوداؤد (۳۸۷۸) فی الطب : باب فی الأمر بالکحل و (۴۰۶۱) فی اللباس : باب فی البیاض، ترمذی (۹۹۴) فی الجنائز: باب مایستحب من الاکفان، ابن ماجہ (۱۴۷۲) فی الجنائز: باب مایستحب من الکفن، مسند احمد ج ۱، ص ۲۴۷ و ۲۷۴ و ۳۲۸ و ۳۵۵ و ۳۶۳، ترمذی کے مطابق یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ہے بھی ایسا ہی، ترمذی نے اسے (۲۸۱۱) فی الادب : باب ماجاء فی لبس البیاض اور نسائی ج ۸، ص ۲۰۵، فی الزینۃ : باب الامر بلبس البیض من الثیاب، ابن ماجہ (۳۵۶۷) فی اللباس : باب البیاض من الثیاب، مسند احمد ج ۵، ص ۱۲ و ۲۱۔ حدیث سمرہ بن جندب سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ "البسوا البیاض فإنها أطهر وأطیب وکفنوا فیها موتاکم" ہیں اور یہ بھی صحیح ہے۔

[2] بخاری ج ۱۰، ص ۲۳۵، فی اللباس : باب الأکسیة والخمائص۔ و فی الجهاد : باب ماذکر من درع النبی صلی الله علیه وسلم و عصاه و سیفه، مسلم (۲۰۸۰) فی اللباس، باب التواضع فی اللباس، ترمذی (۱۷۳۳) فی اللباس : باب ماجاء فی لبس الصوف، ابوداؤد (۴۰۳۶) فی اللباس : باب لباس الغلیظ، ابن ماجہ (۳۵۵۱) فی اللباس : باب لباس رسول الله صلی الله علیه وسلم، مسند احمد ج ۶، ص ۳۲ و ۱۳۱، ان تمام کتابوں میں روایت ابو بردہ عن عائشہ ہے۔

[3] ابوداؤد (۴۰۴۹) فی اللباس : باب من کره لبس الحریر اور نسائی ج ۸، ص ۱۴۳، فی الزینة : باب النتف کی یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ نسائی کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔
ابوداؤد اس روایت کے مابعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں انگوٹھی کا تذکرہ منفرد نوعیت کا ہے۔

[4] ترمذی (۱۷۴۶) فی اللباس : باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین، ابوداؤد (۱۹) فی الطهارة : باب الخاتم یکون فیه ذکر الله یدخل به الخلاء، نسائی ۱۷۸/۸ فی الزینة : باب الخاتم عند دخول الخلاء، ابن ماجہ (۳۰۳) فی الطهارة : باب ذکر الله عزوجل علی الخلاء والخاتم فی الخلاء، ابن حبان (۱۲۵) اور حاکم کے یہاں یہ روایت انس بن مالک سے ہے۔ اس کی سند میں ابن جریج مدلس ہے، انھوں نے عن عن کر کے روایت کی ہے، ابوداؤد نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے اور نسائی نے اسے غیر محفوظ بتایا ہے۔ دارقطنی نے اسے اختلافی قرار دیا ہے اس کے شاذ ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے، مگر بایں ہمہ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے، نووی نے ترمذی کے فیصلہ کو مسترد کر دیا ہے۔

طیلسان[1] کے باب میں کوئی روایت اس طرح کی نہیں ملتی کہ آپ نے یا کسی صحابی نے اسے استعمال کیا ہو۔ البتہ صحیح مسلم میں انس بن مالک کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تذکرۂ دجال کے بعد آیا ہے کہ "اس کے ساتھ ستر ہزار اصبہان کے یہودی بھی نکلیں گے جن پر طیلسان کی پوشاک ہوگی"[2]

انس بن مالک نے ایک جماعت کو طیلسان کی پوشاک میں دیکھ کر فرمایا "یہ حضرات خیبر کے یہودیوں سے کتنے مشابہ ہیں"۔ چنانچہ اسی بنیاد پر سلف وخلف کی ایک جماعت طیلسان کا استعمال مکروہ سمجھتی ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بروایت ابوداؤد اور حاکم ابن عمر سے منقول ہے۔ "من تشبّہ بقوم فھو منھم" جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں شمار ہوگا[3]۔ ترمذی میں ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لیس منا من تشبّہ بقوم غیرنا" (جو ہمارے علاوہ کسی اور قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ ہماری جماعت سے خارج ہے[4]۔) باقی ہجرتِ مدینہ والی حدیث کے اندر جو یہ آیا ہے کہ حضرت ابوبکر کے یہاں دوپہر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں پہنچے کہ اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ تو یہ صورت صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکیں یہ بات گویا ضرورۃً تھی۔ بالعموم آپ ایسا نہیں کرتے تھے۔

انس بن مالک نے اپنی ایک روایت میں کہا ہے کہ آپ بکثرت مُنہ پر پردہ ڈال لیا کرتے تھے۔ آپ کا یہ فعل واللہ اعلم صرف تپش وغیرہ سے بچنے کے لیے ہوا کرتا تھا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مُنہ کو پردے میں چھپا لینا طیلسانی پوشاک پہننے کے مفہوم میں آتا نہیں۔

لباس کے باب میں دیگر سنّتیں

بالعموم آپ اور صحابہ سوتی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ گاہ اونی اور کتانی بھی استعمال فرمائے ہیں۔ شیخ ابواسحاق اصبہانی نے صحیح سند سے جابر بن ایوب کی روایت پیش کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ صَلت بن راشد اونی جبہ، اونی ازار اور اونی عمامہ پہنے محمد بن سیرین کے یہاں آئے تو انھیں بے حد انقباض ہوا۔ فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگ اون پہن کر فرماتے ہوں گے کہ یہ پوشاک عیسیٰ ابن مریم کی رہی ہے اور میں نے اس شخص کو جو میرے نزدیک بے عیب ہے یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتانی، اونی، اور سوتی لباس بھی پہنا ہے۔ ہمارے نبی کی سنت اتباع کیے جانے کا زیادہ حق رکھتی ہے"۔ ابن سیرین کا مقصد یہ تھا کہ کچھ حضرات اونی لباس کو دیگر پوشاکوں کے مقابلہ میں افضل تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسری پوشاکوں سے باز رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی نوعیت کی پوشاک پر انحصار کرتے ہیں۔ اور ایسے رسوم وعادات اور وضع قطع اختیار کرتے ہیں جن کی خلاف ورزی منکر تصور فرماتے ہیں، حالانکہ منکر تو یہ ہے کہ کسی ایک

---

[1] طیلسان عجمی زبان کا لفظ ہے جو معرب ہو کر عربی میں آیا ہے، یہ ایک پوشاک ہوتی ہے جسے کندھے پر ڈال کر پورا بدن ڈھانک لیتے ہیں۔ اس کی سلائی وغیرہ نہیں کرتے۔

[2] صحیح مسلم (۲۹۴۴) فی الفتن: باب فی بقیۃ من احادیث الدجال، انس بن مالک کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے "دجال کے پیچھے اصبہان کے ستر ہزار یہودی ہوں گے۔ جن پر طیلسانی پوشاکیں ہوں گی" اصل نسخہ میں روایت نواس بن سمعان کی ہے۔ مگر مؤلف رحمہ اللہ کا یہ وہم ہے۔

[3] دیکھیے ص ۱۱، یہ حدیث حسن ہے۔ حاکم کی جانب اس کا انتساب مؤلف رحمہ اللہ کا وہم ہو سکتا ہے۔

[4] ترمذی (۲۶۹۶) فی الإستئذان: باب کراھیۃ إشارۃ الید فی السلام۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہے مگر ماقبل کی حدیث بطور شاہد ہے اس لیے حسن کے درجہ میں آگئی ہے۔

پوشاک ہی کا التزام کرلیا جائے۔ اور اس کی خلاف ورزی گوارہ نہ کی جائے۔

صحیح یہ ہے کہ سب سے افضل طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، جس کا حکم دیا ہے، جس کی ترغیب دی ہے، اور جس پر آپ نے مداومت اختیار فرمائی ہے، لباس کے بارے میں آپ کی سنت یہ ہے کہ جو لباس بھی میسر ہو پہنا جائے، اونی بھی، سوتی بھی، کتانی بھی۔

آپ کے استعمال میں یمنی چادریں بھی آئیں، سبز چادر بھی، جبہ بھی، قبا بھی، قمیص بھی، پائجامہ بھی، ازار بھی، ردا بھی، موزہ بھی اور جوتا بھی، عمامہ کا شملہ کبھی پیچھے کی جانب لٹکا لیتے کبھی نہیں۔

ٹھوڑی کے نیچے عمامہ لپیٹ لیتے[1] جب کوئی نیا کپڑا استعمال فرماتے تو اسی کا نام لے کر فرماتے۔

اللھم انت کسوتنی ھذا القمیص او الرداء او العمامۃ۔ أسألك خیرہ وخیر ما صُنع لہ۔ واعوذبك من شرہ ومن شر ما صُنع لہ[2]

الٰہی! تو نے یہ قمیص، چادر یا عمامہ مجھے پہنایا میں تجھ سے اس کے خیر کا اور جس مقصد کے لیے اسے بنایا گیا ہے اس کے خیر کا طالب ہوں اور اس کے اور جس مقصد کے لیے اسے بنایا گیا ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

قمیص داہنے جانب سے پہنتے۔ سیاہ بالوں کی پوشاک بھی زیب تن فرمائی ہے۔ صحیح مسلم میں عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ بالوں سے بنا ہوا ایک دھاری دار کمبل اوڑھ کر باہر تشریف لائے[3]

صحیحین میں ایک روایت قتادہ کی ہے کہ ہم نے انس سے دریافت کیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ محبوب لباس کیا تھا؟" انھوں نے فرمایا "حِبَرَۃ"[4] حبرۃ ایک قسم کی یمنی چادر تھی[5] عربوں کا زیادہ تر لباس یمنی ہوا کرتا تھا کیونکہ یمن ان سے قریب تھا۔ جہاں کپڑے تیار ہوتے تھے یہی یمن تھا۔ صحابہ نے گاہ مصر و شام سے درآمد شدہ کپڑے مثلاً قباطی جو کتان کے بنے ہوتے تھے۔ انھیں قبطی قوم تیار کرتی تھی استعمال فرمائے۔ سنن نسائی میں عائشہ فرماتی ہیں "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اونی خوبصورت چادر بنائی۔ آپ نے اسے استعمال فرمایا، لیکن پسینہ ہوا اور اون کی بو محسوس ہوئی تو اتار دیا۔ آپ کو

۱۔ "المغنی" ج ۱، ص ۳۰۱، میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ "مسح علی العمامہ کے جواز کی شرطوں میں یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے عماموں کے انداز پر پائیں صورت ہو کہ اس کا کچھ حصہ تالو کے نیچے ہو۔ کیونکہ عربوں کے عماموں کا یہی طریقہ ہوتا تھا۔ اس سے ستر پوشی بھی زیادہ ہوتی ہے اور اسے ہٹانا بھی دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر مسح کرنا جائز ہے۔ خواہ عمامہ کا شملہ ہو یا نہ ہو۔ یہ قاضی نے کہا ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ باقی اگر تالو کے نیچے اس کا کچھ بھی حصہ نہ ہو نہ اس کا شملہ ہی ہو تو اس پر مسح کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ذمیوں کے طرز کا عمامہ ہوتا ہے اسے ہٹا لینا بھی دشوار نہیں ہوتا۔

۲۔ ابوداؤد (۴۰۲۰) فی اول اللباس، ترمذی (۱۷۶۷) فی اللباس: باب مایقول اذا لبس ثوبا جدیدا، مسند احمد ج ۳، ص ۳۰ و ۵۰، حدیث ابوسعید خدری، سند صحیح ہے، ابن حبان (۱۴۴۲) اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۳۔ مسلم (۲۰۸۱) فی اللباس: باب التواضع فی اللباس والاقتصار علی الغلیظ منہ والیسیر، ترمذی (۲۸۱۴) فی الادب: باب ماجاء فی الثوب الاسود، ابوداؤد ۴۰۳۲ فی اللباس: باب فی لبس الصوف والشعر۔

۴۔ بخاری ج ۱۰، ص ۲۳۴، فی اللباس: باب البرود والحبر والشملۃ، مسلم (۲۰۸۱) فی اللباس: باب التواضع، ترمذی (۱۷۸۸) فی اللباس: باب احب الثیاب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوداؤد (۴۰۶۰) فی اللباس: باب لبس الحبرۃ، نسائی ج ۸، ص ۲۰۳، فی الزینۃ: باب لبس الحبرۃ، مسند احمد ج ۳، ص ۱۳۴ و ۱۸۴ و ۲۵۱ و ۲۹۱۔ حافظ نے "الفتح" میں لکھا ہے کہ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ انس نے قتادہ سے ایک سوال کے جواب میں فرمایا اس طرح یہ حدیث قتادہ کی تدلیس سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

۵۔ یمنی چادریں، مزین قسم کی کتانی یا سوتی ہوا کرتی تھیں۔

خوشبو پسند تھی[1]

سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر عمدہ سے عمدہ جوڑا دیکھا ہے[2]" اور سنن نسائی میں ابو رمثہ کا بیان ہے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو سبز چادریں پہنے خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ہے[3]"۔ سبز چادروں میں خالص ہرا رنگ نہیں ہری دھاریاں ہوتی تھیں جیساکہ سرخ جوڑے میں خالص سرخی نہیں بلکہ سرخ دھاریاں ہوتی تھیں۔ حلہ حمراء سے جو شخص خالص سرخ رنگ کا حلہ مراد لیتا ہے اسے اس کا بھی قائل ہونا چاہیے کہ آپ کی ہری چادر خالص ہرے رنگ کی تھی۔ حالانکہ اس کا قائل کوئی نہیں ہے۔

تکیہ آپ کا چرمی تھا جس میں کھجور کی پتیاں بھری ہوتیں جو لوگ زہد و عبادت کے خیال سے اللہ کے جائز کردہ لباس، کھانوں اور شادیوں سے باز رہتے ہیں ان ہی کے بالمقابل ایسا گروہ بھی پایا جاتا ہے جو عمدہ سے عمدہ لباس زیب تن کرتا ہے، عمدہ سے عمدہ نرم اور ملائم غذائیں ہی استعمال کرتا ہے۔

کھردرے ملبوسات اور معمولی کھردری غذائیں محض غرور سے ناپسند کرتا ہے۔ دونوں ہی گروہوں کا طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ اسی سے بعض بزرگانِ قدیم نے فرمایا ہے صحابہ اچھے سے اچھے اور معمولی سے معمولی دونوں ہی لباسوں کو مکروہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ دونوں ہی نام و نمود اور شہرت کے باعث ہیں۔ سنن میں عبداللہ بن عمر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مرفوعاً منقول ہے: "دنیا میں جو شہرت کا لباس اختیار کرے گا آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ ذلت کا لباس پہنائے گا۔ اس لباس میں آگ بھڑکے گی[4]" چونکہ اس طرح کا لباس انھوں نے فخر و تکبر کے خیال سے پہنا تھا اس لیے اللہ انھیں اس کے خلاف ذلت کی سزا دے گا جیساکہ تکبر سے کپڑے گھسیٹ کر چلنے والے کی سزا یہ ہے کہ اسے زمین میں دھنسایا جائے گا اور وہ قیامت تک اسی میں دھنستا چلا جائے گا۔

صحیحین میں عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تکبر سے جو شخص اپنے کپڑے گھسیٹے گا قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کی جانب نگاہ نہ کرے گا[5]" اور سنن میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "ازار، قمیص اور عمامہ جسے بھی

---

[1] مؤلف رحمہ اللہ کے مطابق ہم نے اسے سنن نسائی میں نہیں پایا۔ غالباً یہ "الکبریٰ" میں ہے۔ یہ حدیث سنن ابوداؤد (۴۰۷۴) فی اللباس: باب فی السواد اور مسند احمد ج ۶، ص ۱۳۲ و ۱۴۴ و ۲۱۹ و ۲۴۹ میں قتادۃ عن مطرف عن عائشۃ رضی اللہ عنہا کی روایت سے وارد ہے۔ سند صحیح ہے۔

[2] ابوداؤد (۴۰۳۰) فی اللباس: باب لباس الغلیظ، سند حسن ہے، حاکم ج ۴، ص ۱۸۲، نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

[3] نسائی ج ۸، ص ۲۰۴، فی الزینۃ: باب الخضر من الثیاب یہ روایت حسب ذیل کتابوں میں بھی وارد ہے۔
ابوداؤد (۴۲۰۶) فی الترجل: باب فی الخضاب، ترمذی (۲۸۱۳) فی الأدب: باب ماجاء فی الثوب الأخضر اور مسند احمد ج ۲، ص ۲۲۷ و ۲۲۸ و ج ۴، ص ۱۶۳ اس کی سند صحیح ہے۔

[4] ابوداؤد (۴۰۲۹) فی اللباس: باب لبس الشھرۃ، ابن ماجہ (۳۶۰۶) فی اللباس: باب من لبس شھرۃ من الثیاب، مسند احمد ج ۲، ص ۹۲، سند حسن ہے، ابن ماجہ (۳۶۰۸)، اور "حلیہ" لأبی نعیم ج ۴، ص ۱۹۰، ۱۹۱ میں ابوذر سے مرفوعاً اسی کی شاہد بھی ایک روایت وارد ہے "شہرت کا لباس جو استعمال کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے اعراض کرے گا جب تک کہ وہ اسے اتار نہ دے"۔ "شہرت کا لباس" سے مراد یہ ہے کہ لباس رنگ، وضع اور قطع میں اسی انداز کا ہو کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ جائیں اور استعمال کرنے میں عُجب و غرور کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ بیہقی نے ج ۳، ص ۲۷۳ میں بروایت کنانہ بن نعیم تابعی یہ حدیث درج کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہرت کے دو لباسوں سے منع فرمایا ہے، ایک اتنا عمدہ کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ جائیں اور ایک اتنا گھٹیا یا بوسیدہ کہ اسے استعمال کرنے والا لوگوں کو اپنی جانب ملتفت کرے۔ سند صحیح ہے مگر مرسل ہے۔

[5] بخاری ج ۱۰، ص ۲۲۳، فی اللباس: باب من جر ثوبہ من الخیلاء و باب قول اللہ تعالیٰ (قل من حرم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تکبر سے کوئی گھسیٹے گا قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نہ دیکھے گا[1]۔ سنن میں عبداللہ بن عمر ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ازار کے سلسلہ میں فرمائی وہی قمیص کے باب میں بھی فرماتی ہے[2]۔ اسی طرح معمولی لباس کہیں مذموم اور کہیں محمود ہوتا ہے۔ مذموم وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کا مقصود شہرت و تکبر کا اظہار ہو اور محمود وہاں ہوتا ہے جہاں مقصود تواضع و انکسار ہے۔

اسی طرح عمدہ لباس بھی کہیں مذموم اور کہیں محمود ہوتا ہے، مذموم وہاں ہوتا ہے جہاں مقصود اظہارِ تکبر اور محمود وہاں ہوتا ہے جہاں مقصود اظہارِ نعمت اور اظہارِ جمال ہو۔ صحیح مسلم کے اندر بروایت عبداللہ بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا۔ اسی طرح جہنم میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا" ایک شخص نے پوچھا "رسول اللہ! میری خواہش ہے کہ میرا کپڑا عمدہ ہو، جوتا عمدہ ہو، کیا یہ بھی تکبر ہے؟" فرمایا "نہیں! اللہ جمیل ہے جمال پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ بڑائی کی خاطر حق کا انکار کر دیا جائے اور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے[3]"۔

ماکولات و مشروبات میں سنتِ طیّبہ

اکل و شرب میں بھی آپ کی سنت وہی تھی جو لباس کے باب میں تم پڑھ چکے ہو۔ جو کھانا موجود ہوتا اسے رد نہ فرماتے۔ جو موجود نہ ہوتا اس کا اہتمام نہ فرماتے۔ جو پاکیزہ شے بھی خدمت میں پیش کی گئی اسے کھا لیا، طبیعت نے نہ چاہا تو بغیر حرام قرار دیئے چھوڑ دیا۔ کسی کھانے میں کبھی عیب نہ نکالا، رغبت رہی تو کھایا ورنہ چھوڑ دیا۔ جیسا کہ ایک بار دسترخوان پر گوہ آیا اسے آپ نے کبھی نہ کھایا تھا اس لیے چھوڑ دیا مگر حرام نہیں فرمایا۔ بلکہ آپ کے دسترخوان پر کھایا گیا اور آپ دیکھتے رہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) زینة الله التی اخرج لعباده) و باب من جرّ ازاره من غیر خیلاء و فی فضائل أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم: باب قول النبی صلی الله علیه وسلم "لوکنت متخذا خلیلاً" و فی الادب: باب من أثنی علی اخیه بما یعلم، مسلم (۲۰۸۵) فی اللباس: باب تحریم جرّ الثوب خیلاء، ترمذی (۱۷۳۰) فی اللباس: باب ماجاء فی کراهیة جرّ الإزار، ابوداؤد (۴۰۸۵) فی اللباس: باب ماجاء فی إسبال الإزار، نسائی ج ۸، ص ۲۰۶، فی الزینة: باب التغلیظ فی جرّ الإزار، ابن ماجہ (۳۶۰۷) فی اللباس: باب من لبس ثوب شهرة۔

[1] ابوداؤد (۴۰۹۴) فی اللباس: باب فی قدر موضع الإزار، نسائی ج ۸، ص ۲۰۸، فی الزینة: باب إسبال الإزار، ابن ماجہ (۳۵۷۶) فی اللباس: باب طول القمیص کم هو، حدیث عبداللہ بن عمر۔ سند حسن ہے۔

[2] ابوداؤد (۴۰۹۵) فی اللباس: باب قدر موضع الإزار، سند قوی ہے۔

[3] مسلم (۹۱) فی الإیمان: باب تحریم الکبر، الفاظ یہ ہیں "لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر" قال رجل "ان الرجل یحب أن یکون ثوبه حسنا و نعله حسنة قال إن الله جمیل یحب الجمال، الکبر بطر الحق و غمط الناس" مسلم ہی کی ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں "لا یدخل النار احد فی قلبه مثقال حبة خردل من إیمان و لا یدخل الجنة أحد فی قلبه مثقال حبة خردل من کبریاء"۔ ابوداؤد (۴۰۹۱)، ابن ماجہ (۴۱۷۳)، مسند احمد ج ۱، ص ۳۹۹ و ۴۱۲ و ۴۱۶ و ۴۵۶ "لا یدخل النار أحد فی قلبه مثقال حبة من خردل من إیمان" (جہنم میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا) کا مفہوم یہ ہے کہ داخلہ کفار کی مانند نہ ہوگا کہ وہ تو دائمی طور پر جہنم میں داخل ہوں گے۔ جب کہ صحیح بخاری سے ثابت ہے۔ بہت سارے گنہگار جہنم میں داخل ہوں گے، انہیں عذاب ہوگا پھر بذریعہ شفاعت باہر نکالا جائے گا۔ چنانچہ اسمیں کوئی بھی جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو دائمی طور پر نہ رہے گا۔

مٹھائی اور شہد بھی آپ نے کھایا ہے، اسے پسند فرماتے تھے۔ اونٹ، بکری، مرغ، تیتر، گورخر اور خرگوش کا گوشت بھی کھایا، مچھلی بھی کھائی۔ آگ پر بھنا ہوا گوشت بھی تناول فرمایا، تر اور خشک کھجوریں بھی کھائیں، خالص اور ملاوٹ کا دودھ، ستو شہد اور خشک کھجور کا شربت بھی نوش فرمایا۔ فیرنی بھی کھائی، تر کھجور سے ککڑی بھی استعمال فرمائی۔ پنیر اور روٹی سے کھجوریں، سرکہ سے روٹی، ثرید (روٹی اور گوشت کا پکوان) اور پگھلی ہوئی چربی سے روٹی بھی کھائی، بھنی ہوئی کلیجی، خشک گوشت کے ٹکڑے اور پکی ہوئی لوکی بھی استعمال کی۔ لوکی آپ کی مرغوب غذا تھی۔ ابالا ہوا گوشت، گھی سے بنا ہوا ثرید، زیتون سے روٹی، تر کھجوروں سے تربوز اور بالائی سے کھجوریں استعمال فرمائی ہیں بالائی کے ساتھ کھجوروں کا استعمال آپ کو بے حد پسند تھا۔ آپ نے کبھی کوئی طیب غذا مسترد نہیں فرمائی نہ اسے حاصل کرنے کا اہتمام فرمایا۔ سنت یہ تھی کہ جو میسر آجاتا کھا لیتے۔ میسر نہ ہوتا تو صبر کرتے حتیٰ کہ بھوک سے شکم پر پتھر بھی باندھے تین تین مہینے گزر جاتے گھر میں آگ نہ جلتی۔ آپ کا کھانا زمین پر ایک توشہ دان میں رکھ دیا جاتا یہی آپ کا دسترخوان تھا۔ کھانا تین انگلیوں سے تناول فرماتے۔ فارغ ہونے کے بعد انگلیوں کو چاٹ لیتے۔ کھانے کا یہ سب سے عمدہ اور اعلیٰ طریقہ ہے، متکبر ایک انگلی سے اور حریص پانچوں انگلیوں سے کھاتا ہے اور ہتھیلی سے ٹھونستا ہے۔

آپ ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ٹیک لگانے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلو پر ٹیک لگانا، آلتی پالتی مار کر بیٹھنا، ایک ہاتھ پر ٹیک لگا کر دوسرے سے کھانا۔ تینوں صورتیں مذموم ہیں۔

کھانے کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور آخر میں حسب ذیل دعا پڑھتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَّلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا۔[۱]

تعریف اللہ کی، بے حد پاک، یہ تعریف مبارک، ناقابلِ کفایت، مسلسل مطلوب، ہمہ دم ضروری رہے، ہمارے پروردگار!

کبھی یہ دعا بھی پڑھی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ مَنَّ عَلَيْنَا فَهَدَانَا وَاَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكُلَّ بَلَاءٍ حَسَنٍ اَبْلَانَا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَ مِنَ الطَّعَامِ وَسَقٰى مِنَ الشَّرَابِ وَكَسَا مِنَ الْعُرْيِ وَهَدٰى مِنَ الضَّلَالَةِ وَبَصَّرَ مِنَ الْعَمٰى وَفَضَّلَ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔[۲]

تعریف اس اللہ کی جو کھلاتا ہے، کھلایا نہیں جاتا، احسان اس کا کہ ہمیں ہدایت بخشی، ہمیں کھلایا پلایا، کیا کیا احسان نہیں کیے، تعریف اس اللہ کی جس نے کھلایا پلایا، پہنایا، راہ یاب فرمایا، بصارت بخشی، اپنی بہتیری مخلوقات پر ہمیں فوقیت دی، تعریف اللہ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

کبھی یہ دعا پڑھتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَ وَسَقٰى وَسَوَّغَهٗ۔[۳]

تعریف اللہ کی، جس نے کھلایا، پلایا اور کھانے کو حلق سے اتار دیا۔

---

[۱] بخاری ج ۹، ص ۵۰۱، ۵۰۲، فی الأطعمة : باب مایقول اذا فرغ من طعامه، ترمذی (۳۴۵۲) فی الدعوات : باب مایقول اذا فرغ من الطعام، ابوداؤد (۳۸۴۹) فی الأطعمة : باب مایقول الرجل اذا طعم، ابن ماجہ (۳۲۸۴) فی الأطعمة : باب مایقال اذا فرغ من الطعام، مستدرک حاکم ج ۴، ص ۱۳۶۔

[۲] ابن حبان (۱۳۵۲) حدیث ابوہریرہ، سند قوی ہے۔

[۳] ابوداؤد (۳۸۵۱) فی الأطعمة : باب مایقول الرجل اذا طعم، ابن حبان (۱۳۵۱) حدیث ابوایوب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کھانے سے فارغ ہو کر انگلیاں چاٹتے۔ اس زمانہ میں پونچھنے کے لیے رومال تھے نہ ہی کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا دستور تھا۔

پانی اکثر بیٹھ کر پیتے۔ کھڑے ہو کر پانی پینے پر جھڑکا بھی ہے[1] ایک بار کھڑے ہو کر پانی پینا بھی ثابت ہے[2]۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس عمل سے ممانعت منسوخ ہو گئی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں باتوں کا جواز مقصود ہے۔

اس بارے میں صحیح موقف واللہ اعلم یہ ہے کہ یہ واقعہ ایک ایسے چشمہ کا ہے جہاں آپ کھڑے ہو کر پانی پینے پر مجبور تھے۔ واقعہ کا سیاق اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ چاہ زمزم پر آپ تشریف لائے لوگ یہاں پانی پی رہے تھے۔ آپ نے بھی بالٹی اٹھائی اور کھڑے ہو کر پانی پیا۔

صحیح مسئلہ یہی ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ممنوع ہے۔ جائز صرف اسی وقت ہے جب کہ بیٹھ کر پینا ممکن نہ ہو۔ اس طرح اس باب کی تمام حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم[3]۔ آپ جب پی لیتے تو بائیں جانب خواہ کوئی بڑا شخص کیوں نہ ہوتا پینے کے لیے پیالہ داہنی جانب ہی بڑھاتے[4]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) انصاری اس میں تکملہ یہ الفاظ ہیں "وجعل له مخرجا" (اور اس کے لیے نکاسی کی راہ بنائی) سند صحیح ہے۔

۱۔ مسلم (۲۰۲۴) فی الأشربة : باب کراهية الشرب قائما، ترمذی (۱۸۸۰) فی الأشربة : باب فی النهی عن الشرب قائما، ابوداؤد (۳۷۱۷) فی الأشربة : باب فی الشرب قائما، ابن ماجہ (۳۴۲۴) فی الأشربة : باب الشرب قائما، مسند احمد ج ۳، ص ۱۹۹ و ۲۵۰ و ۲۹۱ حدیث انس رضی اللہ عنہ کی ہے۔

۲۔ بخاری ج ۱۰، ص ۷۱، فی الأشربة : باب الشرب قائما، ابوداؤد (۳۷۱۸) فی الأشربة : باب فی الشرب قائما، بروایت نزال عن علی۔ ترمذی (۴۸) فی الطهارة : باب ما جاء فی وضوء النبی صلی الله علیه وسلم، نسائی ج ۱، ص ۸۷، فی الطهارة : باب الانتفاع بفضل الوضوء بروایت ابو حیۃ۔ بخاری میں یہ ہے "علی رضی اللہ عنہ باب الرحبہ پر آئے تو کھڑے ہو کر پیتے ہوئے فرمایا : کچھ لوگ کھڑے ہو کر پینا مکروہ سمجھتے ہیں مگر جیسا میں نے کیا ہے ویسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۳۔ "الفتح" ج ۱۰، ص ۷۳، ۷۴، میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں : اس باب میں علماء نے حسب ذیل موقف اختیار کیے ہیں۔

۱۔ ترجیح، جواز کی حدیثیں ممانعت کی حدیثوں کے مقابل میں زیادہ ثابت ہیں۔

۲۔ ممانعت کی حدیثوں کی منسوخی کا دعویٰ۔

۳۔ تاویل کے ذریعہ دونوں قسم کی احادیث کے درمیان تطابق۔

پھر فرماتے ہیں : متاخرین علماء نے مطابقت کی یہ راہ اختیار کی کہ ممانعت کی حدیثوں کو مکروہ تنزیہی اور دوسری حدیثوں کو بیان جواز پر محمول کیا۔ متاخرین میں خطابی اور ابن بطال کا یہ مسلک ہے۔ یہ سب سے عمدہ سب سے محفوظ اور اعتراض سے بالاتر مسلک ہے اثرم نے اس کی جانب آخر میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اگر کراہیت ثابت ہو تو اسے حرمت پر نہیں ارشاد و تادیب پر محمول کیا جائے" طبری نے پورے جزم کے ساتھ یہی راہ اختیار کی ہے۔ اور بایں طور اس کی تائید فرمائی ہے کہ اگر یہ بات جائز تھی پھر حرام ہوئی یا حرام تھی پھر جائز قرار دی گئی تو صاف صاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے بیان فرما دیتے۔ احادیث اس باب میں متعارض ہیں تو ان کا تعارض ہمارے بیان کردہ طریقہ سے رفع ہو سکتا ہے۔

۴۔ بخاری ج ۱۰، ص ۶۶، فی الأشربة : باب شرب اللبن بالماء، حدیث انس بن مالک، اس حدیث کے مطابق انس کا بیان ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پیتے دیکھا اور آپ ان کے گھر آئے تو میں نے ایک بکری دوہی پھر کنویں سے پانی کھینچ کر اس میں ملایا۔ آپ نے پیالہ تناول فرمایا بائیں ابوبکر تھے اور دائیں ایک بدو آپ نے بچا ہوا پیالہ بدو کو بڑھایا۔ اور پھر فرمایا "دائیں پھر دائیں"۔

نکاح اور اہل وعیال کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت

انس کی یہ حدیث ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حُبِّبَ الیّ من دنیاکم، النساء والطیب و جُعِلَتْ قرّة عینی فی الصلوٰة" "یعنی تمہاری دنیا کی چیزوں میں عورتیں اور خوشبو مجھے محبوب ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک صلوٰة کے اندر رکھی گئی ہے[1]" یہ اصل حدیث کے الفاظ ہیں، باقی جس نے یہ روایت کی ہے کہ "تمہاری دنیا کی تین چیزیں میری محبوب ہیں" اسے وہم ہوگیا ہے۔ آپ نے تین چیزیں نہیں فرمائی ہیں، صلوٰة دنیاوی امور میں داخل نہیں ہے۔ عورتیں اور خوشبو آپ کی مرغوب اشیاء تھیں۔ آپ ایک ہی شب میں تمام بیویوں کے پاس جاتے تھے۔ جماع وغیرہ کے باب میں آپ کو تیس مردوں کی طاقت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں آپ کے لیے جو کچھ مباح فرمایا وہ امت میں کسی اور فرد کے لیے مباح نہ فرمایا۔

شب باشی، رہن سہن اور نان ونفقہ میں برابر کا سلوک کرتے۔ محبت کی کمی بیشی میں فرمایا " الٰہی! یہ میری تقسیم ان باتوں میں ہے جن کا مجھے اختیار حاصل ہے باقی جو بات بس سے باہر ہے اس میں تو مجھے ملامت نہ کیجیو[2]" کہا جاتا ہے کہ جو بات بس سے باہر تھی وہ محبت اور جماع کی بات ہے۔ یہی بات ایسی ہے جس کے اندر مساوات واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے اندر انسان خود مختار نہیں ہوتا۔ باری سے جانا آپ کے لیے ضروری تھا یا معاشرت اس کے بغیر بھی تھی؟ فقہاء کا دو قول ہے۔

امت میں سب سے زیادہ بیویاں آپ کے پاس تھیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں " زیادہ سے زیادہ شادیاں کرو، اس امت میں سب سے بہتر وہ ہوگا جس کے پاس سب سے زیادہ بیویاں ہوں[3]"

آپ نے طلاق بھی دی، رجوع بھی فرمایا۔ ایک مہینہ کا عارضی ایلاء بھی کیا۔ ظہار کبھی نہیں کیا۔ ظہار کا واقعہ آپ کی جانب منسوب کرنے والا سخت غلط فہمی میں ہے۔ یہ تذکرہ ہم نے بطور تنبیہ کردیا ہے۔

تمام ازواج کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ تھا، ہمیشہ خوش خلقی سے پیش آتے۔

عائشہ کے یہاں انصاری بچیوں کو اکثر بلایا کرتے۔ جو ان کے ساتھ کھیلا کرتیں۔ عائشہ کسی ایسی چیز کے لیے ضد کرتیں جو ناممناسب نہ ہوتی تو آپ اس کی اجازت دیدیتے۔ وہ کسی برتن میں پانی پیتیں تو اسے لے کر اپنا لب مبارک اسی جگہ رکھ کر پیتے جہاں عائشہ کا لب ہوتا۔ اسی طرح کوئی ہڈی چوستیں تو اسے لے کر وہیں سے چوستے جہاں سے وہ چوستی ہوتیں۔ ان کی گود کو تکیہ بناتے، گود میں سر رکھ کر تلاوت قرآن فرماتے۔ گاہ حالتِ حیض میں بھی ایسا ہوا۔ حالتِ حیض میں انھیں ازار باندھنے کا حکم دیتے اور پھر

---

[1] نسائی ج ۷، ص ۶۱، فی عشرة النساء : باب حُبّ النساء، مسند احمد ج ۳، ص ۱۲۸ و ۱۹۹ و ۲۸۵۔ سند حسن ہے۔ حاکم ج ۲، ص ۱۶۰ نے ایک اور روایت سے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

[2] ترمذی (۱۱۴۰) فی النکاح : باب ماجاء فی التسویة بین الضرائر، ابوداؤد (۲۱۳۴) فی النکاح : باب القسمة بین النساء، ابن حبان (۱۳۰۵) مستدرک حاکم ج ۲، ص ۱۸۷، نسائی ج ۷، ص ۶۴، فی عشرة النساء : باب میل الرجل الی بعض نسائه دون بعض، ابن ماجه (۱۹۷۱) فی النکاح : باب القسمة بین النساء، دارمی ج ۲، ص ۱۴۴، فی النکاح : باب القسمة بین النساء، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے ان کی تائید کی ہے اور حقیقت ہے بھی یہی۔

[3] بخاری ج ۹، ص ۹۹، بروایت سعید بن جبیر، انھوں نے کہا کہ مجھ سے ابن عباس نے پوچھا کہ کیا تم نے شادی کرلی ہے۔ میں نے کہا نہیں تو فرمایا شادی کرلو کیونکہ اس امت کا بہتر شخص وہ ہے جس کے پاس زیادہ بیویاں ہوں۔

مباشرت فرماتے، صوم سے ہونے کے باوجود بوسہ لیتے، لطف و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ انھیں کھیل اور تفریح کا موقع عنایت فرماتے۔ حبشہ سے آئے ہوئے کھلاڑی جب آپ کی مسجد میں اپنا کرتب دکھا رہے تھے تو آپ کے مونڈھوں کے درمیان سر رکھ کر حضرت عائشہ تماشہ دیکھتی رہیں سفر میں دو مرتبہ پیدل آپ دونوں کی دوڑ ہوئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے ایک بار دونوں میں کشمکش بھی ہوئی۔

قاعدہ تھا کہ سفر میں جاتے تو بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، قرعہ جس کے نام نکل آتا اسے ہم سفر بناتے۔ دوسری بیویوں کے حق میں کوئی بات نہ کرتے۔ جمہور کا مسلک یہی ہے۔

فرمایا کرتے "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے حق میں بہتر ہو میں اپنے اہل کے لیے تم سب سے زیادہ بہتر ہوں"[1]

گاہ آپ نے دوسری ازواج کی موجودگی میں کبھی ایک بیوی کی جانب ہاتھ بھی بڑھایا[2]۔ عموماً صلوٰۃ عصر کے بعد ایک ایک کر کے اپنی تمام بیویوں کے یہاں جاتے، احوال دریافت فرماتے۔ جب رات ہو جاتی تو اس بیوی کے گھر تشریف لے جاتے جس کی باری ہوتی۔ اور وہیں رات بسر فرماتے، عائشہ فرماتی ہیں "باری کے معاملہ میں آپ ہم میں کسی کو دوسرے پر فوقیت نہ دیتے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے ہم سب کا چکر نہ لگایا ہو۔

ہر ایک کے پاس جاتے لیکن جماع نہیں کرتے حتیٰ کہ اس بیوی کے یہاں پہنچتے جس کی باری ہوتی اور وہیں رات بسر کرتے۔[3]

نو بیویوں میں آٹھ کی باری ہوتی، صحیح مسلم میں عطاء کا قول ہے۔ باری کے اندر جس بیوی کو شریک نہیں فرمایا تھا وہ صفیہ بنت حُیَیّ تھیں۔ مگر یہ عطاء کی غلط فہمی ہے۔ یہ صفیہ نہیں سودہ تھیں۔ کیونکہ سودہ جب عمر دراز ہوئیں تو انھوں نے اپنی باری عائشہ کو دیدی[4]۔ عائشہ کو ان کی اور سودہ کی باری تقسیم کر کے عنایت فرماتے۔ مذکورہ غلط فہمی کی بنیاد "واللہ اعلم" یہ ہے کہ کسی بات پر ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفیہ سے ناراض ہو گئے تھے۔ چنانچہ صفیہ نے عائشہ سے کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے خوش کر دو، میں اپنی باری تمھیں دیدوں گی"۔ فرمایا۔ "اچھا" چنانچہ صفیہ کی باری آئی تو عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جا بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا "عائشہ! دور ہٹو، آج تمھاری نہیں ہے" عائشہ نے کہا "یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے" اور پورا قصہ سنایا۔ آپ صفیہ سے خوش ہو گئے[5] ہو سکتا ہے صفیہ نے اپنی کوئی باری حضرت عائشہ کو دیدی

۱۔ ترمذی (۳۸۹۲) فی المناقب : باب فضل أزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، دارمی ج ۲، ص ۱۵۹، فی النکاح : باب حسن معاشرۃ النساء، ابن حبان "موارد" (۱۳۱۲) فی النکاح : باب عشرۃ النساء، حدیث عائشہ، ترمذی کے مطابق حسن صحیح ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ابن ماجہ (۱۹۷۷) فی النکاح : باب حسن معاشرۃ النساء، حدیث ابن عباس۔ شواہد کی بنیاد پر اس کی سند حسن ہے۔

۲۔ مسلم (۱۴۶۲) میں انس بن مالک کا بیان : "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں جب باری سے آپ ان کے یہاں آتے تو پہلی بیوی کے پاس نو دن کے بعد ہی آتے۔ چنانچہ وہ سب ہر رات اس گھر میں اکٹھا ہوتیں جہاں آپ کی باری ہوتی۔ ایک دفعہ عائشہ کی باری تھی۔ چنانچہ یہاں زینب آئیں تو ان کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ بولیں "یہ زینب ہیں" آپ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

۳۔ ابوداؤد (۲۱۳۵) فی النکاح : باب فی القسم بین النساء، سند حسن ہے۔ پوری حدیث یوں ہے "سودہ بنت زمعہ جب عمر دراز ہو گئیں اور انھیں اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جُدائی اختیار کر لیں گے تو فرمایا "رسول اللہ! میری باری عائشہ کی ہوگی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمالیا۔ سودہ کی اپنی باری سے دست برداری کا واقعہ بخاری ج ۹، ص ۲۷۴، اور مسلم (۱۴۶۳) میں بھی آیا ہے۔ نو بیویاں حسب ذیل تھیں۔ عائشہ، حفصہ، سودہ، زینب، ام سلمہ، ام حبیبہ، میمونہ، جویریہ، صفیہ، سودہ عمر دراز ہو گئیں تو اپنی باری انھوں نے عائشہ کو دیدی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باریاں آٹھ میں تقسیم فرماتے۔

۴۔ عطاء کا قول مسلم (۱۴۶۵) میں ہے۔

۵۔ ابن ماجہ (۱۹۷۳) فی النکاح : باب المرأۃ تھب یومھا لزوجھا، سند میں سمیہ بصریہ عائشہ سے روایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہو، مگر یہ کوئی متعین باری رہی ہوگی۔ ورنہ باریاں آٹھ کے بجائے سات کے درمیان تقسیم ہوتیں۔ اور یہ صحیح حدیث کے بالکل خلاف ہوتا جس کے مطابق باریاں لاریب آٹھ تھیں۔ واللہ اعلم۔

اس طرح کا واقعہ اگر کسی ایسے شخص کو پیش آجائے جس کے دو سے زیادہ بیویاں ہوں، ایک اپنی باری دوسری کو ہبہ کردے تو کیا شوہر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہبہ میں آئی ہوئی باری موہوبہ کی اصل باری کے ساتھ ملاکر مسلسل کردے یا یہ ضروری ہے کہ بعینہ وہی شب رکھے جو اصل میں واہبہ کی رہی ہے، امام احمد وغیرہ کے مذہب کے مطابق دونوں قول ہیں۔

آپ اپنی بیویوں کے پاس آخر شب میں بھی آتے اور آغازِ شب میں بھی۔ ابتدائے شب میں ہم بستر ہوتے تو گاہ غسل فرماکر آرام فرماتے، گاہ وضو کرکے، ابو اسحٰق سبیعی نے اسود سے انھوں نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ کبھی آپ پانی ہاتھ لگائے بغیر سو رہتے[1]۔ مگر ائمۂ حدیث کے نزدیک یہ غلط ہے۔ اپنی کتاب "تہذیب سنن ابی داؤد" میں اس پر ہم نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس کے علل و مشکلات کی پوری طرح وضاحت بھی کردی ہے۔

کبھی ایک ہی شب میں اپنی تمام بیویوں کے پاس جاتے اور صرف ایک ہی غسل فرماتے، گاہ ہر ایک کے بعد غسل کرتے۔ دونوں طریقے استعمال فرمائے ہیں۔

جب سفر پر جاتے اور واپس آتے تو اہل و عیال کے پاس کبھی شب میں واپس نہ آتے۔ اس سے منع فرماتے تھے[2]۔

خواب اور بیداری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور سیرت

کبھی بستر پر، کبھی چرمی بساط پر، کبھی چٹائی پر، کبھی زمین پر، کبھی ننگی چارپائی پر اور کبھی سیاہ کمبل پر سو رہتے۔ عباد بن تمیم اپنے چچا کا بیان روایت کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے دیکھا ہے کہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کررہی ہیں۔ یہ غیر معروف ہیں، سند کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔

[1] ابوداؤد (۲۲۸) فی الطهارة : باب فی الجنب یؤخر الغسل، ترمذی (۱۱۸) فی الطهارة : باب فی الجنب ینام قبل ان یغتسل، ابن ماجہ (۵۸۳) فی الطهارة : باب فی الجنب ینام کھیئته لا یمس ماء۔ حدیث سفیان وغیرہ عن ابی اسحاق عن الاسود عن عائشة سند قوی ہے، دارقطنی اور بیہقی سے اس کی صحت کی تصدیق نقل کرنے کے بعد حافظ نے لکھا ہے۔ "اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جس کی روایت ہشیم نے عن عبدالملك عن عطاء عن عائشة، ابواسحاق عن الاسود ہی کی روایت کے مانند کی ہے۔ نیز وہ بھی جسے ابن خزیمہ (۲۱۱) اور ابن حبان (۲۳۲) نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے، اس حدیث میں ابن عمر کا یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا کہ آیا جنبی ہونے کی حالت میں کوئی سو سکتا ہے، تو آپ نے فرمایا "ہاں" چاہے تو وضو بھی کرلے" سند صحیح ہے۔ صحیح مسلم (۳۰۶) (۲۴) میں الفاظ اس طرح پر ہیں "ہاں وضو کرے پھر سوئے پھر جب چاہے غسل کرے" امام احمد نے ج ۶، ص ۱۰۱ و ۲۵۴ اور ابن ابی شیبہ نے ۲/۱۷۳/۲ میں مطرف کی روایت عن عامر الشعبی عن عائشة درج کی ہے۔ جس میں عائشہ فرماتی ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنبی رات بسر فرماتے، حتیٰ کہ بلال آکر آپ کو صلوٰۃ کی اطلاع دیتے، آپ اٹھ کر غسل فرماتے آپ کے سر سے پانی گرتے نظر آتا، پھر آپ نکل جاتے، فجر کی صلوٰۃ میں آپ کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے بعد آپ صوم رکھتے۔ مطرف کہتے ہیں کہ میں نے عامر سے کہا "رمضان میں؟" فرمایا "ہاں رمضان وغیرہ سب میں" سند صحیح ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے صاف واضح ہے کہ مصنف کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ حدیث ائمۂ حدیث کے نزدیک غلط ہے۔

[2] بخاری ج ۹، ص ۲۹۶، ۲۹۷، مسلم ج ۳، ص ۱۵۲۷ (۱۸۲) حدیث جابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جب کوئی عرصہ تک باہر رہے تو اپنے اہل کے یہاں شب میں نہ پہنچے، بخاری ج ۳، ص ۴۹۳، اور مسلم (۱۹۲۸) میں انس کی روایت ہے "آپ اپنے اہل میں رات کو سفر سے واپس نہ آتے بلکہ صبح یا شام میں آتے۔"

آپ کا ایک پیر دوسرے پیر پر تھا[1]

آپ کا بستر چرمی ہوتا جس میں کھجور کی پتیاں بھری ہوتیں۔ بال سے بنا ہوا ایک کمبل تھا جسے دوہرا کرکے سوتے تھے۔ ایک دن اسے چارپرت بنا کر بچھایا گیا تو آپ نے اس سے منع فرمایا اور کہا "اسے اپنی پہلی حالت پر واپس لاؤ، کیونکہ آج رات یہی میری صلوٰۃ میں رکاوٹ بن گیا"۔ مقصد یہ ہے کہ آپ بستر پر بھی سوئے، لحاف بھی اوڑھا۔ اپنی بیویوں سے ایک دفعہ فرمایا "سوائے عائشہ کے تم میں سے کسی کے لحاف میں میرے پاس جبرئیل نہیں آئے"[2][3]

تکیہ بھی چرمی تھا جس میں کھجور کی پتیاں بھری تھیں۔

سونے کے لیے بستر پر پہنچتے تو یہ دعا پڑھتے۔

بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ اَحْيَا وَاَمُوْتُ[4] بارالہا! ترے نام سے زندہ ہوتا اور مرتا ہوں۔

دونوں ہتھیلیاں یکجا کرکے ان میں پھونکتے اور (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ)، (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) اور (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) پڑھتے۔ پھر جسم مبارک پر جہاں تک ہاتھ پہنچتا ملتے، ابتدا سر سے فرماتے، پھر چہرہ، پھر جسم کا اگلا حصہ اس طرح تین بار یہ عمل دہراتے[5]

دائیں پہلو سوتے، دایاں ہاتھ داہنے رخسار کے نیچے رکھتے اور یہ دعا پڑھتے "اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ"[6] (اے اللہ! مجھے اس دن اپنے عذاب سے بچا جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔)

جب بستر پر تشریف لے جاتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِيَ۔

تعریف اس اللہ کی جس نے ہمیں کھلایا، پلایا، ہمارے حق میں کافی ہوا۔ ہمیں ٹھکانا دیا، کتنے ہیں جن کا نہ کوئی کافی ہے نہ ملجا وماوی۔

یہ مسلم کی روایت ہے[7]

---

[1] ۔ بخاری ج ۱۰، ص ۳۳۴ و ج ۱۱، ص ۶۸، مسلم (۲۱۰۰)۔

[2] ۔ ترمذی فی الشمائل رقم (۳۲۲) حدیث جعفر بن محمد عن ابیہ عن عائشۃ، یہ منقطع ہے۔

[3] ۔ بخاری ج ۷، ص ۸۴، فی فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم: باب فضل عائشۃ، وفی الھبۃ: باب قبول الھدیۃ وباب من أھدیٰ إلی صاحبہ وتحری بعض نسائہ دون بعض، ترمذی (۳۸۷۴) فی المناقب: باب من فضل عائشۃ، نسائی ج ۷، ص ۶۸ و ۶۹ فی عشرۃ النساء: باب حب الرجل بعض نسائہ اکثر من بعض۔

[4] ۔ بخاری ج ۱۱، ص ۹۶، فی الدعوات: باب مایقول اذا نام، وباب وضع الید الیمنی تحت الخد الأیمن، وباب مایقول اذا اصبح وفی التوحید: باب السؤال باسماء اللہ تعالیٰ، ترمذی (۳۴۱۳) فی الدعوات: باب مایدعو بہ عند النوم، ابوداؤد (۵۰۴۹) فی الادب: باب مایقول عند النوم، حدیث حذیفہ۔ مسلم (۲۷۱۱) فی الذکر والدعاء: باب مایقول عند النوم واخذ المضجع، حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ۔

[5] ۔ بخاری ج ۱۱، ص ۱۰۷، ابوداؤد (۵۰۵۶)، ترمذی (۳۳۹۹) حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[6] ۔ ابوداؤد (۵۰۴۵) فی الادب: باب مایقول عند النوم، ترمذی (۳۳۹۵) فی الدعوات: باب من الأدعیۃ عند النوم۔ حدیث حذیفہ۔ ابن حبان (۲۳۵۰) حدیث براء، الفتح للحافظ ابن حجر ج ۱۱، ص ۹۸، مسند احمد ج ۱، ص ۴۰۰ و ۴۱۴ و ۴۴۳، حدیث ابن مسعود ج ۶، ص ۲۸۷، ۲۸۸ حدیث حفصہ، حافظ نے بھی اسے صحیح لکھا ہے۔

[7] ۔ مسلم (۲۷۱۵) فی الذکر والدعاء: باب مایقول عند النوم، ترمذی (۳۳۹۳) فی الدعوات: باب ماجاء فی الدعاء إذا أوی إلی فرشہ، ابوداؤد (۵۰۵۳) فی الادب: باب مایقول عند النوم، مسند احمد ج ۳، ص ۱۵۳ و ۱۶۷ و ۲۸۸ ان تمام کتابوں میں روایتِ حدیث انس سے ہے۔

صحیح مسلم ہی نے ذکر کیا ہے کہ بستر پر آرام کے لیے تشریف لے جاتے تو حسبِ ذیل دعا پڑھتے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوَى، مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْفُرْقَانِ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِي شَرٍّ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ، اِقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ [1]

بارالہا! ارض و سما کے پروردگار، عرش عظیم کے پروردگار، ہمارے پروردگار، ہر شئی کے پروردگار، دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے، تورات وانجیل اور فرقان اتارنے والے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر بد کی بدی سے، تیرے ہاتھ میں اس کی چوٹی ہے تو اوّل ہے کہ تجھ سے پہلے کوئی نہیں۔ تو آخر ہے کہ تیرے بعد کچھ نہیں، تو ظاہر ہے کہ تیرے اوپر کوئی شئی نہیں، تو باطن ہے کہ تیرے نیچے کوئی چیز نہیں، ہمارے قرض ادا فرما، اور ہمیں فقر و احتیاج سے بے نیاز کردے۔

رات میں نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِي وَأَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ، اَللّٰهُمَّ زِدْنِي عِلْمًا وَلَا تُزِغْ قَلْبِي بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنِي وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ [2]

تو ہی معبود ہے، تیری ذات پاک ہے، بارالہا! میں اپنے گناہ کی تجھ سے بخشش چاہتا ہوں، تجھ سے تیری رحمت کا طلب گار ہوں، بارالہا! میرے علم میں اضافہ فرما، میرے دل میں ہدایت کے بعد کجی پیدا نہ کر، اپنے یہاں سے مجھے رحمت عطا کر، تو بڑا دینے والا ہے۔

نیند سے بیدار ہوتے تو حسبِ ذیل دعا پڑھتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ [3]

اس اللہ کا شکر جس نے مارنے کے بعد ہمیں زندہ کیا اور اسی کی طرف جانا ہوگا۔

سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کرتے۔ بسا اوقات آل عمران کے آخر سے دس آیات از (اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ)

---

[1] مسلم (۲۷۱۳) فی الذکر والدعاء: باب مایقول عند النوم واخذ المضجع، ترمذی (۳۳۹۷) فی الدعوات: باب من الادعیة عند النوم، ابوداؤد (۵۰۵۱) فی الادب: باب مایقول عند النوم، مسند احمد ج ۲، ص ۳۸۱ و ۴۰۴ و ۵۳۶، تمام کے یہاں روایت ابوہریرہ سے ہے۔

[2] ابوداؤد (۵۰۶۱) فی الادب: باب مایقول الرجل اذا تعارّ من اللیل، مسند میں عبداللہ بن ولید بن قیس التجیبی مصری لین الحدیث ہے۔ یہ "التقریب" میں حافظ کا تبصرہ ہے، مگر بایں ہمہ ابن حبان (۲۳۵۹) اور حاکم ج ۱، ص ۵۴۰ نے اسے صحیح لکھا ہے، ذہبی نے حاکم کی تائید کی ہے۔

[3] بخاری ج ۱۱، ص ۱۱۱، فی الدعوات: باب مایقول اذا اصبح و باب مایقول اذا نام و باب وضع الید الیمنیٰ تحت الخد الایمن، وفی التوحید: باب السؤال باسماء اللہ تعالیٰ۔ حدیث حذیفہ، مسلم (۲۷۱۱) فی الذکر والدعا: باب مایقول عند النوم واخذ المضجع، حدیث براء بن عازب، ترمذی (۳۴۱۳) فی الدعوات: باب ما یدعو بہ النوم، ابوداؤد (۵۰۴۹) فی الادب: باب مایقول عند النوم، ابن ماجہ (۳۸۸۰) فی الدعاء: باب ما یدعو بہ اذا انتبہ من اللیل، تینوں بزرگوں کے یہاں روایت حذیفہ سے ہے۔

تا آخر یعنی (۱۹۰ — ۲۰۰)[۱] کی تلاوت فرماتے۔ پھر یہ دعا پڑھتے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُکَ الْحَقُّ وَلِقَاءُکَ حَقٌّ وَالْجَنَّۃُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَۃُ حَقٌّ اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ حَاکَمْتُ فَاغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ اَنْتَ اِلٰھِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ[۲]

بارالٰہا! تیری تعریف کہ تو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی جملہ کائنات کا نور ہے۔ تیری تعریف کہ تو آسمانوں زمین اور ان کے مابین جملہ کائنات کا منتظم ہے تیری تعریف کہ تو حق، ترا وعدہ حق، تیری ملاقات حق، جنت حق، دوزخ حق، انبیاء حق، محمد حق، قیامت حق۔ بارالٰہا! تیرے آگے سرافگندہ ہوں، تجھ ہی پر میرا ایمان ہے، تجھ ہی پر میرا بھروسہ ہے، تیری ہی جانب میری رجوع ہے۔ تیرے سبب میری کشمکش، تیرے یہاں میرا قضیہ پس بخش دے میرے گناہوں کو جو ڈھکے ہوں اور جو کھلے ہوں، تو میرا الٰہ ہے تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

عام معمول یہ تھا کہ اول شب میں سو جاتے اور آخر میں بیدار ہوتے۔ کبھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں سے ابتدائے شب میں بھی بیدار رہتے۔ آنکھیں سوتیں مگر دل نہ سوتا۔ جب سوتے تو خود ہی بیدار ہوتے۔ کسی کے جگانے کی ضرورت پیش نہ آتی، رات میں کہیں آرام کے لیے منزل فرماتے تو داہنی کروٹ لیٹ جاتے، پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ ہاتھ اونچا کر کے سر کو ہتھیلی پر رکھ لیتے[۳] ترمذی کا یہی بیان ہے۔ صحیح ابو حاتم میں ہے کہ شب میں کہیں فروکش ہوتے تو داہنے ہاتھ کا تکیہ بناتے۔ صبح سے ذرا پیشتر کہیں اترتے تو بازو کھڑا کر لیتے۔ میرے خیال میں راوی کو وہم ہو گیا ہے صحیح ترمذی کی حدیث ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ پچھلے پہر آرام کے لیے اترنے کو تعریس کہتے ہیں۔ آپ کی نیند معتدل تھی۔ یہی کیفیت زیادہ مفید ہوتی ہے۔ اطباء کہتے ہیں ”شب و روز کا ایک ثلث یعنی چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے سونا سب سے معتدل ہے۔

---

[۱] بخاری ج ۱، ص ۲۵۰، فی الوضوء باب قراءۃ القرآن بعد الحدث، مسلم (۷۶۳) فی صلاۃ المسافرین، باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل وقیامہ، عبداللہ بن عباس سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی میمونہ (آپ کی خالہ تھیں) کے یہاں بسر کی۔ چنانچہ میں تو تکیہ کے عرض میں سویا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیوی طول میں۔ حتی کہ نصف شب ہوئی یا اس سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے، بیٹھے اور آنکھوں سے نیند بھگائی، پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیتیں تلاوت فرمائیں پھر اٹھ کر ایک لٹکی ہوئی مشک کے پاس آئے۔ یہاں سے پانی لے کر اچھی طرح وضو کیا پھر صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوئے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ”میں نے بھی ایسا ہی کیا ..... الخ۔

[۲] بخاری ج ۱، ص ۱۰۱، فی الدعوات: باب الدعاء إذا انتبہ باللیل وفی التھجد: باب التھجد باللیل وفی التوحید: باب قول اللہ تعالیٰ (وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ) وباب قول اللہ تعالیٰ (وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ) وباب قول اللہ تعالیٰ (یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰہِ) مسلم (۷۶۹) فی صلاۃ المسافرین: باب الدعاء فی صلوۃ اللیل، مؤطا ج ۱، ص ۲۱۵، فی القرآن: باب ماجاء فی الدعاء، ترمذی (۳۴۱۴) فی الدعوات: باب ماجاء مایقول اذا قام من اللیل الی الصلوۃ، نسائی ج ۳، ص ۲۱۰، فی صلوۃ اللیل: باب ذکر مایستفتح بہ القیام، ابن ماجہ (۱۳۵۵) فی الإقامۃ: باب ماجاء فی الدعاء اذا قام الرجل من اللیل، مسند احمد ج ۱، ص ۲۹۸ و ۳۰۸ و ۳۵۸۔

[۳] ترمذی فی الشمائل (۲۵۷) سند قوی ہے۔

سواریوں کے باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھوں کی سواری فرمائی۔ گھوڑوں پر کبھی زین رکھ کر کبھی ننگی پیٹھ سوار ہوئے بعض اوقات سرپٹ بھی دوڑایا۔ بالعموم تنہا بیٹھتے۔ اونٹ پر پیچھے یا آگے پیچھے دونوں طرف اوروں کو بھی بیٹھایا ہے۔ اس طرح ایک اونٹ پر بیک وقت تین سوار ہوئے۔
پیچھے مردوں کو بھی بیٹھایا ہے اور اپنی بعض بیویوں کو بھی۔ زیادہ تر آپ کی سواریاں گھوڑے اور اونٹ ہوا کرتے تھے۔
خچروں کے باب میں مشہور یہ ہے کہ آپ کے پاس صرف ایک ہی تھا جسے کسی بادشاہ نے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ سرزمین عرب میں اس وقت خچر عام نہ تھے۔ چنانچہ ہدیہ کے طور پر جب خچر خدمتِ اقدس میں پہنچا تو صحابہ نے عرض کیا "کیوں نہ گھوڑوں اور گدھوں کا ملاپ کرائیں؟" آپ نے فرمایا "ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو جانتے نہیں ہیں[۱]۔"

بکریوں، کنیزوں اور غلاموں کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں بھی پالیں۔ سو بکریاں آپ کے پاس تھیں۔ سو سے زیادہ کی خواہش نہیں تھی چنانچہ جہاں کسی بچہ کی پیدائش کی خبر ملی، آپ نے اس کی جگہ ایک بکری ذبح کروادی۔ کنیزیں اور غلام بھی تھے۔ موجود اور آزاد کردہ غلاموں کی تعداد کنیزوں سے زیادہ تھی۔ جامع ترمذی میں بروایت ابو امامہ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
جو شخص کسی مرد مسلمان کو آزاد کردے گا اس کے لیے وہ آگ سے چھٹکارے کا باعث بن جائے گا۔ اس کا ایک ایک عضو اس کے ایک ایک عضو کا بدلہ بنے گا۔ جو شخص دو مسلمان عورتوں کو آزاد کرے گا اس کے لیے وہ دونوں آگ سے نجات کا باعث بنیں گی۔ ان دونوں کے ہر دو دو عضو اس کے ایک ایک عضو کا بدلہ ہوں گے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے[۲]۔
حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کو آزاد کرنا افضل ہے، نیز ایک غلام کی آزادی دو کنیزوں کی آزادی کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے زیادہ تر غلاموں کو آزاد فرمایا ہے یہ مقام ان پانچ مقامات میں سے ایک ہے جہاں عورت مرد کے مقابلہ میں نصف ہوتی ہے۔ دوسرا مقام عقیقہ کا ہے، عقیقہ میں جمہور کے نزدیک بچی کی جانب سے ایک اور بچہ کی جانب سے دو بکریاں ذبح کی جائیں گی، اس باب میں کچھ صحیح اور حسن حدیثیں بھی موجود ہیں، تیسرا مقام شہادت کا ہے۔

۱۔ ابوداؤد (۲۵۶۵) فی الجهاد : باب کراهیة الحُمر تنزی علی الخیل، نسائی ج ۶، ص ۲۲۴، فی الخیل : باب التشدید فی حمل الحمیر علی الخیل، مسند احمد ج ۱، ص ۷۸ و ۹۵ و ۹۸ و ۱۰۰ و ۱۳۲ و ۱۵۸۔ ابن حبان (۱۶۳۹) حدیث علی رضی اللہ عنہ، سند صحیح ہے۔

۲۔ اپنے شواہد کے پیش نظر حدیث صحیح ہے۔ ترمذی (۱۵۴۷) فی النذور والأیمان : باب ماجاء فی فضل من أعتق، حدیث ابوامامہ، مسند احمد ج ۴، ص ۲۳۵، ابوداؤد (۳۹۶۷) فی العتق : باب ای الرقاب افضل، ابن ماجہ (۲۵۲۲) فی العتق : باب العتق، حدیث کعب بن مرہ یا مرہ بن کعب طبرانی۔ حدیث عبدالرحمٰن بن عوف۔

شہادت میں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں، چوتھا میراث اور پانچواں دیت کا مقام ہے۔

خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت کا کام بھی کیا ہے۔ رسالتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بیع کے مقابلہ میں خریداری زیادہ کی ہے۔ ہجرت کے بعد بھی یہی صورت رہی۔ چند معاملات میں آپ کا بیع کرنا ثابت ہے۔ اور وہ بھی زیادہ تر دوسروں کے لیے، مثلاً پیالہ اور چٹائی کا نیلام، ابو مذکور کے مدبّر غلام یعقوب کی بیع، دو غلاموں کے عوض ایک حبشی غلام کی بیع۔

خریداری بہت کی ہے، مزدوری بھی کی ہے اور مزدور رکھے بھی ہیں، مزدوری کم کی ہے مگر مزدور زیادہ رکھے۔ ثابت یہی ہے کہ نبوت سے پہلے ایک دفعہ آپ نے بکریاں چرانے کی مزدوری کی اور ایک بار مزدوری پر خدیجہ کا مال تجارت لے کر شام کے سفر پر روانہ ہوئے۔

معاملہ اگر مضاربت کی شرط پر ہو تو مضارب امین بھی ہوتا ہے، اجیر بھی، وکیل بھی اور شریک بھی۔ امین جب مال اپنے ہاتھ میں لے لے، وکیل جب اس میں تصرف کرے، اجیر جب بذاتِ خود کام انجام دے اور شریک جب تجارت کے اندر نفع ظاہر ہو۔

مستدرک حاکم میں ربیع بن بدر نے ابو زبیر سے، انھوں نے جابر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہ بنت خویلد سے مزدوری پر مقام جرش کے دو سفروں کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک اونٹ کے عوض میں تھا[۱] حاکم نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔

"النہایۃ" کے مطابق جُرش جیم کو ضمہ اور راء کو فتحہ، یمن کا ایک پرگنہ ہے۔ اور جَرش، جیم اور راء دونوں کو فتحہ، سرزمین شام کا ایک مقام ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر حدیث ثابت ہے جو جرش سے مراد شامی علاقہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس میں جس ربیع بن بدر کا ذکر ہے اصل میں وہ عُلیلہ[۲] ہے۔ ائمۂ حدیث نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ نسائی، دارقطنی اور ازدی کے نزدیک یہ متروک ہے، غالباً حاکم نے اسے طلحہ بن عبید اللہ کے غلام ربیع بن بدر کو خیال کر لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کا کاروبار بھی کیا ہے، آپ کی خدمت میں ایک بار جب آپ کا پرانا شریک آیا تو کہا "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" فرمایا "تم میرے شریک ہونا؟" کیا ہی اچھے شریک رہے۔ تم تو کبھی اپنے حق کا دفاع کرتے تھے نہ تکرار و حجت"[۳]

حدیث میں لفظ تداریٔ یا تداری ہے۔ تداریٔ ہمزہ سے مصدر مداراۃ ہوگا اس کے معنی حق کا دفاع و تحفظ کرنا ہے۔ ہمزہ نہ ہو تو

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۸۲، حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں مگر ابو زبیر اس میں مدلس ہیں۔

[۲] مطبوعہ نسخہ میں "علیل" ہے، یہ تحریف ہے۔ ربیع بن بدر کی بنیاد پر مؤلف کا حدیث کو معلول قرار دینا پایۂ کمال کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اسی سند سے ان کی جگہ حماد بن مسعدہ کا نام بھی آتا ہے جن کا ثقہ ہونا مسلّم ہے۔

[۳] ابوداؤد (۴۸۳۶) فی الادب : باب کراهية المراء، ابن ماجہ (۲۲۸۷) فی التجارات : باب الشركة والمضاربة، مسند احمد ج ۳، ص ۴۲۵، اس میں یہ ہے کہ سائب نے کہا "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے میری تعریف اور مجھے یاد کرنا شروع کیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں" میں نے کہا "سچ فرمایا۔ ماں باپ آپ پر قربان، آپ میرے شریک رہ چکے ہیں، کیا ہی عمدہ شریک رہے نہ اپنا دفاع کیا نہ جھگڑا" اس کی سند میں ابراہیم بن مہاجر بجلی لین الحفظ ہے اور سائب سے جس نے روایت کی ہے وہ مجہول ہے۔

پھر یہ مداراۃ سے بنے گا۔ اس کے معنی بطریق احسن دفاع کرنے کے ہیں۔

آپ نے دوسروں کو وکیل بنایا بھی ہے اور بنے بھی ہیں۔ مگر بننے کے مقابلہ میں بنایا زیادہ ہے۔

ہدیہ دیا بھی ہے اور قبول بھی کیا ہے۔ ہدیہ کا بدلہ بھی دیا ہے۔ ہبہ کیا بھی ہے اور کرایا بھی ہے۔ چنانچہ سلمہ بن اکوع سے جن کے حصہ میں ایک لونڈی آئی تھی فرمایا "اسے مجھے ہبہ کردو" انھوں نے فوراً منظور کرلیا۔ وہ کنیز آپ نے مکہ بھیج دیا اور معاوضہ میں چند قیدی مسلمانوں کو رہا کرالیا۔[1]

آپ نے قرضہ بھی لیا ہے، کبھی رہن رکھ کے، کبھی بغیر رہن کے۔ عاریت بھی لی ہے۔ فوری ادائیگی نیز تاخیر ادائیگی پر سامان کی خریداری بھی فرمائی ہے۔

ضمانتیں دو طرح کی لی ہیں۔ ایک خصوصی۔ پروردگار کی بنیاد پر۔ آپ نے کچھ کام پیش فرمائے کہ انھیں جو انجام دے گا اس کے لیے جنت کی ضمانت ہے۔ دوسری ضمانت عمومی انداز کی ان وفات پانے والے مسلمانوں کی لی ہے جنھوں نے ترکہ میں قرضوں کی بھرپائی کی حد تک دولت نہ چھوڑی ہو۔ چنانچہ جو قرضہ بھی اس تعلق سے واجب ہوا اسے ادا کیے بغیر نہ چھوڑا۔[2] کہا جاتا ہے کہ یہ حکم آپ کے بعد بھی تمام ائمہ کے لیے عام ہے۔ سلطانِ وقت مسلمانوں کے قرضہ جات کا ضامن ہے۔ بشرطیکہ انھوں نے قرضہ چکا دینے کی حد تک دولت نہ چھوڑی ہو۔ یہ قرضے سلطان بیت المال سے ادا کرے گا۔ اس مسلک والوں کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان لاوارث مرتا ہے تو سلطان ہی اس کا وارث ہوتا ہے، اسی طرح ادائیگی قرض کی حد تک دولت چھوڑے بغیر کوئی فوت کر جائے تو قرضہ کی ادائیگی بھی اسی کے ذمہ ہوگی۔ کوئی کفیل نہ ہو تو زندگی میں بھی سلطان اس کے اخراجات پورا کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زمین فی سبیل اللہ صدقہ کے طور پر وقف فرمائی۔

آپ نے سفارش بھی کی ہے۔ اور آپ کی خدمت میں سفارش کی بھی گئی ہے۔ مغیث کی جانب رجوع کر لینے کے بارے میں بریرہ سے آپ نے سفارش کی تھی جسے اس نے رد کر دیا تھا۔ مگر آپ غصہ ہوئے نہ عتاب فرمایا۔ آپ ہی اسوہ ہیں، آپ ہی مقتدا ہیں۔ اسّی سے زیادہ مقامات پر قسمیں کھائی ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تین مقامات پر آپ کو قسم کھانے کا حکم دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

---

[1] مسلم (۱۷۵۵) فی الجھاد: باب التنفیل وفداء المسلمین بالأسری میں سلمہ بن اکوع کی ایک حدیث آئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "ہم نے فزارہ پر لشکر کشی کی، ہمارے سپہ سالار ابوبکر تھے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنایا تھا۔ اس حدیث میں آگے فرماتے ہیں "میں نے ان کے اور پہاڑ کے درمیان ایک تیر پھینکا، تیر دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے۔ انھیں گرفتار کر کے لے آیا۔ انہی میں خاندان فزارہ کی ایک عورت بھی تھی۔ جس کے سر پر ایک چرمی پوشاک تھی۔ اس کے ساتھ عرب کی ایک نہایت حسین دوشیزہ تھی۔ میں انھیں لے کر ابوبکر کے پاس آیا۔ ابوبکر نے یہ دوشیزہ بطور غنیمت عطا کی۔ مدینہ واپس آئے۔ راستہ میں کہیں بھی میں نے اس کے جسم سے کوئی کپڑا ہٹا کر نہیں دیکھا۔ بازار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی فرمایا "سلمہ! اسے مجھے ہبہ کر دو" میں نے کہا رسول اللہ! واللہ یہ مجھے بے حد اچھی لگی، ابھی میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ دوسرے دن بازار میں آپ سے ملاقات ہوئی، فرمایا "سلمہ! اللہ کے بندے! عورت مجھے ہبہ کر دے" میں نے کہا "رسول اللہ! یہ آپ کی ہے، واللہ میں نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے کر مکہ والوں کے یہاں بھیجدیا۔ اس کے عوض آپ نے کچھ مسلمانوں کو رہا کروایا جو مکہ میں قید ہوگئے تھے۔ ابوداؤد (۲۶۹۷) ابن ماجہ (۲۸۴۶)، احمد ج ۴، ص ۴۶۔

[2] بخاری نے ج ۱۲، ص ۲۳، فی الفرائض، اور مسلم نے (۱۶۱۹) فی الفرائض: باب من ترک مالاً فلورثتہ میں ابوہریرہ سے روایت درج کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میں مسلمانوں کا ان کے تئیں زیادہ حق دار ہوں۔ جس کی وفات ہو جائے اور اس کے ذمہ قرضہ ہو تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور ترکہ میں جو کوئی دولت چھوڑے گا تو وہ اس کے ورثہ کی ہوگی۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ (یونس : ۵۳)
پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو کہو میرے رب کی قسم یہ بالکل سچ ہے۔
دوسری جگہ ارشاد ہے۔
وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ (سبا : ۳)
منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم پر نہیں آئے گی کہو قسم ہے میرے پروردگار کی، وہ تم پر آکر رہے گی۔
تیسری جگہ ارشاد ہے۔
زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّن يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (تغابن: ۷)
منکرین کا دعویٰ ہے کہ مرنے کے بعد ہرگز نہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے، ان سے کہو نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور تمھیں بتایا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔

اسماعیل بن اسحاق قاضی، ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری سے مذاکرہ فرماتے مگر انھیں فقیہ کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک دن ان کی عدالت میں ابن داؤد ظاہری اور ان کا ایک فریق کوئی مقدمہ لے کر آیا۔ ثبوت میں ابن داؤد کو قسم کھانا تھی۔ اس کے لیے وہ تیار ہو گئے۔ قاضی اسماعیل نے ان سے کہا " ابوبکر! آپ اور آپ جیسے لوگ قسم کھائیں گے؟" فرمایا " آخر کیوں نہ کھاؤں، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تین مقامات پر قسم کھانے کا حکم دیا ہے۔" قاضی نے وہ مقامات دریافت کیے تو ابن داؤد نے اس کی تفصیل پیش کی۔ اس سے وہ بے حد خوش ہوئے اور اسی دن سے انھیں فقیہ کہنے لگے۔

قسم میں کبھی استثنار فرماتے، کبھی توڑ کر کفارہ ادا فرماتے، کبھی پوری کرتے۔ استثنار سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور کفارہ قسم کو اتار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے "تحلّہ" سے موسوم کیا ہے۔

مزاح بھی فرماتے تھے۔ مزاح میں صحیح اور سچی بات فرماتے، توریہ بھی فرماتے مگر توریہ میں بھی سچی ہی بات فرماتے۔ مثلاً سفر کی جہت اور ہوتی مگر برعکس سوال فرماتے، پوچھتے راستہ کیسا ہے؟ اس کے چشمے کیسے ہیں؟ کیسے اسے طے کیا جائے گا؟ وغیرہ مشورہ دیتے اور لیتے بھی تھے۔

مریضوں کی عیادت فرماتے، جنازوں میں شرکت کرتے، دعوتیں قبول فرماتے، رانڈوں، مسکینوں اور کمزوروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ان کے ساتھ جاتے۔ کبھی کسی کی مدد سے دریغ نہ فرماتے۔ مدحیہ اشعار سنے ہیں اور اس پر انعام بھی دیا ہے مگر آپ کی مدح میں جو قصائد کہے گئے ہیں ان میں آپ کے اوصاف و محامد کا تذکرہ بہت کم آیا ہے۔ انعام بھی آپ نے سچائی پر دیا ہے۔ آپ کے علاوہ دوسروں کی شان میں جو مدحیہ قصائد ملتے ہیں ان میں سے زیادہ تر مبالغہ آرائی اور کذب بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ اسی لیے آپ نے حکم دیا ہے کہ جو لوگ بکثرت مدح سرائی کرتے ہیں ان کے چہروں پر خاک پھینکی جائے[1]۔

---

[1] صحیح مسلم (۳۰۰۲) فی الزہد کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بروایت مقداد "جب مدح سراؤں کو دیکھو تو ان کے چہروں پر خاک ڈال دو" ابوداؤد (۴۸۰۴)، ترمذی (۲۳۹۵) اور ابن ماجہ (۳۷۴۲) نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدل دوڑ بھی لگائی ہے، کشتی بھی لڑی ہے[1]۔ اپنے ہاتھ سے اپنے جوتے بھی گانٹھے ہیں، کپڑے اور بالٹی میں پیوند بھی لگائے ہیں۔ بکری بھی دوہی ہے، کپڑے سے جوئیں بھی نکالی ہیں، اپنے گھر والوں کی اور خود اپنی خدمت بھی کی ہے، تعمیر مسجد کے سلسلہ میں لوگوں کے ساتھ اینٹیں ڈھوئیں، گاہ بھوک سے اپنے شکم پر پتھر باندھے، گاہ آسودہ بھی رہے۔ میزبانی فرمائی، مہمان بھی رہے، سر کے بیچ، پیر کے اوپری حصہ، رگ ہائے پشت اور دونوں کندھوں کے مابین پچھنے بھی لگوائے۔ دوا بھی استعمال فرمائی۔ بطور علاج دوسروں کو داغا خود کو نہیں، آپ نے جھاڑ پھونک کیا مگر خود کرایا نہیں، مریض کو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرایا۔

طب کی بنیادی اصول تین ہیں۔ ۱۔ پرہیز۔ ۲۔ حفظانِ صحت۔ ۳۔ استفراغ مادۂ ردّیہ۔ یہ تینوں اصول آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے تین مقامات پر اکٹھا ذکر فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (نساء : ۴۳، المائدۃ : ۶)

اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کرکے آئے، یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔

آیت میں پانی نہ پانے والے کی طرح مریض کو بھی پرہیز کے طور پر تیمم کی اجازت دی گئی۔ حفظانِ صحت کے باب میں ارشاد ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرۃ : ۱۸۴)

پس تم میں کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو گنتی کے دوسرے دن پورا کرے۔

یہاں مسافر کو حفاظت صحت کے پیش نظر رمضان میں صوم نہ رکھنے کی اجازت دی گئی۔ تاکہ بیک وقت صوم اور سفر کی مشقتیں اس کی قوت وصحت پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ استفراغ مادۂ ردّیہ کے سلسلہ میں حالت احرام میں رہنے کے باوجود حاجی کو سر منڈانے کی اجازت دی گئی۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (بقرۃ : ۱۹۶)

مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر سر منڈالے تو اسے چاہیے کہ فدیہ کے طور پر صوم رکھے یا صدقہ دے، یا قربانی کرے۔

آیت میں مریض اور اس شخص کو بھی جس کے سر میں تکلیف ہو، حالتِ احرام میں سر منڈانا مباح قرار دیا گیا، تاکہ مادۂ فاسدہ اور بخاراتِ ردّیہ کا جن سے جوئیں نیز دیگر امراض پیدا ہوتے ہیں استفراغ ہوجائے۔ یہ واقعہ ہے کہ حج کے ایام میں کعب بن عجرہ

---

[1] ابوداؤد (۴۰۷۸) فی اللباس : باب فی العمائم اور ترمذی (۱۷۸۵) فی اللباس : باب العمائم علی القلانس میں ابوالحسن عسقلانی کی حدیث وارد ہے جس میں وہ ابوجعفر بن محمد بن رکانہ سے بیان کرتے ہیں کہ "رکانہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑی، آپ نے اسے پچھاڑ دیا" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، اس کی سند مضبوط نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ابوالحسن عسقلانی اور ابن رکانہ دونوں غیر معروف ہیں۔

کے سر میں بے شمار جوئیں پیدا ہو گئی تھیں۔ پس طب کے یہ تین بنیادی اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا تھوڑا ذکر فرمایا تاکہ اجتناب و پرہیز، حفظانِ صحت اور استفراغ مادۂ فاسدہ جیسی باتوں کی جانب اشارہ کر کے بندوں پر اظہارِ نعمت فرمائے، یہ اس کی رحمت ہے۔ لطف و مہربانی ہے، رافت و شفقت ہے۔ بلاشبہ اس کی ذات بے حد مہربان رحم کرنے والی ہے۔

معاملات میں آپ کا اُسوۂ حسنہ

معاملات میں آپ سب سے عمدہ تھے۔ قرض لیتے تو اس سے بہتر واپس[1] فرماتے۔ واپس فرماتے ہوئے دعا دیتے۔

"بَارَكَ اللهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ[2]"

اللہ آپ کے اہل و عیال اور دولت میں برکت عطا فرمائے، قرض کا معاوضہ تو یہی ہے کہ شکر کیا جائے اور ادائیگی ہو۔

ایک دفعہ ایک شخص سے چالیس صاع قرض لیے۔ درمیان میں اسے ضرورت ہوئی تو آپ کی خدمت میں تقاضے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا "ہمارے پاس ابھی کوئی آمدنی نہیں ہے۔" اس شخص نے کچھ کہنا چاہا مگر آپ نے فرمایا "بہتر ہی کہنا کیونکہ جن لوگوں کو تم نے قرضے دیئے ہیں ان میں میں سب سے بہتر ہوں۔" چنانچہ اسے چالیس قرض اور چالیس زائد اس طرح اسّی صاع واپس فرمائے۔ بزار نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے[3]۔ ایک دفعہ ایک اونٹ ادھار لیا۔ اونٹ والا تقاضا پر آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سست بھی کہا۔ صحابہ نے تنبیہ کے لیے اٹھنا چاہا مگر آپ نے فرمایا "جانے دو، حقدار کو کہنے سننے کا حق ہے[4]۔"

ایک دفعہ ایک چیز خریدی آپ کے پاس اس کی قیمت نہ تھی۔ اس میں آپ کو نفع ہوا چنانچہ بیچ کر اس کا نفع خاندان عبدالمطلب کی بیواؤں پر صدقہ کر دیا اور فرمایا "اب کوئی چیز خریدوں گا تو اسی وقت جب قیمت بھی موجود ہو[5]۔" اس واقعہ کا ذکر ابوداؤد نے کیا ہے۔ مگر یہ ادھار خریداری کے مخالف نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں باتیں جداگانہ ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ سے قرضہ کا تقاضہ کیا اور بڑی سخت کلامی سے پیش آیا۔ عمر بن الخطاب نے اس کا مزاج درست کرنا چاہا مگر آپ نے فرمایا "عمر! رکو۔ تمہارے لیے زیادہ مناسب تھا کہ مجھے ادائیگی کی اور اسے صبر کی

---

[1] بخاری ج ۵، ص ۴۴، فی الاستقراض، مسلم (۱۶۰۱) فی المساقات، میں ابوہریرہ سے روایت ہے "ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اونٹ کے تقاضہ پر آیا تو آپ نے فرمایا "دیدو اسے" صحابہ نے کہا "جو اونٹ بھی ہمیں ملتا ہے اس کے اونٹ سے بہتر ملتا ہے" اس شخص نے کہا "مجھے دو گے تو اللہ تمہیں دے گا" آپ نے فرمایا "دیدو" کیونکہ بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض عمدہ واپس کرتے ہوں۔"

[2] نسائی ج ۷، ص ۳۱۴، فی البیوع : باب الاستقراض، ابن ماجہ (۲۴۲۴) فی الصدقات : باب حسن القضاء، مسند احمد ج ۴، ص ۳۶، حدیث عبداللہ ابن ابی ربیعہ مخزومی۔ سند قوی ہے۔

[3] حدیث عبداللہ بن عباس ہیثمی نے مجمع الزوائد ج ۴، ص ۱۴۱، میں لکھا ہے کہ روایت بزار کی ہے۔ اس کے تمام رجال بزار کے شیخ کے علاوہ صحیح کے رجال ہیں بزار کے شیخ ثقہ ہیں۔

[4] بخاری ج ۴، ص ۳۹۴، فی الوکالۃ : باب الوکالۃ فی قضاء الدیون و باب وکالۃ الشاھد والغائب، و فی الاستقراض : باب استقراض الابل و باب ھل یعطی اکبر منہ و باب حسن القضاء و باب لصاحب الحق مقال، و فی الھبۃ : باب الھبۃ المقبوضۃ وغیر المقبوضۃ، مسلم (۱۶۰۱) فی المساقات : باب من استسلف شیئا فقضی خیرا منہ، ترمذی (۱۳۱۷) فی البیوع : باب ماجاء فی استقراض البعیر، حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[5] ابوداؤد (۳۳۴۴) فی البیوع : باب فی التشدید فی الدین، حدیث شریک عن سماک عن عکرمہ عن ابن عباس۔ شریک بن عبداللہ قاضی سئی الحفظ ہیں۔ اور سماک کی خاص کر عکرمہ سے روایت میں اضطراب ہوتا ہے۔ اس لیے حدیث ضعیف ہے۔

نصیحت کرتے۔[1] ایک یہودی نے کوئی چیز آپ سے ادھار بیچی مگر مدت سے پہلے ہی قیمت کے تقاضا پر آ گیا، فرمایا "ابھی مدت پوری نہیں ہوئی" یہودی نے کہا "عبدالمطلب کے بیٹو! جیسے تم ٹال مٹول کے عادی ہو" صحابہ نے اس کی سرزنش کرنی چاہی تو آپ نے انھیں روک دیا۔ یہودی کی یہ سخت معاملگی آپ کو اور زیادہ پُروقار بناتی گئی۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا "علامات نبوت کی ہر ایک بات آپ کے اندر دیکھ چکا ہوں صرف ایک رہ گئی تھی وہ یہ کہ نبی کے ساتھ جتنی جہالت کی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ وہ پُروقار ہو جاتا ہے۔ اسے بھی آزما کر دیکھ لیا، اس کے بعد یہ یہودی مشرف باسلام ہو گیا۔[2]

تنہا اور صحابہ کے ساتھ چلنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیّبہ

آپ جب چلتے تو آگے کو زور دیکر جھک کر چلتے۔ سب سے تیز، سب سے عمدہ اور سب سے پُرسکون رفتار ہوتی۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت کسی اور کو نہ دیکھا ایسا لگتا تھا جیسے رُخِ انور پر آفتاب رواں دواں ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز رفتار بھی کسی اور کو نہ پایا۔ گیا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین آپ کے لیے سمیٹی جا رہی ہو۔ ہم تھک تھک جاتے مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو آگے کو زور دے کر جھک کر چلتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اوپر سے نیچے اتر رہے ہیں" ایک بار فرمایا "جب چلتے تو زمین پر سے پاؤں زور سے اٹھاتے" میں کہتا ہوں "تقلع جو حدیث کے اندر استعمال ہوا ہے پورے طور پر زمین سے اوپر اٹھنے کو کہتے ہیں۔ جیسے کوئی اوپر سے نیچے کو چل رہا ہو تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔ یہ رفتار اربابِ عزیمت اور اصحابِ شجاعت کی ہوتی ہے۔ یہی سب سے زیادہ متوازن بھی ہوتی ہے اور اعضاء و جوارح کے لیے زیادہ راحت بخش بھی۔ نیز اس رفتار کا اس رفتار سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا جس میں تیزی، جلد بازی، سستی، ضعف اور مُردنی پائی جاتی ہو۔ کیونکہ چلنے والے اصل میں تین ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ مریل رفتار، دست بدست دیگرے پا بدست دیگرے، جیسے لکڑی کا کوئی کندہ لدا ہوا چلا جا رہا ہو۔ یہ چال بدنما اور مذموم ہوتی ہے۔

۲۔ حرکت و اضطراب پیدا کر کے اس طرح چلنے والا جیسے کوئی اکھڑ اونٹ چل رہا ہو یہ بھی مذموم ہے اور کم عقلی کی دلیل بھی۔ بالخصوص جب کہ چلنے والا بکثرت دائیں بائیں مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا چلے۔

---

[1] حاکم ج ۲، ص ۳۲، میں اسی طرح کی روایت ہے، اسے انھوں نے صحیح لکھا ہے، مگر ذہبی نے استدراک کرتے ہوئے اسے مرسل قرار دیا ہے۔

[2] ابن حبان نے (۲۱۰۵) میں اور ابوالشیخ نے "اخلاق النبی" ص ۸۳ — ۸۵ میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ محمد بن متوکل کی روایت سے پیش کیا ہے، حافظ نے اصابہ (۲۹۰۴) میں جہاں زید بن سعنہ کے حالات قلمبند فرماتے وہاں لکھا ہے کہ سند کے تمام رجال ثقہ ہیں۔ یہاں ولید نے حدیث بیان کرنے کی صراحت کی ہے، ان کا مدار محمد بن متوکل ہیں جو ابن ابی السری کے نام سے مشہور تھے اور ان کے لیے ولید سے حدیثوں کی روایت کرتے تھے۔ ابن معین نے انھیں ثقہ مگر ابوحاتم نے لین الحدیث قرار دیا ہے۔ ابن عدی انھیں کثیر الغلط شمار کرتے ہیں، واللہ اعلم۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کی ایک اور شاہد روایت موجود ہے مگر اس کی تعیین نہیں کی۔ ابن سعد لکھتے ہیں، ہم سے یزید نے، انھوں نے کہا ہم سے جریر بن حازم نے، انھوں نے کہا مجھ سے اس نے جس نے زہری کو بیان کرتے سنا یہ بیان کیا کہ "ایک یہودی نے کہا" تورات میں محمد کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ سب میں دیکھ چکا بس ایک وصف حلم اور دیکھنا تھا، اور پھر پورا واقعہ بیان کیا ہے۔

۳۔ نرمی و آہستگی کے ساتھ چلنے والا۔ یہ رحمٰن کے بندوں کی رفتار ہے جیسا کہ اس نے اپنی کتاب کے اندر خود ان کی صفت بیان کی ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (فرقان : ٦٣)

رحمٰن کے اصل بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔

اکثر متقدمین کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ چال ہے جو کبر و نخوت اور مُردنی سے دور، وقار و سکینت کی چال ہوتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار یہی تھی۔ کیونکہ بایں رفتار ایسا لگتا تھا جیسے آپ اوپر سے نیچے کو جا رہے ہوں اور زمین تیزی سے سمٹتی چلی جا رہی ہو۔ حتیٰ کہ ساتھ میں چلنے والا تھک تھک جائے مگر آپ پر تھکن کا اثر نہ ہو۔ یہاں دو باتوں کی دلیل ہے ایک یہ کہ آپ کی رفتار مُردنی نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ سست بھی نہ تھی۔ بلکہ سب سے معتدل اور متوازن تھی۔

رفتار کی دس قسمیں ہیں۔ تین تو وہی جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ چوتھی سعی (دوڑ) پانچویں رمل۔ یعنی قدموں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ دے کر انتہائی سرعت سے چلنا۔ اسے خبب بھی کہتے ہیں۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ طواف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدموں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ دے کر تین بار تیزی سے دوڑے (خبب) اور چار بار عام رفتار سے[ل] (مشی) چھٹی قسم نَسلان۔ یعنی آہستہ دوڑ جس میں مشقت و اذیت نہ ہو۔ بعض مسانید میں آیا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے رفتار کی شکایت کی تو فرمایا "نَسلان (آہستہ دوڑ) کا سہارا لو"[۲] ساتویں خوزلی (جھوم کر چلنا) کہتے ہیں اس چال میں شکستگی اور نسوانیت پائی جاتی ہے۔ آٹھویں قہقری پیچھے کی جانب چلنا۔ نویں جمزی۔ اس میں چلنے والا کود کود کر چلتا ہے۔ دسویں تبختر۔ یہ عُجب و تکبر کی چال ہے، چونکہ اس میں غرور پایا جاتا ہے اور آدمی کی توجہ اپنے دونوں پہلوؤں کی جانب ہوتی ہے اس لیے ایسی چال اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ زمین میں دھنسا دیتا ہے جس میں قیامت تک گھستا اور دھنستا چلا جاتا ہے۔

ان تمام رفتاروں میں سب سے معتدل اور متوازن رفتار وہی ہے جو نرم آہستہ اور آگے زور دیکر جھک کر ہو۔

دستور یہ تھا کہ صحابہ کے ساتھ ہوتے تو انھیں آگے کرتے اور خود پیچھے چلتے اور فرماتے جاتے "میری پشت کو فرشتوں کے لیے رہنے دو[۳]" اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو ہنکاتے تھے۔ آپ جوتا پہن کر بھی چلتے اور برہنہ پاؤں بھی، صحابہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے اور اجتماعی طور پر بھی چلے، کسی غزوہ میں ایک دفعہ چلے تو انگلی زخمی ہو گئی اور خون بہہ نکلا تو فرمایا ؎

هل انتِ الا اصبع دميتِ وفی سبيل الله ما لقيتِ[۴]

ل۔ بخاری ج ۳، ص ۴۰۱، فی الحج : باب ماجاء فی السعی بین الصفا والمروۃ وباب من طاف بالبیت اذا قدم مکۃ قبل ان یرجع الی مکۃ، مسلم (۱۲۶۱) فی الحج : باب استحباب الرمل فی الطواف والعمرۃ، نسائی ج ۵، ص ۲۳۰، فی الحج : باب الرمل فی الحج والعمرۃ۔

۲۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۴۴۳، میں یہ حدیث بروایت جابر بن عبداللہ مرفوعاً آئی ہے، اس میں الفاظ "علیکم بالنسلان" (آہستہ دوڑ اختیار کرو) کے ہیں۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے ان کی تائید کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

۳۔ مسند احمد ج ۳، ص ۳۳۲، ابن ماجہ (۲۴۶) فی المقدمۃ : باب من کرہ أن یوطئ، بروایت جابر۔ مفہوم یہ ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تھے تو صحابہ آپ کے آگے چلتے تھے اور آپ کی پشت فرشتوں کے لیے رہنے دیتے"۔ سند قوی ہے حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

۴۔ بخاری ج ۶، ص ۱۴، مسلم ۱۷۹۶، حدیث جندب بن سفیان۔

توایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوگئی ہے، اللہ کی راہ میں تجھے یہ تکلیف لاحق ہوئی ہے۔

سفر میں صحابہ کے پیچھے پیچھے چلتے۔ کمزوروں کو سہارا دیتے اور پیچھے بٹھا لیتے اور سب کو دعا دیتے۔ اس کا ذکر ابوداؤد نے کیا ہے[1]۔

بیٹھنے اور ٹیک لگانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ

زمین ہو، چٹائی ہو، فرش ہو کہیں بھی بیٹھ رہتے تھے۔ قیلہ بنت مخرمہ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آئی تو آپ کو اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ کہتی ہیں کہ اس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خشوع کی جو کیفیت طاری تھی اسے دیکھ کر میں بے حد مرعوب ہوئی عدی بن حاتم آپ کے پاس پہنچے تو انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر گھر تشریف لے گئے۔ بیٹھنے کے لیے لونڈی نے ایک گدا ڈال دیا۔ مگر گدے کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھ کر خود زمین پر بیٹھ گئے، عدی کہتے ہیں اس وقت معلوم ہوا کہ یہاں بادشاہی نہیں ہے۔ کبھی کبھی چت لیٹتے۔ گاہ ایک پیر دوسرے پیر پر رکھ لیتے، گدے کو تکیہ بناتے۔ کبھی بائیں ہاتھ اور کبھی داہنے ہاتھ پر ٹیک لگایا ہے۔ بوقتِ ضرورت باہر نکلتے تو کمزوری کے باعث کسی صحابی پر ٹیک بھی لگایا۔

قضائے حاجت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ

قضائے حاجت کے لیے جاتے تو حسب ذیل دعا پڑھتے۔

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ[2]" الرجس النجس الشیطان الرجیم"

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبیث جنوں اور جنیوں سے۔ گندے ناپاک مردود شیطان سے۔

فارغ ہو کر لوٹتے تو یہ دعا پڑھتے۔

غُفْرَانَكَ[3] اللہ! تیری مغفرت مطلوب ہے۔

کبھی پانی سے، کبھی پتھر سے اور کبھی دونوں سے استنجاء کرتے تھے۔

لہ رقم ۲۶۳۹، حدیث جابر۔ سند صحیح ہے۔

۲ہ بخاری ۱/۲۱۲، ص ۲۱۲، فی الوضوء: باب مایقول اذا دخل الخلاء، وفی الدعوات: باب الدعاء عند الخلاء، مسلم(۳۷۵) فی الحیض: باب مایقول اذا دخل الخلاء، ترمذی (۵) فی الطهارة: باب مایقول اذا دخل الخلاء، ابوداؤد (۴) فی الطهارة: باب مایقول الرجل اذا دخل الخلاء، نسائی ۱/۲۰، فی الطهارة: باب القول عند دخول الخلاء، مسند احمد ۳/۹۹ و ۱۰۱ و ۲۸۲۔ مذکورہ تمام کتابوں میں روایت انس بن مالک سے ہے۔ "الرجس النجس الشیطان الرجیم" کے الفاظ کی تخریج صرف ابن ماجہ ۲۹۹ نے ابوامامہ کی روایت سے کی ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

۳ہ ترمذی (۷) فی الطهارة: باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ابوداؤد (۳۰) فی الطهارة: باب مایقول الرجل اذا خرج من الخلاء، ابن ماجہ ۳۰۰، فی الطهارة: باب مایقول اذا خرج من الخلاء، مسند احمد ۶/۱۵۵۔ ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن غریب ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ابن خزیمہ (۹۰)، ابن حبان اور حاکم ۱/۱۵۸ نے اسے صحیح قرار دیا ہے "شرح المهذب" میں نووی نے اسے حسن صحیح کا درجہ دیا ہے۔

سفر میں قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو اتنی دور نکل جاتے کہ صحابہ کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ گاہ دو میل تک دور نکل جایا کرتے تھے۔

قضائے حاجت کے موقعہ پر کسی تودۂ ریت یا کھجوروں کے جھنڈ یا وادی کے درختوں کی آڑ میں بیٹھتے، پیشاب کے موقعہ پر اتفاق سے کوئی سخت زمین ہوتی تو کسی لکڑی سے اسے اتنا کریدتے کہ نرم ہو جاتی۔ اس وقت پیشاب کرتے۔

پیشاب کے لیے ہمیشہ نرم زمین تلاش کرتے۔ زیادہ تر بیٹھ کر پیشاب کرتے۔ حتی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے "کس نے تمھیں بتایا کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے۔ جو بھی ایسا کہے اس کی تصدیق نہ کرو" آپ ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کرتے تھے[1] صحیح مسلم کے اندر حذیفہ کی روایت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے[2]

اس کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ ایسا بیانِ جواز کے طور پر تھا۔ یہ توجیہ بھی کی گئی ہے کہ آپ کے دونوں گھٹنوں کے اندرونی حصوں میں چونکہ درد تھا اس لیے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے پر مجبور تھے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسا بطور علاج آپ نے اختیار فرمایا تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ عرب دردِ پشت کے ازالہ کے لیے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آپ نے ایسا محض اس لیے کیا کہ پیشاب کے چھینٹوں سے محفوظ رہ سکیں۔ کیونکہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ کسی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جسے مزبلہ کہتے ہیں پیشاب کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ یہ بلند ہوتا ہے بیٹھ کر آدمی یہاں پیشاب کرے تو الٹے خود اس پر آتا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ اسے آپ نے اپنے اور چہار دیواری کے مابین سترہ بنایا تھا اس لیے آپ کو مجبوراً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑا۔ واللہ اعلم۔

ترمذی نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھڑے پیشاب کرتے دیکھ کر فرمایا "عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو" فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا[3]

مسند بزار وغیرہ میں عبد اللہ بن بریدہ اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ "تین باتیں اجڈپن ہیں۔ (۱) آدمی کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔ (۲) صلوٰۃ سے فارغ ہونے سے پہلے پیشانی صاف کرنا۔ (۳) سجدہ میں پھونک مارنا[4] ترمذی نے روایت کرتے ہوئے اسے غیر محفوظ کہا ہے۔ بزار نے کہا ہے کہ عبد اللہ بن بریدہ سے روایت کرنے والے ہمارے علم کی حد تک صرف سعید بن عبید اللہ ہیں، ان پر کسی طرح کی انھوں نے جرح نہیں کی ہے۔ ابن ابی حاتم

---

[1] ترمذی (۱۲) نسائی ۱/۲۶، ابن ماجہ ۳۰۷، سند میں شریک قاضی سئ الحفظ ہیں۔ مگر یہی روایت مسند احمد ۶/۱۳۶ و ۱۹۲ میں بھی ہے جہاں سفیان نے شریک قاضی کی متابعت کی ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] بخاری ۱/۲۸۳، فی الوضوء: باب البول قائماً و قاعداً و باب البول عند صاحبه والتستر بالحائط و باب البول عند سباطة قوم، وفی المظالم: باب الوقوف والبول عند سباطة قوم، مسلم (۲۷۳) فی الطهارة: باب المسح علی الخفین، ترمذی (۱۳) فی الطهارة: باب الرخصة فی البول قائما، ابوداؤد (۲۳) فی الطهارة: باب البول قائما، نسائی ۱/۲۵، فی الطهارة: باب الرخصة فی البول فی الصحراء قائما، ابن ماجہ (۳۰۵) فی الطهارة: باب ماجاء فی البول قائما، مسند احمد ۵/۳۸۲ و ۳۹۴ و ۴۰۲۔ ان تمام کتابوں میں روایت حذیفہ کی ہے۔ ابن ماجہ ۳۰۶ اور مسند احمد ۴/۲۴۶ نے اس کی تخریج مغیرہ بن شعبہ سے بھی کی ہے۔

[3] ترمذی نے (۱۲) میں اس کی روایت معلقاً اور ابن ماجہ نے (۳۰۸) میں موصولاً کی ہے، مگر جیسا کہ ترمذی نے کہا ہے یہ ضعیف ہے کیونکہ سند کے اندر عبد الکریم ابن ابی المخارق کا نام آیا ہے۔ جو متفقہ طور پر ضعیف ہیں۔

[4] اس کی تخریج۔ بزار نے نصر بن علی کی سند سے کی ہے، انھوں نے عبد اللہ بن داؤد سے، انھوں نے سعید بن عبید اللہ سے، انھوں عبد اللہ بن بریدہ سے، انھوں نے اپنے والد سے، سند حسن ہے۔ بدر عینی نے "عمدۃ القاری" ۳/۱۳۵ میں اسے صحیح لکھا ہے، ہیثمی نے مجمع الزوائد ۲/۸۳، فی الصلوٰۃ: باب مسح الجبهة فی الصلوٰۃ، بزار کی روایت سے اور طبرانی نے "الاوسط" میں بریدہ سے اس کا ذکر کیا ہے۔ طبری فرماتے ہیں بزار کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

فرماتے ہیں، یہ بصری ثقہ اور مشہور ہیں۔

بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد بھی آپ قرآن پڑھتے تھے اور ڈھیلا ہو یا پانی استنجاء بائیں ہاتھ سے کرتے۔ کوئی ایسی بات نہ کرتے جو مریضانِ شک کیا کرتے ہیں، یعنی عضو تناسل کو مالش کر کر کے سختی سے پیشاب نچوڑنا، کھنگھارنا، اچھلنا، کودنا، رسّی پکڑ کر زور لگانا، زینوں پر چڑھنا، احلیل (شرم گاہ کا سوراخ) میں روئی بھرنا، اس کے اندر پانی ڈالنا، وقفہ وقفہ سے نگرانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ شکی لوگوں کی ایجاد کردہ حرکتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق "آپ جب پیشاب کرتے تھے تو عضو تناسل کو تین بار مالش کر کے نچوڑتے تھے"۔[1]

ایک روایت کے مطابق آپ نے اس کا حکم بھی دیا ہے۔ مگر یہ دونوں روایتیں ثابت نہیں ہیں۔ ابو جعفر عقیلی کا یہی کہنا ہے۔ پیشاب کرتے ہوئے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر کی ہی روایت[2] ہے۔ بزار نے اپنی مسند میں اس واقعہ کے سلسلہ میں روایت کی ہے کہ آپ نے سلام کا جواب بھی دیا۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ "جواب اس خیال سے دیدیا کہ مبادا کہہ نہ سکو سلام کیا مگر جواب نہ دیا"۔ اس حالت میں مجھے دیکھو تو سلام نہ کیا کرو۔ ورنہ سلام کا جواب نہ دوں گا۔ کہا جاتا ہے کہ غالبًا ایسا دو بار ہوا۔ مگر مسلم کی حدیث زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ ضحاک بن عثمان کی حدیث ہے جسے انھوں نے نافع سے، انھوں نے ابن عمر سے روایت کی ہے۔ مگر بزار کی حدیث عبداللہ بن عمر کی اولاد میں ابو بکر نامی کسی راوی کی روایت کردہ ہے، انھوں نے نافع سے اور انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ابو بکر کے سلسلہ میں بتایا جاتا ہے کہ یہ ابو بکر بن عمر بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمر ہیں[3]۔ امام مالک وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ مگر ضحاک ان کے بالمقابل زیادہ ثقہ ہیں۔

آپ جب استنجاء پانی سے کرتے تو اس کے بعد زمین پر ہاتھ مارتے تھے۔ رفع حاجت کے لیے بیٹھتے تو اس وقت تک کپڑا نہ اٹھاتے جب تک زمین سے بالکل قریب نہ ہو جاتے۔

فطرت اور لوازم فطرت کے بارے میں آپ کی سنّت طیّبہ

اس سے قبل یہ اختلافی مسئلہ گذر چکا ہے کہ آیا آپ مختون پیدا ہوئے تھے یا جس دن پہلی بار فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اس دن انھوں نے آپ کا ختنہ کیا۔ یا دادا عبدالمطلب نے کیا۔

---

[1] ابن ماجہ (۳۲۶)، مسند احمد ۴/ ۳۴۷، سند ضعیف ہے۔

[2] مسلم ۳۷۰، فی الحیض : باب التیمم، ترمذی (۹۰) فی الطھارۃ : باب فی کراھۃ رد السلام غیر متوضئ، ابوداؤد (۱۶) فی الطھارۃ : باب أیرد السلام وھو یبول، نسائی ۱/ ۳۶، فی الطھارۃ : باب السلام علی من یبول، ابن ماجہ (۳۵۳) فی الطھارۃ : باب الرجل یسلم علیہ وھو یبول۔

[3] عبدالحق نے اپنی کتاب "احکام" میں بھی یہی بات کہی ہے۔ "نصب الرایۃ" میں زیلعی نے بھی عبدالحق سے یہی نقل کیا ہے "المنتقیٰ" ص ۲۷ لابن الجارود میں صراحت کے ساتھ نام بھی آیا ہے سند کے الفاظ اس طرح ہیں حدثنا محمد بن یحیی، ثنا عبداللہ بن رجاء ثنا سعید یعنی ابن ابی سلمۃ، ثنی ابوبکر وھو ابن عمر بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عمر بن خطاب عن نافع عن عبداللہ اس کے بعد پوری حدیث نقل کی ہے۔ مسند ابو العباس سراج میں بھی زیلعی کی روایت کے مطابق اسی طرح صراحت سے نام آیا ہے۔ سند کے تمام رجال ثقہ ہیں۔

جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو کرنے اور اخذ وعطا میں داہنی جانب کا استعمال آپ کو بے حد پسند تھا۔ دایاں ہاتھ کھانے، پینے اور وضو کے لیے اور بایاں آبدست وغیرہ کے لیے مخصوص رکھتے تھے۔

حجامت کے بارے میں سنت یہ تھی کہ یا تو پورا سر منڈوا دیتے یا بالکل نہ مونڈواتے۔ طریقہ یہ نہ تھا کہ کچھ حصہ منڈوائیں کچھ چھوڑ دیں، سر منڈوانے کی روایت محفوظ طریقہ پر صرف قربانی کے موقعوں پر ملتی ہے۔

مسواک بے حد مرغوب تھی صوم سے ہوں یا بغیر صوم، ہر حال میں مسواک کرتے تھے۔ خواب سے بیدار ہو کر، وضو کے وقت، صلوٰۃ کے موقعہ پر اور گھر میں داخل ہوتے وقت مسواک ضرور کرتے۔ مسواک پیلو کی ہوتی۔

خوشبو پسند تھی اسے بکثرت استعمال فرماتے۔ مذکور ہے کہ آپ چونہ کا طلا کرتے تھے[1] بال شروع شروع پیچھے کی جانب لٹکتے تھے۔ بعد میں آپ نے دو گیسو بنا لیے، حمام میں کبھی داخل نہ ہوئے۔ غالباً اسے اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا بھی نہیں حمام کے ضمن میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہے[2]۔

آپ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سوتے وقت ہر شب، ہر آنکھ میں تین بار سرمہ لگاتے[3] خضاب کے باب

لہ۔ ابن ماجہ (۳۷۵۱) فی الادب : باب الاطلاء بالنورۃ، حبیب بن ابی ثابت عن ام سلمۃ کی سند سے، رجال سب ثقہ ہیں، لیکن حبیب ابن ابی ثابت کا ام سلمہ سے سماع ثابت نہیں ہے، لہذا حدیث منقطع ہے، بایں ہمہ اس باب میں کچھ دیگر احادیث بھی مروی ہیں جن کا تذکرہ شوکانی نے "نیل الاوطار" ۱/۱۳۰ فی الطہارۃ : باب الاطلاء بالنورۃ میں کیا ہے۔ اسے دیکھیے۔

سہ۔ یہاں مؤلف کا خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس باب میں تین حدیثیں مروی ہیں جو صحیح ہیں۔

۱۔ جابر سے مرفوعاً روایت ہے "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنی بیوی کو حمام میں نہ داخل کرے، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ حمام میں ازار پہن کر ہی داخل ہو اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اس دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چلتا ہو۔" مستدرک حاکم ۴/۲۸۸، ترمذی (۲۸۰۲) نسائی نے ۱/۱۹۸ میں اس کے پہلے جزء کی روایت کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی ان کے موافق ہیں، ترمذی کے مطابق یہ حدیث حسن غریب ہے، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو جید قرار دی ہے۔ اس حدیث کے بہ کثرت شواہد موجود ہیں جنھیں "الترغیب والترہیب" ۱/۸۸، ۹۱ فی الطہارۃ : باب الترھیب من دخول الرجال الحمام بغیر ازار اور "مجمع الزوائد" ۱/۲۷۷، ۲۷۹ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ حدیث صحیح ہے۔

۲۔ ام درداء کی حدیث جس کی تخریج احمد ۶/۳۶۱ و ۳۶۲ اور دولابی نے "الکنی والالقاب" ۲/۱۳۴ میں دو سندوں سے کی ہے۔ ایک صحیح ہے جس کو منذری نے قوی بتایا ہے۔ اس حدیث میں وہ فرماتی ہیں "میں حمام سے نکلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ملے اور دریافت فرمایا "ام درداء کہاں سے آرہی ہو؟" میں نے کہا "حمام سے" فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو عورت بھی اپنے کپڑے اپنی ماؤں کے علاوہ کسی اور کے گھر میں اتارے گی وہ اپنے رحمان کے درمیان کا ہر پردہ چاک کر دے گی"، ہیثمی نے اسے المجمع ۱/۲۷۷ میں درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احمد نے اور طبرانی نے الکبیر میں اسے چند سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں ایک سند کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

۳۔ ابوالملیح کی حدیث۔ کچھ شامی خواتین عائشہ کے پاس آئیں تو آپ نے پوچھا "تم کہاں کی ہو" انھوں نے کہا "شام کی" فرمایا "غالباً تمھارا تعلق اسی شہر سے ہے جہاں عورتیں حمام میں داخل ہوتی ہیں؟" انھوں نے کہا "ہاں" فرمایا "سن لو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو عورت بھی اپنے گھر کے سوا کہیں اور اپنے کپڑے اتارے گی۔ اپنے اور اللہ کے درمیان کا پردہ پھاڑ دے گی۔" اس حدیث کی تخریج ابوداؤد (۴۰۱۰) ترمذی (۲۸۰۴) اور ابن ماجہ (۳۷۵۰) نے کی ہے۔ ترمذی نے اسے حسن اور حاکم نے ج ۴، ص ۲۸۸ میں صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی ان کے موافق ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ان احادیث کے اندر تاکید کی گئی ہے کہ گھروں کے اندر غسل خانے (حمامات) تعمیر کیے جائیں۔ حاکم نے ۴/۲۸۸ میں عبداللہ بن عباس کی ایک روایت مرفوعاً نقل کی ہے جس میں آپ کا ارشاد ہے "اس گھر سے بچو جسے حمام کہا جاتا ہے" صحابہ نے کہا "رسول اللہ! اس سے میل کچیل صاف ہو جاتا ہے اور مرض کا ازالہ بھی ہوتا ہے" فرمایا "تو جو اس میں داخل ہو وہ پردہ کرے" حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی ان کے موافق ہیں۔ طبرانی نے "الکبیر" ۳/۱۰۳/۱/۱ اور ضیاء مقدسی نے "المختارہ" میں اس کی تخریج کی ہے۔

سہ۔ ترمذی (۲۰۴۹) فی الطب : باب ماجاء فی السعوط وغیرہ، ابن ماجہ (۳۴۹۹) فی الطب : باب من (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں صحابہ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ انس فرماتے ہیں آپ نے خضاب نہیں لگایا۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں خضاب لگایا ہے۔ حماد بن سلمہ نے حمید سے روایت کی ہے اور وہ انس سے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال خضاب شدہ دیکھے۔ حماد فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن محمد بن عقیل کا بیان ہے۔ کہتے ہیں کہ انس بن مالک کے پاس میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال خضاب شدہ دیکھے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ چونکہ آپ کثرت سے خوشبو استعمال فرماتے تھے اس لیے بال سرخ ہوگئے تھے۔ اور خضاب شدہ معلوم ہوتے تھے یہ حقیقت میں خضاب نہ تھا۔ ابورمثہ فرماتے ہیں میں اپنے ایک بچّے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا "یہ تمھارا بچّہ ہے؟" میں نے کہا "ہاں! گواہ ہوں کہ یہ بچّہ میرا ہے" فرمایا "تیرے قصور کا اس سے اور اس کے قصور کا تجھ سے مواخذہ نہ ہوگا"۔ ابورمثہ فرماتے ہیں۔ "اس وقت میں نے آپ پر بڑھاپے کے بال سرخ دیکھے[1]۔ ترمذی فرماتے ہیں اس باب میں یہ حدیث سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ واضح ہے، کیونکہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑھاپے کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ حماد بن سلمہ نے سماک بن حرب سے اپنی ایک روایت میں کہا ہے کہ جابر بن سمرہ سے پوچھا گیا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں سفیدی ظاہر ہوگئی تھی؟" انھوں نے فرمایا "آپ کے سر میں سفیدی کے آثار بس اس حد تک تھے کہ آگے کے چند بال سفید ہوگئے تھے۔ آپ سر پر تیل رکھتے تو تیل کے رنگ میں روپوش ہوجاتے۔ انس فرماتے ہیں "سر اور داڑھی میں آپ بکثرت تیل لگاتے اور کثرت سے سرپوش استعمال فرماتے حتّٰی کہ آپ کا کپڑا (تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا) کنگھی کرنا پسند فرماتے تھے۔ کبھی خود کبھی عائشہ آپ کے سر میں کنگھی کرتیں۔ آپ کے بال جُمّہ سے بڑے اور وفرہ سے چھوٹے تھے[3]۔ جُمّہ "وہ بال جو کان کی لو تک ہوتے ہیں۔ بال بڑھ جاتا تو اس کی چار چوٹیاں بنا لیتے۔ ام ہانی فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار ہمارے یہاں مکہ آئے تو دیکھا کہ آپ کے چار چوٹیاں گندھی ہوئی ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے[4]۔ خوشبو مسترد نہ فرماتے۔ صحیح مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جب کسی کو "ریحان" پیش کی جائے تو رد نہ کرے۔ کیونکہ یہ خوشبودار ہوتی ہے۔ قبول کرلی جائے تو اسے رکھنے پالنے جانے میں کوئی محنت بھی نہیں ہوتی ہے" حدیث کے الفاظ یہی ہیں، بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں "جسے کوئی خوشبو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اکتحل وترًا، مسند احمد ۱/۳۵۴۔ ترمذی نے شمائل (۴۸) و (۴۹) میں اسے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ سند میں عباد بن منصور ضعیف ہیں۔ ان کا حافظہ کمزور تھا۔ ان پر تدلیس واختلاط کا الزام ہے۔ اس باب میں انس سے ایک روایت ہے جس کی تخریج ابوالشیخ نے اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۸۳ میں بہ سند جید کی ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔ "اپنی داہنی آنکھ میں تین بار اور بائیں آنکھ میں دو بار سلائی سے سرمہ لگاتے تھے"۔ طبرانی کی "الکبیر" ۳/۱۱۹/۱ میں عبداللہ بن عمر کی روایت سے اس کی ایک شاہد بھی موجود ہے اس کی سند میں دو ضعیف ہیں مگر پھر بھی شاہد ہونے کے لائق ہے۔

[1]۔ ابوداؤد (۴۴۹۵) الدیات : باب لا یوخذ احد بجریرۃ اخیہ أوابیہ، نسائی ۸/۵۳، فی القسامۃ : باب ھل یوخذ احد بجریرۃ غیرہ، مسند احمد ۲/۲۲۶ و ۲۲۷، ترمذی فی الشمائل رقم (۴۴) سند صحیح ہے۔

[2]۔ ترمذی فی الشمائل رقم ۳۲ سند ضعیف ہے۔ سلسلۂ سند میں ربیع بن صبیح اور یزید بن ابان رقاشی دونوں ضعیف ہیں۔

[3]۔ ترمذی (۱۷۵۵) فی اللباس : باب فی الجمعۃ واتخاذ الشعر۔ وفی الشمائل (۲۴) و ابوداؤد (۴۱۸۷) فی الترجل : باب ماجاء فی الشعر، ابن ماجہ (۳۶۳۵) فی اللباس : باب اتخاذ الجُمّۃ والذوائب، مسند احمد ۶/۱۰۸ و ۱۱۸۔ سند حسن ہے۔ ترمذی کے مطابق حسن غریب، صحیح ہے۔

وفرہ، سر پر سمٹے ہوئے وہ بال، یا اس بال کو کہتے ہیں جو دونوں کانوں پر لٹک رہے ہوں یا کان کی لو سے بڑھے ہوں۔ پھر جُمّہ کہلاتا ہے پھر لمّہ۔

[4]۔ ترمذی (۱۷۸۲) فی اللباس : باب دخول النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ، ابوداؤد (۴۱۹۱) فی الترجل : باب فی الرجل یقص شعرہ، ابن ماجہ (۳۶۳۲) فی اللباس : باب اتخاذ الجُمّۃ والذوائب، مسند احمد ۶/۳۴۱ و ۴۲۵، روایت مجاہد کی ام ہانی سے، سند صحیح ہے، ترمذی کے مطابق حسن ہے۔

پیش کی جائے اسے رد نہ کرے[1]"۔ یہ روایت مذکورہ بالا حدیث کے مفہوم میں نہیں ہے۔ کیونکہ خوشبو (پھول وغیرہ) اگر قبول کر لی جائے تو کوئی خاص احسان نہیں ہوتا۔ عام طور پر لوگ فیاضی کے ساتھ اسے ہدیہ کرتے ہیں۔ برعکس ازیں مشک، عنبر اور مجموعۂ عطر وغیرہ پیش کیا جائے تو بار خاطر ہوتا ہے۔ مگر عزرہ بن ثابت نے جو حدیث ثمامہ سے بیان کی ہے اس میں انس کا قول ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو مسترد نہیں فرماتے تھے[2]"۔ باقی عبداللہ بن عمر کی مرفوعاً یہ حدیث "تین چیزیں مسترد نہ کی جائیں، گدّے، تیل اور دودھ" تو یہ معلول ہے۔ ترمذی نے روایت کرتے ہوئے اس کی علت ظاہر کر دی ہے۔ اس روایت کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے مجھے سر دست یاد نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ عبداللہ بن مسلم بن جندب کی حدیث ہے۔ جسے وہ اپنے والد سے وہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ابو عثمان نہدی کی ایک مرسل روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "تم میں سے کسی کو ریحان پیش کی جائے تو اسے رد نہ کرے، کیونکہ یہ جنت سے نکلی ہے[4]"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خوشبو دانی[5] تھا۔ جس سے نکال کر آپ خوشبو لگایا کرتے تھے۔ پسندیدہ ترین خوشبو مشک تھی۔ فاغیہ بھی بے حد مرغوب تھی۔ فاغیہ ایک قول کے مطابق حنا کی کلی کو کہتے ہیں۔

مونچھ کاٹنے کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پاک

ابو عمر بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حسن بن صالح، سماک سے وہ عکرمہ سے، وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مونچھ کترتے تھے، وہ یہ بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ آپ کی مونچھ ابراہیم کترا کرتے تھے[6]۔ ایک گروہ نے ابن عباس پر اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے، ترمذی نے، زید بن ارقم کی سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کیا ہے۔ "جو اپنی مونچھ نہ کاٹے وہ ہماری جماعت سے خارج ہے"۔ اس حدیث کو انھوں نے صحیح قرار دیا[7] ہے۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ

۱۔ مسلم (۲۲۵۳) فی الالفاظ من الادب: باب استعمال المسک، ابوداؤد (۴۱۷۲) فی الترجل: باب فی رد الطیب، نسائی ۸/ ۱۸۹ فی الزینة: باب الطیب باللفظ الثانی۔

۲۔ بخاری ۱۰/ ۳۱۲، فی اللباس: باب من لم یرد الطیب وفی الهبة: باب ما لا یرد من الهدیة، ترمذی (۲۷۹۰) فی الادب: باب ما جاء فی کراهیة رد الطیب، نسائی ۸/ ۱۸۹ فی الزینة، ترمذی کے مطابق حدیث حسن صحیح ہے۔ اصل نسخہ میں عروہ بن ثابت ہے۔ مگر یہ تحریف ہے۔

۳۔ ترمذی (۲۷۹۱) فی الادب: باب ما جاء فی کراهیة رد الطیب، تاریخ اصبہان لابی نعیم ۱/ ۹۹ سند حسن ہے۔ اس میں کسی طرح کی کوئی علت نہیں۔ اصل میں عبداللہ بن مسلم کا حال ترمذی سے پوشیدہ رہا۔ ابو زرعہ رازی ان کا تعارف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ غنیمت تھے۔ ابن حبان اور عجلی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔

۴۔ ترمذی (۲۷۹۲) فی الادب: باب ما جاء فی کراهیة رد الطیب، ابو عثمان نہدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا نہ سنا، اس لیے حدیث منقطع ہے۔

۵۔ اصل نسخہ میں لفظ "مسکہ" ہے مگر یہ تحریف ہے۔ اصل لفظ "سُکّة" ہے جس کے معنی ایک عمدہ خوشبو کے ہیں۔ مگر ایک قول کے مطابق اس کا اطلاق مختلف خوشبوؤں کے ایک ظرف پر ہوتا ہے۔ حدیث کی تخریج ابوداؤد (۴۱۶۲) اور ترمذی نے فی الشمائل (۲۱۷) کی ہے۔ روایت انس کی، سند حسن ہے۔

۶۔ ترمذی (۲۷۶۱) فی الادب: باب ما جاء فی قص الشارب، عکرمہ سے سماک کی روایت میں اضطراب ہے۔

۷۔ نسائی ۸/ ۱۲۹، ۱۳۰ فی الزینة: باب احفاء الشارب، ترمذی (۲۷۶۲)، مسند احمد ۴/ ۳۶۶ و ۳۶۸۔ سند صحیح ہے۔ ضیاء مقدسی نے المختارہ میں اسے صحیح لکھا ہے، حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ مشروع صرف مونچھ کا کچھ حصہ کاٹنا ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ، مجوس کے برخلاف چلو"[1]

صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "مشرکین کے برخلاف چلو، داڑھیاں خوب بڑھاؤ اور مونچھوں کو جڑ سے کاٹو"[2] صحیح مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھ کاٹنے اور ناخن تراشنے کی ایک مدت متعین فرمائی تھی۔ مدت یہ تھی کہ ہم چالیس شب و روز سے زیادہ انھیں نہ چھوڑیں[3]

مونچھ کاٹنے اور منڈوانے کی افضلیت میں سلف کا اختلاف ہے۔ امام مالک مؤطا میں فرماتے ہیں "مونچھ اس قدر کاٹی جائے کہ لب کے کنارے کھل جائیں۔ ایسا نہ کاٹے کہ اپنا مثلہ کرلے۔ ابن عبد الحکم نے امام مالک کے ایک قول کی روایت کی ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں "مونچھ کاٹی جائے گی، داڑھی بڑھائی جائے گی، کاٹنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منڈوایا جائے۔ میرے خیال میں جو شخص مونچھیں منڈوائے اس کی سرزنش کی جانی چاہیے" ابن قاسم امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ مونچھ جڑ سے کاٹنا اور منڈوانا دونوں میرے نزدیک مثلہ کرنا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں "مونچھ جڑ سے کاٹنے کا جو ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ اتنی کاٹی جائے کہ مونچھ کے بالوں اور لب کا حد فاصل نمایاں ہوجائے۔ مونچھوں کے بال اوپر سے کاٹنا مکروہ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں "پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مونچھوں کو منڈوانا بدعت ہے۔ میرے خیال میں ایسا کرنے والے کو اذیت ناک سزا دی جانی چاہیے" فرماتے ہیں "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی تکلیف دہ بات آتی تو پھنکارتے، پھر مونچھیں بٹتے ہوئے اپنا پیر چادر میں ڈال لیتے۔ عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "مونچھیں کاٹنے کے باب میں سنت یہ ہے کہ اتنی کاٹی جائیں کہ مونچھوں کے بال اور لب کے درمیان کا فاصلہ نمایاں ہوجائے" طحاوی فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں امام شافعی سے کوئی منصوص چیز مجھے نہیں ملی۔ آپ کے جن اصحاب کو دیکھا مزنی اور ربیع دونوں اپنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹتے تھے۔ یہ بات انھوں نے شافعی سے ہی اخذ کی ہوگی۔ فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ، زفر، ابو یوسف اور محمد کے نزدیک سر کے بال اور مونچھوں کو چھوٹا کرنے کے بمقابل جڑ سے کاٹ دینا افضل تھا۔ مونچھیں منڈانے کے باب میں ابن خویز منداد مالکی، شافعی کا مذہب وہی بتاتے ہیں جو ابو حنیفہ کا ہے۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ امام احمد کے بارے میں اثرم فرماتے ہیں "میں نے امام احمد کو دیکھا کہ مونچھ کے بال کاٹ رہے ہیں۔ آپ سے جب مونچھیں کاٹنے کے باب میں سنت دریافت کی گئی تو فرمایا "جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "احفوا الشوارب" مونچھوں کو جڑ سے کاٹو، یہ جڑ سے کاٹی جائیں گی۔ حنبل فرماتے ہیں کہ ابو عبد اللہ (امام احمد) سے پوچھا گیا کہ کیا خیال ہے آدمی اپنی مونچھیں کترے یا جڑ سے کاٹے یا کیا کرے؟ فرمایا اگر جڑ سے کاٹتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں اور کترتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ابو محمد بن قدامہ مقدسی المغنی میں رقمطراز ہیں کہ اختیار ہے چاہے جڑ سے کاٹے یا صرف تراشے۔ طحاوی فرماتے ہیں "مغیرہ بن شعبہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسواک[4] پر رکھ کر اپنی مونچھ کا کچھ حصہ تراشا" ایسی صورت میں جڑ سے کاٹنے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اور وہ وہی ہے جو بڑھ کر لبوں پر پھیل جاتا ہے۔ مونچھوں کو منڈانا نہیں جیسا کہ بعض حضرات اختیار کرتے ہیں۔

[1] مسلم (۲۶۰) فی الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ، اس میں "قصوا" (کاٹو) کے بجائے "جزوا" (کاٹو) ہے۔

[2] بخاری ۱۰/۲۹۵، ۲۹۶ فی اللباس: باب تقلیم الاظافر و إعفاء اللحی، الفاظ بخاری کے ہیں، مسلم (۲۵۴) و (۲۵۹) فی الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ، ترمذی (۲۷۶۴) فی الادب: باب إعفاء اللحی، نسائی ۱/۱۲۹ فی الطہارۃ: باب احفاء الشارب و فی الزینۃ: باب احفاء الشارب، و إعفاء اللحی، مسند احمد ۲/۱۶ و ۵۲، حدیث عبد اللہ بن عمر۔

[3] مسلم (۲۵۸) فی الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ، ترمذی (۲۷۵۹) فی الادب: باب ماجاء فی التوقیت فی تقلیم الاظافر و قص الشارب، نسائی ۱/۱۵، ۱۶ فی الطہارۃ: باب التوقیت فی قص الشارب، ابوداؤد (۴۲۰۰) فی الترجل: باب فی اخذ الشارب۔

[4] شرح معانی الآثار للطحاوی ۴/۲۳۰، مسند احمد ۴/۲۵۲ و ۲۵۵، ابوداؤد (۱۸۸) فی الطہارۃ: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کا کوئی امکان نہیں، جو لوگ جڑ سے کاٹنے کے حق میں ہیں وہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیثوں سے استدلال پیش کرتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث یہ ہے کہ دس باتیں فطرت ہیں، ان میں ایک مونچھ کترنے کا ذکر کیا[۱]۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے کہ فطرت کی باتیں پانچ ہیں[۲]، ان میں ایک انھوں نے مونچھیں کترنے کا ذکر فرمایا۔

جو لوگ مونچھیں جڑ سے کاٹنے کے قائل ہیں ان کا استدلال ان حدیثوں سے ہے جن میں اس کا حکم ہے، یہ سب حدیثیں صحیح ہیں، نیز ابن عباس کی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مونچھیں کاٹ دیتے تھے[۳]۔ طحاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں گو دونوں صورتوں کا احتمال ہے۔ مگر اغلب جڑ سے کاٹنے کی بات ہے۔ علاء بن عبدالرحمن اپنے والد سے وہ ابو ہریرہ سے مرفوعًا آپ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں چھوڑ دو[۴]" فرماتے ہیں اس حدیث سے بھی احفاء شوارب (مونچھوں کے استیصال) کا احتمال ہے۔ انھوں نے اپنی سند سے تذکرہ کیا ہے کہ ابو سعید، ابو اسید، رافع بن خدیج، سہل بن سعد، عبداللہ بن عمر، جابر اور ابو ہریرہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سب مونچھیں جڑ سے کٹواتے تھے۔ ابراہیم بن محمد بن حاطب فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمر کو دیکھا کہ اس طرح جڑ سے مونچھیں کاٹتے تھے۔ جیسے انھیں نوچ لیا ہو۔ بعض روایتوں کے مطابق حتّٰی کہ چمڑے کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔ طحاوی فرماتے ہیں چونکہ مونچھوں کا قصر کرنا سب کے نزدیک مسنون ہے لہٰذا سر پر قیاس کرتے ہوئے اس کا منڈوانا افضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منڈوانے والوں کو تین بار اور قصر کرنے والوں کو ایک بار دعا دی[۵] ہے۔ چنانچہ قصر کے بمقابل سر کو منڈوانا افضل قرار پایا بنا بریں مونچھوں کو منڈوانا بھی افضل ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) باب من ترك الوضوء مما مست النار، سند صحیح ہے۔ حدیث کا پورا متن درج ذیل ہے۔ مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے فرماتے ہیں "میں ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوا۔ آپ نے ایک دست بھوننے کا حکم دیا چنانچہ بھونا گیا۔ آپ چھری لے کر اس میں سے کاٹ کاٹ کر مجھے دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ اتنے میں بلال نے آکر صلوٰۃ کی اطلاع دی آپ نے چھری پھینک دی اور فرمایا "اس کے ہاتھ خاک آلود ہوں، کیا ہو گیا ہے اسے" مغیرہ کہتے ہیں کہ میری مونچھیں بڑھ گئی تھیں، چنانچہ ایک مسواک پر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تراشا، یا یہ فرمایا کہ میں ایک مسواک پر رکھ کر اسے کتر دوں گا۔

۱۔ مسلم (۲۶۱) فی الطهارة : باب خصال الفطرة، ترمذی (۲۷۵۸) فی الادب : باب ماجاء فی تقليم الاظافر، ابوداؤد (۵۳) فی الطهارة : باب السواك من الفطرة، نسائی ۸/۱۲۷ و ۱۲۸، فی الزينة : باب من السنن الفطرة، ابن ماجہ (۲۹۳) فی الطهارة : باب الفطرة۔ اسی طرح کی روایت احمد نے بھی کی ہے۔ ان کے یہاں پورے الفاظ یہ ہیں "دس باتیں فطرت کی ہیں، مونچھ کترنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغل کے بال اکھیڑنا، زیر ناف بال مونڈنا، پانی سے استنجا کرنا، زکریا کہتے ہیں کہ مصعب نے فرمایا دسویں بات بھول رہا ہوں، غالبًا کلی کرنا ہے۔

۲۔ بخاری ۲/۲۸۲، فی اللباس : باب قص الشارب و باب تقليم الاظافر وفی الاستئذان : باب الختان بعد الكبر ونتف الابط، مسلم (۲۵۷) فی الطهارة : باب خصال الفطرة، ترمذی (۲۷۵۷) فی الادب : باب ماجاء فی تقليم الاظافر، ابوداؤد (۴۱۹۸) فی الترجل : باب فی اخذ الشارب، نسائی ۸/۱۲۸، فی الزينة : باب من السنن الفطرة، ابن ماجہ (۲۹۲) فی الطهارة : باب الفطرة۔

۳۔ طحاوی ۴/۲۳۰، ترمذی (۲۷۶۱) فی الادب : باب ماجاء فی قص الشارب، الفاظ یہ ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مونچھوں کا کچھ حصہ کترتے یا تراشتے تھے۔ ابراہیم خلیل الرحمٰن اس خدمت پر مامور تھے" یہ سماک کی حدیث ہے جسے انھوں نے عکرمہ سے انھوں نے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ سے سماک کی روایت میں اضطراب ہے۔

۴۔ مسلم (۲۶۰) فی الطهارة : باب خصال الفطرة، یہ حدیث اوپر آچکی ہے۔

۵۔ بخاری ۳/۴۴۶، ۴۴۷، فی الحج : باب الحلق والتقصير عند الاحلال، مسلم (۱۳۰۲) فی الحج : باب تفضيل الحلق علی التقصير، حدیث ابو ہریرہ، مسلم (۱۳۰۳) نے اس کی تخریج ام حصین کی روایت سے بھی کی ہے۔

گفتگو، خاموشی، ہنسنے اور رونے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے شیریں بیان تھے۔ مافی الضمیر کی ادائیگی انتہائی سرعت سے فرماتے۔ کلام میں بے حد حلاوت اور شیرینی پائی جاتی۔ اندازِ گفتگو انتہائی مؤثر، دلنشیں اور قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا، حتیٰ کہ دشمن نے بھی اس کی گواہی دی۔ گفتگو اتنی واضح اور کھلی ہوئی کہ آدمی ایک ایک فقرہ محفوظ کرلے۔ اتنی تیز نہیں کہ محفوظ نہ کی جاسکے نہ اتنی بے جوڑ کہ اثنائے کلام جگہ جگہ سکتہ واضح ہو جائے۔ غرض آپ کا طریقۂ ادا اور اسلوبِ بیان انتہائی کامل تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جیسے تم لوگ کرتے ہو ویسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اتنی واضح، اتنی روشن اور اتنی دوٹوک کہ حاضرینِ مجلس اسے محفوظ کرلیتے[1]۔ عموماً ایک بات کو تین بار دہراتے کہ ذہن نشین ہو جائے۔ سلام کرتے تو تین بار، اکثر چپ رہتے۔ بلا ضرورت کلام نہ فرماتے۔ کلام کا آغاز اور خاتمہ سب کشادہ دلی سے کرتے، لایعنی اور ناقص کلام سے اجتناب فرماتے، بات وہی کرتے جس سے ثواب کی امید ہو، کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس کا اثر چہرے سے عیاں ہوتا۔ بدخلقی، سخت کلامی اور شور و غل کا نام و نشان بھی آپ کی گفتگو میں نہ ہوتا۔ ہنسی بس مسکراہٹ کی حد تک تھی۔ بہت زیادہ ہنسے تو باچھیں کھل گئیں۔

ہنسنا بھی انہی چیزوں پر ہوجن پر عام طور پر لوگ ہنس دیتے ہیں، اظہارِ تعجب بھی فرماتے تو انہی باتوں پر جو نادرالوقوع اور تعجب خیز ہوتیں۔

ہنسی کے متعدد اسباب ہیں۔ ایک تو وہی جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ دوسرا خوشی اور مسرت کے موقعہ پر ہنسنا چنانچہ لائق مسرت چیز دیکھ یا محسوس کر کے آدمی ہنس پڑتا ہے۔ تیسرا غیظ و غضب سے ہنسنا، آدمی جب انتہائی غضبناک ہوتا ہے تو زیادہ تر ہنس پڑتا ہے، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تعجب ہوتا ہے کہ اسے غصہ کیوں آیا، نیز مدمقابل پر پورے قبضہ وقدرت کا اسے یقین ہوتا ہے۔ گاہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہوتا ہے فریق مخالف کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ غیظ و غضب کے موقعہ پر ہنس پڑتا ہے۔

رونا بھی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ دھاڑیں مار کر یا آہیں بھر کر نہ روتے۔ جس طرح ہنسنا قہقہہ کی حد تک نہ ہوتا اسی طرح یہ رونا بھی حد سے باہر نہ تھا۔ بس آنکھیں اشکبار ہو جاتیں بہہ پڑتیں اور سینے سے گریہ کی آواز سنائی دیتی۔ آپ کا رونا کبھی میت کے لیے ہوتا، کبھی خشیتِ الٰہی سے کبھی قرآن سن کر۔ کبھی اس لیے کہ امت پر کوئی آفت نہ آجائے۔ یہ گریہ، گریۂ شوق، گریۂ محبت اور گریۂ احترام ہوتا جس میں خوف و خشیت کی ملی جلی کیفیت ہوتی۔ آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کی وفات ہوئی تو آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یہ اشک ریزی برینائے رحمت تھی۔ اس موقعہ پر ارشاد فرمایا "آنکھوں میں اشک آئے، دل پر غم طاری ہوا، ہم وہی کہیں گے جو ہمارے پروردگار کی خوشی کا موجب ہو، ابراہیم ہم تمہارے فراق پر بے حد غمگین ہیں[2]"۔

---

[1] ترمذی فی الجامع (۳۶۴۳) وفی الشمائل (۲۲۳) سند حسن ہے۔ بخاری ۶/۴۲۳ اور مسلم (۲۴۹۳) نے اس کی تخریج مختصر طور پر یوں کی ہے۔ "تمہاری طرح آپ گفتگو نہیں فرماتے تھے"۔ اسماعیلی نے آگے مزید اضافہ فرمایا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو دوٹوک اور آسان ہوتی کہ سمجھ میں آجاتی"۔

[2] بخاری ۳/۱۳۹، ۱۴۰ فی الجنائز: باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بک لمحزونون، مسلم ۲۳۱۵، فی الفضائل: باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال، ابوداؤد ۳۱۲۶ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک دفعہ آپ اپنی کسی صاحبزادی کو عالم نزع میں دیکھ کر روئے اور ایک بار اس وقت رقت طاری ہوئی جب ابن مسعود سورۂ نساء کی تلاوت کرتے ہوئے ذیل کی آیت پر پہنچے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا[1] (۴۱)

پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت میں سے ایک شہید بلائیں گے اور تجھ کو ان کا شہید بنا کر لائیں گے۔

ایک دفعہ عثمان بن مظعون کی وفات پر روئے۔ ایک بار سورج گرہن پڑا، آپ نے صلوٰۃ الکسوف پڑھی اور صلوٰۃ میں روتے اور سسکتے جاتے دعا میں یہ الفاظ فرمائے۔

رَبِّ أَلَمْ تَعِدْنِي أَلَّا تُعَذِّبَهُمْ وَأَنَا فِيهِمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ وَنَحْنُ نَسْتَغْفِرُكَ[2]

پروردگار! کیا مجھ سے تو نے وعدہ نہیں کیا ہے کہ میری موجودگی میں انھیں عذاب نہ دے گا جب تک مغفرت طلب کرتے رہیں گے سو ہم تری مغفرت کے برابر طلب گار ہیں۔

اپنی صاحبزادی کی قبر کے پاس بیٹھے تو رو پڑے[3]، شب کی صلوٰۃ میں اکثر رویا کرتے تھے۔

گریہ و بکا کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ گریۂ رحمت، گریۂ رقت
۲۔ گریۂ خوف، گریۂ خشیت
۳۔ گریۂ محبت، گریۂ شوق
۴۔ گریۂ فرحت، گریۂ مسرت
۵۔ گریۂ بے صبری، گریۂ بے ثباتی
۶۔ گریۂ حزن

گریۂ حزن اور گریۂ خوف میں فرق یہ ہے کہ ماضی میں جو مصیبت آچکی ہے یا جو محبوب شئی رخصت ہو چکی ہے اس پر رونا گریۂ حزن اور مستقبل میں آنے والے مصائب پر رونا دھونا گریۂ خوف ہے، گریۂ مسرت اور گریۂ حزن میں فرق یہ ہے کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے قلب پر فرحت کا اثر، مگر غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں اور دل غم سے بھر جاتا ہے۔ چنانچہ جو شئی باعث مسرت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی الجنائز : باب فی البکاء علی المیت، مسند احمد ۳/۱۹۴، حدیث انس۔

[1] بخاری ۸/۱۸۸، ۱۸۹ و ۹/۸۱، مسلم (۸۰۰) روایت عبداللہ بن مسعود۔ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "مجھے پڑھ کر سناؤ" میں نے کہا قرآن آپ پر اترا ہے اور پڑھ کر میں سناؤں" فرمایا "ہاں" پڑھ کر سناؤ" چنانچہ میں نے سورۂ نساء کی تلاوت کی اور جب اس آیت پر پہنچا "فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید وجئنا بك علی هؤلاء شهیدا" تو فرمایا "بس" دیکھا تو آپ کی آنکھیں اشک ریز تھیں۔

[2] ابوداؤد (۱۱۹۴) فی الصلوٰۃ : باب من قال یرکع رکعتین، نسائی ۳/۱۳۷، ۱۳۸، فی صلوٰۃ الکسوف، مسند احمد ۲/۱۵۹ و ۱۸۸، ترمذی فی الشمائل ۲/۳۱، حدیث عبداللہ بن عمرو۔ سند صحیح ہے۔ کیونکہ عطاء بن سائب ہی سے شعبہ نے بھی مسند احمد کی دوسری حدیث میں روایت کی ہے۔

[3] بخاری ۳/۱۶۷، فی الجنائز : باب من یدخل قبر المرأۃ۔ روایت انس سے ہے۔ فرماتے ہیں "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صاحبزادی کے جنازہ میں شریک تھے آپ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دیکھا کہ آپ کی آنکھیں اشکبار ہیں" کہتے ہیں کہ فرمایا "کیا تم میں کوئی ہے جس نے آج شب بیوی سے صحبت نہ کی ہو" ابوطلحہ نے کہا "ہاں میں نے"۔ فرمایا "قبر میں اترو" کہتے ہیں کہ وہ قبر میں اترے۔ اس حدیث کی رو سے میت کی تدفین میں خواہ عورت ہی کی کیوں نہ ہو اسی شخص کو ترجیح دی جائیگی جو لذت اندوزیوں سے دور ہو۔

ہوتی ہے اسے آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس بات سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ مگر باعثِ غم کو آنکھوں کی گرمی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی آنکھیں اس سے گرم کرے۔

۷۔ گریۂ ضعف و نقاہت۔

۸۔ گریۂ نفاق (مگرمچھ کے آنسو) اس میں آنکھیں اشکبار مگر دل بدستور سخت ہوتا ہے، رونے والا بظاہر کیفیتِ خشوع کا اظہار کرتا ہے مگر باطن انتہائی سنگ دل ہوتا ہے۔

۹۔ گریۂ مستعار۔ اجرت پر رونا مثلاً نوحہ کرنے والی خواتین جو اجرت پر روتی ہیں، ایسے ہی رونے پر عمر بن الخطاب نے فرمایا۔ وہ اپنا اشک بیچتی ہیں اور دوسروں کا غم روتی ہیں۔

۱۰۔ گریۂ موافقت۔ لوگوں کو روتے دیکھ کر رو دینا۔ خواہ سبب معلوم ہو یا نہ ہو محض روتے دیکھ کر رونا گریۂ موافقت کہلاتا ہے۔ بغیر آواز کے بکی (مقصور) اور بہ آواز آنسو بہانا بکاء (ممدود) آنسو بہانا۔ کہا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

بَكَتْ عَيْنِي وَحُقَّ لَهَا بُكَاهَا وَمَا يُغْنِي الْبُكَاءُ وَلَا الْعَوِيلُ[1]

آنکھ اشک ریز ہوئی اور حق بھی ہے کہ بغیر آواز اشک ریز ہو جاتے۔ بہ آواز اشک ریزی اور چیخ و پکار سے کیا حاصل؟

بہ تکلف رونے کو تباکی کہتے ہیں۔ یہ رونا محمود اور مذموم دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ محمود وہ ہے جو ریا و نمود کے لیے نہیں رقت و خشیتِ الٰہی طاری کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے، مذموم وہ ہے جو مخلوق کی خاطر اختیار کی جاتی ہے معرکۂ بدر میں جو مسلمان کفارِ مکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کو روتے دیکھ کر عمر بن الخطاب نے فرمایا "رسول اللہ! بتائیں کس بات پر رو رہے ہیں اگر رو سکوں تو میں بھی روؤں ورنہ آپ دونوں کو دیکھ کر رونی صورت ہی بناؤں۔"[2]

بتاکیت کہنے پر آپ نے عمر کے خلاف کوئی نکیر نہ فرمائی۔ بعض سلف کا قول ہے کہ خشیتِ الٰہی سے روؤ۔ رونہ سکو تو رونی صورت ہی بنالو۔[3]

خطابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ

آپ نے زمین پر کھڑے ہو کر بھی خطبہ دیا ہے منبر پر بھی۔ اونٹ پر سوار ہو کر بھی اور ناقہ پر بھی۔ جب خطبہ دیتے تو آنکھیں سُرخ اور آواز بلند ہو جاتی، انتہائی غضبناک ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی فوج سے خطرہ کا الارم دے رہے ہوں، فرماتے "صبّحکم و مسّاکم" (غنیم بس صبح یا شام آیا چاہتا ہے) نیز بیچ اور شہادت کی انگلیوں کو باہم قریب لا کر اشارہ کرتے ہوئے فرماتے "بُعِثْتُ انا والساعۃ کہاتین" میری بعثت اور قیامت ان دونوں کی طرح قریب قریب

۱۔ شعر حسان بن ثابت یا عبداللہ بن رواحہ یا کعب بن مالک کا ہے۔ دیکھیے السیرۃ ۲/۱۶۲، الکامل ۱۸۹، المقتضب ۴/۲۹۲، شرح شواہد الشافیہ ۴/۶۶ اور مجالس ثعلب ۱۰۹۔

۲۔ صحیح مسلم (۱۷۶۳) جہاد کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں۔ باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر۔

۳۔ روایت مرفوعاً آئی ہے مگر ضعیف ہے، کیونکہ ابن ماجہ (۱۳۳۷) نے گو اسے سعد بن وقاص سے مرفوعاً روایت کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔ "یہ قرآن غم کی بات لے کر اترا ہے، پڑھو تو روؤ، رونہ سکو تو رونی صورت بنالو" مگر سند میں ابو رافع اسماعیل بن رافع ضعیف ہیں۔

ہیں۔ فرماتے:

أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ[1]

امابعد! سب سے عمدہ حدیث کتاب اللہ ہے اور سب سے عمدہ سنت سنتِ محمدی ہے اور سب سے برے کام بدعات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

جو خطبہ بھی ارشاد فرماتے اس کا آغاز حمدالٰہی سے فرماتے۔ باقی اکثر فقہاء کا یہ قول ہے کہ آپ خطبۂ استسقاء کی ابتدا استغفار سے اور عیدین کا خطبہ تکبیر سے شروع فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت سے قطعاً نہیں ہوتی۔ آپ کی سنت برعکس ہے۔ تمام خطبوں کی ابتدا آپ نے ہمیشہ الحمدللہ سے فرمائی ہے۔ حنابلہ کے تین اقوال میں سے ایک یہ بھی ہے یہی ہمارے شیخ قدس اللہ سرہ کا مذہب مختار بھی ہے۔

خطبہ آپ کھڑے ہو کر دیا کرتے تھے۔ عطاء وغیرہ کی مرسل حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ جب منبر پر پہنچتے تو اپنا رخ لوگوں کی جانب فرمالیتے پھر کہتے "السلام علیکم" شعبی فرماتے ہیں ابوبکر اور عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

خطبہ کا خاتمہ استغفار پر ہوتا۔ زیادہ تر قرآن سے خطبہ دیا کرتے۔ صحیح مسلم میں ام ہشام بنت حارثہ سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں "(ق۔ والقرآن المجید)" میں نے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر سیکھا ہے۔ ہر جمعہ کو جب منبر پر کھڑے ہو کر آپ خطبہ دیتے تو یہی سورۃ تلاوت فرماتے[3] ابوداؤد نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد پڑھتے تو آپ کے الفاظ حسب ذیل ہوتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا، مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَإِنَّهُ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا[4]

---

[1] مسلم (۸۶۷) فی الجمعة: باب تخفیف الصلوٰة والخطبة، نسائی ۳/۱۸۸، ۱۸۹، فی صلوٰة العیدین: باب کیف الخطبة، ابن ماجہ (۴۵) فی المقدمة: باب اجتناب البدع والجدل۔ حدیث جابر بن عبداللہ۔

[2] حدیث صحیح ہے۔ عبدالرزاق (۵۲۸۱) نے اس کی تخریج کی ہے۔ ابن جریج عن عطاء کی سند سے، انھوں نے (۵۲۸۱) اور ابن ابی شیبہ ۳۳۹ نے بھی ابواسامہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے مجالد شعبی سے بیان کرتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی جانب اپنا رخ کر لیتے اور فرماتے "السلام علیکم" کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر اور عمر بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ابن ماجہ (۱۱۰۹) نے یہ روایت جابر سے کی ہے۔ مگر سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہیں۔ اس باب میں طبرانی نے "الاوسط" میں ایک روایت پیش کی ہے۔ ہیثمی مجمع الزوائد ۲/۱۸۴ میں فرماتے ہیں کہ ان کی سند میں عیسیٰ بن عبداللہ انصاری ضعیف ہیں۔ بیہقی نے ۳/۲۰۴، ۲۰۵ میں جابر و عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس باب میں ابن عباس اور ابن زبیر سے بھی روایتیں موجود ہیں، نیز عمر بن عبدالعزیز سے بھی ایک روایت آئی ہے۔

[3] مسلم (۸۷۳) فی الجمعة: باب تخفیف الصلوٰة والخطبة، ابوداؤد (۱۱۰۰) و (۱۱۰۲) فی الصلوٰة: باب الرجل یخطب علی قوس، نسائی ۲/۱۵۷، فی افتتاح الصلوٰة: باب القرأة فی الصبح ب (ق)۔

[4] ابوداؤد (۱۰۹۷) فی الصلوٰة: باب الرجل یخطب علی قوس، وفی النکاح: باب فی خطبة النکاح سند میں ابوعیاض مدنی مجہول ہیں۔ مگر حدیث ایک دوسری سند اور مختلف الفاظ سے جو ابن مسعود کے بیان کردہ ہیں صحت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کیونکہ عبدالرزاق نے "المصنف" ۱۰۴۴۹ میں، احمد نے ۴۱۱۶ و ۳۷۲۱ میں، نسائی نے ۶/۸۹ میں، ترمذی نے ۱۱۰۵ میں، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حمد و سپاس اللہ کے لیے ہے، ہم اس سے نصرت اور مغفرت کے طالب ہیں، ہم اپنے نفس کی بدیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اللہ جسے ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، جسے گمراہ کردے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں، میں گواہ ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندہ اور رسول ہیں، انھیں حق دے کر بشیر و نذیر بنا کر قیامت کے روبرو بھیجا، جو اللہ اور اس کے رسول کا تابع فرمان ہوگا وہ راہ یاب ہوگا اور جو ان کی نافرمانی کرے گا وہ خود کو نقصان پہنچائے گا، اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔

ابوداؤد نے یونس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ابن شہاب سے پوچھا کہ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا تشہد پڑھتے تھے۔ اس پر انھوں نے مذکورہ نوعیت ہی کا تشہد بتایا۔ صرف "ومن یعصہما فانہ الخ" کے بجائے "ومن یعصہما فقد غوی" کے الفاظ نقل کیے[1]

ابن شہاب فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے تو یہ فرماتے۔ كُلُّ مَا هُوَ آتٍ قَرِيبٌ، لَا بُعْدَ لِمَا هُوَ آتٍ وَلَا يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِعَجَلَةِ أَحَدٍ وَلَا يُخِفُّ لِأَمْرِ النَّاسِ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا مَا شَاءَ النَّاسُ، يُرِيدُ اللّٰهُ شَيْئًا وَيُرِيدُ النَّاسُ شَيْئًا مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَلَوْ كَرِهَ النَّاسُ وَلَا مُبْعِدَ لِمَا قَرَّبَ اللّٰهُ وَلَا مُقَرِّبَ لِمَا بَعَّدَ اللّٰهُ وَلَا يَكُونُ شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ[2]

جو بھی آنے والی شئی ہے قریب ہے، آنے والی شئی کچھ دور نہیں اللہ تعالیٰ کسی کی عجلت طلبی پر ہرگز جلدی نہیں کرتا اور نہ لوگوں کے معاملہ میں نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ جو چاہے نہ کہ لوگ جو چاہیں۔ اللہ کا ارادہ اور ہے بندوں کا کچھ اور، اللہ جو چاہے وہ ہوتا ہے خواہ لوگوں کو برا معلوم ہو۔ اللہ جسے قریب لائے اسے دور کرنے والا کوئی نہیں اور جسے دور کرے اسے قریب لانے والا کوئی نہیں جو شئے بھی وجود میں آتی ہے اللہ کے اذن سے وجود میں آتی ہے۔

آپ کے خطبے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کے اوصاف و کمالات کا بیان انعامات و احسانات کا تذکرہ، اسلام کی بنیادی تعلیم، جنت و جہنم اور معاد کی تشریح، اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید، مقامات غضب الٰہی اور مقامات رضائے الٰہی کی تفصیل پر مبنی ہوتے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ابن ماجہ نے (۱۸۹۲) میں، طحاوی نے مشکل الآثار ۱/۴ میں، بیہقی نے السنن ۳/۲۱۴ میں کئی سندوں سے، ابو اسحٰق سے، انھوں نے ابی الاحوص۔ عوف بن مالک بن نضلہ سے، انھوں نے ابن مسعود سے روایت کی ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حاجت اس طرح سکھایا ہے:" ان الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا من یھد اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ" پھر حسب ذیل تینوں آیات پڑھتے۔ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ) (اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ان اللہ کان علیکم رقیبا) (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا) اس کی سند قوی ہے۔ ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ پہلی ضعیف حدیث میں ایک منکر جملہ ہے۔ اور وہ یہ ہے "ومن یعصہما" اس طرح کی ترکیب سے بطریق صحیح روایت آپ نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خطبہ دیتے ہوئے کہا "من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیسے خراب خطیب تم ہو، یوں کہو" ومن یعص اللہ ورسولہ" صحیح مسلم (۸۷۰) فی الجمعۃ، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ۔

[1] ابوداؤد (۱۰۹۸) فی الصلوٰۃ: باب الرجل یخطب علی قوس، سند کے تمام رجال ثقہ ہیں مگر حدیث مرسل ہے۔ لہٰذا قابل استدلال نہیں۔

[2] مراسیل میں ابوداؤد نے اس کی روایت ابن شہاب سے مرسلاً کی ہے۔ حدیث منقطع ہے۔ زرقانی نے شرح المواہب اللدنیہ ۷/۴۴۷ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

آپ اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے۔
يَآيُّهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ لَنْ تُطِيقُوا۔ أَوْلَنْ تَفْعَلُوا كُلَّ مَا أُمِرْتُمْ بِهِ وَلٰكِنْ سَدِّدُوا وَأَبْشِرُوا[1]
لوگو! جن باتوں کا تمھیں حکم دیا گیا ہے ان تمام کی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے۔ یا یہ فرمایا کہ وہ تمام باتیں تم انجام نہیں دے سکتے لہٰذا میانہ روی اختیار کرو اور خوش رہو۔

آپ جو خطبہ بھی دیتے اس میں مخاطبین کی ضروریات اور ان کے مصالح کو مدنظر رکھ کر ہی باتیں فرماتے ہر خطبہ کا آغاز اللہ کی حمد سے ہوتا۔ اس میں دونوں کلمۂ شہادت پڑھتے اور اپنا تذکرہ اسم علم سے فرماتے۔

آپ کا یہ فرمانا ثابت ہے "كُلُّ خُطْبَةٍ لَيْسَ فِيهَا تَشَهُّدٌ فَهِيَ كَالْيَدِ الْجَذْمَاءِ[2]" (جس خطبہ میں کلمۂ شہادت نہ ہو وہ کٹے ہاتھ کی طرح ہے۔)

آپ کا کوئی سارجنٹ نہ تھا جو حجرہ سے باہر آگے آگے چلتا رہا ہو۔ نہ ہی جیسا آج کے خطیب لباس پہنتے ہیں ویسا لباس آپ پہنتے تھے، نہ ہی عبا، نہ ہی کشادہ گریبان جبہ۔

منبر آپ کا تین زینوں کا تھا۔ جب لوگوں کے روبرو ہو کر اس پر بیٹھ جاتے تو مؤذن فقط اذان دیتا۔ اس سے پہلے اور بعد میں آپ کچھ نہ فرماتے۔ جب خطبہ شروع ہو جاتا تو کوئی بھی آواز بلند نہ کرتا۔ نہ مؤذن نہ غیر مؤذن۔

خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے تو ایک عصا ہاتھ میں ہوتا جس کا سہارا لے کر منبر پہ خطبہ ارشاد فرماتے۔ ابوداؤد نے ابن شہاب[3] سے ایسی ہی روایت کی ہے۔ آپ کے بعد تینوں خلفاء اسلام بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ کبھی کبھی آپ کسی کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔ تلوار پر ٹیک لگانے کی روایت ثابت نہیں ہے۔ اکثر جاہلوں کا خیال ہے کہ منبر پر آپ کے ہاتھوں میں تلوار بطور اس علامت کے ہوتی کہ دین بزور شمشیر قائم ہوگا۔ یہ دو وجوہ سے قبیح جہالت ہے ایک یہ کہ ثابت ہی ہے کہ آپ نے عصا اور کمان کے علاوہ کسی اور چیز پر ٹیک نہیں لگایا ہے، دوسرے یہ کہ دین کا قیام بذریعہ وحی ہوا ہے، تیغ و تبر کا کام محض اہل شر اور ارباب ضلالت کو مٹانے کے لیے ہے۔ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جس میں آپ خطاب فرمایا کرتے تھے بزور قرآن فتح ہوا نہ کہ بزور شمشیر۔

---

[1] ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جسے ابوداؤد (۱۰۹۶) فی الصلوٰۃ : باب الرجل یخطب علی قوس اور احمد نے مسند ۴/۲۱۲ میں روایت کیا ہے۔ حدیث حکم بن حزن کلفی۔ سند حسن ہے۔

[2] ترمذی (۱۱۰۶) فی النکاح : باب ماجاء فی خطبۃ النکاح، ابوداؤد (۴۸۴۱) فی الادب : باب فی الخطبۃ، مسند احمد ۲/ ۳۰۲ و ۳۴۳۔ سند قوی ہے۔ ترمذی وغیرہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[3] غالباً یہ مراسیل ابوداؤد میں ہے۔ سنن ابوداؤد (۱۰۹۶) میں حکم بن حزن کلفی کی جو روایت ہے وہ یہ ہے۔ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اپنے چھ یا آٹھ ساتھیوں کے ساتھ آیا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہا "رسول اللہ! ہم آپ کے یہاں آئے ہیں، ہمارے لیے دعائے خیر فرمائیں" چنانچہ آپ نے ہم کو یا ہمارے لیے کچھ کھجوریں لانے کا حکم دیا۔ حالت اسی وقت ابتر تھی، ہم مدینہ میں چند ایام رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ میں بھی حاضر ہوئے۔ آپ کسی عصا یا کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے اللہ کی حمد و ثنا چند ہلکے پاکیزہ اور مبارک کلمات میں ادا فرمائی پھر فرمایا" لوگو! جن باتوں کا تمھیں حکم دیا گیا ہے ان تمام باتوں کی تم طاقت نہیں رکھتے یا وہ تمام باتیں تم انجام نہیں دے سکتے۔ لہٰذا بس اپنے عمل درست رکھو اور خوشخبری لو"۔ سند حسن ہے۔ حافظ نے تلخیص میں اسے حسن کہا ہے۔ اس کی ایک شاہد حدیث بھی موجود ہے جو براء ابن عازب سے مروی ہے۔ اور ابوداؤد نے ۱۱۴۵ کے تحت اسے درج کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عید کے دن کمان تھائی گئی، آپ نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ دیا" حافظ کہتے ہیں کہ احمد اور طبرانی نے طویل حدیث ذکر کی ہے اور ابن سکن نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس باب میں عبداللہ بن زبیر سے بھی ایک روایت ہے جس کی تخریج ابوالشیخ نے اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۱۵۵، ۱۵۶ میں کی ہے۔ سلسلۂ روایت میں ابن لہیعہ ضعیف ہیں مگر شواہد کے اعتبار سے حسن ہے۔

اثنا خطبہ کوئی عارضہ پیش آجاتا تو اس میں مشغول ہو جاتے، فارغ ہونے کے بعد پھر خطبے کی جانب رجوع فرماتے۔ ایک دفعہ خطبہ دیتے ہوئے حسن حسین دونوں سرخ قمیص پہنے گرتے پڑتے آگئے۔ سلسلۂ کلام منقطع فرما کر نیچے اترے، ان دونوں کو اٹھایا پھر منبر پر چڑھے اور فرمایا "اللہ عظیم کا ارشاد سچ ہے۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔ (انفال: ۲۸) تمھارے مال، تمھاری اولاد سب فتنہ ہیں۔

میں نے ان دونوں کو اپنے کرتوں میں الجھتے دیکھا تو صبر نہ ہو سکا بات کاٹنی پڑی اور میرے لیے انھیں اٹھائے بغیر چارہ نہ رہا۔"[1]

ایک دفعہ اثنا خطبہ سُلیک آکر بیٹھ گئے۔ فرمایا "سُلیک! اٹھو دو رکعت صلوٰۃ پڑھو۔ دونوں رکعتیں سبک ہوں" پھر منبر پر ہی سے فرمایا "جمعہ کے دن جب کوئی اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعتیں پڑھ لے، دونوں ہلکی ہوں۔"[2]

لوگوں کی ضرورت کے مطابق کبھی خطبہ مختصر کبھی طویل دیتے۔ عارضی خطبہ دائمی خطبہ سے زیادہ طویل ہوتا۔ تہواروں کے موقعوں پر عورتوں کو علیحدہ سے خطاب فرماتے اور انھیں صدقہ اور خیرات کی ترغیب دیتے[3] واللہ اعلم۔

سلہ۔ ترمذی (۳۷۷۶) فی المناقب: باب مناقب الحسن والحسین، ابوداؤد (۱۱۰۹) فی الصلاۃ: باب الامام یقطع الخطبۃ للأمر یحدث، نسائی ۱۰۸/۳، فی الجمعۃ: باب نزول الامام عن المنبر قبل فراغہ من الخطبۃ، ابن ماجہ (۳۶۰۰) فی اللباس: باب لبس الاحمر للرجال۔ سند حسن ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

سلہ۔ بخاری ۳۳۶/۲، ۳۳۷، فی الجمعۃ: باب اذا رأی الامام رجلا جاء وھو یخطب امرہ ان یصلی رکعتین، باب من جاء والامام یخطب صلی رکعتین، وفی التطوع: باب ماجاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ، مسلم (۸۷۵) (۵۹) فی الجمعۃ: باب التحیۃ والامام یخطب، ترمذی (۵۱۰) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی الرکعتین اذا جاء الرجل والامام یخطب، ابوداؤد (۱۱۱۵) و (۱۱۱۶) و (۱۱۱۷) فی الصلوٰۃ: باب اذا دخل الرجل والامام یخطب، نسائی ۱۰۳/۳، فی الجمعۃ: باب الصلاۃ یوم الجمعۃ لمن جاء والامام یخطب، ابن ماجہ (۱۱۱۲) فی اقامۃ الصلوٰۃ: باب ماجاء فیمن دخل المسجد والامام یخطب، حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

سلہ۔ بخاری ۳۸۸/۲، حدیث جابر بن عبداللہ۔ فرماتے ہیں "عید الفطر کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے، صلوٰۃ پڑھی، ابتدا صلوٰۃ سے کی، پھر خطبہ دیا۔ فارغ ہوئے تو منبر سے اتر کر عورتوں کے پاس آئے اور انھیں تذکیر فرمائی۔

عبادات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت طیّبہ

وضو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ہر صلوٰۃ کے لیے وضو کرتے۔ گاہ ایک ہی وضو سے[1] کئی صلوٰتیں ادا فرماتے۔ آپ کبھی ایک مد پانی سے، کبھی دو تہائی مد سے، کبھی اس سے زیادہ سے وضو کرتے تھے۔ دمشقی اوقیہ سے ناپا جائے تو اس کی مقدار تقریبًا چار، تین یا دو اوقیہ ہوتی ہے۔ آپ سب سے کم پانی خرچ کرتے تھے۔ امت کو اس سلسلہ میں اسراف سے بچنے کی تاکید بھی فرماتے تھے۔ آپ نے خبر دی ہے کہ امت میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو وضو کا پانی استعمال کرنے میں حد سے تجاوز کریں گے[2]۔ آپ کا ارشاد ہے: "وضو کا ایک شیطان ہے جسے ولہان کہتے ہیں۔ لہٰذا پانی کے وسوسوں سے[3] بچو۔" سعد کے پاس سے جب کہ وضو کر رہے تھے گذرے تو ان سے فرمایا "پانی میں اسراف نہ کرو"۔ انھوں نے کہا "کیا پانی میں بھی اسراف ہے؟" فرمایا "ہاں۔ خواہ رواں دریا ہی پر بیٹھ کر وضو کیوں نہ کر رہے ہو[4]۔"

صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ نے وضو ایک ایک بار دو دو بار، تین تین بار کیا ہے، بعض اعضاء کو دو بار بعض کو تین بار بھی دھونا ثابت ہے۔

کبھی ایک چلو پانی سے کلی کرتے اور ناک میں پانی چڑھاتے۔ کبھی دو سے کبھی تین سے۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا دونوں بیک وقت ہوتا وہ اس طرح کہ ایک چلو کا آدھا منہ کے لیے اور آدھا ناک کے لیے استعمال فرماتے۔ ایک چلو پانی میں ممکن یہی ہے۔ باقی دو اور تین میں فصل اور وصل دونوں ہو سکتا ہے، مگر سنت وصل ہی کی رہی ہے صحیحین میں عبد اللہ

۱ھ۔ مسلم (۲۷۷) ابوداؤد (۱۷۲) ترمذی (۶۱) نسائی ۱/۸۶۔ حدیث بریدہ بن حصیب۔ فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن تمام صلوٰتیں ایک ہی وضو سے ادا فرمائیں۔ موزوں پر مسح کیا"۔ عمر نے فرمایا "آج آپ نے وہ کام کیا جو کبھی نہیں کیا تھا"۔ فرمایا "عمر! جان بوجھ کر کیا ہے"۔

۲ھ۔ احمد ۴/۸۶-۸۷ و ۵/۵۵، ابوداؤد (۹۶) حدیث عبد اللہ بن مغفل۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب اس وقت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو وضو اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ سند قوی ہے، ابوداؤد (۱۳۵) فی الطھارۃ : باب الوضوء ثلاثا ثلاثا، نسائی ۱/۸۸، فی الطھارۃ : باب الاعتدال فی الوضوء، ابن ماجہ (۴۲۲) فی الطھارۃ : باب ماجاء فی القصد فی الوضوء وکراھیۃ التعدی فیہ اور مسند احمد ۴ ۶۶۸ سب نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے، انھوں نے عمرو بن شعیب سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کا مسئلہ پوچھنے آیا تو آپ نے عملاً تین تین بار کر کے دکھایا، پھر فرمایا، وضو اس طرح کیا جاتا ہے۔ جو اس سے زیادہ کرے گا وہ اچھا نہیں کرے گا اور حد سے تجاوز کرے گا"۔ سند حسن ہے۔ ابوداؤد میں "اَوْنَقَصَ" (یا کم کرے گا) کا لفظ منکر یا شاذ کہا جائے گا کیونکہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہی ہوگا کہ تین بار سے جو کم کرے گا وہ . . . . حالانکہ تین بار سے کم کرنا جائز ہے، خود آپ نے ایسا کیا ہے، اس سلسلہ میں جو احادیث ہیں وہ صحیح ہیں۔ پھر کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنے والا بُرا ہے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔

۳ھ۔ ترمذی (۵۷) فی الطھارۃ : باب ماجاء فی کراھیۃ الاسراف فی الوضوء، ابن ماجہ (۴۲۱) فی الطھارۃ : باب ماجاء فی القصد فی الوضوء وکراھیۃ التعدی فیہ۔ مسند احمد ۵/۱۳۶۔ سند میں خارجہ بن مصعب حافظ کی التقریب کے مطابق متروک ہیں، کاذبین سے ان کی تدلیس ثابت ہے۔

۴ھ۔ ابن ماجہ (۴۲۵) مسند احمد ۲/۲۲۱۔ بوصیری "الزوائد" میں فرماتے ہیں سند ضعیف ہے۔ کیونکہ سلسلۂ روایت میں حی بن عبد اللہ معافری اور ابن لہیعہ آتے ہیں۔

بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی ہاتھ سے کلی بھی کی اور ناک میں پانی بھی چڑھایا۔ ایسا آپ نے تین بار کیا۔ دوسرے الفاظ اس طرح پر آئے ہیں "تین چلو سے کلی کی اور ناک جھاڑی"[1]۔ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے باب میں جتنی احادیث وارد ہیں ان میں مذکورہ بالا روایت صحیح تر ہے۔ کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کے درمیان فصل کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ طلحہ بن مصرف اپنے والد سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کے درمیان فصل کرتے دیکھا ہے۔ مگر یہ روایت طلحہ عن ابیہ عن جدہ آئی ہے اور ان کے دادا کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت ثابت نہیں ہے[2]۔

آپ داہنے ہاتھ سے پانی ناک میں چڑھاتے اور بائیں ہاتھ سے جھاڑتے مسح پورے سر کا فرماتے۔ اور کبھی دونوں ہاتھ آگے لے جاتے پھر پیچھے لے جاتے، جس حدیث کے اندر وارد ہے کہ آپ نے سر کا دو بار مسح کیا اسے مذکورہ صورت پر محمول کریں گے لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ نے سر کا دو بار مسح نہیں کیا ہے بلکہ جب کبھی اعضاء دو بار دھوئے تو سر کا ایک بار مسح کیا۔ صراحت سے یہی ثابت ہے اس کے خلاف آپ سے کوئی اور چیز ثابت نہیں ہے۔ ماسوا جو کچھ ہے یا تو صحیح غیر صریح ہے جیسے صحابی کا یہ قول کہ "آپ نے وضو تین تین بار کیا" یا یہ قول کہ "سر کا دو بار مسح کیا" یا پھر صریح غیر صحیح ہے۔ جیسا کہ ابن بیلمانی کی حدیث میں جسے وہ اپنے والد سے وہ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے وضو کیا اور دونوں ہتھیلیاں تین بار دھوئیں" پھر فرمایا "اور سر کا مسح تین بار کیا"۔

یہ حدیث ناقابل استدلال ہے۔ کیونکہ ابن بیلمانی کے والد کا حال[3] گو اچھا تھا پھر بھی دونوں کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے۔ نیز عثمان کی وہ حدیث جس میں ابو داؤد کی روایت کے مطابق آپ نے تین بار مسح کیا[4] اس کے بارے میں ابو داؤد فرماتے ہیں کہ عثمان کی تمام صحیح حدیثیں ایک بار مسح کرنے کے حق میں ہیں۔ کسی ایک حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے سر کے کچھ حصہ کا مسح کیا ہو۔ البتہ پیشانی کے بالوں پر مسح فرمایا تو تکمیل عمامہ[5] پر کی۔ ابو داؤد کی روایت کے مطابق انس کا یہ بیان کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو فرماتے دیکھا۔ آپ کے سر پر قطری عمامہ[6] تھا۔

چنانچہ عمامہ کے نیچے سے آپ نے ہاتھ داخل کیا اور اگلے سر کا مسح کیا، عمامہ کھولا نہیں۔ تو انس کا مقصود یہ تھا کہ آپ نے عمامہ نہیں کھولا کہ پورے بالوں کا مسح کریں مگر انھوں نے عمامہ پر تکمیل مسح کی نفی نہیں فرمائی، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ کی حدیثوں

---

[1] - بخاری ۱/۲۵۵ و ۲۵۷، مسلم (۲۳۵) فی الطھارۃ : باب وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] - طلحہ ابن مصرف کی حدیث عن ابیہ عن جدہ کی روایت ابو داؤد (۱۳۹) نے کی ہے۔ سند میں لیث بن ابی سلیم ضعیف ہیں۔ مصرف طلحہ کے والد مجہول ہیں۔ دیکھیے "التہذیب" میں مصرف کے والد کعب بن عمرو یامی کے حالات۔

[3] - حدیث دار قطنی ۱/۹۳ کی روایت کردہ ہے۔ سند میں صالح بن عبد الجبار بھی ہیں۔ حافظ زیلعی "نصب الرایہ" ۱/۳۲ میں ابن قطان کی کتاب سے حوالہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صالح بن عبد الجبار صرف اسی حدیث میں نظر آتے ہیں، یہ مجہول الحال ہیں۔ محمد بن عبد الرحمن بیلمانی کے بارے میں ترمذی، بخاری کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ منکر الحدیث ہیں۔

[4] - ابو داؤد (۱۱۰) فی الطھارۃ : باب صفۃ وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سند میں عامر بن شقیق بن حمزہ، حافظ کی "التقریب" کے مطابق لین الحدیث ہیں۔

[5] - صحیح مسلم (۲۷۴) (۸۳) میں مغیرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشانی کے بالوں پر، عمامہ پر اور موزوں پر مسح کیا ہے۔

[6] - ابو داؤد (۱۴۷) فی الطھارۃ : باب المسح علی العمامۃ۔ سند میں معاویہ بن صالح بن حدیر حضرمی گو سچے ہیں مگر ان کے وہم کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں، نیز عبد العزیز بن مسلم مدنی مولی آل رفاعہ کو ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ دیکھیے سابقہ تعلیق۔ "قطریۃ" قاف کو کسرہ کے ساتھ خلاف قیاس، قطر سے آنے والی چادروں کی جانب نسبت ہے، اسی طرح لفظ دُھری دال کو ضمہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

سے یہی ثابت ہے، لہذا انس کا سکوت فرمانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ نے تکمیل مسح کی نفی فرمائی ہے۔
جو وضو بھی آپ نے کیا ہے اس میں کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا آپ سے ثابت ہے۔ یہ ثابت نہیں کہ اس میں کبھی فرق آیا ہے۔
آپ کا وضو اسی طرح مرتب اور مسلسل ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ بھی اس ترتیب میں فرق نہیں آیا۔ مسح کبھی سر پر کرتے، کبھی عمامہ پر اور کبھی پیشانی کے بالوں اور عمامہ دونوں پر محض پیشانی کے بالوں پر مسح ثابت نہیں ہے[1] جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔
پیروں میں جراب اور موزے نہ ہوتے تو دھوتے، اور اگر ہوتے تو مسح کرتے[2] سر کے ساتھ کانوں کے اندرونی اور بیرونی دونوں حصوں کا مسح بھی کرتے۔ ابن عمر[3] کے علاوہ کسی اور کی حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ نے نیا پانی لیا ہو۔ گردن کے مسح کے باب میں بھی کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اسی طرح وضو کے وقت بسم اللہ کے علاوہ آپ کا کچھ اور پڑھنا بھی ثابت نہیں ہے۔ اذکار وضو کے سلسلہ میں ہر حدیث جو آپ کی جانب منسوب کی جاتی ہے وہ جھوٹی اور من گھڑت ہے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اذکار پڑھے نہ امت کو اس کی تعلیم فرمائی۔
آپ سے جو ثابت ہے وہ صرف اتنا ہے کہ شروع[4] میں بسم اللہ پڑھا۔ آخر میں یہ دعا۔

۱۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ فتح الباری ۱/۳۰۴ میں شافعی کی روایت سے عطاء کی حدیث ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور سر سے عمامہ ہٹا کر اگلے حصہ کا مسح کیا" حدیث مرسل ہے مگر ایک اور سند سے موصولاً اسی طرح کی حدیث آئی ہے جسے ابو داؤد (۱۴۷) نے انس سے روایت کی ہے اس کی سند میں ابو معقل غیر معروف ہیں، یہ دونوں مرسل اور موصول حدیثیں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس طرح دونوں کے مجموعہ سے سند قوی ہو جاتا ہے۔ اس بات کے اندر عثمان سے بھی ایک حدیث کیفیت وضو کے سلسلہ میں وارد ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اگلے سر کا مسح کیا۔ اس کی تخریج سعید بن منصور نے کی ہے۔ سند میں خالد بن زید بن ابی مالک مختلف فیہ ہیں۔ عبد اللہ بن عمر سے بھی ثابت ہے کہ آپ نے سر کے کچھ حصہ کا مسح کرنے پر اکتفا فرمایا۔ ابن منذر وغیرہ فرماتے ہیں کہ صحابہ سے اس حقیقت کا انکار ثابت نہیں ہے یہ ابن حزم کی تحقیق ہے۔ ان ساری باتوں سے مذکورہ بالا مرسل حدیث کو طاقت پہنچتی ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ جرابوں پر مسح کرنے کے سلسلہ میں صحیح ثابت حدیثیں وارد ہیں جنھیں شیخ جمال الدین قاسمی نے ایک رسالہ کے اندر جمع فرما کر تخریج کی ہے تخریج میں مزید اضافہ شیخ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ کا ہے۔ اسے دیکھیے۔

۳۔ موطا امام مالک ۱/۳۴، فی الطہارۃ: باب ماجاء فی المسح بالرأس علی الاذنین، سند صحیح ہے۔ یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ فرماتے ہیں کانوں پر مسح کرنے کے لیے نیا پانی لیں گے۔ مگر اکثر اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ دونوں کان سر کا حصہ ہیں، اسی کے ساتھ ان پر بھی مسح کیا جائے گا۔ سعید بن مسیب، عطاء، حسن، ابن سیرین، سعید بن جبیر اور نخعی اسی کے قائل ہیں اور یہی ثوری، ابن مبارک، مالک، اصحاب الرائے، احمد اور اسحاق کا بھی ہے۔

۴۔ ابو داؤد ۱۰۱، احمد ۲/۴۱۸، ابن ماجہ ۳۹۹، دار قطنی ۱/۲۹، حاکم ۱/۱۴۶، اور بیہقی ۱/۴۳ سب نے محمد بن موسیٰ مخزومی کی سند سے، انھوں نے یعقوب سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جس کا وضو نہیں اس کی صلوٰۃ نہیں اور جو بسم اللہ نہ پڑھے اس کا وضو نہیں" یعقوب مجہول الحال ہیں اور ابو سلمہ لیثی لین الحدیث۔ اس حدیث کی تخریج دار قطنی ۱/۲۶ اور بیہقی ۱/۴۴ نے محمود بن محمد ظفری کی سند سے، انھوں نے ایوب بن نجار سے، انھوں نے یحییٰ بن ابی سلمہ بن عبد الرحمٰن سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے ان الفاظ میں کی ہے۔ "جس نے وضو کے وقت بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہ ہوا اور جس کا وضو نہ ہوا اس کی صلوٰۃ نہ ہوئی" حافظ نے "التلخیص" ۱/۷۳ میں کہا ہے کہ محمود قوی نہیں ہیں۔ ایوب بن نجار گو ثقہ ہیں مگر مدلس ہیں۔ انھوں نے عن عن کر کے روایت کی ہے۔ الاوسط میں طبرانی نے علی بن ثابت کی سند سے، انھوں نے محمد بن سیرین سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے مرفوعاً یہ روایت کی ہے۔ "ابو ہریرہ! وضو کرو تو بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھو، تمھارے محافظ فرشتے جب تک وضو باقی رہے گا تمھارے حق میں نیکیاں ہی لکھتے رہیں گے" ہیثمی نے المجمع ۱/۲۲۰ میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ حدیث کے کچھ شواہد احمد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کے یہاں ابو سعید خدری کی۔ ترمذی، ابن ماجہ، احمد اور دار قطنی کے یہاں سعید بن زید کی ابن ماجہ اور طبرانی کے یہاں سہل بن سعد کی روایتوں سے ملتے ہیں جن کے باعث حسن اور قوی قرار پاتی ہے، حافظ "التلخیص" میں فرماتے ہیں "مجموعۂ احادیث سے ایک قوت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی بنیاد ہے۔ حافظ منذری الترغیب ۱/۱۲۸ میں رقمطراز ہیں کہ حسن، اسحق بن راہویہ اور اہل ظاہر وضو میں بسم اللہ کے قائل ہیں حتی کہ عمداً ترک کر دینے کی صورت میں وضو دہرایا جائے گا۔ یہی امام احمد سے بھی مروی ہے اس میں شک

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ [۱]

گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں بس وہی ایک جس کا کوئی شریک نہیں، گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں مجھے اچھی طرح پاک صاف رہنے والوں میں بنادے۔

سنن نسائی میں وضو کے بعد یہ دعا بھی وارد ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ [۲]

پاک ہے تو اے اللہ! حمد ہے تیری، میں گواہی دیتا ہوں کہ جز تیرے کوئی الٰہ نہیں، میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور تیری جانب رجوع کرتا ہوں۔

آپ نے یا کسی صحابی نے وضو کے شروع میں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے نیت کی رفع حدث کی یا صلوٰۃ کو جائز کرنے کی۔ اس سلسلہ میں آپ سے ایک حرف بھی کسی سند صحیح سے ثابت ہے نہ ضعیف سند سے۔ نہ ہی تین بار سے زیادہ کبھی آپ نے اعضا دھوئے ہیں۔ کہنی اور ٹخنے سے اوپر دھونا بھی آپ سے ثابت نہیں ہے۔ مگر ابوہریرہ ایسا کرتے تھے۔ اور اطالۂ غرہ [۳] (چمک بڑھانا) والی حدیث کی تاویل کی جاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت وضو کے سلسلہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ آپ نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کو اتنا دھویا کہ بازوؤں اور پنڈلیوں تک آگئے [۴] محض اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کہنیاں اور ٹخنے وضو میں داخل ہیں، چمک بڑھانے کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

وضو کے بعد آپ کو اعضا سکھانے کی عادت بھی نہ تھی: اس سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نہیں کہ اس سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں گو ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی کلام نہ ہوا ہو مگر پھر بھی کثرت اسناد کے باعث ایک دوسرے کو طاقت پہنچاتی ہیں اور قوت کے درجہ پر پہنچتی ہیں۔

[۱] انہی الفاظ میں ترمذی نے (۵۵) فی الطهارة : باب فيما يقال بعد الوضوء میں ابو ادریس خولانی اور ابو عثمان عن عمر کی سندوں سے اس کی روایت کی ہے۔ اصل حدیث مسلم کے یہاں (۲۳۴) فی الطهارة : باب الذكر المستحب عقب الوضوء میں عقبہ بن عامر کی روایت سے آئی ہے۔ اس میں "اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين" کے الفاظ نہیں ہیں۔ مگر ترمذی کا یہ اضافہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس کی ایک شاہد بھی موجود ہے جس سے اسے قوت پہنچتی ہے۔ حافظ نے "التلخیص" میں بزار کی روایت سے اور طبرانی نے الاوسط میں ثوبان کی سند سے یہ شاہد پیش کی ہے، الفاظ حسب ذیل ہیں "جو وضو کا پانی منگا کر وضو کرے اور وضو سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے: اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله۔ اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين . . ."

[۲] ابن سنی نے اس کی روایت "عمل اليوم والليلة" میں ص ۲۱ میں ابو سعید خدری کی سند سے کی ہے۔ اس میں مسیب بن واضح سئ الحفظ ہیں، ایسے ہی ان سے روایت کرنے والے یوسف بن اسباط بھی سئ الحفظ ہیں۔

[۳] یہ وہ حدیث ہے جس کی روایت بخاری ۱/۲۰۷ و ۲۰۸، فی الوضوء : باب فضل الوضوء والغر المحجلون میں اور مسلم نے (۲۴۶) في الوضوء : باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل میں ابوہریرہ سے کی ہے۔ الفاظ یہ ہیں "وضو کے اثر سے میری امت کا حال یہ ہوگا کہ قیامت کے دن وہ روشن پیشانیوں اور چمکدار دست و پا کے ساتھ آئیں گے۔ پس جو اپنی چمک افزوں کر سکے وہ ایسا ضرور کرے۔" حدیث کا آخری فقرہ ابوہریرہ کا ہے جو اس میں درج ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے۔ جیسا کہ علماء محققین منذری اور ابن حجر وغیرہ کی تحقیق ہے۔

[۴] مسلم (۲۴۶) مصنف نے دو روایتیں ملا دی ہیں۔ پہلی نعیم بن عبداللہ المجمر کی الفاظ یہ ہیں۔ " رايت ابا هريرة يتوضا فغسل وجهه فاسبغ الوضوء ثم غسل يده اليمنى حتى اشرع فى العضد ثم يده اليسرى حتى اشرع فى العضد۔ دوسری روایت بھی نعیم بن عبداللہ المجمر ہی سے ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ انه راى ابا هريرة يتوضا فغسل وجهه ويديه حتى كاد يبلغ المنكبين ثم غسل رجليه حتى رفع الى الساقين۔

ثابت ہے برعکس ہی ثابت ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس سے وضو کے بعد اعضا خشک کرتے تھے۔ نیز معاذ بن جبل کی یہ حدیث کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب وضو کرتے تو اپنے لباس کے کنارے سے چہرہ پونچھتے[1] دونوں ہی ضعیف ہیں، ایسی حدیثیں ناقابلِ استدلال ہیں، پہلی حدیث میں سلیمان بن ارقم متروک، دوسری میں عبدالرحمن زیاد بن انعم افریقی ضعیف ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں اس باب میں کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔

آپ کا یہ دستور نہ تھا کہ ہمیشہ آپ کو کوئی وضو کراتا، وضو کے لیے پانی کبھی خود انڈیل لیتے کبھی بوقتِ ضرورت دوسروں سے مدد بھی لیتے۔ جیسا کہ صحیحین میں بروایت مغیرہ بن شعبہ وارد ہے کہ سفر میں آپ نے وضو کیا تو انھوں نے پانی گرایا۔[2]

آپ کبھی کبھی داڑھی کا خلال کرتے تھے۔ مداومت ثابت نہیں ہے، خلال کے باب میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے چنانچہ صحیح سند سے ترمذی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کا خلال کرتے تھے[3]۔ احمد اور ابوزرعہ فرماتے ہیں خلال کے سلسلہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔

انگلیوں کا خلال بھی اسی طرح آپ پابندی سے نہیں کرتے تھے۔ سنن میں مستورد بن شداد سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب وضو فرماتے تو اپنی چھنگلی سے دونوں پیروں کی انگلیاں رگڑتے۔[4] یہ حدیث ثابت بھی ہو تو بھی آپ ایسا کبھی کبھی کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے اس حدیث کی روایت نہیں کی جنھوں نے آپ کے وضو کو ضبط کرنے کا اہتمام کیا ہے، مثلاً عثمان، علی، عبداللہ بن زید، ربیع وغیرہ بایں ہمہ سند کے اندر عبداللہ بن لہیعہ ضعیف بھی ہے۔

---

[1] ۔ ترمذی (۵۳) و (۵۴)

[2] ۔ بخاری ۱/۲۶۵، فی الوضوء : باب المسح علی الخفین و باب الرجل یوضی صاحبه و باب اذا ادخل رجلیه وهما طاهرتان و فی الصلوٰۃ فی الثیاب : باب الصلوٰۃ فی الجُبّة الشامیه و باب الصلوٰۃ فی الخفاف و فی الجهاد : باب الجُبّة فی السفر و فی المغازی : باب نزول النبی صلی الله علیه وسلم الحجر و فی اللباس : باب من لبس جبة ضیقة الکمین فی السفر و باب جبة الصوف فی الغزو۔ مسلم (۲۷۴) فی الطهارة : باب المسح علی الخفین، موطا ۱/۳۶، فی الطهارة : باب المسح علی الخفین، ترمذی (۹۸) فی الطهارة : باب فی المسح علی الخفین، ابوداؤد ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، فی الطهارة؛ باب المسح علی الخفین، نسائی ۱/۸۳، فی الطهارة : باب المسح علی الخفین فی السفر، ابن ماجه ۳۸۹، فی الطهارة : باب الرجل یستعین علی وضوئه فیصب علیه۔

[3] ۔ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی (۳۱) فی الطهارة : باب ماجاء فی تخلیل اللحیة، ابن ماجه (۴۳۰) فی الطهارة : باب ماجاء فی تخلیل اللحیة، ابن حبان "موارد الظمآن" (۱۵۴)، مستدرک حاکم ۱/۱۴۹، روایت عثمان سے سند میں عامر بن شقیق لین الحدیث ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں، اس کی ایک شاہد انس کی روایت میں ہے جس کی تخریج ابوداؤد (۱۴۵) نے کی ہے، حاکم، ابن عدی اور ذہبی کے یہاں یہ دوسری سندوں سے بھی آئی ہے۔ احمد کے یہاں عائشہ ابن ابی شیبہ کے یہاں ابوامامہ، ترمذی اور ابن ماجہ کے یہاں عمار اور الاوسط میں طبرانی کے یہاں ابن عمر کی حدیثیں اس کی دوسری شواہد ہیں۔ دیکھیے "التلخیص" ۱/۸۵، ۸۶، ۸۷۔

[4] ۔ احمد ۴/۲۲۹، ابوداؤد (۱۴۸)، ترمذی (۴۰)، ابن ماجه (۴۴۶)، اس کی سند میں ان ائمہ کے نزدیک ابن لہیعہ سئی الحفظ ہیں۔ مگر حافظ نے تلخیص میں کہا ہے۔ ابن لہیعہ کے معاون لیث بن سعد اور عمرو بن حارث ہیں، ان کی روایتوں کی تخریج بیہقی، ابوبشر دولابی اور دار قطنی نے غرائب مالک میں ابن وہب کی سند سے کی ہے۔ ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ انگلیوں میں خلال کرنا لقیط بن صبرہ کی اس حدیث سے ثابت ہے جس کی روایت شافعی ۱/۳۰، ۳۱، ابوداؤد ۱۴۲ و ۱۴۳، احمد ۴/۳۳، نسائی ۱/۶۶، ابن ماجہ ۴۰۷، ترمذی ۳۸ نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے "آپ نے فرمایا خوب اچھی طرح وضو کرو، انگلیوں کے درمیان خلال کرو، ناک میں خوب خوب پانی چڑھاؤ مگر صوم کی حالت میں ایسا نہ کرو"۔ ابن حبان ۱۵۹ اور حاکم ۱/۱۴۷، ۱۴۸ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی تائید کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ابن قطان، نووی اور ابن حجر نے بھی اسے صحیح لکھا ہے۔

وضو کے وقت انگوٹھی کو حرکت دینے کے بارے میں ایک ضعیف حدیث وارد ہے جسے معمر بن محمد بن عبید اللہ بن ابی رافع نے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے دادا سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے تو اپنی انگوٹھی کو حرکت دیتے تھے[1] معمر اور ان کے والد دونوں ضعیف ہیں۔ دار قطنی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

موزوں پر مسح کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت

سفر اور حضر میں موزوں پر آپ کا مسح کرنا ثابت ہے۔ وفات تک یہ منسوخ نہیں ہوا۔ میعاد اس کی مقیم کے لیے آپ نے ایک اور مسافر کے لیے تین شب و روز مقرر فرمائی ہے۔ اس ضمن میں حسن و صحیح متعدد حدیثیں وارد ہیں۔ مسح موزوں کے اوپری حصہ پر کرتے تھے۔ نچلے حصہ کے سلسلہ میں ایک منقطع حدیث کے علاوہ اور کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیثیں اس کے برعکس ہیں، آپ نے جرابوں اور جوتوں پر بھی مسح کیا ہے[2]۔ صرف عمامہ پر نیز پیشانی کے ساتھ عمامہ پر مسح کیا ہے بمتعدد احادیث سے آپ کا یہ فعل اور حکم دونوں ثابت ہے۔ مگر کچھ خاص لوگوں کے مسائل میں ہو سکتا ہے یہ حدیثیں ضرورت کے ساتھ خاص ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ موزوں کی طرح یہ بھی عام ہوں، آخری صورت زیادہ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

آپ کے پیر جس حالت میں ہوتے اس کے برخلاف تکلف نہ فرماتے۔ موزے ہوتے تو مسح کر لیا اتارا نہیں، نہ ہوتے تو دھو لیے۔ موزے پہنے نہیں کہ مسح کریں۔ مسح اور دھونے میں افضل کون ہے اس مسئلہ میں سب سے زیادہ موزوں اور معتدل قول وہی ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ ہمارے شیخ کا افادہ ہے۔ واللہ اعلم۔

تیمم کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ

صرف ایک ضرب سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا تیمم فرما لیتے[3]۔ دو ضربوں یا دونوں کہنیوں تک تیمم کرنا ثابت نہیں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں "جو شخص دونوں کہنیوں تک تیمم کا قائل ہے وہ اپنی جانب سے اضافہ کر رہا ہے[4]۔ تیمم ہر اس جگہ سے کر لیتے جہاں صلوٰۃ پڑھ سکتے تھے۔ عام اس سے کہ وہاں مٹی ہو یا زمینِ شور یا ریت ہو۔" آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے "میری امت کے جس فرد کو جہاں صلوٰۃ کا وقت آجائے وہیں اس کی مسجد اور وہیں اس کا وضو ہے[5]۔"

---

[1]۔ ابن ماجہ (۴۴۹) فی الطہارۃ : باب تخلیل الاصابع، بوصیری "الزوائد" میں فرماتے ہیں کہ معمر اور ان کے والد محمد بن عبید اللہ کی وجہ سے اس کی سند ضعیف ہے۔

[2]۔ دیکھیے سنن ترمذی ۱/ ۱۶۷، ۱۶۸، جس پر احمد شاکر نے اپنی تحقیقات قلمبند کی ہیں۔

[3]۔ بخاری ۱/ ۳۷۵، ۳۷۶، مسلم (۳۶۸) (۱۱۲) حدیث عمار بن یاسر۔

[4]۔ دیکھیے نصب الرایہ ۱/ ۱۵۱، ۱۵۴، اور تلخیص الحبیر ۱/ ۱۵۲، ۱۵۳، دونوں میں موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

[5]۔ مسند احمد ۵/ ۲۴۸۔ حدیث ابوامامہ رضی اللہ عنہ، سند صحیح ہے۔ پورے الفاظ یہ ہیں "میرے رب نے انبیاء علیہم السلام پر یا فرمایا: قوموں پر چار باتوں میں مجھے فوقیت دی ہے۔ میری رسالت تمام دنیائے انسانیت کے لیے ہے، تمام زمین میرے لیے اور میری امت کے لیے مسجد اور وضو کی جگہ بنائی گئی ہے، پس جہاں میری امت کے کسی فرد کو صلوٰۃ کا وقت آجائے وہیں اس کی مسجد وہیں اس کا وضو ہے۔ ایک ماہ کی مسافت کے برابر (دوری تک) میرے دشمنوں کے سینوں میں رعب و دبدبہ ڈال کر میری مدد کی گئی، اموال غنیمت ہمارے لیے حلال ہوئے۔

حدیث اس بات کی صریح نص ہے کہ ریت پر جسے صلوٰۃ کا وقت آجائے ریت ہی اس کے لیے وضو ہے آپ اور صحابہ جب تبوک کے سفر پر روانہ ہوئے تو راستہ میں یہی ریت پڑی، ان کے پاس پانی بے حد قلیل تھا۔ کوئی روایت اس طرح کی نہیں ہے کہ اپنے ساتھ مٹی لے گئے تھے۔ یا آپ نے وہاں مٹی پر تیمم کا حکم دیا۔ یا کبھی صحابہ نے مٹی سے تیمم کیا تھا۔ باوجودیکہ ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ صحرا میں مٹی کے بمقابلہ ریت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حال سرزمین حجاز وغیرہ کا بھی ہے۔ اس پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ آپ ریت سے تیمم کرتے رہے۔ واللہ اعلم۔ یہی جمہور کا مسلک بھی ہے۔

کیفیت تیمم کے بارے میں جو یہ مذکور ہے کہ آپ نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے داخلی حصہ کو داہنے ہاتھ کی پشت پر رکھا اور اسے گذارتے ہوئے کہنی تک لے گئے، پھر ہتھیلی کے باطنی حصہ کو ہاتھ کے اندرونی بشرہ پر گھمایا اور بائیں انگوٹھے کو مؤذن کی طرح اتنا کھڑا کیا کہ داہنے انگوٹھے تک پہنچا کر اس پر چپاں کر دیا تو قطعی طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا نہ اس کا حکم دیا، نہ مستحسن خیال فرمایا نہ کسی صحابہ کو اس کی تعلیم فرمائی۔ آپ کا اصل اسوہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ فیصلہ اسی کے ہاتھوں میں ہے۔

اسی طرح ہر صلوٰۃ کے لیے تیمم کرنا یا اس کا حکم دینا بھی ثابت نہیں ہے۔ بلکہ تیمم کو مطلق قرار دے کر اسے آپ نے وضو کے قائم مقام بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم وضو کا ہے وہی تیمم کا بھی ہے۔ صرف وہی مسئلہ مستثنیٰ ہو سکتا ہے جو بمقتضائے دلیل اس کے برعکس ہو۔

صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت مُطہرہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تو "اللہ اکبر" کہتے۔ اس سے پہلے کچھ نہیں کہا۔ نہ ہی نیت الفاظ میں ادا کی، نہ یہ کہا "میں صلوٰۃ پڑھتا ہوں، واسطے اللہ کے، فلاں صلوٰۃ، مُنہ میرا قبلہ کی طرف، چار رکعت امام کے طور پر یا پیچھے اس امام کے"، نہ یہ کہا "ادا کی یا قضا کی یا اس وقت کے فرض کی" یہ دس بدعتیں ہیں۔ جن کا ایک لفظ بھی کسی نے آپ سے ہرگز کسی صحیح سند سے منقول کیا ہے نہ ضعیف سے، نہ مسند سے نہ مرسل سے، بلکہ اس کی روایت کسی نے آپ کے کسی صحابی سے بھی نہیں کی ہے، نہ ہی اسے کسی تابعی نے مستحسن کہا ہے، نہ ہی ائمہ اربعہ نے۔ دھوکہ اصل میں بعض متاخرین کو صلوٰۃ کے بارے میں شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ہوگیا کہ "یہ صوم کی طرح نہیں ہے۔ کوئی شخص اس میں بغیر ذکر کے داخل نہ ہو" ذکر کا مفہوم انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ مصلی الفاظ کے ساتھ نیت کرے، شافعی رحمہ اللہ کی ذکر سے مراد تو تکبیر تحریمہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آخر شافعی رحمہ اللہ ایک ایسے کام کو مستحب کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جسے ایک صلوٰۃ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ ہی آپ کے کسی خلیفہ یا صحابی نے کیا ہو۔ یہ ان کے اسوے اور سیرتیں موجود ہیں۔ اگر کوئی

لہ۔ (ابوداؤد (۳۳۲) و (۳۳۳)، ترمذی (۱۲۴)، نسائی ۱/۱۷۱، اور احمد ۵/۱۴۶ و ۱۴۷ و ۱۵۵ و ۱۸۰) کی حدیث کے مطابق یہ روایت ابوذر کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "پاک مٹی مسلم کا وضو ہے۔ خواہ دس سال پانی نہ ملے، پانی مل جائے تو استعمال کرے" ابن حبان (۱۹۶) اور حاکم ۱/۱۷۶، ۱۷۷ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی موافق ہیں۔ بزار کے یہاں اس کی ایک شاہد حدیث ہے جو ابوہریرہ سے مروی ہے، اس کی سند قوی ہے۔

اس سلسلہ میں ان سے ایک حرف بھی نہیں دکھا دے تو ہم اسے قبول کرلیں گے۔ اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ ان کے اسوہ سے کامل تر کوئی اسوہ نہیں ہے۔ سنت وہی ہے جسے ان بزرگوں نے صاحب شرع صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہے۔

تکبیر تحریمہ میں ہمیشہ دستور یہ تھا کہ صرف "اللہ اکبر" کہتے اس کے علاوہ کچھ نہیں، آپ سے اس کے سوا کسی نے کچھ نقل نہیں کیا ہے۔

تکبیر تحریمہ کے ساتھ، دونوں ہاتھوں کو کھلی انگلیوں کے ساتھ، قبلہ رخ کرکے دونوں کانوں کی لو تک بعض روایتوں کے مطابق مونڈھوں تک بلند فرماتے۔ چنانچہ ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی فرماتے ہیں کہ آپ دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے مقابل میں لے جاتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اپنے کانوں کے سامنے اور برابر کہتے ہیں اپنے کانوں کے قریب لے جاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس میں آدمی کو اختیار ہے جو چاہے کرے، ایک قول یہ ہے کہ ہاتھ کا بالائی حصہ کانوں کی لو تک اور ہتھیلیاں مونڈھوں تک ہوتی تھیں۔ یہ صورت مان لی جائے تو کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ ہاتھوں کو اٹھانے کی جگہ کا جہاں تک تعلق ہے اس تکبیر تحریمہ کے موقعہ پر رفع الیدین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

پھر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ لیتے

افتتاح کبھی اس دعا سے فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰھُمَّ اغْسِلْنِیْ مِنْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ[1]

اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان وہی بُعد پیدا کردے جو تو نے مشرق و مغرب کے درمیان کیا ہے۔ اے اللہ! مجھ کو میری خطاؤں سے پانی، برف اور اولے سے دھودے، اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے اسی طرح صاف وشفاف فرما جس طرح میل کچیل سے دھل کر سفید کپڑا صاف وشفاف ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دعا پڑھتے۔

وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِکُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُکَ، ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ جَمِیْعًا۔ اِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ وَاھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّیَٔ الْاَخْلَاقِ، لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ، لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ بِیَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ، اَنَا بِکَ وَاِلَیْکَ تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ، اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ[2]

---

[1] بخاری ۲/۱۸۸، ۱۹۱، مسلم (۵۹۸)، (۱۴۷)، ابوداؤد (۷۸۱)، نسائی ۲/۱۲۹، حدیث ابوہریرہ فرماتے ہیں "قرأت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے" میں نے پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماں باپ آپ پر قربان، تکبیر اور قرأت کے درمیان سکوت فرمایا کیا پڑھتے ہیں اس میں؟ جواب میں مذکورہ دعا کا ذکر فرمایا۔

[2] مسلم (۷۷۱) فی صلوٰۃ المسافرین: باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل وقیامہ، ابوداؤد (۷۶۰) فی الصلوٰۃ: باب ما یستفتح بہ الصلوٰۃ من الدعاء، احمد: ۷۲۹، ابن حبان: ۴۴۵، نسائی ۲/۱۳۰، فی الافتتاح: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں نے اپنا رُخ اس ذات کی جانب کرلیا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، یکسو ہو کر، تابع ہو کر، میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں، میری صلوٰۃ، قربانیاں، زندگی اور موت سب اللہ کے لیے ہے، تمام جہانوں کا پروردگار اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم ہے، سب سے پہلے تابعداری قبول کرنے والا میں ہوں، اے اللہ! تو مقتدر ہے تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو میرا پروردگار میں تیرا بندہ، میں نے خود پر ظلم کیا، مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ پس تو میرے لیے میرے تمام گناہوں کو بخش دے، گناہوں کو بخشنے والا تو ہی ہے، مجھے بہترین اخلاق کی رہنمائی فرما، بہترین اخلاق کی رہنمائی تو ہی کرسکتا ہے، مجھے برے اخلاق سے دور رکھ، برے اخلاق سے دور تو ہی کرسکتا ہے، حاضر ہوں اور تیری توفیق کا خواہاں، بھلائی تمام تیرے ہاتھوں ہے، بدی کا تیرے یہاں گذر نہیں، میں تیرے سہارے ہوں، تیری جانب مجھے جانا ہے، تو مبارک، تو بلند، میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور تیری جانب رجوع کرتا ہوں۔

مگر ثابت یہ ہے کہ یہ افتتاحی دعا آپ شب کی صلوٰۃ میں پڑھتے تھے[1]

کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[2]

اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے پوشیدہ اور کھلے کو جاننے والے، بندوں کے درمیان تو ان کے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے، مختلف فیہ امر میں حق کی مجھے اپنے اذن سے رہنمائی فرما۔ تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی رہنمائی فرماتا ہے۔

کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، أَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ . . . .[3]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) باب الذکر والدعاء بعد التکبیرۃ، حدیث علی رضی اللہ عنہ۔ حدیث میں "والشر لیس الیک" کا مفہوم یہ ہے کہ شر سے تیرا تقرب حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شر تیرے یہاں نہیں جاسکتا، تیرے یہاں گذر بس طیب ہی یعنی خیر ہی کا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تیری جانب شر کی نسبت تنہا بطور تعظیم کے نہیں کی جاسکتی . . . ورنہ درحقیقت اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی خیر و شر دونوں کے خالق ہیں۔ لہٰذا شر ان کی بعض مخلوقات میں ہے نہ کہ اس کی تخلیق اور فعل کے اندر۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ ظلم سے منزہ ہے، اور ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ کسی شئے کو بے موقع رکھ دیا جائے لہٰذا تمام اشیاء کو ان کے محل و موقع پر رکھ دیا جائے تو یہی خیر کل ہے اور شر یہ ہے کہ کسی شئے کو بے موقع رکھ دیا جائے۔ اگر اسے اس کے محل پر رکھ دیا جائے تو شر نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شر کی نسبت اس کی جانب نہیں ہے، دیکھیے "شفاء العلیل"، مولفہ ابن قیم الجوزیہ، حدیث کے دوسرے فقرہ "أنا اول المسلمین" کا مفہوم تعمیل مامورات میں سرعت کا ہے، اس فقرہ کی نذیر یہ آیت ہے "قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِيْنَ"، نیز حضرت موسیٰ کا قول "وأنا اول المؤمنین" لہٰذا اولیت اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔

[1] فرض صلوات میں بھی پڑھتے تھے۔ صحیح ابن خزیمہ ۱/۳۰۷ وغیرہ سے ثابت ہے کہ آپ فرض صلوات کے لیے کھڑے ہوتے تو پڑھتے .... سند صحیح ہے۔

[2] مسلم (۷۷۰) فی صلوٰۃ المسافرین : باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[3] بخاری ۳/۳، ۴ فی التہجد، مسلم (۷۶۹) فی صلوٰۃ المسافرین۔ ابن عباس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شب کی صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تو فرماتے "اللهم لك الحمد، انت نور السموٰت والارض، ولك الحمد انت قيّام السموٰت والارض ولك الحمد انت رب السموٰت والارض ومن فيهن، انت الحق، ووعدك الحق وقولك الحق، ولقاؤك حق والجنة حق، والنار حق والساعة حق، اللهم لك اسلمت وبك آمنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفرلي ماقدمت وما اخرت واسررت واعلنت، انت الٰهي لا اله الا انت"۔

اے اللہ! تیری ہی حمد وسپاس، تو آسمانوں، زمین اور جو مخلوقات ان کے اندر ہیں ان کا نور ہے . . . . .
اس کی بعض صحیح سندوں کے اندر آیا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے۔ آپ نے تکبیر بلند کی، پھر یہ دعا پڑھی۔
کبھی آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ۔[1]

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، بے حد حمد وسپاس اللہ کی، بے حد حمد وسپاس اللہ کی، بے حد حمد وسپاس اللہ کی، پاکی اللہ کی صبح وشام، پاکی اللہ کی صبح وشام، پاکی اللہ کی صبح وشام، اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں مردود شیطان کے کھٹکے سے، اس کے پھونک مارنے سے، اس کے وسوسہ سے۔

کبھی اللہ اکبر دس بار، پھر سبحان اللہ دس بار، پھر الحمد للہ دس بار، پھر لا الٰہ الا اللہ دس بار، پھر استغفراللہ دس بار کہتے، پھر اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ (اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھے ہدایت فرما، مجھے روزی دے، مجھے عافیت دے) دس بار پڑھتے، پھر اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضِيْقِ الْمَقَامِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[2] (اے اللہ! میں قیامت کے روز تنگیٔ مقام سے تیری پناہ مانگتا ہوں) دس بار۔

مذکورہ تمام دعائیں آپ سے ثابت ہیں۔
یہ بھی مروی ہے کہ آپ اس دعا سے افتتاح فرماتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ۔

پاک ہے اے اللہ تو اور تیری تعریف ہے، تیرا نام مبارک، تیرا رتبہ بلند، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اس دعا کا اہل سنن نے تذکرہ کیا ہے، روایت علی بن علی رفاعی نے ابو متوکل ناجی سے اور انھوں نے ابو سعید سے کی ہے۔ بایں ہمہ گاہ انھوں نے اسے مرسل بھی کر دیا ہے۔ ایسی ہی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی وارد ہے[3] مگر اس

---

[1]۔ احمد ۸۰/۴ و ۸۵، ابوداؤد (۷۶۴)، ابن ماجہ (۸۰۷) سند میں عاصم بن عمیر عنزی کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے، ان سے دو راویوں نے روایت کی ہے، ان کی اس حدیث کو ابن حبان (۴۴۳) اور حاکم ۲۳۵/۱ نے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔ احمد ۵۰/۳، ابوداؤد (۷۷۵) اور ترمذی (۲۴۲) نے ابو سعید خدری کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شب میں صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔ "سبحانك اللهم بحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك، پھر تین بار لا اله الا الله، پھر تین بار الله اكبر كبيرا، اس کے بعد اعوذ بالله من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه، پھر قرآت فرماتے"۔ اس کی سند حسن ہے۔ مسلم (۶۰۱) اور ابو عوانہ نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ پڑھ رہے تھے کہ جماعت میں سے ایک شخص نے پڑھا" الله اكبر كبيرا والحمد لله كثيرا وسبحان الله بكرة واصيلا" تو آپ نے پوچھا۔ ایسا ایسا کہنے والا کون ہے؟ اس شخص نے کہا "میں یا رسول اللہ" فرمایا "حیرت ہے مجھے اس کلمہ پر، اس کیلیے آسمان کے دروازے کھل گئے۔

[2]۔ حدیث صحیح ہے۔ ابوداؤد (۷۶۶) فی الصلوٰۃ: باب مایستفتح بہ الصلوٰۃ، ابن ماجہ (۱۳۵۶) فی الاقامۃ: باب ماجاء فی الدعاء اذا قام الرجل من اللیل، نسائی ۲۰۹/۳، فی صلوٰۃ اللیل: باب ذکر مایستفتح بہ القیام، مسند احمد ۱۴۳/۶، اور طبرانی اوسط ۲/۶۲ میں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[3]۔ احمد ۵۰/۳، ترمذی (۲۴۲) فی الصلوٰۃ: باب مایقول عند افتتاح الصلوٰۃ، ابوداؤد (۷۷۵) فی الصلوٰۃ: باب من رأی الاستفتاح بسبحانک اللھم وبحمدک، نسائی ۱۳۲/۲، فی الصلوٰۃ: باب نوع (بقیہ اگلے صفحہ پر

سے پیشتر جو احادیث گذر چکی ہیں وہ زیادہ ثابت ہیں۔ مگر بروایت صحیح ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عمر بن الخطاب باآواز بلند اسی دعا سے صلوٰۃ کا افتتاح فرماتے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے [۱]

امام احمد فرماتے ہیں میرا مسلک وہی ہے جو حضرت عمر سے مروی ہے مگر کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور کوئی افتتاحی دعا پڑھے تو بھی بہتر ہے۔

امام احمد نے یہ مسلک دس وجوہ کی بنیاد پر اختیار کیا ہے، جسکی تفصیل ہم دوسری جگہوں پر کر چکے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ عمر نے یہ دعا باآواز بلند پڑھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی۔

دوسری یہ کہ یہ دعا قرآن کے بعد افضل ترین کلام پر مشتمل ہے کیونکہ قرآن کے بعد سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر ہی افضل کلام ہے۔ یہ دعائے افتتاح تکبیر تحریمہ سمیت انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔

تیسری یہ کہ اس دعا میں خاص کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے جب کہ دوسری دعاؤں میں صرف دعا کا پہلو ہے۔ ثناء الٰہی دعا کے بمقابلہ افضل ہے، یہی وجہ ہے کہ سورہ اخلاص کو ثلث قرآن کا رتبہ حاصل ہوا۔ اس لیے کہ اس کے اندر خالصۃً اللہ تبارک وتعالیٰ کا وصف اور اس کی ثنا ہے۔ بنابریں سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر قرآن کے بعد افضل کلام قرار پایا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا جن افتتاحی کلمات پر مشتمل ہے وہ دیگر افتتاحی کلمات کے بمقابلہ افضل ہیں۔

چوتھی یہ کہ دیگر افتتاحی دعائیں عام طور پر شب کی نفل صلوٰتوں میں پڑھی جاتی ہیں، مگر اس دعا کو فرض صلوٰتوں کے اندر عمر خود پڑھتے تھے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

پانچویں یہ کہ اس دعائے افتتاح کے اندر ثنائے رب تعالیٰ کا انشائی مفہوم ہے، جس کے اندر اللہ کے اوصاف کمال وجلال کی خبر پوشیدہ ہے مگر "وجہت وجھی" جیسی دعاؤں میں بندوں کی عبودیت کی خبر دی گئی ہے، خبر و انشا کے درمیان جو فرق ہے وہی فرق ان دونوں دعاؤں کے اندر بھی ہے۔

چھٹی یہ کہ "وجہت وجھی" جیسی دعاؤں سے جو شخص افتتاح کرتا ہے وہ انھیں مکمل نہیں پڑھتا بلکہ حدیث کا ایک ٹکڑا لے لیتا ہے باقی کو چھوڑ دیتا ہے، اس کے برعکس "سبحانك اللهم وبحمدك" شروع سے آخر تک پڑھنے والے پڑھتے ہیں۔

افتتاحی دعا کے بعد آپ "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پڑھتے، پھر سورۂ فاتحہ، گاہ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) آخر من الذكر بين افتتاح الصلوٰة، ابن ماجہ (۸۰۴) في الاقامة : باب افتتاح الصلوٰة، تمام ائمہ کے یہاں راوی ابو سعید خدری ہیں، سند حسن ہے، ترمذی نے (۲۴۳) في الصلوٰة : باب مايقول عند افتتاح الصلوٰة، ابوداؤد (۷۷۶) في الصلوٰة : باب من رأى الاستفتاح بسبحانك اللهم، ابن ماجہ (۸۰۶) في الاقامة : باب افتتاح الصلوٰة، دارقطنی ۱/ ۱۱۲ اور حاکم نے ۱/ ۲۳۵ میں اس حدیث کو عائشہ سے روایت کیا ہے۔ سند کے رجال صحیح ہیں لہذا حدیث صحیح ہے۔

[۱] مسلم (۳۹۹) (۵۲) بسند عبدہ۔ عمر باآواز بلند ان کلمات کو ادا فرماتے "سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك" عبدہ کا حضرت عمر سے سماع ثابت نہیں ہے، انھوں نے آپ کے صاحبزادے عبد اللہ سے البتہ سنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عمر کو صرف ایک بار دیکھا ہے "شرح معانی الآثار" ۱/ ۱۱۱ میں طحاوی نے اس کی روایت حکم سے انھوں نے عمرو بن میمون سے کرتے ہوئے کہا ہے کہ عمر نے ذوالحلیفہ میں ہمیں صلوٰۃ پڑھائی۔ چنانچہ اللہ اکبر کے بعد یہ دعا پڑھی "سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك" اس کے رجال ثقہ ہیں۔

باآواز بلند مگر اکثر آہستہ پڑھتے تھے[1] بلاشبہ شب و روز کی پنجگانہ صلوات میں آپ ہمیشہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ باآواز بلند نہیں پڑھتے تھے، خواہ سفر کی حالت رہی ہو یا حضر کی، مگر یہ تو ممکن بھی نہیں کہ آپ ہمیشہ شب و روز سفر و حضر کی پنج وقتہ صلوات میں بسم اللہ باآواز بلند کہتے رہے ہوں اور یہ بات خلفاء راشدین، صحابہ اور خیر القرون میں اہل مدینہ پر پوشیدہ رہے — یہ بالکل امر محال ہے جسے ثابت کرنے کے لیے مجمل الفاظ اور کمزور احادیث کا سہارا لینا پڑا ہے۔ ان احادیث میں بھی جو صحیح ہیں وہ غیر صریح ہیں اور جو صریح ہیں وہ غیر صحیح ہیں، اس پر ہم لکھنا چاہیں تو ایک ضخیم کتاب کی تالیف درکار ہوگی۔

آپ کی قرأت مد کے ساتھ ہوتی تھی، ہر آیت پر آپ ٹھہرتے تھے۔ اور آواز کو کھینچتے تھے[2] سورہ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو کر جہری قرأتوں میں "آمین" باآواز بلند کہتے تھے، پیچھے لوگ بھی آمین کہتے تھے[3]

آپ دو سکتے فرماتے تھے۔ ایک سکتہ تکبیر اور قرأت کے درمیان۔ اس کے بارے میں ابوہریرہ نے آپ سے دریافت فرمایا تھا۔ دوسرے سکتہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق سورہ فاتحہ کے بعد اور ایک روایت کے مطابق قرأۃ کے بعد رکوع سے پہلے، ایک روایت یہ ہے کہ پہلے سکتہ کے علاوہ دو اور سکتے فرماتے تھے، اس طرح تین سکتوں کے تین مقامات ہو گئے۔ مگر بظاہر دو ہی تھے، تیسرا نہایت باریک دم لینے کے لیے ہوتا تھا، قرأت کے معًا بعد آپ رکوع میں نہیں جاتے تھے، برعکس ازیں سکتہ اولیٰ اس قدر ہوتا کہ آپ دعائے افتتاح سے فارغ

---

[1] آپ سے یہی ثابت ہے کہ باآواز بلند نہیں پڑھتے تھے۔ بخاری ۱۸۸/۲، فی صفة الصلوٰة : باب مایقول بعد التکبیر میں انس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما صلوٰۃ کا افتتاح الحمد للہ رب العلمین سے کرتے تھے۔ ترمذی نے اس کی تخریج (۲۴۶) میں کی ہے مگر ان کے یہاں "صلوٰۃ" کی جگہ قرأۃ کا لفظ ہے۔ نیز عمر کے بعد عثمان کا بھی ذکر ہے۔ مسلم (۳۹۹) نے فی الصلاۃ : باب حجة من قال لایجهر بالبسملة میں یہ الفاظ پیش کیے ہیں "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ صلوٰۃ پڑھی مگر کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے نہیں سنا۔ احمد ۲۶۴/۳، طحاوی ۱۱۹/۱، اور دارقطنی ۱۱۹ نے اس حدیث کی روایت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ صحابہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم باآواز بلند نہیں پڑھتے تھے اور ابن حبان نے اسے اپنی صحیح کے اندر روایت کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ "الحمد للہ رب العلمین" باآواز بلند پڑھتے تھے۔ نسائی ۱۳۵/۲، اور ابن حبان کے الفاظ یہ ہیں "میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے نہیں سنا" مسند ابویعلیٰ موصلی کے الفاظ یہ ہیں "جہری صلوات میں الحمد للہ رب العالمین کی قرأۃ سے آغاز کرتے تھے"، معجم طبرانی، حلیہ ابی نعیم، صحیح ابن خزیمہ (۴۹۸) اور شرح معانی الآثار للطحاوی میں آیا ہے کہ صحابہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آہستہ پڑھتے تھے۔ زیلعی نے نصب الرایہ ۳۲۷/۱ میں ان روایات کے تمام رجال کو ثقہ قرار دیا ہے، صحیح میں ان کی سندوں سے بکثرت تخریجات ہیں۔

[2] بخاری نے ۷۹/۹، فی فضائل القرآن : باب مد القرأۃ میں قتادہ سے روایت پیش کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ انس سے پوچھا گیا "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کیسی تھی؟ تو فرمایا کھینچ کر ہوتی تھی، پھر انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سنایا" بسم اللہ کو کھینچ کر، الرحمٰن کو کھینچ کر اور الرحیم کو کھینچ کر، انھیں کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ خوب کھینچ کر پڑھتے تھے۔ احمد ۳۰۲/۶، ابوداؤد (۴۰۰۱) اور ترمذی (۲۹۲۸) نے ام سلمہ سے روایت کی ہے، فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العلمین، الرحمٰن الرحیم، مالك یوم الدین کی قرأت اس طرح تھی کہ ایک ایک آیت کاٹ کر پڑھتے تھے۔ دارقطنی اور حاکم ۲۳۲/۱ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، ذہبی موافق ہیں، دانی نے المکتفیٰ ۵/۲ میں اس کی روایت کرتے ہوئے کہا ہے "اس حدیث کی اور بہت سی سندیں ہیں، یہی اس باب میں اصل ہے" آگے لکھتے ہیں : ائمہ سلف اور قراء سابقین کی ایک جماعت آیات کو گو باہم مربوط ہوں مگر کاٹ کاٹ کر پڑھنا مستحب سمجھتی تھی۔

[3] ابوداؤد (۹۳۲) نے وائل بن حجر کی روایت پیش کی ہے، فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "ولا الضآلین" پڑھتے تو باآواز بلند آمین کہتے تھے، ترمذی نے اس کی روایت (۲۴۸) میں کی ہے، سند صحیح ہے، حافظ نے تلخیص ص ۹۰ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے دارقطنی اور ابن حبان کی جانب بھی منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۴۶۲) نے ابوہریرہ کی روایت سے سعید بن مسیب اور ابوسلمہ کی حدیث پیش کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں : "ام القرآن کی قرأت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوتے تو آواز بلند فرماتے ہوئے آمین کہتے"، دارقطنی نے سنن ۱۲۷/۱ میں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

ہو جاتے، سکتۂ ثانیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقتدیوں کی قرأۃ کے لیے ہوتا تھا، بنا بریں یہ سکتہ اتنا لمبا ہونا چاہیے کہ سورہ فاتحہ پڑھی جا سکے، تیسرا سکتہ محض آرام اور دم لینے کے لیے ہوتا ہے، یہ چونکہ انتہائی ہلکا ہوتا ہے اس لیے جس نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اس نے محض اس کے مختصر ہونے کے باعث ذکر نہیں کیا ہے، مگر جس نے اسے محسوب کر لیا ہے اس نے ایک تیسرا سکتہ بھی مانا ہے، لہٰذا دونوں روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس حدیث پر جو تبصرے کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح یہی ہے۔ دونوں سکتوں کی حدیث سمرہ، ابی بن کعب اور عمران بن حصین کی روایتوں سے ثابت ہے۔ ابو حاتم نے صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ سمرہ جندب کے صاحبزادے ہیں، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دو سکتوں کی حدیث روایت کرنے والوں میں ایک سمرہ بن جندب بھی ہیں۔ اور وہ یہ فرما چکے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سکتے یاد ہیں، ایک اس وقت جب تکبیر تحریمہ کہتے اور ایک جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی قرأت سے فارغ ہوتے۔ حدیث کی بعض سندوں میں آیا ہے کہ جب قرأت سے آپ فارغ ہوتے تو سکتہ فرماتے۔ یہ مجمل بیان ہے، پہلا بیان توضیحی ہے، چنانچہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن فرماتے ہیں۔ امام کے دو سکتے ہیں، لہٰذا جب وہ صلوٰۃ کا افتتاح کرے اور "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہے تو ان دونوں کے درمیان سورۂ فاتحہ کی قرأت غنیمت سمجھو۔ بایں ہمہ دونوں سکتوں کے محل کی تعیین قتادہ کی تفسیر ہے کیونکہ حدیث کی روایت انھوں نے حسن سے، انھوں نے سمرہ سے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: دو سکتے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہیں، عمران نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہمیں ایک یاد ہے۔ چنانچہ ہم نے مدینہ میں ابی بن کعب کو لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ سمرہ نے یاد رکھا ہے، سعید فرماتے ہیں: پھر ہم نے قتادہ سے پوچھا کہ یہ دونوں سکتے کیسے ہیں؟ تو فرمایا صلوٰۃ میں داخلہ کے وقت اور قرأت سے فارغ ہو کر، اور پھر کہا جب "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہے۔ فرماتے ہیں کہ قرأت سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو یہ پسند تھا کہ دم لینے کے لیے سکوت اختیار فرمائیں[2] جو لوگ حسن از سمرہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ سے فارغ ہوتے تو دوسری سورۃ پڑھتے جو گاہ طویل ہوتی گاہ سفر وغیرہ کی وجہ سے مختصر مگر عام طور پر متوسط درجہ کی ہوا کرتی تھی۔

آپ فجر کی صلوٰۃ میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔ اس میں آپ نے سورہ "ق"، سورہ روم[3]، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، اِذَا زُلْزِلَتْ دونوں رکعتوں میں پڑھی ہے۔ معوذتین بھی پڑھی ہے۔ ایک سفر میں فجر کی صلوٰۃ میں سورہ مومنون

۱۔ احمد ۵/۷، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ابوداؤد (۷۷۹)، ترمذی (۲۵۱) ابن ماجہ (۸۴۴)، حسن سے انھوں نے سمرہ بن جندب اور عمران بن حصین سے۔۔۔ حسن کا نہ سمرہ سے سماع ثابت ہے نہ عمران سے، لہٰذا یہ منقطع ہے، ابوداؤد نے (۷۷۸) بطریق اشعث، انھوں نے حسن سے انھوں نے سمرہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو سکتہ فرماتے تھے۔ جب افتتاح فرماتے اور تمام قرأت سے فارغ ہوتے، ترمذی کہتے ہیں یہی ایک سے زیادہ اہل علم کا قول ہے وہ افتتاح صلاۃ اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام کے لیے سکتہ کرنا مستحب سمجھتے ہیں، یہی قول امام احمد، اسحاق اور ہمارے اصحاب کا ہے۔

۲۔ ترمذی (۲۵۱) کی تخریج کردہ ہے، یہ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے منقطع ہے۔

۳۔ امام احمد ۳/۴۷۲ اور نسائی ۲/۱۵۶ نے ایک صحابی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی صلوٰۃ پڑھائی اور اس میں سورہ روم پڑھی، آپ کو کچھ وہم ہو گیا، سلام پھیرا تو فرمایا: ہم پر قرآن مشتبہ ہو گیا ہے۔ کچھ حضرات ہمارے ساتھ صلوٰۃ ادا کرتے ہیں مگر وضو اچھی طرح نہیں کرتے، لہٰذا ہمارے ساتھ جو شخص صلوٰۃ میں شریک ہو اسے چاہیے کہ وضو اچھی طرح کرلے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ سورہ روم کی آخری آیات کی تفسیر میں اس حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ عمدہ سند اور عمدہ متن ہے۔ اس میں عجیب و غریب راز اور انوکھی خبر ہے۔ وہ یہ کہ مقتدیوں کی کمی وضو سے آپ متاثر ہوئے، معلوم ہوا کہ ان کی صلوٰۃ کا امام کی صلوٰۃ سے تعلق ہے۔

شروع کی اور جب پہلی رکعت میں موسیٰ اور ہارون کا ذکر آیا تو آپ کو کھانسی آگئی اور آپ رکوع میں چلے گئے۔

جمعہ کے دن فجر کی صلوٰۃ میں المرتنزیل السجدہ، سورۃ ھل اتی علی الانسان دونوں مکمل پڑھتے تھے۔ آج بہتیرے حضرات دونوں رکعتوں میں کچھ اس سورہ سے کچھ اس سورہ سے، یا دونوں میں سورہ سجدہ پڑھتے ہیں آپ ایسا نہیں کرتے تھے۔ یہ سنت کے خلاف ہے، جاہلوں کا ایک جم غفیر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ سورہ سجدہ کے باعث جمعہ کے دن کو فضیلت حاصل ہے مگر یہ عظیم جہالت ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے سورۃ سجدہ کو پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے تاکہ اس طرح کے عقیدہ کی جڑ کٹ جائے۔ یہ دونوں سورتیں (الم سجدہ اور سورہ دھر) پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں مبدا ومعاد تخلیق آدم اور دخول جنت وجہنم کا ذکر ہے، اور یہ وہ واقعات وحوادث ہیں جو جمعہ کو پیش آچکے ہیں یا پیش آئیں گے۔ چنانچہ آپ جمعہ کے دن فجر کی صلوٰۃ میں انھیں حوادث پر مشتمل سورتیں پڑھتے تھے جو اس دن پیش آچکے ہیں یا پیش آئیں گے تاکہ امت کے ذہنوں میں اس دن پیش آنے والے حوادث کی یاد تازہ ہو جائے۔ اسی طرح آپ بڑے بڑے مجمعوں مثلاً عید اور جمعہ میں سورہ "ق"، واقتربت الساعۃ، سبح اسم ربك الاعلی اور سورہ غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔

دیگر صلوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأتیں

ظہر کی صلوٰۃ میں آپ کی قرأت کبھی کبھی اتنی طویل ہو جاتی کہ ابو سعید کا بیان ہے ظہر کی صلوٰۃ شروع ہوتی، کوئی شخص بقیع جاتا ضرورت پوری کرتا پھر گھر آکر وضو کرتا تو اسے پہلی رکعت مل جاتی کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے طویل پڑھتے تھے۔ اس کی روایت مسلم نے کی ہے[1]۔ اس صلوٰۃ میں آپ کبھی بقدر المرتنزیل پڑھتے کبھی سبح اسم ربك الاعلی[2] اور واللیل اذا یغشی اور کبھی والسماء ذات البروج اور والسماء والطارق پڑھتے تھے۔

عصر کی صلوٰۃ میں آپ کی قرأت، ظہر کی طویل صلوٰۃ کی آدھی اور اس کی مختصر قرأت کے برابر ہوتی تھی۔

مغرب کی صلوٰۃ میں آپ کی سنت آج کل کے معمول کے خلاف تھی۔ چنانچہ اس کی دونوں رکعتوں میں آپ نے کبھی سورہ اعراف، کبھی الطور اور کبھی المرسلات پڑھی ہے۔

ابو عمر بن عبد البر فرماتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مغرب کی صلوٰۃ میں کبھی المص، کبھی الصافات کبھی حم الدخان کبھی سبح اسم ربك الاعلی[3] کبھی والتین والزیتون کبھی معوذتین اور کبھی المرسلات کا پڑھنا ثابت ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی قصار مفصل بھی پڑھتے تھے[4] ابو عمر فرماتے ہیں یہ تمام روایتیں صحیح اور مشہور ہیں۔

۱۔ رقم (۴۵۴) فی الصلاۃ : باب القرأۃ فی صلاۃ الظھر والعصر۔

۲۔ صحیح ابن خزیمہ (۵۱۲) میں انس بن مالک سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کو ظہر کی صلوٰۃ کے اندر آپ سے سبح اسم ربك الاعلی اور ھل اتاك حدیث الغاشیۃ کا نغمہ سنائی دیتا تھا۔ سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۴۶۹) نے اسے صحیح کہا ہے۔

۳۔ نسائی ۲/۱۶۸، روایت جابر رضی اللہ عنہ۔ فرماتے ہیں، ناضحین میں ایک انصاری معاذ کے پاس سے گذرے وہ مغرب کی صلوٰۃ پڑھ رہے تھے جس میں سورہ بقرہ شروع کر رکھی تھی، یہ انصاری تنہا صلوٰۃ پڑھ کے چلے گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا: معاذ! فتنہ میں ڈالتے ہو، معاذ! فتنہ میں ڈالتے ہو، سبح اسم ربك الاعلی اور والشمس وضحٰھا جیسی سورتیں کیوں نہیں پڑھتے؟ سند صحیح ہے، مغرب کی صلوٰۃ میں حٰمٓ دخان کی قرأت، نسائی ۲/۱۶۹ کی روایت کردہ ہے، اس کے رجال ثقہ اور سند حسن ہے۔

۴۔ سورہ (قٓ) سے لے کر قرآن کے آخر تک مفصل کہلاتی ہیں۔

باقی قصار مفصل کو دائمی طور پر پڑھنا دراصل مروان بن حکم کا فعل رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ زید بن ثابت نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا "مغرب میں قصار مفصل کیوں پڑھتے ہو، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طولی الطولیین پڑھتے دیکھا ہے"، انھوں نے پوچھا یہ طولی الطولیین کیا ہے؟ فرمایا "الأعراف" یہ حدیث صحیح ہے۔ اہل سنن نے اسے روایت کیا ہے[1]۔ نسائی نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت درج کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی صلوٰۃ میں سورہ الأعراف دو رکعتوں میں پڑھی[2]۔ پس مغرب میں مختصر آیت کا التزام اور قصار مفصل ہی کی سورتیں پڑھنا خلاف سنت اور مروان بن حکم کا فعل رہا ہے۔

عشاء کی صلوٰۃ میں آپ نے والتین والزیتون پڑھی ہے، اور معاذ کے لیے اس میں والشمس وضحٰھا، سبح اسم ربك الاعلی اور واللیل اذا یغشی جیسی سورتیں پڑھنے کی تعیین فرمائی۔ اور معاذ رضی اللہ عنہ چونکہ آپ کے ساتھ یہ صلاۃ ادا کر کے بنی عمرو بن عوف میں گئے اور انھیں رات کا ایک حصہ گذر جانے کے بعد عشاء پڑھائی اور اس میں سورۃ البقرہ کی قرأت کی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "افتان انت یا معاذ"[3] فرمایا اور ان کے لیے عشاء میں بقرہ کی قرأت ناپسند فرمائی۔ پھر چونچ مارنے والے اسی کلمہ کو لے اڑے اور اس کے سیاق وسباق کو نہ دیکھا۔

جمعہ میں "جمعۃ" اور "منافقون" کی سورتیں مکمل اور سورۃ "سبح" اور "غاشیۃ" پڑھتے تھے۔ لیکن دونوں سورتوں کے آخر (یاأیها الذین آمنوا سے آخر تک) کی قرأت پر اکتفا کبھی نہیں کیا۔ یہ آپ کی معمول بہ سنت کے خلاف ہے۔

عید کے موقعوں پر کبھی آپ سورہ ق اور سورۃ "اقترب" مکمل اور کبھی سورۃ "سبح" اور "غاشیۃ" پڑھتے تھے۔ وفات تک آپ کا دستور یہی رہا۔ ان میں سے کوئی چیز منسوخ نہیں ہوئی۔

آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین کا بھی یہی دستور رہا۔ چنانچہ فجر کی صلوٰۃ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ البقرہ پڑھی۔ سلام پھیرا تو قریب تھا کہ سورج نکل آئے، لوگوں نے کہا: خلیفۂ رسول! سورج بس نکلا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا نکل آتا تو ہمیں غافل نہ پاتا۔

عمر رضی اللہ عنہ ان صلوات میں "یوسف"، "نحل"، "ہود"، "بنی اسرائیل" اور انہی جیسی دوسری سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ اگر آپ کی طولانی قرأت منسوخ ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ چونچ مارنے والوں کو اس کی خبر ہوتی اور خلفاء راشدین اس سے بے خبر رہتے۔

جس حدیث کی روایت صحیح مسلم[4] میں حضرت جابر بن سمرہ سے آئی ہے یعنی آپ فجر کی صلوٰۃ میں ق والقرآن المجید پڑھتے تھے، اس کے بعد آپ کی صلوٰۃ ہلکی ہوگئی تو "اس کے بعد" کا مفہوم اس میں فجر کے بعد کا ہے، یعنی فجر کی صلوٰۃ کے بمقابلہ

---

[1] بخاری ۲/۲۰۵، فی صفۃ الصلوٰۃ: باب القرأۃ فی المغرب (بخاری میں طولیین کی تفسیر نہیں ہے) ابوداؤد (۸۱۲) فی الصلوٰۃ: باب قدر القرأۃ فی المغرب، اور نسائی نے ۲/۱۷۰، فی افتتاح الصلوٰۃ: باب القرأۃ فی المغرب بالمّص میں اس کی روایت کی ہے، سند صحیح ہے۔

[2] نسائی ۲/۱۷۰، سند صحیح ہے۔

[3] بخاری ۱۰/۴۲۹، فی الادب: باب من لم یر إکفار من قال ذلك متأولاً أوجاهلاً، وفی الجماعۃ: باب اذا طول الامام وکان للرجل حاجۃ فخرج فصلی، وباب من شکا امامہ اذا طول، وباب اذا صلی ثم أم قوماً، مسلم (۴۶۵) فی الصلوٰۃ: باب القرأۃ فی العشاء، ابوداؤد (۷۹۰) فی الصلوٰۃ: باب فی تخفیف الصلوٰۃ، نسائی ۲/۹۷، ۹۸، فی الامامۃ: باب خروج الرجل من صلوٰۃ الامام، ابن ماجہ (۹۸۶) فی الاقامۃ: باب من أم قوماً فلیخفف، مسند احمد ۳/۱۲۴، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۸، ۳۶۹۔

[4] مسلم (۴۵۸) فی الصلوٰۃ: باب القرأۃ فی الصبح۔

دوسری صلوٰۃ میں ہلکی پڑھتے تھے۔ ام فضل کا قول اس کی دلیل ہے، جنھوں نے ابن عباس کو "والمرسلات عرفا" پڑھتے سنا تو فرمایا: بیٹے یہ سورہ پڑھ کر تم نے میری یاد تازہ کر دی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مغرب کی صلوٰۃ میں پڑھتے ہوئے یہ سب سے آخری سورہ سنی ہے[1] چنانچہ یہ عمل اخیر زندگی کا رہا ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ لفظ "بعدُ" آیا ہے۔ اس کا مضاف الیہ محذوف ہے، سیاق سے جو بات مفہوم نہ ہو اس کی تقدیر اور جو مفہوم ہو اس کا ترک جائز نہیں، سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ فجر کے بعد کی صلوٰۃ آپ کی ہلکی ہو، یہ نہیں کہ اس دن کے بعد آپ کی صلوٰتیں ہلکی ہوا کرتی تھیں۔ الفاظ کے اندر اس کی دلیل نہیں ہے، ایسا ہوتا تو یقیناً خلفاء راشدین سے یہ بات پوشیدہ نہ رہتی وہ منسوخ کو اخذ اور ناسخ کو ترک ہرگز نہ کرتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "جو امامت کرے وہ صلوٰۃ ہلکی پڑھائے[2]" اور حضرت انس کا یہ قول کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ کامل ہونے کے باوجود سب لوگوں سے ہلکی ہوتی تھی[3]" تو واضح رہے کہ ہلکی کرنا ایک نسبتی معاملہ ہے جس کا تعلق مقتدیوں کی خواہش سے نہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل اور آپ کی مداومت سے ہے، ایسا نہیں تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم دیں اور خود آپ اس کی مخالفت کریں، آپ کو معلوم تھا کہ پیچھے آپ کے بوڑھے بھی ہیں، کمزور بھی اور ضرورت مند بھی، پس آپ نے جس پر عمل کیا وہی تخفیف ہے اور اسی کا حکم بھی دیا، اس لیے کہ ممکن ہے کہ آپ کی صلوٰۃ میں اسے بھی کئی گنا لمبی ہو اور اس کے باوجود اس سے زیادہ لمبی صلوٰۃ کی نسبت سے خفیف ہو، اور سارے جھگڑوں میں آپ کا اسوہ ہی فیصلہ کن ہے، نسائی وغیرہ نے ابن عمر سے جو روایت کی ہے وہ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تخفیف کا حکم دیتے تھے اور صلوٰۃ میں سورہ "الصافات" پڑھتے تھے[4] معلوم ہوا کہ جس تخفیف کا آپ حکم دیتے تھے سورہ "الصافات" اس کا معیار ہے۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃ میں سورتوں کی تعیین اور مقدار کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

جمعہ اور عیدین کے علاوہ کسی صلوٰۃ میں کوئی متعین سورہ نہیں پڑھتے تھے، ابوداؤد نے عمرو بن شعیب سے انھوں

---

[1] ۔ مؤطا امام مالک ۱/۷۸، بخاری ۲/۲۰۴، مسلم (۴۶۲)۔

[2] ۔ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے جسے بخاری نے ۲/۱۶۸، فی صلوٰۃ الجماعۃ: باب اذا صلی بنفسہ فلیطول ما شاء، مسلم (۴۶۷) فی الصلاۃ: باب امر الائمۃ بتخفیف الصلاۃ فی تمام، مؤطا ۱/۱۳۴، فی صلوٰۃ الجماعۃ، ترمذی (۲۳۶) فی الصلاۃ: باب ما جاء اذا أمّ احدکم الناس فلیخفف، ابوداؤد (۷۹۴) فی الصلاۃ: باب فی تخفیف الصلاۃ، نسائی ۲/۹۴، فی الافتتاح: باب ما علی الامام من التخفیف، مسند احمد ۲/۲۵۶ و ۲۷۱ و ۳۱۷ و ۳۹۳ و ۴۸۶ و ۵۰۲ و ۵۳۷۔ حدیث ابوہریرہ۔

[3] ۔ بخاری ۲/۱۷۰، فی الجماعۃ: باب الإیجاز فی الصلاۃ وإکمالھا، مسلم (۴۶۹) باب الامر بتخفیف الصلاۃ فی تمام، ترمذی (۲۳۷) فی الصلاۃ: باب ما جاء اذا أمّ احدکم الناس فلیخفف، نسائی ۲/۹۴، فی الامامۃ: باب ما علی الامام من التخفیف، ابن ماجہ (۹۸۵) فی الاقامۃ: باب من أمّ قوماً فلیخفف، مسند احمد ۳/۲۵۵، مسلم میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ کامل ہونے کے باوجود سب سے ہلکی ہوتی تھی"۔

[4] ۔ نسائی ۲/۹۵، فی الصلاۃ: باب الرخصۃ للامام فی التطویل۔ سند صحیح ہے۔

نے اپنے والد سے، انھوں نے دادا سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں: مفصل کی ہر چھوٹی بڑی سورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرض صلوٰۃ میں لوگوں کی امامت کرتے ہوئے پڑھتے سنا ہے[1]

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ مکمل سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی ایک سورہ دونوں رکعتوں میں پڑھتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ سورہ کی ابتدائی آیات کی قرأت فرمائی، سورہ کی آخری اور بیچ آیات کا پڑھنا آپ سے ثابت نہیں ہے۔ ایک رکعت کے اندر دو سورتیں صرف نوافل میں پڑھتے تھے۔ فرض صلوات میں اس کا ثبوت نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ وہ نظائر سورجن میں سے دو سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت میں پڑھا کرتے تھے مجھے معلوم ہیں "الرحمٰن" اور "النجم" ایک رکعت میں، "اقتربت" اور "الحاقۃ" ایک رکعت میں "الطور" اور "الذاریات" ایک رکعت میں "اذا وقعت" اور "نٓ" ایک رکعت میں۔[2]...

مگر یہ آپ کے ایسے فعل کی روایت ہے جس میں تعین موجود نہیں کہ فرض صلوات میں آپ ایسا کرتے تھے یا نوافل میں۔ یہاں دونوں ہی احتمال ہے۔ دو رکعتوں میں معاً ایک ہی سورہ پڑھنا بہت کم ہوتا تھا، ابوداؤد نے ایک جہنی صحابی کے اسی بیان کی روایت کی ہے کہ انھوں نے صبح کی صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "اذا زلزلت" دونوں رکعتوں میں پڑھتے سنا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھول گئے یا عمداً ایسا آپ نے کیا۔[3]

رکعتیں لمبی پڑھنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

ہر صلوٰۃ بالخصوص صلوٰۃ فجر کی پہلی رکعت دوسری رکعت سے لمبی ہوتی، بسا اوقات اتنی لمبی ہو جاتی کہ کوئی آنے والا باقی نہ رہ جاتا۔ دیگر صلوات کے مقابلہ میں فجر کی صلوٰۃ نسبتاً زیادہ لمبی ہوتی کیونکہ اس صلوٰۃ میں اللہ اور فرشتے حاضری دیتے ہیں، ایک قول ہے کہ شب و روز کے تمام فرشتے اسی صلوٰۃ میں یکجا ہو جاتے ہیں، دونوں روایتوں کی بنیاد اس اختلافی امر پر ہے کہ نزول الٰہی کا سلسلہ صلوٰۃ صبح کے خاتمہ تک رہتا ہے یا صرف طلوع فجر تک، دونوں ہی قسم کی روایتیں موجود ہیں۔

صبح کی صلوٰۃ لمبی پڑھنے کے دیگر اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس میں رکعتیں کم کر دی گئی ہیں، اس لیے اس کے عوض قرأۃ لمبی کر دی گئی۔

۲۔ سوکر اٹھنے کے بعد یہ صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے، جب کہ لوگ آرام کر رہے ہوتے ہیں۔

۳۔ معاشی کاروبار اور دنیاوی امور میں مصروف ہونے کے لیے ابھی وقت رہتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد (۸۱۴) فی الصلاۃ: باب من رأی التخفیف فیہا۔ اسناد حسن ہے۔

[2] ابوداؤد (۱۳۹۶) باب الصلاۃ: باب تحزیب القرآن وتمامہ، حدیث کا باقی حصہ یہ ہے: (سأل سائل) اور (والنازعات) ایک رکعت میں، اور (ویل للمطففین) اور (عبس) ایک رکعت میں، (المدثر) و (المزمل) ایک رکعت میں، (ھل اتی) اور (لا اقسم بیوم القیامۃ) ایک رکعت میں، (عم یتساءلون) اور (والمرسلات) ایک رکعت میں، (الدخان) اور (اذا الشمس کورت) ایک رکعت میں، سند قوی ہے۔

بخاری (۲/۲۱۵)، مسلم (۷۲۲)، حدیث ابن مسعود کی، کہا: مجھے وہ نظائر سورتیں معلوم ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ساتھ ایک ہی رکعت میں پڑھتے تھے، پھر انھوں نے بیس سورتیں مفصل کی اور دو سورتیں آل حٰمٓ ذکر کیں۔

[3] ابوداؤد (۸۱۶) فی الصلاۃ: باب من رأی التخفیف فیہا۔ سند قوی ہے۔

۴۔ کان، زبان اور دل بوجہ فراغت و عدم مشغولیت اس وقت آمادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے فہم قرآن کا موقع زیادہ رہتا ہے۔
۵۔ یہ صلوٰۃ عمل کا آغاز ہے اس لیے خصوصی اہتمام ہوتا ہے اور لمبی پڑھی جاتی ہے۔
یہ حقائق انھیں خوش بختوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں جو شریعت کے نکات و رموز اور مقاصد و مصالح کی معرفت کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

رکوع کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

جب قرأت ختم ہوتی تو اتنا توقف فرماتے کہ دم لے لیں، پھر جیسا کہ گذر چکا ہے ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے، رکوع کی صورت یہ تھی کہ دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر اس طرح رکھتے جیسے انھیں گرفت میں لیا ہے۔ دونوں ہاتھوں کو تان کر پہلو سے دور رکھتے، پشت کو پھیلا کر دراز کر دیتے اور اس طرح سیدھے ہو جاتے کہ سر اونچا نہ نیچا بلکہ پشت کے متوازی رہتا۔

رکوع میں کبھی صرف "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ"[1] پڑھتے تھے، کبھی "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ"[2] (الٰہی پاک ہے تو ہمارے پروردگار، تعریف ہے تیری، الٰہی مجھے بخشدے)، اور کبھی دونوں پڑھتے تھے۔ عام طور پر آپ کا رکوع دس تسبیحات کے برابر ہوتا، سجدہ کی مقدار بھی اسی قدر ہوتی۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ہے۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سب نے صلوٰۃ کا اندازہ لگایا، چنانچہ دیکھا کہ قیام، رکوع، سیدھا کھڑا ہونا سجدہ اور دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ تقریباً سب برابر تھے"[3] اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آپ کا رکوع سجدہ اور سیدھا کھڑا ہونا سب قیام کے برابر ہوتا تھا، مگر یہ فہم محل نظر ہے۔ کیونکہ آپ صبح کی صلوٰۃ میں سو آیتیں یا اس کے لگ بھگ پڑھتے تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ مغرب میں سورہ اعراف، سورۂ طور اور سورۂ "مرسلات" پڑھتے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے رکوع اور سجدے اتنے لمبے نہیں ہوتے تھے۔ اس کی دلیل اصحاب سنن کی روایت کردہ انس کی وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہ صلوٰۃ میں نے بس اسی نوجوان یعنی عمر بن عبدالعزیز کے پیچھے پڑھی ہے۔" کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے رکوع اور سجدہ کا اندازہ لگایا گیا تو دس تسبیحات کے

---

[1] مسلم (۷۷۲) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب تطویل القرأۃ فی صلاۃ اللیل۔ ترمذی (۲۶۲) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۱) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، نسائی ۲/۱۹۰، فی الصلاۃ : باب الذکر فی الرکوع، ابن ماجہ (۸۸۸) فی الاقامۃ : باب التسبیح فی الرکوع والسجود، مسند احمد ۵/۳۸۲ و ۳۸۴ و ۳۸۹ و ۳۹۴ و ۳۹۷ و ۳۹۸۔ حدیث حذیفہ، تین تسبیحات کی روایت بہتیرے صحابہ نے فرمائی ہے۔ دارقطنی ۱/۳۴۱ اور طحاوی ۱/۲۳۵ میں حذیفہ، اور دارقطنی ۱/۳۴۲، ۳۴۳ میں جبیر بن مطعم اور عبداللہ بن اقرم، ترمذی (۲۶۱)، ابوداؤد (۸۸۶)، ابن ماجہ (۸۹۰) اور دارقطنی ۱/۳۴۳ میں عبداللہ بن مسعود نیز بزار اور کبیر طبرانی میں ابوبکرہ اور "المجمع" ۲/۱۸۲ کے مطابق کبیر طبرانی میں ابومالک اشعری کی روایتیں موجود ہیں، لہٰذا حدیث صحیح ہے۔

[2] بخاری ۲/۲۳۳، فی صفۃ الصلوٰۃ : باب الدعاء فی الرکوع، مسلم (۴۸۴) فی الصلاۃ : باب مایقال فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۷) فی الصلوٰۃ : باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود، نسائی ۲/۱۹۰ فی افتتاح الصلاۃ : باب نوع آخر من الذکر فی الرکوع، ابن ماجہ (۸۸۹) فی الاقامۃ : باب التسبیح فی الرکوع والسجود، مسند احمد ۶/۴۳ و ۴۹ و ۱۰۰ و ۱۹۰، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[3] بخاری ۲/۲۲۸، مسلم (۴۷۱) فی الصلاۃ : باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفھا فی تمام۔

برابر نکلے[1] باایں ہمہ حضرت انس کا یہ قول بھی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز صلوٰۃ میں سورۂ "صافات" پڑھتے تھے۔ براء کی مراد واللہ اعلم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ معتدل ہوا کرتی تھی، چنانچہ قیام طویل فرماتے تو رکوع و سجود بھی لمبے ہو جاتے اور قیام ہلکا ہوتا تو رکوع و سجود بھی ہلکے ہوتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رکوع و سجود قیام کے برابر ہوتے۔ مگر ایسا صرف شب کی صلوات میں گاہے بگاہے ہوتا تھا، تقریباً یہی طریقہ صلاۃ الکسوف میں بھی ہوتا۔ مگر عام طریقہ کے مطابق صلوٰۃ معتدل اور متناسب ہوتی۔

رکوع میں یہ دعا بھی پڑھتے تھے "سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ"[2] (لائق تسبیح، لائق تقدیس فرشتوں اور روح القدس کا پروردگار ہے) کبھی یہ پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ، خَشَعَ لَكَ سَمْعِي وَبَصَرِي وَمُخِّي وَعَظْمِي وَعَصَبِي[3]۔

اے اللہ! تیرے لیے رکوع کیا، تجھی پر ایمان میرا، تیرے آگے سر افگندہ، میرا کان، آنکھ، مغز، ہڈی، اور اعصاب سب جھک گئے۔

یہ دعا صرف شب کی صلوٰۃ میں ثابت ہے۔

اس کے بعد سر اٹھاتے ہوئے "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ"[4] کہتے اور جیسا کہ گذر چکا ہے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، ان تینوں مقامات پر رفع یدین کی روایت تقریباً بائیس راویوں نے کی ہے، دس متفق ہیں، اس کے برعکس آپ سے اور کچھ ثابت نہیں۔ بلکہ وفات تک ہمیشہ آپ کا یہی دستور رہا۔ حضرت براء کی یہ حدیث کہ آپ دوبارہ رفع یدین نہیں کرتے تھے ثابت نہیں ہے یہ فقرہ یزید بن زیاد کا بڑھایا ہوا ہے[5]، عبداللہ بن مسعود اگر بالفرض رفع یدین نہیں کرتے تھے تو ان کا یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ پر مقدم نہیں ہو سکتا، صلوٰۃ کی بہت سی باتیں جو عبداللہ بن مسعود اختیار کرتے تھے متروک ہیں جن کے بالمقابل امور مرتبہ میں رفع یدین سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے۔ چنانچہ دونوں پنجوں یا ہاتھوں کو رکوع یا تشہد میں جنگاسوں یا گھٹنوں کے درمیان رکھنا، سجدوں میں پھیل جانا، آگے بڑھے بغیر دو مصلیوں کے درمیان کھڑے ہو کر امامت کرنا، مسجدوں میں امراء کے دیر سے آنے پر گھر ہی میں بغیر اذان و اقامت کے صلوٰۃ پڑھنا اور پڑھانا، یہ سب حضرت عبداللہ بن مسعود کے

---

[1] ابوداؤد (۸۸۸) فی الصلوٰۃ: باب مقدار الرکوع والسجود، نسائی ۲/۲۲۵، فی افتتاح الصلوٰۃ: باب عدد التسبیح فی السجود، مسند احمد ۳/۱۶۲ و ۱۶۳۔ سند میں وہب بن مانوس ہیں جنھیں ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بقیہ رجال ثقہ ہیں۔

[2] مسلم (۴۸۷) فی الصلوٰۃ: باب ما یقال فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۲) فی الصلوٰۃ: باب ما یقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، نسائی ۲/۱۹۱، فی افتتاح الصلوٰۃ: باب نوع آخر من الذکر فی الرکوع، مسند احمد ۶/۳۵ و ۹۴ و ۱۱۵ و ۱۴۸ و ۱۴۹ و ۱۷۶ و ۱۹۳ و ۲۰۰ و ۲۴۴ و ۲۶۶۔

[3] مسلم (۷۷۱) فی صلوٰۃ المسافرین: باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل، حدیث علی رضی اللہ عنہ۔

[4] متفق علیہ۔ حدیث ابوہریرہ۔ اس باب میں عبداللہ بن ابی اوفی، عبداللہ بن عمر اور مالک بن حویرث سے بھی روایات موجود ہیں۔

[5] ابوداؤد (۷۴۹) و (۷۵۰) فی الصلوٰۃ: باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع، حدیث یزید بن ابی زیاد۔ انھوں نے عبدالرحمن ابن ابی لیلی سے، انھوں نے براء سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ کا افتتاح فرماتے تو دونوں کانوں سے قریب ہاتھوں کو اٹھاتے پھر ایسا نہیں کرتے تھے۔ یزید بن ابی زیاد ضعیف ہیں، بوڑھے ہو گئے تو ان کو خود اپنی روایات کا پتہ نہ رہا اور دوسروں کی تلقین پر اعتماد کرنے لگے۔ اسی باب میں عبداللہ بن مسعود سے بھی ایک روایت آئی ہے جس کی تخریج ابوداؤد (۷۴۸)، ترمذی (۲۵۷) نسائی ۲/۱۹۵ اور احمد ۱/۴۴۲ نے کی ہے۔ فرماتے ہیں: کیا تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ نہ پڑھا دوں، کہتے ہیں کہ صلوٰۃ پڑھی تو صرف ایک بار رفع یدین کیا، سند کے رجال ثقہ ہیں، چند باتوں سے اس میں عیب ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے "نصب الرایہ" ۱/۳۹۴، ۳۹۷، نیز ۱/۳۹۷، ۴۰۱، اسی میں ابن مسعود جن مسائل کے قائل ہیں اس کی اور مخالفین کے اقوال کی تفصیل ہے۔

تفردات تھے جو متروک ہیں۔ مذکورہ باتوں کے خلاف جو حدیثیں ثابت ہیں، کثرت، صحت وصراحت اور عمل کے اعتبار سے رفع یدین کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

رکوع سے اٹھنے کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان ہمیشہ پیٹھ سیدھی رکھتے، فرماتے: وہ صلوٰۃ مکمل نہیں جس میں آدمی رکوع اور سجدہ کے اندر اپنی پیٹھ سیدھی نہ رکھے۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح کے اندر اس حدیث کا ذکر کیا ہے[1]

رکوع سے اٹھ کر برابر کھڑے ہو جاتے تو یہ دعا پڑھتے: "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" (پروردگار تیری تعریف ہے) کبھی پڑھتے "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" (ہمارے پروردگار تیری ہی تعریف ہے) کبھی یہ پڑھتے: "اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" (الٰہی! ہمارے پروردگار تیری تعریف ہے) آپ سے یہی ثابت ہے۔ باقی اَللّٰهُمَّ اور واؤ کو اکٹھا پڑھنا ثابت نہیں ہے[2]

رکوع کے بعد قیام معمولاً رکوع اور سجدہ کے برابر ہوتا۔ اس میں حسب ذیل دعا کا پڑھنا آپ سے ثابت ہے۔

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ[3]

اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی، اے اللہ ہمارے پروردگار تیری تعریف، آسمانوں کے برابر، زمین کے برابر اور ان کے علاوہ جس چیز کے برابر تو چاہے، تعریف و بزرگی کے لائق، بندے کی جانب سے تعریف کا سب سے زیادہ مستحق ہم سبھی تیرے بندے ہیں، جو شئی تو عطا کرے اسے روکنے والا اور جسے تو رد کرے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں، کسی مرتبہ والے کو اس کا مرتبہ تجھ سے نہیں بچا سکتا۔

یہ دعا بھی ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّنِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ[4]

---

[1] ابن خزیمہ (۵۹۱) و (۵۹۲) و (۶۶۶) سند صحیح ہے۔ ترمذی (۲۶۵) ابوداؤد (۸۵۵) اور نسائی ۲/۱۸۳ نے اسے فی الافتتاح : باب اقامۃ الصلب فی الرکوع میں اور ابن ماجہ نے (۸۷۰) اور احمد نے ۴/۱۱۹ و ۱۲۲ میں روایت کیا ہے، سب کے یہاں راوی ابو مسعود ہیں، ابن حبان (۵۰۱) نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ترمذی کے مطابق حدیث حسن صحیح ہے۔

[2] ثابت ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری ۲/۲۳۴ فی الصلاۃ : باب ما یقول الامام ومن خلفہ اذا رفع راسہ من الرکوع، نسائی ۲/۱۹۵ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سمع اللہ لمن حمدہ فرماتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے... "اللھم ربنا ولک الحمد" اس باب میں ابن ماجہ (۸۷۷) کے یہاں ابو سعید خدری، دارمی ۱/۳۰۰ کے یہاں عبداللہ بن عمر اور نسائی کے یہاں ابو موسیٰ اشعری سے بھی روایتیں آئی ہیں۔

[3] مسلم (۴۷۷) فی الصلاۃ : باب ما یقول اذا رفع راسہ فی الرکوع، حدیث ابو سعید خدری، نسائی ۳/۱۹۸ فی الافتتاح : باب ما یقول فی قیامہ من الرکوع، ابوداؤد (۸۴۷) فی الصلاۃ : باب ما یقول اذا رفع راسہ من الرکوع، مسلم ہی میں (۴۷۸) فی الصلاۃ : باب ما یقول اذا رفع راسہ من الرکوع کے اندر عبداللہ بن عباس سے بھی روایت آئی ہے، ابن ماجہ (۸۷۹) فی الاقامۃ : باب ما یقول اذا رفع راسہ من الرکوع میں یہی روایت ابوجحیفہ سے آئی ہے۔

[4] مسلم (۴۷۶) حدیث عبداللہ بن ابی اوفیٰ، فی الصلاۃ : باب ما یقول اذا رفع راسہ من الرکوع، الفاظ حسب ذیل ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے تھے "اللھم لک الحمد ملء السماء وملء الارض وملء ما شئت من شئی بعد، اللھم طھرنی بالثلج والبرد والماء البارد، اللھم طھرنی من الذنوب والخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الوسخ" باعد بینی وبین خطایای . . . کا اضافہ اس میں نہیں ہے۔ یہ جیسا کہ گذر چکا ہے دعاء افتتاح میں اور مطلق دعاؤں میں آتا ہے۔ دیکھیے بخاری ۱۱/۱۵۱ اور مسلم (۵۸۹)۔

اے اللہ! مجھے میرے گناہوں سے برف اور اولوں سے دھودے، مجھے میرے گناہوں اور خطاؤں سے اسی طرح دھو کر صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے دھو کر صاف کر دیا جاتا ہے، میرے اور میری خطاؤں کے درمیان وہی فاصلہ پیدا کر دے جو مشرق و مغرب کے مابین ہے۔

یہ بھی ثابت ہے۔ "لِرَبِّيَ الْحَمْدُ، لِرَبِّيَ الْحَمْدُ" [1] (میرے پروردگار کی تعریف، میرے پروردگار کی تعریف) یہ دعا بہ تکرار اتنا پڑھتے کہ رکوع کے برابر ہو جاتی۔

آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد اتنی دیر قومہ فرماتے کہ لوگوں کو خیال ہوتا کہ شاید آپ بھول گئے، مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" فرماتے تو اتنی دیر قومہ فرماتے کہ ہم سمجھتے کہ آپ کو وہم ہو گیا ہے، اسی طرح سجدہ کرتے ہوئے، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو ہم سمجھتے کہ آپ بھول گئے ہیں [2]

صلوٰۃ کسوف کے بارے میں ثابت ہے کہ رکوع کے بعد آپ کا قومہ تقریباً رکوع کے برابر اور رکوع قیام کے برابر ہوتا تھا۔ یہ آپ کا دائمی دستور تھا، اس کے معارض کوئی بھی روایت نہیں ملتی۔

باقی بخاری [3] میں براء بن عازب کی یہ حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع، سجدہ، دونوں سجدوں کے مابین جلسہ، رکوع سے اٹھنے کے بعد قومہ، قیام و قعود کے علاوہ سب تقریباً برابر ہوتے تھے۔ تو اس سے وہ حضرات چمٹ گئے جو ان دو ارکان کو مختصر کرنے کے قائل ہیں، حالانکہ اس حدیث کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ حدیث ان دونوں اور بقیہ سارے ارکان کے درمیان مساوات کی صراحت کرتی ہے۔ حدیث میں قیام و قعود کا جو استثناء ہے اگر اس سے مراد رکوع کے بعد قیام اور دونوں سجدوں کے درمیان قعود ہے تو ایک ہی حدیث باہم متعارض ہو جاتی ہے، لہٰذا قطعی طور پر یہ بات متعین ہے کہ قیام سے مراد قیام قرأت اور قعود سے قعود تشہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے آپ بقیہ تمام ارکان کے بالمقابل انھیں ارکان کو طول دیتے تھے، بحمد اللہ یہ بالکل واضح ہے، باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کو اللہ جن پر مخفی رکھنا چاہے اسے کون واضح کر سکتا ہے۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں ان دونوں ارکان کو مختصر کرنا صلوٰۃ میں اموی حکام کا تصرف ہے یہ ان کی ویسی ہی بدعت ہے جیسی اتمام تکبیر کا ترک، شدید تاخیر نیز دیگر خلاف سنت طریقے جنھیں امتداد زمانہ سے لوگ سنت سمجھ بیٹھے۔

---

[1] ابوداؤد (۸۷۴) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، نسائی ۲/۱۹۹، ۲۰۰ فی الافتتاح : باب مایقول فی قیامہ من الرکوع، مسند احمد ۵/۳۹۸، حدیث حذیفہ، سند صحیح ہے۔

[2] مسلم (۴۷۳) فی الصلاۃ : باب اعتدال ارکان الصلاۃ، ابوداؤد (۵۵۳) فی الصلاۃ : باب طول القیام من الرکوع وبین السجدتین، مسند احمد ۳/۲۴۷۔

[3] بخاری ۲/۲۲۸، فی صفۃ الصلاۃ : باب استواء الظہر فی الرکوع وباب الاطمئنان حین یرفع راسہ من الرکوع وباب المکث بین السجدتین، مسلم (۴۷۱) فی الصلاۃ : باب اعتدال ارکان الصلاۃ وتخفیفھا فی تمام، ترمذی (۲۷۹) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی اقامۃ الصلب واذا رفع راسہ من الرکوع، ابوداؤد (۸۵۴) فی الصلاۃ : باب طول القیام من الرکوع وبین السجدتین، نسائی ۲/۱۹۷، ۱۹۸ فی الافتتاح : باب قدر القیام بین الرفع من الرکوع والسجود۔

سجدہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

تکبیر کہتے ہوئے سجدہ میں چلے جاتے تھے، رفع یدین نہیں کرتے تھے[1] ایک روایت کے مطابق کرتے تھے[2] ابو محمد ابن حزم رحمہ اللہ جیسے حافظین حدیث نے اسے صحیح کہا ہے، مگر یہ وہم ہے۔ آپ سے ثابت نہیں ہے، انھیں دھوکہ راوی کی اس غلطی سے ہوگیا کہ آپ نیچے اوپر اٹھتے ہوئے ہر موقع پر تکبیر کہتے تھے اور رفع یدین فرماتے تھے، راوی ثقہ ہے، مگر اس کی غلطی کو وہ سمجھ نہ سکے اس لیے روایت صحیح قرار دے دی، واللہ اعلم۔

سجدہ میں جاتے ہوئے زمین پر پہلے دونوں گھٹنے اس کے بعد ہاتھ رکھتے تھے، پھر پیشانی اور ناک، یہی صحیح ہے، اس کے راوی شریک ہیں۔ انھوں نے عاصم بن کلیب سے، انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے وائل بن حجر سے روایت کی ہے کہ سجدہ کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ہاتھوں سے پہلے زمین پر گھٹنے رکھے، اور اٹھے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھ اٹھائے[3] اس مسئلے میں آپ کے عمل کے بارے میں اس کے مخالف کوئی اور روایت موجود نہیں ہے[4]

حضرت ابو ہریرہ کی یہ مرفوع روایت کہ جب کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے، بلکہ گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے[5] واللہ اعلم اس میں بعض راویوں کو وہم ہوگیا ہے، اس کا پہلا فقرہ آخری فقرہ کے مخالف ہے کیونکہ

---

[1] بخاری ۲/۱۸۳، ۱۸۴، روایت ابن عمر سے ہے، فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوٰۃ میں تکبیر شروع کرتے وقت دیکھا ہے کہ اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھوں کو دونوں مونڈھوں کے محاذ میں لے گئے، رکوع کے لیے تکبیر فرمائی تو اسی طرح کیا، سمع اللہ لمن حمدہ فرمایا تو بھی اسی طرح کیا اور ربنا ولک الحمد پڑھا، سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے ہوئے ایسا نہیں کیا۔

[2] ابو داؤد (۷۲۳) احمد ۴/۳۱۷، اس میں یہ الفاظ ہیں "پھر سجدہ کیا اور چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے مابین رکھا، سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کیا ...." یہ سند صحیح ہے، بدائع الفوائد مؤلفہ ابن قیم ۴/۸۹ میں آیا ہے کہ رفع یدین کے متعلق امام احمد سے سوال ہوا تو فرمایا "نیچے جاتے اور اوپر اٹھتے ہوئے ہر موقع پر رفع یدین کیا ہے" اثرم نے یہ گفتگو نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابو عبد اللہ کو ہر صلوٰۃ میں نیچے اوپر اٹھتے ہوئے رفع یدین کرتے دیکھا۔

[3] ابو داؤد (۸۳۸) فی الصلاۃ : باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ، ترمذی (۲۶۸) فی الصلاۃ : باب وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود، نسائی ۲/۲۰۷، فی افتتاح الصلاۃ : باب اول مایصل الی الارض من الانسان فی سجودہ، ابن ماجہ (۸۸۲) فی الصلاۃ : باب السجود، ابن حبان (۴۸۷) تمام ائمہ حدیث نے یہ روایت شریک بن عبد اللہ نخعی عن عاصم بن کلب عن ابیہ عن وائل بن حجر کی سند سے کی ہے، شریک گو سچ ہیں مگر کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں، شریک کی متابعت میں ہمام نے عن عاصم عن ابیہ مرسلاً روایت کی ہے۔ دار قطنی اور حاکم ۱/۲۲۶، اور بیہقی نے حفص بن غیاث کی سند سے یہ حدیث پیش کی ہے۔ انھوں نے عاصم احول سے، انھوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے " آپ تکبیر کہتے ہوئے نیچے گئے ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر پہنچے، بیہقی فرماتے ہیں۔ سلسلہ روایت میں علاء بن اسماعیل عطار ایک جگہ تنہا ہیں، جو مجہول ہیں، شریک کی حدیث ترمذی کے مطابق حسن غریب ہے، اس کی روایت شریک کے علاوہ اور کسی نے نہیں کی ہے۔ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے، یعنی ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھنا۔

[4] ثابت ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم ۱/۲۲۶، وغیرہ میں ابن عمر کی روایت موجود ہے کہ وہ گھٹنوں سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ رکھتے اور فرماتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔ مستدرک کا بیان ہے کہ مسلم کی شرط پر یہ حدیث صحیح ہے، شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں صحابہ اور تابعین سے بکثرت روایات کے پیش نظر ابن عمر کی حدیث کی جانب دل زیادہ مائل ہے۔

[5] ابو داؤد (۸۴۰) فی الصلاۃ : باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ، نسائی ۲/۲۰۷، فی افتتاح الصلاۃ : باب اول مایصل الی الارض من الانسان فی سجودہ، مسند احمد ۲/۳۸۱، سند صحیح ہے، علماء کا اس باب میں کثرت سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھوں کو رکھنا ہی اونٹ کی بیٹھک ہے، اونٹ پہلے دونوں ہاتھ رکھتا ہے پھر بیٹھتا ہے، یہ بات جب اہل مسلک کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اونٹ کے گھٹنے اس کے پیروں میں نہیں دونوں ہاتھوں میں ہیں، لہذا بیٹھتا ہے تو پہلے دونوں گھٹنے رکھتا ہے جس کی حدیث کے اندر ممانعت کی گئی ہے، یہ چند وجوہ سے غلط ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اونٹ جب بیٹھتا ہے تو سب سے پہلے دونوں ہاتھ رکھتا ہے دونوں پیر کھڑے رہتے ہیں، اٹھتا ہے تو دونوں پیر پہلے اٹھتے ہیں، دونوں ہاتھ زمین پر پڑے رہتے ہیں، یہی وہ وضع ہے جسے اختیار کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، آپ کا فعل اس کے برعکس ہے، آپ کا فعل یہ تھا کہ زمین پر سب سے پہلے پڑنے والے جسم کے حصّے زمین سے اقرب فالاقرب اور زمین سے اٹھنے والے سب سے پہلے اعلیٰ فالاعلیٰ ہوا کرتے تھے۔

چنانچہ گھٹنے سب سے پہلے رکھتے پھر ہاتھ پھر پیشانی اور اٹھاتے تو سب سے پہلے سر پھر ہاتھ پھر گھٹنے۔ اونٹ اس کے برعکس کرتا ہے، صلوٰۃ میں جانوروں کی مشابہت اختیار کرنے سے آپ منع فرماتے تھے، چنانچہ اونٹ کی طرح بیٹھنے، لومڑی کی طرح مڑنے، درندوں کی طرح بچھانے، کتوں کی طرح نشست اختیار کرنے، کوّوں کی طرح چونچ[۱] مارنے اور وقت سلام بدکنے والے[۲] گھوڑوں کی دموں کی طرح ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا ہے، پس مصلیوں کا طریقہ جانوروں کے طریقوں کے برعکس ہے۔

۲۔ یہ بات کہ اونٹ کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، ناقابل فہم ہے، لغت میں اس کا کہیں وجود[۳] نہیں، گھٹنے تو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اختلاف ہے، اوزاعی اور مالک کا رجحان اس جانب ہے کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو رکھنا مستحب ہے، المغنی لابن قدامہ ۱/۵۱۴ کے مطابق ایک روایت احمد سے بھی یہی ہے، یہی اکثر محدثین کا بھی قول ہے۔ عبداللہ بن عمر کے فعل سے بھی یہی ثابت ہے، نیز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی فعل کی خبر بھی دی ہے، صحیح بخاری ۲/۲۴۱ میں آیا ہے نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھتے تھے، ابن خزیمہ (۶۲۷) حاکم ۱/۲۲۶ اور بیہقی ۲/۱۰۰ وغیرہ نے اس کی عبدالعزیز دراوردی عن عبیداللہ بن عمر عن نافع، عنہ کی سند سے موصولاً روایت کی ہے، سند صحیح ہے۔ شافعی کے مذہب میں سجدوں میں مستحب یہ ہے کہ پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھے جائیں ... خطابی اور ترمذی کے مطابق یہی اکثر علماء کا مذہب ہے، قاضی ابوالطیب نے اسے عام فقہاء کا مذہب قرار دیا ہے، ابن منذر نے اسی مذہب کی حضرت عمر، نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے سے حکایت کی ہے، اور کہتے ہیں کہ یہی میرا بھی مذہب ہے۔

علامہ احمد شاکر تعلیقات ترمذی ۲/۵۸، ۵۹ میں فرماتے ہیں: دونوں حدیثوں کے ضمن میں علماء کے جو اقوال ہیں ان سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث صحیح ہے اور وائل کی حدیث سے صحیح تر ہے، یہ قولی حدیث ہے جسے اصحاب اصول کے مطابق فعلی حدیث پر ترجیح حاصل ہے۔ دیکھیے فتح الباری ۲/۲۴۱، تحفۃ الاحوذی ۲/۱۳۴، ۱۴۰، سبل السلام ۱/۲۶۳، ۲۶۵، ترمذی بہ تحقیق احمد شاکر ۲/۵۸، ۵۹، شرح المہذب للنووی ۳/۳۹۳، ۳۹۵۔

[۱] ابوداؤد (۸۶۲) ابن ماجہ (۱۴۲۹) نسائی (۲۱۴) دارمی ۱/۳۰۳، مسند احمد ۳/۴۲۸، ۴۴۴ حدیث عبدالرحمن بن شبل، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوّوں کی طرح چونچ مارنے، درندوں کی طرح بچھانے اور اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی مسجد میں اونٹ کی طرح اپنے لیے جگہ بنائے۔ سند میں تمیم بن محمود لین الحدیث ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں، احمد ۷/۴۴۷ میں اس کی شاہد ابوسلمہ سے ایک روایت ہے مگر سند میں دو مجہول باقی ثقہ ہیں، اس طرح ہو سکتا ہے اس حدیث میں قوت ہو، احمد نے ابوہریرہ کی روایت سے ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس میں آیا ہے کہ میرے خلیل نے مجھے تین باتوں کا حکم اور تین باتوں سے روکا ہے، مرغ کی طرح چونچ مارنے، کتوں کی نشست اختیار کرنے اور لومڑی کی طرح مڑنے سے روکا ہے، منذری نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، بخاری ۲/۲۴۹، مسلم (۴۹۳) ابوداؤد (۸۹۷) اور ترمذی (۲۷۶) میں حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سجدوں میں توازن پیدا کرو، کوئی اپنے ہاتھ کتوں کی طرح نہ پھیلائے۔

[۲] مسلم (۴۳۰) فی الصلاۃ: باب الامر بالسکون فی الصلاۃ، نسائی ۳/۵ فی التشہد، حدیث جابر بن سمرہ۔

[۳] ایسا نہیں ہے بلکہ بہیترے اصحاب لغت نے اس کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ لسان العرب مادہ رکب میں آیا ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پیروں میں ہوتے ہیں۔ اگر ہاتھوں میں گھٹنے کا اطلاق بھی ہو تو برسبیل اغلبیت ہوگا۔

۳۔ اگر بات وہی ہوتی جیسا کہ ان حضرات کا کہنا ہے تو یوں کہا جاتا "اونٹ کی طرح بیٹھے"۔ کیونکہ زمین سے اونٹ کا سب سے پہلا حصہ ہاتھ ہی لگتا ہے، اونٹ کی بیٹھک پر غور کرنے سے اور اس حقیقت کے مدنظر کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی طرح بیٹھنے سے منع فرمایا ہے، یقیناً وائل بن حجر کی حدیث ہی صحیح نظر آتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ بعض راویوں سے حضرت ابوہریرہ کی حدیث کی اصل اور متن دونوں الٹے بیان ہو گئے ہیں، غالباً کہنا یہ چاہیے تھا کہ "ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھے"۔ ایسا ہی واقعہ عبداللہ بن عمر کی حدیث کے ساتھ بھی پیش آچکا ہے۔ جس میں اصلاً یوں ہے کہ "بلال رات میں اذان دیں تو کھاؤ پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں، مگر عبارت الٹ کر یوں ہو گئی۔ "ابن ام مکتوم رات میں اذان دیں تو کھاؤ پیو یہاں تک کہ بلال اذان دیں"[51]۔ اسی طرح بعض راویوں سے یہ حدیث بھی الٹی بیان ہو گئی۔ "لایزال یُلقی فی النار فتقول: ھل من مزید . . ." (جہنم میں برابر لوگوں کو ڈالا جاتا رہے گا حتیٰ کہ وہ بولے گی اور بھی کچھ ہیں . . . .) آگے یہاں تک فرمایا "وَاَمَّا الْجَنَّۃَ فَیُنْشِئُ اللّٰہُ لَھَا خَلْقًا یُسْکِنُھُمْ اِیَّاھَا"[52] پھر ارشاد ہوا "واما النار فینشئ اللہ لھا خلقا یسکنھم ایاھا" دونوں فقروں کا مفہوم یہ ہے کہ جنت کے لیے اللہ تعالیٰ ایک اور مخلوق برپا کریگا جسے اس میں آباد کرے گا اور جہنم کے لیے بھی ایک اور مخلوق پیدا کرے گا جو اس میں داخل ہوگی، چنانچہ ابوبکر بن ابی شیبہ نے اس حدیث کی اسی طرح روایت کی ہے اور کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن فضیل نے انھوں نے عبداللہ بن سعید سے انھوں نے اپنے دادا سے انھوں نے ابوہریرہ سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے "کہ جب کوئی سجدہ کرے تو ہاتھ سے پہلے گھٹنے رکھے اور نر اونٹ کی طرح نہ بیٹھے"[53]، اثرم نے بھی سنن میں ابوبکر سے ایسے ہی روایت کی ہے، ابوہریرہ سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اونٹ کا گھٹنا اس کے ہاتھ میں اور ہر چوپائے کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ شرح معانی الآثار للطحاوی ۱/۲۵۴، میں جہاں اس حدیث کے ثابت صحیح ہونے اور اس مستحالہ کی نفی پر گفتگو کی گئی ہے وہاں آیا ہے کہ اونٹ کے دونوں گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، یہی حال تمام چوپایوں کا ہے، انسان کا یہ حال نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ اونٹ جس طرح اپنے ہاتھوں کے گھٹنوں پر بیٹھتا ہے اس طرح انسان اپنے پیر کے گھٹنوں پر نہیں بیٹھتا بلکہ سب سے پہلے ہاتھ رکھتا ہے جس میں گھٹنا نہیں ہوتا، پھر گھٹنا رکھتا ہے، اس طرح اس کی کیفیت اونٹ کے برعکس ہوتی ہے، امام قاسم بن ثابت سرقسطی نے غریب الحدیث ۲/۷۰ میں صحیح سند سے حضرت ابوہریرہ کی روایت پیش کی ہے جس میں آپ نے فرمایا: کوئی برگشتہ اونٹ کی طرح نہ بیٹھے، امام فرماتے ہیں کہ یہ کیفیت سجدوں کی بیان کی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ جس طرح برگشتہ غیر مطمئن اونٹ کے بیٹھنے کی کیفیت ہوتی ہے اس طرح آدمی خود یکبارگی زمین پر نہ ڈال دے بلکہ اطمینان سے پہلے ہاتھ پھر گھٹنے رکھے، اس ضمن میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے جو اس کی تفسیر کرتی ہے، آگے امام نے حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔

۵۱۔ حافظ الفتح ۲/۵۸ میں رقم طراز ہیں "ابن عبدالبر اور ائمہ کی ایک جماعت دعویدار ہے کہ حدیث الٹ گئی ہے، صحیح اس باب کی حدیث ہے (یعنی حدیث ان بلالا یؤذن بلیل) میرا بھی میلان اسی جانب تھا، مگر صحیح ابن خزیمہ (۴۰۸) میں یہ حدیث دو اور سندوں سے حضرت عائشہ سے مروی ہے، اس کے الفاظ میں بعض ایسی باتیں ہیں جن سے شک کا ازالہ ہو جاتا ہے، اس میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "جب عمرو (ابن ام مکتوم) اذان دیں تو چونکہ اندھے ہیں اس لیے دھوکہ نہ کھاؤ، مگر بلال اذان دیں تو کوئی ہرگز نہ کھائے" دیکھیے وہاں پوری حدیث۔

۵۲۔ صحیح بخاری ۸/۴۵۹، ۱۳/۴۱۲، مسلم (۲۸۴۶) (۳۶) حضرت ابوہریرہ، دوسری الٹی ہوئی روایت کی تخریج بخاری نے ۱۳/۳۹۹، ۳۶۷، میں کی ہے، ابوالحسن قابسی فرماتے ہیں کہ اس مقام پر موزوں تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت کے لیے اور مخلوق پیدا کرے، باقی جہنم کی بات تو اللہ تعالیٰ اس میں اپنے قدم رکھ دے گا۔ اس حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں میرے علم کی حد تک اور مخلوق پیدا کرنے کی بات نہیں آئی ہے۔

۵۳۔ عبداللہ بن سعید مقبری متروک ہیں، دوسری روایت کی تخریج بیہقی نے سنن ۲/۱۰۰ میں کی ہے، اس میں بھی عبداللہ بن سعید ہیں، لہٰذا دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، ان سے کوئی دلیل فراہم نہیں ہو سکتی۔

ایک اور روایت ہے جو مذکورہ بالا مضمون کی تصدیق اور وائل بن حجر کی حدیث کی تائید کرتی ہے۔ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں: ہم سے یوسف بن عدی نے، انھوں نے ابن فضیل یعنی محمد سے، انھوں نے عبداللہ بن سعید سے انھوں نے اپنے دادا سے انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جاتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔

صحیح ابن خزیمہ میں مصعب بن سعد کی حدیث وارد ہے جسے وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ "ہم گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھا کرتے تھے چنانچہ ہمیں حکم ہوا کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھیں[1]"۔ بنابریں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ثابت بھی ہو تو منسوخ قرار پائے گی، صاحب مغنی وغیرہ کا یہی فیصلہ ہے۔ تاہم حدیث کے اندر دو خرابیاں ہیں۔

۱۔ یہ روایت یحییٰ بن سلمہ بن کہیل کی روایت کردہ ہے اور لائق استدلال نہیں ہے، یحییٰ نسائی کے مطابق متروک، ابن حبان کے مطابق سخت منکر الحدیث ناقابل استدلال اور ابن معین کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہیں۔

۲۔ مصعب بن سعد عن ابیہ کی روایت سے جو ثابت ہے وہ تطبیق (یعنی رکوع میں دونوں گھٹنوں کے بیچ میں ہاتھ رکھنے) کا واقعہ ہے نیز یہ سعد کا قول ہے۔ ہم ایسا کرتے تھے چنانچہ حکم ہوا کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھیں۔

صاحب مغنی کی ابوسعید سے یہ روایت کہ ہم گھٹنوں سے پیشتر دونوں ہاتھ رکھتے تھے، پھر حکم ہوا کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھیں اولاً تو (واللہ اعلم) نام میں وہم ہوگیا ہے، چنانچہ نام ابوسعید نہیں سعد ہے، دوسرے جیسا کہ گذر چکا ہے متن میں بھی وہم ہوگیا ہے، یہ تو اصلاً تطبیق کے ضمن میں ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ابوہریرہ پہلی حدیث کو بخاری، ترمذی اور دارقطنی سبھوں نے معلول قرار دیا ہے۔ بخاری فرماتے ہیں محمد بن عبداللہ بن حسن کے علاوہ اور کوئی اس حدیث کو بیان نہیں کرتا، فرماتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ محمد کا ابوزناد سے سماع ثابت ہے یا نہیں۔

ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، ابوزناد سے یہی ایک سلسلہ ہے۔ دارقطنی کا ارشاد ہے کہ محمد بن عبداللہ بن حسن علوی عن ابی الزناد کی سند میں عبدالعزیز دراوردی منفرد ہیں۔ نسائی نے قتیبہ سے ایک اور روایت درج کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن نافع نے انھوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن علوی سے انھوں نے ابوزناد سے انھوں نے اعرج سے انھوں نے ابوہریرہ سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اپنی صلوٰۃ میں تم قصد کرکے اونٹ کی طرح بیٹھتے ہو[2]" اس میں آگے انھوں نے اور کچھ اضافہ نہیں کیا ہے، ابوبکر بن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ یہ سنت تنہا اہل مدینہ کی ہے، اس سلسلہ میں وہ دو سند رکھتے ہیں، ایک تو یہی جو ابھی گذر چکی ہے اور دوسری عبیداللہ سے مروی ہے جسے انھوں نے نافع سے انھوں نے ابن عمر سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

۱۔ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ (۶۲۸) میں آئی ہے، اس کی سند میں اسماعیل بن یحییٰ بن سلمہ "التقریب" للحافظ کے مطابق متروک اور ان کے صاحبزادے ابراہیم ضعیف ہیں، بیہقی نے ۲/۱۰۰ میں اس کی روایت کی ہے، حافظ نے الفتح ۲/۲۴۱ میں لکھا ہے کہ ابن خزیمہ کا دعویٰ ہے کہ ابوہریرہ کی حدیث سعد کی اس حدیث سے منسوخ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ نزاعی مسئلہ صاف ہو جاتا ہے مگر سلسلۂ روایت میں ابراہیم بن اسماعیل بن یحییٰ بن سلمہ بن کہیل عن ابیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔

۲۔ ترمذی (۲۶۹) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود۔ امام ترمذی فرماتے ہیں ابوہریرہؓ کی حدیث غریب ہے، ابوزناد سے یہی ایک سلسلہ ہے۔ ابوداؤد نے (۸۴۱) فی الصلاۃ، باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ۔ اور نسائی نے ۲/۲۰۷، فی افتتاح الصلاۃ: باب اول مایصل الی الارض من الانسان فی سجودہ، میں اس کی روایت کی ہے۔ سند جید ہے۔

دوسری سند کا جو حوالہ انھوں نے دیا ہے اس میں مراد وہ حدیث ہے جس کے راوی اصبغ بن فرج ہیں، وہ دراوردی سے اور وہ عبید اللہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافع سے اس میں حضرت عبداللہ بن عمر کا فعل مذکور ہے کہ وہ گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے، حاکم نے مستدرک کے اندر اس کی روایت محرز بن سلمہ سے انھوں نے دراوردی سے کی ہے، فرماتے ہیں کہ یہ مسلم کی شرط پر ہے[۱]۔ نیز حاکم نے یہ حدیث بطریق حفص بن غیاث عن عاصم احول اور انھوں نے حضرت انس سے ان کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تکبیر کہتے ہوئے نیچے گئے اور ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر پڑے، حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے، اس کے اندر مجھے کوئی علت نظر نہ آئی[۲]۔

میرے علم کی حد تک اس حدیث کے متعلق جب عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنے والد سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا "یہ حدیث منکر ہے۔ منکر انھوں نے (واللہ اعلم) اس لیے قرار دیا کہ سند میں علاء بن اسماعیل عطار مجہول ہیں۔ صحاح ستہ میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ ہیں دونوں گروہوں کی جانب سے پیش کردہ مرفوع احادیث۔

باقی صحابہ کرام سے صحیح روایات کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ دونوں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔ اس کا تذکرہ عبدالرزاق[۳] اور ابن منذر وغیرہ نے کیا ہے۔ یہی روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی ہے۔ نیز اس کا ذکر طحاوی نے فہد کی روایت سے، انھوں نے عمر بن حفص سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے اعمش سے انھوں نے ابراہیم سے، انھوں نے عبداللہ کے ساتھیوں علقمہ اور اسود سے کی ہے۔ یہ دونوں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کی صلوٰۃ کے باب میں ہمیں یاد ہے کہ وہ رکوع کے بعد گھٹنوں پر اونٹ کی طرح گرتے تھے۔ اور دونوں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھتے تھے۔ پھر حجاج بن ارطاۃ کی سند سے بھی روایت پیش کی ہے کہ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں عبداللہ بن مسعود سے ثابت ہے کہ ان کے دونوں گھٹنے زمین پر ہاتھوں سے پہلے پہنچتے تھے۔ انھوں نے ابو مرزوق سے انھوں نے وہب سے، انھوں نے شعبہ سے، انھوں نے مغیرہ سے نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے دریافت کیا کہ سجدہ میں جاتے ہوئے آدمی گھٹنوں سے پہلے ہاتھ سے ابتدا کرے تو کیسا ہے؟ فرمایا ایسا صرف احمق یا مجنون ہی کر سکتا ہے۔

ابن منذر فرماتے ہیں، اہل علم کا اس باب میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھنے والوں میں حضرت عمر بن الخطاب ہیں، یہی مذہب نخعی، مسلم بن یسار، ثوری، شافعی، احمد، اسحاق، ابو حنیفہ، ان کے ساتھیوں اور اہل کوفہ کا ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھے جائیں گے، یہ قول امام مالک کا ہے، امام اوزاعی فرماتے ہیں ہم نے لوگوں کو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھتے ہوئے دیکھا ہے، ابن ابی داؤد فرماتے ہیں۔ یہی قول اصحاب حدیث کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث دوسرے الفاظ میں بھی وارد ہے جس کا تذکرہ بیہقی نے کیا ہے اور وہ یہ ہیں

۱۔ مستدرک حاکم ۱/۲۲۶، سنن بیہقی ۲/۱۰۰، صحیح ابن خزیمہ (۶۲۷) سند صحیح ہے، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی ان کے موافق ہیں۔

۲۔ حاکم ۱/۲۲۶، علاء بن اسماعیل مجہول ہیں۔ لسان المیزان میں جہاں حافظ نے ان کے حالات زندگی قلمبند فرمائے ہیں وہاں لکھا ہے کہ اس حدیث کی تخریج دارقطنی نے ۱/۳۴۵ میں کی ہے۔ اور کہا ہے کہ علاء اس کی روایت میں منفرد ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ان کے خلاف روایت کیا ہے عمر بن حفص بن غیاث نے اور عمر اپنے باپ حفص سے روایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ثقہ ہیں۔ اس کی سند اس طرح ہے کہ عمر نے اپنے باپ سے اور ان کے والد نے اعمش سے، انھوں نے ابراہیم سے انھوں نے علقمہ وغیرہ سے انھوں نے عمر سے موقوفاً روایت کی ہے اور یہ بالکل ثابت ہے۔

۳۔ المصنف (۲۹۵۵)

"جب کوئی سجدہ میں جائے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ گھٹنوں پر پہلے اپنے ہاتھ رکھ لے[۱] "بیہقی فرماتے ہیں اگر یہ حدیث ثابت ہے تو اس بات کی دلیل ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھوں کو رکھ لے۔

وائل بن حجر کی حدیث چند وجوہ[۲] کی بنا پر اولیٰ ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقابلہ میں زیادہ ثابت ہے اس بات کا ذکر خطابی وغیرہ نے کیا ہے۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ کی حدیث جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مضطرب المتن ہے، کوئی یہ کہتا ہے دونوں گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھے کوئی اس کے برعکس کہتا ہے، کوئی کہتا ہے اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ لے اور کوئی اس فقرہ کو کلیتہً حذف کر دیتا ہے۔

۳۔ جیسا کہ اوپر آچکا ہے بخاری اور دارقطنی اسے معلول قرار دیتے ہیں۔

۴۔ اس کا ثابت ہونا مان بھی لیا جائے تاہم اہل علم کی ایک جماعت اس کی منسوخی کی قائل ہے، ابن منذر فرماتے ہیں ہمارے بعض اصحاب کا خیال ہے کہ گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھوں کو رکھنا منسوخ ہے اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

۵۔ صلوٰۃ میں اونٹ کی طرح بیٹھنے کی جو ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے یہ حدیث اس کے عین موافق ہے، جب کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث مخالف ہے۔

۶۔ حضرت عمر بن خطاب، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ سے جیسا کچھ منقول ہے یہ حدیث ٹھیک اس کے مطابق ہے، حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے موافق صرف حضرت عمر کی ایک روایت ہے، باوجودیکہ حضرت عمر کا خود اس سے اختلاف ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس کی روایتیں اس حدیث کے شواہد ہیں مگر کوئی شاہد حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے حق میں موجود نہیں ہے، اس اعتبار سے موازنہ کیا جائے تو وائل بن حجر کی حدیث مقدم اور جیسا کہ گذر چکا قوی تر بھی ہے، اس کے بعد اب کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے۔

۸۔ کثرت سے لوگوں کا مذہب اسی حدیث کے مطابق ہے، دوسری جانب صرف امام مالک اور اوزاعی ہیں، ابن ابی داؤد کا یہ قول کہ یہی اصحاب حدیث کا مذہب ہے اس سے مراد بعض ہیں اس لیے کہ احمد، شافعی اور اسحاق جیسے اصحاب حدیث کا مسلک اس کے برعکس ہے۔

۹۔ زیر بحث حدیث کے اندر بیان واقعہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی حکایت کی گئی ہے، لہٰذا اسے ثابت ہونے کا استحقاق ہے، کیونکہ جس حدیث میں بیان واقعہ ہوتا ہے حدیث کے ثابت ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔

۱۰۔ زیر بحث حدیث کے اندر جن افعال کی حکایت کی گئی ہے وہ دوسری روایت سے صحیح اور ثابت ہیں، لہٰذا یہ افعال صحیح اور مشہور ہوتے اور یہ بھی انھیں میں سے ایک فعل ہے لہذا اس کا حکم بھی وہی افعال صحیحہ مشہورہ کا ہوگا۔ اس کے مخالف حدیث کو یہ مقام حاصل نہیں اس لیے ترجیح اسے حاصل ہوگی۔ واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیچ دستار پر نہیں پیشانی اور ناک پر سجدہ کیا کرتے تھے۔ پیچ دستار پر سجدہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے نہ حسن سے، تاہم مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے

---

[۱] سنن کبریٰ للبیہقی ۲/۱۰۰۔

[۲] سابقہ تعلیقات سے یہ حقیقت بالکل روشن ہے کہ مرجح مصنف کے خیال کے برعکس ہے، صحت سند کی رو سے حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہی کو وائل کی حدیث پر ترجیح حاصل ہے، اس حدیث میں اضطراب کا جو دعویٰ کیا گیا ہے ان تمام ہی روایات کے ضعف کے پیش نظر جن میں اضطراب ہوتا ہے ساقط ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچ دستار پر سجدہ کرتے تھے[1] مگر یہ روایت عبداللہ بن محرَّر کی ہے جو متروک ہیں، ابو احمد زبیری نے اسے جابر کی روایت قرار دیا ہے مگر حقیقت میں یہ عمرو بن شمر کی حدیث ہے جسے انھوں نے جابر جعفی سے روایت کی ہے، یہ بھی متروک ہیں۔ متروک، متروک سے روایت کر رہا ہے، ابوداؤد نے مراسیل کے اندر ایک روایت درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو مسجد میں صلوٰۃ پڑھتے دیکھا، اس نے پیشانی پر سجدہ کیا، مگر اس پر عمامہ باندھ رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہٹا کر پیشانی کھول دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر زمین پر سجدہ کرتے تھے۔ گیلی مٹی، کھجور کی پتیوں سے بنے ہوئے سجادہ اور چٹائی اور دباغت دیئے گئے چمڑے پر بھی سجدہ کرتے تھے۔

سجدہ میں جاتے تو پیشانی اور ناک زمین سے ٹیک دیتے، ہاتھوں کو پہلوؤں سے اس حد تک دور رکھتے کہ بغل کی سفیدی نظر آجاتی اور بکری کا کوئی بچہ نیچے سے گذرنا چاہے تو گذر سکتا تھا۔

دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں تک اور کانوں کے محاذ میں رکھتے تھے، صحیح مسلم میں حضرت براء سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "سجدہ میں جاؤ تو ہتھیلیاں رکھ دو اور کہنیاں بلند کرو"[2]

سجدہ میں اعتدال ہوتا تھا۔ پیروں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتی تھیں۔

پنجوں اور انگلیوں کو اس طرح بچھاتے تھے کہ ان کے درمیان نہ تو فاصلہ ہوتا تھا نہ سمٹاؤ صحیح ابن حبان میں وارد ہے کہ "جب رکوع میں جاتے تو انگلیوں کو کشادہ رکھتے اور سجدہ میں جاتے تو انھیں ملا لیتے"[3]

سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى"[4] (پاک ہے، میرا پروردگار اعلیٰ اور برتر) اور اس کے پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے۔

اور کبھی یہ بھی پڑھتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي[5]

پاک ہے تو اے اللہ ہمارے رب اور تعریف تیری، اے اللہ! مجھے بخش دے۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ[6]

تمام عیوب سے پاک اور مقدس ہے فرشتوں اور روح الامین کا پروردگار ہے۔

---

[1] المصنف (۱۵۶۴)

[2] مسلم (۴۹۴) فی الصلاۃ : باب الاعتدال فی السجود ووضع الکفین علی الارض۔ مسند احمد ۴/۲۸۳ و ۲۹۴۔

[3] ابن حبان (موارد) (۴۸۸) فی الصلاۃ : صحیح ابن خزیمہ (۵۹۴)، مستدرک حاکم ۱/۲۲۷، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی تائید کی ہے، غلط صلوٰۃ پڑھنے والے کو آپ نے اس کا حکم دیا چنانچہ ارشاد ہے "جب رکوع میں جاؤ تو ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر رکھو اور انگلیوں کے درمیان کشادگی پیدا کرلو"۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

[4] مسلم (۷۷۲) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب القرأۃ فی صلاۃ اللیل، ترمذی (۲۶۲) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود۔ ابوداؤد (۸۷۱) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، النسائی ۲/۲۲۴، فی افتتاح الصلاۃ : باب نوع آخر، ابن ماجہ (۸۸۸) فی الاقامۃ : باب التسبیح فی الرکوع والسجود، مسند احمد ۵/۳۸۲ و ۳۸۴ و ۳۸۹ و ۳۹۴ و ۳۹۷ و ۳۹۸ و ۴۰۰۔ حدیث حذیفہ۔ اس باب میں ترمذی (۲۶۱) اور ابوداؤد (۸۸۶) میں عبداللہ بن مسعود سے بھی روایت ہے۔ حکم دینے کی روایت احمد، ابوداؤد (۸۶۹) اور ابن ماجہ (۸۸۷) نے عقبہ بن عامر کی حدیث سے کی ہے۔

[5] حضرت عائشہ کی روایت میں ہے، یہ گذر چکی ہے۔

[6] یہ بھی حضرت عائشہ کی روایت میں ہے۔ اوپر گذر چکی ہے۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ [1]

پاک ہے تو اے اللہ اور تیری تعریف ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ [2]

اے اللہ! میں تیری ناراضگی سے تیری رضا، تیری سزا سے تیرے عفو، اور تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ تیری کتنی تعریف ہے میں اسے شمار نہیں کر سکتا، تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنی تعریف کی ہے۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ [3]

اے اللہ! میں نے تیرا سجدہ کیا تجھ پر ایمان لایا۔ تیرے آگے سر افگندہ ہوا۔ میرا چہرہ اس کے آگے سجدہ ریز جس نے اسے پیدا کیا اس کی تصویر بنائی، آنکھ اور کان دیئے، مبارک اللہ تمام پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي كُلَّهُ دِقَّهُ وَجِلَّهُ وَأَوَّلَهُ وَآخِرَهُ وَعَلَانِيَتَهُ وَسِرَّهُ [4]

اے اللہ! میرے لیے تمام گناہ چھوٹے بڑے اگلے پچھلے، کھلے چھپے سب بخش دے۔

اور کبھی یہ پڑھتے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيْئَتِي وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي فِي أَمْرِي وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي وَخَطَئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ۔ أَنْتَ إِلٰهِي۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ [5]

اے اللہ! میرے لیے میری خطا، میری نادانی اپنے حق میں اسراف اور ان لغزشوں کو بخش دے جنھیں تو مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اے اللہ! بخش دے میری سنجیدگی و مذاق اور میری نادانستگی اور دانستگی کی خطاکاری (یہ ساری باتیں مجھ میں موجود ہیں)۔

---

[1] مسلم (۴۸۵) فی الصلاۃ : باب مایقال فی الرکوع والسجود، نسائی ۲/۲۲۳، فی افتتاح الصلاۃ : باب نوع آخر، مسند احمد ۶/۱۵، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[2] مسلم (۴۸۶) فی الصلاۃ : باب مایقال فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۹) فی الصلاۃ : باب الدعاء فی الرکوع والسجود، نسائی ۲/۲۲۲، فی الافتتاح : باب الدعاء فی السجود، مسند احمد ۱/۵۸، و ۲۰۱، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[3] صحیح مسلم کی روایت۔ حدیث علی اوپر گذر چکی ہے۔

[4] مسلم (۴۸۳) فی الصلاۃ : باب مایقال فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۸) فی الصلاۃ : باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود۔ حدیث ابوہریرہ۔

[5] بخاری ۱۱/۱۶۶ و ۱۶۷، فی الدعوات : باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت۔ مسلم (۲۷۱۹) فی الذکر والدعاء : باب التعوذ من شرما عمل۔ حدیث ابوموسیٰ اشعری یہ دعا مطلقاً آئی ہے۔ حدیث میں اس کی جگہ کا تعین نہیں ہے۔ آخری فقرہ "اللھم اغفرلی . . . " مسلم (۷۷۱) حضرت علی کی حدیث کا ہے آپ اسے تشہد اور سلام کے درمیان پڑھتے تھے۔ یہ فقرہ مسلم (۷۶۹) ہی کے یہاں عبداللہ بن عباس کی حدیث میں بغیر تعیین کے آیا ہے۔

اے اللہ! جو گناہ آگے کیے اور جو پیچھے جو چھپا کر اور جو کھلے طور پر کیے انھیں میرے لیے بخش دے۔ تو میرا اللہ ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔
اور کبھی یہ پڑھتے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا۔[1]

اے اللہ! میرے دل میں روشنی، میرے کان میں روشنی، میری آنکھ میں روشنی، میرے داہنے روشنی، میرے بائیں روشنی، میرے آگے روشنی، میرے پیچھے روشنی، میرے اوپر روشنی، اور میرے نیچے روشنی پیدا کر دے اور میرے لیے نور بنا دے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں محنت سے دعا کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "یہ قبول ہو کر رہتی ہے[2]" اس حکم سے مراد سجدوں میں کثرت دعا ہے یا یہ ہے کہ دعا کرنے والا جب بھی دعا کرے سجدوں میں کرے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حدیث کا عمدہ محل یہ ہوگا کہ دعائیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جس میں حمد و ثنا کا مضمون ہوتا ہے دوسری وہ جس میں بندہ پروردگار سے درخواست کرتا ہے، دونوں ہی قسم کی دعائیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدوں میں بکثرت مانگتے تھے۔ حدیث میں جس دعا کا حکم ہے وہ ان دونوں ہی قسم کی دعاؤں کو شامل ہے۔

قبولیت دعا کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ درخواست کرنے والے کی درخواست منظور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ حمد و ثنا کرنے والے کو اجر و ثواب سے نوازا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ بقرہ: ۱۸۶" (دعا کرنے والے کی دعا جب کہ پکارتا ہے میں قبول کرتا ہوں) کی تفسیر قبولیت دعا کی دونوں قسموں سے کی گئی ہے۔ اور حق بھی یہی ہے کہ یہ دونوں ہی قسمیں مراد ہیں۔

قیام اور سجدہ میں افضل کون؟

اس بات میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ قیام اور سجدہ میں افضل کون ہے چنانچہ ایک گروہ قیام کو بوجوہ ذیل سجدہ سے افضل تصور کرتا ہے۔

۱۔ قیام کا ذکر تمام اذکار سے افضل ہے لہذا قیام تمام ارکان سے افضل ہوا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ۔ بقرہ: ۲۳۸" (اور اللہ کے ہو کر کے قیام کرو)۔
۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "سب سے افضل صلوٰۃ یہ ہے کہ قیام کو طول دیا جائے"[3]

ایک گروہ سجدہ کو افضل قرار دیتا ہے اور احتجاج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کرتا ہے "بندہ اپنے پروردگار سے سب سے قریب اس وقت ہوتا ہے جب سجدہ میں ہوتا ہے"[4]

---

[1] صحیح مسلم (۷۶۳) (۱۸۷) فی صلاۃ المسافرین: باب الدعا فی صلاۃ اللیل۔

[2] مسلم (۴۷۹) فی الصلاۃ: باب النهی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود۔ ابوداؤد (۸۷۶) فی الصلاۃ: باب مایقول فی رکوعه وسجوده، نسائی ۲/۲۱۷، ۲۱۸ فی الافتتاح: باب الامر بالاجتهاد فی الدعا فی السجود، مسند احمد ۱/۲۱۹، حدیث عبداللہ بن عباس۔

[3] مسلم (۷۵۶) فی صلاۃ المسافرین: باب افضل الصلاۃ طول القنوت، ترمذی (۳۸۷) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی طول القیام فی الصلاۃ، ابن ماجہ (۱۴۲۱) فی الاقامة: باب ماجاء فی طول القیام فی الصلوات، مسند احمد ۳/۳۰۲ و ۳۹۱۔ حدیث جابر بن عبداللہ۔ نسائی ۵/۵۸، فی الزکوٰۃ: باب جهد المقل اور احمد نے مسند ۳/۴۱۲ کے اندر اس کی عبداللہ بن حبشی خثعمی سے ایک لمبی حدیث میں روایت کی ہے۔

(حاشیہ "[4]" اگلے صفحہ پر)

نیز استدلال میں معدان بن ابی طلحہ کی وہ حدیث بھی پیش کرتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور کہا کہ کوئی ایسی بات بتایئے جس سے مجھ کو نفع ہو سکے فرمایا "سجدے کرو" کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "کسی بندہ نے جہاں اللہ کے لیے کوئی سجدہ کیا اللہ وہیں اس سجدہ کے باعث اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور اس سے ایک گناہ کم کر دیتا ہے۔" معدان فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ابو درداء سے ملاقات ہوئی ان سے بھی اسی طرح کا سوال کیا تو انھوں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیعہ بن کعب اسلمی سے جنھوں نے آپ سے جنت کی رفاقت کی درخواست کی تھی فرمایا "کثرت سے سجدے کر کے اپنے حق میں میری مدد کرو۔"[۲]

سب سے پہلی سورہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی صحیح تر قول کے مطابق وہ سورۂ اقرأ تھی۔ اس کا خاتمہ حسب ذیل فقرہ پر ہوتا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق : ۱۹) اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

سجدہ کی افضلیت کی دلیل یہ بھی ہے کہ علوی و سفلی تمام مخلوقات اللہ کے آگے سربسجدہ ہیں۔ اور یہ بھی کہ ساجد سب سے زیادہ ذلیل اور پست اسی حال میں ہوتا ہے یہ بندگی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں بندہ اپنے پروردگار سے سب سے قریب ہوتا ہے، مزید برآں سجدہ ہی عبودیت کا راز ہے۔ کیونکہ عبودیت ذلت و انکساری اور خضوع کا نام ہے۔ طریق معبّد اس راستہ کو کہتے ہیں جسے چلتے چلتے پیروں نے پست کر دیا ہو۔ بندہ سب سے زیادہ پست اس وقت ہوتا ہے جب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔

ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ طول قیام شب میں اور کثرت رکوع و سجود دن میں زیادہ افضل ہے۔ اس گروہ کا استدلال یہ ہے کہ شب کی صلوٰۃ کو خصوصیت سے قیام کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُمِ اللَّيْلَ (مزمل : ۱) شب میں صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا[۳] رمضان میں جو صلوٰۃ کے لیے ایمان اور ثواب کی خاطر قیام کرے گا۔

---

[۴] (حاشیہ صفحہ گذشتہ) مسلم (۴۸۲) فی الصلاۃ : باب مایقال فی الرکوع والسجود، ابوداؤد (۸۷۵) فی الصلاۃ : باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود، نسائی ۲/۲۲۶، فی افتتاح الصلاۃ : باب اقرب مایکون العبد من اللہ عزوجل، حدیث ابوہریرہ، پورے الفاظ یہ ہیں "لہٰذا کثرت سے دعا کرو"

---

[۱] مسلم (۴۸۸) فی الصلاۃ : باب فضل السجود والحث علیہ، ترمذی (۳۸۸) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی کثرۃ السجود وفضلہ، نسائی ۲/۲۲۸، فی افتتاح الصلاۃ : باب ثواب من سجد للہ عزوجل سجدۃ، ابن ماجہ (۱۴۲۳) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی کثرۃ السجود، الفاظ اصحاب سنن کے ہیں۔

[۲] مسلم (۴۸۹) فی الصلاۃ : باب فضل السجود والحث علیہ، ابوداؤد (۱۳۲۰) فی الصلاۃ : باب وقت قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل، نسائی ۲/۲۲۷، فی افتتاح الصلوٰۃ : باب فضل السجود، حدیث ربیعہ بن کعب اسلمی۔

[۳] بخاری ۴/۲۱۷، فی صلاۃ التراویح : باب فضل من قام رمضان وباب فضل لیلۃ القدر، وفی الایمان : باب قیام لیلۃ القدر من الایمان وباب تطوع قیام رمضان من الایمان، وفی الصوم من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ، مسلم (۷۵۹) فی صلاۃ المسافرین : باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح، مؤطا ۱/۱۱۳، فی الصلاۃ فی رمضان: باب الترغیب فی الصلاۃ فی رمضان، ترمذی (۶۸۳) فی الصوم : باب ماجاء فی فضل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہی وجہ ہے کہ قیام نہار نہیں قیام لیل کہا گیا ہے۔ (ورنہ صلوات تو دن میں بھی پڑھی جاتی ہیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت تھی۔ آپ نے شب میں گیارہ یا تیرہ رکعتوں سے زیادہ صلوٰۃ نہیں پڑھی ہے۔[1]

بعض راتوں میں آپ ایک رکعت کے اندر سورہ بقرہ، آل عمران اور سورۃ نساء پڑھتے تھے[1]، دن میں اس طرح کی سورتوں کا پڑھنا آپ سے کہیں بھی ثابت نہیں۔ بلکہ سنتیں ہلکی پڑھنا ہی ثابت ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ افضلیت میں دونوں یکساں ہیں۔ ذکر یعنی قرأت کے اعتبار سے قیام افضل ہے اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے سجدہ افضل ہے لہذا سجدہ کی ہیئت قیام کی ہیئت سے اور قیام کا ذکر سجدہ کے ذکر سے افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اسی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کا قیام طویل ہوتا تو رکوع وسجود بھی طویل کر دیتے، جیسا کہ صلوٰۃ کسوف اور صلوٰۃ لیل میں آپ کا دستور تھا۔ قیام ہلکا فرماتے رکوع و سجود بھی ہلکا کر دیتے ایسا ہی فرض صلوات میں آپ کا طریقہ تھا جیسا کہ براء بن عازب نے کہا ہے "آپ کا قیام، رکوع، سجود اور سیدھا ہونا تقریباً سب برابر تھے" واللہ اعلم۔

دونوں سجدوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسہ کی کیفیت

پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سر اٹھاتے۔ رفع الیدین نہیں کرتے سجدہ سے اٹھتے ہی سر ہاتھوں سے پہلے اٹھاتے پھر بایاں پیر پھیلا کر اس پر بیٹھتے۔ دایاں پیر کھڑا رکھتے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے نسائی نے ذکر کیا ہے کہ صلوٰۃ کی سنت یہ تھی کہ آپ دایاں پیر کھڑا رکھتے، انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں، اور بائیں پیر پر بیٹھ جاتے تھے[2]۔ اس جگہ آپ سے اس کیفیت کے سوا کچھ ثابت نہیں ہے۔

دونوں ہاتھ دونوں رانوں پر رکھتے اور اپنی ایک کہنی ران پر اور دوسرے ہاتھ کا کنارہ اپنے گھٹنے پر اور اپنی دو انگلیاں سمیٹ لیتے اور ایک حلقہ بناتے۔ پھر اپنی انگلی اٹھاتے اس سے دعا کرتے اور حرکت دیتے رہتے۔ وائل بن حجر نے آپ سے یہی کیفیت بیان کی ہے[3]۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت سے ابوداؤد کی یہ حدیث "کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا پڑھتے ہوئے انگلی سے اشارہ کرتے تھے ہلاتے نہیں تھے[4]"، اس میں عدم تحریک کی زیادتی محل نظر ہے۔ صحیح مسلم میں یہ پوری حدیث بیان ہوئی ہے مگر مذکورہ بالا اضافہ نہیں ہے بلکہ یوں ہے:

(بقیہ صفحہ گذشتہ) شہر رمضان، ابوداؤد (۱۳۷۱) فی الصلاۃ: باب فی قیام شہر رمضان، نسائی ۲۰۱/۳، فی صلاۃ اللیل: باب ثواب من قام رمضان ایمانا واحتسابا، حدیث ابوہریرہ۔

[1] صحیح مسلم (۷۷۲) فی صلاۃ المسافرین: باب استحباب تطویل القراءۃ، حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ، مسند احمد ۳۸۴/۵ و ۳۹۷۔

[2] نسائی ۳۶/۳، فی الصلاۃ: باب موضع الکفین۔ حدیث ابن عمر اس میں یہ ہے "دایاں پیر کھڑا کر لیتے اور بائیں کو بچھا دیتے" سند صحیح ہے۔ بخاری ۲۵۲/۲، میں ابن عمر کا قول اس طرح آیا ہے "صلوٰۃ کی سنت یہ ہے کہ دایاں پیر کھڑا رکھو اور بایاں موڑ لو"۔

[3] ابوداؤد (۹۵۷) فی الصلاۃ: باب کیف الجلوس فی التشہد، نسائی ۳۵/۳، فی السہو: باب موضع المرفقین۔ مسند احمد ۳۱۸/۴۔ سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۷۱۴) اور ابن حبان (۴۸۵) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4] ابوداؤد (۹۸۸) نسائی ۳۷/۳، ۳۸۔ سند حسن ہے، نووی نے المجموع ۴۵۴/۳ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ میں بیٹھتے تو بایاں پیر ران اور پنڈلی کے درمیان کر لیتے اور دایاں پیر کھڑا کر لیتے بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ داہنی ران پر رکھتے اور انگلی سے اشارہ کرتے۔[1]

علاوہ ازیں آپ سے ابوداؤد نے جو روایت کی ہے اس میں یہ نہیں ہے کہ ایسا آپ صلوٰۃ کے اندر کرتے تھے پھر اگر صلوٰۃ کے اندر مان بھی لیا جائے تو یہ نافی ہے، حضرت وائل بن حجر کی حدیث ثبت ہے اور مثبت نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ نیز یہ حدیث صحیح بھی ہے۔ صحیح ابو حاتم میں اس کا ذکر آیا ہے[2]

پھر دونوں سجدوں کے درمیان حسب ذیل دعا پڑھتے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاجْبُرْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي۔

اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، میری شکستگی کی اصلاح فرما، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما۔

حضرت ابن عباس نے یہ دعا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے[3]

حذیفہ فرماتے ہیں آپ کی دعا کے الفاظ یہ تھے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي رَبِّ اغْفِرْ لِي[4] پروردگار مجھے بخش دے، پروردگار مجھے بخش دے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جلسہ بین السجدتین کو سجدہ کے بقدر طول دیتے، تمام احادیث سے یہی ثابت ہے۔ صحیح میں حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان اتنی دیر تک بیٹھتے کہ ہم کہتے آپ کو وہم ہو گیا[5] زمانۂ صحابہ کے بعد اکثر لوگوں نے یہ سنت ترک کر دی۔ چنانچہ حضرت ثابت فرماتے ہیں "حضرت انس جیسا کرتے تھے ویسا تم لوگ نہیں کرتے ہو وہ دونوں سجدوں کے درمیان اتنی دیر تک بیٹھتے کہ ہمیں خیال ہوتا شاید بھول گئے ہیں یا وہم ہو گیا ہے[6]

باقی جو سنت کو فیصل مانتا ہے اور اس کے مخالف کی طرف توجہ نہیں کرتا وہ اس سنت کے مخالف چیزوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

---

[1]۔ مسلم (۵۷۹) فی المساجد ومواضع الصلاۃ : باب صفۃ الجلوس فی الصلاۃ۔

[2]۔ موارد (۴۸۵) سند صحیح ہے۔

[3]۔ ترمذی (۲۸۴) فی الصلاۃ : باب مایقول بین السجدتین، ابوداؤد (۸۵۰) فی الصلاۃ : باب الدعاء بین السجدتین، ابن ماجہ (۸۹۸) فی الاقامۃ : باب مایقول بین السجدتین، بیہقی ۱۲۲/۲۔ حاکم ۲۷۱/۱ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی موافق ہیں۔

[4]۔ ابن ماجہ (۸۹۷) فی الاقامۃ : باب مایقول بین السجدتین، سند حسن ہے۔ ابوداؤد (۸۷۴) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، نسائی ۲۳۱/۲، فی افتتاح الصلاۃ : باب الدعاء بین السجدتین، اس میں ایک راوی کا نام نہیں لیا گیا ہے، حاکم ۲۷۱/۱، نے بھی اس کی روایت کی ہے مگر "رب اغفرلی" کی تکرار ان کے یہاں نہیں ہے۔ انھوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[5]۔ مسلم (۴۷۳) فی الصلاۃ : باب اعتدال ارکان الصلاۃ۔ اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

[6]۔ بخاری ۲۴۹/۲، فی صفۃ الصلاۃ : باب المکث بین السجدتین، مسلم (۴۷۲) فی الصلاۃ : باب اعتدال ارکان الصلاۃ، پوری حدیث یہ ہے "حضرت انس روایت کرتے ہیں انھوں نے فرمایا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوٰۃ پڑھاتے دیکھا ہے اس طرح تمھیں صلوٰۃ پڑھانے میں کوتاہی نہ کروں گا۔" فرماتے ہیں کہ "انس کچھ ایسا کرتے تھے جیسا تم لوگ نہیں کرتے، رکوع سے سر اٹھاتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے خیال گذرتا کہ بھول گئے ہیں، سجدہ سے سر اٹھاتے تو اتنی دیر رکتے کہ خیال ہوتا کہ بھول گئے ہیں" وہم کی بات اس روایت میں نہیں بلکہ ماقبل کی روایت کے اندر آیا ہے۔

جلسۂ استراحت

پھر آپ رانوں کا سہارا لے کر گھٹنوں اور پیروں کے سروں پر زور دے کر اٹھتے تھے ایسی ہی کیفیت کا حضرت وائل اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے تذکرہ کیا ہے[1] آپ ہاتھوں سے زمین کا سہارا لے کر نہیں اٹھتے تھے[2] مالک بن حویرث نے روایت کی ہے کہ جم کر بیٹھنے کے بعد اٹھتے تھے[3] اسی کو جلسۂ استراحت کہتے ہیں۔

جلسۂ استراحت کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مسنون ہے اور ہر ایک کے لیے اس کا کرنا مستحب ہے مگر بعض لوگ مسنون نہیں مانتے صرف ضرورتمند کے لیے جائز قرار دیتے ہیں۔ خلال فرماتے ہیں کہ جلسۂ استراحت کے باب میں احمد کی بنیاد مالک بن حویرث کی حدیث ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "یوسف بن موسیٰ نے مجھے بتایا کہ اٹھنے کے بارے میں ابوامامہ سے پوچھا گیا تو فرمایا" رفاعہ کی حدیث کے مطابق دونوں پیروں کے سروں پر زور دے کر اٹھا جائے گا۔ ابن عجلان کی حدیث میں بھی اس بات کی دلیل موجود ہے کہ آپ دونوں قدموں کے سروں پر زور دے کر اٹھتے تھے مختلف صحابہ اور ان سارے ہی لوگوں نے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیتِ صلوٰۃ بیان کی ہے اس جلسہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا تذکرہ صرف ابوحمید اور مالک بن حویرث کی حدیثوں میں ہے۔ اگر یہ دائمی طور پر آپ کا طریقہ تھا تو یقیناً جن لوگوں نے آپ کے صلوٰۃ پڑھنے کی تصویر کھینچی ہے وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ مجرد آپ کا فعل اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ صلوٰۃ کی سنتوں میں داخل ہے۔ ہاں دلیل اس وقت بنے گا جب قرینہ موجود ہو کہ آپ نے یہ طریقہ لائق اتباع سنت قرار پانے کے لیے اختیار فرمایا۔ مگر جب یہ مانا جائے کہ ضرورت کے پیش نظر آپ نے یہ جلسہ اختیار فرمایا تھا تو پھر اس میں اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ صلوٰۃ کی سنتوں میں داخل ہے اس مسئلہ میں تحقیق کی بنیاد یہی ہے۔

---

[1] وائل بن حجر کی حدیث کا تذکرہ رکوع سے سجدہ میں جانے کی کیفیت کے بیان میں آچکا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے، ابوہریرہ کی حدیث کی تخریج سعید بن منصور نے جیسا کہ حافظ نے الفتح ۲/۲۵۰ میں کہا ہے ضعیف سند سے کی ہے۔

[2] بخاری ۲/۲۵۰ نے فی صفۃ الصلاۃ : باب کیف یعتمد علی الارض اذا قام من الرکعۃ میں مالک بن حویرث کی جو حدیث پیش کی ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس میں آیا ہے "سجدۂ ثانیہ سے جب سر اٹھاتے تو بیٹھ جاتے اور زمین کا سہارا لیتے پھر کھڑے ہوتے"۔ اسحاق حربی نے ایک بہتر سند سے روایت کی ہے کہ آپ صلوٰۃ میں ہاتھ سے زمین کا سہارا لیتے تھے۔ ہاتھوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ بیہقی نے بھی اسی مفہوم کی حدیث صحیح سند سے بیان کی ہے۔

[3] بخاری ۲/۲۴۹ فی صفۃ الصلاۃ : باب من استوی قاعدا فی وتر من صلاتہ، ترمذی (۲۸۷) فی الصلاۃ : باب ماجاء کیف النھوض من السجود۔ ابوداؤد (۸۴۴) فی الصلاۃ : باب النھوض فی الفرد، نسائی ۲/۲۳۴ فی افتتاح الصلاۃ : باب الاستواء للجلوس عند الرفع۔

[4] نووی "المجموع" ۳/۴۴۳ میں فرماتے ہیں : ہمارا صحیح اور مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، یہی قول مالک بن حویرث، ابوحمید، ابوقتادہ، صحابہ کی ایک جماعت اور ابوقلابہ وغیرہ تابعین کا ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں، یہی مذہب ہمارے اصحاب کا ہے اور یہی داؤد اور ایک روایت کے مطابق احمد کا بھی ہے۔ زیادہ تر یا اکثریت کا قول یہ ہے کہ یہ مستحب نہیں ہے، بلکہ سجدہ سے سر اٹھاتے ہی کھڑے ہو جائیں گے۔ ابن منذر نے اسے ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، ابوزناد، مالک، ثوری، اصحاب رائے احمد اور اسحاق کا مذہب بتایا ہے۔ کہتے ہیں کہ نعمان بن ابوعیاش نے فرمایا "بیشتر صحابہ کو میں نے ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے احمد فرماتے ہیں۔ اکثر احادیث اسی کے مطابق ہیں احتجاج میں صلوٰۃ خراب پڑھنے والے کی حدیث پیش کی ہے۔ حالانکہ اس میں جلسۂ استراحت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نووی فرماتے ہیں" ہمارے اصحاب نے مالک بن حویرث کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوٰۃ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ جب طاق رکعت میں ہوتے تو جم کر بیٹھے بغیر اٹھتے نہ تھے۔

اٹھتے تو پھر فوراً ہی قرأت شروع کرتے۔ افتتاح صلوٰۃ کے موقع پر جس طرح خاموشی اختیار فرماتے تھے ویسے یہاں خاموش نہیں رہتے۔ چنانچہ فقہاء میں اختلاف ہے کہ آیا یہ مقام تعوذ پڑھنے کا ہے یا نہیں۔ جب کہ سب متفق ہیں کہ یہ مقام بہر حال افتتاحی مقام نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مسئلہ کے باب میں یہاں دو اقوال ملتے ہیں جو احمد سے مروی ہیں۔ امام احمد کے بعض اصحاب نے ان دونوں اقوال کی بنیاد اس مسئلہ پر رکھی ہے کہ صلوٰۃ کی قرأت ایک ہی ہے، یا ہر رکعت اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی بات ہے تو صرف ایک تعوذ کافی ہے، تاہم ان کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مجموعۂ صلوٰۃ کا افتتاح اور ایک ہی تعوذ پر اکتفا کرنا اس صحیح حدیث کے پیش نظر بالکل واضح ہے۔ جس کی روایت ابو ہریرہ نے کی ہے، فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسری رکعت سے اٹھتے تھے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی قرأت شروع کرتے اور خاموش نہیں رہتے تھے۔ یہاں ایک ہی تعوذ کافی ہے۔ کیونکہ دونوں قرأتوں کے درمیان سکوت نہیں ہوتا۔ بلکہ اذکار ہوتے ہیں جیسے قرأت واحدہ ہی کے اندر اللہ کی حمد بھی ہوتی ہے، تسبیح بھی، تہلیل بھی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا جاتا ہے [۲]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت ہی کی طرح دوسری رکعت بھی ادا فرماتے تھے۔ چار باتیں مستثنیٰ تھیں۔ سکوت، افتتاح، تکبیر تحریمہ اور پہلی رکعت کی طرح طول دینا۔ کیونکہ اس رکعت میں نہ آپ افتتاحی کلمات ادا فرماتے، نہ خاموش رہتے نہ تکبیر تحریمہ بلند فرماتے، اور اسے پہلی رکعت کے مقابلہ میں مختصر پڑھتے۔ چنانچہ ہر صلوٰۃ میں جیسا کہ گذر چکا ہے پہلی رکعت دوسری کے مقابلہ میں طویل ہوتی تھی۔

تشہد کے لیے بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور دایاں ہاتھ داہنی ران پر رکھتے تھے۔ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے، اسے پوری طرح نہ تو کھڑی رکھتے نہ بالکل سلا دیتے بلکہ تھوڑا سا موڑ رکھتے تھے۔ اور کچھ کچھ حرکت دیتے تھے۔ جیسا کہ وائل بن حجر کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ دونوں انگلیوں خنصر اور بنصر (چھنگلی اور اس کے پاس کی انگلی) کو سمیٹ کر بیچ کی انگلی انگوٹھے سے ملا کر ایک حلقہ بناتے اور شہادت کی انگلی اٹھا کر دعا پڑھتے تھے۔ نگاہ کو اسی انگلی پر مرکوز رکھتے، بائیں ہتھیلی کو بائیں ران پر پھیلا کر اسی پر اپنا بوجھ ڈالتے تھے۔

نشست کا انداز بالکل وہی ہوتا تھا جو دونوں سجدوں کے درمیان ہوتا اس کی کیفیت اوپر گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں اور کچھ مروی نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں بیٹھتے تھے تو بایاں پیر ران اور پنڈلی کے درمیان کر لیتے اور دایاں پیر پھیلا لیتے تھے [۳] یہ آخری تشہد کی کیفیت ہے جیسا کہ آگے آئے گا نشست کے دونوں طریقے جو آپ سے مروی ہیں ان میں سے یہ ایک ہے۔ صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیتِ صلوٰۃ کے باب میں ابو حمید کی حدیث آئی ہے کہ آپ دو رکعتوں کے بعد بیٹھتے تو بائیں پیر پر بیٹھتے اور دوسرا کھڑا کر لیتے اور آخری رکعت میں بیٹھتے تو بایاں پیر آگے بڑھا کر داہنا پیر کھڑا کر لیتے اور مقعد پر بیٹھتے [۴]۔ چنانچہ ابو حمید کے مطابق دایاں پیر کھڑا کرتے تھے

---

[۱] - مسلم (٥٩٩) فی المساجد و مواضع الصلاۃ : باب مایقال بین تکبیرۃ الاحرام والقرأۃ۔

[۲] - نووی "المجموع" ٣/٣٢٦ میں فرماتے ہیں : صحیح تر ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ تعوذ رکعت کے اندر مستحب ہے۔ ابن سیرین کا بھی یہی قول ہے۔ مگر عطاء، حسن، نخعی، ثوری اور ابو حنیفہ تعوذ کو پہلی رکعت سے خاص مانتے ہیں۔

[۳] - مسلم (٥٧٩) فی المساجد و مواضع الصلاۃ ، باب صفۃ الجلوس فی الصلاۃ۔

[۴] - بخاری ٢/٢٥٢، ٢٥٤ فی صفۃ الصلاۃ ، باب سنۃ الجلوس فی التشہد۔ مسلم کی جانب اس کی نسبت وہم ہے۔

اور ابن زبیر کے مطابق اسے پھیلا دیتے تھے۔ تشہد اول میں کسی کا یہ قول نہیں ہے کہ آپ کے بیٹھنے کا یہی طریقہ تھا۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ایسا کسی نے کہا ہے، بلکہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ دونوں تشہدوں میں آپ کولھے پر بیٹھتے تھے۔ (یعنی دایاں کولھا دائیں پیر پر اس طرح کہ پیر کھڑا ہوتا اور انگلیاں قبلہ رُخ ہوتیں اور بایاں کولھا زمین سے چمٹا ہوا۔ دائیں پہلو سے بایاں پیر نکالے ہوئے) یہ امام مالک رحمۃ اللہ کا مذہب ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ دونوں تشہد میں دایاں پیر کھڑا کر لیتے اور بائیں کو پھیلا کر اس پر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ سلام سے قریب ہر تشہد کے اندر کولھے پر بیٹھتے اور دوسرے تشہد میں بچھا دیتے تھے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ ہر دو تشہد والی صلوٰۃ میں آخری تشہد کے اندر آپ کولھے پر بیٹھتے تھے۔ یہ لوگ دونوں نشستوں میں فرق کرتے ہیں، امام احمد کا قول یہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی حدیث میں دایاں پیر بچھانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس انداز میں آپ مقعد پر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ دایاں پیر بچھا ہوتا بایاں پیر ران اور پنڈلی کے مابین اور مقعد زمین پر رکھتے۔ اختلاف یہ ہے کہ اس نشست میں دایاں پیر بچھا ہوتا یا کھڑا؟ مگر واللہ اعلم حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ آپ پیر پر بہت بیٹھتے تھے بلکہ داہنے جانب سے اسے نکلا ہوا رکھتے تھے گویا کھڑے ہونے اور بچھنے کی درمیانی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ اس طرح ہوتا کہ اس کے نچلے حصے کا داہنا کنارہ زمین پر ہوتا تھا اس معنی میں اسے بچھائے رکھتے تھے کہ اسے اس طرح کھڑا نہیں رکھتے تھے کہ ایڑی پر بیٹھے ہوئے ہوں اور اس معنی میں کھڑا رکھتے تھے کہ اس کے ظاہر کو زمین پر رکھ کر اس کے باطن پر بیٹھتے نہ تھے۔ بنا بریں ابو حمید اور ان کے ساتھیوں اور عبداللہ بن زبیر دونوں کے بیانات صحیح ہیں، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طریقے اختیار فرمائے کبھی پیر کھڑا کیا کبھی بچھا لیا۔ دوسری صورت پیر کے لیے زیادہ راحت بخش ہے۔ واللہ اعلم۔

تشہد اور رفع یدین کا بیان

اس جلسہ میں آپ ہمیشہ تشہد پڑھتے تھے اور صحابہ کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّيِّبَاتُ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ[لہ]

ساری عبادتیں اللہ کے لیے، اے نبی! آپ پر سلام ہو اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں، ہم پر اور اللہ کے بندگان نیک پر سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔

لہ۔ بخاری ۲/۲۵۸، ۲۶۱، فی صفۃ الصلاۃ: باب التشہد فی الآخرۃ و باب یتخیر من الدعاء بعد التشہد و فی العمل فی الصلاۃ: باب من سمی قومًا او سلم فی الصلاۃ فی غیر مواجہۃ، و فی الاستئذان: باب السلام اسم من أسماء اللہ تعالیٰ، باب الاخذ بالیمین، و فی الدعوات: باب الدعاء فی الصلاۃ: و فی التوحید: باب قول اللہ تعالیٰ (السلام المؤمن)۔ مسلم (۴۰۲) فی الصلاۃ: باب التشہد فی الصلاۃ، ترمذی (۲۸۹) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی التشہد، ابوداؤد (۹۶۸) فی الصلاۃ: باب التشہد، نسائی ۲/۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، فی الافتتاح: باب کیف التشہد الأول، ابن ماجہ (۸۹۹) فی الاقامۃ: باب ماجاء فی التشہد۔ مسند احمد ۱/۳۷۶ و ۳۸۲ و ۴۰۸ و ۴۱۳ و ۴۱۴ و ۴۲۲ و ۴۲۳ و ۴۲۸ و ۴۳۱ و ۴۳۷ و ۴۳۹ و ۴۴۰ و ۴۵۰ و ۴۵۹ و ۴۶۴، تمام ائمہ حدیث نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے۔

نسائی میں ابوزبیر کے واسطے سے حضرت جابر کی حدیث آئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ، اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ۔

اللہ کے نام سے اور اللہ سے، تمام عبادتیں اللہ کے لیے، اے نبی آپ پر سلام، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں، سلام ہم پر اور اللہ کے نیکوکار بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ برحق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ سے جنت کا طالب اور جہنم سے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔

تشہد کے شروع میں بسم اللہ کا تذکرہ صرف اسی حدیث میں آیا ہے، ابوزبیر کے عَن عَن کرکے بیان کرنے کے علاوہ اس میں ایک اور علت بھی ہے [1]

اس تشہد کو آپ اتنا مختصر پڑھتے تھے جیسے گرم پتھر پر بیٹھے ہوں۔ کسی حدیث میں آپ سے قطعاً منقول نہیں کہ اس تشہد میں آپ نے اپنے آپ پر اور اپنی آل پر درود بھیجا ہو اور عذاب قبر، عذاب جہنم، فتنۂ حیات، فتنۂ موت اور فتنۂ مسیح دجال سے پناہ مانگی ہو۔ جنھوں نے اسے مستحب خیال کیا ہے دراصل انھوں نے کچھ ایسے عموم اور اطلاق سے اسے سمجھا جس کے مقام کی وضاحت اور تعیین آخری تشہد کے اندر کی گئی ہے۔

پھر آپ جیسا کہ گزر چکا ہے اپنی ران کا سہارا لے کر پیروں کے سروں اور گھٹنوں پر زور دے کر اٹھتے تھے، صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اس موقع پر آپ رفع یدین کرتے تھے۔ بخاری کی بعض سندوں میں بھی ایسا ہی آیا ہے[2] تاہم حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث میں یہ اضافہ متفق علیہ نہیں ہے، اکثر راویوں کے یہاں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ابوحمید ساعدی کی حدیث میں اس کا ذکر صراحت سے آیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے پھر ہاتھوں کو اٹھا کر مونڈھوں کے مقابل میں لیجاتے اور ہر عضو کو اس کی جگہ میں سیدھا کر دیتے پھر قرأت فرماتے پھر ہاتھوں کو اٹھا کر مونڈھوں کے مقابل میں لے جاتے، پھر رکوع کرتے اور ہتھیلی دونوں گھٹنوں پر رکھ کر اس طرح برابر ہو جاتے کہ سر نہ جھکا ہوتا نہ اوپر کو اٹھا رہتا، پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر مونڈھوں کے مقابل لے جاتے اور اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ ہر ہڈی اپنی جگہ پر چلی جاتی، پھر زمین پر جاتے تھے اور دونوں ہاتھ پہلوؤں سے دور رکھتے تھے، پھر سر اٹھاتے اور پیر موڑ کر اس پر بیٹھ جاتے، سجدہ میں پیروں کی انگلیاں پشت قدم کی جانب موڑ لیتے، پھر تکبیر کہتے اور بائیں پیر پر اس طرح بیٹھتے کہ ہر ہڈی اپنی جگہ چلی جاتی،

---

[1] نسائی ۲/۲۴۳، فی افتتاح الصلاۃ : باب نوع آخر من التشہد، ابن ماجہ (۹۰۲) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی التشہد۔ سلسلۂ سند میں ایمن بن نابل ہیں جو صدوق ہیں تاہم انھیں وہم ہو جاتا رہا ہے، نیز ابوزبیر مدلس ہیں۔

[2] بخاری ۲/۱۸۴، فی صفۃ الصلاۃ : باب رفع الیدین اذا قام من الرکعتین، ابن عمر جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو رفع یدین کرتے، اور دونوں رکعتوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے۔ ابن عمر نے یہ کیفیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کی۔ ابوداؤد نے اس کی تخریج (۷۴۱) میں نیز محارب بن دثار عن ابن عمر کی سند سے (۷۴۳) میں کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دو رکعت کے بعد کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع یدین کرتے، اور نسائی ۳/۳ نے نقل کیا ہے کہ ابن عمر نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ میں داخل ہوتے تو رفع یدین کرتے تھے، رکوع میں جانا چاہتے، رکوع سے سر اٹھاتے اور دونوں رکعتوں سے اٹھتے تو بھی اسی طرح مونڈھوں کے محاذ میں رفع یدین کرتے تھے، سند صحیح ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ کے مطابق یہ روایت ہم نے صحیح مسلم میں نہیں پائی۔ یہ ان کا وہم ہے۔

پھر کھڑے ہوتے، اسی طرح دوسری رکعت کے اندر بھی ہوتا پھر دونوں رکعتوں سے اٹھتے تو ہاتھوں کو اٹھا کر آغاز صلوٰۃ کی طرح مونڈھوں کے مقابل لے جاتے اور بقیہ صلوٰۃ مثل سابق پڑھتے۔ حتیٰ کہ وہ رکعت آتی جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے تو اپنے دونوں پیر باہر نکال کر بائیں پہلو پر کولھا رکھ کر بیٹھ جاتے تھے[1] صحیح ابو حاتم میں یہ حدیث ہے، صحیح مسلم میں بھی آئی ہے، ترمذی نے اس حدیث کو حضرت علی بن ابی طالب سے بیان کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے جس میں وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام مقامات پر رفع یدین کرتے تھے۔

آخری دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت

دونوں آخری رکعتوں میں تنہا سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، اس کے بعد کچھ اور پڑھنا آپ سے ثابت نہیں ہے، بعض فقہاء اور اپنے ایک قول کے مطابق امام شافعی سورۂ فاتحہ کے بعد کچھ اور پڑھنا بھی مستحب سمجھتے ہیں۔ استدلال میں "صحیح" کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جو ابو سعید سے مروی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں کے اندر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا اندازہ لگایا تو اسے "الم تنزیل سجدہ" کے برابر، پھر آخری دونوں رکعتوں کا اندازہ کیا تو اس کے نصف، اسی طرح عصر کی دونوں پہلی رکعتوں کا اندازہ کیا تو ظہر کی آخری دونوں رکعتوں کے برابر اور اس کی دونوں آخری رکعتوں کا اندازہ کیا تو اس کے نصف پایا[2]

حضرت ابو قتادہ کی حدیث جو متفق علیہ ہے آخری دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں ظاہر ہے۔ ابو قتادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں صلوٰۃ پڑھاتے تھے، چنانچہ ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ دو اور سورتیں پڑھتے تھے کبھی کبھی ہمیں سنا بھی دیتے تھے، مسلم میں آگے یہ اضافہ بھی ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے[3] دونوں حدیثیں اس نزاعی مسئلہ میں غیر واضح ہیں، ابو سعید کی حدیث خود لوگوں کا اپنا اندازہ ہے، آپ کے نفس فعل کی وضاحت نہیں ہے۔ حضرت ابو قتادہ کی حدیث میں دونوں باتوں کا امکان ہے، یعنی صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے پر آپ کا اکتفا کرنا یا کہ دونوں آخری رکعتوں میں سورۂ فاتحہ نہ چھوڑنا اور پہلی دونوں رکعتوں کی طرح ان دونوں میں بھی پڑھ لینا۔ تاہم حضرت ابو قتادہ کی حدیث کی رو سے آخری دونوں رکعتوں کے اندر سورۂ فاتحہ ہی پر اکتفا کرنا صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ مقام تقسیم ہے، چنانچہ جب یہ کہا گیا کہ آپ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک اور سورہ پڑھتے تھے اور دوسری دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ تو ہر قسم کے اندر بیان کردہ مضمون کے اعتبار سے گویا ایک

---

[1] ابن حبان (۱۸۵۸) نسائی ۳/۳ فی السھو، مختصرا، ابن ماجہ (۸۶۲) فی الاقامۃ، بخاری ۲/۲۵۴ فی صفۃ الصلاۃ: مسلم میں جیسا کہ گزر چکا ہے نہیں ہے، حدیث میں ایک جگہ "یفتخ" کا لفظ ہے، مطبوعہ نسخہ "یفتح" ہے جو تصحیف ہے، معنیٰ یہ ہے کہ آپ انگلیوں کو کھڑی کر کے ان کے جوڑوں پر دباؤ ڈالتے اور اندرون پیر کی جانب موڑتے تھے۔

[2] بخاری ۲/۲۰۲، ۲۰۳ فی صفۃ الصلاۃ: باب القرأۃ فی الظھر، مسلم (۴۵۲) فی الصلاۃ: باب القرأۃ فی الظھر والعصر، ابوداؤد (۸۰۴) فی الصلاۃ: باب فی تخفیف الأخریین، مسند احمد ۲/۳۔

[3] مسلم (۴۵۱) فی الصلاۃ: باب القرأۃ فی الظھر والعصر، ابوداؤد (۷۹۸) و (۷۹۹) و (۸۰۰) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی القرأۃ فی الظھر، نسائی ۲/۱۶۴ فی الافتتاح: باب تطویل القیام فی الرکعۃ الاولی من صلاۃ الظھر، ابن ماجہ (۸۱۹) فی الاقامۃ: باب القرأۃ فی صلاۃ الفجر۔

طرح کی مخصوص صراحت ہوگئی ہے، اس موقع پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ اکثر ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ ویسے کبھی کبھی سورۂ فاتحہ کے بعد بھی کچھ پڑھتے تھے۔ جیسا کہ ابو سعید کی حدیث میں اس کی جانب اشارہ ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ صلوٰۃ فجر کے اندر طویل قرأت فرماتے مگر کبھی کبھی ہلکی قرأت بھی ہوتی تھی، صلوٰۃ مغرب میں عام طور پر ہلکی قرأت ہوتی تھی مگر کبھی کبھی قرأت طویل بھی ہو جاتی تھی نیز فجر میں عام طور پر قنوت نہیں کرتے تھے۔ مگر کبھی کر بھی لیتے تھے، ظہر و عصر کی صلوٰۃ میں قرأت آہستہ ہوتی مگر کبھی کبھی بعض آیات صحابہ کو سنا بھی دیتے تھے۔ عام طور پر بسم اللہ بہ آواز بلند نہیں پڑھتے تھے[۱] مگر کبھی کبھی بآواز بلند بھی پڑھ لیا کرتے تھے[۲] مقصود یہ ہے کہ صلوٰۃ میں کبھی عارضی طور پر کچھ باتیں ایسی بھی ہو جایا کرتی تھیں جو آپ کا دائمی فعل نہ ہوتا۔

چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک شہسوار کو حالات کی اطلاع کے لیے بھیجا اور پھر صلوٰۃ میں مصروف ہو گئے۔ صلوٰۃ میں مڑ مڑ کر اس گھاٹی کی جانب نگاہ ڈالتے رہے جس سے شہسوار کو آنا تھا[۳] حالانکہ صلوٰۃ میں مڑنا آپ کا دستور نہ تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرماتی ہیں: صلوٰۃ میں مڑ کر دیکھنے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو فرمایا: "ایک موقع ہے جس سے فائدہ اٹھا کر شیطان بندے کی صلوٰۃ سے کچھ اچک لیتا ہے"۔[۴]

ترمذی میں سعید بن مسیب کی روایت ہے، جس میں وہ حضرت انس کا حسب ذیل بیان نقل کرتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: بیٹے! دیکھنا صلوٰۃ میں اِدھر اُدھر نہ مڑنا کیونکہ صلوٰۃ میں اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھنا ہلاکت کا موجب ہے، مڑنا ضروری ہو تو فرض میں نہیں نفل صلوات میں مڑ سکتے ہو"۔[۵] مگر حدیث کے اندر دو خرابیاں ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت انس سے سعید بن مسیب کی روایت غیر معروف ہے۔

دوسری یہ کہ سلسلۂ سند میں علی بن زید بن جدعان کا نام بھی ہے۔ مسند بزار میں یوسف بن عبد اللہ بن سلام نے ابو درداء سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، "اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھنے والے کی صلوٰۃ نہیں ہوتی"[۶]

۱۔ مسلم، حدیث انس (۳۹۹) فی الصلاۃ: باب حجۃ من قال لا یجھر بالبسملۃ، ترمذی (۲۴۶) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی افتتاح القرأۃ بـ (الحمد للہ رب العلمین)، ابوداؤد (۷۸۲) فی الصلاۃ: باب من لم یجھر بـ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نسائی ۱۳۵/۲، فی الافتتاح: باب ترک الجھر بـ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ابن ماجہ (۸۱۳) فی الاقامۃ: باب افتتاح القرأۃ۔

۲۔ ترمذی (۲۴۵) حدیث ابن عباس، فی الصلاۃ: باب من رأی الجھر بھا، دارقطنی (۱۱۴) بیہقی ۴۷/۲، سلسلۂ سند میں ایک مجہول ہے، عقیلی فرماتے ہیں: بسم اللہ بالجہر کے سلسلہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔

۳۔ ابوداؤد (۹۱۶) و (۲۵۰۱) فی الصلاۃ: باب الرخصۃ فی النظر فی الصلاۃ: حدیث سہل بن حنظلیہ، سند صحیح ہے، حاکم ۲۳۷/۱ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

۴۔ بخاری ۱۹۴/۲، فی صفۃ الصلاۃ: باب الالتفات فی الصلاۃ، وفی بدء الخلق، باب صفۃ ابلیس وجنودہ، ترمذی (۵۹۰) فی الصلاۃ: باب ماذکر فی الالتفات فی الصلاۃ، ابوداؤد (۹۱۰) فی الصلاۃ: باب الالتفات فی الصلاۃ، نسائی ۸/۳، فی السھو: باب التشدید فی الالتفات فی الصلاۃ، مسند احمد ۱۰۶/۶۔

۵۔ ترمذی (۵۸۹) فی الصلاۃ: باب ماذکر فی الالتفات فی الصلاۃ، اسے انھوں نے حدیث حسن غریب قرار دیا ہے۔ بایں ہمہ سند میں علی بن زید بن جدعان ہیں جو ضعیف ہیں۔

۶۔ مجمع الزوائد ۸۰/۲ میں ہیثمی نے اس کا تذکرہ دو روایتوں سے کیا ہے، پہلی روایت عبد اللہ بن سلام کی ہے جسے طبرانی نے تینوں میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ روایت "الکبیر" کے مطابق اس میں صلت بن یحییٰ ہیں جن کو ازدی نے ضعیف کہا ہے، اور روایت "الصغیر" اور "الاوسط" کے مطابق صلت بن ثابت ہیں، مگر یہ وہم ہے، اصلاً صلت بن طریف ہیں، ذہبی نے المیزان میں اس کا ذکر کیا ہے، اور ان کی یہ حدیث نقل کی ہے، دارقطنی فرماتے ہیں یہ حدیث مضطرب ہے ثابت نہیں ہے۔ دوسری روایت ابو درداء کی ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ حدیث "کہ صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں بائیں دیکھتے تھے مگر اپنی گردن پشت کے پیچھے نہیں موڑتے تھے"، ثابت نہیں ہے، ترمذی نے اسے غریب[1] قرار دیا ہے اور آگے کچھ نہیں کہا ہے۔

خلال فرماتے ہیں کہ میمونی نے مجھے بتایا کہ ابوعبداللہ سے پوچھا گیا "بعض حضرات بسند یہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں مڑ کر دیکھتے تھے" تو آپ نے اس کا سختی سے انکار کیا حتیٰ کہ چہرے کا رنگ بدل گیا، جسم حرکت میں آگیا، ایسی حالت میں ہم نے انھیں کبھی نہ دیکھا تھا، فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں دیکھتے تھے؟ انداز انکار کا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بے سند بات ہے، فرمایا: راوی کون ہے؟ سعید بن مسیب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا، ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ ابوعبداللہ نے سعید کی اس حدیث کو کمزور اور اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث عن رجل عن سعید مروی ہے، عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں، میں نے اپنے والد کو حسان بن ابراہیم کی ایک حدیث سنائی جسے عبدالملک کوفی سے انھوں نے روایت کی تھی۔ فرمایا کہ میں نے علاء سے سنا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے مکحول کو ابوامامہ اور واثلہ سے حدیث بیان کرتے سنا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو دائیں اور بائیں متوجہ نہیں ہوتے تھے بلکہ نگاہ سجدہ کی جگہ ٹکائے رہتے تھے"۔ والد نے اس حدیث کا بری طرح انکار کرتے ہوئے فرمایا "اس پر پردہ ڈال دو" احمد رحمہ اللہ نے دونوں حدیثوں کا انکار کیا۔ مگر پہلی حدیث کا انکار شدت سے کیا کیونکہ سند اور متن دونوں کے اعتبار سے باطل تھی، دوسری حدیث کا انکار سند کے اعتبار سے کیا ورنہ اس کا متن غیر منکر (ناقابل انکار) ہے۔ واللہ اعلم۔

پہلی حدیث ثابت بھی ہو تو یہ آپ کے ایک فعل کی حکایت ہے جسے غالبًا صلوٰۃ سے متعلق کسی مصلحت کی بنیاد پر آپ نے انجام دیا، جیسے صلوٰۃ کے اندر صلوٰۃ یا مسلمانوں کی مصلحت سے خود آپ نے، حضرت ابوبکر نے، حضرت عمر نے، اور حضرت ذوالیدین نے کلام کیا تھا۔ اسی طرح وہ حدیث بھی ہے جس کی روایت ابوداؤد نے ابوکبشہ سلولی سے، انھوں نے سہل بن حنظلیہ سے کی ہے، کہتے ہیں "صلوٰۃ یعنی صبح کی صلوٰۃ کی اقامت کہی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ پڑھتے جاتے تھے اور مڑ مڑ کر گھاٹی کی جانب بھی دیکھتے تھے"، ابوداؤد کہتے ہیں اصل میں گھاٹی کی جانب آپ نے شب میں گشتی سپاہ کے طور پر ایک شہسوار بھیجا تھا[2] یہ مڑنا صلوٰۃ میں اشتغال بالجہاد کے قبیل سے تھا، صلوٰۃ خوف کی طرح یہ بھی عبادات میں داخل ہے۔ اسی سے ملتا جلتا حضرت عمر کا قول ہے، فرماتے ہیں: صلوٰۃ کی حالت میں اپنی فوج کو ضروری سامانوں سے لیس کرتا ہوں، یہ جمع بین الجہاد والصلوٰۃ کی صورت ہوئی، اسی طرح صلوٰۃ میں قرآنی آیات پر غور و فکر اور اس کے دریائے معانی میں ڈوب کر علمی لعل و گہر نکالنے کی بات بھی ہے، یہ جمع بین الصلوٰۃ والعلم کی صورت ہوئی، صلوٰۃ میں اس طرح کا التفات اور شئی ہے اور لہو و لعب میں سرمست غافلوں کا التفات اور ان کے افکار کی بات اور شئی۔ وباللہ التوفیق۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جسے طبرانی نے "الکبیر" میں نقل کیا ہے، اس میں عطاء بن عجلان ضعیف ہیں، ہمارے علم کی حد تک اسے کسی نے بزار کی جانب منسوب نہیں کیا ہے۔

[1] ترمذی (۵۸۷) فی الصلاۃ: باب ماذکر فی الالتفات فی الصلاۃ، احمد ۱/۲۷۵ و ۳۰۶، نسائی ۳/۹ حدیث عبداللہ بن سعید بن ابی ہند، انھوں نے ثور بن زید سے انھوں نے عکرمہ سے انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے، سند صحیح ہے، حاکم ۱/۲۳۶ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ "الوھم والایھام" میں ابن قطان نے کہا ہے جسے زیلعی نے نصب الرایہ ۲/۹۰ میں نقل کیا ہے کہ یہ حدیث گو کہ غریب ہے اور صرف اسی سند سے معروف ہے مگر صحیح ہے کیونکہ عبداللہ بن سعید اور ثور ابن زید ثقہ ہیں اور عکرمہ سے بخاری نے احتجاج کیا ہے، لہٰذا حدیث صحیح ہے۔

[2] ابوداؤد (۹۱۶) فی الصلاۃ: باب الرخصۃ فی النظر فی الصلاۃ، سند جیسا کہ گذر چکا ہے صحیح ہے۔

پس آپ کا دائمی دستور یہ تھا کہ چار رکعتی صلوات میں آخری دونوں کے بمقابلہ پہلی دونوں رکعتیں، اور پہلی دونوں کی دوسری رکعت کے بمقابلہ پہلی رکعت طویل پڑھتے تھے۔ اسی لیے سعد نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ میں پہلی دونوں رکعتیں طویل اور دوسری دونوں رکعتیں مختصر کر دیتا ہوں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ کی اقتداء میں کوتاہی نہیں کرتا۔

اسی طرح آپ کا یہ بھی طریقہ تھا کہ تمام صلوات کے مقابلہ میں فجر کی صلوٰۃ جیسا کہ گزر چکا ہے طویل پڑھتے تھے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اول اللہ تعالیٰ نے صلوات دو دو رکعت فرض کی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو فجر اور مغرب کے علاوہ حضر کی صلوات میں اضافہ ہوا۔ فجر کی صلوٰۃ اس لیے علیٰ حالہ باقی رہی کہ اس کے اندر قرأت طویل ہوتی ہے، اور مغرب کی اس لیے کہ یہ دن کی وتر صلوٰۃ ہے، صحیح ابو حاتم ابن حبان کی یہ روایت ہے[۱] اس کی اصل بخاری میں ہے۔[۲] یہ تھا آپ کا طریقہ، بقیہ ساری صلوات میں دوسری کے مقابلہ میں پہلی کو طویل کر دینے کا ایسا ہی صلوٰۃ کسوف میں آپ کا عمل رہا ہے اور قیامِ لیل میں جب دو لمبی رکعتیں پڑھیں تو ما بعد کی دو اس سے مختصر پڑھیں، اور اس کے بعد کی دو اس سے بھی مختصر، اسی طرح آپ اپنی صلوٰۃ پوری کرتے تھے۔ شب کی صلوٰۃ کا افتتاح آپ دو ہلکی رکعتوں سے کرتے تھے، اسی کا حکم بھی دیتے تھے، تاہم مذکورہ طریقہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ یہ دونوں رکعتیں قیام لیل کی کنجی ہیں، انھیں فجر وغیرہ کی سنت کے قائم مقام سمجھنا چاہیے، یہی حال ان دونوں رکعتوں کا بھی ہے جو آپ کبھی کبھی وتر کے بعد گاہ بیٹھ کر گاہ کھڑے ہو کر اپنے حسب ذیل ارشاد کے باوجود پڑھتے تھے۔

"وتر کو شب کی آخری صلوٰۃ قرار دو"[۳]

یہ دونوں رکعتیں آپ کے اس حکم کے خلاف نہیں ہیں۔ اسے یوں سمجھو جیسے مغرب دن کی وتر صلوٰۃ ہے، مگر اس کے بعد دو رکعت سنت کی ادائیگی اسے اس کے دائرہ وتر سے خارج نہیں کرتی۔ اسی طرح شب کی وتر چونکہ ایک مستقل عبادت ہے اس لیے اس کے بعد پڑھی جانے والی دونوں رکعتیں مغرب کی سنت کے مانند سمجھی جائیں گی۔ مغرب کی صلوٰۃ چونکہ فرض ہے اس لیے آپ نے وتر کی سنت کے مقابلہ میں مغرب کی سنت کی زیادہ محافظت فرمائی ہے، یہ حقیقت ان لوگوں کے اصول کے مطابق جو وتر کے واجب ہونے کے قائل ہیں انتہائی روشن ہے۔ ان دونوں رکعتوں پر آگے انشاء اللہ مزید گفتگو آئے گی۔ یہ ایک انتہائی اعلیٰ مسئلہ ہے جو شاید تمھیں کسی اور کتاب میں نہ مل سکے۔ وباللہ التوفیق۔

۱۔ ابن حبان (۵۴۴) فی الصلاۃ : باب صلاۃ السفر، حدیث محبوب محمد بن الحسن، انھوں نے داؤد بن ابو ہند سے، انھوں نے شعبی سے انھوں نے مسروق سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے، صحیح ابن خزیمہ (۳۰۵) میں بھی یہ حدیث ہے، سلسلۂ سند میں محمد بن حسن ملقب بمحبوب لین الحدیث ہیں، ابن خزیمہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، محبوب بن الحسن کے علاوہ میرے علم کی حد تک اس کی اور کسی نے روایت نہیں کی ہے، اصحاب داؤد نے اس کی روایت جیسا کہ مسند ۲۴۱/۶ و ۲۶۵ میں ہے شعبی سے انھوں نے عائشہ سے کی ہے، شعبی کا حضرت عائشہ سے سماع ثابت نہیں لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے۔

۲۔ ۳۹۲/۱، فی الصلاۃ، باب کیف فرضت الصلوات فی الاسراء وفی تقصیر الصلاۃ : باب یقصر اذا خرج من موضعہ، وفی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم : باب اقامۃ المھاجر بمکۃ بعد قضاء نسکہ، مسلم (۶۸۵) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ المسافرین وقصرھا، ابوداؤد (۱۱۹۸) فی صلاۃ السفر : باب صلاۃ المسافر، نسائی ۲۲۵/۱، ۲۲۶، فی الصلاۃ : باب کیف فرضت الصلاۃ، مؤطا امام مالک ۱۴۶/۱، فی الصلاۃ : باب قصر الصلاۃ فی السفر۔

۳۔ بخاری ۴۰۶/۲، فی الوتر : باب لیجعل آخر صلاتہ وترا، مسلم (۷۵۱) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل مثنی مثنی والوتر رکعۃ من آخر اللیل، ابوداؤد (۱۴۳۸) فی الصلاۃ : باب فی وقت الوتر، نسائی ۲۳۱/۳، فی الوتر : باب وقت الوتر، تمام ائمہ کے یہاں راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔

قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنے کی کیفیت

آخری تشہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سُرین کے بل بیٹھتے تھے، سُرین کو زمین سے ملا کر پیر کو ایک پہلو سے باہر نکال دیتے تھے۔

سُرین پر بیٹھنے کے باب میں آپ سے تین طریقے مروی ہیں، ان میں سے ایک وہی ہے جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا۔ اس کا ذکر ابوداؤد نے عبداللہ بن سعید[1] کی سند سے ابوحمید ساعدی کی حدیث میں کیا ہے۔ نیز ابوحاتم نے اپنے صحیح کے اندر بیٹھنے کی یہی کیفیت بحدیث ابوحمید ساعدی ابن لہیعہ کے علاوہ دوسرے[2] طریق سے درج کی ہے۔ یہ حدیث اوپر آچکی ہے۔

دوسرا طریقہ صحیح بخاری میں انہی ابوحمید ساعدی کی روایت سے مذکور ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق جب آپ آخری رکعت میں بیٹھتے تو بایاں پیر آگے بڑھا کر داہنا کھڑا کر لیتے اور مقعد پر بیٹھتے[3] سرین پر بیٹھنے کی جو پہلی کیفیت بیان ہوئی ہے یہ کیفیت بھی اسی کے مطابق ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مؤخر الذکر حدیث کے اندر دونوں پیروں کی کیفیت بھی بیان ہو گئی ہے جب کہ پہلی حدیث اس کے ذکر سے خالی ہے۔

تیسرا طریقہ وہ ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن زبیر کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایاں پیر ران اور پنڈلی کے درمیان رکھتے تھے اور دایاں پیر بچھا دیتے تھے[4] ابوقاسم خرقی[5] نے یہی طریقہ "مختصر" میں لکھا ہے۔ بایاں پیر داہنے پہلو سے نکالنے اور دایاں پیر کھڑا کرنے کے باب میں یہ طریقہ پہلے دونوں طریقوں کے خلاف ہے، ہوسکتا ہے آپ کا فعل دونوں رہا ہو، تاہم یہ زیادہ واضح ہے۔

اس کا بھی احتمال ہے کہ یہ محض راویوں کا اختلاف ہو، ورنہ سرین پر بیٹھنے کی کیفیت آپ سے صرف اسی تشہد کے اندر مذکور ہے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ امام احمد اور ان کے موافقین فرماتے ہیں کہ یہ کیفیت اس صلوٰۃ کے ساتھ

---

[1] ابوداؤد (۹۶۵) فی الصلاۃ : باب من ذکر التورك فی الرابعۃ۔ ابن لہیعہ کی شخصیت محل نظر ہے، تاہم حدیث ابوحمید وغیرہ سے دوسری سندوں سے بھی بیان ہوئی ہے، جس سے اسے طاقت مل گئی ہے، ترمذی کے مطابق یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

[2] موارد الظمآن (۴۹۱) سند صحیح ہے۔ دیکھیے ابن خزیمہ ۱/۳۴۷۔

[3] بخاری ۲/۲۵۵، فی الصلاۃ : باب سنۃ الجلوس فی التشہد۔ "الفتح" میں حافظ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں امام شافعی اور ان کے ہم مسلکوں کیلئے قوی دلیل موجود ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ پہلے تشہد میں بیٹھنے کی کیفیت آخری تشہد کی کیفیت سے مختلف ہے، مالکیہ اور حنفیہ نے مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دونوں میں یکسانیت رکھے۔ مالکیہ کے مطابق دونوں میں سرین کے بل بیٹھے اور حنفیہ کے نزدیک کسی میں ایسا نہ کرے۔ امام شافعی نے اس سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ صلوٰۃ صبح کا تشہد دوسری صلوات کے آخری تشہد کے مانند ہے، کیونکہ آپ کا ارشاد "فی الرکعۃ الاخیرۃ" عام ہے۔ امام احمد کا قول اس مسئلہ سے مختلف ہے، ان کے مشہور مسلک کے مطابق تورک اس صلوٰۃ میں ہے جس میں دو تشہد ہوں۔

[4] مسلم (۵۷۹) فی المساجد ومواضع الصلاۃ : باب صفۃ الجلوس فی الصلاۃ وکیفیۃ وضع الیدین علی الفخذین، ابوداؤد (۹۸۸) فی الصلاۃ : باب الاشارۃ فی التشہد، نسائی ۲/۲۳۷، فی الافتتاح : باب الاشارۃ بالاصبع فی التشہد الاول۔

[5] عمر بن حسین بن عبداللہ خرقی، کنیت ابوالقاسم، بغدادی حنبلی فقیہ گزرے ہیں، خرقی نسبت خرق (کپڑوں کے ٹکڑے) کی جانب ہے، یہ کٹ پیس کی تجارت کرتے تھے۔ احمد بن حنبل کی اولاد کے شاگرد رہے ہیں۔ دمشق میں ۳۳۴ھ کو وفات ہوئی۔ تصانیف میں صرف "المختصر معروف بہ مختصر الخرقی" رہ گئی بقیہ نذر آتش ہو گئیں۔ یہ فقہ حنبلی کے موضوع پر ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں سب سے بڑی شرح شیخ الاسلام موفق الدین بن قدامہ مقدسی کی "المغنی" ہے۔

مخصوص ہے جس میں دو تشہد ہوتے ہیں، اس طرح کی کیفیت بیٹھنے کی دو کیفیتوں کے درمیان مابہ الامتیاز کے طور پر اختیار کی گئی ہے، یعنی ایک وہ جو تشہد اول میں اختیار کی جاتی ہے، تشہد اول کو ہلکا رکھنا سنت ہے، اس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے کی ہیئت میں ہوتا ہے، دوسری وہ کیفیت جو تشہد ثانی میں اختیار کی جاتی ہے (یہ اطمینان کی حالت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے اندر بیٹھنے کی کیفیت پہلی کیفیت کے مقابلہ میں جدا ہو گئی ہے) علاوہ ازیں نشست کی دونوں کیفیتوں کو دو نوعیتیں تسلیم کر لینے میں تشہدوں کے درمیان امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور مصلی کو معلوم رہتا ہے کہ اب وہ کس تشہد میں ہے۔

نیز یہ حقیقت بھی ہے کہ ابو حمید ساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت اس جلسہ کی بیان کی ہے جو تشہد ثانی میں ہوتا ہے، انھوں نے تشہد اول کی کیفیت بیان کی ہے کہ اس میں آپ پیر بچھا کر بیٹھتے تھے، اس کے بعد کہا "اور جب آخری رکعت میں بیٹھتے تھے" دوسری روایت کے مطابق "اور جب چوتھی رکعت میں بیٹھتے تھے"۔

بعض روایات کے مطابق ابو حمید ساعدی کا یہ بیان کہ جب وہ جلسہ ہوتا جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے تو بایاں پیر نکالتے اور اپنے ایک پہلو پر تورک کی کیفیت میں بیٹھتے تھے۔ تو اس سے اگرچہ ان لوگوں کو کچھ دلیل ہاتھ آگئی ہے جو ہر اس تشہد میں سرین پر بیٹھنے کے قائل ہیں جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے جیسا کہ امام شافعی کا خیال ہے حالانکہ اس میں صریح دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ سیاق حدیث کی دلالت یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت چہار رکعتی یا سہ رکعتی صلوات کے تشہد کی ہے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے، کیونکہ ابو حمید نے تشہد اول میں بیٹھنے اور اٹھنے کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا ہے "یہاں تک کہ جب وہ سجدہ ہوتا جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے تو آپ سرین کے بل بیٹھ جاتے تھے" یہ سیاق صاف ظاہر کرتا ہے کہ بیٹھنے کی یہ کیفیت تشہد ثانی کے ساتھ مخصوص ہے۔

تشہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ کرنے کی کیفیت

تشہد میں آپ بیٹھتے تو داہنے ہاتھ کو داہنی ران پر رکھ کر تینوں انگلیوں کو سمیٹ کر شہادت کی انگلی کھڑی کر لیتے اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے۔ اس کا تذکرہ مسلم میں عبداللہ بن عمر کی روایت سے آیا ہے۔[۱]

وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ "داہنی کہنی کا سرا داہنی ران پر رکھ کر پھر دو انگلیوں کو گرفت میں لے کر ایک حلقہ بناتے تھے، پھر انگلی اٹھاتے، میں نے دیکھا کہ اسے دعا پڑھتے ہوئے حرکت دے رہے ہیں" یہ بیان سنن[۲] میں آیا ہے۔

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر کا بیان اس طرح ہے کہ "ترپن کی گرہ بناتے تھے"[۳]

یہ تمام روایات مفہوم کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، چنانچہ جس نے یہ بیان کیا ہے کہ تینوں انگلیوں کو گرفت میں لیتے تھے

۱۔ (۵۸۰) فی المساجد ومواضع الصلاۃ، ترمذی (۲۹۴) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی الاشارۃ فی التشهد، نسائی: ۳۷/۳، فی السهو: باب بسط الیسری علی الرکبۃ، ابن ماجہ (۹۱۳) فی الاقامۃ: باب مایقال فی التشهد، مسند احمد ۴۵/۲ و ۷۳ و ۱۱۹ و ۱۳۱ و ۱۴۷۔

۲۔ ابوداؤد: ۹۵۷، نسائی: ۱۲۶/۲ و ۱۲۷، فی الصلاۃ: باب موضع الیمین من الشمال فی الصلاۃ و ۳۷/۳، باب قبض الثنتین من أصابع الید الیمنی وعقد الوسطی والابهام منها، مسند احمد ۳۱۸/۴، ابن ماجہ: ۹۱۲ مختصراً، فی الاقامۃ: باب الاشارۃ فی التشهد، سند صحیح ہے۔

۳۔ مسلم: ۵۸۰، فی المساجد ومواضع الصلاۃ، اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

تو اس کی مراد یہ ہے کہ بیچ کی انگلی شہادت کی انگلی کی طرح کھلی ہوئی نہیں سمٹی ہوتی تھی، اور جس نے یہ کہا ہے کہ دو انگلیوں کو گرفت میں لیتے تھے اس کی مراد یہ ہے کہ بیچ کی انگلی بنصر کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے بغیر بنصر اور خنصر دونوں برابر گرفت میں ہوتی تھیں، اس کیفیت کی صراحت اس راوی نے کر دی ہے جس نے ترپن کی گرہ کی بات کہی ہے۔ کیونکہ ترپن کی گرہ میں بیچ کی انگلی بنصر کے ساتھ گرفت میں نہیں بلکہ سمٹی ہوئی ہوگی۔

اکثر اصحاب علم وفضل کے لیے یہ مسئلہ مشکل ہو گیا ہے، کیونکہ ترپن کی گرہ کی بات مذکورہ بالا دونوں کیفیتوں سے مطابقت نہیں رکھتی، اس گرہ میں خنصر کا بنصر کے اوپر ہونا ضروری ہے۔

بعض اہل علم نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ تینوں انگلیوں کی اس گرہ میں دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ قدیم کیفیت۔ اسی کا حضرت ابن عمر کی حدیث میں تذکرہ ہے، ایسی صورت میں تینوں انگلیاں سمٹی ہوئی ہوں گی اور انگوٹھے کا شہادت کی انگلی سے مل کر حلقہ بنے گا۔

۲۔ جدید کیفیت۔ جو آج کل ریاضی دانوں میں رائج ہے۔

ہاتھ ران پر بچھائے رکھتے تھے، اسے دور نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح کہنی کا کنارہ ران کے پچھلے حصہ کے نزدیک ہوتا تھا، بایاں ہاتھ بائیں ران پر اس طرح ہوتا کہ اس کی انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتی تھیں۔ انگلیاں رفع یدین، رکوع، سجدہ اور تشہد سب میں قبلہ رُخ رکھتے تھے۔ سجدہ میں پیر کی انگلیاں بھی قبلہ رُخ رکھتے، ہر دو رکعت میں "التحیات" پڑھتے تھے۔

صلوٰۃ میں دعا کے مقامات

صلوٰۃ کے اندر جن مقامات پر آپ دعا پڑھتے تھے وہ حسب ذیل سات ہیں۔

۱۔ تکبیر تحریمہ کے بعد افتتاحی موقعہ پر۔

۲۔ رکوع سے پیشتر[1] اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد، نیز صبح کی صلوٰۃ میں رکوع سے پیشتر قنوت نازلہ بشرطیکہ ثابت ہو، کیونکہ یہ محل نظر ہے۔

۳۔ رکوع سے اٹھ کر سیدھے ہو جانے کے بعد جیسا کہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت سے ثابت ہے، فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْاَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ - اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ، اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْوَسَخِ[2]

اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی، اے اللہ ہمارے رب! تیری تعریف، آسمانوں برابر، زمین برابر اور اس کے بعد جتنا تو چاہے اس کے برابر، اے اللہ! پاک فرما مجھے برف اولے اور ٹھنڈے پانی سے، اے اللہ! گناہوں اور

---

[1] بیہقی نے کہا ہے کہ رکوع سے پہلے بھی قنوت پڑھنا آپ سے ثابت ہے۔ مگر بعد میں پڑھنے کی روایتیں زیادہ ہیں اور نسبتاً زیادہ ثابت ہیں لہٰذا یہی اولیٰ ہے، مشہور اور زیادہ تر روایات کے مطابق خلفاء راشدین کا اسی پر عمل رہا ہے۔

[2] مسلم (۴۷۶) "مایقول اذا رفع راسہ من الرکوع" کی فصل میں اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

خطاؤں سے مجھے اسی طرح صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔

۴۔ رکوع کے اندر یہ دعا پڑھتے۔

سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي[1]

پاک ہے تو اے اللہ ہمارے رب! اور تیری تعریف، اے اللہ! مجھے بخش دے۔

۵۔ سجدہ میں۔ زیادہ تر دعائیں اسی میں پڑھتے تھے۔

۶۔ دونوں سجدوں کے درمیان۔

۷۔ تشہد کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے۔ ابوہریرہؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کی حدیثوں میں آپ نے اس موقع پر دعا پڑھنے کا حکم دیا ہے، نیز سجدہ کی دعائیں بھی پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔

صلوٰۃ سے سلام پھیرنے کے بعد دعا پڑھنا قبلہ رُخ ہو کر یا مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے خارج ہے، صحیح یا حسن کسی سند سے یہ مروی نہیں ہے۔

فجر اور عصر کی صلوات میں بھی آپ نے یا آپ کے کسی خلیفہ نے مذکورہ طریقہ اختیار نہیں کیا اور نہ امت کو اس کی جانب رہنمائی کی۔ یہ طریقہ جن لوگوں نے اختیار کیا اصل میں دونوں صلوات کے بعد نہ پڑھی جانے والی سنت کے عوض بطور استحسان اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃ میں سلام کے بعد دعا کی بحث

صلوٰۃ سے متعلق عام دعائیں آپ صلوٰۃ کے اندر ہی پڑھتے تھے اور اسی کا حکم بھی دیا ہے۔ یہی مصلی کے شایان شان بھی ہے کیونکہ وہ صلوٰۃ میں جب تک مصروف مناجات ہوتا ہے پروردگار کی جانب متوجہ رہتا ہے، سلام پھیرنے کے بعد مناجات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ موقف باقی نہیں رہتا جو پروردگار کے روبرو ہونے اور اس کے قرب کا ہوتا ہے، مناجات، قربت اور توجہ الی اللہ کی حالت میں سوال ترک کر کے اس وقت درخواست و دعا کیوں کی جائے جب یہ حالات باقی نہ رہیں۔ بلاشبہ اس کے برعکس ہی حالت مصلیوں کے لیے اولیٰ و انسب ہے۔ تاہم یہاں ایک باریک نکتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ مصلی جب صلوٰۃ سے فارغ ہو کر صلوٰۃ کے بعد اذکار مشروعہ کے ذریعہ اللہ کا ذکر، تہلیل و تسبیح، تحمید اور اس کی بڑائی بیان کرتا ہے تو مستحب ہے کہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھی بھیجے۔ پھر جو دعا چاہے مانگے۔ اب یہ دعا اس دوسری عبادت کے بعد ہوگی جو صلوٰۃ کے بعد شروع کی گئی ہے، صلوٰۃ کے بعد کی شمار نہ ہوگی۔ جو اللہ کا ذکر اس پر حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اس کے بعد اس کے لیے دعا مستحب ہے۔ جیسا کہ فضالہ بن عبید کی حدیث میں وارد ہے:

---

[1] بخاری اور مسلم کی روایتوں کے مطابق "مایقولہ فی الرکوع" میں اس کا تذکرہ بھی گزر چکا ہے۔

[2] مسلم (۵۸۸) فی المساجد و مواضع الصلوٰۃ: باب مایستعاذ منہ فی الصلاۃ، ابوداؤد (۹۸۳) فی الصلاۃ: باب مایقول بعد التشہد، نسائی ۵۸/۳، فی السہو: باب التعوذ فی الصلاۃ، ابن ماجہ (۹۰۹) فی الاقامۃ: باب مایقال فی التشہد، مسند احمد ۲۳۷/۲۔

[3] ترمذی (۳۴۷۵) فی الدعوات: باب ادع تجب، ابوداؤد (۱۴۸۱) فی الصلاۃ: باب الدعاء، نسائی ۴۴/۳ فی السہو: باب التمجید والصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ترمذی فرماتے ہیں: حدیث صحیح ہے، حاکم ۲۱۸/۱ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

"جب کوئی صلوٰۃ ادا کرے تو شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، پھر جو چاہے دعا کرے"۔
ترمذی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے[1]

صلوٰۃ سے سلام پھیرنے کی کیفیت

پھر آپ داہنی جانب رُخ کر کے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہتے اور اسی طرح بائیں جانب بھی۔ یہی آپ کا دائمی طریقہ تھا۔ پندرہ صحابیوں نے اس کی روایت کی ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:
عبداللہ[1] ابن مسعود، سعد[2] بن ابی وقاص، سہل[3] بن سعد ساعدی، وائل[4] بن حجر، ابو موسیٰ[5] اشعری، حذیفہ[6] بن یمان، عمار[7] بن یاسر، عبداللہ[8] بن عمر، جابر[9] بن سمرہ، براء[10] بن عازب، ابو مالک[11] اشعری، طلق[12] بن علی، اوس[13] بن اوس، ابو رمثہ[14]، عدی[15] بن عمیرہ۔
روایت ہے کہ "آپ ایک سلام اپنے سامنے ہی کرتے"[2] مگر کسی صحیح سند سے یہ ثابت نہیں ہے۔ ایک سلام کے بارے میں سب سے عمدہ حدیث حضرت عائشہ کی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ "آپ ایک بار السلام علیکم اتنی زور سے کہتے تھے کہ ہم لوگ جاگ جاتے تھے"[3] مگر یہ حدیث معلول ہے اور سنن میں مذکور ہے۔ مگر یہ قیام لیل کے باب میں وارد ہے۔ جن لوگوں نے دونوں سلام کی روایتیں کی ہیں انھوں نے فرض و نفل کا اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہ کی حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ آپ ایک ہی سلام پر اکتفا کرتے تھے انھوں نے خبر یہ دی ہے کہ آپ ایک سلام اتنی زور سے کہتے تھے کہ ہم جاگ جاتے تھے، انھوں نے دوسرے سلام کی نفی نہیں کی ہے بلکہ خاموشی اختیار کی ہے، جن لوگوں نے باقاعدہ یاد رکھا اور ضبط کیا ہے ان کے مقابلہ میں حضرت عائشہ کا سکوت مقدم تصور نہیں کیا جائے گا۔ باقاعدہ یاد اور ضبط کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کی روایت کردہ احادیث صحیح تر بھی ہیں۔ ان میں زیادہ تر حدیثیں صحیح یا حسن کا درجہ رکھتی ہیں۔

ایک سلام کی حدیثیں کمزور ہیں

ابو عمر ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سلام کی روایت حضرت سعد بن ابی وقاص،

---

[1] اس کی تخریج کچھ پیشتر گزر چکی ہے۔

[2] حدیث صحیح ہے، ترمذی نے (۲۹۶) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی التسلیم فی الصلاۃ میں، ابن ماجہ نے (۹۱۹) ابن خزیمہ نے (۲۹) اور حاکم نے ۱/۲۳۰ میں اس کی روایت کی ہے۔ سلسلۂ سند میں زہیر بن محمد مکی ہیں ان سے شامیوں کی جو روایت ہوتی ہے اس میں منکرات ہوتے ہیں۔ یہ حدیث بھی انھیں میں سے ایک ہے، تاہم ابن حبان (۶۶۹) نے حضرت عائشہ سے ایک دوسری سند میں کچھ اسی طرح کی روایت کی ہے، سند مسلم کی شرط پر ہے۔ اس باب میں سہل بن سعد ساعدی اور سلمہ بن اکوع نے بھی روایتیں کی ہیں جو ابن ماجہ (۹۱۸) و (۹۲۰) میں وارد ہیں نیز طبرانی کی الکبیر اور الاوسط ۲/۳۲ میں حضرت انس سے بھی ایک روایت ہے۔ ہیثمی نے "المجمع" میں اس کے رجال کو صحیح کے رجال قرار دیا ہے۔

[3] مسند احمد ۶/۲۳۶، ابوداؤد (۱۳۴۶) فی الصلاۃ: باب فی صلاۃ اللیل، حدیث بھز بن حکیم عن زرارۃ بن اوفی عن عائشۃ، ابن حبان (۶۶۹) نے اسے زرارہ ابن اوفی سے انھوں نے سعد بن ہشام سے انھوں نے عائشہ سے روایت کی ہے اور یہی محفوظ ہے۔ اس کی سند مسلم کی شرط پر جیسا کہ گزر چکا ہے صحیح ہے۔

حضرت عائشہ اور حضرت انس سے مروی ہے مگر یہ تمام احادیث معلول ہیں۔ ائمۂ حدیث نے ان کی تصحیح نہیں کی ہے، حضرت سعد کی حدیث "نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں ایک ہی سلام کہتے تھے" کی علّت ظاہر کرتے ہوئے ابن عبدالبر فرماتے ہیں "یہ وہم اور غلط ہے، حدیث یوں ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں اور بائیں سلام کہتے تھے"، پھر پوری حدیث ابن مبارک کی روایت سے انھوں نے مصعب بن ثابت سے انھوں نے اسماعیل بن محمد بن سعد سے، انھوں نے عامر بن سعد سے اور انھوں نے اپنے والد سے بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں بائیں سلام پھیرتے دیکھا گویا میں آپ کے رخسار دیکھ رہا ہوں[۱]۔ اس موقع پر زہری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں یہ ہم نے نہیں سنا، اس پر اسماعیل بن محمد نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حدیث سنی ہے ؟ کہا نہیں، پوچھا آدھی ؟ کہا نہیں، اسماعیل بن محمد نے کہا تو پھر اسے وہی نصف سمجھو جسے تم نے نہیں سنا ہے[۲]۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ کی یہ روایت "آپ ایک ہی سلام پھیرتے تھے"، اسے مرفوعاً صرف زہیر بن محمد نے ہشام بن عروہ سے انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے بیان کیا ہے، ان سے عمرو بن ابی سلمہ وغیرہ نے روایت کی ہے، زہیر بن محمد تمام ائمہ کے نزدیک ضعیف ہیں، کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں ان کی حدیث لائق استدلال نہیں۔ یحییٰ بن معین کے سامنے اس حدیث کا ذکر آیا تو فرمایا، عمرو بن ابی سلمہ اور زہیر دونوں کی روایت ضعیف ہے ان دونوں سے کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا[۳]۔ نیز کہا کہ حضرت انس کی حدیث صرف ایوب کی سند سے بیان ہوئی ہے، ائمۂ حدیث کے نزدیک ایوب سختیانی کا حضرت انس سے قطعاً کوئی سماع ثابت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ حسن سے ایک روایت مرسلاً بیان ہوئی

۱۔ مسلم (۵۸۲) فی المساجد ومواضع الصلوٰۃ : باب السلام للتحلیل من الصلاۃ عند فراغھا، نسائی ۳/۶۱ فی السھو : باب السلام، ابن ماجہ (۹۱۵) فی الاقامۃ : باب التسلیم۔ اس باب میں بے شمار احادیث مروی ہیں، ان میں سے مسلم (۵۸۱) ترمذی (۲۹۵) ابوداؤد (۹۹۶) نسائی اور ابن ماجہ (۹۱۴) نے ایک ایک حدیث عبداللہ بن مسعود کی روایت سے نقل کی ہے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں بائیں سلام پھیرتے ہوئے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہتے تھے اس حالت میں آپ کے رخسار کی سفیدی دیکھ لی جاتی تھی۔

۲۔ سنن بیہقی ۲/۱۷۸، سند میں مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر ہیں، حافظ نے التقریب میں انھیں لین الحدیث کہا ہے۔

۳۔ مقدم الذکر حضرت عائشہ کی حدیث جو زہیر بن محمد کی سند سے بیان ہوئی ہے اپنے حق میں جیسا کہ گزر چکا ہے کچھ ایسے شواہد رکھتی ہے جس سے اسے تقویت پہنچتی ہے، حاکم نے مستدرک ۱/۲۳۱ میں حضرت عائشہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی روایت وہیب بن خالد نے عبداللہ بن عمر سے، انھوں نے قاسم سے، انھوں نے عائشہ سے کی ہے کہ وہ صرف ایک سلام کہتی تھیں۔ یہ سند صحیح ہے "تلخیص" میں حافظ نے کہا ہے کہ اس کی روایت بھی ابن مخلد نے اپنی مسند میں عاصم سے، انھوں نے ہشام بن عروہ سے مرفوعاً کی ہے اور عاصم میرے نزدیک ابن عمر ہیں یہ ضعیف ہیں، جنھوں نے انھیں ابن سلیمان احول سمجھا ہے انھیں وہم ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ حافظ کہتے ہیں صحیح ابن حبان اور مسند ابوالعباس السراج میں بھی حضرت عائشہ سے ایک اور سند سے کچھ ایسی ہی بات روایت کی گئی ہے، ان دونوں نے اس کی تخریج زرارہ بن ابی اوفی کی سند سے، انھوں نے سعد بن ہشام سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۹ رکعتیں وتر پڑھتے تو صرف آٹھویں رکعت ہی کے اندر بیٹھتے تھے۔ اللہ کی حمد کرتے، اس کا ذکر فرماتے پھر دعا مانگتے، پھر اٹھ جاتے اور سلام نہیں پھیرتے، پھر نویں رکعت پڑھتے، بیٹھتے ذکر و دعا فرماتے، پھر ایک سلام کہتے۔

امام شوکانی نیل الاوتار میں لکھتے ہیں کہ ایک سلام صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر، انس، سلمہ بن اکوع اور عائشہ۔ تابعین میں حسن، ابن سیرین اور عمر بن عبدالعزیز اور آگے مالک، اوزاعی، امامیہ اور ایک قول کے مطابق شافعی کا مذہب ہے۔ دو سلاموں کے قائلین میں اختلاف ہے کہ دوسرا سلام واجب ہے یا نہیں جمہور اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ معتدبہ علماء کا اجماع ہے کہ صرف ایک ہی سلام واجب ہے، طحاوی وغیرہ نے حسن بن صالح کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں ہی سلام واجب ہیں، امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے، بعض اصحاب مالک بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابن عبدالبر نے بعض اصحاب ظاہر کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سب ایک ہی سلام کہتے تھے۔ جو لوگ ایک سلام کے قائل ہیں ان کے یہاں صرف اہلِ مدینہ کا عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کا عمل حجت ہے یہ عمل نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آیا ہے اس سے استدلال کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ روزانہ یہ عمل کئی بار انجام ہوتا چلا آیا ہے۔ لہٰذا کسی سے مخفی نہ تھا، مگر بقیہ تمام فقہاء اس بات کے مخالف ہیں اور حق بھی یہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتیں ثابت ہیں وہ کسی بھی اہلِ ملک کے عمل سے مسترد نہیں کی جاسکتیں۔ مدینہ وغیرہ کے اندر امراء وحکام نے صلوٰۃ کے باب میں کیا کچھ تغیرات نہیں کر دیتے جن پر عمل ہونے لگا نگران کی جانب توجہ نہیں دی گئی، علاوہ ازیں اہلِ مدینہ کا جو عمل لائق استدلال ہے اصل میں وہ عمل ہے جو خلفاء راشدین کے زمانہ میں پایا جاتا تھا باقی ان کی وفات کے بعد نیز جو صحابہ مدینہ میں موجود تھے ان کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد مدینہ اور غیر مدینہ اور دونوں کے عمل میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ اب لوگوں کے درمیان بس نسبت ہی قول فیصل ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے بعد کسی کا عمل۔ وباللّٰہ التوفیق۔

صلوٰۃ کی دعائیں

صلوٰۃ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسب ذیل دعا تشہد کے بعد پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ [1]

اے اللہ! عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں، مسیح دجال کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں، زندگی اور موت کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا رَزَقْتَنِیْ [2]

اے اللہ! میرا گناہ بخش دے، میرے گھر میں کشادگی عطا فرما اور جو رزق دے اس میں برکت عطا فرما۔

یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَی الرُّشْدِ وَاَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ، وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ،

---

[1] بخاری ۲/۲۶۳، فی صفۃ الصلاۃ : باب الدعاء قبل السلام، وفی الاستقراض : باب من استعاذ من الدین، وفی الفتن : باب ذکر الدجال۔ مسلم (۵۸۹) فی المساجد ومواضع الصلاۃ، ابوداؤد (۸۸۰) فی الصلاۃ : باب الدعاء فی الصلاۃ، نسائی ۳/۵۶، ۵۷، فی السہو : باب التعوذ فی الصلاۃ، مسند احمد ۶/۲۴۴، حدیث عائشہ، اس کے آخر میں آیا ہے انھوں نے کہا کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ تاوان سے بہت زیادہ پناہ مانگتے ہیں، تو فرمایا : آدمی جب قرضدار ہو جاتا ہے تو باتیں کرتے وقت جھوٹ بولنے لگتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی پر اتر آتا ہے۔

[2] عمل الیوم واللیلۃ، ص (۲۱) : باب مایقول بین ظہرانی وضوئہ میں ابن سنی نے اس حدیث کی تخریج ابوموسیٰ کی روایت سے کی ہے، سند صحیح ہے، نووی نے "الاذکار" کے باب مایقول علی وضوئہ میں اسے صحیح کہا ہے، ترمذی (۳۴۹۶) نے اس کی روایت ابوہریرہ سے کی ہے، اس کے مطابق ایک شخص نے کہا : اے اللہ کے رسول رات آپ کی دعا سنی، جو الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے وہ یہ تھے " اللھم اغفرلی ذنبی ووسع لی فی داری وبارک لی فیما رزقتنی" یہ حسن حدیث ہے۔ مصنف نے جس طرح اس کا تذکرہ کیا ہے صلوٰۃ کی دعاؤں میں ہم نے کسی کو اس طرح ذکر کرتے نہیں دیکھا ہے۔

وَاَسْاَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَّلِسَانًا صَادِقًا، وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ[1]

اے اللہ! میں تجھ سے ثبات قدمی اور راہِ حق میں اولوالعزمی کا طالب ہوں، تجھ سے سوالی ہوں کہ اپنی نعمت کے شکریہ اور حسن عبادت کی توفیق عطا فرما، میں تجھ سے قلبِ سلیم اور سچی زبان مانگتا ہوں، میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے وہ بھلائی عطا فرما جسے تو بھلا جانتا ہے اور اس شر سے بچا جسے تو شر جانتا ہے، میں تجھ سے اس بات کی مغفرت کا طالب ہوں جو تو جانتا ہے۔

سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔

رَبِّ اَعْطِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّهَا، اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا[2]

پروردگار! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا کر دے، اسے صاف کر دے تو سب سے بہتر اسے صاف کرنے والا ہے تو اس کا ولی اور اس کا مولیٰ ہے۔

رکوع، سجدہ، جلسہ میں اور رکوع سے سیدھے ہو کر جو دعائیں پڑھتے تھے ان میں بعض دعاؤں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

صلوٰۃ کی مسنون دعائیں

تمام صلوات میں آپ سے جو ثابت دعائیں ہیں وہ سب مفرد صیغہ سے ہیں۔ مثلاً

رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ[3] میرے رب! بخشدے مجھے، رحم فرما مجھ پر، ہدایت دے مجھے۔

---

[1] ترمذی (۳۴۰۴) فی الدعوات : باب سئوال الثبات فی الامر؛ یہ حدیث ابوالعلاء بن شخیر نے خاندان بنو حنظلہ کے ایک شخص سے، انھوں نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے، نسائی ۳/۵۴ فی السھو : باب نوع آخر من الدعاء، مسند احمد ۴/۱۲۵، ابن شخیر اور شداد بن اوس کا درمیانی واسطہ ساقط کرتے ہوئے، پہلی سند میں ایک مجہول ہے، دوسری منقطع ہو جاتی ہے لہذا ضعیف ہے، مسند احمد ۴/۱۲۳، میں ایک حدیث روح بن عبادہ کی ہے انھوں نے کہا ہم سے اوزاعی نے بیان کیا ہے انھوں نے حسان بن عطیہ سے، فرماتے ہیں کہ شداد بن اوس ایک سفر میں تھے چنانچہ ایک جگہ منزل کی اور اپنے غلام سے کہا، چھری لاؤ میں اس سے کھیلوں گا، میں نے ان کی بات بری مانی تو فرمایا " اسلام لانے کے بعد جو بات بھی کہی ہے اسے خوب سوچ بوجھ کر کہی ہے سوائے اس بات کے، لہذا میرے خلاف اسے یاد نہ رکھنا، آگے جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے اچھی طرح یاد رکھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ لوگ سونا چاندی ذخیرہ کرنے کے عادی ہیں تو تم حسب ذیل الفاظ کو ذخیرہ کرو۔" اللھم انی اسألك الثبات فی الامر والعزیمة علی الرشد، واسألك شكر نعمتك واسألك حسن عبادتك واسألك قلبًا سليمًا واسألك لسانا صادقا واسألك من خير ما تعلم واعوذ بك من شر ما تعلم واستغفرك لما تعلم، انك انت علام الغيوب۔ اس کے تمام رجال ثقہ ہیں۔

[2] مسند احمد ۶/۲۰۹، انہی الفاظ میں مگر سجدہ کی قید لگا کر، حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے، سند میں انقطاع ہے یہ حدیث سجدہ کی قید کے بغیر بھی مروی ہے، روایت مسلم (۲۷۲۲) نے فی الذكر والدعاء : باب التعوذ من شر ما عمل ومن شر ما لم يعمل، نسائی نے ۸/۲۶۰ فی الاستعاذة : باب الاستعاذة من العجز وباب الاستعاذة من دعاء لا يستجاب، اور احمد نے مسند ۴/۳۷۱ میں کی ہے راوی زید بن ارقم ہیں اور حدیث مذکورہ بالا حدیث سے طویل ہے۔

[3] ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، حدیث عبداللہ بن عباس۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، مسلم (۲۶۹۹) نے سعد بن ابی وقاص سے ایک روایت کی ہے، فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اعرابی نے آکر کہا : مجھے دعائیں سکھائیں آپ نے فرمایا : پڑھو " لا اله الا الله وحده لا شريك له، الله اكبر كبيرا، والحمد لله كثيرا، سبحان الله رب العالمين، لا حول ولا قوة الا بالله العزيز الحكيم " اعرابی نے کہا : یہ باتیں تو رب کے حق میں ہوئیں میرے حق میں کیا ہے؟ فرمایا : آگے پڑھو " اللهم اغفرلی وارحمنی واهدنی وارزقنی "

اسی طرح آپ سے بقیہ تمام ثابت دعاؤں کا بھی حال ہے۔ چنانچہ ایک دعا وہ ہے جسے صلوٰۃ کے افتتاح کے موقع پر پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالثَّلْجِ وَالْمَاءِ وَالْبَرَدِ، اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ [۱]

اے اللہ! میرے گناہوں کو دھو دے برف، پانی اور اولے سے، اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے مابین وہی بُعد پیدا کر دے جو بُعد تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان پیدا کیا ہے۔

امام احمد اور اصحابِ سنن نے حضرت ثوبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ "کوئی بندہ کسی قوم کی امامت کرے تو انھیں نظر انداز کرکے دعا میں اپنے آپ کو مخصوص نہ کرے، اگر ایسا کرے گا تو خیانت کا مرتکب ہوگا[۲]۔" ابن خزیمہ نے اپنی صحیح کے اندر مذکورہ بالا احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ" جیسی حدیث کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ موضوع حدیث "لَا يَؤُمُّ عَبْدٌ قَوْمًا..." [۳] قابلِ رد ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سنا ہے کہ میرے نزدیک اس حدیث کا تعلق اس دعا سے ہے جو امام اپنے لیے اور مقتدیوں کے حق میں مشترکہ طور پر پڑھتا ہے، جیسے دعاء قنوت وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت خشوع

امام احمد کی روایت ہے کہ حالتِ صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر جھکا کر کھڑے ہوتے، تشہد میں آپ کی نگاہ جیسا کہ گزر چکا ہے انگلی کے اشارے سے آگے نہیں جاتی تھی، صلوٰۃ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، نعمت، سرور اور راحت کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ فرماتے تھے: بلال! ہمیں صلوٰۃ کے ذریعہ تسکین پہنچاؤ۔[۴] نیز فرماتے: میری آنکھوں کی ٹھنڈک صلوٰۃ میں ہے۔[۵]

تاہم خشوع وخضوع کی جو کیفیت آپ پر طاری ہوتی وہ آپ کو ماحول سے بیگانہ نہ رکھتی، چنانچہ کمال توجہ الی اللہ، حضورِ قلب اور تقرب الی اللہ کی کیفیت کے باوجود آپ مقتدیوں وغیرہ کا لحاظ فرماتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ صلوٰۃ طویل پڑھنے کا ارادہ ہوتا مگر اس حال میں کسی بچہ کے رونے کی آواز آجاتی تو اس خیال سے

۱۔ بخاری ۱۹۱/۲ فی الصلاۃ: باب مایقال بعد التکبیر، مسلم (۵۹۸) فی المساجد، حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

۲۔ احمد ۲۸۰/۵، ترمذی (۳۵۷) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی کراھیۃ ان یخص الامام نفسہ بالدعاء، ابوداؤد (۹۰) فی الطھارۃ: باب أیصلی الرجل وھو حاقن۔ حدیث اسماعیل بن عیاش عن حبیب بن صالح عن یزید بن شریح الحضرمی عن ابی حی المؤذن عن ثوبان۔ سند حسن ہے۔ اسماعیل ابن عیاش اہلِ وطن سے جو روایت کرتے ہیں وہ صائب ہوتی ہے۔ یہ حدیث بھی انھیں میں سے ایک ہے۔

۳۔ ہمیں ابن خزیمہ کا یہ تبصرہ ان کی صحیح میں مذکورہ حدیث کے بعد نہیں ملا، ممکن ہے کہیں اور ہو، اگر ان سے یہ کلام ثابت ہو تو صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث درجۂ حسن سے کم نہیں جیسا کہ جرح وتعدیل کی کتابوں سے واضح ہے۔

۴۔ ابوداؤد (۴۹۸۵) و (۴۹۸۶) فی الادب: باب صلاۃ العتمۃ، مسند احمد ۳۹۴/۵ و ۳۷۱، روایت ایک صحابی کی ہے، سند صحیح ہے۔

۵۔ نسائی ۶۱/۷ فی عشرۃ النساء: باب حب النساء، مسند احمد ۱۲۸/۳ و ۱۹۹ و ۲۸۵، حدیث انس، سند حسن ہے، حاکم نے اسے صحیح، عراقی نے جید اور ابن حجر نے حسن قرار دیا ہے، پوری حدیث کا مفہوم یہ ہے۔ تمھارے دنیاوی امور میں مجھے عورتیں اور خوشبو محبوب ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک صلوٰۃ میں رکھی گئی ہے۔ یہ حدیث گزر چکی ہے۔

اسے ہلکی ادا فرماتے کہ مبادا ماں پر گراں گزرے۔ ایک بار ایک شہسوار آپ نے بطور گشتی سپاہ کے بھیجا اس کے بعد صلوٰۃ میں مصروف ہو گئے مگر حالت صلوٰۃ میں مڑ مڑ کر اس گھاٹی کی جانب نگاہ ڈالتے رہے جس سے اس شہسوار کو واپس آنا تھا[1] صلوٰۃ کی جو کیفیت آپ پر طاری تھی اس کی وجہ سے آپ اپنے اس شہسوار کی دیکھ ریکھ سے غافل نہ رہے۔

اسی طرح امامہ بنت ابوالعاص بن ربیع یعنی اپنی صاحبزادی زینب کی بچی کو فرض صلوٰۃ کی حالت میں سنبھالتے رہے چنانچہ کھڑے ہوتے تو اسے اٹھا لیتے اور رکوع اور سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے[2]

صلوٰۃ کی حالت میں حسن یا حسین آکر آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے، آپ سجدہ اس خیال سے لمبا کر دیتے کہ کہیں وہ گر نہ پڑیں[3]

صلوٰۃ کی حالت میں حضرت عائشہ اپنی کسی ضرورت سے آتیں، دروازہ بند ہوتا تو آپ چل کر دروازہ کھول دیتے اور پھر مصلی پر واپس آ جاتے[4]

حالت صلوٰۃ میں سلام کا جواب دینا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت صلوٰۃ میں سلام کرنے والوں کو اشارہ سے سلام کا جواب دیتے تھے حضرت جابر فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ضرورت سے مجھے بھیجا، واپس آیا تو حالت صلوٰۃ میں پایا، سلام کیا تو آپ نے اشارہ سے جواب دیا" یہ بیان صحیح مسلم میں مذکور ہے[5]

۱۔ اس حدیث کی تخریج اوپر گزر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے۔

۲۔ بخاری ۱/۴۸۷ فی سترۃ المصلی : باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ، وفی الادب : باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ، مسلم (۵۴۳) فی المساجد : باب جواز حمل الصبیان فی الصلاۃ، مؤطا ۱/۱۷۰ فی قصر الصلاۃ : باب جامع الصلاۃ، ابو داؤد (۹۱۷) فی الصلاۃ : باب العمل فی الصلاۃ، نسائی ۳/۱۰ فی السہو : باب حمل الصبایا فی الصلاۃ ووضعہن فی الصلاۃ۔

۳۔ احمد ۳/۴۹۳، ۴۹۴، نسائی ۲/۲۲۹، ۲۳۰ فی الصلاۃ : باب ھل یجوز ان تکون سجدۃ اطول من سجدۃ، بیہقی ۲/۲۶۳ حدیث شداد بن ہاد۔ فرماتے ہیں کہ عشاء کی کسی صلاۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسن یا حسین کو لے کر آئے۔ آگے بڑھ کر انھیں اتار دیا اور تکبیر فرما کر صلوٰۃ میں مصروف ہو گئے، دوران صلوٰۃ آپ کا ایک سجدہ بڑا لمبا رہا کہتے ہیں کہ سر اٹھا کر جو میں نے دیکھا تو سجدہ کی حالت میں بچہ آپ کی پشت پر تھا، میں دوبارہ سجدہ میں چلا گیا۔ صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! دوران صلوٰۃ آپ نے ایک سجدہ بڑا لمبا فرمایا ہے، ہمیں خیال ہوا کہ کوئی بات ہو گئی ہے یا آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ فرمایا: ان میں سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی، میرا بچہ مجھ پر سوار ہو گیا تھا، اچھا نہ معلوم ہوا کہ اس کی خواہش پوری ہونے سے پہلے اسے ہٹاؤں۔ سند صحیح ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ اس باب میں حضرت ابوہریرہ سے بھی ایک روایت مسند احمد ۲/۵۱۳ میں وارد ہے۔ سند اس کی حسن ہے۔

۴۔ ترمذی (۶۰۱) فی الصلاۃ : باب ذکر ما یجوز من المشی والعمل فی صلاۃ التطوع، ابو داؤد (۹۲۲) فی الصلاۃ : باب العمل فی الصلاۃ، نسائی ۳/۱۱ فی السہو : باب المشی امام القبلۃ خطی یسیرۃ، مسند احمد ۶/۱۸۳ و ۲۳۴۔ سند قوی ہے، ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

۵۔ مسلم (۵۴۰) فی المساجد : باب تحریم الکلام فی الصلاۃ ونسخ ما کان من اباحتہ، ابو داؤد (۹۲۶) فی الصلاۃ : باب رد السلام فی الصلاۃ، نسائی ۳/۶ فی السہو : باب رد السلام بالاشارۃ فی الصلاۃ، ابن ماجہ (۱۰۱۸) فی الاقامۃ : باب المصلی یسلم علیہ کیف یرد۔

حضرت انس فرماتے ہیں : نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں اشارہ کرتے تھے۔ امام احمد نے اس کا تذکرہ کیا ہے [۱]

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: صلوٰۃ کی حالت میں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو سلام کیا آپ نے اشارہ سے جواب دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ ان کا مقصود کچھ اور نہیں بس "انگلی سے اشارہ کرنا" ہے۔ یہ سنن اور مسند میں وارد ہے [۲]

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا پہنچ کر صلوٰۃ ادا فرما رہے تھے اس حالت میں انصار آگئے انھوں نے آپ کو سلام کیا چنانچہ میں نے بلال سے پوچھا کہ جس وقت وہ آپ کو سلام کر رہے تھے، آپ نے ان کا جواب کیسے دیا؟ فرمایا اس طرح اشارہ کرتے تھے۔ جعفر بن عون نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اندرونی حصہ نیچے اور بیرونی حصہ اوپر کر دیا [۳] یہ حدیث سنن اور مسند میں آئی ہے۔ ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے، اس کے الفاظ "کان یشیر بیدہ" ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں : حبشہ سے واپس آکر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ حالتِ صلوٰۃ میں تھے، میں نے سلام کیا تو سر سے اشارہ فرمایا بیہقی نے اسے ذکر کیا ہے [۴] لیکن حضرت ابوہریرہ کی روایت سے ابوغطفان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب بیان کہ " حالت صلوٰۃ میں جو شخص قابل فہم اشارہ کرے وہ صلوٰۃ دہرائے" غلط ہے۔ دارقطنی نے اسے ذکر کیا ہے [۵] انھوں نے کہا ہے کہ ابن ابی داود نے ہم سے فرمایا کہ ابوغطفان مجہول شخص ہے [۶] صحیح یہ ہے کہ حالتِ صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کرتے تھے۔ حضرت انس اور جابر وغیرہ سے یہی روایت ہے۔

آپ حالتِ صلوٰۃ میں ہوتے اور حضرت عائشہ آپ کے اور قبلہ کے درمیان آڑے سوئی ہوتیں، آپ سجدہ میں جانے لگتے تو ہاتھ سے کچھ کے لگاتے، وہ اپنے پیر سمیٹ لیتیں اور جب کھڑے ہو جاتے تو پھیلا لیتیں [۷]

۱۔ مسند احمد ۱۳۸/۳، سند صحیح ہے۔

۲۔ ترمذی (۳۶۷) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الاشارۃ فی الصلاۃ، ابوداؤد (۹۲۵) فی الصلاۃ : باب رد السلام فی الصلاۃ، نسائی ۵/۳ فی السہو : باب رد السلام بالاشارۃ فی الصلاۃ۔ سند حسن ہے۔ ایک دوسری سند سے، مسند احمد ۱۰/۲، ابن ماجہ (۱۰۱۷) فی الاقامۃ : باب المصلی یسلم علیہ کیف یرد۔ ایک دوسری سند ہے جو صحیح ہے، ابن خزیمہ (۸۸۸) نے اسے صحیح کہا ہے۔

۳۔ ترمذی (۳۶۸) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الاشارۃ فی الصلاۃ، ابوداؤد (۹۲۷) فی الصلاۃ : باب رد السلام فی الصلاۃ۔ سند صحیح ہے۔ ترمذی کے مطابق حدیث حسن صحیح ہے۔

۴۔ بیہقی ۲۶۰/۲ فی الصلاۃ : باب من اشار بالراس۔ فرماتے ہیں ابویعلی محمد بن صلت توزی سلسلۂ سند میں منفرد ہیں، تقریب میں ہے کہ صدوق ہیں مگر وہمی ہیں۔

۵۔ دارقطنی (۱۹۵) ابوداؤد (۹۴۴) بیہقی فی السنن الکبریٰ ۲۶۲/۲ فی الصلاۃ۔ اس میں ابن اسحاق کا عنعنہ شامل ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ ۲/ ۹۰، ۹۱۔

۶۔ تقریب اور اس کی اصل کے مطابق ابوغطفان ثقہ ہیں۔ ابن ابی داؤد خود منفرد ہو گئے ہیں، لہذا ابوغطفان کی جہالت کا دعویٰ کر بیٹھے۔ علاوہ ازیں حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں، دارقطنی سے پوچھا گیا تو انھوں نے ایسا ہی جواب دیا۔

۷۔ بخاری ۶۴/۳ فی العمل فی الصلاۃ : باب مایجوز من العمل فی الصلاۃ، و فی الصلاۃ فی الثیاب : باب الصلوٰۃ علی الفراش و فی سترۃ المصلی : باب التطوع خلف المرأۃ، مسلم (۵۱۲) فی الصلاۃ : باب الاعتراض بین یدی المصلی، مؤطا ۱۷/۱ فی صلاۃ اللیل : باب ماجاء فی صلاۃ اللیل، ابوداؤد (۷۱۲) فی الصلاۃ : باب من قال المرأۃ لاتقطع الصلاۃ، نسائی ۱۰۲/۱ فی الطہارۃ : باب ترک الوضوء من مس الرجل امرأتہ من غیر شہوۃ، مسند احمد ۴۴/۶ و ۵۵ و ۱۴۸ و ۲۲۵ و ۲۵۵۔ حدیث حضرت عائشہ۔ معنی یہ ہے " میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک دفعہ آپ حالتِ صلوٰۃ میں تھے، قطع صلوٰۃ کے لیے شیطان آگیا، آپ نے پکڑ کر اس کا گلا اس حد تک گھونٹا کہ اس کا لعاب دہن آپ کے ہاتھوں پر بہہ نکلا[1]

ایک بار منبر پر صلوٰۃ ادا فرما رہے تھے رکوع اسی پر کرتے، سجدہ کا وقت آتا تو پیچھے ہٹ کر زمین پر سجدہ کرتے، پھر منبر پر چڑھ جاتے[2]

ایک دفعہ کسی دیوار کے سامنے صلوٰۃ پڑھ رہے تھے، بکری کا ایک بچہ آیا اور سامنے سے گزرنا چاہا مگر آپ اسے برابر روکتے ٹالتے رہے حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے آپ کا شکم دیوار سے جا لگا اور بچہ پیچھے سے نکل گیا[3]

ایک دفعہ آپ صلوٰۃ پڑھ رہے تھے اسی اثناء میں خاندان عبدالمطلب کی دو بچیاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا آپ کے پاس آگئیں، صلوٰۃ ہی کی حالت میں آپ نے ان دونوں کو پکڑا اور ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ احمد کے الفاظ اس طرح ہیں "ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے پکڑ لیے، آپ نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا، اور صلوٰۃ ترک نہیں کی[4]

ایک بار صلوٰۃ کی حالت میں تھے۔ سامنے سے ایک بچہ نے گزرنا چاہا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا چنانچہ وہ واپس ہو گیا۔ ایک لڑکی نے بھی گزرنا چاہا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا مگر وہ گزر گئی، صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ لڑکیاں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کے سامنے سوتی تھی، میرے پیر آپ کے قبلہ کی جانب ہوتے، سجدہ کرتے تو مجھے کچوکے لگاتے، چنانچہ میں اپنے پیر سمیٹ لیتی، کھڑے ہوتے تو پھر پھیلا لیتی۔ فرماتی ہیں: اس زمانہ میں گھروں کے اندر چراغ نہیں ہوا کرتے تھے۔

[1] بخاری ۳/۶۴ فی العمل فی الصلاۃ: باب مایجوز من العمل فی الصلاۃ وفی المساجد باب الاسیر والغریم یربط فی المسجد، وفی بدء الخلق: باب صفۃ ابلیس وجنودہ، وفی الانبیاء: باب قول اللہ تعالیٰ "ووھبنا لداؤد سلیمان" وفی تفسیر سورۃ ص، مسلم (۵۴۱) فی المساجد: باب جواز لعن الشیطان فی اثناء الصلاۃ۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صلوٰۃ ادا کی تو فرمایا کہ شیطان سامنے آگیا اور میری صلوٰۃ قطع کرنے کے لیے مجھ پر حملہ آور ہوا، اللہ نے اس پر مجھے قابو دے دیا۔ چنانچہ اس کا گلا گھونٹ دیا، خیال ہوا کہ اسے کھمبے سے باندھ دوں تاکہ صبح کو تم لوگ بھی دیکھ سکو مگر سلیمان علیہ السلام کا یہ قول یاد آگیا "رب ھب لی ملکا لاینبغی لاحد من بعدی" پروردگار مجھے ایسا اقتدار عطا کر کہ میرے بعد کسی کو میسر نہ ہو۔ اللہ نے اسے ذلیل کر کے واپس کر دیا" مسلم کی روایت میں الفاظ یوں ہیں "ایک جنی عفریت کل کی شب میری قطع صلوٰۃ کے لیے مجھ پر جھپٹا ..... اور آگے پوری حدیث بیان کی ہے" راوی حضرت ابوہریرہ ہیں۔

[2] بخاری ۲/۳۳۱ مسلم (۵۴۴) حدیث سہل بن سعد۔ آگے ارشاد ہے "لوگو! میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میری اقتدا کر سکو اور میری صلوٰۃ تمہارے علم میں آجائے۔

[3] ابوداؤد (۷۰۸) فی الصلاۃ: باب سترۃ الامام سترۃ من خلفہ، حدیث عمرو بن شعیب، انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔ سند حسن ہے۔ اس باب میں ایک حدیث عبداللہ بن عباس کی روایت سے ابن خزیمہ (۸۲۷) اور حاکم ۱/۲۵۴ میں حسب ذیل معنی میں آئی ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ پڑھ رہے تھے کہ آپ کے سامنے سے ایک بکری گزری، آپ نے اسے قبلہ کی جانب دوڑایا حتیٰ کہ اپنا شکم قبلہ سے چپکا دیا۔ سند صحیح ہے۔

[4] ابوداؤد (۷۱۶) فی الصلاۃ: باب من قال: الحمار لایقطع الصلاۃ، نسائی ۲/۶۵ فی القبلۃ: باب ذکر مایقطع الصلاۃ ومالایقطع، عبداللہ بن عباس کی روایت میں یوں ہے کہ وہ اور بنو ہاشم کا ایک لڑکا دونوں ایک گدھے پر سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے، پھر گدھے سے اتر کر آپ کے ساتھ صلوٰۃ پڑھی، آپ نے صلوٰۃ ترک نہیں کی۔ ان کے بعد دو بچیاں خاندان عبدالمطلب کی دوڑتی ہوئی آئیں اور آپ کے گھٹنے پکڑ لیے آپ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا اور صلوٰۃ ترک نہیں کی، ابوداؤد (۷۱۷) کی ایک روایت میں یوں ہے کہ عبدالمطلب کی دو بچیاں لڑتی ہوئی آئیں، چنانچہ آپ نے انھیں پکڑ لیا۔ سند حسن ہے۔

[5] مسند احمد ۱/۲۳۵ و ۲۵۰ و ۲۵۴ و ۳۰۸ و ۳۱۶ و ۳۴۱۔ سند حسن ہے۔

زیادہ چیرہ دست ہوتی ہیں[1]۔ امام احمد نے اسے ذکر کیا ہے، یہ سنن میں بھی وارد ہے۔

صلوٰۃ میں آپ پھونک مارتے تھے۔ امام احمد نے اس کا ذکر کیا ہے اور سنن میں بھی وارد ہے[2]۔

حدیث "النفخ فی الصلوٰۃ کلام" (صلوٰۃ میں پھونکنا بھی کلام ہے) بے بنیاد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ سنن میں سعید نے اس کی روایت کی ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو ابن عباس کا قول ہے۔

صلوٰۃ میں روتے اور کھنکھارتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ میرا ایک وقت مقرر تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا، داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کرتا، صلوٰۃ پڑھتے ہوتے تو کھنکھار دیتے اور میں اندر آجاتا۔ فارغ ہوتے تو اجازت مرحمت فرماتے، نسائی اور احمد نے اس کا ذکر کیا ہے۔ احمد میں یوں ہے "شب و روز میں دو[3] وقت میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مقرر تھا، صلوٰۃ کی حالت میں اندر آنا چاہتا تو آپ کھنکھار دیتے۔ احمد نے اس کی روایت کی ہے[3] اور اسی پر ان کا عمل بھی ہے۔ چنانچہ وہ صلوٰۃ کے اندر کھنکھارتے تھے اور اس سے صلوٰۃ کے باطل ہونے کے قائل نہ تھے۔

آپ کبھی ننگے پیر کبھی جوتے پہن کر صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ عبداللہ بن عمر نے ایسی ہی کیفیت آپ سے بیان کی ہے[4]۔ یہود کی مخالفت میں آپ نے جوتے پہن کر صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا ہے[5]۔ آپ کبھی ایک کپڑے میں اور اکثر دو کپڑوں میں صلوٰۃ ادا فرماتے تھے۔

صلوٰۃ فجر وغیرہ میں دعائے قنوت پر تحقیقی بحث

فجر کی صلوٰۃ میں رکوع کے بعد آپ نے ایک ماہ دعائے قنوت پڑھی پھر چھوڑ دیا۔ دعائے قنوت پڑھنا آپ کا دائمی دستور

---

[1] ابن ماجہ (۹۴۸) فی الاقامۃ ، باب مایقطع الصلاۃ، مسند احمد ۲۹۴/۶۔ حدیث ام سلمہ، سند میں ایک مجہول ہے۔

[2] نسائی ۱۳۷/۳، ۱۳۸ فی الکسوف : باب صلاۃ الکسوف، مسند احمد ۱۵۹/۲ و ۱۸۸۔ یہ عبداللہ بن عمر سے مروی ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ فرماتے ہیں : آپ کھڑے ہوئے اور قیام، رکوع، سجدہ، جلسہ۔ دوسری رکعت میں بھی ویسا ہی کیا جیسا پہلی رکعت میں کیا تھا اور سجدہ کے آخر میں پھونکنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ پوری حدیث "سند صحیح ہے کیونکہ احمد کے یہاں عطاء بن سائب سے اس کے راوی شعبہ اور ابن خزیمہ کے یہاں سفیان ہیں، اور باہمی ملاقات سے پہلے ہی عطاء سے یہ دونوں سن چکے ہیں، بخاری نے تعلیقاً بصیغہ "تمریض" ۶۲/۳ فی العمل فی الصلاۃ : باب مایجوز من البصاق والنفخ فی الصلاۃ، عبداللہ بن عمرو سے اس کی روایت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے سجدہ کے اندر پھونکا تھا۔

[3] مسند احمد (۶۴۷) نسائی ۱۲/۳ فی الصلاۃ : باب التنحنح فی الصلاۃ، ابن خزیمہ (۹۰۲) حدیث عبداللہ بن نجی، انھوں نے علی سے روایت کی ہے، حدیث منقطع ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن نجی کا حضرت علی سے سماع ثابت نہیں، بعض مآخذ میں روایت عبداللہ بن نجی سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے علی سے کی ہے۔ نجی مجہول ہیں، ابن حبان کے سوا کسی نے انھیں ثقہ قرار نہیں دیا ہے۔

[4] ابوداؤد (۶۵۳) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ فی النعل۔ ابن ماجہ (۱۰۳۸) باب الصلاۃ فی النعال، مسند احمد ۱۷۴/۲ و ۱۷۸ و ۱۷۹ و ۱۹۰ و ۲۰۶ و ۲۱۵۔ سند حسن ہے، نسائی نے اس کی روایت ۸۲/۳ فی السھو : باب الانصراف من الصلاۃ میں حضرت عائشہ سے کی ہے۔ سند حسن ہے۔

[5] ابوداؤد (۶۵۲) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ فی النعل۔ سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔ بیہقی نے اس کی روایت ۴۳۲/۲ میں کی ہے۔

نہ تھا۔ یہ بات ناممکنات میں ہے کہ ہر صبح رکوع سے سیدھے ہونے کے بعد وفات تک ہمیشہ باآواز بلند یہ دعا پڑھتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ ... الخ اور صحابہ اس پر آمین بھی کہیں پھر بھی یہ بات امت کو معلوم نہ ہو سکے بلکہ امت میں جمہور ہی نہیں تمام صحابہ اسے اپنے ذہنوں سے محو کر دیں، حتیٰ کہ بعض صحابہ نے اسے بدعت تک قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ سعد بن طارق اشجعی فرماتے ہیں: "میں نے والد سے پوچھا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے یہاں اور کوفہ میں بھی پانچ سال تک صلوٰۃ پڑھی ہے، کیا وہ لوگ فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے؟ تو والد نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: "ارے بیٹے یہ بدعت ہے"[1]۔ اصحاب سنن اور احمد نے اس کی روایت کی ہے، ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے، دارقطنی نے سعید بن جبیر کی روایت نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "میں گواہ ہوں کہ عبداللہ بن عباس کو کہتے سنا ہے کہ صلوٰۃ فجر میں دعائے قنوت پڑھنا بدعت ہے"[2]۔ بیہقی نے ابو مجلز سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں "میں نے عبداللہ بن عمر کے ساتھ صبح کی صلوٰۃ ادا کی مگر انھوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی، میں نے پوچھا کیا آپ دعائے قنوت نہیں پڑھتے؟ فرمایا: اپنے کسی ساتھی سے اس دعا کا ثبوت مجھے نہیں ملا"[3]۔

بدیہی طور پر یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر صبح دعائے قنوت پڑھتے اور صحابہ بھی آمین کہتے تو یقیناً امت اسے ویسے ہی نقل کرتی جس طرح اس نے صلوٰۃ فجر کی تعداد، اس کا وقت اور اس میں قراءۃ بالجہر کے مسائل نقل کیے ہیں۔ اگر دعائے قنوت کا مسئلہ فراموش کر دینا ان کے لیے جائز ہوتا تو مذکورہ مسائل کو بھی ضائع کر دینا یقیناً جائز ہوتا دونوں میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ اسی اصول پر ہم باور کرتے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ دائمی طور پر بسم اللہ بالجہر پڑھنا بھی آپ کا دستور نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو ہر گز امت اسے ضائع نہ کرتی، نہ اس پر یہ بات مخفی ہوتی۔ صلوات کی تعداد، رکعتوں کی تعداد، جہر و سکوت، سجدوں کی تعداد، ارکان کے مقامات اور ان کی ترتیب یہ سب تو امت نقل کر دے اور نقل نہ کرے تو صرف بسم اللہ بالجہر۔ یہ سخت ناممکنات سے ہے۔ واللہ الموفق۔

انصاف پسند صاحب علم کے نزدیک حق یہ ہے کہ آپ نے بسم اللہ جہراً بھی پڑھا ہے اور سراً بھی۔ دعائے قنوت پڑھی بھی ہے اور نہیں بھی۔ مگر بالجہر کے مقابلہ میں بسم اللہ بالسر پڑھنا اور قنوت پڑھنے کی بہ نسبت ترک کر دینا زیادہ تر آپ کا معمول رہا ہے۔ مصائب کے وقت کسی قوم کے حق میں دعا اور دشمنوں کے حق میں بددعا کے لیے آپ نے قنوت پڑھی ہے، جن لوگوں کے حق میں دعائے قنوت پڑھی تھی قید و بند سے وہ رہا ہو کر واپس آ گئے، اور جن کے خلاف پڑھی تھی وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے تو آپ نے پھر ترک کر دی۔ چنانچہ یہ قنوت کسی عارضی مصلحت سے تھی، یہ مصلحت جاتی رہی تو قنوت بھی ترک کر دی گئی، اس کے لیے صلوٰۃ فجر ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ فجر اور مغرب دونوں وقتوں کی صلوات میں قنوت پڑھی جاتی تھی۔ صحیح بخاری میں اس کا ذکر حضرت انس[4] اور صحیح مسلم میں حضرت براء کی روایتوں میں آیا ہے[5]۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1]۔ ترمذی (۴۰۲) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی ترک القنوت، ابن ماجہ (۱۲۴۱) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی القنوت فی صلاۃ الفجر، مسند احمد ۳/۴۷۲ و ۶/۳۹۴، بیہقی ۲/۲۱۳ فی الصلاۃ : باب من لم یر القنوت فی صلاۃ الصبح۔ سند صحیح ہے۔

[2]۔ سنن دارقطنی ۲/۴۱ فی الوتر : باب صفۃ القنوت ومواضعہ، سند میں عبداللہ بن میسرہ ہیں جو ضعیف ہیں۔

[3]۔ سنن کبریٰ بیہقی ۲/۲۱۳ فی الصلاۃ : باب من لم یر القنوت فی صلاۃ الصبح۔ سند حسن ہے۔

[4]۔ بخاری ۲/۴۰۸ فی الوتر : باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، وفی الجنائز : باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن، وفی الجہاد : باب دعاء الامام علی من نکث عہداً، وفی المغازی : باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان، وفی الدعوات : باب الدعاء علی المشرکین، مسلم (۶۷۷) فی المساجد : باب استحباب القنوت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی ہر صلوٰۃ کے بعد پیہم ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی آخری رکعت میں جب" سمع اللہ لمن حمدہ" فرماتے تو بنو سلیم کے قبیلہ رعل، ذکوان اور عصیّہ پر بددعا کرتے، پیچھے مقتدی آمین کہتے۔ ابوداؤد نے بھی اس کی روایت کی ہے[1]

قنوت پر تفصیلی بحث

خاص کر مصائب میں قنوت پڑھنا اور مصائب کے گزر جانے پر ترک کر دینا آپ کا دستور تھا اسے صلوٰۃ فجر کے ساتھ ہی خصوصیت نہ تھی بلکہ حسب ذیل اسباب کے تحت بالعموم اسی صلوٰۃ میں پڑھتے تھے۔

۱۔ یہ صلوٰۃ زیادہ لمبی ہوتی ہے۔
۲۔ قیام لیل سے لگی ہوتی ہے۔
۳۔ وقت سحر سے قریب ہے۔
۴۔ اس میں قبولیت کی ایک گھڑی ہے۔
۵۔ اللہ کا اس وقت نزول ہوتا ہے۔
۶۔ یہ صلوٰۃ مشہودہ ہے اس میں اللہ اور فرشتے یا شب و روز کے فرشتے بفحوائے تاویلات مختلفہ "اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا" (الاسراء : ۷۸) حاضر ہوتے ہیں۔

ابن ابی فدیک کی عبداللہ بن سعید بن ابی سعید مقبری سے، ان کی اپنے والد سے، ان کی حضرت ابوہریرہ سے روایت کردہ یہ حدیث" صبح کی دو رکعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ اِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ، اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ۔

اے اللہ! جن کو تو نے ہدایت دی ہے ان میں مجھے ہدایت دے اور جن کو تو نے عافیت بخشی ہے ان میں مجھے عافیت بخش اور جن کی تو نے سرپرستی فرمائی ہے ان میں میری سرپرستی فرما اور جو شئی عطا کیا ہے اس میں میرے لیے برکت عطا کر اور مجھے بچا اس چیز کے شر سے جس کا تو نے فیصلہ کیا ہے، بے شک تو فیصلہ کرتا ہے تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جس کا تو والی ہو وہ ذلیل نہیں ہو سکتا، تبارک ہے تو ہمارے پروردگار اور بلند و بالا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی جمیع الصلاۃ اذا نزلت بالمسلمین نازلۃ۔ مسند احمد ۳/۱۶۷ و ۲۵۵ حدیث انس رضی اللہ عنہ۔

ھ۔ رقم (۶۷۸) فی المساجد : باب استحباب القنوت فی جمیع الصلاۃ اذا نزلت بالمسلمین نازلۃ۔ روایت یوں ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح اور مغرب میں دعائے قنوت پڑھتے تھے"۔ ابوداؤد (۱۴۴۴) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الصلوات، ترمذی (۴۰۱) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القنوت فی صلاۃ الفجر۔ نسائی ۲/۲۰۲ فی الافتتاح : باب القنوت فی صلاۃ المغرب، ترمذی نے اسے حدیث حسن صحیح کہا ہے۔

---

[1] ابوداؤد (۱۴۴۳) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الصلوات، مسند احمد ۱/۳۰۱، سند حسن ہے، حاکم نے مستدرک ۱/۲۲۵ میں اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔

اگر یہ حدیث صحیح یا حسن ہوتی تو اس سے استدلال بہت واضح تھا لیکن عبداللہ بن سعید لائق حجت نہیں ہیں، اگرچہ حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جسے انھوں نے احمد بن عبداللہ مزنی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے یوسف بن موسیٰ نے، وہ کہتے ہیں ہم سے احمد بن صالح نے، وہ کہتے ہیں ہم سے ابن ابی فدیک نے بیان کیا ہے۔ آگے حدیث بیان کی گئی ہے۔[1] البتہ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا ہے "اللہ کی قسم میں تمھارے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ سے زیادہ قریب رہا ہوں" چنانچہ وہ صبح کی آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد قنوت کرتے تھے، اس میں مسلمانوں کو دعا دیتے اور کافروں پر لعنت بھیجتے تھے[2]۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ضرور کیا تھا مگر پھر ترک فرما دیا تھا حضرت ابوہریرہ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اس طرح قنوت کرنا سنت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔ یہ اہل کوفہ کے جواب میں تھا جو مصائب وغیرہ پر صلوٰۃ فجر کے اندر قنوت کرنا مطلقاً مکروہ سمجھتے تھے[3] اور کہتے تھے کہ منسوخ ہے اسے کرنا بدعت ہے۔ اہل حدیث نے متوسط راہ اختیار کی ہے۔ جو لوگ اس کی منسوخی کے قائل ہیں اور جو مصائب وغیرہ پر قنوت کرنا مستحب سمجھتے ہیں ان دونوں کے مقابلہ میں انھوں نے اپنا موقف حدیث کے مطابق اختیار کیا ہے، چنانچہ جس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت کی ہے اسی موقع پر وہ بھی کرتے ہیں اور جہاں آپ نے ترک کر دی ہے وہاں وہ بھی ترک کر دیتے ہیں، فعل و ترک میں وہ آپ کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ کرنا بھی سنت ہے اور ترک کر دینا بھی سنت ہے۔ تاہم جو لوگ اسے مسلسل کرتے ہیں ان کے خلاف وہ دارو گیر بھی نہیں کرتے۔ اور اس کا کرنا مکروہ سمجھتے ہیں نہ بدعت اور نہ ہی کرنے والوں کو مخالف سنت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مصائب کے وقت جو لوگ قنوت کرنے کے قائل نہیں ہیں ان کے خلاف نکیر بھی نہیں کرتے اور نہ ترک کر دینے کو بدعت سمجھتے ہیں نہ تارک کو مخالف سنت، بلکہ ان کے خیال میں قنوت کرنے والے نے بھی اچھا کیا اور نہ کرنے والے نے بھی اچھا کیا، رکوع سے سیدھے ہو کر کھڑے ہونے کا جو رکن ہے وہ دعا وثناء کا مقام ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں باتیں اس رکن کے اندر جمع فرما دی ہیں، قنوت میں دعا وثنا دونوں ہیں لہٰذا یہ اس مقام کے لیے زیادہ انسب و اولیٰ ہے۔

کبھی کبھی امام مقتدیوں کو سکھانے کی خاطر اسے بالجہر پڑھے تو کوئی حرج نہیں۔ مقتدیوں کو تعلیم دینے کے لیے حضرت عمر نے دعاء افتتاح بالجہر پڑھی ہے۔ اور صلوٰۃ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی مسنونیت کی تعلیم دینے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس نے اسے بالجہر پڑھا ہے نیز اسی قبیل سے ہے امام کا آمین بالجہر کہنا، یہ ان جائز اختلافات میں سے ہے جسے اختیار کیا جائے یا ترک بہر حال لائق گرفت نہیں، اس کی مثال صلوٰۃ میں رفع یدین، عدم رفع یدین، مختلف اقسام تشہد، اذان و اقامت کے

---

[1] حافظ نے تقریب میں عبداللہ بن سعید بن ابو سعید مقبری کو متروک قرار دیا ہے۔

[2] متفق علیہ، حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[3] حدیث محل نظر ہے۔ علامہ حلبی نے جو حنفی ہیں شرح "الکبیر" (۴۲۰) میں لکھا ہے "اس کی یعنی مصائب میں قنوت کی مشروعیت دائمی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن صحابہ نے قنوت پڑھی ہے اسی موقع پر پڑھی ہے، یہی ہمارا یعنی حنفیہ کا مذہب ہے، جمہور کا بھی مسلک یہی ہے،" امام ابوجعفر طحاوی فرماتے ہیں "صلوٰۃ فجر میں مصیبت کے علاوہ اور موقعوں پر ہمارے یہاں قنوت نہیں پڑھی جاتی، کوئی فتنہ یا مصیبت ہو تو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے، حافظ ابن حجر "درایہ" (۱۱۷) میں فرماتے ہیں: احادیث سے مستنبط یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف مصائب میں قنوت پڑھتے تھے۔ صراحت سے یہی حقیقت ہے۔ ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ جب کسی قوم کے حق میں دعا یا بددعا کرنا ہوتا تو اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی صلوٰۃ میں قنوت پڑھتے تھے۔ ابن خزیمہ (۶۲۰) میں حضرت انس سے اسی طرح کی روایت موجود ہے۔ ہر ایک کی سند صحیح ہے۔

مختلف طریقوں اور افراد، قران اور تمتع کے مختلف عبادتی انواع و اقسام کی ہے۔ ہمارا مقصود یہاں آپ کے اس طریقہ کو ظاہر کردینا ہے جو آپ اختیار فرماتے تھے۔ کیونکہ آپ کی سنت ہی قبلۂ مقصود اور اس تالیف کا موضوع ہے اور آپ ہی کی سنت مدار تحقیق و طلب ہے، یہ ایک بات ہے، باقی جائز جس کا فعل و ترک منکر نہ ہو وہ اور بات ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ہمارا مقصد جائز و ناجائز کی بحث نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ دستور دکھا دینا ہے جو زندگی میں آپ کا تھا کیونکہ یہی دستور سنت و اسوہ میں انتہائی کامل اور افضل ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ فجر کے اندر نہ ہمیشہ دعائے قنوت نہ ہمیشہ بسم اللہ بالجہر پڑھنا آپ کا دستور تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ماسوا مکروہ ہے، بدعت ہے، بلکہ یہ ہے کہ آپ کا طریقہ اکمل و افضل تھا۔ واللہ المستعان۔

حدیث قنوت کے راوی "ابوجعفر رازی" کا ضعف

مسند اور ترمذی[1] وغیرہ میں ابوجعفر رازی کی یہ حدیث کہ " دنیا سے جدا ہونے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ فجر کے اندر برابر قنوت پڑھتے رہے ہیں" جسے انھوں نے ربیع بن انس سے اور انھوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے ضعیف ہے۔ احمد وغیرہ نے ابوجعفر کو ضعیف کہا ہے، ابن مدینی فرماتے ہیں کہ وہ باتیں گڈمڈ کردیتے تھے، ابوزرعہ کہتے ہیں کہ انھیں کثرت سے وہم ہوتا تھا، ابن حبان کا تبصرہ ہے کہ مشہور راویوں سے منکر احادیث روایت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

ہمارے شیخ ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ نے مجھ سے فرمایا: "یہی سند بعینہٖ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ" (الاعراف: ۱۷۲) کے باب میں آئی ہوئی حدیث کی بھی ہے۔ اسی سند سے ابی بن کعب کی لمبی حدیث بیان ہوئی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح بھی منجملہ ان ارواح کے تھی جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں عہد و میثاق لیا تھا چنانچہ مریم علیہا السلام جب اپنے خاندان سے نکل کر مشرقی مقام پر پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے اس روح کو انسان کی صورت میں بھیجا چنانچہ مریم علیہا السلام کے سامنے وہ پورے انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، راوی کہتا ہے کہ پھر جس نے انھیں مخاطب کیا وہ ان کے منہ کے راستہ داخل ہوا اور وہ حمل سے ہوگئیں[2]" یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ مریم کے پاس بھیجا جانے والا شخص فرشتہ تھا جس نے ان سے کہا "اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" (مریم: ۱۹) (میں تو تیرے رب کا رسول ہوں تاکہ تجھے پاکیزہ بچہ عطا کروں) انھیں اس انداز سے مخاطب کرنے والے عیسیٰ بن مریم نہ تھے۔ یہ بالکل محال ہے۔

مقصود یہ ہے کہ ابوجعفر رازی منکر احادیث کی روایت کیا کرتے تھے۔ جس روایت کو وہ منفرد بیان کرتے ہیں اسے کوئی بھی اہلحدیث لائق احتجاج تصور نہیں کرتا۔ اور اگر اسے صحیح تسلیم کرلیا جائے پھر بھی اس حدیث میں اس معین قنوت پر کوئی دلیل موجود نہیں کیونکہ قنوت وہی دعا ہے، حدیث میں اس کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قنوت ہے اور قنوت کا اطلاق قیام، خاموشی، دعا، تسبیح، خشوع اور عبادت میں ہمہ آن مشغولیت سبھی پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم: ۲۶)

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اسی کے بندے ہیں سب کے سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔

نیز ارشاد ہے:

---

[1] ترمذی نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ یہ مسند احمد ۳/۱۶۲، سنن کبریٰ بیہقی ۲/۲۰۱، دارقطنی ۲/۳۹ اور طحاوی ص ۱۴۳ میں آئی ہے سند میں ابوجعفر رازی، نام عیسیٰ بن ہامان جیسا کہ مؤلف نے ذکر کیا ہے، ضعیف ہیں۔

[2] مستدرک حاکم ۲/۳۲۳، ۳۲۴۔ سلسلۂ سند میں ابوجعفر رازی جیسا کہ گزر چکا ہے ضعیف ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۲/۱۱۴ میں اسی روایت کے پیش نظر لکھا ہے "انتہائی غریب اور منکر ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اسرائیلیات میں سے ہے۔ حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دے کر غلطی کی ہے۔

اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ؕ (الزمر : ۹)
کیا وہ شخص جو عبادت گزار ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید رکھتا ہے۔
وَصَدَّقَتۡ بِکَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ کُتُبِهٖ وَ کَانَتۡ مِنَ الۡقٰنِتِیۡنَ ۝ (التحریم : ۱۲)
اور اسی نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :
اَفۡضَلُ الصَّلٰوةِ طُوۡلُ الۡقُنُوۡتِ[1] سب سے افضل صلوٰۃ یہ ہے کہ دعا و تسبیح لمبی ہو۔
اور زید بن ارقم کا قول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ" (البقرۃ : ۲۳۸) (اللہ کے آگے اس طرح کھڑے رہو جیسے فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں) نازل ہوا تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور گفتگو کرنے سے روک دیا گیا۔[2]
حضرت انس نے اپنی روایت میں یہ ذکر نہیں کیا کہ رکوع کے بعد آپ ہمیشہ بہ آواز بلند دعائے قنوت " اللھم اھدنی فیمن ھدیت ۔۔۔ الخ " پڑھتے تھے اور پیچھے کے لوگ آمین کہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا قول " ربنا ولك الحمد ملء السماوات وملء الارض وملء ما شئت من شئ بعد، اھل الثناء والمجد، احق ما قال العبد ۔۔۔ الخ " قنوت ہے، اس رکن کو لمبا کرنا قنوت ہے، طویل قرأت کرنا قنوت ہے اور یہ معین دعا بھی قنوت ہے، پھر آخر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت انس نے قنوت کی جملہ اقسام کو چھوڑ کر صرف اسی ایک معین دعا ہی کو مراد لیا ہے ؟
اس موقعہ پر کہا جا سکتا ہے کہ تمام صلوات کے مقابلہ میں حضرت انس نے قنوت کو صلوٰۃ فجر کے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے یہی معین دعا مراد لی ہے کیونکہ قنوت کے جملہ اقسام فجر وغیرہ تمام صلوات میں مشترک ہیں، مگر حضرت انس نے ساری صلوات کے بالمقابل قنوت کو فجر کے ساتھ مخصوص رکھا، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کفار کے حق میں بد دعا اور کمزور مسلمانوں کے حق میں دعا ہے، کیونکہ حضرت انس نے یہ اطلاع دی ہے کہ آپ نے ایک ماہ تک قنوت پڑھی پھر ترک کردی۔ اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ جس دعا کی آپ مداومت فرماتے رہے ہیں وہ یہی معروف دعائے قنوت تھی۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، براء بن عازب، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، ابوموسیٰ اشعری اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم وغیرہ سب نے قنوت پڑھی ہے۔
مذکورہ امور کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بخاری کے مطابق حضرت انس نے فجر اور مغرب دونوں صلوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قنوت پڑھنے کی خبر دی ہے، اسے محض فجر کی صلوٰۃ کے ساتھ خصوصیت نہیں دی ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کی روایت کی ہے، پھر قنوت کو فجر ہی کے ساتھ کیا خصوصیت ہے ؟

اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کا قنوت منسوخ ہے تو اہل کوفہ کو دلیل ہاتھ آجائے گی، وہ کہیں گے کہ ایسے ہی فجر کا قنوت بھی منسوخ ہے۔

---

[1] حدیث کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے۔
[2] بخاری ۳/۵۹ فی العمل فی الصلاۃ : باب ماینھی من الکلام فی الصلاۃ و فی تفسیر سورۃ البقرۃ : باب وقوموا للہ قانتین، مسلم (۵۳۹) فی المساجد : باب تحریم الکلام فی الصلاۃ، ترمذی (۴۰۵) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی نسخ الکلام فی الصلاۃ وفی التفسیر (۲۹۸۹) باب ومن سورۃ البقرۃ : ابوداؤد (۹۴۹) فی الصلاۃ : باب النھی عن الکلام فی الصلاۃ، نسائی ۳/۱۸ فی السھو : باب الکلام فی الصلاۃ۔

قنوت مغرب کی منسوخی کی جو دلیل لائی جائے گی وہ قنوت فجر کی منسوخی کی دلیل بھی بنے گی، یہ ممکن نہیں کہ قنوت مغرب کی منسوخی اور قنوت فجر کے مستحکم اور مضبوط ہونے کا دعویٰ کیا جائے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کا قنوت قنوت نازلہ تھا دائمی قنوت نہ تھا تو اہل حدیثوں کو دلیل ہاتھ آجائے گی۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے بات اسی طرح ہے، قنوت فجر کی بھی یہی شان تھی۔ آخر دونوں میں فرق کیا ہے؟ دلیل میں وہ یہ بھی کہیں گے کہ حضرت انس نے خود قنوت فجر کے نازلہ ہونے کی خبر دی ہے، حالانکہ یہاں دائمی قنوت کا تمام تر انحصار انہی حضرت انس کی روایت پر تھا مگر ان کی اطلاع یہ ہے کہ قنوت فجر نازلہ تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے بعد میں اسے ترک کر دیا۔ صحیحین کے مطابق حضرت انس کا ارشاد ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک قبیلہ کے خلاف ایک ماہ تک قنوت پڑھی پھر ترک کر دی۔

۲۔ شبابہ نے قیس بن ربیع سے اور انھوں نے عاصم بن سلیمان سے روایت کی ہے، کہتے ہیں کہ "ہم نے انس بن مالک سے پوچھا کہ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صلوٰۃ فجر میں دعائے قنوت پڑھتے رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ جھوٹ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ماہ تک عرب کے ایک خاندان کو بد دعا دیتے ہوئے قنوت پڑھی ہے"۔
قیس بن ربیع کو گو یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے مگر اوروں نے ثقہ کہا ہے۔ یہ بہر حال ابو جعفر رازی سے کم مرتبہ کے نہیں ہیں، پھر ابو جعفر اپنے قول "لم یزل یقنت حتی فارق الدنیا" میں کیوں حجت قرار پائیں اور قیس قابل حجت نہ ہوں۔ جب کہ ان سے زیادہ ثقہ یا کم از کم ان کے مساوی ہیں۔ قیس کے بمقابلہ ابو جعفر کو ضعیف قرار دینے والے زیادہ ہیں اور قیس کو صرف یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے اور ضعف کا سبب بھی یہ بیان کیا ہے کہ وہ حدیث کی روایت عبیدہ سے کرتے ہیں حالانکہ ان کے نزدیک وہ منصور سے ہوتی ہے۔ ایسا شخص کسی راوی کی حدیث مسترد کر دینے کا موجب نہیں ہو سکتا کیونکہ منصور کے بجائے عبیدہ کا نام لے لینا غلط بیانی اور ایک طرح کا وہم ہے، یہ بات یحییٰ بن معین نے احمد بن سعید بن ابی مریم کے جواب میں کہی تھی جنھوں نے قیس بن ربیع کے متعلق ان سے سوال کیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ محدثین میں کون اس فروگذاشت سے بچ سکا ہے؟

۳۔ حضرت انس نے بتایا ہے کہ مسلمان پہلے قنوت نہیں پڑھتے تھے، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب رعل وذکوان قبائل کو بد دعا دیتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی۔ صحیحین میں عبد العزیز بن صہیب کی روایت سے حضرت انس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ضرورت سے ستر مردوں کو جنھیں قراء کہا جاتا تھا باہر بھیجا راستہ میں بئر معونہ نامی ایک کنویں کے پاس خاندان سلیم کے رعل وذکوان نامی دو قبائل آڑے آئے، قراء نے ان سے کہا: اللہ کی قسم ہم تم پر حملہ کرنے نہیں آئے ہیں، ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ضرورت سے نکلے ہیں، مگر ان قبائل نے انھیں قتل کر دیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر صبح کی صلوٰۃ میں ایک ماہ تک بد دعا کی۔ یہی قنوت کا نقطہ آغاز ہے، پہلے ہم قنوت نہیں پڑھتے تھے[1]

مذکورہ بالا بیان میں یہ دلیل موجود ہے کہ دائمی قنوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ و دستور نہ تھا۔ حضرت انس کا یہ قول "یہی قنوت کا نقطۂ آغاز ہے"، نیز "آپ نے ایک ماہ قنوت پڑھی پھر ترک کر دی" اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی مراد اس قنوت سے قنوت نازلہ ہے جسے آپ نے ٹھیک ایک ماہ پڑھی ہے، اسی طرح آپ نے صلوٰۃ عشاء میں بھی ایک ماہ تک قنوت پڑھی ہے۔ صحیحین کے مطابق یحییٰ ابن ابی کثیر نے ابو سلمہ سے اور انھوں نے ابو ہریرہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] بخاری ۲/۴۰۸ و ۷/۲۹۶، ۲۹۷ مسلم (۶۷۷) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

نے عشاء کی صلوٰۃ میں ایک ماہ قنوت پڑھی، اس میں آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔
اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدِ، اَللّٰھُمَّ اَنْجِ سَلَمَۃَ بْنَ ھِشَامٍ، اَللّٰھُمَّ اَنْجِ عَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَۃَ، اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ، اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا عَلَیْھِمْ سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ۔
اے اللہ ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کو نجات دے، اے اللہ اپنی گرفت مضر پر سخت کر دے، اے اللہ یہ گرفت حضرت یوسف کی طرح قحط سالیوں کی ان پر ہو
حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں "ایک دن آپ نے دعا نہیں فرمائی تو میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا" دیکھتے نہیں کہ وہ سب آچکے ہیں۔[1]

پس قنوت فجر بھی اسی طرح کسی عارضی معاملہ یا عارضی مصیبت کے پیش نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت انس نے اپنی حدیث میں اس کی مدت ایک ماہ متعین کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ ہی کی روایت ہے کہ مذکورہ مسلمانوں کے لیے آپ نے ایک ماہ تک فجر میں بھی دعائے قنوت پڑھی۔
دونوں حدیثیں صحیح ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس سے عکرمہ کی یہ روایت "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی صلوات میں مسلسل ایک ماہ قنوت پڑھی ہے" اوپر گزر چکی ہے، اس کی روایت ابوداؤد وغیرہ نے کی ہے اور وہ صحیح ہے۔[2]

معجم طبرانی میں محمد بن انس کی حدیث وارد ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مطرف بن طریف نے بیان کیا، انھوں نے ابوجہم سے، انھوں نے براء بن عازب سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض صلوٰۃ میں قنوت پڑھتے تھے[3] طبرانی کہتے ہیں کہ مطرف سے روایت صرف محمد بن انس نے کی ہے۔

اس سند سے کوئی دلیل گو قائم نہیں ہوتی مگر حدیث باعتبار معنی صحیح ہے۔ کیونکہ قنوت کے معنی دعا کے ہے، اور یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرض صلوٰۃ پڑھتے تھے اس میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے دعا فرماتے تھے۔ ابوجعفر رازی والی حدیث میں بشرطیکہ صحیح ہو حضرت انس کی بھی مراد یہی ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ دنیا سے جدا ہونے تک آپ ہمیشہ قنوت پڑھتے تھے۔ اس کی صحت ناقابل شک ہے، یقیناً آپ دنیا سے جدا ہونے تک صلوٰۃ فجر میں برابر دعا فرماتے رہے ہیں۔

۴۔ حضرت انس سے جتنی روایات ہیں وہ سب معنی کی وضاحت کرتی ہیں، بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں باہم متناقض نہیں ہیں۔ صحیحین میں عاصم احول کی روایت ہے کہتے ہیں کہ حضرت انس سے صلوٰۃ میں قنوت سے متعلق دریافت کیا گیا

---

[1] بخاری ۲/۴۱ فی الاستسقاء : باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم "اجعلھا علیھم سنین کسنی یوسف" و فی الجھاد : باب الدعاء علی المشرکین بالھزیمۃ والزلزلۃ، و فی الانبیاء : باب قول اللہ تعالیٰ "لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین" و فی تفسیر سورۃ آل عمران : باب لیس لک من الامر شیٔ، و فی تفسیر سورۃ النساء ۱۰ باب قول اللہ تعالیٰ "فعسی اللہ ان یعفو عنھم" و فی الادب : باب تسمیۃ الولید، و فی الدعوات : باب الدعاء علی المشرکین، و فی الاکراہ فی فاتحتہ، مسلم (۶۷۵) فی المساجد : باب استحباب القنوت فی جمیع الصلاۃ۔ نسائی ۲/۲۱ فی الافتتاح : باب القنوت فی صلاۃ الصبح۔ ابن ماجہ (۱۲۴۴) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی القنوت فی صلاۃ الفجر۔ ابوداؤد (۱۴۴۲) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الصلوات۔

[2] ابوداؤد (۱۴۴۳) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الصلوات۔ مسند احمد ۱/۳۰۱، سند حسن ہے۔ اس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔

[3] رجال ثقہ ہیں مگر محمد بن انس صدوق ہونے کے باوجود غریب روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔ مجمع الزوائد ۲/۱۳۸ میں ہیثمی نے اوسط طبرانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے رجال سب ثقہ ہیں۔

توفرمایا کہ دعائے قنوت رہی ہے۔ میں نے کہا رکوع سے پہلے یا بعد؟ فرمایا: پہلے، میں نے کہا کہ فلاں شخص نے آپ ہی کے حوالہ سے بعد کو بتایا ہے، فرمایا: جھوٹ کہتا ہے، میں نے تو یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد ایک ماہ قنوت پڑھی تھی[1]۔ ایک گروہ کے مطابق یہ حدیث معلول ہے، اسے بیان کرنے میں عاصم منفرد ہیں۔ حضرت انس سے جن لوگوں نے روایتیں کی ہیں وہ سب ان کے مخالف ہیں۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ عاصم بلاشبہ بے حد ثقہ ہیں مگر انھوں نے دونوں قنوت کے مقام پر حضرت انس کے اصحاب سے اختلاف کیا ہے۔ حافظ کو بھی کبھی وہم ہوتا ہے، گرتا ہے شہسوار ہی۔ اس حدیث کی تعلیل میں امام احمد کا قول اثرم کی روایت سے بیان کیا جاتا ہے۔ "میں نے ابوعبداللہ یعنی احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ حضرت انس کی حدیث "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی ہے" کیا عاصم احول کے علاوہ اور کسی نے بھی بیان کی ہے؟ فرمایا: میرے علم کی حد تک ان کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کی ہے" آگے فرمایا: عاصم نے ان سبھوں کی مخالفت کی ہے، ہشام نے قتادہ سے انھوں نے حضرت انس سے اور تیمی نے ابومجلز سے، انھوں نے حضرت انس سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے رکوع کے بعد قنوت پڑھی۔ ایوب نے محمد بن سیرین کا بیان نقل کیا ہے، کہتے ہیں کہ میں نے انس سے پوچھا اور حنظلہ سدوسی حضرت انس سے چار طرق سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن عاصم نے حضرت انس سے کہا کہ آپ نے یہ کہا ہے؟ تو فرمایا: وہ سب جھوٹے ہیں، آپ نے رکوع کے بعد ایک ماہ قنوت پڑھی ہے۔ امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ انس کی یہ روایت عاصم سے کس نے بیان کی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ ابومعاویہ وغیرہ نے، ابوعبداللہ سے کہا گیا کہ ساری حدیثیں رکوع کے بعد ہی کے حق میں ہیں؟ فرمایا: ہاں! سب خفاف ابن ایماء بن رحضہ اور ابوہریرہ سے مروی ہیں۔

میں نے ابوعبداللہ سے کہا: پھر آپ رکوع سے پہلے قنوت پڑھنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں؟ حدیث سے ثابت تو رکوع کے بعد ہے، فرمایا: صلوٰۃ فجر کے اندر قنوت بعد از رکوع ہے مگر وتر میں بعد از رکوع پسندیدہ ہے اور اگر رکوع سے پہلے کوئی پڑھ لے تو حرج نہیں کیونکہ صحابہ نے ایسا کیا ہے۔ اس میں ان کا اختلاف ہے مگر فجر کی صلوٰۃ کے اندر یہ بعد از رکوع ہی ہے۔

اس موقعہ پر یہ بات کہی جائے گی کہ تعجب ہے اس صحیح حدیث کو جس کی صحت پر سب کا اتفاق ہے اور جسے حافظ، ثقہ اور مسلم ائمہ نے روایت کیا ہے معلول قرار دیا جائے، اور ابوجعفر رازی، قیس بن ربیع، عمرو بن ایوب، عمرو بن عبید، دینار اور جابر جعفی جیسے حضرات کی حدیثوں کو لائق احتجاج تصور کیا جائے، سچ ہے کہ جس نے بھی کوئی مذہب اختیار کر لیا اور ہر بات میں اس کی حمایت شروع کر دی، کم ہی ایسا ہوا کہ وہ اس طرح کا موقف اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوا ہو۔

جواب میں وباللہ التوفیق ہم کہیں گے کہ حضرت انس کی تمام حدیثیں صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے درمیان کسی طرح کا کوئی تناقض نہیں ہے۔ جس قنوت کا انھوں نے قبل از رکوع تذکرہ کیا ہے وہ دراصل وہ قنوت نہیں ہے جس کا انھوں نے بعد از رکوع ذکر کیا ہے۔ جس قنوت کو انھوں نے مقید و مؤقت کہا ہے وہ اور ہے اور جس کو مطلق بیان کیا ہے وہ اور۔ قبل از رکوع جس قنوت کا انھوں نے ذکر کیا ہے اس سے مراد قرأت کے لیے طول قیام ہے۔ اسی قنوت کے باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "أَفْضَلُ الصَّلَاةِ طُولُ الْقُنُوتِ"[2] (سب سے افضل صلوٰۃ یہ ہے کہ قنوت لمبی

۱۔ متفق علیہ۔ اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔ حدیث میں "کذب" "اخطأ" کے معنی میں ہے۔ اہل حجاز کی زبان میں یہی مفہوم ہوتا ہے وہ کذب کا اطلاق "خطأ و عمد" سے عام معنی پر کرتے ہیں۔

۲۔ مسلم (۷۵۶) حدیث گزر چکی ہے۔

کی جائے) بعد از رکوع قنوت کا مفہوم دعا کے لیے طول قیام ہے۔ آپ نے ایک قوم کے حق میں بددعا اور ایک کے حق میں دعا کے طور پر ایک ماہ تک یہ قنوت پڑھی ہے۔ اس کے بعد دعا و ثناء کے اس رکن کو دنیا سے جدا ہونے تک ہمیشہ لمبا رکھتے تھے جیسا کہ صحیحین میں ثابت کی روایت سے حضرت انس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح صلوٰۃ پڑھاتے تھے اسی طرح میں بھی تمھیں ہمیشہ صلوٰۃ پڑھاتا رہا ہوں۔ ثابت فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ میں حضرت انس کے طور طریقے کچھ ایسے تھے کہ ویسا تمھارے یہاں میں نہیں دیکھ رہا ہوں، وہ رکوع سے سر اٹھاتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اتنی دیر کھڑے رہتے کہ بھول جانے کا گمان ہونے لگتا، سجدہ سے سر اٹھاتے تو اتنی دیر رکھتے کہ بھول جانے کا گمان ہونے لگتا[1] پس قنوت کا یہی مفہوم ہے جس پر آپ زندگی بھر قائم رہے۔

ظاہر ہے اس طرح کے طویل وقفہ میں آپ خاموش نہیں رہتے تھے بلکہ رب کی حمد و ثنا، تقدیس و تمجید اور ذکر و دعا فرماتے تھے، یہ ایک ماہ کے محدود قنوت کے علاوہ دوسرا قنوت ہے، کیونکہ محدود قنوت کے اندر آپ نے رعل، ذکوان، عصیہ اور بنی لحیان کے حق میں بددعا اور مکہ کے اندر موجود کمزور مسلمانوں کے لیے دعا کی ہے۔ جہاں تک صلوٰۃ فجر کے ساتھ اس کی خصوصیت کا تعلق ہے تو ایسا سائل کے سوال کے مطابق تھا، چنانچہ اس نے سوال قنوت فجر کے متعلق کیا تھا، جواب بھی ویسا ہی ملا۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ ساری صلوات کے بمقابلہ صلوٰۃ فجر آپ طویل پڑھتے تھے، اس میں ساٹھ سے سو آیات تک پڑھتے تھے۔ حضرت براء بن عازب کے مطابق آپ کا رکوع، رکوع سے اٹھ کر سیدھا ہونا، سجدہ اور قیام سب یکساں ہوا کرتا تھا۔ اور صلوٰۃ فجر میں رکوع کے بعد دیر تک قیام سے ایسی چیزوں کا پتہ لگتا ہے جن کا اظہار باقی دوسری صلوات میں نہیں ہوتا تھا اور یہ بات معلوم ہے کہ قیام بعد الرکوع میں آپ دعا و ثناء اور رب کی بڑائی بیان کرتے تھے جیسا کہ اس سلسلہ کی احادیث پہلے گزر چکی ہیں، لاریب آپ کا یہ قنوت تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک یہ بات ناقابل شک ہے کہ دنیا سے جدا ہونے تک آپ صلوٰۃ فجر کے اندر ہمیشہ قنوت کرتے تھے۔

صحابہ کا قنوت

فقہاء اور اکثر حضرات کی زبان میں چونکہ قنوت اسی معروف دعاء "اللّٰھم اھدنی فیمن ھدیت ... الخ" کا نام ہے۔ اور انھوں نے سن لیا کہ دنیا سے جدا ہونے تک آپ مسلسل صلوٰۃ فجر میں قنوت پڑھتے تھے، خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی طریقہ رہا ہے تو جھٹ انھوں نے صحابہ کے لغوی قنوت کو اپنے اصطلاحی قنوت پر محمول کیا۔ بعد میں وہ لوگ آئے جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے پس انھیں یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ہر صبح کو دائمی طور پر قنوت پڑھتے تھے۔ جمہور علماء نے اسی جگہ پر ان سے اختلاف کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا یہ دائمی فعل نہ تھا، بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کہ کبھی آپ کا یہ فعل بھی رہا ہے۔

اس قنوت کے باب میں حتی روایت مسند اور چاروں سنن کے مطابق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی کو اس کی دعا سکھائی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی دعائے قنوت مجھے حسب ذیل الفاظ میں سکھائی۔

---

[1] بخاری ۲۴۹/۲، مسلم (۴۷۲) مسند احمد ۲۲۶/۳۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ وَقِنِیْ شَرَّ مَا قَضَیْتَ، فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ اِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ [1]

اے اللہ! جنھیں تو نے ہدایت دی ہے انھیں میں مجھے ہدایت دے اور جنھیں عافیت دی ہے انھیں میں مجھے بھی عافیت دے اور جن کی سرپرستی فرمائی ہے انھیں میں میری بھی سرپرستی فرما، جو عطا کر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما، اپنے فیصلہ کے شر سے مجھے بچا، تو فیصلہ کرتا ہے تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جس کا تو والی ہے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا، مبارک ہے تیری ذات ہمارے پروردگار اور تو بلند و بالا ہے۔

ترمذی کے مطابق یہ حدیث حسن ہے، اس سے بہتر قنوت کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔ بیہقی نے "وَلَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ" کے بعد "وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ" [2] (اور جس کا تو دشمن ہے وہ باعزت نہیں ہو سکتا) کا اضافہ بھی کیا ہے۔

بعد از رکوع قنوت سے حضرت انس کی مراد دعا و ثنا کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ اس کی دلیل سلیمان بن حرب کی روایت بھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوہلال نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مسجد قتادہ کے امام حنظلہ (سدوسی) نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ فجر کے اندر بسلسلۂ قنوت مجھ میں اور قتادہ میں اختلاف ہو گیا، قتادہ کہتے تھے کہ قبل از رکوع ہے اور میں کہتا تھا بعد از رکوع ہے، چنانچہ ہم دونوں حضرت انس کے یہاں گئے اور اپنے اختلاف کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا "صلوٰۃ فجر میں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو دیکھا کہ آپ نے تکبیر فرمائی، پھر رکوع کیا، پھر سر اٹھایا، پھر سجدہ کیا پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے، پھر تکبیر کہی، رکوع کیا، پھر سر اٹھایا اور ایک گھنٹہ کھڑے رہے، پھر سجدہ میں گئے" [3] یہ حدیث آپ سے ثابت شدہ صحیح حدیث کی مانند ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قنوت سے حضرت انس کی کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس کے اندر آپ نے بعد از رکوع کی دلیل دی ہے۔ حضرت انس کی مراد اس سے قیام اور طول قیام ہی ہے، لہٰذا آپ کی تمام احادیث باہم متفق ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

صحابہ سے مروی قنوت دو طرح کے ہیں۔

ایک مصائب کے وقت، جیسے وہ قنوت جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ اور اہل کتاب سے جنگ کے موقعہ پر پڑھی تھی، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قنوت اور معاویہ اور اہل شام سے جنگ کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا

---

[1] ترمذی (۴۶۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القنوت فی الوتر۔ ابوداؤد (۱۴۲۵) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الوتر، ابن ماجہ (۱۱۷۸) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی القنوت فی الوتر، نسائی ۳/۲۴۸ فی قیام اللیل : باب الدعاء فی الوتر۔ مسند احمد ۱/۱۹۹، ۲۰۰، دارمی ۱/۳۷۳۔ طیالسی ۱/۱۰۱، برید بن ابی مریم کی سند سے، انھوں نے ابوحوراء السعدی سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں حسن بن علی نے فرمایا "مجھے وتر میں پڑھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات سکھائے ... سند صحیح ہے۔ حاکم ۳/۱۷۲ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ یہ صرف ہمیں ابوحوراء السعدی کی سند سے معلوم ہو سکی ہے، ابوحوراء کا نام ربیعہ بن شیبان ہے۔ وتر میں قنوت کی اس سے اچھی دعا ہمیں معلوم نہیں۔ قنوت وتر میں اہل علم کا اختلاف ہے، عبداللہ بن مسعود کے نزدیک تمام سال وتر میں قنوت پڑھی جائے گی۔ قبل از رکوع پڑھنے کے قائل ہیں۔ یہی قول بعض اہل علم کا ہے، سفیان ثوری، ابن مبارک، اسحاق اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

[2] سنن کبریٰ بیہقی ۲/۲۰۹، فی الصلاۃ : باب دعاء القنوت۔ یہ ایک عمدہ اضافہ ہے۔

[3] سند ضعیف ہے کیونکہ ابوہلال راسبی ضعیف ہیں، ان کا نام محمد بن سلیم بصری راسبی ہے، یہ لین الحدیث ہیں۔ حنظلہ سدوسی کو احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حضرت انس سے منکر حدیثیں بیان کرتے ہیں، ابن معین اور نسائی نے بھی انھیں ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ قوی نہیں ہیں۔ کتاب "الضعفاء" میں ابن حبان نے کہا ہے کہ وہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے یہاں تک کہ انھیں اپنی بیان کردہ چیزوں کا علم نہیں رہ جاتا تھا۔ ان کے اس اختلاط کے سبب جدید و قدیم حدیثیں بھی مختلط ہو گئیں۔ یحییٰ قطان نے انھیں ترک کر دیا ہے۔

قنوت بھی ہے۔

دوسری قنوت مطلق ہے۔ جن لوگوں نے صحابہ سے اس کی روایت کی ہے ان کی مراد یہ ہے کہ دعا و ثنا کے لیے قیام بعد الرکوع کو طول دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

سجدۂ سہو کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ سے ثابت ہے کہ "میں تمھارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، تمھاری طرح بھول بھی سکتا ہوں، لہٰذا بھولوں تو یاد دلایا کرو"۔[1]

صلوٰۃ میں آپ کا بھولنا بھی امت پر اللہ تعالیٰ کے اتمام نعمت اور تکمیل دین کا ایک ذریعہ ہے تاکہ امت بھولے تو قانون الٰہی کے مطابق آپ کی اقتداء کا سبق سیکھے۔ اس حدیث منقطع کا یہی مفہوم ہے جو مؤطا میں آئی ہے کہ "میں بھولتا ہوں یا مجھ پر بھول جانے کی کیفیت طاری کردی جاتی ہے تو محض اس لیے کہ کوئی قانون سامنے آئے"۔[2]

آپ بھولتے تھے۔ چنانچہ آپ کے سہو پر ایسے شرعی احکام وجود میں آگئے جو قیامت تک امت کے لیے مشعل راہ ہیں۔

چنانچہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چہار رکعتی صلوٰۃ کے اندر دو پر بیٹھنے کے بجائے اٹھ گئے، صلوٰۃ پوری ہوگئی تو سلام سے پہلے دو سجدے فرمائے، پھر سلام پھیرا۔ اس عمل سے ایک ضابطہ وجود میں آیا وہ یہ کہ سہواً صلوٰۃ کا کوئی ایسا جز چھوٹ جائے جو غیر رکن ہو تو سلام سے پہلے سجدہ کیا جائے گا۔ اس حدیث کی بعض سندوں سے یہ ضابطہ بھی اخذ کیا گیا کہ جب صلوٰۃ کا کوئی غیر رکن سہواً چھوٹ جائے اور مصلی رکن میں داخل ہو جائے تو پھر چھوٹے ہوئے جز کی جانب رجوع نہ کیا جائے گا، کیونکہ آپ کھڑے ہوگئے تو لوگوں نے پیچھے سے سبحان اللہ کہا مگر آپ نے انھیں کھڑے ہونے کا اشارہ فرمایا۔

---

[1] - بخاری ۱/۴۲۲ فی الصلاۃ : باب التوجه نحو القبلة حیث کان، وباب ماجاء فی القبلة ومن لایری الاعادة علی من سها فصلی الی غیر القبلة، وفی السهو : باب اذا صلی خمسًا۔ وفی الایمان والنذور : باب اذا حنث ناسیًا فی الاعادة، وفی خبر الواحد فی فاتحته۔ مسلم (۵۷۲) فی المساجد : باب السهو فی الصلاة والسجود له۔ ترمذی (۳۹۲) فی الصلاة : باب ماجاء فی سجدتی السهو۔ ابوداؤد (۱۰۲۰) فی الصلاة : باب اذا صلی خمسًا۔ نسائی ۳/۲۹ فی السهو : باب التحری۔ ابن ماجہ (۱۲۱۱) فی الاقامة : باب ماجاء فیمن شك فی صلاته فتحری الصواب۔ تمام ائمہ نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ پڑھی (ابراہیم کہتے ہیں صلوٰۃ میں آپ سے کچھ کمی یا زیادتی ہوئی) سلام پھیرا تو کہا گیا، رسول اللہ! کیا صلوٰۃ میں کوئی نئی چیز پیدا ہوگئی ہے؟ فرمایا وہ کیا؟ لوگوں نے کہا کہ آپ نے ایسے ایسے صلوٰۃ پڑھی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ نے پیر موڑے اور قبلہ رخ ہو کر دو سجدے فرمائے، پھر سلام پھیرا اور ہماری جانب توجہ فرماتے ہوئے کہا "اگر صلوٰۃ میں کوئی نئی بات پیدا ہوئی ہوتی تو میں تمھیں پہلے بتا دیتا، حقیقت یہ ہے کہ میں انسان ہوں، تمھاری طرح بھولتا بھی ہوں، لہٰذا بھولوں تو یاد دلایا کرو"۔ صلوٰۃ میں جب کسی کو شک ہو جائے تو صحیح کیا ہے اس کا اندازہ کرے اس کے مطابق صلوٰۃ پوری کرے پھر سجدہ کرے۔ ترمذی کے الفاظ یوں ہیں: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی صلوٰۃ پانچ رکعتیں پڑھیں، تو آپ سے کہا گیا کہ کیا صلوٰۃ میں اضافہ ہوگیا ہے؟ چنانچہ سلام کے بعد دو سجدے کیے"۔

[2] - مؤطا امام مالک ۱/۱۰۰ فی السهو : باب العمل فی السهو، سند منقطع ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں "اس سند کے علاوہ اور کسی سند سے اس حدیث کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مسند نہ مقطوع کسی طور پر مجھے نہیں معلوم، یہ مؤطا کی ان چار حدیثوں میں سے ایک ہے جو اس کے علاوہ کہیں بھی نہ مسند اور نہ مرسل طور پر ملتی ہیں۔

سجدۂ سہو کیسے کیا جائے گا؟ اس باب میں آپ سے مختلف روایات ہیں۔ چنانچہ صحیحین میں عبداللہ بن بحینہ کی روایت ہے کہ آپ صلوٰۃ ظہر میں دو رکعتوں پر بیٹھنے کے بجائے اٹھ گئے جب صلوٰۃ پوری فرمالی تو دو سجدے کیے اور اس کے بعد سلام پھیرا۔

ایک متفق علیہ روایت کے مطابق سلام سے پہلے ہر سجدہ میں بیٹھے ہوئے آپ اللہ اکبر کہتے۔[1] سند میں یزید بن ہارون کی حدیث ہے جسے انھوں نے مسعودی سے اور انھوں نے زیاد بن علاقہ سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ نے ہمیں صلوٰۃ پڑھائی، دو رکعتیں پڑھ چکے تو بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو گئے، پیچھے سے سبحان اللہ کہا گیا مگر انھوں نے قیام کا اشارہ کیا، جب صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو سلام پھیرا اور دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا، اس کے بعد فرمایا "ایسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمارے ساتھ کیا تھا"[2]، ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

بیہقی نے عبدالرحمٰن بن شمامہ مہری کی حدیث بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ عقبہ بن عامر جہنی نے ہمیں صلوٰۃ پڑھائی، مگر بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو گئے، لوگوں نے سبحان اللہ سبحان اللہ کہا مگر بیٹھے نہیں، کھڑے رہے، صلوٰۃ کے آخر میں بیٹھے بیٹھے دو سجدۂ سہو کئے اور سلام پھیر کر فرمایا "بیٹھنے کے لیے ابھی ابھی میں نے تھیں سبحان اللہ کہتے سنا ہے، مگر سنت وہی ہے جو میں نے کیا۔"[3]

عبداللہ بن بحینہ کی حدیث[4] تین وجہوں سے انسب واولیٰ ہے۔

۱۔ یہ مغیرہ کی حدیث سے صحیح تر ہے۔

۲۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی اور واضح بھی ہے۔ کیونکہ حضرت مغیرہ کا یہ قول کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا تھا"، صلوٰۃ میں ان کے تمام طور طریقوں کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو کبھی قبل از سلام اور کبھی بعد از سلام کیا ہو۔ چنانچہ ابن بحینہ اور ابن مغیرہ نے اپنے اپنے مشاہد بیان کیے۔ اس طرح دونوں باتیں جائز ہو سکتی ہیں۔ حضرت مغیرہ کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کھڑے ہو گئے، واپس نہیں لوٹے، اس کے بعد سجدۂ سہو فرمایا۔

۳۔ ہو سکتا ہے سلام سے پہلے سجدہ کرنا مغیرہ بھول گئے ہوں اور بعد کو کیا ہو۔ یہ بات سہو کی صورت میں کہی جا سکتی ہے، مگر سجدہ قبل از سلام کی صورت میں نہیں کہی جا سکتی۔ واللہ اعلم۔

---

[1] بخاری ۳/۷۴ فی السھو: باب اذا قام من رکعتی الفریضۃ وباب من یکبر فی سجدتی السھو۔ وفی صفۃ الصلاۃ: باب لم یر التشھد الاول واجبًا وباب التشھد فی الاول، وفی الایمان والنذور: باب اذا حنث ناسیًا فی الایمان۔ مسلم (۵۷۰) فی المساجد: باب السھو فی الصلاۃ، ترمذی (۳۹۱) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی سجدتی السھو قبل التسلیم۔ ابوداؤد (۱۰۳۴) فی الصلاۃ: باب من قام من ثنتین ولم یتشھد۔ نسائی ۳/۱۹ فی السھو: باب مایفعل من قام من اثنتین ولم یتشھد۔ ابن ماجہ (۱۲۰۶) و (۱۲۰۷) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فی من قام من اثنتین ساھیًا۔

[2] مسند احمد ۴/۲۴۷۔ ابوداؤد (۱۰۳۷) فی الصلاۃ: باب من نسی ان یتشھد۔ ترمذی (۳۶۵) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی الامام ینھض۔ مسعودی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ہیں، صادق ہیں مگر موت سے پہلے مختلط ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ ترمذی (۳۶۴) میں ایک اور سند سے ان کے موافق روایت آئی ہے جو عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے مروی ہے، انھوں نے شعبی سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کے بقول ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] سنن کبریٰ بیہقی ۲/۳۴۴ فی الصلاۃ: باب من سھا فلم یذکر حتی استتم قائمًا لم یجلس وسجد للسھو۔ سند صحیح ہے۔

[4] بحینہ عبداللہ کی ماں، باپ کا نام مالک بن قشب ازدی، قبیلہ ازدشنوءہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ مالک بن قشب مطلب بن عبد مناف کے حلیف تھے اور بحینہ بنت حارث بن عبدالمطلب سے شادی کی، عبداللہ انہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت سہو کے تمام مواقع اور ائمہ کا اس میں اختلاف

ایک دفعہ ظہر یا عصر کی صلوٰۃ میں دو ہی رکعت پر سلام پھیر دیا، پھر گفتگو کی اس کے بعد صلوٰۃ پوری کی پھر سلام و کلام کے بعد دو سجدہ کیا۔ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے تھے[1]

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ پڑھائی، دو سجدے کیے پھر تشہد پڑھا، پھر سلام پھیرا[2] ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے۔

ایک بار آپ نے صلوٰۃ پڑھی، سلام پھیر کر واپس ہوئے، ایک رکعت رہ گئی تھی مگر حضرت طلحہ بن عبداللہ نے لپک کر آپ سے کہا کہ آپ ایک رکعت بھول گئے ہیں، چنانچہ واپس مسجد آئے حضرت بلال کو اقامت کا حکم دیا اور لوگوں کو ایک رکعت اور صلوٰۃ پڑھائی۔ اس کا تذکرہ امام احمد نے کیا ہے[3]

ایک بار ظہر کی صلوٰۃ آپ نے پانچ رکعت پڑھ لی، کہا گیا کیا صلوٰۃ میں اضافہ ہوا ہے؟ فرمایا وہ کیا؟ تو لوگوں نے کہا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں پھر آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کیے۔ متفق علیہ ہے[4]

---

[1] بخاری ۱/۴۶۹ فی المساجد : باب تشبیک الاصابع فی المسجد وغیرہ۔ مسلم (۵۷۳) فی المساجد : باب السہو فی الصلاۃ۔ حدیث ابوہریرہ، فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی کوئی صلوٰۃ ظہر یا عصر پڑھائی، دو ہی رکعت پر سلام پھیر کر قبلہ مسجد میں نصب کردہ ایک کھمبے کے پاس گئے اور وہاں غصہ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ موقعہ پر حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، مگر دونوں نے ڈر سے گفتگو نہ کی، جلد باز لوگ تیزی سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ صلوٰۃ مختصر کر دی گئی۔ مگر ذوالیدین نے بڑھ کر آپ سے پوچھا، رسول اللہ! صلوٰۃ کم کر دی گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے بائیں دیکھا اور فرمایا" ذوالیدین کیا کہہ رہے ہیں؟" لوگوں نے کہا کہ صحیح کہہ رہے ہیں، آپ نے صرف دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ چنانچہ آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں، سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کیا پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں گئے پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھایا۔

[2] ترمذی (۳۹۵) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی التشہد فی سجدتی السہو۔ ابوداؤد (۱۰۳۹) فی الصلاۃ : باب سجدتی السہو فیہما تشہد وتسلیم۔ نسائی ۳/۲۶ فی السہو : باب ذکر الاختلاف علی ابی ہریرۃ فی السجدتین۔ ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے، حافظ نے الفتح میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ جو لفظ بھی اس کا ہے حسن غریب ہے۔ حاکم نے اسے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ بیہقی، ابن عبدالبر وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے اور اشعث کی روایت کو اس لیے وہم قرار دیا ہے کہ ابن سیرین سے دیگر حفاظ حدیث نے اس کے مخالف روایتیں کی ہیں، کیونکہ ابن سیرین سے عمران کی حدیث میں جو ثابت ہے اس میں تشہد کا ذکر نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں سراج نے سلمہ کی سند سے علقمہ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن سیرین سے پوچھا "اور تشہد؟" تو فرمایا "تشہد کے سلسلہ میں میں نے کچھ نہ سنا۔ عمران کی حدیث میں اسی سند کے ذریعہ خالد حذاء سے جو ثابت ہے اس میں بھی تشہد کا ذکر نہیں ہے۔ جیسا کہ مسلم نے اس کی تخریج کی ہے۔ چنانچہ اشعث کا اضافہ شاذ کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی لیے ابن منذر نے فرمایا ہے کہ سجدۂ سہو میں تشہد کا ثبوت میں نہیں سمجھتا۔ مگر سجدۂ سہو میں تشہد کا ذکر ابوداؤد اور نسائی میں عبداللہ بن مسعود اور بیہقی میں مغیرہ کی روایتوں سے آتا ہے، دونوں کی سندوں میں ضعف ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تشہد کے باب میں تینوں احادیث کے اجتماع سے حسن کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، علائی کہتے ہیں کہ ایسا بعید از امکان نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کے اسی قول سے یہ بھی ثابت ہے جس کی تخریج ابن ابی شیبہ نے کی ہے۔

[3] مسند احمد ۶/۴۰۱۔ ابوداؤد (۱۰۲۳) فی الصلاۃ : باب اذا صلی خمسا۔ حدیث معاویہ بن حُدیج۔ سند صحیح ہے۔

[4] بخاری ۳/۷۵، ۷۶ فی السہو : باب اذا صلی خمسا۔ مسلم (۵۷۲) (۹۱) فی المساجد : باب السہو فی الصلاۃ۔ حدیث عبداللہ بن مسعود۔

ایک دفعہ عصر کی صلوٰۃ آپ نے تین رکعتیں پڑھیں، پھر گھر میں داخل ہوئے، لوگوں نے یاد دلایا تو باہر آکر ایک اور رکعت پڑھائی، پھر سلام پھیر کر دو سجدے کیے اس کے بعد پھر سلام پھیرا[1]

صلوٰۃ میں سہو سے متعلق یہی پانچ واقعات آپ سے ثابت ہیں۔ بعض میں قبل از سلام اور بعض میں بعد از سلام ہے مگر امام شافعی فرماتے ہیں کہ کل سجدے قبل از سلام ہوتے۔ ابوحنیفہ فرماتے ہیں کل بعد از سلام ہوتے۔ مالک فرماتے ہیں "آپ کی جس صلوٰۃ میں کمی ہوئی اس میں سجدہ قبل از سلام اور جس میں زیادتی ہوئی اس میں بعد از سلام ہوا ہے۔ اور اگر سہو سے کمی اور زیادتی دونوں ہو جائے تو سجدہ قبل از سلام ہوگا"۔

ابوعمر بن عبدالبر فرماتے ہیں "بلا اختلاف امام مالک کا یہی مذہب ہے، ان کے نزدیک اگر کسی نے اس کے برعکس سجدۂ سہو کر دیا ہو یعنی تمام سجدے بعد از سلام یا قبل از سلام تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس کا انحصار قاضی کے اجتہاد پر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مرفوع احادیث اور سلف امت کے اقوال مختلف ہیں"۔ اور اثرم نے امام احمد بن حنبل کے بارے میں فرمایا کہ "احمد بن حنبل سے سوال ہوا کہ سجدۂ سہو قبل از سلام ہے یا بعد از سلام؟" تو فرمایا "بعض مقامات پر قبل از سلام ہے اور بعض پر بعد از سلام، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے مطابق ذوالیدین والا واقعہ ہے، ایک دفعہ آپ نے دو رکعتوں ہی کے بعد سلام پھیر دیا تو سجدہ بعد از سلام کیا۔ اور جو شخص صرف تین رکعت پر سلام پھیر دے تو بھی سلام کے بعد سجدۂ سہو کرے، جیسا کہ عمران بن حصین کی حدیث میں ہے[2] نیز ظن غالب کے موقع پر محض سجدۂ سہو بعد از سلام کرے جیسا کہ ابن مسعود کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور ابن بحینہ کی حدیث کے مطابق اگر دو رکعتوں پر بجائے بیٹھنے کے کھڑا ہو جائے تو قبل از سلام کرے۔ شک کے موقع پر حضرت ابوسعید خدری[3]، عبدالرحمن بن عوف[4] کی حدیثوں کے مطابق یقینی پہلو پر بنا کر کے سجدہ قبل از سلام کرے۔

اثرم کہتے ہیں: میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ ان مقامات کے علاوہ کیا کرنا ہوگا؟ فرمایا "سب میں قبل از سلام سجدہ کریں گے کیونکہ صلوٰۃ میں جو نقص رہ جاتا ہے اس سے وہ پورا ہو جاتا ہے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں موجود نہ ہوتیں تو میں ہر جگہ سجدۂ سہو قبل از سلام کا قائل ہوتا۔ کیونکہ یہ صلوٰۃ کے اندر داخل ہے۔ لہٰذا اسے قبل از سلام ہونا چاہیے مگر میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاں روایتیں سجدہ بعد از سلام کی ہوں وہاں بعد از سلام سجدۂ سہو باقی اس کے علاوہ ہر جگہ قبل از سلام ہونا چاہیے۔

داؤد بن علی فرماتے ہیں کہ سجدۂ سہو صرف انہی پانچ مقامات پر ہے جہاں آپ سے کرنا ثابت ہے، شک کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ آپ کو پیش نہیں آیا۔ آپ نے اس موقع پر شک کو چھوڑ کر یقینی پہلو پر بنا کر کے سجدہ قبل از سلام کا حکم دیا ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ شک کے موقع پر دو صورتیں اختیار کی جائیں گی، ایک یقین دوسرے تحری۔ یقین کی صورت میں ابوسعید خدری کی حدیث کے مطابق شک کا ازالہ کر لینے کے بعد قبل از سلام دو سجدے کیے جائیں گے، اور تحری

---

[1] مسلم (۵۷۴) حدیث عمران بن حصین۔
[2] مسلم (۵۷۴)۔ ابوداؤد (۱۰۱۸)۔ نسائی ۳/۲۶ فی السھو۔ ابن ماجہ (۱۲۷۵)۔
[3] مسلم (۵۷۱)۔ ترمذی (۳۹۶)۔ ابوداؤد (۱۰۲۴)۔ نسائی ۳/۲۷۔ ابن ماجہ (۱۲۱۰)
[4] احمد ۱/۹۰۔ ترمذی (۳۹۸)۔ ابن ماجہ (۱۲۰۹)۔ بیہقی ۲/۳۳۲۔ طحاوی ۱/۴۳۲ و ۴۳۳۔ رجال ثقہ ہیں۔ حاکم ۱/۳۲۴، نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔

(ظن غالب) کی صورت میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث کے مطابق جس کے راوی منصور ہیں سجدۂ سہو بعد از سلام کریں گے۔

حضرت ابوسعید خدری کی حدیث حسب ذیل ہے۔

إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَدْرِ كَمْ صَلَّى أَثَلَاثًا أَمْ أَرْبَعًا فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ وَلْيَبْنِ عَلَى مَا اسْتَيْقَنَ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ۔

صلوٰۃ میں کسی کو شک ہو جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ کتنی صلوٰۃ پڑھی ہے، تین رکعتیں یا چار، تو شک کو چھوڑ دے اور یقین پر بنا کرے اور سلام پھیرنے سے قبل دو سجدے کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث حسب ذیل ہے۔

إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ۔

جب کسی کو صلوٰۃ میں شک ہو جائے تو صحیح کا پتہ لگائے پھر دو سجدے کرے۔

دونوں حدیثیں متفق علیہ ہیں۔ صحیحین کے الفاظ یہ ہیں:

ثم یسلم ثم یسجد سجدتین۔ پھر سلام کرے پھر دو سجدے کرے۔

صحیحین کے اسی جزء کے مطابق امام احمد کا قول ہے کہ ظن غالب کی طرف جب رجوع کرے تو سجدہ بعد از سلام کرے۔

تحری اور یقین کے درمیان ان کے نزدیک فرق یہ ہے کہ مصلی جب امام ہو تو ظن غالب یا اکثر خیال (تحری) پر بنا کرے یہی تحری ہے۔ اور ابن مسعود کی حدیث کے مطابق سجدہ بعد از سلام کرے، منفرد ہو تو یقین پر بنا کرے کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث کے مطابق قبل از سلام کرے۔ امام احمد کے ظاہر مذہب کے مطابق ان کے اکثر اصحاب کا یہی طریقہ رہا ہے۔ مگر ان سے دو روایتیں اور ہیں۔ ایک یہ کہ مصلی مطلق یقین پر بنا کرے گا، یہی امام شافعی اور مالک کا بھی مذہب ہے۔ دوسری یہ ہے کہ مطلقاً ظن غالب پر بنا کرے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام احمد کے ظاہری نصوص سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ شک اور ظن غالب میں فرق کرتے ہیں۔ شک کی صورت میں یقین اور ظن غالب کی صورت میں تحری پر بنا کرے گا۔ اور اسی پر ان کے جوابات کا مدار بھی ہے اور انہی دونوں حالتوں پر دونوں حدیثیں محمول بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابوحنیفہ شک کے باب میں فرماتے ہیں کہ اگر پہلی دفعہ پیش آجائے تو صلوٰۃ پھر سے پڑھیں گے، اور بہت زیادہ پیش آگیا ہو تو ظن غالب پر اور عدم ظن کی صورت میں یقین پر بنا کریں گے۔

صلوٰۃ میں آنکھیں بند کر لینے کی کراہیت

صلوٰۃ کی حالت میں آنکھیں بند کر لینا آپ کا طریقہ نہ تھا۔ قبل ازیں گزر چکا ہے کہ تشہد میں دعا پڑھتے وقت انگلی کی جانب آنکھ سے اشارہ کرتے تھے مگر اشارہ سے آگے نگاہ نہیں جاتی تھی[1]

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک منقش پردہ تھا

---

[1] مسند احمد ۴/۳، نسائی ۳/۲۹، ابوداؤد (۹۹۰) حدیث عبداللہ بن زبیر بسند حسن ہے۔

جس سے انھوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ ڈھانک رکھا تھا، اسے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنے اس پردہ کو ہٹا دو، اس پر جو تصویریں بنی ہیں میری صلوٰۃ میں حارج ہوتی ہیں"[1]، صلوٰۃ کی حالت میں آپ آنکھیں بند رکھتے تو ان تصویروں کے حارج ہونے کا کیا سوال تھا؟ مگر اس حدیث سے استدلال محل نظر ہے، کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حارج کون سی چیز تھی؟ آیا ان تصویروں کا دیکھنے کے بعد پردۂ ذہن پر آنا یا بچشم سر انہیں دیکھنا۔ یہاں دونوں کا احتمال ہے۔ اس سے زیادہ واضح دلالت حضرت عائشہ کی یہ حدیث کر رہی ہے جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منقش کمبل پر صلوٰۃ پڑھی، نگاہ نقش و نگار پر بھی پڑی، صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو فرمایا "میرا یہ کمبل لے جا کر ابو جہم کو دے آؤ اور ان سے انبجانی کمبل لے آؤ کہ اس نے ابھی مجھے صلوٰۃ سے غافل کر دیا تھا"[2] مگر یہ استدلال بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں بس اسی حد تک ہے کہ کمبل کی جانب ایک نگاہ پڑی جس نے آپ کو غافل کر دیا۔ شہسواروں کا دستہ بھیج کر آپ نے گھاٹی کی جانب مڑ کر جو نگاہ ڈالی تھی وہ حدیث بھی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ یہ نظر و التفات فوجی مصلحت سے ضرورت کی بنا پر تھی۔ حسب ذیل واقعات البتہ دلیل بن سکتے ہیں:

۱۔ صلوٰۃ کسوف میں جنت دیکھ کر انگور کا گچھا توڑنے کے لیے ہاتھ لپکائے۔
۲۔ صلوٰۃ میں جہنم اور اس کے اندر بلی اور صاحب محجن[3] کا مشاہدہ کیا۔
۳۔ حالت صلوٰۃ میں بکری کے بچہ کو جو سامنے سے گزرنا چاہتا تھا آپ نے روکا، ہٹایا۔
۴۔ لڑکے اور لڑکی کو ہاتھ کے اشارہ سے واپس فرمایا۔
۵۔ آپس میں الجھی ہوئی دونوں بچیوں کے درمیان علیحدگی پیدا کی۔
۶۔ حالت صلوٰۃ میں اشارہ سے سلام کرنے والوں کے جواب دیئے۔ دیکھتے نہ تو اشارہ کس کی جانب کرتے۔
۷۔ شیطان مخل ہوا تو بچشم سر دیکھ کر اسے پکڑا اور اس کا گلا گھونٹا۔

مذکورہ بالا تمام واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی حالت میں آپ آنکھیں بند نہیں رکھتے تھے۔
کراہیت کے باب میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ امام احمد وغیرہ اسے مکروہ اور یہودیوں کا فعل تصور کرتے ہیں،

---

[1] بخاری ۱/۴۰۸ فی الصلاۃ: باب إذا صلی فی ثوب مصلب أو تصاویر هل تفسد صلاته، و فی اللباس: باب کراهية الصلاة فی التصاویر، مسند احمد ۳/۱۵۱ و ۲۸۳۔

[2] بخاری ۱/۴۰۶، ۴۰۷ فی الصلاۃ: باب إذا صلی فی ثوب له أعلام، وفی صفة الصلاة: باب الالتفات فی الصلاة، وفی اللباس: باب الأكسية والخمائص، مسلم (۵۵۶) فی المساجد: باب کراهية الصلاة فی ثوب له أعلام۔ ابوداؤد (۹۱۴) فی الصلاة: باب النظر فی الصلاة۔ نسائی ۲/۷۲ فی القبلة: باب الرخصة فی الصلاة فی خميصة لها أعلام۔ مسند احمد ۶/۳۷ و ۴۶ و ۱۷۷ و ۱۹۹ و ۲۰۸۔ انبجانی: ایک جگہ ہے جہاں اونی چادریں تیار کی جاتی تھیں۔ اسی کی طرف نسبت کرکے چادر کو انبجانیہ کہتے ہیں۔

[3] بخاری ۲/۴۴۷، ۴۴۸، حدیث ابن عباس۔ مسلم (۹۰۴) (۱۰) فی الکسوف: باب ما عرض علی النبی صلی الله علیه وسلم فی صلاة الکسوف من أمر الجنة والنار۔ احمد ۳/۳۱۸، حدیث جابر۔ مسند احمد ۲/۱۸۸۔ نسائی ۳/۱۴۹ فی الکسوف: باب القول فی السجود فی صلاة الکسوف، حدیث شعبة عن عطاء بن السائب عن ابیه عن عبد الله بن عمرو بن العاص۔ سند صحیح ہے۔ کیونکہ ماؤف العقل ہونے سے پہلے عطاء سے شعبہ کا سماع ثابت ہے۔ احمد نے ۴/۲۴۵ میں اس کی روایت مغیرہ بن شعبہ سے کی ہے۔

صاحب المحجن: اشارہ اس آدمی کی طرف ہے جو اپنے آنکس نما نیزے سے حاجیوں کا سامان چرایا کرتا تھا اور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم میں انتڑیاں کھینچتے ہوئے دیکھا تھا۔

مگر ایک جماعت کے نزدیک جائز اور غیر مکروہ ہے، بقول ان کے اس سے خشوع کی کیفیت بآسانی طاری ہو سکتی ہے۔ یہی خشوع تو صلوٰۃ کی روح اور اس کا مطلوب ہے۔

صحیح یہ ہے کہ آنکھیں کھلی رکھنے سے خشوع میں فرق نہ پڑتا ہو تو یہی افضل ہے، اور اگر سامنے کچھ تزئین و آرائش وغیرہ باعث تشویش فکر و نظر ہوں تو آنکھیں بند رکھنا قطعاً مکروہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں شرعی اصول و مقاصد کے اعتبار سے مکروہ سمجھنے کے مقابلہ میں اسے مستحب سمجھنا زیادہ اقرب ہے۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃ سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا دعا کرنا، بیٹھنا، تیزی سے چلے جانا اور امت کو ذکر و قرأت کی تعلیم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے تو تین بار "استغفر اللہ" کہتے اور یہ دعا پڑھتے۔

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ[1]

اے اللہ تو سلام ہے، سلامتی تجھ سے ہے، مبارک تو ہے، اے جلال و عزت والے۔

یہ دعا پڑھتے ہی قبلہ سے رُخ مقتدیوں کی جانب کر لیتے۔

دائیں اور بائیں بھی مڑ کر بیٹھتے۔ عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت سے بائیں مڑ کر بیٹھتے دیکھا ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر داہنے مڑ کر بیٹھتے دیکھا ہے۔

پہلی حدیث صحیحین[2] اور دوسری مسلم میں ہے[3]

حضرت عبد اللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں اور بائیں دونوں جانب مڑ کر بیٹھتے دیکھا ہے[4]

---

[1] مسلم (۵۹۱) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ۔ ترمذی (۳۰۰) فی الصلاۃ : باب مایقول إذا سلم من الصلاۃ۔ ابوداؤد (۱۵۱۳) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل اذا سلم۔ نسائی ۳/۶۸ فی السھو : باب الاستغفار بعد التسلیم۔ ابن ماجہ (۹۲۸) فی الاقامۃ : باب مایقال بعد التسلیم۔ مسند احمد ۵/۲۷۵ و ۲۷۹، حدیث ثوبان رضی اللہ عنہ۔ اس باب کی ایک حدیث مسلم (۵۹۲) میں حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔

[2] بخاری ۲/۲۸۰ فی الصلاۃ : باب الانفتال والانصراف عن الیمین وعن الشمال۔ مسلم (۷۰۷) فی صلاۃ المسافرین : باب جواز الانصراف من الصلاۃ عن الیمین وعن الشمال۔ ابوداؤد (۱۰۴۲) فی الصلاۃ : باب کیف الانصراف من الصلاۃ۔ نسائی ۳/۸۱ فی السھو : باب الانصراف من الصلاۃ۔ مسند احمد ۱/۳۸۳ و ۴۲۹ و ۴۶۴۔

[3] مسلم (۷۰۸) فی صلاۃ المسافرین : باب جواز الانصراف من الصلاۃ عن الیمین والشمال۔ نسائی ۳/۸۱ فی السھو : باب الانصراف من الصلاۃ۔ حدیث یہ ہے۔ سدی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت انس سے دریافت کیا کہ صلوٰۃ سے فارغ ہو جاؤں تو کیسے مڑ کر بیٹھوں۔ داہنے یا بائیں؟ فرمایا" میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر داہنے مڑ کر بیٹھتے دیکھا ہے۔

[4] ابن ماجہ (۹۳۱) فی الاقامۃ : باب الانصراف من الصلاۃ۔ مسند احمد ۲/۱۷۴ و ۱۹۰ و ۲۱۵۔ حدیث یہ ہے : عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے دادا سے بیان کیا، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داہنے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پھر آپ مقتدیوں کی جانب رُخ کر کے بیٹھتے تھے۔ مگر کوئی پہلو مخصوص نہ رکھتے تھے۔
فجر کی صلوٰۃ سے فارغ ہوکر مصلی پر طلوع آفتاب تک بیٹھے رہتے تھے[1]
ہر فرض صلوٰۃ کے بعد آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ[2]
اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہت اور اسی کی تعریف، وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ اے اللہ جو تو عطا کردے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور جو تو روک دے تو اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں۔ تیرے نزدیک غنی کا غنا کچھ کام نہیں آسکتا۔
آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ، لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاۗءُ الْحَسَنُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ[3]
اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت اور اسی کی تعریف، وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ جو تدبیر اور طاقت بھی ہے بس اسی کے سہارے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ ہم اسی کے عبادت گزار ہیں، نعمت اسی کی، فضل واحسان اسی کا، ثنا جمیل اسی کی، اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ ہم خالص اسی کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔ خواہ کافروں کو برا ہی معلوم کیوں نہ ہو۔
ابوداؤد نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ سے سلام پھیرتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ، اَنْتَ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اور بائیں دونوں جانب مڑ کر بیٹھتے دیکھا ہے۔ ننگے پیر اور جوتا پہن کر صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے، کھڑے اور بیٹھ کر پانی پیتے دیکھا ہے۔ سند حسن ہے۔ اس باب کی ایک حدیث نسائی ۳/۸۲ میں حضرت عائشہ کی بھی ہے، اس کی سند بھی حسن ہے، ترمذی (۲۰۱) ابوداؤد (۱۰۴۱) ابن ماجہ (۹۲۹) میں ہلب سے بھی ایک روایت ہے۔ شواہد کے اعتبار سے اس کی سند حسن ہے۔

[1] صحیح مسلم (۶۷۰) فی المساجد : باب فضل الجلوس فی مصلاہ بعد الفجر۔ حدیث جابر بن سمرہ۔ سماک بن حرب کی وجہ سے سند حسن ہے۔ نسائی نے ۳/۸۰، ۸۱ میں اس کی روایت کی ہے۔

[2] بخاری ۲/۲۷۵، ۲۷۶ فی صفۃ الصلاۃ : باب الذکر بعد الصلاۃ، وفی الدعوات : باب الدعاء بعد الصلاۃ، وفی الرقاق : باب مایکرہ من قیل وقال، وفی القدر : باب لامانع لما اعطی اللّٰہ، وفی الاعتصام : باب مایکرہ من کثرۃ السؤال۔ مسلم (۵۹۳) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ وبیان صفتہ۔ ابوداؤد (۱۵۰۵) فی الصلاۃ : باب مایقول الرجل اذا سلم۔ نسائی ۳/۷۰، ۷۱ فی السھو : باب نوع آخر من القول عند انقضاء الصلاۃ۔ تمام ائمہ نے یہ حدیث مغیرہ کے کاتب وراد سے بیان کی ہیں، کہتے ہیں کہ مغیرہ نے معاویہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھوایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض صلوٰۃ کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے ......

[3] مسلم (۵۹۴) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ۔ ابوداؤد (۱۵۰۶) فی الصلاۃ : باب ما یقول الرجل اذا سلم۔ نسائی ۳/۶۹، ۷۰ فی السھو : باب التھلیل و باب عدد التھلیل والذکر بعد التسلیم۔ حدیث ابو الزبیر بروایت عبداللہ بن زبیر۔

الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ [1]

اے اللہ بخش دے میرے اگلے اور پچھلے گناہ، میرے ڈھکے اور کھلے قصور، میرے اسراف اور اسے جو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، تو آگے بڑھانے والا ہے، تو پیچھے ہٹانے والا ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

یہ حضرت علی کی اس طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جسے مسلم [1] نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے افتتاح اور رکوع وسجدہ سے متعلق روایت کی ہے۔

مسلم کے یہاں اس حدیث کے سلسلہ میں دو طرح کے بیانات ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے تشہد اور سلام کے درمیان پڑھتے تھے، اور یہی صحیح ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ اسے سلام کے بعد پڑھتے تھے۔ غالباً ایسا تھا کہ یہ دعا آپ دونوں مقامات پر پڑھتے تھے۔ واللہ اعلم۔

امام احمد نے حضرت زید بن ارقم سے ایک روایت میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر صلوٰۃ کے بعد حسب ذیل دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهٗ اَنَا شَهِيْدٌ اَنَّكَ الرَّبُّ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اَنَا شَهِيْدٌ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اَنَا شَهِيْدٌ اَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اِجْعَلْنِيْ مُخْلِصًا لَكَ وَاَهْلِيْ فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ مِّنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ، اِسْمَعْ وَاسْتَجِبْ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ الْاَكْبَرُ، اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ الْاَكْبَرُ، حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ الْاَكْبَرُ۔ [3]

اے اللہ ہمارے رب اور ہر چیز کے رب ومالک، میں گواہ ہوں کہ تو تنہا رب ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، اے اللہ! ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! میں گواہ ہوں کہ محمد تیرے بندے ہیں، تیرے رسول ہیں، اے اللہ! ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! میں گواہ ہوں کہ بندے سب بھائی بھائی ہیں۔ اے اللہ! ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! مجھے اور میرے اہل کو اپنا مخلص بنا دنیا کی اور آخرت کی ہر گھڑی میں۔ اے بزرگی اور عزت والے! سن لے اور قبول کرلے۔ اللہ بہت بڑا ہے، اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اور سب سے بڑا ہے۔ میرے لیے اللہ کافی ہے اور کیا ہی بہتر وکیل ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے۔

آپ نے صلوٰۃ کے بعد امت کو یہ پڑھنے کی دعوت دی ہے:

---

[1] ابوداؤد (۱۵۰۹) فی الصلاۃ: باب ما یقول الرجل إذا سلم۔ سند صحیح ہے۔ ترمذی (۳۴۱۹) فی الدعوات۔ ان کے مطابق حدیث حسن صحیح ہے۔

[2] رقم (۷۷۱)، (۲۰۱) و (۲۰۲)۔

[3] ابوداؤد (۱۵۰۸) فی الصلاۃ، باب ما یقول الرجل إذا سلم۔ مسند احمد ۴/ ۳۶۹۔ سند میں داؤد بن راشد طفاوی ابوبحر کرمانی بصری صائغ جیسا کہ تقریب میں حافظ نے کہا ہے لین الحدیث ہیں۔ زید بن ارقم سے اس حدیث کی روایت کرنے والے ابومسلم بجلی کو ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ (پاک ہے اللہ) ۳۳ بار
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (تعریف اللہ کی) ۳۳ بار } کل سو بار
اَللّٰہُ اَکْبَرُ (اللہ بہت بڑا ہے) ۳۳ بار

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [1] (ایک بار)
(تنہا اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہت اسی کی، تعریف اسی کی، وہ ہر شے پر قادر ہے)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۳۴ بار پڑھ کر سو کی گنتی پوری کی جائے گی [2]

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ۲۵ بار سُبْحَانَ اللّٰہِ، ۲۵ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، ۲۵ بار اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور ۲۵ بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [3]

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ ۱۰ بار سُبْحَانَ اللّٰہِ، ۱۰ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اور ۱۰ بار اَللّٰہُ اَکْبَرُ [4]

اس طریقہ میں بظاہر بعض راویوں کا تصرف اور ان کی اپنی تفسیر معلوم ہوتی ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ "یُسَبِّحُوْنَ وَیَحْمَدُوْنَ وَیُکَبِّرُوْنَ دُبُرَ کُلِّ صَلٰوۃٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ" (ہر صلوٰۃ کے سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر تینتیس ۳۳ بار

---

[1] مسلم (۵۹۷) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ وبیان صفتہ۔ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[2] مسلم (۵۹۶) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ۔ نسائی ۳/ ۷۵ فی السھو : باب نوع آخر من عدد التسبیح۔ ترمذی (۳۴۰۹) فی الدعوات : باب کم یسبح بعد الصلاۃ، حدیث کعب بن عجرہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ کچھ بتکرار کہے جانے والے کلمات ہیں جنھیں ہر فرض صلوٰۃ کے پیچھے کہنے والا یا اختیار کرنے والا ناکام ونامراد نہیں ہوسکتا۔ ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر۔

[3] ترمذی (۳۴۱۰) فی الدعوات : باب کم یسبح بعد الصلاۃ۔ نسائی ۳/ ۷۶ فی السھو : باب نوع آخر من التسبیح، حدیث زید بن ثابت۔ فرماتے ہیں "ہمیں حکم ہوا کہ ہر صلوٰۃ کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھیں"۔ کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے خواب دیکھ کر کہا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر ہر صلوٰۃ کے بعد پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔ انصاری نے کہا "انھیں ۲۵ بار پڑھا کرو، اور اس کے ساتھ لا الہ الا اللہ شامل کرلو" صبح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آکر انھوں نے اپنا خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا "ایسا ہی کرو" ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس باب میں نسائی ۳/ ۷۶ کے اندر ایک روایت عبد اللہ بن عمر سے بھی ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔

[4] نسائی ۳/ ۵۱ فی السھو : باب الذکر بعد التشھد، حدیث انس، فرماتے ہیں "ام سلیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آکر کہا: رسول اللہ! کچھ کلمات مجھے سکھا دیں کہ اپنی صلوٰۃ میں دعا مانگ سکوں، فرمایا "سبحان اللہ دس بار، الحمد للہ دس بار، اللہ اکبر دس بار پڑھا کرو پھر اپنی ضرورت پیش کرو، وہ ہاں ہاں کہے گا" سند حسن ہے۔ نسائی ۳/ ۷۴ فی السھو : باب عدد التسبیح بعد التسلیم، حدیث عبد اللہ بن عمر۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ دو عادتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان بھی انھیں اختیار کرے گا وہ جنت میں داخل ہو کر رہے گا۔ یہ دونوں آسان ہیں مگر اسے اختیار کرنے والے کم ہیں"۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صلوات خمسہ میں ہر صلوٰۃ کے بعد سبحان اللہ دس بار، الحمد للہ دس بار اور اللہ اکبر دس بار کہے"۔ اور اس کے بعد پوری حدیث بیان کی۔ ترمذی (۳۴۰۷) فی الدعوات : باب کم یسبح بعد الصلاۃ۔ ابوداؤد (۵۰۶۵) فی الادب : باب فی التسبیح عند النوم، حدیث شعبہ بروایت عطاء بن سائب، جسے انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کی ہے۔ سند صحیح ہے کیونکہ اس کی روایت شعبہ نے ماؤف العقل ہونے سے پہلے عطاء سے کی ہے۔

[5] مسلم (۵۹۵) فی المساجد : باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ۔ عن أبی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! مالدار لوگ تو بلند درجے اور پائیدار نعمتیں لے گئے، یہ روایت قتیبہ عن اللیث کی حدیث کے مثل ہے۔ مگر انھوں نے ابوہریرہ کی حدیث میں ابوصالح کا قول (ثم رجع الفقراء۔ الخ) داخل کر دیا ہے اور حدیث میں اتنی زیادتی بھی کی ہے کہ سہیل کہتے ہیں: گیارہ گیارہ بار جس کا مجموعہ ۳۳ بار ہے۔

کہتے ہوں) کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ تسبیحی، تحمیدی اور تکبیری ہر کلمہ تینتیس[۳۳] بار ہو۔ یعنی یہ فرمایا جارہا ہے کہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر تینتیس بار کہو، کیونکہ حدیث کے راوی سُمَیّ نے ابوصالح سمان سے روایت کی ہے اور ابوصالح سمان نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ انھوں نے کہا "کہو! سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر حتی کہ سب مل کر تینتیس بار ہو جائیں"۔

اذکار میں گیارہ بار کی تخصیص کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ برعکس ازیں سو بار کی نظیریں موجود ہیں، دس بار کی بھی نظیریں موجود ہیں، جیساکہ سنن میں حضرت ابوذر کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "پیر موڑے ہوئے گفتگو سے پہلے، صلوٰۃ فجر کے بعد جو مصلی پر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" دس بار پڑھے گا اس کے حق میں دس نیکیاں لکھی جائیں گی، دس گناہ اس کے محو ہوں گے، دس درجے اس کے بلند ہوں گے، وہ تمام دن ہر مصیبت سے بچا رہے گا، شیطان سے اس کی نگہبانی ہوگی، سوائے شرک باللہ کے اور کسی گناہ کو یارا نہ ہوگا کہ اسے اپنی گرفت میں لے سکے۔" ترمذی نے اسے حسن کہا ہے[۱]

مسند امام احمد میں ام سلمہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ کو جب وہ خادم کے لیے آئیں تو حکم دیا کہ سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار اللہ اکبر پڑھ کر سوئیں اور صبح کی صلوٰۃ میں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" دس بار اور دس بار صلوٰۃ مغرب کے بعد پڑھا کریں[۲]

صحیح ابن حبان میں حضرت ابوایوب سے مرفوعاً روایت ہے کہ "صبح کے وقت جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ،

---

[۱] ترمذی (۳۴۷۰) فی الدعوات: باب (۶۴) سند میں شہر بن حوشب ضعیف ہیں۔ مسند احمد ۴/۲۲۷ میں یہ روایت شہر بن حوشب نے عبدالرحمٰن بن غنم اشعری سے بیان کی ہے، ابوذر کا تذکرہ نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن بن غنم کی صحت مختلف فیہ ہے۔ مگر اس روایت کی ایک شاہد بھی ہے جو احمد ۴/۶۰، ابوداؤد (۵۰۷۷) اور ابن ماجہ (۳۸۶۷) میں مذکور ہے۔ راوی ابوعیاش زرقی ہیں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے صبح کے وقت "لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر" کہا تو اس کے حق میں یہ اولاد اسماعیل کی ایک گردن کے برابر ہوں گے۔ اس کے حق میں دس نیکیاں لکھی جائیں گی، دس بدیاں محو ہوں گی، دس درجے بلند ہوں گے، شام تک شیطان سے مامون رہے گا۔ شام کو بھی یہ کلمات کہے تو صبح تک وہ اسی حال میں رہے گا"۔ سند حسن ہے۔ اس کی شاہد حدیث کے اندر "من قال دبر کل صلاۃ وھو ثان رجلیہ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ احمد ۵/۴۲۰ نے بسند صحیح حضرت ابوایوب سے روایت کی ہے کہ "صبح کے وقت جو لاالہ الا اللہ، وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، یحیی ویمیت وھو علی کل شئ قدیر دس بار پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ہر بار کے عوض دس نیکیاں لکھے گا، دس گناہ محو کرے گا، دس درجے بلند فرمائے گا۔ یہ اس کے حق میں دس گردنوں کے برابر ہوں گے اور یہ آغاز یوم سے آخر یوم تک اس کے لیے محافظ ہوں گی، اس کا کوئی کام بھی اس سے انھیں دبا نہ سکے گا، شام کو بھی یہی کلمات پڑھے تو مذکورہ حالت میں رہے گا"۔

[۲] مسند احمد ۶/۲۹۸، سند میں شہر بن حوشب ہیں۔ اس کی قسم اول صحیح ہے، بخاری نے اس کی تخریج ۱۱/۱۰۱، ۱۰۳، اور مسلم نے (۲۷۲۷) میں کی ہے، روایت حضرت علی کی ہے کہ حضرت فاطمہ کا چکی پیستے پیستے برا حال ہوگیا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کچھ قیدی آئے تو چلیں مگر آپ کو نہ پایا، واپسی پر حضرت عائشہ سے ملاقات ہوگئی تو اس کا تذکرہ کر دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت فاطمہ کے آنے کا مقصد حضرت عائشہ نے پیش کیا۔ آپ ہمارے یہاں آئے، اس وقت ہم اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ ہم نے اٹھنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو، آپ ہمارے درمیان بیٹھ گئے حتی کہ آپ کے پیروں کی ٹھنڈک مجھے محسوس ہوئی۔ فرمایا جو درخواست تم نے دی ہے اس سے بہتر ایک دعا تمھیں نہ سکھا دوں وہ یہ کہ جب سونے کے لیے بستروں پر جاؤ تو اللہ اکبر ۳۴ بار، سبحان اللہ ۳۳ بار اور الحمد للہ ۳۳ بار پڑھو۔ یہ نوکر سے تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث کے قسم دوم کی شاہد حضرت ابوایوب انصاری کی وہ حدیث ہے جو اس کے بعد آ رہی ہے۔

لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" دس بار کہے گا اس کے حق میں دس نیکیاں لکھی جائیں گی، دس بدیاں محو ہوں گی، دس درجے بلند ہوں گے، چار گردنیں آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، شام تک شیطان سے محفوظ رہے گا اور جس نے صلوٰۃ مغرب کے بعد یہ کلمات ادا کیے صبح تک مذکورہ کیفیت اس پر رہے گی[1]۔ افتتاحی موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اس سے پہلے آچکی ہے کہ آپ دس بار اللہ اکبر، دس بار الحمد للہ، دس بار سبحان اللہ، دس بار لا الٰہ الا اللہ، دس بار استغفر اللہ، دس بار اللھم اغفر لی واھدنی وارزقنی اور دس بار روز قیامت تنگیٔ مقام سے پناہ مانگتے تھے"۔ پس اذکار اور دعاؤں میں دس بار کا تذکرہ تو بکثرت ملتا ہے مگر گیارہ بار کا تذکرہ سوائے حضرت ابوہریرہ کی مذکورہ بالا حدیث میں اور وہ بھی اس کی بعض روایتوں میں اور کہیں نہیں ملتا۔ واللہ اعلم۔

صحیح ابو حاتم میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ سے مڑتے تو حسب ذیل دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ جَعَلْتَہٗ عِصْمَۃَ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ جَعَلْتَ فِیْھَا مَعَاشِیْ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَاَعُوْذُ بِعَفْوِکَ مِنْ نِقْمَتِکَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ۔ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ[2]

اے اللہ میرے لیے میرے اس دین کو موزوں کر دے جسے تو نے میرے معاملہ کی آبرو بنائی ہے، میرے لیے میری اس دنیا کو درست بنا دے جس میں تو نے میری روزی رکھی ہے۔ اے اللہ میں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ مانگتا ہوں تیری سزا سے تیرے عفو کی پناہ مانگتا ہوں، تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں، جو شے تو عطا کر دے اسے روکنے والا کوئی نہیں، جسے تو روک دے اسے کوئی دینے والا نہیں، تیرے یہاں تونگر کی تونگری کام نہیں آسکتی۔

مستدرک حاکم میں حضرت ابو ایوب سے روایت ہے کہ میں نے جب بھی تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صلوٰۃ پڑھی، صلوٰۃ سے مڑ کر آپ کو یہ دعا پڑھتے سنا۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ خَطَایَایَ وَذُنُوْبِیْ کُلَّھَا، اَللّٰھُمَّ انْعِشْنِیْ وَاَحْیِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّہٗ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا اِلَّا اَنْتَ وَلَا یَصْرِفُ عَنْ سَیِّئِھَا اِلَّا اَنْتَ[3]

اے اللہ میری خطائیں اور گناہ سب کی سب معاف کر دے۔ اے اللہ! مجھے خوشحال کر دے، مجھے زندگی عطا فرما، مجھے

۱۔ (۲۳۴۱) "موارد الظمآن" اور مسند احمد ۵/۴۱۵، سند میں عبد اللہ بن یعیش عن ابی ایوب ہیں، ابن حبان کے علاوہ کسی نے ان کو ثقہ نہیں کہا ہے، باقی رجال ثقہ ہیں۔ ام سلمہ کی گزری ہوئی حدیث اور طبرانی میں معاذ بن جبل کی حدیث اس کی شاہد ہے۔ منذری نے الترغیب و الترہیب ۱/۲۶۹ میں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

۲۔ ابن حبان (۵۴۱) حدیث ابن ابی السری، فرماتے ہیں "حفص بن میسرہ کے یہاں حدیث پڑھی جا رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ فرمایا مجھ سے موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا، انھوں نے عطاء بن ابو مروان سے، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی کہ کعب نے ان سے اللہ کی قسم کھا کر بتایا، جس نے موسیٰ کے لیے دریا پھاڑا ہمیں تورات میں ملتا ہے کہ داؤد نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صلوٰۃ سے مڑتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے . . . . . ابن ابی السری محمد بن متوکل ضعیف ہیں، کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں، بکثرت ان سے منکر احادیث مروی ہیں۔ صحیح مسلم (۲۷۲۰) میں حضرت ابوہریرہ سے روایت بغیر کسی قید کے آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے تھے" اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمة امری واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی واصلح لی آخرتی التی فیھا معادی واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیر واجعل الموت راحة لی من کل شر"

۳۔ حاکم ۳/۴۶۲ سند میں محمد بن سنان قزاز ضعیف ہیں اور عمر بن مسکین کو ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بخاری فرماتے ہیں "ان کی موافقت نہیں کی جاتی" اس باب میں ابن سنی (۱۱۴) کے یہاں ابو امامہ سے بھی ایک روایت ہے، مگر اس کی سند میں علی بن یزید الہانی ضعیف ہیں۔

رزق دے، صالح اعمال واخلاق کی ہدایت فرما۔ صالح اعمال و اخلاق کی ہدایت تو ہی دے سکتا ہے۔ برے اعمال و اخلاق کو مجھ سے تو ہی دور کر سکتا ہے۔

صحیح ابن حبان میں حارث بن مسلم تمیمی سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب صبح کی صلوٰۃ پڑھ کر فارغ ہو تو گفتگو سے پہلے یہ دعا پڑھو۔

اَللّٰهُمَّ أَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ (اے اللہ! مجھے دوزخ سے بچا) سات بار۔ اگر اسی دن مر گئے تو اللہ تعالیٰ تمھارے حق میں دوزخ سے محفوظیت کا پروانہ لکھ دے گا۔ اور مغرب کی صلوٰۃ سے فارغ ہو تو گفتگو سے پہلے "اَللّٰهُمَّ أَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ" سات بار پڑھو۔ اگر اسی شب مر گئے تو اللہ تعالیٰ تمھارے حق میں دوزخ سے محفوظیت کا پروانہ لکھ دے گا۔[1]

سنن کبیر میں نسائی نے ابوامامہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو ہر فرض صلوٰۃ کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا اسے جنت کے داخلہ سے صرف موت ہی روک سکتی ہے۔[2] محمد بن حمیر بطریق محمد بن زیاد الہانی ابوامامہ سے اس حدیث کی تنہا روایت کرتے ہیں، نسائی نے اس کی روایت حسین بن بشر سے انھوں نے محمد بن حمیر سے کی ہے۔ اس حدیث کو کچھ اہل علم صحیح قرار دیتے ہیں، چنانچہ ان کے مطابق حسین بن بشر کے بارے میں نسائی نے کہا ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں اور ایک جگہ ثقہ کہا ہے، محمد بن حمیر اور محمد بن زیاد کو بخاری نے اپنی صحیح میں حجت قرار دیا ہے، چنانچہ حدیث انہی کی شرط پر ہے۔ کچھ اہل علم اسے موضوع قرار دیتے ہیں، ابوالفرج ابن جوزی نے اپنی کتاب "موضوعات" میں اسے درج کیا ہے۔ نیز محمد بن حمیر پر کلام کرتے ہوئے ابوحاتم رازی کا یہ تبصرہ پیش کیا ہے کہ وہ حجت نہیں ہیں۔ یعقوب بن سفیان نے انھیں غیر قوی کہا ہے۔ مگر بعض حفاظ حدیث نے ان کا رد کرتے ہوئے محمد کو ثقہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس بات سے کہیں بالاتر ہیں کہ ان کی جانب کوئی موضوع حدیث منسوب کی جائے۔ حدیث صحیح پر سب سے مہتم بالشان تصنیف پیش کرنے والے یعنی بخاری نے انھیں حجت قرار دیا ہے۔ نیز رجال پر جو انتہائی سخت تنقید پیش کرتے ہیں یعنی یحییٰ بن معین نے بھی انھیں ثقہ کہا ہے، طبرانی نے بھی اس حدیث کی روایت اپنی معجم میں عبداللہ بن حسن سے انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے دادا سے کی ہے، کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو فرض صلوٰۃ کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا۔ وہ دوسری صلوٰۃ تک اللہ کے ذمہ میں رہے گا"[3] یہ حدیث ابوامامہ، علی بن ابی طالب عبداللہ بن عمر، مغیرہ بن شعبہ، جابر بن عبداللہ اور انس بن مالک سے بھی مروی ہے مگر سب میں ضعف پایا جاتا ہے۔ لیکن مختلف طریقوں سے آئی ہوئی ان احادیث کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے، موضوع نہیں ہے۔ ہم سے کسی نے بتایا کہ شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ، کا ارشاد ہے "میں کسی صلوٰۃ کے بعد اسے نہیں چھوڑتا" مسند اور سنن میں عقبہ بن عامر سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر صلوٰۃ کے بعد تمام معوذ سورتیں پڑھنے کا حکم دیا۔[4] اس کی روایت

---

[1] ابن حبان (۲۳۴۱) ابوداؤد (۵۰۷۹) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، لہٰذا سند ضعیف ہے۔

[2] ابن حبان۔ حدیث محمد بن حمیر عن محمد بن زیاد الألهاني عن أبي أمامة۔ سند صحیح ہے۔ منذری نے "الترغیب والترہیب" ۲/ ۲۶۱ میں لکھا ہے کہ نسائی اور طبرانی نے اس کی روایت چند سندوں سے کی ہے جن میں ایک صحیح ہے۔ ہمارے شیخ ابوالحسن فرماتے ہیں کہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے۔ ابن حبان نے "کتاب الصلاۃ" میں اسے درج کیا ہے اور صحیح بتایا ہے۔ طبرانی کی بعض سندوں میں "وقل هو الله احد" کا اضافہ ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ بھی یہ سند جید ہے۔ المجمع ۱۰/ ۱۰۲ میں ہیثمی نے کہا ہے کہ طبرانی نے کبیر اور الاوسط میں اس کی روایت کچھ سندوں سے کی ہے جن میں ایک صحیح ہے۔ ابوامامہ کی حدیث کی تخریج ابن سنی رقم (۱۲۰) اور مغیرہ بن شعبہ کی حدیث کی تخریج ابونعیم نے حلیۃ ۳/ ۱۲۱ میں کی ہے۔ سند حسن ہے۔

[3] ہیثمی نے اس کا تذکرہ المجمع ۲/ ۱۴۸ میں کیا ہے اور کہا ہے کہ طبرانی نے اس کی روایت کبیر میں کی ہے۔ سند حسن ہے۔ (حاشیہ "۴" اگلے صفحہ پر)

صحیح ابوحاتم ابن حبان اور مستدرک حاکم میں آئی ہے، حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، ترمذی کے یہاں "معوذتین" کے الفاظ ہیں۔

معجم طبرانی اور مسند ابویعلیٰ موصلی میں عمر بن نبہان نے حضرت جابر سے مرفوعاً روایت کی ہے جس میں آپ کا ارشاد ہے "تین باتیں ہیں جو بھی انھیں ایمان کے ساتھ اختیار کرے گا جنت کے جس دروازے سے چاہے گا داخل ہوگا اور بڑی بڑی آنکھوں والی جس حور سے چاہے گا شادی کرے گا۔

۱۔ جو اپنے قاتل کو معاف کردے۔

۲۔ پوشیدہ قرض ادا کردے۔

۳۔ ہر فرض صلوٰۃ کے بعد دس بار قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: رسول اللہ! اگر کوئی ایک ہی ان میں سے کرے؟ فرمایا: یا کوئی ایک ہی ان میں سے کرلے[1]۔

عمر بن نبہان کی شخصیت زیر بحث رہی ہے۔

حضرت معاذ کو آپ نے ہر صلوٰۃ کے بعد یہ دعا پڑھنے کی وصیت فرمائی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ[2]

اے اللہ! میری مدد فرما کہ تیری یاد کرسکوں، تیرا شکریہ ادا کرسکوں اور تیری عمدہ عبادت کرسکوں۔

"دبر الصلاۃ" میں قبل از سلام اور بعد از سلام دونوں کا احتمال ہے۔ ہمارے شیخ نے قبل از سلام کو ترجیح دی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ سے گفتگو کی تو فرمایا "دُبُرُ کُلِّ شَیْءٍ مِنْہُ کَدُبُرِ الْحَیَوَانِ" (ہر شئے کا پچھا جانور کے پیچھے کی طرح ہے۔

سترہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیوار کے سامنے کھڑے ہوکر صلوٰۃ پڑھتے تو اپنے اور دیوار کے درمیان ایک بکری کے گزرنے کا فاصلہ رکھتے۔ اس سے زیادہ دور نہ ہوتے تھے۔ بلکہ سترہ سے قریب رہنے کا حکم دیتے تھے، اور اگر کسی لکڑی، ستون یا درخت کے سامنے صلوٰۃ پڑھتے تو اسے بالکل سامنے نہیں بلکہ بائیں یا داہنے ابرو کے روبرو رکھتے۔

سفر اور بیابان میں نیزہ گاڑ کر سواری کو آڑے رکھ کر اور کجاوے کو اپنے سامنے کرکے اس کے پچھلے حصہ کو سترہ بناتے[3] اور صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ مصلیوں کو آپ نے سترہ رکھنے کا حکم دیا ہے، خواہ تیر یا عصا ہی کیوں نہ ہو اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو زمین

---

[4]۔ (حاشیہ "[4]" صفحہ گذشتہ) مسند احمد ۴/۲۱۱۔ ابوداؤد (۱۵۲۳) فی الصلاۃ: باب فی الاستغفار۔ ترمذی (۲۹۰۵) فی ثواب القرآن: باب ما جاء فی المعوذتین۔ نسائی ۳/۶۸ فی السہو: باب الامر بقرأۃ المعوذات بعد التسلیم۔ ابن حبان (۲۳۴۷)۔ مستدرک حاکم ۱/۲۵۳ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

---

[1]۔ ہیثمی نے اسے المجمع ۱۰/۱۰۲ میں ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت ابویعلیٰ کی جانب کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں عمر بن نبہان متروک ہیں۔

[2]۔ ابوداؤد (۱۵۲۲) فی الصلاۃ: باب فی الاستغفار۔ نسائی ۳/۵۳ فی السہو: باب نوع آخر من الدعا۔ سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۲۳۴۵) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3]۔ بخاری ۱/۴۷۹ فی السترۃ اب الصلاۃ الی الراحلۃ۔

پر ایک لکیر ہی کھینچ لیں[1]۔ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل کو کہتے سنا ہے کہ لکیر مثل ہلال کے چوڑائی میں ہوگی۔ عبداللہ فرماتے ہیں طول میں ہوگی اور عصا کو نصب کر دیا جائے گا۔ اگر سترہ نہ ہو تو صحیح حدیث کے مطابق عورت، گدھا اور سیاہ کتا صلوٰۃ کو کاٹ دیتے ہیں یہ حضرت ابوذر[2] حضرت ابوہریرہ[3]، حضرت ابن عباس[4] اور حضرت عبداللہ بن مغفل[5] کی روایتوں سے ثابت ہے۔ ان احادیث کے معارض دو طرح کے ہیں۔ صحیح غیر صریح اور صریح غیر صحیح۔ لہٰذا جس معارض کا یہ حال ہو اس کی وجہ سے مذکورہ احادیث پر عمل کرنا ترک نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ پڑھتے تھے اور قبلہ میں حضرت عائشہ سوئی ہوتی تھیں[6]۔ یہ حالت ایسی تھی جس میں گزرنے کا مفہوم نہیں ہے کیونکہ حرام یہ ہے کہ آدمی مصلی کے سامنے سے گزر جائے باقی سامنے

۱۔ ابوداؤد (۶۸۹) ابن ماجہ (۹۴۳) حدیث ابوہریرہ۔ سند میں دو مجہول ہیں۔ "المحرر" میں ابن قدامہ نے اس حدیث کو مضطرب الاسناد قرار دیا ہے۔

۲۔ مسلم (۵۱۰) فی الصلاۃ : باب قدر مایستر المصلی۔ روایت حضرت ابوذر کی، فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمھارے اندر کوئی صلوٰۃ پڑھنے کھڑا ہو اور اس کے سامنے کجاوے کے آخری حصہ کے مثل کوئی چیز ہو تو سترہ کا کام دے گی، اگر کجاوے کے آخری حصہ کے مثل اس کے سامنے نہ ہو تو اس کی صلوٰۃ گدھے، عورت اور سیاہ کتے سے لوٹ جائے گی"۔ میں نے کہا ابوذر! یہ سیاہ، سرخ اور زرد کتوں میں فرق کیا ہے ؟ فرمایا "بھتیجے ! ایسا ہی سوال میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا آپ نے فرمایا کہ سیاہ کتا شیطان ہوتا ہے۔ ترمذی (۳۳۸) فی الصلاۃ : باب ماجاء انہ لایقطع الصلاۃ الا الکلب والحمار والمرأۃ۔ ابوداؤد (۷۰۲) فی الصلاۃ : باب مایقطع الصلاۃ۔ نسائی ۲/۶۳ فی القبلۃ : باب ذکر مایقطع الصلاۃ ومالایقطع۔ ابن ماجہ (۹۵۲) فی الاقامۃ ؛ باب مایقطع الصلاۃ۔

۳۔ مسلم (۵۱۱) فی الصلاۃ : باب قدر مایستر المصلی، روایت ابوہریرہ سے، فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوٰۃ کو عورت، گدھا، کتا کاٹ دیتے ہیں۔ کجاوے کے آخری حصہ جیسی چیز اسے بچا سکتی ہے۔ ابن ماجہ (۹۵۰) فی الاقامۃ : باب مایقطع الصلاۃ۔

۴۔ ابوداؤد (۷۰۳) فی الصلاۃ : باب مایقطع الصلاۃ، ابن ماجہ (۹۴۹) فی الاقامۃ : باب مایقطع الصلاۃ، روایت عبداللہ بن عباس سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "سیاہ کتا اور مبتلائے حیض عورت صلوٰۃ کو کاٹ دیتے ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے۔ شعبہ نے اسے اصحاب قتادہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے، مگر سعید وہشام وغیرہ نے قتادہ سے بروایت ابن عباس اس کی موقوفاً روایت کی ہے

۵۔ ابن ماجہ (۹۵۱) فی الاقامۃ : باب مایقطع الصلاۃ، روایت عبداللہ بن مغفل کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوٰۃ عورت، کتا اور گدھا کاٹ دیتے ہیں۔ اس کی سند میں حسن کا عنعنہ ہے۔

۶۔ بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ بخاری ۱/۴۸۵ فی السترۃ ؛ باب من قال لایقطع الصلاۃ شئ، مسلم (۵۱۲)، (۲۷۰) میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ان کے یہاں کتے، گدھے اور عورت کے گزرنے سے صلوٰۃ ٹوٹ جانے کا تذکرہ آیا تو کہا "تم نے ہمیں گدھوں اور کتوں کے برابر کر دیا ہے، واللہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے، میں سامنے آپ کے اور قبلہ کے درمیان تخت پر لیٹی ہوتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موطا امام مالک ۱/۱۵۵، ۱۵۶۔ بخاری ۱/۴۷۲ اور مسلم (۵۰۴) میں عبداللہ بن عباس سے روایت ہے، فرماتے ہیں "میں اپنے عنفوان شباب میں ایک گدھی پر سوار ہو کر نکلا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں لوگوں کو صلوٰۃ پڑھا رہے تھے، میں بعض صفوں کے سامنے سے گزر کر گدھی سے اتر پڑا اور اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود صف میں پہنچ گیا مگر کسی نے مجھ پر کوئی نکیر نہ کی۔ ابوداؤد (۷۱۹)، دارقطنی ص ۱۴۱ اور بیہقی ۲/۱۷۸ میں ابوسعید کی حدیث ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوٰۃ کو کوئی چیز نہیں کاٹتی، حتی الامکان ہٹا دو اس لیے کہ یہ شیطان ہوتا ہے" سند میں مجالد بن سعید سیئ الحفظ ہیں، مگر دارقطنی ص ۱۴۱ میں سلیم بن عامر کی سند سے ابوامامہ کی مرفوعاً ایک روایت بھی آئی ہے جس سے اسے تقویت ملتی ہے اس میں آیا ہے کہ "صلوٰۃ کو کوئی چیز نہیں کاٹتی" ہیثمی نے المجمع ۲/۶۲ میں کبیر طبرانی سے اسے نقل کیا ہے، اور اس کی سند کو حسن کہا ہے نیز دارقطنی ہی نے ایک روایت اور زید بن اسلم کی سند سے پیش کی ہے، جس میں زید عطاء بن یسار سے اور وہ ابوہریرہ سے مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ آدمی کی صلوٰۃ نہ عورت کاٹتی ہے نہ کتا نہ گدھا، حتی الامکان اپنے سامنے سے ہٹا دیا کرو۔ اسی طرح انھوں نے حضرت انس سے بھی ایک مرفوع روایت پیش کی ہے جس میں آیا ہے کہ صلوٰۃ کو کوئی شئ نہیں کاٹتی۔ یہ سارے شواہد ایک دوسرے کو قوت پہنچاتے ہیں۔ اس طرح حدیث قوی ہو جاتی ہے۔ حافظ فرماتے ہیں : سعید بن منصور نے صحیح سند سے اسی طرح کی موقوف روایتیں حضرت علی و عثمان وغیرہ سے پیش کی ہیں۔ موطا ۱/۱۵۶ میں ابن شہاب سے روایت ہے وہ سالم بن عبداللہ سے بیان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کھڑا ہے، بیٹھا ہے یا لیٹا ہے تو اس میں کراہیت نہیں ہے۔ اسی طرح عورت بھی سامنے ٹھہری ہو گزر نہ رہی ہو تو اس سے صلوٰۃ نہ ٹوٹے گی۔ واللہ اعلم۔

سنن رواتب کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

حضر میں دائمی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس رکعتوں کی پابندی کرتے تھے، یہ وہی رکعتیں ہیں جن کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں میں نے محفوظ کی ہیں، دو قبل از ظہر، دو بعد از ظہر، دو بعد از مغرب گھر میں، دو بعد از عشاء گھر میں اور دو رکعتیں صلوٰۃ صبح سے پہلے[۱]"۔ یہ رکعتیں حضر میں آپ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ بعد از ظہر کی دونوں رکعتیں ایک دفعہ فوت ہو گئیں تو عصر کے بعد ان کی قضا فرمائی اور پھر انھیں پابندی سے ادا کرنے لگے کیونکہ آپ جب کوئی عمل کرتے تو برابر کرتے رہتے تھے۔ ممانعت کے اوقات میں سنن رواتب کی قضا آپ اور آپ کی امت کے لیے عام ہے، مگر ممانعت کے وقت پابندی سے ان دونوں رکعتوں کی ادائیگی یہ آپ کے لیے مخصوص تھی۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ اس جگہ آئے گی جہاں ہم آپ کی خصوصیات کا تذکرہ کریں گے۔ کبھی کبھی قبل از ظہر چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور فجر سے پہلے دو رکعتیں چھوڑتے نہیں تھے[۲]"۔ یا تو یہ کہا جائے گا کہ گھر میں چار اور مسجد میں دو پڑھتے تھے اور یہ زیادہ ظاہر ہے یا یہ کہ کبھی یہ اور کبھی وہ پڑھتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہ اور ابن عمر نے اپنے اپنے مشاہد کے مطابق بیان کیا۔ دونوں حدیثیں صحیح ہیں، ان پر کوئی کلام نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ چاروں رکعتیں ظہر کی سنت نہیں بلکہ مستقل صلوٰۃ تھیں جو آپ زوال کے بعد ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ امام احمد نے عبداللہ بن سائب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوال آفتاب کے بعد چار رکعتیں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اس لیے چاہتا ہوں کہ اس وقت کوئی عمل نیک اوپر کو جائے[۳]"۔

سنن میں حضرت عائشہ سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل از ظہر چار رکعتیں پڑھنے کا موقع نہ پاتے تو

(بقیہ صفحہ ص ـــ) کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے "مصلی کے سامنے سے گزرنے والی کوئی شئی صلوٰۃ نہیں کاٹتی۔ سند صحیح ہے۔ ان تمام نصوص کے اندر اکثر اہل علم صحابہ وغیرہ کے لیے اس حقیقت کی دلیل موجود ہے کہ مصلی کے سامنے سے گزرنے والی کوئی چیز صلوٰۃ نہیں کاٹتی۔ یہی قول حضرت علی، عثمان اور ابن عمر، ابن مسیب، شعبی، عروہ، امام مالک، ثوری، شافعی اور اصحاب رائے کا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں "صلوٰۃ بلاشبہ سیاہ کتا کاٹ دیتا ہے۔ مگر عورت اور گدھے کے باب میں تھوڑا تامل ہے۔

[۱] بخاری ۳/۴۸ فی التطوع : باب الرکعتین قبل الظہر و باب ماجاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ و باب التطوع بعد المکتوبة، و فی الجمعة : باب الصلاة بعد الجمعة وقبلها۔ مسلم (۷۲۹) فی صلاة المسافرین۔ ترمذی (۴۳۳) فی الصلاة : باب ماجاء انه یصلیهما فی البیت، ابوداؤد (۱۲۵۲) فی الصلاة : باب تفریع ابواب التطوع۔ نسائی ۲/۱۱۹ فی الامامة : باب الصلاة بعد الظہر۔ مؤطا ۱/۱۶۶ فی قصر الصلاة فی السفر : باب العمل فی جامع الصلاة۔ مسند احمد ۲/۱۱۷۔

[۲] بخاری ۳/۴۸ فی التطوع : باب الرکعتین قبل الظہر۔ ابوداؤد (۱۲۵۳) فی الصلاة : باب تفریع ابواب التطوع۔ نسائی ۳/۲۵۶ فی صلاة اللیل : باب المحافظة علی الرکعتین قبل الفجر۔

[۳] مسند احمد ۳/۴۱۱۔ ترمذی (۴۷۸) فی الصلاة : باب ماجاء فی الصلاة عند الزوال، سند حسن ہے، اس باب میں طیالسی ۱/۱۱۳ کے یہاں حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے جو شواہد کے اعتبار سے حسن ہے۔

بعد میں پڑھتے تھے[1] ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں رکعتیں قبل ازظہر کی فوت ہوجاتیں تو انھیں بعد ازظہر کی دونوں رکعتوں کے بعد پڑھتے تھے[2] ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل ازظہر چار اور بعد ازظہر دو رکعتیں پڑھتے تھے[3] ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل ازظہر چار رکعتیں پڑھتے تھے جن میں قیام طویل اور رکوع وسجود باقاعدہ ہوتا۔[4] یہ ہیں وہ چار رکعتیں جن کے بارے میں حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ آپ انھیں چھوڑتے نہیں تھے۔ واللہ اعلم۔ باقی ظہر کی سنت وہی دو رکعتیں ہیں جن کو عبداللہ ابن عمر نے ذکر کیا ہے۔ اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ تمام صلوات کی سنت دو دو رکعتیں ہیں حتیٰ کہ فجر میں بھی باوجودیکہ اس میں فرض دو ہی ہیں۔ نیز دیگر اوقات کے مقابلہ میں اس وقت زیادہ فارغ رہتے ہیں مگر سنت پھر بھی دو ہی رکعتیں ہیں۔ بنابریں یہ چاروں رکعتیں قبل ازظہر ایک مستقل وظیفہ کی ہیں جس کا سبب نصف النہار اور زوال آفتاب ہے۔ زوال آفتاب کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس طرح یہ قیام لیل کی رکعتوں کے برابر ہوجاتی ہیں۔ اس کا راز واللہ اعلم یہ ہے کہ نصف نہار نصف شب کے بالمقابل ہے۔ آسمان کے دروازے زوال آفتاب کے بعد کھلتے ہیں، نصف شب کے بعد نزول الٰہی ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں اوقات قربت ورحمت کے ہیں۔ ایک وقت میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اور دوسرے وقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ خود نچلے آسمان پر اتر آتا ہے۔ صحیح مسلم میں ام حبیبہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شب وروز میں بارہ ۱۲ رکعتیں پڑھے گا ان کے عوض جنت میں اس کے لیے ایک مکان تعمیر ہوگا۔ نسائی اور ترمذی میں آگے یہ اضافہ بھی ہے "چار قبل ازظہر اور دو بعد ازظہر، دو بعد ازمغرب، دو بعد ازعشاء اور دو قبل از صلوٰۃ فجر" نسائی میں "دو بعد ازعشاء" کے بجائے دو قبل ازعصر ہے۔ ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔[5] ابن ماجہ نے حضرت عائشہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ "جو سنت کی بارہ رکعتوں کی پابندی کرے گا اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کرے گا، چار قبل ازظہر، دو بعد ازظہر، دو بعد ازمغرب، دو بعد ازعشاء اور دو قبل ازفجر"[6] حضرت ابوہریرہ نے بھی اسی طرح کی روایت بیان کی ہے۔ اس کے مطابق دو رکعتیں قبل ازفجر، دو قبل ازظہر، دو بعد ازظہر، "دو" میرا خیال ہے قبل ازعصر کہا۔ دو بعد ازمغرب میرا خیال ہے کہ اور دو بعد ازعشاء آخر فرمایا۔[7] ہوسکتا ہے کہ یہ تشریح بعض راویوں کا کلام ہو۔ مگر حدیث میں درج ہوگئی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مرفوعاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کلام ہو۔ واللہ اعلم۔

۱۔ ترمذی (۴۲۶) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الرکعتین بعد الظھر۔ سند حسن ہے۔

۲۔ ابن ماجہ (۱۱۵۸) اس سے پیشتر جو حدیث گزری ہے اس کی وجہ سے حسن ہے۔

۳۔ ترمذی (۴۲۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الاربع قبل الظھر۔ سند حسن ہے۔

۴۔ ابن ماجہ (۱۱۵۶) فی اقامۃ الصلاۃ : باب فی الاربع رکعات قبل الظھر۔ سند میں قابوس بن ابی ظبیان جنبی جیسا کہ حافظ نے تقریب میں کہا ہے لین الحدیث ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں۔

۵۔ مسلم (۷۲۸) فی صلاۃ المسافرین : باب فضل السنن الراتبۃ۔ ترمذی (۴۱۵) فی الصلاۃ : باب ماجاء فیمن صلی فی یوم ولیلۃ ثنتی عشرۃ رکعۃ۔ ابوداؤد (۱۲۵۰) فی الصلاۃ : باب تفریع ابواب التطوع۔ نسائی ۳/۲۶۱ فی صلاۃ اللیل : باب ثواب من صلی فی الیوم واللیلۃ ثنتی عشرۃ رکعۃ۔ ابن ماجہ (۱۱۴۱) فی الاقامۃ : باب ماجاء فی ثنتی عشرۃ رکعۃ من السنۃ۔ ابن حبان (۶۱۴) نے اسے صحیح کہا ہے اور ترمذی نے حسن صحیح، اور حقیقت بھی یہی ہے۔

۶۔ ابن ماجہ (۱۱۴۰) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی ثنتی عشرۃ رکعۃ من السنۃ۔ ترمذی (۴۱۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فیمن صلی فی یوم ولیلہ اثنتی عشرۃ رکعۃ من السنۃ۔ نسائی ۳/۲۶۰، ۲۶۱ فی صلاۃ اللیل : باب ثواب من صلی فی الیوم واللیلۃ ثنتی عشرۃ رکعۃ۔ سند حسن ہے۔ یہ ام حبیبہ کی حدیث کے مفہوم میں ہے۔

۷۔ ابن ماجہ (۱۱۴۲)، نسائی ۳/۲۶۴۔ سند حسن ہے۔

قبل از عصر چار رکعتوں کے بارے میں سوائے عاصم بن ضمرہ کی روایت کے جسے انھوں نے حضرت علی سے بیان کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کچھ کرنا ثابت نہیں ہے۔ یہ لمبی حدیث ہے، اس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سولہ[1] رکعتیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں جب سورج یہاں صلوٰۃ ظہر کے وقت اپنی ہیئت پر ہوتا ہے اس وقت، چار قبل از ظہر، دو بعد از ظہر، چار قبل از عصر۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سورج جب اس جگہ اسی ہیئت پر زوال پذیر ہوتا ہے جس ہیئت پر عصر کے وقت ہوتا ہے تو دو رکعتیں، اور جب یہاں ظہر کے وقت کی ہیئت پر ہوتا ہے تو چار، قبل از ظہر چار، بعد از ظہر دو اور قبل از عصر چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ ہر دو رکعتوں کے درمیان سلام کے ذریعہ فصل کرتے اور یہ سلام ملائکہ مقربین اور مومنوں، مسلمانوں پر بھیجتے[1]۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے سنا ہے، وہ انتہائی سختی سے اس کا رد کرتے تھے، فرماتے تھے کہ موضوع ہے، ابو اسحاق جوزجانی نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ اس شخص پر رحم کرے جو قبل از عصر چار رکعتیں پڑھتا ہو[2]"۔ اس حدیث میں اختلاف ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح مگر دوسروں نے معلول قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ والد کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ میں نے ابو ولید طیالسی سے محمد بن مسلم بن مثنیٰ کی حدیث کے متعلق پوچھا جسے انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ اس شخص پر رحم کرے جو قبل از عصر چار رکعتیں پڑھتا ہو" تو فرمایا "چھوڑو اسے"۔ میں نے کہا "ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے"۔ فرمایا "مگر ابو ولید کہتے ہیں کہ ابن عمر کہا کرتے تھے "شب و روز میں دس رکعتیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ کی ہیں"۔ اگر حقیقت یہی تھی تو اسی کو وہ شمار کرتے، والد نے کہا کہ وہ فرماتے تھے "میں نے بارہ رکعتیں محفوظ کی ہیں"۔ مگر اصلاً یہ کوئی علت نہیں ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فعل محفوظ رکھا تھا اسی کی خبر دی ہے نہ کہ اور باتوں کی، لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔

قبل از مغرب دو رکعتوں کا پڑھنا آپ سے منقول نہیں ہے، البتہ یہ ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کو اس پر قائم رہنے دیا، آپ انھیں قبل از مغرب دو رکعتیں پڑھتے دیکھتے مگر نہ اس کا حکم دیتے نہ اس سے روکتے۔ صحیحین میں عبداللہ بن مزنی کی روایت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مغرب سے پہلے صلوٰۃ پڑھو، مغرب سے پہلے صلوٰۃ پڑھو" تیسری بار فرمایا "جو چاہے پڑھے" اس خیال سے کہ کہیں لوگ اسے سنت نہ بنالیں[3]۔ ان دونوں رکعتوں کے باب میں صحیح یہی ہے۔ دائمی سنتوں کی طرح یہ سنتِ مؤکدہ نہیں ہے۔

---

[1] مسند احمد ۱/ ۸۵، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶۔ ترمذی (۵۹۸) و (۵۹۹) میں اسی جیسی روایت ہے۔ ابن ماجہ (۱۱۶۱) فی اقامة الصلاة : باب ماجاء فیما یستحب من التطوع بالنہار۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ حدیث حسن ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نفل کے سلسلہ میں یہ سب سے عمدہ روایت ہے۔

[2] مسند احمد ۲/ ۱۱۷۔ ترمذی (۴۳۰) فی الصلاة : باب ماجاء فی الاربع قبل العصر۔ ابوداؤد (۱۲۷۱) فی الصلاة : باب الصلاة قبل العصر۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۶۱۶) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] بخاری ۳/ ۴۹ فی التطوع : باب الصلاة قبل المغرب، و فی الاعتصام : باب نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن التحریم الا ما تعرف اباحتہ۔ ابوداؤد (۱۲۸۱) فی الصلاة : باب الصلاة قبل المغرب۔ مسند احمد ۵/ ۵۵ حدیث عبداللہ بن مغفل مزنی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا ارشاد بیان کرتے ہیں "مغرب سے پہلے صلوٰۃ پڑھو، تیسری بار فرمایا یہ اس کے لیے ہے جو چاہے، مبادا لوگ اسے سنت نہ بنالیں۔ مسلم (۸۳۸) فی صلاة المسافرین : باب بین کل اذانین صلاة۔ حدیث یہ ہے "ہر دو اذانوں کے درمیان ایک صلوٰۃ ہے" ایسا تین بار فرمایا، تیسری بار فرمایا "اس کے لیے جو چاہے"۔ اور ابن حبان (۶۱۷) فی الصلاة : باب الصلاة قبل المغرب، حدیث یہ ہے "رسول اللہ علیہ وسلم نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔ سند صحیح ہے۔

سنتیں اور نفل گھر میں یا مسجد میں ؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام سنتیں اور نفلیں بالخصوص مغرب کی سنت گھر ہی میں پڑھتے تھے۔ مغرب کی سنت کے بارے میں منقول نہیں ہے کہ اسے کبھی مسجد میں بھی پڑھی ہے۔

امام احمد، حنبل کی روایت کے مطابق فرماتے ہیں : سنت یہ ہے کہ مصلی بعد از صلوٰۃ مغرب دو رکعتیں اپنے گھر میں ادا کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے یہی مروی ہے۔ سائب بن یزید فرماتے ہیں : میں نے حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں دیکھا کہ لوگ مغرب کی صلوٰۃ پڑھ کر نکلتے تو سب کے سب نکل جاتے کوئی مسجد میں باقی نہ رہ جاتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ مغرب کے بعد صلوٰۃ پڑھتے ہی نہ تھے چلے جاتے تھے۔

مسجد میں دونوں رکعتوں کی ادائیگی کافی اور برمحل ہوگی یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں امام احمد کا قول مختلف ہے چنانچہ ایک روایت ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی ہے جس میں انکا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ مجھے ایک شخص کے متعلق معلوم ہوا جس کا انھوں نے نام لیا تھا کہ وہ کہتا ہے کہ "بعد صلوٰۃ مغرب دو رکعتیں جو شخص مسجد میں ادا کرے گا کافی نہ ہوں گی" فرمایا : خوب کہا اس شخص نے، بڑا عمدہ استنباط کیا ہے۔ ابوحفص فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گھروں میں اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ مروزی فرماتے ہیں کہ مغرب کے بعد دو رکعتیں جو شخص مسجد میں ادا کرے گا گنہگار ہوگا" انھوں نے فرمایا : مجھے نہیں معلوم۔ میں نے کہا ابو ثور سے بھی یہی منقول ہے، فرمایا : ہوسکتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ان کی نظر گئی ہو کہ "انھیں اپنے گھروں میں ادا کرو"[1] ابوحفص فرماتے ہیں کہ اگر فرض مسجد میں نہیں گھر میں پڑھ لی جائے تو کافی ہوجاتی ہے پھر اس کے برخلاف سنت کے باب میں کیوں نہیں ہوسکتا ؟ مگر امام احمد کے نزدیک یہ توجیہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ سنتوں کے لیے کوئی مخصوص جگہ کی شرط ہے نہ جماعت کی۔ لہذا مسجد اور گھر دونوں جگہوں پر اس کی ادائیگی جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

مغرب میں ادائیگی سنت کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اور فرض کے درمیان کوئی کلام نہ ہوگا میمونی اور مروزی کی روایتوں کے مطابق امام احمد کا قول ہے کہ بعد از مغرب دو رکعتوں سے پہلے کلام نہ کرنا مستحب ہے۔ حسن بن محمد فرماتے ہیں : میں نے امام احمد کو دیکھا کہ صلوٰۃ مغرب سے سلام پھیرا پھر کلام کیے بغیر کھڑے ہوگئے اور گھر میں داخل ہونے سے پہلے مسجد میں صلوٰۃ نہیں پڑھی۔ ابوحفص فرماتے ہیں : اس کا سبب مکحول کی حدیث ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص کلام کیے بغیر بعد از مغرب دو رکعتیں پڑھے گا اس کی صلوٰۃ بلند ہوکر علیین میں پہنچے گی"[2] نیز یہ بھی ہے کہ فرض سے نفل کا

---

[1] ۔ مسند امام احمد ۴۲۸/۵، حدیث محمود بن لبید، فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاندان عبد الاشہل کے یہاں آئے اور صلوٰۃ مغرب پڑھائی۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا "اب دونوں رکعتیں اپنے گھروں میں ادا کرو" اس کے بعد مروزی نے عبداللہ کی بات اور ان کے والد کا جواب نقل کیا ہے۔ سند قوی ہے۔ ابن ماجہ نے ان سے (۱۱۶۵) میں مرفوعاً روایت کی ہے، انھوں نے محمود بن لبید سے، انھوں نے رافع بن خدیج سے روایت کی ہے۔ ہیثمی اسے المجمع ۲/ ۲۲۹، ۲۳۰ میں لائے ہیں اور فرمایا ہے کہ احمد نے اس کی روایت کی ہے۔ رجال اس کے ثقہ ہیں۔

[2] ۔ الترغیب والترهیب للمنذری ۲۰۵/۱ فی الصلاة، باب الترغیب فی الصلاة بین المغرب والعشاء - روایت مکحول کی ہے جسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں آپ کا ارشاد ہے "جس نے مغرب کے بعد بغیر کلام کیے دو رکعتیں پڑھیں" ایک اور روایت کے مطابق "چار رکعتیں پڑھیں اس کی صلوٰۃ علیین میں بلند ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ رزین نے اس کا ذکر کیا ہے مگر میں نے الاصول میں نہیں پایا۔ سند منقطع ہے۔

اتصال ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ گھر میں ادا کی جائے۔ نسائی، ابوداؤد اور ترمذی میں کعب بن عجرہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبد الاشہل کی مسجد میں تشریف لائے، یہاں صلوٰۃ مغرب پڑھی جب پوری ہو گئی تو آپ نے دیکھا کہ لوگ اس کے بعد سنت پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا "یہ صلوٰۃ گھر کی ہے[1]" ابن ماجہ میں رافع بن خدیج سے یہ روایت آئی ہے اس میں آپ کا ارشاد اس طرح ہے۔ "ان دونوں رکعتوں کو اپنے گھروں میں ادا کرو"

مقصود یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ عام سنتیں اور نفل گھر میں ادا کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں محفوظ کی ہیں۔ دو قبل از ظہر، دو بعد از ظہر، دو بعد از مغرب اپنے گھر میں، دو بعد از عشاء اپنے گھر میں اور دو قبل از صلوٰۃ فجر[2]"

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے فرماتی ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں چار رکعتیں قبل از ظہر پڑھ کر لوگوں کو صلوٰۃ پڑھانے کے لیے نکلتے تھے پھر واپس آ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے، صلوٰۃ مغرب پڑھا کر واپس آتے تو دو رکعتیں پڑھتے اور صلوٰۃ عشاء پڑھا کر واپس آتے تو گھر میں دو رکعتیں ادا فرماتے[3]" اسی طرح صلوٰۃ فجر کی سنت کے بارے میں بھی آپ سے یہی ثابت ہے کہ گھر میں پڑھتے تھے، جیسا کہ ام المؤمنین حضرت حفصہ کا بیان ہے[4] صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ جمعہ کے بعد دو رکعتیں اپنے گھر میں پڑھتے تھے[5] قبل از جمعہ و بعد از جمعہ سنتوں کا ذکر انشاء اللہ وہاں آئے گا جہاں جمعہ کے باب میں آپ کی سنت کا ذکر ہوگا۔ یہ حدیث آپ کے اس ارشاد کے مطابق ہے "لوگو! گھروں میں صلوٰۃ ادا کرو کیونکہ آدمی کی سب سے افضل صلوٰۃ وہ ہے جو گھر میں ادا کی جائے، فرض صلوات اس سے مستثنیٰ ہیں[6]" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا کہ آپ سنتیں اور نفلیں گھر میں ادا فرماتے تھے الا یہ کہ کوئی عذر پیش آجائے، بالکل ایسے ہی جیسے آپ فرض صلوات مسجد میں ادا فرماتے تھے مگر سفر یا مرض یا کسی ایسی رکاوٹ کے باعث جو مسجد جانے سے مانع ہو بات اور ہوتی۔ فجر کی سنت دیگر نوافل کے مقابلہ میں سخت پابندی سے ادا فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر ہو کہ حضر کسی حال میں اسے نہیں چھوڑتے تھے۔

سنتیں اور نوافل سفر میں

سفر میں آپ تمام سنتوں اور نوافل کے بالمقابل فجر کی سنت اور وتر کی انتہائی سخت پابندی فرماتے تھے۔ حالت سفر میں سوائے ان دونوں کے دائمی سنتیں پڑھنا آپ سے منقول نہیں ہے۔

---

[1] نسائی ۳/۱۹۸ فی صلاۃ اللیل : باب الحث علی الصلاۃ فی البیوت۔ ترمذی (۶۰۴) فی الصلاۃ : باب ماذکر فی الصلاۃ بعد المغرب أنه فی البیت أفضل۔ ابوداؤد (۱۳۰۰) فی الصلاۃ : باب رکعتی المغرب این تصلیان۔ سند میں اسحاق بن کعب مجہول الحال ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں، بایں ہمہ محمود بن لبید کی سابقہ روایت اس کی شاہد ہے جس سے اسے قوت پہنچتی ہے۔ ابن ماجہ (۱۱۶۵) میں رافع بن خدیج کی روایت میں عبد الوہاب بن ضحاک عرضی متروک ہیں، ابوحاتم نے انھیں کاذب کہا ہے۔

[2] بخاری ۳/۴۱ فی التطوع : باب التطوع بعد المکتوبة۔ مسلم (۷۲۹) فی صلاۃ المسافرین : باب فضل السنن الراتبة، مالک ۱/۱۶۶ فی قصر الصلاۃ : باب العمل فی جامع الصلاۃ۔ ابوداؤد (۱۲۵۲)۔ نسائی ۲/۱۱۹۔ ترمذی (۴۳۳) و (۴۳۴)

[3] مسلم (۷۳۰) فی صلاۃ المسافرین : باب جواز النافلة قائما وقاعدا۔

[4] بخاری ۲/۸۳، ۸۴۔ مسلم (۷۲۳) روایت حضرت حفصہ سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صلوٰۃ صبح کے لیے جب مؤذن اذان دیکر خاموش ہو جاتا اور صبح نمودار ہو جاتی تو صلوٰۃ کی اقامت سے پہلے دو ہلکی رکعتیں پڑھتے تھے۔

[5] بخاری ۲/۳۵۴۔ مسلم (۸۸۲) فی الجمعة : باب الصلاۃ بعد الجمعة۔ حدیث عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

[6] بخاری ۱۳/۲۲۶ فی الاعتصام : باب مایکره من کثرة السؤال وفی الجماعة : باب اذا کان بین الامام وبین القوم حائط أو سترة وفی الادب : باب مایجوز من الغضب والشدة لامر الله۔ مسلم (۷۸۱) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب صلاۃ النافلة فی بیته وجوازها فی المسجد۔ حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سفر کر چکا ہوں یہ لوگ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہاں گو احتمال ہے کہ چار کے بجائے دو پڑھنے کے ساتھ ساتھ سنت نہیں پڑھتے تھے مگر ثابت بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا گیا کہ آپ سفر میں ظہر کی سنت پڑھتے ہیں یا نہیں؟ فرمایا: پڑھتا ہوتا تو فرض بھی پوری پڑھتا۔ یہ آپ کا تفقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسافروں کے لیے فرض کی چار رکعتوں میں سے دو کم کر دی ہیں، اگر اس سے پہلے یا بعد کی دونوں رکعتیں (سنت کی) مشروع ہوتیں تو بدرجۂ اولیٰ فرض صلوٰۃ پوری پڑھی جاتی۔

فجر کی سنت اور صلوٰۃ وتر میں مؤکد کون ہے؟

فجر کی سنت اور وتر دونوں صلوات میں مؤکد کون ہے؟ اس بارے میں فقہاء کے دونوں قول ہیں۔ صلوٰۃ وتر کے واجب ہونے میں فقہاء کے اختلاف سے ترجیح کا فیصلہ ممکن نہیں کیونکہ خود فجر کی سنت کے واجب ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو فرماتے سنا ہے کہ فجر کی سنت آغازِ عمل اور صلوٰۃِ وتر خاتمۂ عمل کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنت اور وتر دونوں میں اخلاص کی دونوں سورتیں پڑھتے تھے۔ ان دونوں میں توحید علم و عمل، توحید ارادہ و معرفت اور توحید اعتقاد و نیت کے مضامین جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی سورہ میں عقیدۂ و معرفت کی توحید، رب تعالیٰ کی احدیت جس سے از خود کسی نہ کسی پہلو سے شرک مطلق کی نفی ہو جاتی ہے اور صمدیت (بے نیازی) کا اثبات ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے ان تمام صفات کمال کا اثبات ہوتا ہے جو ہر نقص سے بالاتر ہیں۔ آگے صمدیت، احدیت اور استغناء الٰہی کے لوازم کا اثبات ہے یعنی اللہ کے والد و مولود ہونے اور اس کے کفو کی نفی کی گئی ہے جس سے از خود تشبیہ (مشابہ ہونا) تمثیل (مجسم ہونا) اور تنظیر (نظیر رکھنا) کی نفی ہو گئی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے ہر کمال کا اثبات، ہر نقص کی نفی نیز کمال کے اندر اثباتِ شبیہ، اثباتِ نظیر اور شرک مطلق کی نفی کا مضمون سورہ کے اندر آ گیا ہے۔ یہ توحید الٰہی کے وہ جامع اصول ہیں جنھیں علمی اور اعتقادی اعتبار سے قبول کرنے والا شرک اور گمراہی کے تمام فرقوں سے ممتاز ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کو ثلث قرآن کا درجہ حاصل ہے کیونکہ قرآن کا مدار خبری اور انشائی مضامین پر ہے انشائی مضامین تین طرح کے ہیں۔ امر، نہی، اباحت۔ خبری مضامین دو قسم کے ہیں۔ ایک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات اور احکام کی خبر دی گئی ہے، دوسری میں اس کی مخلوقات کی خبر دی گئی ہے۔ سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ خالصتہً اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کی خبر پر مشتمل ہے اس لیے وہ ثلث قرآن کے مساوی ہوئی اور اپنے پڑھنے والے بندۂ مومن کو علمی شرک سے پاک و صاف کر کے مبرا کر دیتی ہے۔ اس کے بالمقابل سورہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ بندۂ مومن کو نیت و ارادہ اور عمل کے شرک سے پاک و صاف کر کے بے عیب اور خالص کر دیتی ہے۔ علم کا مقام چونکہ عمل سے پہلے ہے، یہی اس کا پیشوا، قائد اور رہبر ہے، عمل پر اسے بالادستی حاصل ہے اور یہی اسے اس کی منزلوں پر پہنچاتا ہے۔ لہٰذا سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثلث قرآن کے مساوی ٹھہری۔ اس سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں وہ تقریباً تواتر کے درجہ کی ہیں۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ربع قرآن کے برابر ہے۔ اس بات کی نشاندہی ترمذی کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس سے مرفوعاً مروی ہے۔ مضمون یہ ہے۔

"اِذَا زُلْزِلَتْ نصف قرآن کے برابر، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثلث قرآن کے برابر اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ربع قرآن کے برابر ہے"[1]

---

[1] ترمذی (۲۸۹۶) فی ثواب القرآن: باب ماجاء فی اذا زلزلت۔ مستدرک حاکم ۱/۵۶۶، سندیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حاکم نے مستدرک میں اس کی روایت کرتے ہوئے اسے صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

چونکہ نفوس انسانی پر ارادی اور عملی شرک کا زیادہ تر غلبہ رہتا ہے اس لیے کہ انسان زیادہ تر اپنی خواہشات نفسانی ہی کا تابع ہوتا ہے۔ شرک عملی کی مضرتوں اور اس کے بے بنیاد ہونے کا علم ہونے کے باوجود اغراض و خواہشات کے چکر میں پڑ کر انسان اسی کا شکار رہتا ہے اور اس کا ازالہ علمی شرک کے مقابلہ میں زیادہ دشوار ہوتا ہے کیونکہ علمی شرک علم اور دلیل وحجت سے دور ہوسکتا ہے۔ فکر و نظر کا مشرک گول شئ کو بہرحال جو کور دائرہ میں دیکھ ہی لیتا ہے مگر اقدام وعمل کا مشرک چونکہ خواہشاتِ نفس کا بندہ ہوتا ہے اس لیے علمی روشنی کے باوجود شرک عمل سے ملوث رہتا ہے اس لیے اس کے ازالہ کے لیے قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے اندر مضامین بہ تاکید اور بتکرار آتے ہیں جس کی مثال سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں نہیں ملتی۔

نیز چونکہ قرآن کے دو حصّے ہیں۔ ایک دنیا اور اس کے احکام و متعلقات اور اس کے اندر واقع ہونے والے امور و معاملات اور افعال مکلّفین وغیرہ سے متعلق ہے۔ دوسرا آخرت اور امور آخرت سے متعلق ہے۔ سورہ اِذَا زُلْزِلَتْ اول تا آخر اسی دوسرے حصہ سے متعلق ہے چنانچہ آخرت اور آخرت میں پیش آنے والے زمین اور اس کے باشندوں کے احوال کا تذکرہ اس کے اندر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ سورہ نصف قرآن کے برابر ہوئی۔ پس یہ حدیث (واللہ اعلم) صحیح ہونے کی زیادہ مستحق ہے۔

طواف کی دونوں رکعتوں میں اسی وجہ سے آپ یہی دونوں سورتیں پڑھتے تھے اور چونکہ دونوں ہی میں اخلاص و توحید کا مضمون ہے لہٰذا انہی سے آپ دن کے کاموں کا افتتاح اور اختتام فرماتے تھے[1] اور حج میں بھی پڑھتے تھے جو اصلاً توحید کا عنوان ہے۔

فجر کی سنت یا تہجّد کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لیٹنا

فجر کی سنت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم داہنی کروٹ لیٹ جاتے تھے۔ یہ صحیحین میں حضرت عائشہ کی حدیث سے ثابت ہے[2]۔ ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث وارد ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوٰۃ صبح سے پہلے جب تم میں سے کوئی دونوں رکعتیں پڑھ لے تو دائیں پہلو لیٹ رہے[3]۔" ترمذی نے اسے حسن صحیح غریب کہا ہے مگر ابن تیمیہ کو فرماتے سنا ہے کہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یمان بن مغیرہ عنزی ضعیف ہیں مگر "قل ھو اللہ احد ثلث قرآن کے برابر ہے" صحیحین میں ہے اور "قل یاَیھا الکٰفرون ربع قرآن کے برابر ہے"۔ اس کی تخریج حاکم نے مستدرک ۱/۵۶۶ اور طبرانی نے معجم کبیر ۳/۲۰۳ میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث سے کی ہے۔ سند میں ضعف ہے مگر ترمذی (۲۸۹۷) اور مسند احمد ۳/۱۴۶، ۱۴۷ میں حضرت انس سے اس کی ایک نظیر موجود ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے، بایں ہمہ اس میں سلمہ بن وردان سیٔ الحفظ ہیں۔ صغیر طبرانی ص ۳۲ میں اس کی ایک اور نظیر حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت میں ہے۔ اس طرح حدیث صحت اور قوت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔

[1]۔ طواف کی دونوں رکعتوں میں انھیں پڑھنے کی روایت مسلم نے (۱۲۱۸) فی صفۃ حجۃ النبی میں حضرت جابر سے، فجر کی سنت میں پڑھنے کی مسلم (۷۲۶)، ابوداؤد (۱۲۵۶) اور نسائی ۲/۱۵۵، ۱۵۶ نے حضرت ابوہریرہ سے اور وتر میں پڑھنے کی ترمذی (۴۶۲) اور نسائی ۳/۱۳۶ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے کی ہے۔ شواہد کے اعتبار سے سند حسن ہے۔ نسائی نے ۳/۲۴۵ میں اس کی تخریج حضرت عائشہ سے کی ہے، سند صحیح ہے۔ حاکم ۱/۳۰۵ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[2]۔ بخاری ۳/۳۵ فی التطوع : باب الضجعۃ علی الشق الایمن بعد رکعتی الفجر۔ مسلم (۷۳۶) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔ ابوداؤد (۱۲۶۲) فی الصلاۃ : باب الاضطجاع بعدھا۔ مسند احمد ۶/۱۲۱ و ۱۳۳۔ ابن ماجہ (۱۱۹۸) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الضجعۃ فی الوتر بعد رکعتی الفجر۔

[3]۔ ترمذی (۴۲۰) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الاضطجاع بعد رکعتی الفجر۔ مسند احمد ۲/۴۱۵۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ حدیث غلط ہے، صحیح نہیں ہے۔ ثابت آپ سے صرف آپ کا فعل ہے حکم نہیں۔ عبدالواحد بن زیاد اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں جنھوں نے غلطی کی ہے ابن حزم اور ان کے پیرو اسے واجب قرار دیتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے ابن حزم اس شخص کی صلوٰۃ باطل قرار دیتے ہیں جو فجر کی سنت کے بعد نہ لیٹے۔ تمام امت کے مقابلہ میں یہ ان کا تفرد ہے۔ میں نے ان کے بعض اصحاب کی ایک کتاب دیکھی ہے جس میں انھوں نے ان کے مسلک کی خوب خوب تائید کی ہے۔ "المصنف"[1] میں عبدالرزاق نے معمر سے، انھوں نے ایوب سے، انھوں نے ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ ابوموسیٰ، رافع بن خدیج اور انس مالک رضی اللہ عنہم فجر کی دونوں رکعتوں کے بعد لیٹتے تھے اور اس کا حکم دیتے تھے۔ اور وہ معمر سے، وہ ایوب سے، وہ نافع سے یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر ایسا نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے لیے سلام کر لینا کافی ہے۔ وہ ابن جریج سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا مجھے اس نے بتایا جسے میں سچا سمجھتا ہوں کہ حضرت عائشہ فرمایا کرتی تھیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لیٹنا کچھ سنت کے طور پر نہ تھا بلکہ شب بھر عبادت کرنے سے تھک جاتے تھے لہٰذا ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر جب لوگوں کو داہنی کروٹ لیٹے ہوئے دیکھتے تو کنکریاں مارتے۔ ابن ابی شیبہ نے ابوصدیق ناجی سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے فجر کی دونوں رکعتوں کے بعد کچھ لوگوں کو لیٹے ہوئے دیکھا تو انھیں منع کرنے کے لیے آدمی بھیجا۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ہم سنت پر عمل کر رہے ہیں تو حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا "واپس جا کر انھیں بتا دو کہ بدعت ہے" ابومجلز فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اس کے متعلق پوچھا تو فرمایا "۔۔۔۔ شیطان تم سے کھیلتا ہے" حضرت عبداللہ بن عمر کا ارشاد ہے "آخر کیا بات ہے؟ آدمی دونوں رکعتیں پڑھنے کے بعد گدھے کی طرح زمین پر لوٹنے لگتا ہے"

اس سلسلہ میں دو جماعتوں نے غلو سے کام لیا ہے، ایک تیسری جماعت نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اہل ظاہر کی ایک جماعت نے اسے واجب اور چھوڑ دینے پر صلوٰۃ کو باطل قرار دیا ہے۔ یہ ابن حزم اور ان کے موافقین کا مسلک ہے۔ فقہاء کی ایک جماعت نے اسے مکروہ اور بدعت کہا ہے، امام مالک وغیرہ نے درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ چنانچہ آرام کے لیے اگر کوئی لیٹے تو ان کے نزدیک کوئی حرج نہیں مگر سنت سمجھ کر لیٹنا ان کے نزدیک مکروہ ہے۔ ایک گروہ نے اسے مطلقاً مستحب قرار دیا ہے۔ خواہ آرام کے لیے ہو یا نہ ہو انھوں نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جن لوگوں نے اسے مکروہ کہا ہے کچھ تو حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہ جیسے صحابہ کے آثار سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عمر لیٹنے والے کو کنکری مارتے تھے۔ اور کچھ لوگوں نے اس بات کا سرے سے انکار کر دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنت کے بعد لیٹتے تھے، ان کے مطابق صحیح یہ ہے کہ آپ وتر کے بعد اور فجر کی دونوں رکعتوں سے قبل لیٹتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے[2]۔ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی حدیث ابن شہاب سے مختلف طور پر مروی ہے۔ چنانچہ امام مالک کی ان سے روایت یہ ہے "پس جب آپ فارغ یعنی قیام لیل سے فارغ ہو جاتے تو داہنی کروٹ لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن آتا تو دو ہلکی رکعتیں پڑھتے"[3]۔ اس روایت کے مطابق اس بات کی صراحت ہے کہ آپ سنت فجر سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ابوداؤد (۱۲۶۱) فی الصلاۃ : باب الاضطجاع بعد رکعتی الفجر۔ ابن ماجہ (۱۱۹۹) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الضجعۃ بعد الوتر و بعد رکعتی الفجر۔ سند حسن ہے۔ ابن خزیمہ (۱۱۲۰) اور ابن حبان (۶۱۲) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[1] دیکھیے المصنف ۳/ ۴۲، ۴۴۔

[2] اس کی تخریج پیشتر گزر چکی ہے۔

(حاشیہ "۳" اگلے صفحہ پر)

پیشتر لیٹتے تھے۔ دوسروں نے ابن شہاب سے جو روایت کی ہے وہ یہ ہے "اذان دے کر مؤذن خاموش ہو جاتا اور فجر کا وقت بالکل روشن ہو جاتا اور مؤذن آپ کے یہاں آتا تو آپ اٹھتے، دو ہلکی رکعتیں پڑھتے پھر داہنی کروٹ لیٹ جاتے"، فیصلہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ جب ابن شہاب کے شاگرد مختلف الروایہ ہیں تو امام مالک کا قول مان لینا چاہیے کیونکہ سب میں یہی زیادہ ثابت الرائے اور احفظ ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ حق مخالفین مالک کے ساتھ ہے۔ ابوبکر خطیب فرماتے ہیں، مالک نے زہری سے، انھوں نے عروہ سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب کی گیارہ رکعتیں پڑھتے ان میں ایک رکعت الگ پڑھ کر تمام صلوات کو طاق کر دیتے تھے، فارغ ہو کر داہنی کروٹ لیٹ جاتے تھے، حتیٰ کہ مؤذن آتا تو دو ہلکی رکعتیں پڑھتے[۱] امام مالک کے خلاف روایت کرنے والے عقیل، یونس، شعیب، ابن ابی ذئب اور اوزاعی وغیرہ نے زہری سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دونوں رکعتیں پڑھ کر داہنی کروٹ لیٹ جاتے حتیٰ کہ مؤذن آتا تو اس کے ساتھ نکلتے۔ مالک کے مطابق فجر کی دونوں رکعتوں سے پہلے اور بقیہ پوری جماعت کے مطابق ان دونوں کے بعد آپ لیٹتے تھے۔ لہٰذا علماء نے فیصلہ کے طور پر مالک کو غلط اور دوسروں کو صحیح قرار دیا ہے۔[۲]

ابوطالب فرماتے ہیں میں نے احمد سے کہا ہم سے ابوصلت نے بیان کیا، انھوں نے ابوکدینہ سے، انھوں نے سہیل بن ابی صالح سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ فجر کی دونوں رکعتوں کے بعد لیٹ رہے، امام احمد نے فرمایا کہ شعبہ نے اسے مرفوعاً نہیں بیان کیا ہے، میں نے کہا اگر کوئی نہ لیٹے تو کوئی حرج ہے؟ فرمایا: نہیں، حضرت عائشہ اسے ثابت کرتی ہیں، اور عبداللہ بن عمر اس کا انکار کرتے ہیں۔ خلال فرماتے ہیں کہ مروزی نے ہمیں بتایا کہ ابوعبداللہ فرماتے ہیں: ابوہریرہ کی حدیث لائق حجت نہیں ہے میں نے کہا کہ اعمش اسے ابوصالح سے اور وہ ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا عبدالواحد اسے تنہا روایت کرتے ہیں۔ ابراہیم بن حارث فرماتے ہیں: ابوعبداللہ سے جب فجر کی دونوں رکعتوں کے بعد لیٹنے سے متعلق سوال ہوا تو فرمایا "میں ایسا نہیں کرتا مگر کوئی کرے تو بہتر ہے"۔ پس اگر عبدالواحد بن زیاد عن اعمش عن ابی صالح کی حدیث صحیح ہوتی تو ان کے نزدیک اس کا کم سے کم درجہ استحباب کا ہوتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ نے دونوں طریقے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ کبھی آپ بعد از فجر اور کبھی بعد از وتر لیٹتے تھے۔ یہ اختلاف کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ ہے تو یہ مباح۔ واللہ اعلم۔

داہنی کروٹ آپ کے لیٹنے میں ایک راز ہے، وہ یہ ہے کہ دل بائیں جانب ہوتا ہے بائیں پہلو لیٹنے پر آدمی کو نیند گہری آتی ہے اس لیے کہ اسے آرام ملتا ہے لیکن داہنی کروٹ آرام کی حالت نہیں ہوتی اس صورت میں قلب پریشان

---

[۳]۔ (حاشیہ "۳" صفحہ گذشتہ) موطا امام مالک ۱/۱۲۰ فی صلاۃ اللیل: باب صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الوتر۔ ابن شہاب کی روایت کے الفاظ ان کے یہاں یہ ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب کی گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں ایک رکعت پڑھ کر وتر فرما دیتے تھے۔ فارغ ہو کر داہنی کروٹ لیٹ جاتے تھے"۔ مسلم (۷۳۶) دوسری روایت بھی اس میں موجود ہے۔ رقم (۷۳۶)، (۱۲۲)۔

---

[۱]۔ موطا امام مالک ۱/۱۲۰ فی صلاۃ اللیل: باب صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الوتر۔ مسلم (۷۳۶) فی صلاۃ المسافرین: باب صلاۃ اللیل۔

[۲]۔ الفتح ۳/۳۶ میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مسلم نے بطریق مالک عن الزهری عن عروۃ عن عائشۃ آپ کے بعد از وتر لیٹنے کی جو روایت کی ہے اس کے خلاف اصحاب زہری عروہ سے روایت کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے بعد از فجر لیٹنے کی روایت کی ہے اور یہ حدیث محفوظ ہے۔ جو لوگ اس حدیث سے عدم استحباب پر استدلال کرتے ہیں ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔

اور راحت طلب ہوگا اور گہری نیند نہیں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اطباء راحت اور عمدہ نیند کے لیے بائیں کروٹ سونے کا مشورہ دیتے ہیں، مگر شارع علیہ السلام کو پسند داہنی کروٹ سونا ہے تاکہ نیند سے بوجھل ہو کر قیام لیل سے غفلت نہ ہو سکے۔ پس داہنی کروٹ سونا قلب کے لیے مگر بائیں پہلو سونا بدن کے لیے زیادہ مفید ہے۔ واللہ اعلم۔

قیام لیل کے باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ

متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے کہ صلوٰۃ تہجد آپ پر فرض تھی یا نہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء: ۷۹) اور رات میں تہجد پڑھو یہ تمھارے لیے نفل ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آیت میں صراحت سے تہجد کے عدم وجوب کی دلیل ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس میں آپ کو تہجد کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مزمل میں بھی یہ حکم موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ○ (المزمل: ۱-۲) اے کمبل کے اوڑھنے والے رات کے اکثر حصے میں قیام کر۔

کہیں یہ حکم منسوخ بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد (نَافِلَةً لَّكَ) یعنی تمھارے لیے نفل ہے، سے مراد اگر نفل ہے تو اس تخصیص کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اصل میں نافلہ سے مراد زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ اضافہ یا مطلق زیادتی نفل کی دلیل نہیں بن سکتی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً (الانبیاء: ۷۲) اور ہم نے اسے اسحٰق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید۔

یعنی بیٹے پر ایک اضافہ بھی۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تہجد میں بھی نافلہ آپ کے درجات اور اجر میں ایک اضافہ ہے، لہٰذا آپ کو اس سے خصوصیت دی گئی کیونکہ دوسروں کے حق میں قیام لیل مباح ہے اور بدیوں کا کفارہ ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں لہٰذا آپ جو کچھ کرتے ہیں درجات کی زیادتی اور مراتب کی بلندی کے لیے ہے اور آپ کے غیر کا عمل کفارہ کے لیے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ تہجد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نفل اس لیے کہا گیا کیونکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف تھے لہٰذا آپ کی طاعت نفل یعنی ثواب میں زیادتی ہے اور وہ غیر کے لیے کفارۂ ذنوب ہے۔ ابن منذر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "ہم سے یعلی بن ابی عبید نے، انھوں نے کہا ہم سے حجاج نے، انھوں نے کہا ہم سے ابن جریج نے حدیث بیان کی، وہ عبداللہ بن کثیر سے، وہ مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ فرض کے سوا ساری صلوات نافلہ ہیں کیونکہ گناہوں کے کفارہ میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ لوگوں کے لیے نوافل نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں، تمام لوگ فرض صلوات کے سوا جو عمل کرتے ہیں وہ سب گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں[1]۔

ہم سے محمد بن نصر نے، انھوں نے کہا ہم سے عبداللہ نے، انھوں نے کہا ہم سے عمرو نے بیان کیا وہ سعید سے، وہ قبیصہ سے، وہ سفیان سے، وہ ابو عثمان سے، وہ حسن سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ" کے بارے میں روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شب کی نافلہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے[2]۔ ضحاک کا قول انھوں نے نقل کیا ہے

---

[1] سیوطی نے الدر المنثور ۴/۱۹۶ میں اس کا ذکر کیا ہے اور آگے مزید اس کی نسبت ابن جریر ۱۵/۱۴۳ ۔

[2] سیوطی نے الدر المنثور ۴/۱۹۶ میں اس کا ذکر محمد بن نصر سے کیا ہے۔

کہ نافلہ خاص کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔

سُلیم بن حیان نے ذکر کیا ہے کہ ہم سے ابو غالب نے، انھوں نے کہا ہم سے ابو امامہ نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وضو ٹھیک ٹھیک کروگے تو تمھاری بخشش ہوگی اور صلوٰۃ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگے تو یہ صلوٰۃ تمھارے لیے فضیلت واجر کا موجب ہوگی۔ ایک شخص نے پوچھا "ابو امامہ! یہ صلوٰۃ کیا اس کے حق میں نافلہ ہوگی؟ فرمایا نہیں، نافلہ تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ اس کے لیے کیسے ہوگی جب کہ ہمیشہ گناہوں اور خطاؤں کے سمندر میں غرق رہتا ہے۔ البتہ فضیلت واجر کا باعث ضرور ہوگی [۱]

مقصد یہ ہے کہ آیت میں نافلہ سے مراد مستحب اور مندوب جیسی وہ بات نہیں جس کا فعل وترک دونوں جائز ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد اضافۂ درجات ہے۔ یہ فرض اور مستحب کے درمیان ایک قدر مشترک ہے، لہٰذا ارشاد باری تعالیٰ (نَافِلَةً لَّكَ) امر برائے وجوب کی نفی نہیں کرتا۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل خصوصیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر انشاء اللہ آئے گی۔

حضر یا سفر کسی حال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی صلوٰۃ نہیں چھوڑتے تھے۔ نیند کا غلبہ یا کوئی تکلیف ہوتی تو دن ہی میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سنا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وقت فوت ہوجانے پر وتر کی قضا نہیں ہے۔ اس کی مثال تحیۃ المسجد، صلوٰۃ کسوف اور صلوٰۃ استسقاء وغیرہ ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ شب کی آخری صلوٰۃ وتر ہوجائے۔ جیسے کہ مغرب کی صلوٰۃ دن کی آخری صلوٰۃ ہے۔ پس جب رات گزرجائے اور صلوٰۃ صبح بھی پڑھی جاچکی ہو تو وتر کا وقت نہیں رہتا۔ شیخ الاسلام کا یہی مفہوم ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ابوسعید خدری کی روایت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "سو جانے سے یا بھول کر جس کی وتر فوت ہوجائے تو وہ صبح کو یا جب بھی یاد پڑے پڑھ لے" [۲] مگر اس حدیث کے اندر چند علتیں ہیں۔

۱۔ یہ روایت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی ہے جو ضعیف ہیں [۳]

۲۔ اس سلسلہ میں صحیح یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مرسلاً بیان کی ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں اس کا مرسل ہونا زیادہ ثابت ہے۔

۳۔ ابن ماجہ نے ابوسعید کی حدیث کے بعد محمد بن یحییٰ کا بیان نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحیح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے "صبح سے قبل وتر پڑھ لو" [۴] فرماتے ہیں یہ حدیث عبدالرحمٰن کی حدیث کے کمزور ہونے کی دلیل ہے۔

تہجد کی صلوٰۃ آپ گیارہ یا تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ سے یہی مروی ہے۔

---

[۱] مسند احمد ۵/۲۵۵، سند حسن ہے۔ سیوطی نے الدرالمنثور ۴/۱۹۶، ۱۹۷ میں اس کا ذکر کیا ہے اور آگے مزید اس کی نسبت طیالسی، ابن نصر، طبرانی، ابن مردویہ، شعب الایمان للبیہقی اور تاریخ خطیب کی جانب کیا ہے۔ اور مطبوعہ نسخہ میں سُلیم بن حیان کے بجائے سلیمان بن حبان ہے جو تحریف ہے۔

[۲] ابوداؤد (۱۴۳۱) فی الصلاۃ، باب فی الوتر قبل النوم، سند صحیح ہے۔ ابن ماجہ (۱۱۸۸) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فیمن ینام عن وترأو نسیہ۔ ترمذی (۴۶۵) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی الرجل ینام عن الوتر أو ینساہ۔ مسند احمد ۳/۴۱، ۴۴۔ بیہقی ۲/۴۸۰۔ حاکم ۱/۳۰۲ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[۳] اس علت کا تعلق صرف ترمذی اور ابن ماجہ کی سند سے ہے۔ ابوداؤد، حاکم اور بیہقی کے یہاں یہ روایت ابوغسان۔ محمد بن مطرف مدنی۔ زید بن اسلم۔ عطا بن یسار۔ ابوسعید خدری سے ہے اور یہ سند صحیح ہے۔

[۴] ترمذی (۴۶۶)۔

[۵] ابن ماجہ (۱۱۸۹) فی اقامۃ الصلاۃ: باب من نام عن وترہ أو نسیہ۔ مسلم (۷۵۴) فی صلاۃ المسافرین: باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔

صحیحین میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان و غیر رمضان کسی مہینہ میں بھی گیارہ[۱۱] رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھتے تھے[۱]۔ صحیحین میں انہی سے ایک اور روایت ہے کہ شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ[۱۳] رکعتیں پڑھتے تھے، پانچ رکعتیں پڑھ کر انھیں وتر کرتے تھے۔ ان پانچوں میں صرف آخر رکعت کے اندر بیٹھتے تھے[۲]۔ صحیح حضرت عائشہ کی پہلی ہی روایت ہے۔ گیارہ[۱۱] سے اوپر دو رکعتیں فجر کی ہیں، اس کی وضاحت خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دونوں رکعتوں کے ساتھ تیرہ[۱۳] رکعتیں پڑھتے تھے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس کا تذکرہ کیا ہے[۳]۔ بخاری اس حدیث کے باب میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، فجر کی اذان سنتے تو پھر دو[۲] ہلکی رکعتیں پڑھتے تھے[۴]۔ صحیحین میں قاسم بن محمد سے روایت ہے، فرماتے ہیں: حضرت عائشہ کو فرماتے سنا ہے کہ شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ دس[۱۰] رکعتیں ہوتی تھیں، ایک رکعت سے انھیں وتر فرماتے تھے، پھر دو رکعتیں فجر کی پڑھتے تھے، اس طرح یہ تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں[۵]۔ پچھلی حدیث میں تیرہ رکعتوں کا جو ذکر آیا ہے یہ بیان اس کی کھلی ہوئی توضیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایتوں میں اختلاف ہے۔ چنانچہ صحیحین کے اندر ابو جمرہ کی روایت صلوٰۃ لیل کے بارے میں آپ سے یہ ہے۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شب کی صلوٰۃ تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں[۶]“ مگر انہی حضرت ابن عباس سے یہ تشریح بھی ملتی ہے کہ دو رکعتیں ان میں فجر کی ہوتی تھیں۔ شعبی فرماتے ہیں ”میں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ لیل کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا تیرہ رکعتیں، آٹھ تہجد کی، انھیں تین رکعتوں کے ذریعہ وتر کرتے اور دو رکعتیں قبل از صلوٰۃ فجر۔ صحیحین میں کریب حضرت ابن عباس سے وہ حدیث روایت کرتے ہیں جس میں وہ اپنی خالہ میمونہ بنت حارث کے یہاں شب گزارنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: آپ نے تیرہ رکعتیں پڑھیں پھر سو گئے حتیٰ کہ ناک سے آواز آنے لگی اور جب فجر طلوع ہوئی تو دو ہلکی رکعتیں پڑھیں۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے کہ آپ نے دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو رکعتیں پڑھیں پھر انھیں وتر کیا پھر لیٹ گئے حتیٰ کہ مؤذن آیا تو اٹھ کر دو ہلکی رکعتیں پڑھیں، پھر صلوٰۃ صبح کے لیے باہر تشریف لے گئے[۷]۔ گیارہ رکعتوں کی حد تک تو سب کا اتفاق

۱۔ بخاری ۳/۲۷ فی التہجد : باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل فی رمضان وغیرہ، وفی صلاۃ التراویح: باب فضل من قام رمضان، وفی الانبیاء : باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تنام عینہ ولا ینام قلبہ۔ مسلم (۷۳۸) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل وأن الوتر رکعۃ۔ ترمذی (۴۳۹) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی وصف صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل۔ نسائی ۳/۲۳۴ فی قیام اللیل : باب کیف الوتر بثلاث۔

۲۔ مسلم (۷۳۷) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔ بخاری ۳/۱۶ فی التہجد : باب کیف صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکم کان یصلی باللیل۔ بخاری میں حضرت عائشہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں ”کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی من اللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ منہا الوتر ورکعتا الفجر“۔

۳۔ (۷۳۷) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔ بخاری نے جیسا کہ پیشتر کی حدیث میں آیا ہے اسی مفہوم میں روایت کی ہے۔

۴۔ بخاری ۳/۳۷ فی التہجد : باب ما یقرأ فی رکعتی الفجر۔

۵۔ انہی الفاظ میں مسلم نے (۷۳۸)، (۱۲۸) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل روایت کی ہے۔

۶۔ بخاری ۳/۱۶ فی التہجد : باب کیف صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکم کان یصلی باللیل۔ مسلم (۷۶۴) فی صلاۃ المسافرین : باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ۔ ترمذی (۴۴۲) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی وصف صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل۔

۷۔ بخاری ۳/۵۷، ۵۸ فی أبواب العمل فی الصلاۃ : باب استعانۃ الید فی الصلاۃ اذا کان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہے۔ مگر دو آخری رکعتوں کے باب میں اختلاف ہے کہ آیا یہ دونوں فجر کی دونوں رکعتیں ہیں یا کوئی اور صلوٰۃ۔ اگر یہ تعداد فرض صلوات اور سنن مؤکدہ جن کی آپ پابندی فرماتے تھے کے ساتھ شامل کر دی جائیں تو شب و روز کی کل دائمی صلوٰۃ چالیس[۴۰] رکعت ہو جاتی ہے، ان کی آپ ہمیشہ پابندی کرتے تھے۔ سترہ فرض، دس یا بارہ سنت مؤکدہ، گیارہ یا تیرہ صلوٰۃ تہجد۔ مجموعہ چالیس[۴۰] رکعتیں۔ اس سے زائد عارضی ہوا کرتی تھیں نہ کہ دائمی۔ مثلاً صلوٰۃ فتح آٹھ رکعتیں[۱]، سفر سے واپسی پر چاشت کی صلوٰۃ، بوقت زیارت صلوٰۃ، تحیۃ المسجد وغیرہ۔ لہٰذا بندوں کو چاہیے کہ وہ تادم مرگ ہمیشہ مذکور وظیفہ کی پابندی کریں۔ شب و روز جس دروازہ کو چالیس بار کھٹکھٹایا جائے وہ کتنی جلد کھل سکتا ہے اور جس درخواست کو شب و روز چالیس بار پیش کیا جائے وہ کس قدر جلد شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واللہ المستعان۔

صلوٰۃِ شب، وتر اور آغازِ شب کی صلوٰۃ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عشاء کی صلوٰۃ پڑھی اور اس کے بعد میرے یہاں تشریف لائے، چار یا چھ رکعتیں پڑھیں[۲] اس کے بعد بستر پر تشریف لائے "۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے آپ کے یہاں جو رات بسر کی تھی اس کا وہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ " آپ نے عشاء پڑھی پھر گھر تشریف لائے، پھر صلوٰۃ پڑھی پھر سو گئے[۳] "۔ ابوداؤد نے ان دونوں کی روایت کی ہے۔ بیدار ہو کر آپ مسواک کرتے پھر ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ خواب سے بیداری کے بعد جو دعا پڑھتے تھے اس کا ذکر آچکا ہے۔ پھر وضو کرتے پھر دو ہلکی رکعتیں پڑھتے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت ہے " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ صفحہ گذشتہ) من أمر الصلاة، وفي العلم : باب السمر في العلم، وفي الوضوء : باب التخفيف في الوضوء، وباب قرأة القرآن بعد الحدث وغيره، وفي الجماعة : باب يقوم عن يمين الامام بحذائه سواء اذا كانا اثنين، وباب إذا لم ينو الامام أن يؤم ثم جاء قوم فأمهم، وباب إذا قام الرجل عن يسار الامام وحوله الامام خلفه إلى يمينه تمت صلاته، وباب ميمنة المسجد والامام، وفي صفة الصلاة : باب وضوء الصبيان، وفي الوتر : باب ماجاء في الوتر، وفي تفسير سورة آل عمران : باب قوله (إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) وباب قوله (اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ) وباب : (رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ) وباب : رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ، وفي اللباس : باب الذوائب، وفي الادب : باب رفع البصر الى السماء، وفي الدعوات : باب الدعاء اذا انتبه بالليل، وفي التوحيد : باب ماجاء في تخليق السماوات والارض وغيرها من الخلائق۔ مسلم (۷۶۳) في صلاة المسافرين : باب الدعاء في صلاة الليل۔ مؤطا امام مالک ۱/۱۲۱، ۱۲۲ في صلاة الليل : باب صلاة النبي صلى الله عليه وسلم في الوتر۔

۱۔ بخاری ۳/۴۳۔ مسلم ۱/۴۹۷ (۳۳۶) عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے، فرماتے ہیں : ام ہانی کے سوا کسی نے ہم سے بیان نہیں کیا کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے۔ ام ہانی فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر آئے، غسل کیا اور آٹھ رکعتیں پڑھیں، ان سے ہلکی صلوٰۃ میں نے نہیں دیکھی، البتہ آپ رکوع و سجود مکمل فرماتے تھے۔

۲۔ ابوداؤد (۱۳۰۳) في الصلاة : باب الصلاة بعد العشاء۔ سند میں مقاتل بن بشیر العجلی ہیں جنھیں ابن حبان کے علاوہ کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے اور باقی رجال ثقہ ہیں۔

۳۔ ابوداؤد (۱۳۵۷) في الصلاة : باب في رفع الصوت بالقرأة في صلاة الليل۔ سند صحیح ہے، اصل بخاری اور مسلم کے یہاں رات گزارنے والی حدیث میں ہے۔ جس کی تخریج گزر چکی ہے۔

جب شب میں کھڑے ہوتے تو صلوٰۃ کا آغاز دو ہلکی رکعتوں سے کرتے تھے"[1] حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کے مطابق آپ نے اس کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے "جب کوئی شب میں صلوٰۃ کے لیے کھڑا ہو تو ابتدا دو ہلکی رکعتوں سے کرے" یہ مسلم کی روایت ہے[2] کبھی آدھی رات کو، کبھی کچھ پہلے، کبھی کچھ بعد کو صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مرغ نے بانگ دی تو اس وقت اٹھے۔ مرغ بالعموم شب کے نصف ثانی میں بولتا ہے۔ کبھی اپنا وظیفہ کئی حصوں میں مگر اکثر مسلسل پڑھتے تھے۔ کئی حصوں میں پڑھنے کی روایت حضرت عبداللہ بن عباس نے آپ کے یہاں شب بسری والی حدیث میں کی ہے۔ فرماتے ہیں: آپ بیدار ہوئے، مسواک کیا اور آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آل عمران : ۱۹۰) پڑھتے ہوئے وضو فرمایا۔ مذکورہ آیتیں ختم سورہ تک پڑھیں، پھر اٹھ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ ان میں قیام، رکوع اور سجدہ لمبا رہا پھر صلوٰۃ سے فارغ ہو کر سو گئے حتیٰ کہ ناک سے آواز آنے لگی، اس طرح تین مرحلوں میں چھ رکعتیں پڑھیں۔ ہر دو رکعت پر مسواک اور وضو کرتے اور مذکورہ آیات کی تلاوت فرماتے، آخر میں تین رکعتیں پڑھ کر سابقہ رکعتوں کو وتر کیا۔ اب مؤذن نے اذان دی، چنانچہ آپ یہ دعا پڑھتے ہوئے صلوٰۃ کے لیے نکلے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ مِنْ خَلْفِیْ نُوْرًا وَّمِنْ اَمَامِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا، اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

اے اللہ! میرے قلب میں نور، میری زبان میں نور، میرے کان میں نور، میری آنکھ میں نور پیدا فرما۔ میرے پیچھے نور، میرے آگے نور، میرے اوپر نور، میرے نیچے نور بنا دے۔ اے اللہ! مجھے نور عطا فرما۔

مسلم نے اس کی روایت کی ہے[3] حضرت ابن عباس نے حضرت عائشہ کی طرح آپ کی دو ہلکی افتتاحی رکعتوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ آپ کا عمل یا تو کبھی یہ رہا اور کبھی وہ رہا یا پھر حضرت عائشہ کو جو کیفیت یاد رہی وہ حضرت ابن عباس کو یاد نہ رہی۔ یہی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ ہمیشہ آپ کی صحبت میں رہیں انھیں آپ کے معمول کا زیادہ خیال رہتا نیز تمام انسانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل کی جو خبر انھیں ہو سکتی ہے دوسروں کو نہیں اور پھر حضرت عبداللہ بن عباس کا مشاہدہ تو صرف اسی شب کا تھا جس میں وہ اپنی خالہ کے یہاں سوئے تھے۔ قیام لیل کا کوئی پہلو ہو اگر اس میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ میں اختلاف ہو تو حضرت عائشہ ہی کی بات مانی جائے گی۔

شب میں آپ کی صلوٰۃ اور وتر کی کئی شکلیں ہوتی تھیں۔

پہلی شکل: جس کا ذکر اوپر حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں آچکا ہے۔

دوسری شکل: جس کا تذکرہ حضرت عائشہ نے فرمایا ہے کہ دو ہلکی رکعتوں سے اپنی صلوٰۃ کی ابتدا فرماتے تھے پھر گیارہ رکعتیں پوری کرتے تھے، ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے، ایک رکعت پڑھ کر وتر کر دیتے تھے۔

تیسری شکل: دوسری قسم کی طرح تیرہ رکعتیں۔

چوتھی شکل: آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، ہر دو رکعت پر سلام پھیرنے پر پانچ مسلسل رکعتوں کے ذریعہ جن کے آخر میں بیٹھتے تھے جفت رکعتوں کو وتر کر دیتے تھے[4]

---

[1] مسلم (۷۶۷) فی صلاۃ المسافرین : باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ۔ مسند احمد ۶/ ۳۰۔
[2] مسلم (۷۶۸)۔ مسند احمد ۲/ ۳۹۹۔
[3] مسلم (۷۶۳) فی صلاۃ المسافرین : باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ۔ [4] مسلم (۷۳۷)، ترمذی (۴۹۵) حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

پانچویں شکل :- نو رکعتیں۔ آٹھ مسلسل پڑھتے، صرف آٹھویں رکعت میں بیٹھتے، اللہ کے ذکر اور حمد و دعا کے بعد اٹھ جاتے، سلام نہیں پھیرتے پھر نویں رکعت پڑھتے، بیٹھتے، تشہد پڑھتے اور سلام پھیرتے اس کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے[1]

چھٹی شکل :- سات رکعتیں مذکورہ بالا نو رکعتوں کی طرح پڑھتے پھر اس کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

ساتویں شکل :- دو دو کر کے پڑھتے تھے پھر تین رکعتیں پڑھ کر وتر کر دیتے تھے۔ ان کے درمیان فصل نہیں کرتے تھے۔

امام احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ تین رکعتوں سے وتر کرتے تھے۔ ان تینوں کے درمیان فصل پیدا نہیں کرتے تھے[2] نسائی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے[3] لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "تین رکعتیں وتر نہ پڑھو، پانچ یا سات پڑھو، مغرب کی صلوٰۃ کی مشابہت اختیار نہ کرو[4]" دارقطنی نے اس کے تمام راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ مہنا کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ سے پوچھا "وتر کے بارے میں آپ کا کیا مذہب ہے؟ دو رکعتوں پر سلام پھیر دیتے ہیں؟ فرمایا "ہاں" میں نے کہا: کیوں؟ فرمایا "اس لیے کہ اس سلسلہ میں جو احادیث مروی ہیں وہ زیادہ قوی ہیں اور بکثرت دو رکعتوں کے باب میں آئی ہیں۔ زہری عروہ سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں پر سلام پھیرا[5] حرب کہتے ہیں امام احمد سے وتر کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا دونوں رکعتوں پر سلام پھیر دیں گے، اگر نہ پھیرا تو مجھے امید ہے کوئی نقصان نہ ہوگا، مگر سلام پھیر دینا زیادہ ثابت ہے۔ ابو طالب فرماتے ہیں "میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا کہ وتر کے باب میں آپ کا مدار کس حدیث پر ہے؟ فرمایا "تمام احادیث میرے پیش نظر ہیں، پانچ رکعتیں بھی جن کے آخر میں بیٹھا جائے گا، سات رکعتیں بھی جن کے آخر میں بیٹھا جائے گا" حضرت عائشہ سے زرارہ کی روایت کے مطابق نو رکعتیں، آٹھویں رکعت میں بیٹھیں گے[6] مگر اکثر اور قوی تر حدیثیں ایک رکعت کے باب میں ہیں، لہذا میرا یہی مذہب ہے۔ میں نے کہا حضرت ابن مسعود تین رکعتوں کے قائل ہیں۔ فرمایا "ہاں انھوں نے ایک رکعت کے بارے میں حضرت سعد پر نکتہ چینی

۱۔ مسلم (۷۴۶)۔

۲۔ مسند احمد ۶/ ۱۵۵، ۱۵۶۔ حدیث یہ ہے "حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عشاء کی صلوٰۃ سے فارغ ہوتے تو گھر آتے پھر دو رکعتیں پڑھتے، پھر اس کے بعد دو رکعتیں ان سے لمبی پڑھتے، پھر تین پڑھ کر وتر کر دیتے، ان تینوں کے درمیان فصل پیدا نہیں کرتے، پھر بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے، بیٹھ کر رکوع کرتے، بیٹھے بیٹھے سجدہ کرتے، سند میں یزید بن یعفر کے بارے میں ذہبی نے المیزان میں کہا ہے کہ حجت نہیں ہیں، دارقطنی نے انھیں معتبر کہا ہے یعنی متابعت میں ورنہ لین الحدیث ہیں۔

۳۔ نسائی ۳/ ۲۳۴ فی صلاۃ اللیل : باب کیف الوتر بثلاث، حاکم ۱/ ۳۰۴۔ دارقطنی ص ۱۷۵۔ طحاوی ۱/ ۲۸۰۔ بیہقی ۳/ ۳۱ سند صحیح ہے، نووی شرح المہذب ۴/ ۷ میں فرماتے ہیں کہ نسائی نے اس کی روایت سند حسن سے کی ہے اور بیہقی نے سنن کبیر میں سند صحیح سے۔

۴۔ ابن حبان (۶۸۰) دارقطنی ۲/ ۲۴۔ طحاوی ص ۱۷۲۔ حاکم ۱/ ۳۰۴ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ بیہقی ۳/ ۳۱ دارقطنی فرماتے ہیں اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں اس کے تمام رجال ثقہ ہیں۔ محمد بن نصر نے اس کی تخریج قیام اللیل ص ۱۲۵ میں کی ہے، عراقی نے اس کی سند صحیح بتائی ہے۔

۵۔ مسند احمد ۶/ ۷۴ و ۱۴۳۔ مسلم (۷۳۶) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔ ابوداؤد (۱۳۳۶) فی الصلاۃ : باب صلاۃ اللیل۔

۶۔ مسلم (۷۴۶) فی صلاۃ المسافرین : باب جامع صلاۃ اللیل۔

بھی کی تھی اور حضرت سعد نے انھیں کچھ جواب بھی دیا تھا۔"

آٹھویں شکل :- نسائی نے حضرت حذیفہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں صلوٰۃ پڑھی، آپ نے رکوع کیا اور رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" بقدر قیام پڑھتے رہے پھر "رَبِّ اغْفِرْلِي رَبِّ اغْفِرْلِي" کہتے ہوئے بقدر قیام جلسہ فرمایا پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" بقدر قیام پڑھتے رہے، چار رکعتیں پڑھی تھیں کہ حضرت بلال صبح کی صلوٰۃ کے لیے آپ کو بلانے آگئے۔[1]

آپ نے رات کے ابتدائی، درمیانی اور آخری حصوں میں وتر کی صلوٰۃ پڑھی ہے اور ایک بار تو پوری رات ایک ہی آیت صبح تک بار بار پڑھتے رہے، وہ آیت یہ تھی (إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ[2] الآیۃ)۔ (مائدہ : ۱۱۸)

شب میں آپ کی صلوٰۃ تین طرح کی ہوتی تھی۔

۱۔ زیادہ تر کھڑے ہو کر۔

۲۔ بیٹھ کر پڑھتے تھے، بیٹھے بیٹھے رکوع کرتے تھے۔

۳۔ بیٹھ کر قرأت کرتے تھے، تھوڑی قرأت رہ جاتی تو اٹھ جاتے اور پوری کرکے رکوع کرتے تھے۔ تینوں صورتیں آپ سے ثابت ہیں۔

حالتِ قیام میں آپ کے بیٹھنے کی کیفیت سنن نسائی میں عبداللہ بن شقیق نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے چار زانو ہو کر بیٹھے ہوئے صلوٰۃ پڑھتے دیکھا۔"[3]

نسائی فرماتے ہیں ابوداؤد یعنی حفری کے علاوہ میرے علم میں اس حدیث کی اور کسی نے روایت نہیں کی ہے۔ ابوداؤد ثقہ ہیں مگر یہ حدیث مجھے غلط معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] نسائی ۳/۲۲۶ فی صلاۃ اللیل : باب تسویۃ القیام بعد الرکوع والسجود، سند کے رجال ثقہ ہیں، مگر اس کے بعد نسائی فرماتے ہیں کہ حدیث میرے نزدیک مرسل ہے۔ طلحہ بن یزید کے متعلق مجھے نہیں معلوم کہ حضرت حذیفہ سے انھوں نے کچھ سنا ہے یا نہیں۔ علا بن مسیب کے علاوہ دوسرے نے اسے طلحہ سے 'انھوں نے ایک شخص سے' انھوں نے حضرت حذیفہ سے روایت کی ہے۔

[2] احمد ۵/۱۵۶۔ نسائی ۲/۱۷۷ فی الافتتاح : باب تردید الآیۃ۔ حاکم ۱/۲۴۱، ابن خزیمہ ۱/۷۰، حدیث جسرہ عن ابی ذر۔ فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آیت "إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" (اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔) صبح تک پڑھتے رہے"۔ سند صحیح ہے۔

[3] نسائی ۳/۲۲۴ فی صلاۃ اللیل : باب کیف صلاۃ القاعد، حدیث ابوداؤد حفری عن حفص بن غیاث عن حمید الطویل عن عبد اللہ بن شقیق عن عائشۃ ۔ رجال ثقہ ہیں۔ مؤطا امام مالک ۱/۸۹ میں بسند صحیح عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے انھوں نے سنا ہے کہ ایک آدمی ان کے پہلو میں صلوٰۃ پڑھ رہا تھا، چار رکعتوں کے بعد بیٹھا تو چار زانو ہو گیا اور دونوں پیروں کو موڑ لیا۔ حضرت عبداللہ نے سلام پھیرا تو اس پر نکتہ چینی فرمائی، اس نے کہا آپ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ فرمایا "مجھے تکلیف ہے"۔ امام مالک اور بخاری ۲/۲۵۲ نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت عبداللہ کو صلوٰۃ میں چار زانو ہو کر بیٹھتے دیکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں نے بھی ایسا کیا اور اس وقت میں تھوڑی عمر کا تھا، عبداللہ بن عمر نے مجھے منع کیا اور فرمایا کہ سنت یہ ہے کہ داہنا پیر کھڑا رکھو اور بایاں پیر موڑ لو، میں نے کہا، آپ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں، فرمایا "میرے پیر میرا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے"۔

وتر کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھ کر صلوٰۃ پڑھنا

آپ سے یہ ثابت ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت صلوٰۃ کبھی بیٹھ کر پڑھتے کبھی بیٹھے بیٹھے ان دونوں میں قرأت کرتے اور کھڑے ہو کر رکوع فرماتے تھے۔ صحیح مسلم میں ابو سلمہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "آپ تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، آٹھ رکعتوں کے بعد وتر پھر بیٹھ کر دو رکعتیں۔ رکوع کا وقت آتا تو کھڑے ہو کر رکوع کرتے، پھر دو رکعتیں صلوٰۃ صبح کی اذان اور اقامت کے درمیان پڑھتے تھے۔"[1] مسند میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد بیٹھ کر دو ہلکی رکعتیں پڑھتے تھے۔[2] ترمذی فرماتے ہیں اسی طرح کی حدیث حضرت عائشہ، حضرت ابو امامہ اور بہتیرے صحابہ سے روایت ہوئی ہے۔

مسند میں حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ ان دونوں میں (اذا زلزلت) اور (قل یایھا الکافرون) کی سورتیں پڑھتے تھے۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دارقطنی نے اسی طرح کی روایت کی ہے۔[4]

اس حدیث سے بہتوں کو اشکال پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ انھوں نے اسے حسب ذیل روایت کے مخالف سمجھا ہے۔ "اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وترا"[5] یعنی شب میں اپنی آخری صلوٰۃ وتر رکھو۔ امام مالک رحمۃ اللہ نے ان دونوں رکعتوں کا انکار کر دیا ہے، امام احمد فرماتے ہیں میں یہ دونوں رکعتیں نہیں پڑھتا، نہ پڑھنے والوں کو منع کرتا ہوں۔ مالک نے اس کا انکار کیا ہے اور ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ دونوں رکعتیں آپ نے وتر کے بعد صلوٰۃ کے جواز کے طور پر پڑھی ہیں، نیز یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ نفل کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ انھوں نے آپ کے ارشاد "اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وترا" کو استحباب پر اور اس کے بعد کی دونوں رکعتوں کو جواز پر محمول کیا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں رکعتیں سنت کے قائم مقام ہیں، ان سے وتر کی تکمیل ہوتی ہے کیونکہ وتر ایک مستقل عبادت ہے بالخصوص جب کہ اسے واجب مان لیا جائے۔ ایسی صورت میں اس کے بعد دونوں رکعتوں کی وہی حیثیت ہے جو صلوٰۃ مغرب کے بعد دو رکعتوں کی ہے۔ مغرب کی صلوٰۃ دن کی صلوٰۃ وتر ہے، دونوں رکعتیں اس کے بعد کی تکمیل ہیں یہی حال شب میں وتر کے بعد دونوں رکعتوں کا بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] مسلم (۷۳۸) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل۔

[2] مسند احمد ۶/۲۹۸، ۲۹۹۔ رجال ثقہ ہیں، یہ مابعد کی حدیث کے مفہوم میں ہے۔

[3] مسند احمد ۵/۲۶۰۔ سند حسن ہے۔

[4] دارقطنی ۲/۴۱ سند ضعیف ہے۔ دیکھیے نصب الرایہ ۲/۱۳۷۔

[5] مسند احمد ۲/۱۱۹ و ۱۳۵ و ۱۴۳ و ۱۵۰۔ بخاری ۲/۴۰۶ فی الوتر : باب لیجعل آخر صلاۃ وترا۔ مسلم (۷۵۱) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ اللیل مثنی مثنی والوتر رکعۃ مرۃ آخر اللیل۔

قنوتِ وتر کا بیان

وتر میں قنوت پڑھنا صرف ایک حدیث سے ثابت ہے جس کی روایت ابن ماجہ نے علی بن میمون رقی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مخلد بن یزید نے بیان کیا، انھوں نے سفیان سے، انھوں نے زبید یامی سے، انھوں نے سعید بن عبدالرحمٰن أبزی سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے أبی بن کعب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے[1] امام احمد کا ان کے صاحبزادہ عبداللہ کی روایت کے مطابق قول ہے کہ میں قنوت بعد از رکوع پسند کرتا ہوں۔ قنوت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی ثابت ہے وہ فجر کی صلوٰۃ میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے۔ قنوت وتر میں میرا مذہب مختار بعد از رکوع کا ہے۔ اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں نہ قبل از رکوع نہ بعد از رکوع۔ خلاّل فرماتے ہیں کہ محمد بن یحییٰ کحال نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ابوعبداللہ سے وتر میں قنوت کی بابت دریافت کیا تو فرمایا "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ مگر حضرت عمر تمام سال پڑھتے تھے۔

احمد اور اصحاب سنن نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہا کی حدیث روایت کی ہے جس میں حضرت حسن فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی یہ دعا سکھائی۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ فِیْمَنْ هَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ، وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ، وَقِنِیْ شَرَّ مَا قَضَیْتَ، اِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ اِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ۔[2]

اے اللہ جنھیں تو نے ہدایت دی ان میں مجھے بھی ہدایت دے، جنھیں تو نے عافیت دی ان میں مجھے بھی عافیت دے، جن کی سرپرستی فرمائی ہے ان میں میری بھی سرپرستی فرما، جو عطا کرے اس میں مجھے برکت دے، مجھے اپنے فیصلہ کے شر سے بچا، تو فیصلہ کرتا ہے، تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جس کا تو والی ہو وہ ذلیل نہیں ہو سکتا، تو مبارک ہے ہمارے رب اور بلند و بالا تر ہے۔

بیہقی اور نسائی نے " وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ"[3] کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یعنی جس کا تو دشمن ہے وہ باعزت نہیں ہو سکتا۔ اپنی روایت میں نسائی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے "وَصَلَّی اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ"[4] یعنی نبی پر اللہ کا درود ہو"

---

[1] نسائی ۲/۲۳۵ - ابن ماجہ (۱۱۸۲) "قیام اللیل" لمحمد بن نصر ص ۱۳۱ - سند حسن ہے۔ اس باب میں کتاب القنوت للخطیب میں عبداللہ بن مسعود، "حلیۃ" لابی نعیم میں حضرت ابن عباس اور اوسط طبرانی میں حضرت ابن عمر سے روایتیں بھی آئی ہیں۔ یہ گو ضعیف ہیں مگر ان سے ابی بن کعب کی حدیث کو قوت پہنچتی ہے۔

[2] مسند احمد (۱۷۱۸) ترمذی (۴۶۴) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الوتر - ابوداؤد (۱۴۲۵) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الوتر - نسائی ۳/۲۴۸ فی صلاۃ اللیل : باب الدعاء فی الوتر، ابن ماجہ (۱۱۷۸) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی القنوت فی الوتر - دارمی ۱/۳۷۳، ۳۷۴ - بیہقی ۲/۲۰۹، سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۵۱۲ - ۵۱۳) اور حاکم نے مستدرک ۳/۱۷۲ میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] یہ صحیح اضافہ ہے۔

[4] کمزور اضافہ ہے، حافظ ابن حجر نے اسے ضعیف کہا ہے جیسا کہ الفتوحات الربانیۃ ۲/۲۹۲ میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حاکم نے مستدرک میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ وتر میں جب سر اٹھاؤں اور صرف سجدہ کرنا باقی رہ جائے تو . . . . . " صحیح ابن حبان میں یہ الفاظ ہیں "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا پڑھتے سنا"۔

ترمذی فرماتے ہیں اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے، حدیث حسن ہے۔ یہ ہمیں صرف ابو حوراء سعدی کی سند سے معلوم ہو سکی ہے، ان کا نام ربیعہ بن شیبان ہے، قنوتِ وتر کے بارے میں اس سے بہتر کوئی روایت ہمارے علم میں نہیں آسکی۔

قنوتِ وتر حضرت عمر اور ابن مسعود سے ثابت ہے اور ان کی روایت قنوت فی الفجر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ قنوت فی الفجر کے سلسلہ میں جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہے وہ قنوتِ وتر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے آخر میں یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ [1]

اے اللہ میں تیری ناراضگی سے تیری رضا اور تیری سزا سے تیری عفو کی اور تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں، تیری تعریف میرے شمار سے باہر ہے۔ تو ویسا ہی ہے جیسا تو اپنی تعریف کرے۔

احتمال ہے کہ یہ دعا آپ وتر سے فارغ ہو کر پڑھتے تھے یا اس سے پہلے، نسائی کی ایک روایت کے مطابق صلوٰۃ سے فارغ ہو کر اور آرام گاہ پر اطمینان سے جانے کے بعد پڑھتے تھے، اس روایت میں یہ الفاظ ہیں " لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ وَلَوْ حَرَصْتُ " آپ سے ثابت ہے کہ یہ دعا آپ نے سجدہ میں پڑھی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے یہ دعا صلوٰۃ میں اور اس کے بعد بھی پڑھی ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ اور وتر کے بارے میں حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ پھر آپ نے وتر پڑھی، جب صلوٰۃ پڑھ چکے تو آپ کو یہ دعا پڑھتے سنا،

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَعَنْ شِمَالِيْ نُوْرًا وَفَوْقِيْ نُوْرًا وَتَحْتِيْ نُوْرًا وَأَمَامِيْ نُوْرًا وَخَلْفِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِيْ يَوْمَ لِقَائِكَ نُوْرًا [2]

اے اللہ میرے دل میں نور، میری آنکھ میں نور، میرے کان میں نور، میرے داہنے نور، میرے بائیں نور، میرے اوپر

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ابن علان نے اسے نقل کیا ہے۔ انھوں نے کچھ باتوں کے بعد لکھا ہے کہ اس سند میں یہ اضافہ غریب ہے ثابت نہیں ہے۔ پھر ذکر کیا ہے کہ اس کی سند میں یا تو کوئی مجہول راوی ہے یا یہ منقطع ہے۔ اس کی وضاحت کے بعد فرمایا، معلوم ہوا کہ یہ سند حسن کی شرط سے خالی ہے کیونکہ اس میں انقطاع یا راوی مجہول ہے۔ دوسری سند سے بھی اس کی اصلاح نہیں ہوتی، انقطاع کی تائید میں یہ لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس راوی کا تذکرہ تبع تابعین میں کیا ہے، اگر اس کا سماع حسن سے ہوتا تو تابعین میں اس کا تذکرہ کرتے۔ شیخ (نووی) نے "شرح المہذب" میں لکھا ہے کہ سند صحیح ہے یا حسن۔ ایسا ہی "الخلاصۃ" میں بھی انھوں نے تبصرہ کیا ہے۔ اس تعلیل کے بعد یہ حدیث شاذ کے درجہ میں آجاتی ہے۔

[1] ترمذی (۳۵۶۱) فی الدعوات : باب فی دعاء الوتر۔ ابوداؤد (۱۴۲۷) فی الصلاۃ : باب القنوت فی الوتر۔ نسائی ۳/۲۴۸، ۲۴۹ فی صلاۃ اللیل : باب الدعاء فی الوتر۔ ابن ماجہ (۱۱۷۹) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی القنوت فی الوتر۔ مستدرک حاکم ۱/۳۰۶۔ اسے انھوں نے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔

[2] مستدرک حاکم ۳/۵۳۶۔ اسے انھوں نے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

نور، میرے نیچے نور، میرے آگے نور اور میرے پیچھے نور کر دے اور جس دن تجھ سے ملاقات ہو اس دن میرے لیے نور فراہم کرنا۔

کریب نے سات کا ذکر کیا ہے قنوت کے سلسلے میں، انھوں نے کہا کہ اولادِ عباس میں سے ایک آدمی سے میں ملا تو انھوں نے ان ساتوں کو بیان کیا جو یہ ہیں "لَحْمِي وَدَمِي وَعَصَبِي وَشَعْرِي وَبَشَرِي" ان کے ساتھ دو اور خصلتوں کا ذکر کیا۔ نسائی کے اندر اس حدیث کی روایت میں یوں ہے کہ آپ اپنے سجدوں میں کہتے تھے[1] مسلم کے اندر اسی حدیث میں ہے "صلوٰۃ صبح کے لیے نکلتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے" اور انہی کی ایک روایت میں ہے "وَفِي لِسَانِي نُورًا وَاجْعَلْ فِي نَفْسِي نُورًا وَأَعْظِمْ لِي نُورًا" ایک دوسری روایت میں یوں ہے "وَاجْعَلْنِي نُورًا"۔[2]

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت أبی بن کعب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى"، "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ" اور "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ"، پڑھتے تھے، سلام پھیرنے کے بعد "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ"، تین بار پڑھتے تھے، تیسری بار بآواز بلند پڑھتے۔ یہ نسائی[3] کے الفاظ ہیں۔ دارقطنی نے "رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ"[4] کا اضافہ کیا ہے۔

آپ الفاظ الگ الگ کر کے قرأت فرماتے تھے، ہر آیت پر رکتے تھے چنانچہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھ کر وقف فرماتے، "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھ کر وقف فرماتے، "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" پڑھ کر وقف فرماتے[5]

زہری نے ذکر کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت ایک ایک آیت ہوا کرتی تھی اور یہی بہتر ہے۔ یعنی آیات کے سروں پر گو مضمون کا مابعد سے ربط ہو مگر ٹھہرنا بہتر ہے۔ بعض قراء کا مذہب یہ ہے کہ مضمون کے اعتبار سے وقف وہاں کرنا مناسب ہے جہاں وہ ختم ہوتا ہو، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور سنت کی اتباع ہی مناسب ہے۔ یہ بات بیہقی نے "شعب الایمان" میں اور دوسروں نے بھی کہی ہے۔ انھوں نے مابعد سے تعلق کے باوجود آیتوں کے آخر میں ٹھہرنا راجح قرار دیا ہے۔

تلاوت و ترتیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورتیں ترتیل سے پڑھتے تھے جس سے چھوٹی سورتیں طویل سورتوں سے بھی زیادہ لمبی ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک آیت کو صبح تک دہراتے رہے[6]

---

[1]۔ نسائی ۲۱۸/۲ فی الافتتاح فان الدعاء فی السجود، ابن عباس کی وہ روایت جس میں انھوں نے اپنی خالہ کے گھر رات گزارنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اسناد صحیح ہے۔

[2]۔ مسلم (۷۶۳) فی صلاۃ المسافرین : باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ، حدیث ابن عباس۔

[3]۔ ابوداؤد (۱۴۲۳) فی الصلاۃ : باب مایقرء فی الوتر، نسائی ۲۴۴/۳، ۲۴۵ فی صلاۃ اللیل : باب نوع آخر من القراءۃ فی الوتر۔ ابن ماجہ (۱۱۷۱) فی اقامۃ الصلاۃ ، باب ماجاء فیما یقرء فی الوتر۔ سند صحیح ہے۔

[4]۔ دارقطنی ص ۱۷۵ فی الوتر : باب مایقرء فی رکعات الوتر والقنوت۔ سند صحیح ہے۔

[5]۔ مسند احمد ۳۰۲/۶۔ ترمذی (۲۹۲۸) فی القراءات : باب فی فاتحۃ الکتاب۔ ابوداؤد (۴۰۰۱) فی الحروف والقراءات مستدرک حاکم ۲۳۲/۲ فی التفسیر۔ انھوں نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

(حاشیہ "۶" اگلے صفحہ پر)

ترتیل کے ساتھ کم پڑھنا یا سرعت کے ساتھ زیادہ پڑھنا دونوں میں افضل کون ہے؟ اس باب میں دو قول ہیں۔
حضرت ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ کم قرأت کے ساتھ ترتیل و تدبر سرعت کے ساتھ زیادہ پڑھنے کے بمقابلہ افضل ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ قرأت سے مقصود فہم و تدبر اور فقہ و عمل ہے، تلاوت اور حفظ قرآن دونوں مفاہیم قرآن کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ بعض اسلاف کا قول ہے کہ قرآن نازل عمل کے لیے ہوا ہے، لہٰذا اس کی تلاوت عمل کے لیے ہو، اسی لیے اہل قرآن انہی خوش بختوں کو کہتے تھے جن کو گو قرآن زبانی یاد نہ ہو مگر اس کا علم ہو اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ فہم قرآن سے تہی دست اور قرآنی تقاضوں کے مطابق عمل سے خالی حافظ قرآن خواہ حروف قرآن کو تیر کی طرح سیدھا پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہوں، بہرحال اہل قرآن نہیں ہیں۔

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایمان سب سے افضل عمل ہے اور قرآن کا فہم و تدبر ہی ایمان پیدا کرتا ہے۔ بلا سمجھے بوجھے قرآن کی تلاوت نتیجہ خیز نہیں ہوتی، یہ تو نیک و بد اور مومن و منافق سبھی انجام دے لیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "قرآن پڑھنے والے منافق کی مثال ریحانہ کی ہے جس کی بو تو عمدہ مگر مزہ کڑوہ ہوتا ہے"[1]

قرآن سے ربط و تعلق رکھنے کے اعتبار سے لوگوں کے چار طبقے ہیں:

پہلا:- اہل قرآن اور اہل ایمان کا ہے۔ یہ سب سے افضل اور اعلیٰ طبقہ ہے۔

دوسرا:- ان لوگوں کا ہے جو قرآن اور ایمان دونوں سے تہی دست ہیں۔

تیسرا:- ان کا ہے جو قرآن کے حامل تو ہیں مگر ایمان غائب ہے۔

چوتھا:- ان کا ہے جو صاحب ایمان ہیں مگر قرآن غائب ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح صاحب ایمان بلا قرآن، صاحب قرآن بلا ایمان سے افضل ہے۔ اسی طرح جو لوگ تلاوت قرآن کے ساتھ فہم و تدبر کا جوہر بھی رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے افضل ہیں جو بلا فہم و تدبر بہ کثرت اور بسرعت قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ فہم و تدبر ہی کا تھا، چنانچہ آپ سورہ کی تلاوت اس طرح ترتیل سے فرماتے تھے کہ طویل تر سورہ بھی اس کے آگے مختصر معلوم ہوتی تھی، صرف ایک آیت کی تلاوت آپ صبح تک کرتے رہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب بکثرت پڑھنے کو افضل قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کتاب الٰہی کا جو کوئی ایک حرف پڑھے گا اس کے عوض اسے ایک نیکی اور ایک نیکی دس گنی کر کے ملے گی۔ "الٓم" ایک حرف نہیں ہے بلکہ "الف" ایک حرف "لام" ایک حرف "میم" ایک حرف ہے" ترمذی نے اس کی روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے[2]

لٰہ۔ (حاشیہ "لٰہ" صفحہ گذشتہ) حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد ۵/۱۴۹ اتخریج گذر چکی ہے، جو آیت آپ دہراتے رہے وہ یہ ہے " إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ "

---

[1] مسند احمد ۴/۳۹۷، بخاری ۱۳/۴۴۷ فی التوحید: باب قرأۃ الفاجر المنافق، وفی فضائل القرآن: باب فضل القرآن علی سائر الکلام و باب اثم من رایٰ بالقرآن او تاکل بہ، وفی الاطعمۃ: باب ذکر الطعام۔ مسلم (۷۹۷) فی صلاۃ المسافرین: باب فضیلۃ حافظ القرآن۔ ابوداؤد (۴۸۲۹) فی الادب: باب من یؤمر أن یجالس۔ ترمذی (۲۸۶۹) فی الامثال: باب ماجاء فی مثل المؤمن القاریٔ للقرآن وغیر القاریٔ۔ نسائی ۱۲۵/۸ فی الایمان: باب مثل الذی یقرأ القرآن من مؤمن ومنافق۔ ابن ماجہ (۲۱۴) فی المقدمۃ: باب من تعلم القرآن وعلمہ۔

[2] ترمذی (۲۹۱۲) فی ثواب القرآن: باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن مالہ من الأجر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ لوگ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پڑھا ہے۔ علاوہ ازیں کثرت قرأت کے بارے میں سلف سے بکثرت روایات بھی پیش کرتے ہیں۔

مسئلے کے اندر صحیح موقف یہ ہے کہ ترتیل وتدبر کا ثواب قدر و منزلت کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع اور کثرت قرأت کا ثواب تعداد کے اعتبار سے بیش از بیش ہے۔ پہلے کی مثال اس شخص کی ہے جو کوئی گوہر آبدار صدقہ یا کوئی بیش قیمت غلام آزاد کرے۔ دوسرے کی مثال اس شخص کی ہے جو زیادہ سے زیادہ روپے صدقہ کرے یا کم قیمت کے بے شمار غلام آزاد کرے۔

صحیح بخاری کے اندر حضرت قتادہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں "میں نے حضرت انس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "انتہائی کھینچ کر پڑھتے تھے"۔[1]

شعبہ فرماتے ہیں ابوجمرہ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عباس سے کہا کہ میں انتہائی سریع القرأت انسان ہوں، بسا اوقات ایک ہی شب میں ایک بار یا دو بار قرآن ختم کرلیتا ہوں، انھوں نے فرمایا "مجھے تو صرف ایک سورہ پڑھنا زیادہ مسرت انگیز ہے اس بات سے کہ تمھارے جیسا کام کروں، اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہو تو کم از کم اس طرح پڑھو کہ کان سن سکیں اور دل میں اتر سکے۔

ابراہیم فرماتے ہیں: علقمہ نے حضرت ابن مسعود کو قرآن سنایا، یہ خوش آواز تھے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: "فداك أبي وأمي"، ترتیل سے پڑھو کہ یہ قرآن کی زینت ہے"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے "شعر کی طرح سرعت سے بلا تأمل قرآن نہ پڑھو، اور نہ اسے اس طرح بکھیرو جیسے کھجور کا درخت ہلا کر ردی اور خشک کھجوریں بکھیرتے ہو، اس کے عجائب پر ٹھہرو اور دلوں میں حرکت پیدا کرو، فکر یہ نہ ہو کہ کب سورہ کے آخر تک پہنچ جائیں"۔

ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جب "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کی صدائے الٰہی سنو تو ہمہ تن گوش ہو جاؤ کہ اس موقعہ پر یا تو کسی خیر کی ہدایت دی جارہی ہے یا کسی شر سے رکنے کی تاکید۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: ایک خاتون میرے یہاں آئیں، اس وقت میں سورۂ ہود پڑھ رہا تھا انھوں نے فرمایا "عبدالرحمٰن! کیا یونہی سورۂ ہود پڑھتے ہو؟ واللہ چھ مہینوں سے میں اس کی تلاوت کر رہی ہوں مگر ابھی تک ختم نہیں ہوئی"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب کی صلوٰۃ میں قرأت گاہ آہستہ گاہ بلند آواز سے کرتے، قیام کبھی طویل کبھی ہلکا رکھتے، وتر کی صلوٰۃ کبھی آغاز شب میں، کبھی درمیان میں اور اکثر آخر شب میں پڑھتے تھے۔

سفر میں آپ شب وروز کی نفل صلوات سواری پر پڑھتے تھے جس رخ بھی سواری جائے، اس پر رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرتے تھے، سجدہ رکوع سے زیادہ پست ہوتا تھا۔ احمد اور ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر نفل پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو قبلہ رخ ہو کر صلوٰۃ کے لیے تکبیر کہتے پھر سواری کی زمام چھوڑ دیتے۔ وہ جس رخ پر ہوتی اسی رخ پر صلوٰۃ پڑھ لیتے۔[2]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) انھوں نے اسے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

[1] مسند احمد ۳/ ۱۲۷ و ۱۹۸۔ بخاری ۹/ ۷۹ فی فضائل القرآن: باب من القرأة۔ نسائی ۲/ ۱۷۹ فی الافتتاح: باب من الصوت بالقرأة۔ ابن ماجہ (۱۳۵۳) فی اقامة الصلاة: باب ماجاء فی القرأة فی صلاة اللیل۔

(حاشیہ "[2]" اگلے صفحہ پر)

امام احمد سے دو مختلف روایتیں ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں کہ آیا قبلہ رُخ ہونے کی قدرت ہوتے ہوئے بھی ایسا کرنا لازم ہے ؟ یعنی اگر تمام صلوٰۃ میں قبلہ رُخ گھوم جانا ممکن ہو مثلاً محمل یا عماریہ وغیرہ ہو تو کیا ایسا کرنا لازم ہے یا یہ کہ سواری کا جو رُخ ہو اسی پر صلوٰۃ پڑھ لینا درست ہوگا ؟ چنانچہ محمل میں صلوٰۃ پڑھنے والے کے بارے میں محمد بن حکم کی روایت کے مطابق امام احمد کا قول یہ ہے کہ ایسی حالت میں قبلہ رُخ رہنا ہی کافی ہوگا کیونکہ اس حالت میں گھوم جانا ممکن ہے، جب کہ جانور کی پشت پر سوار انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ مگر ان سے ابو طالب کی روایت یہ ہے کہ محمل میں رُخ پھیرنا دشوار ہے، لہٰذا سواری کا جو رُخ ہو اسی رُخ پر صلوٰۃ پڑھ لی جائے گی۔ محمل میں سجدہ کی روایت بھی امام احمد سے مختلف ہوگئی ہے۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا " محمل میں سجدہ کی قدرت ہو تو سجدہ کرے۔ اور امام احمد سے میمونی کی روایت یہ ہے کہ محمل میں صلوٰۃ پڑھے تو میرے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہے کہ سجدہ کرے کیونکہ یہاں اس کا امکان ہے۔ فضل بن زیاد نے بھی یہی روایت کی ہے۔ جعفر بن محمد کی روایت یہ ہے کہ محمل میں ہو تو کہنی پر سجدہ کرے، کبھی اونٹ پر ٹیک بھی لگا سکتا ہے، مگر اشارے سے سجدہ کرے اور اسے رکوع سے پست رکھے۔ ایسی ہی روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابو داؤد نے بھی کی ہے۔[1]

چاشت کی صلوٰۃ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا مگر میں پڑھتی ہوں۔[2]" بخاری ہی کے اندر مورّق عجلی کی حدیث وارد ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا " آپ چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے ہیں ؟ فرمایا : نہیں، پوچھا " اور عمر ؟" فرمایا : نہیں، پھر پوچھا " اور ابو بکر ؟" فرمایا : نہیں، پھر پوچھا " اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ؟" فرمایا : میرا خیال ہے نہیں۔[3]

ابن ابی لیلیٰ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں " ام ہانی کے سوا ہم میں سے کسی نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے۔" ام ہانی فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر

۲ے۔ (حاشیہ "۲ے" صفحہ گذشتہ) مسند احمد ۳/۱۲۶ و ۲۰۳۔ ابوداؤد (۱۲۲۵) فی الصلاۃ : باب التطوع علی الراحلۃ والوتر۔ سند قوی ہے۔

لہ۔ ابوداؤد (۱۲۲۷) فی الصلاۃ : باب التطوع علی الراحلۃ والوتر۔ ترمذی (۳۵۱) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ علی الدابۃ حیثما توجہت بہ۔ بیہقی ۲/۵۔ ابن خزیمہ (۱۲۷۰) روایت حضرت جابر سے، فرماتے ہیں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک ضرورت سے بھیجا، واپس آیا تو دیکھا آپ سواری پر صلوٰۃ مشرق رُخ پڑھ رہے تھے، سجدہ رکوع سے پست ہوتا تھا۔" سند صحیح ہے۔

۲ے۔ مسند احمد ۶/۸۶ و ۱۷۷ و ۲۱۵ و ۲۲۳ و ۲۳۸۔ بخاری ۳/۴۶ فی التہجد : باب من لم یصل الضحی۔ مسلم (۷۱۸) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب صلاۃ الضحی وان اقلہا رکعتان۔ ابوداؤد (۱۲۹۳) فی الصلاۃ : باب صلاۃ الضحی۔ پوری حدیث اس طرح ہے " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس ڈر سے چھوڑ دیتے تھے کہ مبادا لوگ عمل کرنے لگیں اور ان پر فرض ہو جائے۔"

۳ے۔ بخاری ۳/۴۲ فی التہجد : باب صلاۃ الضحیٰ فی السفر۔

تشریف لائے، غسل فرمایا، پھر آٹھ رکعتیں صلوات پڑھیں، میں نے ان صلوات سے زیادہ ہلکی کوئی صلوٰۃ کبھی نہیں دیکھی تھی مگر رکوع وسجود آپ مکمل ادا فرماتے تھے[1]۔

صحیح مسلم میں عبداللہ بن شقیق کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا "کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تھے؟" فرمایا "نہیں، صرف اس وقت پڑھتے تھے جب باہر سے تشریف لاتے۔" پوچھا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورتوں کو ملا کر پڑھتے تھے؟" فرمایا "مفصل کی سورتیں[2]"۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرماتی ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ چار رکعتیں پڑھتے تھے کبھی اس سے زیادہ بھی پڑھی ہے[3]۔" صحیحین میں ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن چاشت کے وقت آٹھ رکعتیں پڑھیں[4]۔"

حاکم نے مستدرک میں کہا ہے کہ ہم سے اصم نے، انھوں نے کہا ہم سے صغانی نے، انھوں نے کہا ہم سے ابن مریم نے، انھوں نے کہا ہم سے بکر بن مضر نے، انھوں نے کہا ہم سے عمرو بن الحارث نے بیان کیا، انھوں نے بکر بن اشج سے، انھوں نے ضحاک بن عبداللہ سے، انھوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں "میں نے ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا، آپ نے آٹھ رکعتیں پڑھیں، جب فارغ ہوئے تو فرمایا "میں نے رغبت ورہبت (خوشی اور خوف) کی صلوٰۃ پڑھی ہے، رب سے تین چیزیں مانگیں، دو تو اس نے دیدیا، ایک نہیں دی۔ میں نے یہ درخواست کی کہ میری امت کو قحط میں مبتلا کر کے نہ مارے، یہ اس نے منظور کرلی، میں نے درخواست کی کہ ان پر کسی دشمن کو غالب نہ کرے۔ اس نے یہ بھی منظور کرلی۔ درخواست کی کہ انھیں مختلف فرقوں میں تقسیم نہ کرے۔ یہ منظور نہیں کی۔" حاکم نے اسے صحیح کہا ہے[5]۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ضحاک بن عبداللہ محل نظر ہیں، یہ کون ہیں؟ ان کے حالات کیا ہیں؟ یہ سب پردۂ خفا میں ہے۔

کتاب "فضل الضحیٰ" میں حاکم نے کہا ہے "ہم سے ابوبکر فقیہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہمیں بشر بن یحییٰ نے خبر دی، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن صالح دولابی نے، انھوں نے کہا ہم سے خالد بن عبداللہ بن حصین نے بیان کیا، انھوں نے ہلال بن یساف سے، انھوں نے زاذان سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے، فرماتی ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ پڑھی پھر یہ دعا مانگی اور سو بار پڑھتے رہے۔

---

[1] بخاری ۳/۴۳ فی التطوع : باب صلاۃ الضحی فی السفر وفی تقصیر الصلاۃ : باب من تطوع فی الصلاۃ فی غیر دبر الصلاۃ وقبلها وفی المغازی : باب منزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح۔ مسلم (۳۳۶) (۸۰) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب صلاۃ الضحی۔ ترمذی (۴۷۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی صلاۃ الضحی۔ ابوداؤد (۱۲۹۱) فی الصلاۃ : باب صلاۃ الضحی۔

[2] مسلم (۷۱۷) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب صلاۃ الضحیٰ۔ ابوداؤد (۱۲۹۲) فی الصلاۃ : باب صلاۃ الضحیٰ۔ نسائی ۴/۱۵۲ فی الصوم : باب التقدم قبل رمضان۔ مسند احمد ۶/۱۷۱ و ۲۰۴ و ۲۱۸۔

[3] مسلم (۷۱۹) فی صلاۃ المسافرین : باب استحباب صلاۃ الضحیٰ۔ ابن ماجہ (۱۳۸۱) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی صلاۃ الضحی۔

[4] اس کی تخریج قریب ہی گذر چکی ہے۔

[5] حاکم ۱/۳۱۴۔ ابن خزیمہ (۱۲۲۸) مسند احمد ۳/۱۴۶۔ ضحاک بن عبداللہ مجہول ہیں باقی رجال ثقہ ہیں۔ بایں ہمہ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ[1]

اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، میری جانب مائل ہو، بے شک تو بے حد مائل ہونے والا، رحم کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

ہم سے ابوالعباس اصم نے، انھوں نے کہا ہم سے اسد بن عاصم نے ان سے حصین بن حفص نے بیان کیا، انھوں نے سفیان سے، انھوں نے عمر بن ذر سے، انھوں نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ دو، چار، چھ اور آٹھ رکعتیں پڑھی ہیں[2]

امام احمد فرماتے ہیں، ہم سے ابوسعید مولی بنی ہاشم نے، انھوں نے کہا ہم سے عثمان بن عبدالملک عمری نے انھوں نے کہا ہم سے عائشہ بنت سعد نے بیان کیا، انھوں نے ام ذرہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں "حضرت عائشہ کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف چار رکعتیں پڑھتے دیکھا ہے[3]

حاکم ہی نے یہ روایت بھی کی ہے، کہتے ہیں ہمیں ابو احمد بکر بن محمد مروزی نے خبر دی، انھوں نے کہا ہم سے ابوقلابہ نے، انھوں نے کہا ہم سے ابو ولید نے، انھوں نے کہا ہم سے ابوعوانہ نے بیان کیا، وہ حصین بن عبدالرحمٰن سے وہ عمرو بن مرہ سے وہ عمارہ بن عمیر سے وہ ابن جبیر بن مطعم سے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے[4]

حاکم یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ ہم سے اسماعیل بن محمد نے، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن عدی بن کامل نے، انھوں نے کہا ہم سے وہب بن بقیہ واسطی نے، انھوں نے کہا ہم سے خالد بن عبداللہ نے بیان کیا، وہ محمد بن قیس سے، وہ جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ چھ رکعتیں پڑھی ہیں[5]

آگے حاکم نے اسحاق بن بشیر محاملی سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا ہم سے عیسیٰ بن موسیٰ نے بیان کیا، وہ جابر سے، وہ عمر بن صبح سے، وہ مقاتل بن حیان سے، وہ مسلم بن صبیح سے، وہ مسروق سے، وہ حضرت عائشہ اور ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ دونوں فرماتی ہیں "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ بارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ آگے لمبی حدیث ذکر کی ہے[6]

حاکم بیان کرتے ہیں، ہمیں ابو احمد بن محمد صیرفی نے خبر دی، انھوں نے کہا ہم سے ابوقلابہ رقاشی نے، انھوں نے کہا ہم سے ابوالولید نے، انھوں نے کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، وہ ابواسحاق سے، وہ عاصم بن ضمرہ سے، وہ حضرت علی

---

[1]۔ سند میں ایک شخص غیر معروف ہے۔

[2]۔ مرسل ہے اور سند میں ایک شخص غیر معروف ہے

[3]۔ مسند احمد ۱۰۶/۶۔ عثمان بن عبدالملک، ایسا ہی نام مسند میں آیا ہے مگر مزی نے عائشہ بنت سعد سے روایت کرنے والے کے باب میں لکھا ہے کہ یہ عثمان بن محمد بن عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر عمری ہیں، الجرح والتعدیل ۱۶۵/۶ میں ان کے حالات قلمبند ہیں، آگے کہا ہے کہ ان سے خالد بن مخلد قطوانی، اسماعیل بن ابو اویس اور ہشام بن عبیداللہ رازی نے روایتیں کی ہیں۔ باقی رجال ثقہ ہیں۔

[4]۔ رجال ثقہ ہیں، ہیثمی نے المجمع ۲۳۸/۲ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کبیر طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے، اس کی سند حسن ہے۔

[5]۔ محمد بن قیس کو ابن حبان کے علاوہ اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔

[6]۔ عمر بن صبح متروک ہیں، ابن راہویہ وغیرہ نے انھیں کاذب کہا ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ بعد میں حدیث کے موضوع ہونے کا تذکرہ کریں گے۔

سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تھے[1]

انہی سے ابو ولید تک سلسلۂ روایت ملاتے ہوئے کہتے ہیں، اور انھوں نے کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے حصین بن عبد الرحمٰن سے، انھوں نے عمرو بن مرہ سے، انھوں نے عمارہ بن عمیر عبدی سے، انھوں نے ابن جبیر بن مطعم سے، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ "انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے[2]"۔

حاکم فرماتے ہیں اس باب میں ابو سعید خدری، ابو ذر غفاری، زید بن ارقم، ابو ہریرہ، بریدہ اسلمی، ابو درداء، عبد اللہ بن ابی اوفیٰ، عتبان بن مالک، انس بن مالک، عتبہ بن عبد اللہ سلمی، نعیم بن ہمار غطفانی، ابو امامہ باہلی اور عورتوں میں حضرت عائشہ بنت ابی بکر، ام ہانی اور ام سلمہ سے بھی روایتیں ہیں، سبھی نے بچشم دید گواہی دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ صلوٰۃ پڑھتے تھے۔

طبرانی نے حضرت علی اور حضرت انس، حضرت عائشہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی روایتوں میں ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ چھ رکعتیں پڑھتے تھے[3]

مذکورہ بالا احادیث کے پیش نظر مسئلہ کے اندر اختلاف ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ ترک پر فعل کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس کا انداز اثباتی ہے اور مزید علم ہوتا ہے جو نفی کرنے والے پر پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے اس طرح کا علم کم ہی لوگوں کو ہوا اور اکثر لوگوں سے مخفی رہے۔

حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت جابر، حضرت ام ہانی اور علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اطلاعات کے مطابق آپ نے یہ صلوٰۃ پڑھی ہے، نیز اس کی تائید احادیث صحیحہ بھی کرتی ہیں جن کے اندر چاشت کی صلوٰۃ کی وصیت اور اس کی پابندی اور اسے اختیار کرنے والوں کی مدح وستائش موجود ہے۔ صحیحین میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ میرے خلیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ماہ تین صوم رکھنے، چاشت کی دو رکعت اور سونے سے پہلے وتر کی صلوٰۃ پڑھنے کی وصیت کی ہے[4]

صحیح مسلم میں حضرت ابو درداء سے بھی اسی طرح کی روایت موجود ہے[5]

---

[1] رجال ثقہ ہیں۔

[2] رجال ثقہ ہیں۔ قریب ہی گذر چکی ہے۔

[3] ہیثمی نے حضرت انس کی حدیث کا "مجمع الزوائد" ۲/۲۳۷ میں تذکرہ کرتے ہوتے کہا ہے کہ اوسط طبرانی میں یہ روایت ہے، سلسلہ سند میں سعید بن مسلم اموی کو بخاری، ابن معین اور ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے انھیں ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ غلطی کرتے تھے۔ حضرت جابر کی حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی روایت اوسط طبرانی میں محمد بن قیس عن جابر کی سند سے ہے۔ ابن حبان نے محمد بن قیس کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ حضرت عائشہ کی حدیث کا تذکرہ ہیثمی نے المجمع ۲/۲۳۵ میں اس طرح کیا ہے۔ "عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ صرف فتح مکہ کے دن پڑھی ہے، اسے انھوں نے بزار کی روایت بتائی ہے اور اس کے تمام رجال کو ثقہ قرار دیا ہے، بعض پر غیر مضر تنقید کی گئی ہے، حضرت علی کی حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تھے، کہتے ہیں کہ اس کی روایت احمد اور ابو یعلیٰ نے کی ہے۔ احمد کے رجال ثقہ ہیں۔

[4] بخاری ۳/۴۷ فی التطوع : باب صلاة الضحیٰ فی الحضر و فی الصوم : باب صیام ایام البیض۔ مسلم (۷۲۱) فی صلاة المسافرین : باب استحباب رکعتی الضحیٰ۔ ابو داؤد (۱۴۳۲) فی الصلاة : باب الوتر قبل النوم۔ نسائی ۳/۲۲۹ فی صلاة اللیل : باب الحث علی الوتر قبل النوم۔

[5] مسلم (۷۲۲) ابو داؤد (۱۴۳۳)۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر سے مرفوعًا روایت ہے۔ ارشاد ہے:

"تم میں ہر شخص کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے، ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، ہر تہلیل صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، نہی عن المنکر صدقہ ہے۔ ان تمام باتوں کے مقابلہ میں بس چاشت کی دو رکعت کافی ہے"[1]

مسند امام احمد میں معاذ بن انس جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو شخص صبح کی صلوٰۃ سے فارغ ہو کر اپنے مصلّٰی پر اس حد تک بیٹھا رہے کہ چاشت کی دو رکعتیں بھی پڑھ لے، اس درمیان بھلی باتوں کے علاوہ اس کی زبان سے کچھ نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں"[2]

ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوٰۃ چاشت کی جو پابندی کرے گا اس کے گناہ سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں تو بخشے جائیں گے"[3]

مسند اور سنن میں نعیم بن ہمار سے روایت ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے۔ "اللہ عزوجل فرماتا ہے" اے ابن آدم! شروع دن کی چار رکعتوں سے ہرگز عاجز نہ رہنا، میں آخر دن میں تمہارے لیے کافی ہوں گا"[4] یہ روایت ترمذی میں حضرت ابودرداء اور ابوذر سے آئی ہے[5]

جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس سے مرفوعًا روایت ہے کہ

"جس نے چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھیں، جنت میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے سونے کا محل تعمیر کرے گا"[6]

صحیح مسلم میں زید بن ارقم سے روایت ہے کہ انھوں نے مسجد قبا میں کچھ لوگوں کو چاشت پڑھتے دیکھا تو فرمایا "دیکھیے تو، انھیں معلوم ہے کہ دوسرے وقت صلوٰۃ پڑھنا افضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"اوّابین کی صلوٰۃ اس وقت ہے جب اونٹ کے بچّہ کے لیے گرمی ناقابل برداشت ہو جائے"[7]

حدیث میں الفاظ "ترمضُ الفِصَال" کے آئے ہیں، یعنی دن کی گرمی اس حد تک سخت ہو جائے کہ اونٹ کے بچّے محسوس کرنے لگیں۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ دو رکعت عتبان بن مالک کے گھر میں پڑھی۔[8]

مستدرک حاکم میں خالد بن عبداللہ واسطی کی حدیث محمد بن عمرو عن ابی سلمہ حضرت ابوہریرہ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

۱۔ مسلم (۷۲۰) ابوداؤد (۱۲۸۵)۔

۲۔ مسند احمد ۳/۴۳۹۔ بیہقی ۳/۴۹ سند میں ابن لہیعہ سیئ الحفظ ہیں اور زبان بن فائد ضعیف۔ سہیل بن معاذ میں کوئی حرج نہیں مگر ان سے زبان کی روایت محل نظر ہے اور یہ ایسی ہی ہے۔

۳۔ ترمذی (۴۷۶) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ ابن ماجہ (۱۳۸۲) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ مسند احمد ۲/۴۴۳ و ۴۹۷ و ۴۹۹۔ سند میں نہاس بن قہم جیسا کہ "التقریب" میں حافظ نے کہا ہے ضعیف ہیں۔

۴۔ مسند احمد ۵/۲۸۶، ۲۸۷۔ ابوداؤد (۱۲۸۹) فی الصلاۃ: باب صلاۃ الضحیٰ۔ سند صحیح ہے۔

۵۔ ترمذی (۴۷۵) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ، سند قوی ہے، ماقبل کی حدیث شاہد ہے۔

۶۔ ترمذی (۴۷۳) ابن ماجہ (۱۳۸۰) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ سند میں موسیٰ بن انس مجہول ہیں۔

۷۔ مسلم (۷۴۸) فی صلاۃ المسافرین: باب صلاۃ الاوابین حین ترمض الفصال۔ دارمی ۱/۳۴۰ فی الصلاۃ: باب فی صلاۃ الاوابین۔ مسند احمد ۴/۳۶۶ و ۳۶۷ و ۳۷۲ و ۳۷۵۔

۸۔ عنقریب آرہی ہے۔

"چاشت کی محافظت صرف بندۂ اوّاب (رجوع ہونے والا) ہی کرسکتا ہے"[1]

حاکم نے کہا ہے کہ اس جیسی سند سے مسلم بن حجاج نے استدلال کیا ہے، انھوں نے اپنے شیوخ سے، انھوں نے محمد بن عمرو سے، انھوں نے ابوسلمہ سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ "اللہ تعالی قرآن جس طرح نغمگی سے پڑھنے والے نبی سے سنتا ہے اس طرح اور کچھ نہیں سنتا"[2] کہتے ہیں کہ اس موقع پر کہا جاسکتا ہے کہ حماد بن سلمہ اور عبدالعزیز بن محمد دراوردی نے اسے محمد بن عمرو سے مرسلاً بیان کیا ہے مگر جواب یہ ہے کہ خالد بن عبداللہ ثقہ ہیں اور ثقہ کا اضافہ لائق قبول ہے۔

حاکم نے آگے کہا ہے کہ ہم سے عبداللہ بن یزید نے، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن مغیرہ سکری نے، انھوں نے کہا ہم سے قاسم بن حکم عُرنی نے، انھوں نے کہا ہم سے سلیمان بن داؤد یمامی نے، انھوں نے کہا ہم سے یحییٰ بن ابی کثیر نے بیان کیا، انھوں نے ابوسلمہ سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جنت کا ایک دروازہ باب الضحیٰ نام کا ہے، قیامت کے دن اعلانچی پکارے گا" وہ لوگ کہاں ہیں جو چاشت کی صلوٰۃ کی پابندی کرتے تھے؟ آؤ یہ تمھارا دروازہ ہے، رحمت الٰہی کے زیر سایہ اس میں داخل ہو"[3]

جامع ترمذی میں آیا ہے۔ ہم سے ابوکریب محمد بن علاء نے، انھوں نے کہا ہم سے یونس بن بکیر نے بیان کیا، وہ محمد بن اسحاق سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا مجھ سے موسیٰ بن فلاں نے بیان کیا وہ اپنے چچا ثمامہ بن انس بن مالک سے اور وہ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو چاشت کی صلوٰۃ بارہ رکعتیں پڑھے گا جنت میں اللہ اس کے لیے سونے کا محل تعمیر کرے گا"۔

ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے، ہمیں اسی سند سے معلوم ہے[4]۔ امام احمد اس باب میں صحیح ترام ہانی کی روایت مانتے تھے۔ موسیٰ ابن فلاں، موسیٰ بن عبداللہ بن مثنیٰ بن انس بن مالک ہیں۔

جامع ترمذی میں ابوسعید خدری سے عطیہ عوفی کی حدیث بھی وارد ہے۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تو اس طرح کہ ہمیں خیال ہوتا آپ نہیں چھوڑیں گے اور چھوڑتے تو اس طرح کہ ہمیں خیال ہوتا کہ آپ نہیں پڑھیں گے"[5] اس حدیث کو انھوں نے حسن غریب کہا ہے۔

---

[1] مستدرک حاکم ۱/۳۱۴۔ ابن خزیمہ (۱۲۲۴) سند حسن ہے، حاکم نے مسلم کی شرط پر اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے، بایں ہمہ محمد بن عمرو کی حدیث کی مسلم نے صرف متابعت میں تخریج کی ہے۔

[2] مصنف کی مذکورہ سند کے علاوہ طریق سے بخاری نے ۱۳/۳۸۵ فی التوحید: باب ولا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له۔ وباب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الماہر بالقرآن مع الکرام البررہ و فی فضائل القرآن: باب من لم یتغن بالقرآن۔ مسلم (۷۹۲) فی صلاۃ المسافرین: باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن۔ ابوداؤد (۱۴۷۳) فی الصلاۃ: باب استحباب الترتیل فی القرآن۔ نسائی ۲/۱۸۰ فی الافتتاح: باب تزیین القرآن بالصوت۔ مسند احمد ۲/۲۷۱ و ۲۸۵ و ۴۵۰۔

[3] اوسط طبرانی ۱/۵۹/۱۔ سلیمان بن داؤد یمامی ابن معین کے مطابق لائق حجت نہیں ہیں۔ بخاری نے انھیں منکر الحدیث کہا ہے۔ ان کی اصطلاح کے مطابق منکر الحدیث اسے کہتے ہیں جس سے روایت کرنا جائز نہ ہو۔ ابن حبان نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے اور دوسروں نے متروک۔ یحییٰ بن ابی کثیر مدلس ہیں۔ ان سے عنعنہ ثابت ہے۔ لہٰذا حدیث صحیح نہیں ہے۔

[4] ترمذی (۴۷۳) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ ابن ماجہ (۱۳۸۰) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ موسیٰ بن فلاں تقریب کے مطابق مجہول ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

[5] ترمذی (۴۷۷) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ۔ مسند احمد ۳/۲۱ و ۳۵۔ عطیہ بن سعد عوفی سیئ الحفظ ہیں۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

مسند میں امام احمد نے کہا ہے ہم سے ابوالیمان نے، انھوں نے کہا ہم سے اسماعیل بن عیاش نے بیان کیا، وہ یحییٰ بن حارث ذماری سے وہ قاسم سے وہ ابوامامہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"وضو کر کے جو صلوٰۃ فرض کو جائے اس کا اجر حالتِ احرام میں رہنے والے حاجی کا ہے اور جو چاشت کی صلوٰۃ کو جائے تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کا ہے اور صلوٰۃ کے بعد صلوٰۃ پڑھے، درمیان میں کوئی لغو بات نہ ہو تو یہ علیین میں مرقوم ہوگی۔"

ابوامامہ فرماتے ہیں "مسجدوں کو آنا جانا جہاد فی سبیل اللہ کے قبیل سے ہے۔"[۱]

حاکم نے کہا ہے ہم سے ابوالعباس نے، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن اسحاق صغانی نے، انھوں نے کہا ہم سے ابومورّع محاضر بن مورّع نے، انھوں نے کہا ہم سے احوص بن حکیم نے بیان کیا، انھوں نے کہا مجھ سے عبداللہ بن عامر الہانی نے بیان کیا، انھوں نے منیب بن عیینہ بن عبداللہ سُلمی سے، انھوں نے ابوامامہ سے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روایت کی ہے۔

"جو کسی مسجد میں باجماعت صلوٰۃ صبح ادا کرے، پھر چاشت تک یہاں موجود رہے اور چاشت کی صلوٰۃ پڑھ لے تو اس کا اجر ایسے حاجی یا عمرہ کرنے والے کا ہے جس کا حج وعمرہ مکمل ہوا ہو۔"[۲]

ابن ابی شیبہ نے کہا ہے، مجھ سے حاتم بن اسماعیل نے بیان کیا، انھوں نے حمید بن صخر سے، انھوں نے مقبری سے، انھوں نے اعرج سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی جو بہت سارا مال غنیمت لائی، اس نے بڑی تیزی سے حملہ کیا تھا۔ ایک شخص نے کہا "جس تیزی سے یہ فوج حملہ آور ہوئی اور جس کثرت سے مال غنیمت لائی ہم نے اس کی نظیر نہیں دیکھی" آپ نے فرمایا:

"بتاؤں کہ اس سے بھی تیز حملہ کرنے والا اور اس سے بھی زیادہ مال غنیمت لانے والا کون ہے؟ وہ شخص جو گھر میں وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر مسجد کا رخ کرے، یہاں صلوٰۃ صبح ادا کرے پھر چاشت کی صلوٰۃ پڑھے، اس کا حملہ اور زیادہ سخت اور اس کا مال غنیمت اور زیادہ ہے۔"[۳]

اس باب میں اس کے علاوہ بھی حدیثیں ہیں مگر یہ سب سے عمدہ ہے۔ حاکم فرماتے ہیں: میں نے ائمۂ حفاظ حدیث کی صحبت اٹھائی ہے انھیں یہی چار رکعتیں پڑھتے دیکھا ہے۔ صحیح حدیثیں اسی کے حق میں ہیں، یہی میرا مذہب ہے۔ دیگر احادیث ماثورہ کے پیش نظر نیز مشائخ حدیث کی اقتدا میں بھی میں اسی کی دعوت دیتا ہوں۔

چاشت کے سلسلہ میں مرفوع احادیث اور اختلاف تعداد کا تذکرہ کرنے کے بعد ابن جریر طبری فرماتے ہیں، ان میں کوئی حدیث قابلِ رد نہیں ہے، تفصیل یہ ہے کہ جس نے چار رکعتیں پڑھنے کی حکایت کی ممکن ہے اس نے آپ کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہو۔ دوسرے نے ایک دوسری حالت میں دو رکعتیں پڑھتے دیکھا، تیسرے نے ایک اور حالت میں

۱۔ مسند احمد ۵/۲۶۸ اس میں یحییٰ بن حارث ذماری کا نام تحریف ہو کر یحییٰ بن خالد ذماری ہو گیا ہے۔ سند حسن ہے۔ ابوداؤد (۱۲۸۸) نے مختصر الفاظ میں یوں روایت کی ہے کہ "صلوٰۃ کے بعد صلوٰۃ جن کے درمیان کوئی لغو نہ ہو علیین میں مرقوم ہوگی۔" سند حسن ہے۔

۲۔ سند ضعیف ہے۔

۳۔ سند حسن کے قابل ہے۔ ابن حبان (۶۲۹) نے ابن ابی شیبہ کے طریق سے اس کی تخریج کی ہے اور اس کو منذری ترغیب وترہیب ۱/۴۲۷، ۴۲۸ میں لاتے ہیں اور کہا ہے کہ ابویعلی نے اس کی روایت کی ہے اور اس کے رجال صحیح اور بزار کے ہیں، بزار نے بھی روایت کی ہے۔ بزار نے وضاحت بھی کی ہے کہ وہ شخص ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اس باب میں مسند احمد کے اندر عبداللہ بن عمر کی ایک حدیث ابن لہیعہ کی روایت سے ہے۔ طبرانی نے اس کی روایت جید سند سے کی ہے۔

آٹھ رکعتیں پڑھتے دیکھا، چوتھے نے چھ، پانچویں نے دو، چھٹے نے دس، ساتویں نے بارہ رکعتوں کی ترغیب آپ سے سماعت کی۔ چنانچہ ہر ایک نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا اس کی روایت کی ہے، فرماتے ہیں ہمارے اس قول کی صحت کی دلیل زید بن اسلم کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر نے اپنی گفتگو میں حضرت ابوذر سے کہا "چچا! مجھے وصیت کیجیے" فرمایا "یہی سوال میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا :

"چاشت کی جو شخص دو رکعتیں پڑھے گا اس کا شمار غافلوں میں نہ ہوگا، جو چار پڑھے گا اس کا شمار عابدوں میں ہوگا، جو چھ پڑھے گا قیامت کے دن اسے کوئی گناہ لاحق نہ ہوگا، جو آٹھ پڑھے گا اس کا شمار قانتوں میں ہوگا اور جو دس پڑھے گا جنت میں اللہ اس کے لیے ایک گھر تعمیر کرے گا"[۱]

مجاہد فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن چاشت کی دو رکعتیں پھر چار پھر ایک دن چھ پھر ایک دن آٹھ پڑھیں پھر چھوڑ دیں"۔ اس حدیث سے ظاہر ہوگیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ یعنی یہ کہ جس کا جیسا مشاہدہ رہا اس نے ویسے ہی روایت کی ہے۔

بات اس طرح ہے تو پھر یہ صحیح ہے کہ یہ صلوٰۃ جتنی تعداد میں آدمی چاہے پڑھے، یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی بھی ہے۔ چنانچہ ہم سے ابن حمید نے، انھوں نے کہا ہم سے جریر نے بیان کیا، وہ ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ اسود سے ایک آدمی نے پوچھا "چاشت کی صلوٰۃ کتنی تعداد میں پڑھوں؟" فرمایا "جتنی چاہو"۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ چاشت کی صلوٰۃ کے بارے میں ترک کی جو احادیث ہیں وہی سند اور عمل صحابہ کے اعتبار سے راجح ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر سے بخاری کی روایت ہے کہ نہ وہ خود پڑھتے تھے نہ حضرت ابو بکر صدیق، نہ حضرت عمر اور راوی نے جب یہ پوچھا کہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو فرمایا "میرا خیال ہے نہیں"[۲]۔ وکیع فرماتے ہیں، ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا ہے، وہ عاصم بن کلیب سے، وہ اپنے والد سے، وہ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک دن چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا ہے"[۳]۔

علی بن مدینی نے کہا، ہم سے معاذ بن معاذ نے، انھوں نے کہا ہم سے شعبہ نے، انھوں کہا ہم سے فضیل بن فضالہ نے بیان کیا، انھوں نے عبدالرحمٰن بن ابوبکرہ سے روایت کی کہ ابوبکرہ نے ایک دن کچھ لوگوں کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا تو فرمایا "تم لوگ ایسی صلوٰۃ پڑھتے ہو جسے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے نہ عام صحابہ نے"[۴]۔

مؤطا امام مالک میں مالک ۔ ابن شہاب ۔ عروہ ۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ کبھی نہیں پڑھی، میں پڑھتی ہوں، رسول اللہ علیہ وسلم عمل کرنا چاہتے مگر اس ڈر سے نہیں کرتے تھے کہ مبادا لوگ عمل کرنے لگیں اور ان پر فرض ہو جائے"[۵]۔

۱۔ بزار سند میں حسین بن عطاء بن یسار مدنی ابوحاتم کے مطابق منکر الحدیث ہیں۔ ابن حبان فرماتے ہیں، منفرد ہوں تو ان کی حدیث سے احتجاج درست نہیں۔ الترغیب والترہیب ۱/۴۳۰ میں منذری نے اسے حضرت ابو درداء کی روایت سے پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ طبرانی نے الکبیر میں اس کی روایت کی ہے، رجال ثقہ ہیں، موسیٰ ابن یعقوب زمعی کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ انھوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے اور دیگر کئی طرق سے روایت کی ہے۔ یہ ان کی سب سے عمدہ سند ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد ۲/۲۳۷، اور فتح الباری ۳/۴۴۔

۲۔ اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

۳۔ سند صحیح ہے۔ ۴۔ سند صحیح ہے۔

۵۔ مؤطا امام مالک ۱/۱۵۲، ۱۵۳ فی قصر الصلاۃ : باب صلاۃ الضحیٰ ۔ بخاری و مسلم ۔ تخریج گذر چکی ہے۔

ابوالحسن علی بن بطّال فرماتے ہیں، حضرت عائشہ کی حدیث کے مطابق سلف کی ایک جماعت چاشت کی قائل نہیں ہے، کچھ لوگ اسے بدعت کہتے ہیں، شعبی نے قیس بن عبید سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمام سال حضرت عبداللہ ابن مسعود کے پاس آتا جاتا رہا مگر آپ کو کبھی چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے نہیں دیکھا۔ شعبہ نے سعد بن ابراہیم سے، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف چاشت کی صلوٰۃ نہیں پڑھتے تھے۔ مجاہد سے روایت ہے، فرماتے ہیں "میں اور عروہ بن زبیر دونوں مسجد میں داخل ہوئے وہاں حضرت عبداللہ بن عمر حجرۂ عائشہ کے پاس بیٹھے تھے، لوگ مسجد میں چاشت کی صلوٰۃ پڑھ رہے تھے، ہم نے ان کی صلوٰۃ کے بارے میں حضرت ابن عمر سے پوچھا تو فرمایا "یہ ایجاد ہے" اور ایک دفعہ فرمایا "کیا ہی بہتر ایجاد ہے"[۱]

شعبی فرماتے ہیں "میں نے حضرت عبداللہ بن عمر کو فرماتے سُنا کہ "چاشت سے بہتر کوئی صلوٰۃ مسلمانوں نے ایجاد نہیں کی"۔ حضرت انس بن مالک سے چاشت کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا "صلوات تو بس پانچ وقتوں کی ہیں"۔

ایک تیسرا گروہ کبھی کبھی چاشت پڑھنا مستحب سمجھتا ہے، ان کے خیال میں کچھ دنوں یہ صلوٰۃ پڑھی جائے کچھ دنوں ترک رکھی جائے۔ امام احمد سے دو روایتوں میں سے یہ ایک ہے۔ طبری نے یہ مذہب ایک جماعت کا نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ جریری کی روایت سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے چنانچہ وہ عبداللہ بن شقیق سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تھے؟" فرمایا "نہیں، البتہ پڑھتے تھے جب باہر سے تشریف لاتے تھے"[۲] اس کے بعد انھوں نے ابوسعید کی حدیث کا تذکرہ کیا ہے جس میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت اس طرح پڑھتے کہ ہمیں خیال ہوتا کہ آپ چھوڑیں گے نہیں اور چھوڑتے تو ہمیں خیال ہوتا کہ اب نہیں پڑھیں گے۔ یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے، اس کے بعد کہا ہے۔ سلف میں جو لوگ چاشت پڑھتے تھے ان کا بھی یہی خیال ہے، شعبہ نے حبیب بن شہید سے اور انھوں نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ایک دن چاشت پڑھتے تھے اور دس دن نہیں پڑھتے تھے۔ شعبہ نے عبداللہ بن دینار سے اور انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ وہ چاشت نہیں پڑھتے تھے مگر مسجد قبا آتے تو پڑھتے تھے، یہاں ہر شنبہ کو وہ آیا کرتے تھے۔ سفیان نے منصور سے روایت کی ہے کہ لوگ فرض صلوٰۃ کی طرح اس کی پابندی مکروہ سمجھتے تھے چنانچہ پڑھتے بھی تھے اور چھوڑتے بھی تھے۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں خواہش کے باوجود چاشت چھوڑ دیتا ہوں اس اندیشے سے کہ اپنے لیے لازمی نہ سمجھ لوں۔ مسروق فرماتے ہیں "ہم مسجد میں قرآن پڑھنے آتے، حضرت عبداللہ بن مسعود کے چلے جانے کے بعد رک جاتے، پھر کھڑے ہو کر چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے، یہ بات حضرت ابن مسعود کو معلوم ہوئی تو فرمایا "اللہ کے بندوں پر وہ بوجھ کیوں ڈالتے ہو جو اللہ نے ان پر نہیں ڈالا ہے، اگر تم ضرور پڑھنا چاہتے ہو تو گھروں میں پڑھ لیا کرو۔ ابومجلز گھر ہی میں چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے تھے۔

یہ گروہ کہتا ہے کہ اولیٰ یہی ہے، مبادا پابندی دیکھ کر کوئی اسے واجب یا سنت مؤکدہ سمجھ بیٹھے۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ نے فرمایا تھا کہ اگر میرے والدین اٹھا دیئے جائیں تو بھی اسے نہ چھوڑوں[۳]۔ وہ یہ صلوٰۃ گھر میں پڑھتی تھیں جہاں انھیں کوئی

---

[۱] الفتح ۳/۴۳ میں حافظ نے جیسا کہ ذکر کیا ہے ابن ابی شیبہ نے اس کی بسند صحیح روایت کی ہے۔ المصنف (۴۸۶۸) میں عبدالرزاق نے سالم سے، انھوں نے اپنے والد عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ شہادت عثمان تک کوئی اسے نہیں پڑھتا رہا ہے، لوگوں نے اس سے زیادہ عمدہ اور کوئی شے ایجاد نہیں کی ہے سند صحیح ہے۔

[۲] اس کی تخریج گذر چکی ہے اور وہ صحیح ہے۔ [۳] موطا امام مالک ۱/۱۵۳ فی قصر الصلاۃ: باب صلاۃ الضحیٰ، سند صحیح ہے۔

دیکھ نہیں سکتا تھا۔

ایک چوتھی جماعت کا خیال ہے کہ کسی سبب سے یہ صلوٰۃ پڑھی جائے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی اسے پڑھا ہے کسی سبب کے تحت ہی پڑھا ہے، فتح مکہ کے دن آپ نے جو آٹھ رکعتیں پڑھیں وہ فتح کے سبب پڑھی تھیں۔ اب فتح کی سنت یہ ہے کہ اس موقع پر آٹھ رکعتیں پڑھی جائیں۔ امراء اسے صلوٰۃ الفتح کے نام سے موسوم کرتے تھے تاریخ طبری میں شعبی سے مذکور ہے کہ خالد بن ولید نے جب حیرہ فتح کیا تو صلوٰۃ الفتح آٹھ رکعتیں پڑھیں جس میں انھوں نے سلام نہیں پھیرا اور فارغ ہوگئے۔ یہ جماعت کہتی ہے کہ ام ہانی کے اس قول "وذلك ضحى" (یہ صلوٰۃ بوقت چاشت تھی) کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ صلوٰۃ بوقت چاشت پڑھی تھی نہ یہ کہ اس کا نام چاشت کی صلوٰۃ تھا۔ عتبان بن مالک کے گھر میں آپ کی صلوٰۃ بھی ایک سبب کے تحت تھی کیونکہ عتبان نے آپ سے کہا تھا کہ "میری آنکھ جواب دے چکی ہے، سیلاب میرے اور میری قوم کی مسجد کے مابین حائل ہے، میری خواہش ہے کہ میرے گھر آپ آکر ایک جگہ صلوٰۃ پڑھ دیتے تو میں اسے مسجد بنا لیتا" آپ نے فرمایا "إن شاء اللہ آؤں گا" فرماتے ہیں "صبح کو میرے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ ابوبکر دن ذرا تیز ہوگیا تو تشریف لائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت طلب کی، میں نے اجازت دی، بیٹھے بغیر فرمایا "گھر میں کس جگہ چاہتے ہو کہ صلوٰۃ پڑھوں" میں نے اس جگہ کا اشارہ کیا جہاں چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ کھڑے ہوگئے، ہم نے آپ کے پیچھے صف باندھی، آپ نے صلوٰۃ پڑھی، سلام پھیرا، ساتھ ہی ہم نے بھی سلام پھیرا" متفق علیہ ہے[1]۔

یہ اس صلوٰۃ کی اصل اور اس کا قصہ ہے۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔ عتبان سے روایت کرنے والے بعض راویوں نے مختصراً یوں روایت کردی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں چاشت کی صلوٰۃ پڑھی، چنانچہ حاضرین نے پیچھے کھڑے ہوکر صلوٰۃ پڑھی۔

حضرت عائشہ کے اس قول "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ صرف اس وقت پڑھتے جب باہر سے تشریف لاتے تھے" سے کھل کر وضاحت ہوجاتی ہے کہ آپ کی یہ صلوٰۃ کسی سبب کے تحت ہوا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ جب سفر سے تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسجد جاکر دو رکعت صلوٰۃ پڑھتے تھے[2]۔

یہ تھا آپ کا طریقہ۔ حضرت عائشہ دونوں کی خبر دیتی ہیں۔ انہی کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی صلوٰۃ کبھی نہیں پڑھی۔

---

[1]۔ بخاری ۳/۵۰ فی التطوع : باب صلاة النوافل جماعة، وفی المساجد : باب اذا دخل بيتا يصلی حيث شاء أو حيث أمر، وباب المساجد فی البيوت، وفی الجماعة : باب الرخصة فی المطر والعلة ان يصلی فی رحله وباب اذا زار الامام قوما فأمهم، وفی صفة الصلاة : باب يسلم حيث يسلم الامام وباب من لم يرد السلام على الامام، وفی المغازی : باب شهود الملائكة بدرًا وفی الأطعمة : باب الخزيرة، وفی الرقاق : باب العمل الذی ابتغی به وجه الله وفی استتابة المرتدين والمعاندين : باب ماجاء فی المتأولين ـ مسلم (۳۳) فی الإيمان : باب الدليل على ان من مات على التوحيد، وفی المساجد : باب الرخصة فی التخلف عن الجماعة بعذر، رقم خاص (۲۶۳) نسائی ۲/۱۰۵ فی الاقامة : باب الجماعة للنافلة۔ ابن ماجہ (۷۵۴) فی المساجد : باب المساجد فی الدور، مسند احمد ۴۴۹/۵ و ۴۵۰۔

[2]۔ بخاری ۱/۴۴۷، فی الصلاة : باب الصلاة اذا قدم من سفر، یہ کعب بن مالک کی لمبی حدیث کا ایک حصہ ہے جس میں انھوں نے غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کی داستان سنائی ہے۔ مسلم (۷۱۶) فی صلاة المسافرين : باب استحباب الركعتين فی المسجد لمن قدم من سفر۔ ابوداؤد (۲۷۸۱) فی الجهاد : باب فی الصلاة عند القدوم من السفر۔ نسائی ۲/۵۴، فی المساجد : باب الرخصة فی الجلوس فی المسجد والخروج منه بغير صلاة۔ مسند احمد ۶/۳۱ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

آپ نے مثبت طور پر جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے یہ صلوٰۃ کسی سبب کے تحت پڑھی ہے۔ جیسے سفر سے واپسی پر، فتح مکہ کے موقع پر، کسی قوم کی زیارت وغیرہ پر۔ صلوٰۃ کے لیے مسجد قبا تشریف لانا بھی ایک سبب ہے۔ ایسے ہی یوسف بن یعقوب کی وہ روایت بھی ہے جس میں انھوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن ابوبکر نے، انھوں نے کہا ہم سے مسلم بن رجاء نے، انھوں نے کہا ہم سے شعثاء نے بیان کیا۔ کہتی ہیں "ابن ابی اوفیٰ کو دیکھا کہ اس دن چاشت کے وقت دو رکعتیں ادا کیں جب دن ابوجہل کے قتل کی خوشخبری سنائی گئی" یہ روایت اگر صحیح ہے تو فتح کی طرح یہ بھی شکرانہ کی صلوٰۃ ہوئی جو بوقت چاشت ادا کی گئی تھی۔ حضرت عائشہ نے نفی جس صلوٰۃ کی فرمائی ہے اصل میں وہ صلوٰۃ ہے جسے لوگ بغیر کسی سبب کے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے اسے مکروہ یا مخالف سنت نہیں کہا بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ آپ نے یہ صلوٰۃ بغیر سبب نہیں پڑھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلوٰۃ کی وصیت فرمائی ہے، دعوت دی ہے اور تاکید فرمائی ہے۔ آپ خود قیام لیل کے باعث اس سے بے نیاز تھے۔ چاشت کی صلوٰۃ گویا تہجد کا بدل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ○ (فرقان: ٦٢)

اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے۔

حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ فرماتے ہیں، یہاں "خلفة" کا مفہوم عوض اور قائم مقام کا ہے لہٰذا جس کسی کا شب و روز کا کوئی عمل فوت ہو جائے وہ ایک کی دوسرے کے اندر قضا کر سکتا ہے۔

قتادہ کا قول ہے کہ شب و روز کے اندر اللہ کے حق میں جو تمھارے بہتر اعمال ہوں انھیں ادا کرو، یہ دو سواریاں ہیں جو لوگوں کو پشت پر لاد کر ان کی مدتہائے حیات تک پہنچا رہی ہیں، ہر دور منزل کو قریب تر لا رہی ہیں، ہر شے کو پرانی کر رہی ہیں اور انسان سے جو وعدے کیے گئے ہیں قیامت تک انھیں بروئے کار لاتی رہیں گی۔

شقیق فرماتے ہیں: حضرت عمر بن الخطاب سے ایک شخص نے کہا "آج رات صلوٰۃ فوت ہو گئی ہے"، آپ نے فرمایا "شب میں فوت ہو جائے تو دن میں اس کا ادراک کر و کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شب و روز کو ایک دوسرے کا قائم مقام انہی لوگوں کے لیے بنایا ہے جو ذکر یا شکر ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اس مسلک کے حاملین دلیل کے طور پر یہ بھی کہتے ہیں کہ صحابہ کا عمل بھی یہی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس ایک دن پڑھتے تھے اور دس دن چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نہیں پڑھتے تھے، صرف مسجد قبا آتے تو پڑھ لیا یہاں ہر شنبہ کو آیا کرتے تھے۔ سفیان نے منصور سے روایت کی ہے کہ صحابہ فرض صلوات کی طرح اس کی پابندی مکروہ تصور کرتے تھے چنانچہ پڑھتے بھی تھے اور چھوڑتے بھی تھے۔ انھوں نے کہا ہے، حضرت انس سے ایک صحیح حدیث بھی وارد ہے کہ ایک انصاری بہت موٹے تھے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "میں آپ کے ساتھ صلوٰۃ پڑھنے کی قدرت نہیں رکھتا" انھوں نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا اور گھر پر مدعو کیا، چٹائی کے ایک طرف پانی چھڑکا، آپ نے اس پر دو رکعتیں صلوٰۃ ادا کیں۔ حضرت انس فرماتے ہیں "بس اسی دن آپ کو چاشت کی صلوٰۃ پڑھتے دیکھا"[له] یہ بخاری کی روایت ہے۔

له۔ بخاری ۲/۱۳۳، فی صلاۃ الجماعۃ : باب ھل یصلی الامام بمن حضر وھو یخطب یوم الجمعۃ فی المطر، وفی التطوع : باب صلاۃ الضحیٰ فی الحضر، وفی الادب : باب الزیارۃ ومن زار (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مرفوع احادیث اور آثارِ صحابہ پر جو غور کرے گا وہ اسی مسلک کو برحق پائے گا۔ ترغیبی احادیث اور وصیت کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوذر کی روایت کردہ صحیح حدیثوں میں بھی یہ دلیل موجود نہیں ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ کوئی سنتِ مؤکدہ کا درجہ رکھتی ہے، حضرت ابوہریرہ کو اس کی وصیت آپ نے محض اس وجہ سے فرمائی تھی کہ شب میں وہ صلوٰۃ کے بمقابلہ درس حدیث زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے قیام لیل کے عوض انھیں چاشت کی وصیت فرمائی، سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے کی وصیت بھی اسی لیے کی تھی حالانکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نیز دیگر صحابہ کو آپ نے ایسا حکم نہیں دیا تھا۔

اس سلسلہ کی عام حدیثیں سند کے اعتبار سے محلِ نظر ہیں، چنانچہ کچھ منقطع ہیں، کچھ موضوع ہیں جن سے استدلال جائز نہیں۔ جیسے وہ حدیث جو حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی گئی ہے کہ

"چاشت کی صلوٰۃ جو شخص ایسی پابندی سے پڑھے گا کہ صرف بیماری ہی اسے جدا کرسکے تو میں اور وہ دونوں بحرِ نور میں سفینۂ نور پر ہوں گے۔"

یہ حدیث زکریا بن دُوید کندیؔ[1] کی وضع کردہ ہے جسے اس نے حُمید سے روایت کی ہے۔ یعلی بن اشدق نے عبداللہ بن جراد سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ

"چاشت کی صلوٰۃ جو شخص ادا کرے اسے وہ مستقل عبادت سمجھ کر ادا کرے کیونکہ آدمی سال بھر ادا کرکے جب اسے فراموش کردیتا ہے تو اس کے لیے وہ اسی طرح تڑپتی ہے جس طرح کھو جانے پر اونٹنی بچہ کے لیے تڑپتی ہے۔"

حیرت ہے کہ کس طرح حاکم اس جیسی احادیث سے استدلال کرتے ہیں، انھوں نے الگ سے ایک کتاب صلوٰۃ چاشت کے موضوع پر قلمبند فرمائی ہے، اس میں اس حدیث کا بھی تذکرہ کردیا ہے، حالانکہ یہ سرتاسر موضوع ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں یعلی بن اشدق اپنے چچا عبداللہ بن جراد سے بکثرت منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ وہ اور ان کے چچا دونوں غیر معروف ہیں۔ ابومسہر کا یہ بیان مجھے ملا ہے کہ میں نے یعلی بن اشدق سے پوچھا "تمہارے چچا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی حدیثیں سنی ہیں" اس نے کہا، جامع سفیان، مؤطا مالک اور کچھ فوائد کی۔ ابوحاتم بن حبان فرماتے ہیں "عبداللہ بن جراد سے یعلی کی ملاقاتیں رہیں مگر جب بوڑھے ہوگئے تو ان کی خدمت میں وہ بھی حاضر ہونے لگا جس کا کوئی دین نہ تھا، چنانچہ اس کے لیے تقریباً دو سو حدیثیں وضع کی گئیں، یعلی بلا جانے بوجھے ان کی روایت کرنے لگے۔ یہ وہی شخص ہیں جن سے ہمارے اصحاب کے بعض مشائخ نے پوچھا "عبداللہ بن جراد سے کیا سنا ہے؟ تو کہا "یہ نسخہ" اور جامع سفیان۔ ان سے روایت کرنا بہرحال جائز نہیں ہے۔

اسی طرح عمر بن صبح نے مقاتل بن حیّان سے حضرت عائشہ کی مقدم الذکر جس حدیث کی روایت کی ہے اور جسے حاکم نے اپنی کتاب "صلوٰۃ الضحیٰ" میں نقل کیا ہے وہ بھی موضوع ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی صلوٰۃ بارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ وضع کا الزام عمر بن صبح پر ہے۔ بخاری فرماتے ہیں: مجھ سے یحییٰ نے بیان کیا،

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قوما فطعم عندهم۔ مسند احمد ۳/۱۳۰ و ۱۸۴ و ۲۹۱ میں بھی یہ روایت آئی ہے۔

[1] اصل نسخہ میں "دُرید" تحریف ہے، ذہبی نے میزان میں لکھا ہے کہ یہ مالک، ثوری اور کبار ائمہ سے سماع کا مدعی کذاب اور ایک سو تیس سالہ عمر کا دعویدار تھا۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا اور انھیں حمید الطویل کی جانب منسوب کرتا تھا۔ اس تبصرہ کے بعد زیر بحث حدیث کا ذکر کیا ہے۔

انھوں نے علی بن جریر سے روایت کی ہے کہ عمر بن صبح کو یہ کہتے سنا ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ میں نے ہی وضع کیا ہے"۔ ابن عدی نے انھیں منکر الحدیث اور ابن حبان نے کہا ہے کہ حدیثیں وضع کر کے ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا تھا، اس کی حدیثیں قلمبند کرنا صرف برائے حیرت و تعجب جائز ہے۔ دار قطنی اسے متروک اور ازدی کذاب کہتے ہیں۔

یہی حال عبد العزیز بن ابان کی روایت کا بھی ہے جسے انھوں نے ثوری سے، انھوں نے حجاج بن فرافصہ سے، انھوں نے مکحول سے اور انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ "چاشت کی صلوٰۃ کا جو شخص پابند رہے گا اس کے گناہ بخشے جائیں گے خواہ ٹڈیوں کی تعداد میں ہوں، سمندر کی جھاگ سے زیادہ ہوں" حاکم نے اسے بھی نقل کیا ہے۔ عبد العزیز کو ابن نمیر نے کذاب کہا ہے، یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے، کذاب خبیث حدیثیں وضع کرتا تھا۔ بخاری، نسائی اور دار قطنی نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔

نہاس بن قہم کی حدیث کا بھی یہی حال ہے جسے اس نے شداد سے، انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "چاشت کی جفت صلوٰۃ کی جو پابندی کرے گا اس کے گناہ بخشے جائیں گے خواہ سمندر کے جھاگ سے زیادہ ہوں"[1]۔ نہاس کے بارے میں یحییٰ نے کہا ہے کہ ضعیف ہے، لائق حجت نہیں، عطاء عن ابن عباس سے منکر روایتیں لاتا ہے۔ نسائی نے ضعیف کہا ہے، ابن عدی نے کہا ہے کہ کچھ بھی لائق حجت نہیں، ابن حبان فرماتے ہیں ثقہ راویوں کے خلاف مشاہیر سے منکر حدیثیں روایت کرتا تھا۔ ایسے راوی سے استدلال جائز نہیں۔ دار قطنی نے مضطرب الحدیث قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یحییٰ قطان کے نزدیک یہ متروک ہے۔

حمید بن صخر نے مقبری سے انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے جو مقدم الذکر حدیث بیان کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ بھیجا . . . ." تو ملاحظہ کیجیے کہ نسائی اور ابن معین نے اسے ضعیف اور دوسروں نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ان کی بعض حدیثیں منکر ہیں، منفرد ہوں تو لائق احتجاج نہیں رہ جاتے۔ واللہ اعلم۔

محمد بن اسحاق نے موسیٰ عن عبد اللہ بن مثنیٰ عن انس عن عمہ ثمامہ عن انس سے مرفوعاً یہ حدیث بیان کی ہے کہ "جو چاشت پڑھے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے سونے کا محل تعمیر کرے گا"۔ یہ غریب احادیث میں سے ہے۔ چنانچہ ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، ہمیں صرف اسی سند سے معلوم ہوئی ہے۔

نعیم بن ہمار کی حدیث "اے ابن آدم! میرے لیے ابتدائے دن میں چار رکعتوں کی ادائیگی سے عاجز نہ ہونا میں آخر دن تک تمھارے حق میں کافی ہوں گا" اور اسی طرح حضرت ابو درداء اور حضرت ابو ذر کی حدیثوں کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک ان چار رکعتوں سے مراد فجر کی صلوٰۃ اور اس کی سنت ہے۔

سجدۂ شکر کے باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی مسرت خیز نعمت حاصل ہوتی یا کوئی مصیبت دور ہو جاتی تو

---

[1] ترمذی (۴۷۶) ابن ماجہ (۱۳۸۲) بسند نہاس بن قہم عن شداد ابو عمار عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

سجدۂ شکر بجالاتے ۔ جیساکہ مسند میں ابوبکرہ سے روایت ہے " نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی خوش کن بات پر ادائیگی شکر کے لیے اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوجاتے تھے[1]

ابن ماجہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت کی تکمیل کی خوشخبری دی جاتی تو آپ اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوجاتے[2]

بیہقی نے بخاری کی شرط پر ایک سند سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمدان والوں کے اسلام کی خبر لکھ کر بھیجی تو سجدہ میں گر گئے اور پھر سر اٹھا کر فرمایا " ہمدان والوں پر سلامتی ہو، ہمدان والوں پر سلامتی ہو" حدیث کا ابتدائی حصہ صحیح بخاری میں[3] اور یہ حصہ تمام کا تمام بخاری کی سند پر بیہقی کے اندر ہے[4]

مسند میں عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت ہے کہ پروردگار کی جانب سے جب یہ خوشخبری آپ کو ملی کہ جو تم پر درود بھیجے گا میں اس پر رحمت نازل کروں گا اور جو تم پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلامتی نازل کروں گا" تو آپ شکریہ کے طور پر سجدہ میں چلے گئے[5]

سنن ابوداؤد میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھاکر اللہ تعالیٰ سے ایک گھنٹہ دعا فرمائی، پھر اس کے بعد تین بار سجدہ میں گرے ۔ بعد میں فرمایا :

" میں نے اپنے رب سے اپنی دعا میں امت کی سفارش کی تو اس نے مجھے ایک ثلث عطا کیا، چنانچہ شکریہ میں سجدہ ریز ہوگیا، سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے پھر درخواست کی تو دوسرا ثلث عطا ہوا، چنانچہ رب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے پھر سجدہ میں گیا، سر اٹھا کر پھر اپنی امت کے لیے دعا کی تو بقیہ ثلث بھی عطا ہوا چنانچہ اپنے رب کے آگے سجدہ ریز ہوگیا"[6]

قبولیت توبہ کی خوشخبری حضرت کعب بن مالک کو پہنچی تو وہ بھی سجدہ میں چلے گئے، اس کا ذکر بخاری نے کیا ہے[7]

---

[1] - مسند احمد ۴۵/۵، حدیث ابوبکرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں وہ موجود تھے، خوشخبری لانے والا دشمن پر آپ کے ایک فوجی دستہ کی کامیابی کی خبر لایا، اس وقت آپ کا سر حضرت عائشہ کی گود میں تھا۔ کھڑے ہو کر آپ نے سجدہ کیا۔ پھر خوشخبری لانے والے سے دریافت حال فرمایا۔ منجملہ اطلاعات کے یہ خبر بھی دی کہ انھوں نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنالیا تھا۔ آپ نے فرمایا " اب عورتوں کی بات مان کر لوگ ہلاک ہوں گے، عورتوں کی بات مان کر لوگ ہلاک ہوں گے" تین بار فرمایا۔

ترمذی (۱۵۷۸) فی السیر : باب ماجاء فی سجدۃ الشکر ۔ ابوداؤد (۲۷۷۴) فی الجھاد : باب فی سجود الشکر۔ ابن ماجہ (۱۳۹۴) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ والسجدۃ عند الشکر۔ ابوداؤد کی حدیث یہ ہے " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی خوش کن معاملہ یا کوئی خوشخبری دی جاتی تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں چلے جاتے" سند حسن ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت کعب بن مالک کو جب قبولیتِ توبہ کی بشارت دی گئی تو اس موقع کی جو حدیث انھوں نے روایت کی ہے وہ بھی اس باب میں داخل ہے۔ ان کا قصہ متفق علیہ ہے۔ یہ اور دوسرے قصے آگے آئیں گے۔

[2] - ابن ماجہ (۱۳۹۲) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ والسجدۃ عند الشکر۔ سند میں ابن لہیعہ سیئ الحفظ ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں۔ ماقبل کی حدیث شاہد ہے۔ لہٰذا حسن کے درجہ میں ہے۔

[3] - دیکھیے بخاری ۵۲/۸، فی المغازی : باب بعث علی بن ابی طالب وخالد بن الولید إلی الیمن ۔

[4] - سنن بیہقی ۳۶۹/۲ ۔

[5] - احمد ۱۹۱/۱، سند میں عبدالواحد بن محمد بن عبدالرحمٰن بن عوف کو ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بقیہ رجال ثقہ ہیں، شواہد کے اعتبار سے حسن ہے۔

[6] - ابوداؤد (۲۷۷۵) فی الجھاد : باب فی سجود الشکر، سند میں موسیٰ بن یعقوب زمعی سیئ الحفظ ہیں اور دو مجہول بھی ہیں۔

[7] - بخاری ۲۸۹/۵، فی الوصایا : باب اذا تصدق، ووقف بعض مالہ، وفی الجھاد : باب من اراد (بقیہ اگلے صفحہ پر)

احمد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت پیش کی ہے کہ خوارج کے مقتولین میں جب ذوالثدیہ کو دیکھا تو وہ سجدے میں چلے گئے۔[1]

سعید بن منصور نے ذکر کیا ہے کہ مسیلمہ کے قتل کی اطلاع پہنچی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سجدہ میں چلے گئے۔[2]

سجدۂ قرآن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کی کسی آیت سے گذرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں چلے جاتے، گاہ اس سجدہ میں یہ دعا پڑھتے۔

سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ[3]

میرا چہرہ اس ذات کے آگے سجدہ ریز ہے جس نے اسے پیدا کیا، اس کی صورت گری کی، اس میں پھاڑ کر اپنی تدبیر اور قوت سے کان اور آنکھ بنائی۔

کبھی یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ احْطُطْ عَنِّي بِهَا وِزْرًا وَاكْتُبْ لِي بِهَا أَجْرًا وَاجْعَلْهَا لِي عِنْدَكَ ذُخْرًا وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ۔[4]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) غزوۃ فوری بغیرھا، وفی الأنبیاء : باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وفی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم : باب وفود الانصار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ۔ وفی المغازی : باب قصۃ غزوۃ بدر، وباب غزوۃ تبوک، وفی تفسیر سورۃ براءۃ (لقد تاب اللہ علی النبی) وباب (وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا) وباب (یاایُّھا الذینَ آمَنوا اتَّقُوا اللّٰہَ وکونوا مع الصّٰادقینَ) وفی الاستئذان : باب من لم یسلم علی من اقترف ذنبا۔ وفی الأیمان والنذور وباب اذا اھدیٰ مالہ علی وجہ النذر والتوبۃ، وفی الاحکام : باب ھل للامام أن یمنع المجرمین واھل المعصیۃ من الکلام معہ والزیارۃ۔ مسلم (۲۷۶۹) فی التوبۃ : باب حدیث توبۃ کعب بن مالک۔ ترمذی (۳۱۰۱) فی التفسیر : باب ومن سورۃ البراءۃ۔ ابوداؤد (۲۲۰۲) فی الطلاق : باب فیما عنی بہ الطلاق والنیات۔ وفی الجہاد : باب اعطاء البشیر، وفی النذور : باب من نذر ان یتصدق بمالہ۔ مسند احمد ۳/۴۵۹ و ۴۶۰۔ طبری (۱۷۴۴۷) حدیث میں اور بہت سارے افادات ہیں جن کا ذکر حافظ نے الفتح ۸/۹۳، ۹۵ میں کیا ہے۔

[1] حسن ہے۔ مسند احمد رقم (۸۴۴) و (۱۲۵۴)

[2] بیہقی ۲/۳۷۱۔ شرح السنۃ ۳/۳۱۶ میں لغوی فرماتے ہیں : جس نعمت کا عرصہ سے انتظار ہو اس کے حاصل ہونے پر یا جس مصیبت کے دور ہو جانے کی توقع ہو اس کے دور ہو جانے پر یا کسی مبتلائے مرض یا معصیت کو دیکھ کر سجدۂ شکر بجالانا سنت ہے۔ مریض سے یہ سجدہ چھپا کر کیا جائے گا تاکہ اس کے لیے ناشکری کا باعث نہ بن جائے اور عاصی کو دکھا کر کیا جائے گا تاکہ اسے توبہ کی توفیق ہو سکے۔

[3] مسند احمد ۶/۳۱ و ۲۱۷۔ ترمذی (۵۸۰) فی الصلاۃ : باب مایقول فی سجود القرآن۔ ابوداؤد (۱۴۱۴) فی الصلاۃ : باب مایقول اذا سجد۔ نسائی ۲/۲۲۲، فی الافتتاح : باب الدعاء فی السجود۔ سند حسن ہے، ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ حاکم نے ۱/۲۲۰ میں اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[4] راوی حضرت ابن عباس۔ ترمذی (۵۷۹) ابن ماجہ (۱۰۵۳) فی اقامۃ الصلاۃ : باب سجود القرآن۔ سند میں حسن بن محمد بن عبید اللہ کو ابن حبان کے علاوہ اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بایں ہمہ ابن خزیمہ (۵۶۲) ابن حبان (۶۹۱) اور حاکم ۱/۲۱۹ و ۲۹۰ نے انھیں صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔

اے اللہ اس کے ذریعہ میرے گناہ جھاڑ دے، میرے حق میں ایک اجر رقم فرما، اپنے یہاں میرے لیے اس کا ذخیرہ فرما، اور اپنے بندے داؤد کی طرح مجھ سے بھی اسے قبول فرما۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کا ذکر اہل سنن نے کیا ہے۔

آپ سے یہ ثابت نہیں کہ سجدہ سے اٹھتے ہوئے کبھی تکبیر کہی ہو۔ خرقی اور متقدمین نے اسی لیے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اسی طرح تشہد اور سلام پھیرنا ثابت نہیں ہے۔ احمد اور شافعی سلام پھیرنے کے قائل نہیں ہیں۔ شافعی سے منصوص یہ ہے کہ اس میں نہ تشہد ہے نہ سلام۔ احمد فرماتے ہیں کہ اس میں سلام پھیرنے کی بات تو مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔

یہ ثابت ہے کہ (الٓمٓ تنزیل)، (صٓ)، (النجم)، (إِذَا السَّمَآءُ انشَقَّتْ) اور (اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ) میں آپ نے سجدہ کیا ہے۔

ابوداؤد نے حضرت عمرو بن العاص سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پندرہ سجدے بتائے۔ ان میں تین مفصل کے اور دو سورۂ حج کے ہیں[1]

حضرت ابودرداء کی اس حدیث میں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گیارہ سجدے کیے" مفصل کا کوئی ذکر نہیں، اس میں (الاعراف)، (الرعد)، (النحل)، (بنی اسرائیل)، (مریم)، (حج)، (سجدۃ الفرقان)، (النمل)، (السجدۃ)، (ص) اور (سجدۂ حوامیم) آتے ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے کہ ابودرداء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گیارہ سجدوں کی روایت کی ہے مگر اس کی سند کمزور ہے[2]

حدیث "لم يسجد في المفصل" کے راوی ابوقدامہ کا ضعف

حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ حدیث کہ "مدینہ منتقل ہونے کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفصل میں سجدہ نہیں کیا"، جس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے[3] ضعیف ہے۔ سند میں ابوقدامہ حارث بن عبید لائق حجت نہیں امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوقدامہ مضطرب الحدیث ہیں۔ یحییٰ بن معین انھیں ضعیف کہتے ہیں۔ نسائی فرماتے ہیں کہ صدوق ہیں مگر منکر احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ ابوحاتم بستی فرماتے ہیں کہ صالح شیخ تھے مگر کثرت سے انھیں وہم ہو جایا کرتا تھا۔ ابن قطان نے انھیں مطر الوراق کی وجہ سے معلول بتایا ہے اور کہا ہے کہ سوء حفظ میں ان کے مشابہ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ تھے، انھوں نے اس حدیث کی تخریج پر مسلم پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔

---

[1] ابوداؤد (۱۴۰۱) فی الصلاۃ: باب تفریع ابواب السجود وكم سجدة في القرآن - ابن ماجہ (۱۰۵۷) فی اقامۃ الصلاۃ: باب عدد سجود القرآن - حاکم ۱/۲۲۳، سند میں حارث بن سعید عتقی کو ابن حبان کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے، اس میں ان کے شیخ عبداللہ بن منین مجہول ہیں، ان سے حارث کے سوا اور کسی نے روایت نہیں کی ہے۔

[2] ترمذی (۵۶۸) و (۵۶۹) فی الصلاۃ: باب ما جاء في سجود القرآن - ابن ماجہ (۱۰۵۶) سند میں عمر بن حیان دمشقی جیسا کہ حافظ نے التقریب میں کہا ہے مجہول ہیں۔

[3] ابوداؤد (۱۴۰۳) فی الصلاۃ: باب من یر السجود في المفصل۔

حاکم اور ابن حزم پر تنقید اور مسلم کا طریقہ

مگر اس حدیث کی تخریج کر کے مسلم نے کوئی معیوب کام نہیں کیا کیونکہ اس طرح کی حدیثوں میں انتخاب وہ اسی کا کرتے ہیں جن کے بارے میں راوی کی جانب سے اسے محفوظ رکھنے کا انھیں یقین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ثقہ راویوں کی وہ حدیثیں رد کر دیتے ہیں جن کے بارے میں غلط بیانی کا انھیں علم ہو جاتا ہے۔ ثقہ راویوں کی تمام حدیثوں کی تخریج اور خراب یاداشت والے تمام راویوں کی حدیثوں کو ضعیف قرار دے دینا دونوں ہی موقف غلط ہیں۔ پہلا حاکم وغیرہ کا طریقہ ہے۔ دوسرا محمد بن حزم وغیرہ کا۔ مسلم کا طریقہ اس باب میں وہی ہے جو اس فن کے ائمہ کا ہوا کرتا ہے۔ واللہ المستعان۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ) اور (إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ) میں سجدہ کیا ہے[1]۔ ہجرت مدینہ کے چھ یا سات سال بعد وہ اسلام لاتے ہیں۔ دونوں حدیثیں بہر پہلو متعارض اور صحت میں ایک دوسرے کے درجہ کی ہوں پھر بھی حضرت ابوہریرہ کی حدیث مقدم ہوگی کیونکہ اس میں اثباتی اضافہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے کوئی بات مخفی رہ سکتی ہے مگر یہاں تو حضرت ابوہریرہ کی حدیث صحت کے انتہائی درجہ میں ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے، مگر حضرت ابن عباس کی حدیث ضعیف ہے۔ پھر کیوں نہ حضرت ابوہریرہ کی روایت کا پلہ بھاری ہو۔ واللہ اعلم۔

جمعہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ اور یوم جمعہ کی خصوصیات کا بیان

صحیحین میں آپ کا یہ قول ثابت ہے کہ

"ہم پچھلے لوگ قیامت کے دن سب سے اول اور سب سے آگے ہوں گے، فرق یہ ہے کہ ہم سے پہلے انھیں کتاب دی گئی پھر یہ (جمعہ کا دن) بھی تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا مگر انھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا، چنانچہ اس نے ہمیں اس کی ہدایت دے دی۔ لوگ اس باب میں ہمارے تابع ہوں گے، یہود کل اور نصاریٰ پرسوں[2]"

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت حذیفہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت ہے:

---

[1]۔ مسلم (۵۷۸) فی المساجد: باب سجود التلاوۃ۔ ترمذی (۵۷۳) و (۵۷۴) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی السجدۃ فی اقرء باسم ربک الذی خلق و اذا السماء انشقت۔ ابوداؤد (۱۴۰۷) فی الصلاۃ: باب فی السجود فی اذا السماء انشقت واقرء۔ نسائی ۲/۱۶۲ فی الافتتاح: باب السجود فی اقرء باسم ربک الذی خلق۔ ابن ماجہ (۱۰۵۸) فی اقامۃ الصلاۃ: باب عدد سجود القرآن۔

[2]۔ بخاری ۲/۲۹۳، ۲۹۴ فی الجمعۃ: باب فرض الجمعۃ، وباب هل علی من یشهد الجمعۃ غسل، وفی الانبیاء: باب ماذکر عن بنی اسرائیل۔ مسلم (۸۵۵) فی الجمعۃ: باب هدایۃ هذه الامۃ لیوم الجمعۃ۔ نسائی ۳/۸۵، ۸۶ فی الجمعۃ: باب ایجاب الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۰۸۳) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فی فضل الجمعۃ۔

”ہم سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اللہ نے جمعہ سے ہٹا کر دور کر دیا، چنانچہ یہود کا سنیچر رہا اور نصاریٰ کا اتوار۔ اللہ نے ہمیں برپا کیا اور یوم جمعہ کی توفیق عطا فرمائی۔ چنانچہ اول حیثیت جمعہ کی پھر سنیچر کی پھر اتوار کی بنائی، اسی طرح وہ قیامت کے دن بھی ہمارے پیچھے ہوں گے، دنیا میں ہم سب سے بعد میں ہیں مگر قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے، ہمارا فیصلہ مخلوقات سے پہلے ہوگا۔“[1]

مسند اور سنن میں اوس بن اوس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

”تمہارا اشرف ترین دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا، اسی دن ان کی روح قبض ہوئی، اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی دن صَعقہ (شدید گرج) ہوگا، لہٰذا اس دن زیادہ سے زیادہ مجھ پر درود بھیجو کیونکہ یہ میرے اوپر پیش کیے جاتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ! آپ بوسیدہ ہو چکے ہوں گے تو اس وقت کیسے ہمارے درود آپ پر پیش کیے جائیں گے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین کے لیے انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔“[2]

حاکم نے مستدرک میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کرتے ہیں:

”سب سے بہتر دن جس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا، اسی دن وہ جنت میں داخل کیے گئے، اسی دن اس سے نکالے گئے، قیامت بھی جمعہ ہی کے دن آئے گی۔“[3]

ترمذی نے اسے حسن صحیح اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مستدرک ہی میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ مرفوع حدیث وارد ہے:

”سب سے بڑا دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن جنت میں داخل کیے گئے، اسی دن اس سے نکالے گئے، قیامت بھی جمعہ ہی کے دن آئے گی۔“[4]

مؤطا میں امام مالک نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کی ہے:

”سب سے بہتر دن جس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن زمین پر اتارے گئے، اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی، اسی دن انتقال ہوا اور اسی دن قیامت برپا ہوگی،

---

[1] مسلم (۸۵۶)، نسائی ۳/۸۷، ابن ماجہ (۱۰۸۳)۔

[2] مسند احمد ۴/۸۔ ابوداؤد (۱۰۴۷) فی الجمعۃ: باب تفریع ابواب الجمعۃ۔ نسائی ۳/۹۱، ۹۲ فی الجمعۃ: باب اکثار الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۰۸۵) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فضل الجمعۃ۔ سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۷۳۳)، ابن حبان (۵۵۰) اور حاکم ۱/۲۷۸ نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔ منذری اور ابن حجر نے اسے حسن اور نووی نے ”الاذکار“ میں صحیح کہا ہے۔ اس کی ایک شاہد ابن ماجہ (۱۶۳۷) میں حضرت ابو درداء اور ایک دوسری شاہد بیہقی میں حضرت ابو امامہ کی روایت سے آئی ہے۔

[3] ترمذی (۴۸۸) فی الجمعۃ: باب ماجاء فی فضل الجمعۃ۔ نسائی ۳/۸۹، ۹۰ فی الجمعۃ: باب ذکر فضل یوم الجمعۃ۔ مستدرک حاکم ۱/۲۷۸۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ صحیح مسلم (۸۵۴) فی الجمعۃ: باب فضل یوم الجمعۃ میں بھی یہ روایت آئی ہے مگر فاضل مصنف اس کا تذکرہ نہ کر سکے۔

[4] حاکم ۱/۲۷۷، نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام جانور جمعہ کے دن قیامت کے ڈر سے صبح سے طلوع آفتاب تک کان لگائے رکھتے ہیں اور جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں بندۂ مسلم صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی مانگ کرتا ہے اسے اللہ عطا کرتا ہے۔"

کعب نے کہا "یہ وقت سال میں ایک بار آتا ہے؟" میں نے کہا "ہر جمعہ کو آتا ہے" کعب نے تورات پڑھ کر کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: اس کے بعد عبداللہ بن سلام سے ملاقات ہوئی تو کعب کے ساتھ اپنی مجلس کی گفتگو بیان کی۔ انھوں نے فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ وہ گھڑی کون سی ہے، میں نے کہا مجھے بتا دیجیے، فرمایا "یوم جمعہ کا آخری وقت" میں نے کہا! ایسا کیسے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا کہ "صلوٰۃ پڑھتے ہوئے کوئی بندۂ مسلم اسے پائے" اور آپ جو گھڑی بتا رہے ہیں اس میں صلوٰۃ نہیں پڑھی جاتی۔ ابن سلام نے کہا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ:

"جو صلوٰۃ کے انتظار میں بیٹھا رہے وہ صلوٰۃ میں رہتا ہے"[1]

صحیح ابن حبان میں مرفوعاً روایت ہے کہ:

"جمعہ کے دن سے بہتر کوئی دن نہیں جس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے"[2]

مسند شافعی میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک سفید آئینہ لے کر آئے جس میں ایک نکتہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا "یہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ جمعہ کا دن ہے جس کی بدولت آپ اور آپ کی امت کو فضیلت نصیب ہوئی ہے، یہود و نصاریٰ اس سلسلہ میں آپ سے پیچھے ہیں، اس میں آپ کے لیے خیر ہے، اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس میں بندۂ مومن جو دعا مانگتا ہے قبول ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اسے یوم مزید کہتے ہیں" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا "جبرئیل! یوم مزید کیا ہے؟" فرمایا "آپ کے پروردگار نے فردوس میں ایک کشادہ وادی بنائی ہے جس میں مشک کے ٹیلے ہیں، جب جمعہ کا دن ہوگا تو اللہ سبحانہ تعالیٰ جتنا چاہے گا اپنے فرشتے اتارے گا، اس کے گردوپیش نورانی منبر ہیں جن پر نبیوں کی کرسیاں بچھائی گئی ہیں۔ ان منبروں کے اردگرد سونے کے ایسے منبر ہیں جو یاقوت اور زبرجد سے مزین ہیں، ان پر شہداء اور صدیقین بیٹھیں گے، وہ انبیاء کے پیچھے ان ٹیلوں پر بیٹھیں گے تو اللہ عزوجل فرمائے گا! "میں تمھارا رب، تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرچکا، مانگو میں عطا کروں گا" وہ لوگ کہیں گے "ہمارے رب! ہمیں تیرا رضوان چاہیے" رب کہے گا "میں تم سے خوش ہوں، تمھاری آرزو عطا ہوئی، مزید بھی ہے" لہٰذا یہ لوگ اپنے رب سے خیر کی عطا و بخشش پانے کے لیے جمعہ کا دن پسند کریں گے اور یہ وہی دن ہے جس دن آپ کا رب تبارک وتعالیٰ عرش پر متمکن ہوا، اسی

---

[1] موطا امام مالک ۱/۱۰۸-۱۱۰، فی الجمعۃ: باب ماجاء فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ۔ ترمذی (۴۹۱) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی الساعۃ التی ترجی فی یوم الجمعۃ۔ ابوداؤد (۱۰۴۶) فی الصلاۃ: باب فضل یوم الجمعۃ۔ نسائی ۳/۱۱۳، ۱۱۵، فی الجمعۃ: باب ذکر الساعۃ التی یستجاب فیھا الدعاء یوم الجمعۃ۔ احمد ۲/۴۸۶، سند صحیح ہے۔ حاکم ۱/۲۷۸، ۲۷۹ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

[2] ابن حبان (۵۵۱) فی الصلاۃ: باب ما جاء فی یوم الجمعۃ والصلاۃ علی النبی۔ حدیث یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جمعہ کے دن سے زیادہ افضل دن پر آفتاب نہ طلوع ہوتا ہے نہ غروب، ان دونوں اہم مخلوق (جن وانس) کے علاوہ ہر جانور جمعہ کے دن چوکنا ہو جاتا ہے" سند قوی ہے۔

دن آدم کو اس نے پیدا کیا اور اسی دن قیامت آئے گی[۱]
شافعی نے اس کی روایت ابراہیم بن محمد سے، انھوں نے کہا مجھ سے موسیٰ بن عبیدہ نے، انھوں نے کہا مجھ سے ابوازہر معاویہ بن اسحاق بن طلحہ نے بیان کیا، انھوں نے عبداللہ بن عبید سے، انھوں نے عمیر بن انس سے روایت کی ہے۔
پھر فرماتے ہیں، ابراہیم نے ہمیں بتایا کہ مجھ سے ابوعمران ابراہیم بن جعد نے بیان کیا، انھوں نے حضرت انس سے اسی طرح کی حدیث روایت کی ہے[۲]
شافعی اپنے شیخ ابراہیم کے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے، مگر امام احمد نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ اعتزال، جہمیت اور قدریت ہر طرح کی بلائیں ان کے اندر موجود تھیں۔
مذکورہ حدیث کی روایت ابوالیمان حکم بن نافع نے کی ہے، انھوں نے کہا ہم سے صفوان نے بیان کیا، انھوں نے کہا، حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روایت کرتے ہیں کہ "میرے یہاں جبرئیل آئے . . . . ." آگے پوری حدیث بیان کی۔ اس کی روایت محمد بن شعیب نے کی ہے، انھوں نے عمر مولیٰ غفرہ سے، انھوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے، ابوطیبہ نے بھی اس کی روایت کی ہے، وہ عثمان بن عمیر سے وہ حضرت انس سے روایت کرتے ہیں، ابوبکر بن ابوداؤد نے اس کی تمام سندیں جمع کی ہیں۔
مسند احمد میں علی بن ابوطلحہ کی حدیث حضرت ابوہریرہ کی روایت سے آئی ہے۔ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا "جمعہ کے دن کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟" فرمایا "اس دن تمھارے باپ آدم کا پتلا بنایا گیا، اسی دن صَعْقہ (گرج)، بعثہ (اٹھایا جانا) اور بطشہ (گرفت) ہوگا۔ اس دن کے آخری حصہ میں تین گھڑیاں ہیں جن میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اللہ سے دعا کرنے والے کی دعا اس میں مقبول ہوتی ہے[۳]"
حسن بن سفیان نسوی[۴] اپنی مسند کے اندر فرماتے ہیں ہم سے ابومروان ہشام بن خالد ازرق نے، انھوں نے کہا ہم سے حسن بن یحییٰ الخشنی نے، انھوں نے کہا ہم سے عمر بن عبداللہ مولیٰ غفرہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا مجھ سے انس بن مالک نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے۔
"میرے پاس جبرئیل آئے، ان کے ہاتھ میں سفید آئینہ جیسی کوئی چیز تھی جس میں ایک سیاہ نکتہ تھا میں نے کہا "جبرئیل! یہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ جمعہ ہے، اسے دے کر مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے، یہ آپ کے لیے اور آپ کے بعد آپ کی امت کے لیے عید کا دن ہوگا۔" میں نے کہا "جبرئیل! ہمیں اس سے کیا ملے گا؟" فرمایا "آپ کے لیے اس میں خیر کثیر ہے، آپ سب سے بعد میں ہیں مگر قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے، اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ بندۂ مسلم صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اس میں اللہ سے جو مانگتا ہے اسے وہ عطا کرتا ہے۔" میں نے کہا "جبرئیل! یہ

۱۔ مسند شافعی ۱/۱۴۸ اول الجمعۃ : باب فضل یوم الجمعۃ وفیہ ساعۃ الاجابۃ، سند میں شافعی کے شیخ ابراہیم بن محمد جیسا کہ حافظ نے التقریب میں تصریح کی ہے متروک اور موسیٰ بن عبیدہ ضعیف ہیں۔
۲۔ ۱/۱۴۸، ابراہیم بن محمد جیسا کہ گذر چکا ہے متروک اور ابراہیم بن جعد ضعیف ہیں۔
۳۔ مسند احمد ۲/۳۱۱، سند میں فرج بن فضالہ ضعیف ہیں، علی بن ابوطلحہ اور ابوہریرہ کے درمیان انقطاع بھی ہے اس لیے ان کا ان سے سماع ثابت نہیں ہے۔
۴۔ حافظ امام شیخ خراسان ابوالعباس شیبانی نسوی صاحب مسند کبیر و اربعین، ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۷۰۳۔

سیاہ نکتہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ جمعہ کے دن کی ایک گھڑی ہے، جمعہ کا دن سید الایام (سب سے بڑا دن) ہے، ہمارے یہاں اس کا نام یوم مزید ہے۔" میں نے کہا "جبرئیل! یہ یوم مزید کیا ہے؟" فرمایا "ایسا ہے کہ آپ کے رب نے جنت میں سفید مشک کی ایک کشادہ وادی بنائی ہے، ایام آخرت میں جمعہ کے دن پروردگار عزوجل عرش سے کرسی پر آجائے گا، کرسی نورانی منبروں سے گھری ہوگی، جن پر انبیاء بیٹھیں گے، منبر زریں کرسیوں سے گھرے ہوں گے جن پر صدیقین اور شہدا بیٹھیں گے اور بالاخانہ والے اپنے بالاخانوں سے اتر کر مشک کے ٹیلوں پر بیٹھیں گے مگر منبر اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر رشک نہ کریں گے، پھر جلال واکرام والا نمودار ہوگا اور کہے گا "مانگو" سب بول اٹھیں گے "یارب ہم تیری رضا چاہتے ہیں" وہ ان کے حق میں رضا کی یقینی خبر دے گا، پھر کہے گا "مانگو" وہ اتنا مانگیں گے کہ ہر بندہ نہال ہو جائے گا۔ جبرئیل نے کہا "پھر ایسی شے کا ان پر دور چلے گا کہ اسے کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا نہ کسی کان نے سنا ہوگا نہ کسی دل میں اس کا تصور گذرا ہوگا۔ پھر جبار اپنی کرسی سے اٹھ کر عرش کو اور بالاخانے والے اپنے بالاخانوں کو جائیں گے۔ یہ بالاخانے سفید موتیوں یا سرخ یاقوت یا سفید زمرد کے بنے ہوں گے، ان میں کسی طرح کا کوئی شگاف نہ ہوگا اور نہ تو کوئی عیب ہوگا جس پر قلعی کی گئی ہو، ان کی نہریں انھیں کے اندر ہوں گی، یا فرمایا کہ جاری ہوں گی، ان کے پھل لٹکے ہوئے ہوں گے، ان میں ان کی بیویاں، خادم اور مکانات ہوں گے۔ پس اہل جنت جنت میں یوم جمعہ پر اسی طرح خوشی منائیں گے جس طرح دنیا والے دنیا میں بارش پر خوش ہوتے ہیں [۱]۔

ابن ابی الدنیا اپنی کتاب "صفۃ الجنۃ" میں فرماتے ہیں، مجھ سے ازہر بن مروان رقاشی نے، انھوں نے کہا مجھ سے عبداللہ بن عرادہ شیبانی نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہم سے قاسم بن مطیب نے بیان کیا، انھوں نے اعمش سے، انھوں نے ابو وائل سے، انھوں نے حذیفہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"میرے پاس جبرئیل آئے، ان کے ہاتھ میں انتہائی عمدہ اور انتہائی روشن ایک آئینہ تھا، بیچ میں کیا نظر آیا جیسے ایک سیاہ چمک سی، میں نے کہا "یہ چمک کیسی نظر آرہی ہے؟" فرمایا "یہ جمعہ ہے" میں نے کہا "جمعہ کیا ہے؟" فرمایا "آپ کے رب کے ایام میں ایک یوم عظیم ہے، دنیا میں اس کا شرف و مقام کیا ہے، جمعہ والوں کو اس دن کیا توقعات ہیں اور آخرت میں اس کا نام کیا ہے؟ ان سب کی تفصیل بتاؤں گا۔ دنیا میں اس کا شرف و مرتبہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ساری مخلوقات کی بات اس میں جمع کر دی ہے۔ اہل جمعہ کو اس دن متوقع یہ ہے کہ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ جو مسلمان بندہ یا کنیز اللہ سے دعا کرتا ہوا اسے پالیتا ہے تو اس کی دعا اللہ قبول کر لیتا ہے۔ آخرت میں اس کا شرف و مقام اور نام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اہل جنت کو جنت اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دے گا تو ان پر یہی شب و روز چلیں گے۔ مگر دن و رات کا معاملہ نہ ہوگا، بس اللہ تعالیٰ کو اس کی مقدار اور گھڑیاں معلوم ہوں گی۔ جب جمعہ کا دن ہوگا یعنی جمعہ والے جس وقت جمعہ میں شرکت کے لیے نکلتے ہیں تو اہل جنت سے ایک منادی پکار کر کہے گا، اے اہل جنت! وادی مزید کو چلو۔ وادی مزید کی وسعت و عرض کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس میں مشک کے ٹیلے ہوں گے جن کے سرے آسمان سے باتیں کرتے ہوں گے۔ فرمایا پھر انبیاء کے خادم بچے نورانی منبر اور مسلمانوں کے خادم بچے یاقوتی کرسیاں لے کر نکلیں گے، یہ سجادی جائیں گی اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ مثیرہ نام کی ایک ہوا چلائے گا جس سے مشک بکھر کر ان کی پوشاکوں کے اندر داخل ہوگی اور ان کے چہروں اور بالوں

---

[۱] سند میں عمر بن عبداللہ مولیٰ غفرہ ضعیف ہیں۔ حسن بن یحییٰ خشنی کثرت سے غلطیاں کرتے تھے، دارقطنی نے انھیں متروک قرار دیا ہے۔

سے نکلے گی۔ تم میں کسی کی بیوی کو جسے دنیا بھر کی خوشبو دے دی گئی ہو اس کے بالمقابل مذکورہ مشک کا اس ہوا پر کیا اثر ہوگا اسے میں جانتا ہوں۔ فرمایا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حاملین عرش کو حکم دے گا کہ عرش ان لوگوں کے درمیان رکھیں۔ پہلی آواز جو انھیں سنائی دے گی وہ یہ ہوگی "میرے پاس آؤ، میرے وہ بندو جنھوں نے غیب میں رہ کر مجھے دیکھے بغیر میری اطاعت کی، میرے پیغمبروں کی تصدیق کی، میرے حکم کا اتباع کیا، مانگو مجھ سے کہ یہ یوم مزید ہے" چنانچہ سب ایک ہی بات بولیں گے "ہم تجھ سے خوش، تو ہم سے خوش ہوجا" اللہ انھیں جواب دے گا "اگر تم سے خوش نہ ہوتا تو اپنے گھر میں تمھیں آباد نہ کرتا، مانگو کہ یہ یوم مزید ہے" چنانچہ سب ایک ہی بات بولیں گے "پروردگار ہم تیرا دیدار چاہتے ہیں" وہ پردے ہٹا کر ان کے سامنے نمودار ہو جائے گا، اس کے نور کی ان پر اس وقت ایک ایسی کیفیت طاری ہو جائے گی کہ اگر نہ جلنے کا فیصلہ نہ ہوا ہوتا تو اس کیفیت سے سب جل جاتے، پھر ان سے کہا جائے گا، اپنی اپنی منزلوں کو واپس جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی اپنی منزلوں کو واپس ہوں گے اور حالت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان پر یہ کیفیت دوچند طاری کردے گا، وہ اپنی بیویوں کے پاس آئیں گے درآں حالیکہ نورانی پردے کے باعث وہ ایک دوسرے سے مخفی ہوں گے۔ اپنی منزلوں پر وہ آجائیں گے تو نور واپس ہو جائے گا اور وہ اپنی اصلی صورتوں پر آجائیں گے۔ بیویاں ان سے کہیں گی "ہمارے یہاں سے جس شکل میں گئے تھے وہ اب بدل گئی ہے" وہ کہیں گے "اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے آیا تھا اور ہم نے اس کا کچھ دیدار کیا ہے" فرمایا: واللہ کوئی مخلوق اللہ کا احاطہ نہیں کرسکی ہے، اس نے تو محض اپنی عظمت کا تھوڑا سا حصہ دکھایا ہوگا اور یہی ان کا کہنا بھی ہوگا، یعنی یہ کہ ہم نے اس کے کچھ حصے کا دیدار کیا ہے۔ فرمایا: چنانچہ وہ ہر ساتویں دن میں ایک بار جنت کی مشک اور اس کی نعمتوں کے مرغزار میں پہلے سے بھی زیادہ شاداں و فرحاں ہوں گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا ارشاد بھی یہی ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [1] (السجدۃ: ۱۷)

پھر جو کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں۔

ابونعیم نے صفۃ الجنۃ میں اس کی روایت عصمت بن محمد سے کی ہے، انھوں نے کہا ہم سے موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا، انھوں نے ابوصالح سے، انھوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے جس میں اسی طرح کا بیان ہے [2]

ابونعیم نے صفۃ الجنۃ میں مسعودی کی روایت پیش کی ہے، انھوں نے منہال سے، انھوں نے ابوعبیدہ سے، انھوں نے عبداللہ سے روایت کی ہے۔ فرمایا:

"دنیاوی جمعہ کو تیزی سے چلو کیونکہ ہر جمعہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ سفید کافور کے ٹیلے پر اہل جنت کے روبرو آیا کرے گا، چنانچہ جو لوگ جتنی تیزی سے جمعہ کو آئیں گے اسی قدر اس سے قریب ہوں گے۔ اللہ انھیں ایسا اعزاز بخشے گا کہ اس سے پہلے کبھی لوگوں نے نہ دیکھا ہوگا، اسی حال میں وہ اپنی بیویوں کے یہاں واپس ہوں گے" [3]

---

[1] عبداللہ بن عرادہ شیبانی ضعیف ہیں، بخاری نے انھیں منکر الحدیث اور بہتوں نے ضعیف کہا ہے۔ قاسم بن مطیب ابن حبان کے مطابق قلت روایت کے باوجود غلطیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا متروک ہونے کے مستحق ہیں

[2] عصمت بن محمد۔ ابوحاتم نے کہا کہ قوی نہیں ہے۔ یحییٰ نے کہا ہے کہ کذاب تھا، حدیثیں گھڑتا تھا، عقیلی فرماتے ہیں ثقہ راویوں سے خرافات روایت کرتا تھا۔ دارقطنی وغیرہ نے متروک قرار دیا ہے۔ لہٰذا سند باطل ہے۔

(حاشیہ "۳" اگلے صفحہ پر)

جمعہ کی ابتداء

ابن اسحاق فرماتے ہیں مجھ سے محمد بن ابو امامہ بن سہل بن حنیف نے بیان کیا، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی، انھوں نے کہا مجھ سے عبد الرحمٰن بن کعب بن مالک نے بیان کیا کہ والد کی آنکھیں جب جاتی رہیں تو ان کی رہنمائی کے لیے آگے آگے چلتا تھا، ان کو لے کر جمعہ کے لیے جاتا، اذان سنتے تو ابو امامہ اسعد بن زرارہ کے حق میں استغفار فرماتے تھوڑی دیر ان کا یہی شغل رہتا۔ میں نے دل میں کہا کہ بڑی کمزوری کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں ان سے دریافت نہ کروں۔ چنانچہ حسب معمول انھیں لے کر چلا، انھوں نے جمعہ کی اذان سنتے ہی اسعد بن زرارہ کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ میں نے کہا "ابا جان! کیا بات ہے جب بھی آپ جمعہ کی اذان سنتے ہیں اسعد بن زرارہ کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں؟" بولے "بیٹے! یہ اسعد پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے مدینہ کے اندر حرہ بنی بیاضہ[1] کی ایک وادی (ہزم نبیت) میں ایک سبزہ زار پر جسے "نقیع الخضمات" کہتے ہیں، ہمیں جمعہ کی صلوٰۃ پڑھائی تھی۔" میں نے کہا "اس وقت آپ کی تعداد کیا تھی؟" فرمایا "چالیس نفر[2]"

بیہقی فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحاق جب اپنا سماع کسی ثقہ راوی سے ذکر کریں تو وہ روایت سنداً صحیح ہوتی ہے، اسی بنیاد پر یہ حدیث از روئے سند حسن صحیح ہے۔

یہی جمعہ کی ابتداء ہے۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو قبا میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں سوموار، منگلوار، بدھ وار اور جمعرات آپ نے قیام کیا اور مسجد قبا کی بنیاد ڈالی پھر آپ قبا سے جمعہ کے دن نکلے تو بنی سالم بن عوف میں جمعہ کا وقت ہو گیا، آپ نے بطن وادی کی مسجد میں صلوٰۃ جمعہ ادا کی۔ مسجد نبوی کی تاسیس سے قبل یہ پہلا جمعہ ہے جسے آپ نے مدینہ میں ادا کیا[3]"

ابن اسحاق فرماتے ہیں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے جو خبر مجھے ملی ہے ——— اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب غلط بات منسوب کرنے سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ——— اس کے مطابق آپ نے اپنے سب سے پہلے خطبہ کے موقع پر اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

أَمَّا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ فَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ تَعْلَمُنَّ وَاللّٰهِ لَيُصْعَقَنَّ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ لَيَدَعَنَّ غَنَمَهُ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ، ثُمَّ لَيَقُولَنَّ لَهُ رَبُّهُ وَلَيْسَ لَهُ تُرْجُمَانٌ وَلَا حَاجِبٌ يَحْجُبُهُ دُونَهُ: أَلَمْ يَأْتِكَ رَسُولِي، فَبَلَّغَكَ،

۳ھ۔ (حاشیہ "۳ھ" صفحہ گذشتہ) مسعودی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود مسعودی ہیں، موت سے پہلے ماؤف العقل ہو گئے تھے۔ ابو عبیدہ بن عبد اللہ مسعود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں مگر سماع ثابت نہیں ہے لہذا سند ضعیف اور منقطع ہے۔

۱ھ۔ حرہ بنی بیاضہ مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔

۲ھ۔ السيرة النبوية لابن هشام ۱/۴۳۵۔ ابوداؤد (۱۰۶۹) فی الصلاۃ، باب الجمعة فی القرى۔ ابن ماجہ (۱۰۸۲) فی اقامة الصلاة: باب فی فرض الجمعة۔ حاکم ۱/۲۸۱۔ بیہقی ۳/۱۷۶، سند قوی ہے کیونکہ ابن ہشام، حاکم اور بیہقی کے مطابق ابن اسحاق نے صراحت سے حدیث بیان کرنے کا ذکر کیا ہے، لہذا تدلیس کا شبہ جاتا رہا۔ مگر جیسا کہ مخفی نہیں ہے اس میں چالیس کی تعداد حجت نہیں ہے۔

۳ھ۔ السيرة النبوية لابن هشام ۱/۴۹۴۔

وَاٰتَيْتُكَ مَالًا وَاَفْضَلْتُ عَلَيْكَ، فَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ، فَلْيَنْظُرَنَّ يَمِيْنًا وَشِمَالًا، فَلَا يَرٰى شَيْئًا، ثُمَّ لَيَنْظُرَنَّ قُدَّامَهٗ فَلَا يَرٰى غَيْرَ جَهَنَّمَ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَقِيَ وَجْهَهٗ مِنَ النَّارِ وَلَوْ بِشِقٍّ مِّنْ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ، فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ، فَاِنَّ بِهَا تُجْزَى الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ. وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ"[1]

امابعد! لوگو! اپنے لیے اپنا عمل آگے کے لیے بھیجو، یقیناً تم اسے پاؤ گے، واللہ اس دن یہ حال ہوگا کہ تم میں سے کوئی اچانک مرجائے گا اور اپنا گلہ بغیر گلہ بان کے چھوڑ جائے گا، پھر اس کا پروردگار بغیر ترجمان اور دربان کے اس سے کہے گا "تمہارے پاس میرا رسول نہیں پہنچا تھا، تو کیا اس نے پیغام نہیں پہنچایا تھا، میں نے تجھے دولت دی اور احسانات کیے، اب بتا آج کے لیے تو نے کیا ذخیرہ کیا ہے؟ وہ دائیں اور بائیں نگاہیں دھنسا دھنسا کر دیکھے گا مگر اسے کچھ نظر نہ آئے گا، پھر وہ نگاہیں گاڑ کر سامنے دیکھے گا، مگر سوائے جہنم کے کچھ نظر نہ آئے گا، لہٰذا جو کوئی خود کو آدھی کھجور بھی دے کر جہنم سے بچا سکے تو دریغ نہ کرے، جسے یہ بھی میسر نہ ہو اچھی بات کے ذریعہ کر اس کے عوض نیکی دس گنی سے لے کر سات سو گنی تک بدلہ کے طور پر لکھی جاتی ہے۔ تم سب پر اللہ کی سلامتی ہو، رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

" اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ اَحْمَدُهٗ وَاَسْتَعِيْنُهٗ، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، اِنَّ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَيَّنَهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَاَدْخَلَهٗ فِي الْاِسْلَامِ بَعْدَ الْكُفْرِ، فَاخْتَارَهٗ عَلٰى مَا سِوَاهُ مِنْ اَحَادِيْثِ النَّاسِ، اِنَّهٗ اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ وَاَبْلَغُهٗ، اَحِبُّوْا مَا اَحَبَّ اللّٰهُ، اَحِبُّوا اللّٰهَ مِنْ كُلِّ قُلُوْبِكُمْ وَلَا تَمَلُّوْا كَلَامَ اللّٰهِ وَذِكْرَهٗ وَلَا تَقْسُ عَنْهُ قُلُوْبُكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْ كُلِّ مَا يَخْلُقُ اللّٰهُ يَخْتَارُ وَيَصْطَفِيْ۔ قَدْ سَمَّاهُ اللّٰهُ خِيَرَتَهٗ مِنَ الْاَعْمَالِ وَمُصْطَفَاهُ مِنَ الْعِبَادِ وَالصَّالِحَ مِنَ الْحَدِيْثِ وَمِنْ كُلِّ مَا اُوْتِيَ النَّاسُ مِنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ، فَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، وَاتَّقُوْهُ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَاصْدُقُوا اللّٰهَ صَالِحَ مَا تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ وَتَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ بَيْنَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْضَبُ اَنْ يُّنْكَثَ عَهْدُهٗ۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"[2]

تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد کا طالب ہوں، اپنے نفس کی بدیوں سے اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، جسے گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی ایک لاشریک ہے، سب سے عمدہ بات اللہ کی کتاب ہے جس کے دل میں اللہ اسے مزین کردے، جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کردے وہ ماسوا لوگوں کی باتوں کے مقابلے میں قرآن کو پسند کرلے کہ یہی سب سے عمدہ اور مؤثر کلام ہے۔ بس وہی کامیاب ہے۔ اللہ کو جو پسند ہو وہی پسند کر، اللہ سے محبت پورے دل سے کرو، کلام الٰہی اور اللہ کے ذکر سے بیزار نہ ہو، دل تمہارے

---

[1] - السيرة النبوية لابن هشام ۱/ ۵۰۰، ۵۰۱، ابن اسحاق نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا مگر ان سے روایت نہیں کی ہے۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بعض صحابہ سے روایت کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا تھا کیونکہ ان کی وفات کا سن ۹۴ھ ہے۔

[2] - السيرة النبويه ۲/ ۵۰۰ میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے یہ خطبہ بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔

اس کی جانب سے سخت نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کردہ ہر شے سے انتخاب کرتا ہے اور اسے برگزیدہ بناتا ہے۔ جس کا نام اس نے عمدہ اعمال، برگزیدہ بندے، راست کلام اور بہترین حلال وحرام رکھا ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اس سے ڈرنے کی طرح ڈرو اور اپنی بہترین گفتار کے ذریعہ اللہ سے سچ بولو۔ اپنے درمیان محبت کے تعلقات تعلق باللہ کی بنیاد پر پیدا کرو۔ اللہ کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ اس کا عہد توڑ دیا جائے۔ تم سب پر اللہ کی سلامتی، رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔

پیچھے جہاں خطبوں کے بارے میں آپ کی سنت کا ذکر آیا ہے وہاں آپ کے خطبوں کا ایک حصّہ بھی آچکا ہے۔

جمعہ کی خصوصیات

سنت یہ تھی کہ جمعہ کے دن کو انتہائی اہمیت دیتے، اس کی قدر ومنزلت اور تعظیم کرتے، اس دن کچھ مخصوص عبادتیں کرتے جو دوسرے دنوں کے مقابلے میں اس کے لیے وجہ امتیاز تھیں۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جمعہ کا دن افضل ہے یا عرفہ کا؟ دونوں قول ہیں اور دونوں امام شافعی کے اصحاب کے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی فجر میں سورۃ (الم تنزیل) اور سورۃ (ھل اتی علی الانسان) پڑھتے تھے[1] اکثر ناواقفوں کا خیال ہے کہ یہ صلوٰۃ سجدۂ زائدہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا نام سجدۂ جمعہ رکھتے ہیں۔ آدمی کو یہ سورہ یاد نہ ہو تو دوسری ایسی سورہ پڑھنا مستحب ہے، جس میں سجدہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فجر میں ائمہ نے سورۂ سجدہ کی پابندی مکروہ سمجھی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ناواقفوں کے اندر پھیلے ہوئے خیال کا ازالہ ہو جائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے میں نے سنا ہے کہ فجر جمعہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں سورتیں اس لیے پڑھتے تھے کہ ان کے اندر اس دن ماضی اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں سورتوں کے اندر تخلیق آدم اور حشر ونشر کا مضمون آیا ہے جو اسی جمعہ کے دن پیش آئے گا، ان دونوں سورتوں کو پڑھ کر امت کو اس دن پیش آنے والے واقعات کی تذکیر مقصود تھی، سجدہ تو ضمنی طور پر آگیا ہے، اصل مقصود نہیں کہ جہاں یہ آئے مصلی اسی سورہ کو پڑھنے کا پابند رہے۔ یہ جمعہ کی ایک خصوصیت ہوئی۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دن اور اس کی شب کو کثرت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا مستحب ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب مجھ پر بکثرت درود بھیجو۔"[2]

---

[1] مسلم (۸۷۹) فی الجمعۃ : باب مایقرء فی یوم الجمعۃ۔ حدیث حضرت ابن عباس "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر میں الم تنزیل السجدۃ اور ھل اتی علی الانسان حین من الدھر اور جمعہ کی صلوٰۃ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھتے تھے۔ ترمذی (۵۲۰) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی مایقرء بہ فی صلاۃ الصبح یوم الجمعۃ۔ ابوداؤد (۱۰۷۴) فی الصلاۃ : باب مایقرء بہ فی صلاۃ الصبح یوم الجمعۃ۔ نسائی ۱۵۹/۲، فی الافتتاح : باب القرأۃ فی الصبح یوم الجمعۃ۔ مسند احمد ۲۲۶/۱ و ۳۳۴ و ۳۴۰۔ مسلم (۸۸۰) فی الجمعۃ : باب مایقرء یوم الجمعۃ۔ نسائی ۱۵۹/۲ فی الافتتاح : باب القرأۃ فی الصبح یوم الجمعۃ۔ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[2] بیہقی۔ حدیث حضرت انس۔ سند حسن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الانام ہیں اور جمعہ کا دن سید الایّام (سب سے بڑا دن) لہٰذا اس دن آپ پر درود بھیجنا ایک ایسا امتیاز ہے جو کسی اور دن کو حاصل نہیں۔ نیز ایک اور حکمت بھی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں آپ کی امت کو جو خیر بھی ملا ہے وہ محض آپ کی بدولت ملا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے طفیل امت کے لیے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں جمع کر دی ہیں، سب سے بڑی عزت امت کو اسی جمعہ کے دن ملے گی چنانچہ یہی وہ دن ہے جس میں اٹھا کر انھیں جنت میں ان کی منزلوں اور محلات میں منتقل کیا جائے گا۔ جنت میں داخلہ کے بعد یوم جمعہ ہی ان کے لیے یوم مزید بھی ہوگا، یہ دنیا میں ان کے لیے عید ہے اور آخرت میں ایک ایسا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان کی تمام ضرورتیں اور درخواستیں منظور کرے گا۔ یہ ساری باتیں امت کو صرف آپ کے سبب معلوم ہوئیں اور آپ سے حاصل ہوئیں۔ لہٰذا آپ کے شکریہ اور تھوڑے سے حق کی ادائیگی کے طور پر ضروری ہے کہ ہم جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب کثرت سے آپ پر درود بھیجیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ صلوٰۃ جمعہ انتہائی مؤکد فریضۂ اسلامی ہے، اس دن مسلمانوں کا سب سے بڑا مجمع ہوتا ہے۔ عرفہ کو چھوڑ کر اس سے بڑا مسلمانوں کا اور کوئی اجتماع نہیں ہوتا۔ معمولی سمجھ کر اسے جو چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے۔ قیامت کے دن اہل جنت اللہ تعالیٰ سے اتنے ہی قریب اور اس کی ملاقات میں اتنے ہی آگے ہوں گے جتنا جمعہ کے دن وہ امام سے قریب ہوں گے اور صلوٰۃ کے لیے سویرے پہنچیں گے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس دن غسل کرنے کا حکم ہے، یہ بہت تاکیدی حکم ہے۔ بلاشبہ وتر واجب ہے، صلوٰۃ میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے، عورت اور عضو خاص کو چھونے، صلوٰۃ میں قہقہہ مار کر ہنسنے، نکسیر ٹوٹنے، حجامت اور قے کر دینے پر وضو واجب ہے، اخیر تشہد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا واجب ہے، مقتدی پر قرأت کرنا واجب ہے، مگر ان سب سے عظیم تر واجب جمعہ کے دن غسل کرنا ہے۔

غسل جمعہ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ واجب نہیں، دوسرے یہ کہ واجب ہے، تیسرا یہ کہ جسم سے اگر بدبو پھوٹ رہی ہو تو واجب ہے ورنہ مستحب ہے۔ تینوں اقوال امام احمد کے اصحاب کے ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن خوشبو لگانا دیگر ایام کے بمقابلہ افضل ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ دیگر ایام کے بمقابلہ اس دن مسواک کرنا زیادہ افضل ہے۔

ساتویں خصوصیت سویرے صلوٰۃ کے لیے جانا ہے۔

آٹھویں خصوصیت امام کے نکل کر آنے تک صلوٰۃ، ذکر و فکر اور تلاوت میں مصروف رہنا ہے۔

نویں خصوصیت صحیح تر قول کے مطابق واجبی طور پر خطبہ سننے کے لیے خاموش رہنا ہے۔ خاموش نہ رہنے والا لاغی شمار ہوتا ہے اور لاغی کا جمعہ نہیں ہوتا۔ مسند میں مرفوعًا روایت ہے "جس نے اپنے قریب بیٹھنے والے سے کہا "خاموش رہو" اس کا جمعہ نہیں ہوتا"۔[۱]

---

[۱] احمد ۱/۹۳ اور ابوداؤد (۱۰۵۱) میں لمبی حدیث ہے، روایت حضرت علی بن ابو طالب کی ہے۔ ابوداؤد کی حدیث یہ ہے "جمعہ کے دن اپنے ساتھی سے جس نے کہا "صہ" (خاموش) اس نے لغو حرکت کی، اور جو لغو حرکت کریگا اس جمعہ میں اسے کچھ حاصل نہ ہوگا" سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ بخاری ۳۴۳/۲۔ مسلم (۸۵۱) اور موطا ۱۰۳/۱۔ روایت حضرت ابوہریرہ۔ اس میں "جو لغو حرکت کرے گا الخ" نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے "جمعہ کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اس وقت اپنے ساتھی سے اگر کہو گے کہ خاموش ہو جا تو یہ تمھاری لغو حرکت ہوگی۔ ابوداؤد (۳۴۷) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مرفوعًا روایت ہے جمعہ کے دن (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دسویں خصوصیت سورۃ الکہف کی تلاوت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"جس نے جمعہ کے دن سورۃ الکہف کی تلاوت کی قیامت کے دن اس کے زیر قدم سے آسمان کی جانب حدنگاہ تک نور چمکے گا جس کی روشنی میں وہ چلے گا اور دونوں جمعوں کے درمیان اس کے کردہ گناہ بخش دیئے جائیں گے"[۱]

سعید بن منصور نے حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں اسی سے مشابہ تر روایت پیش کی ہے۔

گیارھویں خصوصیت یہ ہے کہ شافعین اور ان کے موافقین کے نزدیک جمعہ کے دن زوال کے وقت صلوٰۃ پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ یہی ہمارے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ کا بھی مذہب ہے، آپ کی بنیاد لیث کی حدیث پر نہیں ہے جسے انھوں نے مجاہد سے، انھوں نے ابوخلیل سے، انھوں نے ابوقتادہ سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے جمعہ کے علاوہ ہر دن نصف النہار پر صلوٰۃ پڑھنا مکروہ سمجھا ہے اور فرمایا ہے کہ "جمعہ کے علاوہ جہنم ہر روز خوب اچھی طرح بھڑکائی جاتی ہے"[۲]، بلکہ یہ ہے کہ جمعہ میں شرکت کرنے والے کے لیے مستحب یہ ہے کہ امام کے نکلنے تک صلوٰۃ پڑھتا رہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ :

"جو شخص بھی جمعہ کے دن غسل کرتا ہے، حتی الامکان پاک وصاف ہو کر تیل یا اپنے گھر کی خوشبو لگاتا ہے، پھر نکلتا ہے اور کسی دو آدمی کے درمیان تفریق پیدا نہیں کرتا اپنے مقدر کی صلوٰۃ پڑھتا ہے، پھر امام خطبہ دیتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے تو اس کے آئندہ جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں"[۳] (رواہ البخاری)

آپ نے جمعہ کے دن صلوٰۃ مقدر کی ادائیگی کی دعوت دی ہے اور اس سے صرف اسی وقت روکا ہے جب امام خطبہ کے لیے نکلے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب وغیرہ بہیترے بزرگان سلف نے فرمایا ہے اور انہی کی موافقت امام احمد بن حنبل نے بھی کی ہے کہ امام کے نکلنے پر صلوٰۃ اور خطبہ شروع ہونے پر کلام کرنا سب ممنوع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے صلوٰۃ نہ پڑھنے کی علت امام کا نکلنا قرار دیا ہے نہ کہ نصف النہار۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جو غسل کرے گا، اپنی بیوی کی خوشبو بشرطیکہ اس کے پاس ہو لگائے گا، عمدہ ترین کپڑے پہنے گا، لوگوں کی گردنیں پھاند کر آگے نہ جائے گا اور نہ کوئی لغو حرکت کرے گا تو اس کا یہ جمعہ دونوں کے درمیان کا کفارہ ہوگا۔ لیکن جو لغو کرے گا اور لوگوں کی گردنیں پھاندے گا تو اسے صرف صلوٰۃ ظہر کا ثواب ملے گا۔ سند حسن ہے۔ خزیمہ (۱۸۱۰) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[۱] یہ حدیث صحیح ہے۔ حاکم ۳۶۸/۲ اور بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔ روایت نعیم بن حماد سے ہے، انھوں نے ہشیم سے، انھوں نے ابوہاشم سے، انھوں نے ابومجلز سے، انھوں نے قیس بن عباد سے، انھوں نے ابوسعید خدری سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ نعیم بن حماد سے بکثرت خطائیں ہوتی تھیں، بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ دارمی نے اپنی مسند ۴۵۴/۲ میں اسے ابوسعید سے موقوفاً روایت کی ہے اس کے رجال ثقہ ہیں۔ لہٰذا اس طرح کی روایت بالرای نہیں کی جاسکتی، اس کا حکم مرفوع کا ہے۔ باب میں حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی ایک روایت کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے جمعہ کے دن سورۃ الکہف پڑھی اس کے حق میں زیر قدم سے لے کر آسمان کی جانب حد نگاہ تک نور چمکے گا جو قیامت کے دن اس کے لیے روشنی پیدا کرے گا، اور دونوں جمعوں کے مابین اس کے گناہ بخشدیئے جائیں گے" ابوبکر بن مردویہ نے اس کی تخریج اپنی تفسیر میں کی ہے، جب کہ منذری نے الترغیب والترہیب ۳۲۳/۲ میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ سند میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس باب میں حضرت علی سے بھی روایت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے جمعہ کے دن سورۃ الکہف پڑھی وہ آٹھ دن تک ہر فتنہ سے محفوظ ہوگا، اگر دجال کا اس عرصہ میں خروج بھی ہو گیا تو بھی اس کے فتنہ سے محفوظ ہوگا" ضیاء مقدسی نے "الاحادیث المختارۃ" میں عبداللہ بن مصعب کی سند سے اس کی تخریج کی ہے، جسے انھوں نے منظور بن زید بن خالد جہنی سے، انھوں نے علی بن حسین سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے۔ عبداللہ بن مصعب کو ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

[۲] ابوداؤد (۱۰۸۳) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ یوم الجمعۃ قبل الزوال۔ لیث بن ابوسلیم ضعیف ہیں۔ حدیث منقطع بھی ہے۔

[۳] بخاری ۳۰۸/۲، ۳۰۹ فی الجمعۃ : باب الدھن للجمعۃ وباب لایفرق بین اثنین یوم الجمعۃ۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ہے کہ لوگ مسجد میں چھتوں کے نیچے ہوتے ہیں، وقتِ زوال کا اندازہ نہیں ہوتا، صلوٰۃ میں مشغول آدمی اندازہ کر بھی نہیں سکتا، یہ بھی ممکن نہیں کہ لوگوں کی گردنیں پھاندتا ہوا نکلے، آفتاب دیکھے اور پھر گردنیں پھاندتا ہوا واپس آجائے، یہ اس کے لیے جائز بھی نہیں ہے۔

ابو قتادہ کی اس حدیث کو ابو داؤد نے مرسل کہا ہے کیونکہ ابو خلیل کا ابو قتادہ سے سماع ثابت نہیں مگر مرسل رواۃ کی موجودگی میں اس کے مطابق عمل بھی ہو، قیاس یا کسی صحابی کے قول سے اسے تقویت بھی پہنچتی ہو یا شیوخ کے رجحان اور ضعیفوں اور متروکین وغیرہ کی روایتوں سے راوی کے اعراض کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہو تو وہ مرسل معروف ہے اور عمل کیا جا سکتا ہے۔

پھر حدیث کے دیگر شواہد بھی موجود ہیں۔ ایک یہ ہے جس کا تذکرہ شافعی نے اپنی کتاب میں اسحاق بن عبداللہ کی روایت سے کیا ہے، انھوں نے اسے سعید بن ابو سعید سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے علاوہ ہر دن زوالِ آفتاب تک نصف النہار کے وقت صلوٰۃ پڑھنے سے روکا ہے۔[1] امام شافعی نے یہ روایت اختلاف الحدیث میں ذکر کی ہے اور اس کی روایت کتاب الجمعہ میں ابراہیم بن محمد سے، وہ اسحاق سے بیان کرتے ہیں، ابو خالد الاحمر نے اس کی روایت مدینہ کے ایک شیخ جن کا نام عبداللہ بن سعید مقبری ہے ان سے، انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ بیہقی نے "معرفۃ" میں اس کی روایت عطاء بن عجلان سے، انھوں نے ابو نضرہ سے، انھوں نے حضرت ابو سعید اور حضرت ابوہریرہ سے کی ہے۔ دونوں کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے علاوہ ہر دن نصف النہار کے وقت صلوٰۃ پڑھنے سے روکا ہے۔ مگر اس کی سند میں ایک راوی ناقابلِ استدلال ہے جس کا بیہقی نے تذکرہ کیا ہے نیز کہا ہے کہ یہ تمام حدیثیں ابو قتادہ کی حدیث سے مل کر تھوڑی قوت پیدا کر دیتی ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ عام طور پر لوگ چلچلاتی دھوپ میں جمعہ کو جاتے اور امام کے نکلنے تک صلوٰۃ پڑھتے رہتے تھے۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ شافعی نے جو اشارہ کیا ہے وہ صحیح حدیثوں کے اندر موجود ہے۔ وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کو سویرے جانے اور امام کے نکلنے تک بغیر کسی استثناء کے صلوٰۃ پڑھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ یہ بات ان حدیثوں کے موافق ہے جن میں جمعہ کے دن نصف النہار کے وقت صلوٰۃ پڑھنا مباح قرار دیا گیا ہے۔ عطاء، طاؤس، حسن اور مکحول سے بھی اسی طرح کی روایتیں ہم سے بیان کی گئی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ نصف النہار کے وقت صلوٰۃ پڑھنے کی کراہیت کے بارے میں تین قول ہے۔

۱۔ بالکل مکروہ نہیں ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

۲۔ جمعہ اور بقیہ تمام دنوں میں مکروہ ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا اور امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔

۳۔ جمعہ کے علاوہ ہر دن مکروہ ہے۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

بارھویں[12] خصوصیت یہ ہے کہ جمعہ کی صلوٰۃ میں سورۂ جمعہ، سورۂ منافقون یا سورۂ سبح اسم ربک اور سورۂ غاشیہ پڑھی جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں جمعہ کے اندر پڑھتے تھے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔[2]

---

[1] شافعی ۱/۵۲۔ امام شافعی کے شیخ ابراہیم بن محمد اور اسحاق بن عبداللہ بن ابو فروہ دونوں متروک ہیں۔

[2] صحیح مسلم (۸۷۷) فی الجمعۃ : باب مایقرء فی صلاۃ الجمعۃ، حدیث ابوہریرہ۔ ابوداؤد (۱۱۲۴) فی الصلاۃ : باب ما یقرء بہ فی الجمعۃ، ترمذی (۵۱۹) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی صلاۃ الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۱۱۸) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی القرأۃ فی الصلاۃ یوم الجمعۃ۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی صلوٰۃ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ ھل اتاك حديث الغاشية پڑھا کرتے تھے[۱] یہ آپ سے ثابت ہے۔

مستحب نہیں ہے کہ کسی سورہ کا تھوڑا حصہ یا ایک ہی سورہ دونوں رکعتوں کے اندر پڑھی جائے۔ یہ خلافِ سنت ہے مگر جاہل امام اسی کی پابندی کرتے ہیں۔

تیرھویں خصوصیت یہ ہے کہ جمعہ کا دن بار بار آنے والی ہفتہ کی عید ہے۔ ابوعبداللہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ابولبابہ بن عبدالمنذر کی حدیث نقل کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جمعہ کا دن سیدالایام ہے، اللہ کے نزدیک اس کی بے حد عظمت ہے، اس کے نزدیک یوم الضحیٰ اور یوم الفطر سے بھی زیادہ یہ عظیم ہے، اس کی پانچ امتیازی خوبیاں ہیں۔ اللہ نے اس دن آدم کو پیدا کیا، اسی دن انھیں زمین پر اتارا، اسی دن ان کی وفات ہوئی، اس دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ اللہ سے جو کچھ دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے بشرطیکہ کسی حرام چیز کی دعا نہ کرے، اسی دن قیامت آئے گی، کیا کوئی مقرب فرشتہ، کیا آسمان، کیا زمین، کیا ہوائیں، کیا پہاڑ، کیا شجر سب جمعہ کے دن سے لرزہ براندام ہیں[۲]"

جمعہ کے دن عمدہ ترین لباس پہننا

چودھویں[۱۴] خصوصیت یہ ہے کہ حتی المقدور عمدہ ترین پوشاک پہننا مستحب ہے۔ امام احمد نے مسند میں حضرت ابوایوب کی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے "جمعہ کے دن جس نے غسل کیا، اگر میسر ہوئی تو خوشبو لگائی، عمدہ ترین لباس پہنا، پھر انتہائی وقار کے ساتھ چل کر جمعہ کو آیا، پھر ہو سکا تو صلوٰۃ پڑھی، کسی کو تکلیف نہ دی، پھر امام کے نکلنے سے لے کر صلوٰۃ کے خاتمہ تک خاموش رہا تو اس کا یہ عمل دونوں جمعوں کے درمیان گناہوں کا کفارہ بن جائے گا[۳]"

سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت ہے کہ انھوں نے جمعہ کے دن منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے "کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ اگر کوئی جمعہ کے لیے دو اور کپڑے خرید لے تو کیا نقصان ہے[۴]"

سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے آپ نے دیکھا کہ لوگ سفید اور سیاہ دھاریوں والے کپڑوں میں ملبوس ہیں تو فرمایا:

"کام کاج کے کپڑوں کے سوا طاقت ہو تو جمعہ کے لیے اگر کوئی دو کپڑے خرید لے تو کیا نقصان ہے[۵]"

۱۔ مسلم (۸۷۸) حدیث نعمان بن بشیر۔

۲۔ ابن ماجہ (۱۰۸۴) فی اقامة الصلاة : باب فی فضل الجمعة۔ مسند احمد ۳/ ۴۳۰، سند جیسا کہ بوصیری نے "الزوائد" میں کہا ہے حسن ہے۔

۳۔ مسند احمد ۵/ ۴۲۰۔ سند حسن ہے۔ ابن خزیمہ (۱۷۷۵) نے اسے صحیح کہا ہے۔

۴۔ ابوداؤد (۱۰۷۸) فی الصلاة : باب اللبس للجمعة۔ ابن ماجہ (۱۰۹۵) فی اقامة الصلاة : باب ماجاء فی الزینة۔ الفاظ انہی کے ہیں۔ "الزوائد" میں بوصیری کے قول کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔

۵۔ ابن ماجہ (۱۰۹۶) ابن خزیمہ (۱۷۶۵) سند میں زہیر بن محمد تمیمی سے اہل شام کی روایت غیر درست ہے اور اسی لیے انھیں ضعیف کہا گیا ہے۔ یہاں ان سے روایت عمرو بن ابی سلمہ تنیسی ابوحفص دمشقی کر رہے ہیں، بایں ہمہ ماقبل کی حدیث شاہد ہے۔ لہٰذا صحیح ہے۔

مسجد کو دھونی دینا مستحب ہے

پندرھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن مسجد کو دھونی دینا مستحب ہے۔ سعید بن منصور نے نعیم بن عبداللہ المجمر سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ہر جمعہ کو نصف النہار کے وقت مسجد نبوی کو دھونی دینے کا حکم دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نعیم کو المجمر (دھونی دینے والا) اسی لیے کہتے ہیں۔

سولہویں خصوصیت یہ ہے کہ وقت ہو جانے پر جمعہ کی ادائیگی سے پہلے اس دن جس پر جمعہ واجب ہے اسے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ جمعہ کا وقت آنے سے پہلے جواز سفر کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ اور یہ سب کے سب امام احمد رحمہ اللہ سے ثابت ہیں۔ ایک یہ کہ جائز نہیں، دوسرے یہ کہ جائز ہے، تیسرے یہ کہ خصوصیت سے جہاد کے موقع پر جائز ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک زوال کے بعد جمعہ کے دن سفر شروع کرنا حرام ہے۔ دینی سفر کے سلسلہ میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ حرام ہے۔ یہ نووی کا مذہب ہے۔ دوسرا یہ کہ جائز ہے، اسے رافعی نے اختیار کیا ہے۔

زوال سے پیشتر سفر کے سلسلہ میں امام شافعی کے دو قول ہیں، قدیم قول جواز کے حق میں اور جدید قول کے مطابق اس کا حکم وہی ہے جو بعد از زوال کا ہے۔

امام مالک کا مذہب صاحب "تفریع"[1] کے مطابق یہ ہے کہ بعد از زوال جمعہ کے دن کسی کے لیے سفر کرنا روا نہیں ہے۔ قبل از زوال سفر کر سکتا ہے۔ مذہب مختار یہ ہے کہ مقیم ہو تو طلوع فجر کے بعد جمعہ کی صلوٰۃ پڑھے بغیر سفر نہ کرے۔

امام ابو حنیفہ جمعہ کے دن مطلق سفر کے قائل ہیں۔ دارقطنی نے "الافراد" میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے پیش کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جمعہ کے دن جو اپنے مقام سے سفر اختیار کرتا ہے تو فرشتے بد دعا دیتے ہیں کہ اس کا سفر بالتوفیق نہ ہو۔"

سلسلۂ سند میں ابن لہیعہ ہیں۔

مسند امام احمد میں حکم کی روایت ہے، وہ مقسم سے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن رواحہ کو ایک سریہ میں بھیجا، اتفاق سے یہ جمعہ کا دن تھا، فوج روانہ ہو گئی، عبداللہ بن رواحہ نے دل میں کہا میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رک کر جمعہ کی صلوٰۃ پڑھوں گا پھر سریہ سے جا ملوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو ان کو دیکھا، دریافت فرمایا "اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ کیوں نہیں ہوئے؟" بولے "آپ کے ساتھ صلوٰۃ پڑھ لینی چاہی اور اب ان سے جا ملوں گا" آپ نے فرمایا "پوری زمین کی دولت خرچ کر لو گے پھر بھی ساتھیوں کے کوچ کا مرتبہ نہ پا سکو گے۔"[2]

حدیث معلول ہے اس لیے کہ حکم کا مقسم سے سماع ثابت نہیں ہے[3]

۱۔ عبیداللہ بن حسن بن جلاب بصری۔ کنیت ابو القاسم ہے۔ فقیہ اور ماہر اصول گذرے ہیں ۳۷۸ھ میں سفر حج سے واپس ہوتے ہوئے انتقال فرمایا۔ "الدیباج المذھب" ص ۱۴۶ میں ان کے حالات قلمبند ہوئے ہیں۔

۲۔ مسند احمد ۱/۲۲۴۔ ترمذی (۵۲۷) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی السفر یوم الجمعة۔

۳۔ اس کی سند میں حجاج بن ارطاط ہیں جو گو صدوق ہیں مگر کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں، تدلیس کے ساتھ عنعنہ بھی ان سے ثابت ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں، یہ حدیث غریب ہے جو ہمیں صرف اسی سند سے ملتی ہے۔ علی بن مدینی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ مسئلہ ایسی حالت کے لیے ہے جب کہ مسافر کو اپنے ساتھیوں کی رفاقت چھوٹ جانے کا اندیشہ نہ ہو اور اگر اندیشہ ہو تو مطلق سفر کی اجازت ہے کیونکہ یہ ایک ایسا عذر ہے جس سے جمعہ اور جماعت دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔ امام اوزاعی سے دریافت کیا گیا کہ سواری پر زین کس لینے کے بعد مسافر جمعہ کی اذان سن لے تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ سفر پر روانہ ہو جائے۔ غالباً ان کا یہ فتویٰ مذکورہ بالا نوعیت ہی کی بنیاد پر ہے۔ ایسا ہی قول حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے "جمعہ سفر کی راہ میں حائل نہیں ہوتا" گو ان کی مراد مطلق سفر کا جواز ہے، مسئلہ پھر بھی نزاعی ہے اور دلیل ہی فیصلہ کن ہوگی۔ چنانچہ عبدالرزاق نے مصنف میں معمر سے روایت کی ہے، وہ خالد حذاء سے، وہ ابن سیرین سے یا کسی اور سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے جمعہ کی صلوٰۃ کے بعد ایک شخص پر سفری کپڑے دیکھ کر فرمایا "کیا بات ہے؟" بولے "سفر کا ارادہ ہے مگر جمعہ کی صلوٰۃ پڑھے بغیر سفر پر جانا گوارا نہ ہوا" حضرت عمر نے فرمایا "جب تک وقت نہ آجائے جمعہ سفر سے نہیں روکتا"[1] یہ ان کا قول ہے جو سفر سے بعد از زوال روکتے ہیں نہ قبل از زوال۔

اس کی روایت عبدالرزاق نے ثوری سے بھی کی ہے۔ وہ اسود بن قیس سے، وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے ایک شخص کو سفر کے لیے تیار دیکھا۔ اس شخص نے کہا "آج جمعہ کا دن نہ ہوتا تو اب تک سفر پر روانہ ہو چکا ہوتا" اس پر حضرت عمر نے فرمایا "جمعہ کسی مسافر کو محبوس نہیں رکھتا، زوال سے پہلے پہلے روانہ ہو سکتے ہو"[2]

ثوری ہی سے ان کی یہ روایت بھی ہے۔ وہ ابن ابو ذئب سے، وہ صالح بن کثیر سے، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن صلوٰۃ سے پہلے چاشت کے وقت سفر پر روانہ ہوئے"[3]

عبدالرزاق نے معمر سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے دریافت کیا۔ "جمعہ کے دن کیا کوئی سفر پر روانہ ہو سکتا ہے؟" انھوں نے اسے ناپسند کیا تو جب میں نے جمعہ کے دن رخصت کا تذکرہ کیا تو فرمایا "کم ہی ایسا ہوا ہے کہ کوئی جمعہ کے دن سفر پر روانہ ہوا ہو اور اسے کوئی ناپسندیدہ بات پیش نہ آئی ہو، اس پر غور کرو گے تو ایسا ضرور پاؤ گے"[4]

ابن مبارک نے امام اوزاعی کی روایت سے حسان بن عطیہ کا یہ قول پیش کیا ہے کہ "جمعہ کے دن جب کوئی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو یہ دن اس کے حق میں بد دعا دیتا ہے کہ اس کی ضرورت پوری نہ ہو، سفر میں اسے توفیق نہ ملے"[5]

اوزاعی نے ابن مسیب کا یہ قول پیش کیا ہے کہ جمعہ کے دن سفر صلوٰۃ کے بعد کیا جائے گا۔ ابن جریج فرماتے ہیں "میں نے عطاء سے پوچھا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کہا جاتا تھا" شب جمعہ کسی قریۂ جامعہ میں ہوں تو جمعہ پڑھنے سے پہلے روانہ ہونا روا نہیں ہے" فرمایا "یہ مکروہ ہے" میں نے کہا جمعرات کے دن؟ فرمایا "مکروہ نہیں ہے، کیونکہ یہ دن ہے اس میں کوئی مضرت نہیں"[6]

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید نے کہا کہ شعبہ نے فرمایا "مقسم سے حکم کا صرف پانچ حدیثوں کا سماع ثابت ہے۔ شعبہ نے ان پانچوں کو شمار کیا مگر ان میں یہ حدیث نہ تھی، گویا اس حدیث کا مقسم سے حکم کا سماع ثابت نہیں ہے۔

[1] مصنف عبدالرزاق (۵۵۳۶) تمام راوی اس کے ثقہ ہیں۔

[2] المصنف (۵۵۳۷) راوی ثقہ ہیں۔

[3] المصنف (۵۵۴۰) مرسل ہے۔ صالح بن کثیر مجہول ہیں۔

[4] المصنف (۵۵۴۱)۔

[5] المصنف (۵۵۴۲)۔

[6] المصنف (۵۵۴۳)۔

صلوٰۃ جمعہ کے لیے جانے والے کا اجر

سترھویں خصوصیت یہ ہے کہ جمعہ کے لیے جانے والے کو ہر قدم کے عوض ایک سال کے صوم وصلوٰۃ کا اجر ملتا ہے۔ عبدالرزاق نے معمر سے روایت کی ہے کہ وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے، وہ ابو قلابہ سے، وہ ابوالاشعث صنعانی سے وہ اوس بن اوس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "جمعہ کے دن جس نے خوب اچھی طرح غسل کیا اور بہت سویرے مسجد گیا، امام سے قریب ہو کر خاموش رہا تو اس کے لیے ہر اٹھنے والے قدم کے عوض ایک سال کے صیام اور صلوات کا ثواب ہو گا، یہ اللہ کے لیے بے حد آسان ہے"[1] امام احمد نے مسند میں اس کی روایت کی ہے۔

(حدیث میں "غَسَّلَ" کا لفظ آیا ہے) امام احمد فرماتے ہیں غَسَّلَ (تشدید کے ساتھ) کے معنی ہیں اپنی بیوی سے جماع کیا۔ وکیع سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

گناہوں کے کفارہ کا دن

اٹھارھویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بدیوں کے کفارہ کا دن ہے۔ مسند احمد میں سلمان سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "جانتے ہو جمعہ کا دن کیا ہے؟" میں نے کہا یہ وہی دن ہے جس میں اللہ نے آپ کے باپ حضرت آدم کو جمع کیا" فرمایا "میں جانتا ہوں جمعہ کا دن کیا ہے، آدمی خوب اچھی طرح پاک وصاف ہو کر جمعہ میں آئے، پھر خاموش رہے حتیٰ کہ امام صلوٰۃ پوری کرے تو اس کے اور آئندہ جمعہ کے درمیان جو بدیاں ہوں گی بجز قتل کے یہ ان کا کفارہ بن جائے گا"[2]

مسند ہی میں عطا خراسانی کی روایت ہے۔ وہ نبیشہ ہذلی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی کہ "مسلمان جب جمعہ کے دن غسل کرتا ہے پھر جمعہ میں اس طرح شریک ہوتا ہے کہ کسی کو اس سے تکلیف نہیں پہنچتی، امام اگر خطبے کے لیے نہ نکلا ہو تو جتنی چاہے صلوٰۃ پڑھے، نکل آیا ہو تو بیٹھ کر خاموشی سے سنے حتیٰ کہ امام جمعہ اور خطبہ سے فارغ ہو جائے تو اس جمعہ میں اس کے تمام گناہ معاف ہوں یا نہ ہوں مگر آئندہ جمعہ تک کی گناہوں کا کفارہ ضرور ہو جائے گا"[3]

۱۔ المصنف (۵۵۷۰)۔ مسند احمد ۴/۸۔ ترمذی (۴۹۶) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی فضل الغسل یوم الجمعۃ۔ ابوداؤد (۳۴۵) فی الطہارۃ : باب الغسل للجمعۃ۔ نسائی ۳/۹۵، فی الجمعۃ : باب فضل غسل یوم الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۰۸۷) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الغسل یوم الجمعۃ۔ سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۷۵۸) و (۱۷۶۷) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۲۔ مسند احمد ۵/۴۳۹۔ راوی ثقہ ہیں بایں ہمہ سند میں ہشیم اور مغیرہ بن مقسم کا عنعنہ بھی شامل ہے۔ "المجمع" ۲/۱۷۴ میں ہیثمی نے اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ طبرانی نے اس کی روایت "الکبیر" میں کی ہے۔ سند حسن ہے۔

۳۔ مسند احمد ۵/۷۵۔ الترغیب والترہیب ۲/۶، ۷ میں منذری نے کہا ہے کہ احمد نے اس کی روایت کی ہے مگر اپنے علم کی حد تک نبیشہ سے عطاء کا سماع ثابت نہیں ہے۔ "المجمع" ۲/۱۷۱ میں ہیثمی نے کہا ہے کہ احمد نے اس کی روایت کی ہے۔ امام احمد کے شیخ کے علاوہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں اور ان کے شیخ بھی ثقہ ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت سلمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جو آدمی جمعہ کے دن غسل کرتا ہے اور اچھی طرح طاقت بھر پاک وصاف ہو جاتا ہے، سر پر تیل رکھتا ہے یا گھر کی کوئی خوشبو استعمال کرتا ہے پھر مسجد میں اس طرح آتا ہے کہ دو آدمیوں میں تفریق پیدا نہیں کرتا پھر واجبی صلوٰۃ پڑھتا ہے، پھر امام خطبہ دے تو خاموش رہتا ہے تو ایسے شخص کی اس جمعہ اور آئندہ جمعہ کے درمیان جو بدیاں ہوں گی بخش دی جائیں گی"[1]

مسند احمد میں حضرت ابو درداء کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جمعہ کے دن جس نے غسل کیا، کپڑے پہنے، موجود ہو تو خوشبو لے پھر جمعہ کو پورے وقار کے ساتھ جائے، کسی کو پھاندے نہیں تکلیف نہ پہنچائے، جو ہو سکے صلوٰۃ ادا کرے پھر امام کے سلام پھیرنے تک خاموش رہے تو دونوں جمعوں کے درمیان کے گناہ اس کے بخش دیئے جائیں گے"[2]

جمعہ کے دن جہنم دہکائی نہیں جاتی

انیسویں خصوصیت یہ ہے کہ جمعہ کا دن ایسا ہے کہ اس دن جہنم دہکائی نہیں جاتی۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو قتادہ کی حدیث اوپر گذر چکی ہے۔ اس کا راز واللہ اعلم یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک افضل ترین دن یہی جمعہ کا دن ہے، اس دن کثرت سے طاعت وعبادت کے کام انجام پاتے ہیں، دعائیں ہوتی ہیں اور گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ اس دن جہنم دھکائی نہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر ایام کے بمقابلہ اس دن مومنوں کے گناہ کم ہوتے ہیں حتی کہ اصحاب فسق وفجور بھی اس دن دیگر ایام کے بمقابلہ گناہوں سے دور رہتے ہیں"

حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اس دن جہنم دھکائی نہیں جاتی ورنہ قیامت میں تو کوئی دن اس سے خالی نہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جہنمی جب جہنم کے داروغوں سے درخواست کریں گے کہ اپنے رب سے کسی دن عذاب ہلکا کر دینے کی دعا کریں تو اسے وہ منظور نہ کریں گے۔

جمعہ کے دن قبولیت کی ایک گھڑی ہے

بیسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن قبولیت کی ایک گھڑی ہے۔ اس گھڑی اللہ کا جو مسلم بندہ بھی اس سے کچھ مانگتا ہے اسے وہ عطا کرتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے: "جمعہ کے دن ایک گھڑی ہے جس میں اگر کوئی بندۂ مسلم صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اللہ سے کچھ مانگتا ہے تو اسے وہ چیز اللہ عطا کر دیتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اس کی کمی کا اشارہ بھی کر کے فرمایا"[3]

---

[1] اس کی تخریج پیشتر گذر چکی ہے۔

[2] مسند احمد ۵/۱۹۸۔ حدیث حرب بن قیس عن ابی الدرداء۔ حرب کا ابو درداء سے سماع ثابت نہیں ہے۔ پھر بھی مسند احمد میں حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ کی روایتیں اس کی شاہد ہیں۔ نیز ابوذر کی ایک حدیث بروایت احمد بھی شاہد ہے۔ لہذا حدیث صحت کے درجہ کو ہے۔

[3] بخاری ۲/۳۴۴، فی الجمعۃ: باب الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ، وفی الطلاق: باب الاشارۃ فی الطلاق، وفی الدعوات: باب الدعاء فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ۔ مسلم (۸۵۲) فی الجمعۃ: باب فی الساعۃ التی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مسند میں ابولبابہ بن عبدالمنذر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے :
"سید الایام اور سب سے بڑا دن اللہ کے نزدیک جمعہ کا دن ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دن یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے بھی بڑا ہے، اس کی پانچ خوبیاں ہیں۔ اسی دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا، اسی دن اللہ نے آدم کو زمین پر اتارا، اسی دن اللہ نے آدم کو وفات دی، اس دن ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس میں بندۂ مسلم اللہ تعالیٰ سے جو شے بھی مانگتا ہے اللہ اسے وہ شے عطا کر دیتا ہے بشرطیکہ حرام کا طالب نہ ہو، اسی دن قیامت آئے گی۔ کوئی مقرب فرشتہ ہو کہ زمین، ہوائیں ہوں کہ دریا، پہاڑ ہوں کہ شجر سب جمعہ کے دن سے ڈرتے ہیں[1]"

قبولیت کی گھڑی کے بارے میں لوگوں کے اختلاف اور اقوال

اس گھڑی کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ آیا یہ اب تک موجود ہے یا اٹھ چکی ہے۔ دونوں ہی قول ہیں۔ ابن عبدالبر وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جو لوگ اس گھڑی کے اب تک باقی رہنے کے قائل ہیں ان میں اختلاف ہے کہ آیا یہ دن کے کسی خاص حصہ میں ہے یا غیر معین ہیں۔ پھر جو لوگ غیر معین ہونے کے قائل ہیں ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ گھڑی دن کی مختلف گھڑیوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا نہیں۔ جو لوگ معین ہونے کے قائل ہیں ان میں بھی گیارہ اختلافی اقوال ملتے ہیں۔

ابن منذر فرماتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کا قول ہم تک روایت ہوتا ہوا پہنچا ہے کہ یہ گھڑی طلوعِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک اور صلوٰۃ عصر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ گھڑی زوال کے وقت آتی ہے۔ ابن منذر نے اس کا ذکر حسن بصری اور ابو عالیہ سے روایت کرتے ہوئے کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ گھڑی اس وقت آتی ہے جب مؤذن جمعہ کی اذان دیتا ہے۔ ابن منذر فرماتے ہیں کہ اس کی روایت ہم کو حضرت عائشہ سے پہنچی ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ امام منبر پر خطبہ دینے کے لیے جب بیٹھتا ہے اس وقت سے لے کر خطبہ سے فارغ ہونے تک یہ گھڑی رہتی ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ یہ روایت ہم کو حسن بصری سے پہنچی ہے۔

پانچواں قول ابوبُردہ کا ہے۔ اس کے مطابق یہ وہی گھڑی ہے جس کا وقت اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کے لیے منتخب کیا ہے۔

چھٹا قول ابوالسوار عدوی کا ہے۔ ان کے مطابق صحابہ کا خیال تھا کہ زوال آفتاب سے لے کر وقت صلوٰۃ تک کے درمیان دعا مقبول ہوا کرتی ہے۔

ساتواں قول حضرت ابوذر کا ہے۔ ایک بالشت سے ایک ہاتھ تک آفتاب بلند ہو جائے تو اسی کے درمیان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی یوم الجمعة۔ نسائی ۳/ ۱۱۵ فی الجمعة : باب الساعة التی یستجاب فیها الدعاء یوم الجمعة۔ ابن ماجہ (۱۱۳۷) فی اقامة الصلاة : باب ماجاء فی الساعة التی ترجی فی الجمعة۔

[1] مسند احمد ۳/ ۴۳۰۔ ابن ماجہ (۱۰۸۴) گذر چکی ہے۔ حدیث حسن ہے۔

یہ گھڑی ہوتی ہے۔

آٹھواں قول یہ ہے کہ عصر کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کے درمیان یہ گھڑی ہوتی ہے۔ یہ قول حضرت ابوہریرہ، عطاء، عبداللہ بن سلام اور طاؤس کا ہے۔ یہ سارے اقوال ابن منذر نے بیان کیے ہیں۔

نواں قول یہ ہے کہ عصر کے بعد کی یہ سب سے آخری گھڑی ہے۔ یہ قول امام احمد اور جمہور صحابہ وتابعین کا ہے۔

دسواں قول یہ ہے کہ امام کے نکلنے سے لے کر اختتام صلوٰۃ تک کے درمیان یہ گھڑی رہتی ہے۔ نووی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

گیارہواں قول یہ ہے کہ یہ دن کا تیسرا پہر ہے۔ صاحب "المغنی" نے اسے بیان کیا ہے اور کعب کا قول ہے کہ ایک جمعہ کو کئی جمعوں پر تقسیم کر دیا جائے تو یہ گھڑی مل سکتی ہے۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے، دن بھر کسی ضرورت کی طلب کرتے رہنا نہایت آسان ہے۔

صحیح احادیث کے مطابق ان تمام اقوال میں راجح تر دو قول ہیں۔ ان دونوں قول میں سے ایک دوسرے سے زیادہ راجح ہے

پہلا یہ کہ منبر پر امام کے بیٹھنے سے لے کر صلوٰۃ سے فارغ ہونے تک کے درمیان یہ گھڑی ہوتی ہے۔ دلیل صحیح مسلم میں حضرت ابوبُردہ بن ابوموسیٰ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے ان سے پوچھا "کیا اپنے والد کو جمعہ کی گھڑی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بیان کرتے ہوئے سنا ہے؟" تو کہا ہاں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔

"یہ گھڑی امام کے بیٹھنے سے لے کر صلوٰۃ کے تمام ہونے تک کے درمیان ہے"[1]

ابن ماجہ اور ترمذی نے عمرو بن عوف مزنی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"جمعہ میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ بندہ اس میں اللہ سے جو دعا مانگتا ہے اسے وہ دیتا ہے" لوگوں نے کہا "رسول اللہ! وہ کون سی گھڑی ہے؟" فرمایا "صلوٰۃ کے لیے قیام سے لے کر سلام پھیرنے تک"[2]

---

[1] مسلم (۸۵۳) فی الجمعة : باب فی الساعة التی فی یوم الجمعة - حدیث ابن وھب عن مخرمة عن ابیہ عن ابی بردة بن ابی موسی الاشعری۔ فرمایا "عبداللہ بن عمر نے مجھ سے پوچھا کہ جمعہ کی گھڑی کے بارے میں کیا اپنے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بیان کرتے ہوتے سنا ہے؟ کہا "ہاں میں نے انھیں کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ یہ گھڑی امام کے بیٹھنے سے لے کر صلاۃ کے تمام ہونے تک کے درمیان ہے" اس حدیث میں انقطاع اور اضطراب دونوں ہیں۔ انقطاع تو یہ ہے کہ مخرمہ بن بکیر کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں ہے۔ احمد نے حماد بن خالد سے اور انھوں نے خود مخرمہ سے روایت کی ہے۔ اسی طرح سعید بن ابو مریم نے موسیٰ بن سلمہ سے، انھوں نے مخرمہ سے روایت کی ہے۔ اس میں مزید یہ ہے کہ یہ ہمارے یہاں موجود نوشتے تھے۔ علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ میں سے کسی کو مخرمہ سے یہ روایت کرتے ہوئے میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے اپنی حدیث کے کسی گوشہ میں "میں نے اپنے والد سے سنا" کہا ہو اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم معنعن حدیث میں معاصرت کے ساتھ امکان ملاقات پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہی صورت حال یہاں ہے۔ اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ مخرمہ کی اپنے والد سے عدم سماع کی تصریح کافی ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے۔ اضطراب یہ ہے کہ ابواسحاق، واصل الاحدب، معاویہ بن قرہ وغیرہ نے ابوبردہ سے ان کے قول کی روایت کی ہے۔ یہ حضرات اہل کوفہ میں سے ہیں، ابوبردہ کوفی ہیں۔ لہٰذا بکیر مدنی کی بہ نسبت یہ اپنی حدیث سے زیادہ واقف ہوں گے۔ یہ حضرات کافی تعداد میں ہیں، بکیر اکیلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دارقطنی نے پورے یقین سے کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا ہی صحیح ہے۔

[2] ابن ماجہ (۱۱۳۸) فی اقامة الصلاة : باب ماجاء فی الساعة التی ترجی فی الجمعة۔ ترمذی (۴۹۰) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ گھڑی عصر کے بعد آتی ہے۔ یہ دونوں میں سب سے زیادہ راجح قول ہے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام، حضرت ابوہریرہ، امام احمد اور ایک پوری مخلوق اسی کی قائل ہے۔ اس قول کی دلیل مسند احمد کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابو سعید اور حضرت ابوہریرہ نے روایت کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہے کہ بندۂ مسلم جس خیر کی دعا مانگتا ہوا اسے پالیتا ہے اللہ اسے وہ عطا کر دیتا ہے۔ یہ گھڑی عصر کے بعد کی ہے۔"[1]

ابوداؤد اور نسائی میں حضرت جابر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے:

"جمعہ کے دن بارہ گھڑیاں ہیں، ان میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی مسلمان اس میں جو شے بھی مانگتا ہوا پایا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ وہ شے عطا کر کے رہے گا۔ تو عصر کے بعد کی اس آخری گھڑی کو پالینے کی کوشش کرو۔"[2]

سنن سعید بن منصور میں حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ جمع ہوئے اور جمعہ کے دن والی گھڑی پر مذاکرہ کر کے جدا ہوئے تو اس کے بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہ رہا کہ یہ گھڑی جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن سلام سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں میں نے کہا "ہم کو کتاب الٰہی (یعنی تورات) میں جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ملتی ہے جس میں بندۂ مومن صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے جو شے بھی مانگتا ہے اللہ اس کی مراد پوری کرتا ہے۔" حضرت عبد اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری جانب اشارہ فرماتے ہوئے کہا کہ "یا ایک گھڑی کا کچھ حصہ"۔ میں نے کہا "رسول اللہ! آپ نے سچ فرمایا "یا ایک گھڑی کا کچھ حصہ" میں نے پوچھا وہ کون سی گھڑی ہے؟ فرمایا "دن کی سب سے آخری گھڑی ہے"۔ میں نے کہا، یہ صلوٰۃ کا وقت نہیں ہے، فرمایا "کیوں نہیں، بندۂ مومن جب صلوٰۃ پڑھتا ہے اور پھر صلوٰۃ کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے تو گویا صلوٰۃ کی حالت میں رہتا ہے۔"[3]

مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یوم جمعہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الساعۃ التی ترجی فی یوم الجمعۃ۔ سند میں کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف مزنی ضعیف ہیں۔ بایں ہمہ ترمذی نے اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔ "الترغیب والترھیب" میں منذری نے کہا ہے کہ کثیر بن عبد اللہ انتہائی درجہ کا ضعیف ہے۔ ترمذی وغیرہ نے اس کے باوجود اس کی حدیثوں کو حسن قرار دیا ہے اور صلح کے باب میں ان کی اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اس پر حفاظ نے تنقید نیز حسن قرار دینے پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ حافظ ابن حجر نے "الفتح" میں کہا ہے کہ اس کی روایت ابن ابی شیبہ نے مغیرہ کی سند سے، انھوں نے واصل الاحدب سے، انھوں نے ابو بردہ سے ان کے قول کی روایت کی ہے۔

[1] مسند احمد ۲/۲۷۲۔ حدیث ابو سعید وحضرت ابوہریرہ۔ سند میں محمد بن سلمہ انصاری مجہول ہیں۔ "المیزان" اور "اللسان" میں ان کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں مگر مابعد کی حدیث اس کی شاہد ہے۔

[2] ابوداؤد (۱۰۴۸) فی الصلاۃ : باب الاجابۃ ایۃ ساعۃ ھی فی یوم الجمعۃ۔ نسائی ۳/۹۹، ۱۰۰ فی الجمعۃ : باب وقت الجمعۃ۔ سند جید ہے۔ حاکم ۱/۲۷۹ نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔ نووی نے بھی اسے صحیح کہا ہے حافظ ابن حجر نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ احمد یعنی ابن حنبل کا ارشاد ہے مقبولیت کی گھڑی کے باب میں اکثر حدیثیں بعد از عصر کے حق میں ہیں، بعد از زوال آفتاب بھی اس کے ہونے کی امید ہے۔ دیکھیے الفتح ۲/۳۵۱۔

[3] ابن ماجہ (۱۱۳۹) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الساعۃ التی ترجی فی الجمعۃ۔ سند حسن ہے۔

کی وجہ تسمیہ کیا ہے ؟ فرمایا " اس دن تمھارے باپ آدم کا ڈھانچہ تیار کیا گیا، اسی دن صعقہ (بے ہوشی، موت) اور بعثہ (اٹھایا جانا) ہوگا، اسی دن بطشہ (گرفت، مواخذہ) بھی ہوگا اور اس کے آخر کی تین گھڑیوں میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں دعا کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے[1]"

سنن ابو داؤد، ترمذی اور نسائی میں ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی روایت حضرت ابو ہریرہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

" سب سے عمدہ دن جس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن ان کا ہبوط ہوا، اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی، اسی دن انھوں نے انتقال فرمایا، اسی دن قیامت آئے گی۔ جنوں اور انسانوں کو چھوڑ کر ہر رینگنے والی شے جمعہ کے دن صبح سے طلوعِ آفتاب تک قیامت کے ڈر سے کان لگائے رکھتی ہے، اس دن ایک ایسی گھڑی ہے کہ بندۂ مسلم صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اس میں اللہ تعالیٰ سے کوئی مراد مانگتا ہے تو اسے وہ پوری کرتا ہے"۔ کعب نے کہا " ایسا سال میں ایک دن ہوتا ہے؟" میں نے کہا " نہیں، بلکہ ہر جمعہ کو یہ گھڑی آتی ہے "۔ کعب نے تورات پڑھی تو کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ بعد میں عبداللہ بن سلام سے ملاقات ہوئی تو کعب کے ساتھ اپنی گفتگو کا ان سے تذکرہ کیا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا " مجھے معلوم ہے کہ یہ کون سی گھڑی ہے"۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ مجھے بتا دیجیے، عبداللہ بن سلام نے کہا " یہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے "۔ میں نے کہا کہ آخر یہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی کیونکر ہو سکتی ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ بندۂ مسلم صلوٰۃ پڑھتے ہوئے اسے پالے اور معلوم ہے کہ اس گھڑی میں صلوٰۃ نہیں پڑھی جاتی۔ عبداللہ بن سلام نے کہا " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نہیں ہے کہ جو آدمی بیٹھ کر صلوٰۃ کا انتظار کرے تو دوسری صلوٰۃ پڑھنے تک صلوٰۃ ہی کی حالت میں رہتا ہے ؟ میں نے کہا " کیوں نہیں "، فرمایا " وہ یہی حالت ہے[2]"۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ صحیحین میں اس کا کچھ حصہ آیا ہے۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ گھڑی امام کے خطبہ شروع کرنے سے فراغتِ صلوٰۃ تک کے درمیان ہے وہ صحیح مسلم میں حضرت ابو بُردہ بن ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ اس روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے پوچھا کہ جمعہ والی گھڑی کے بارے میں اپنے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ فرماتے ہیں : میں نے کہا کہ ہاں انھیں کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے " یہ گھڑی امام کے بیٹھنے سے لے کر اختتامِ صلوٰۃ تک کے درمیان ہے[3]"۔

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ صلوٰۃ کی گھڑی ہے تو ان کا استدلال ترمذی اور ابن ماجہ کی روایتوں سے ہے جس میں عمرو بن عوف مزنی کی حدیث آئی ہے۔ فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ " جمعہ میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس میں بندہ اللہ سے جو کچھ مانگتا ہے اسے وہ دیتا ہے " صحابہ نے پوچھا : رسول اللہ ! وہ کون سی گھڑی ہے؟ فرمایا

۱۔ مسند احمد ۲/۳۱۱ سند میں فرج بن فضالہ ضعیف ہیں اور علی ابن ابو طلحہ کا حضرت ابو ہریرہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

۲۔ ابو داؤد (۱۰۴۶) فی الصلاۃ : باب فضل یوم الجمعة و لیلة الجمعة۔ ترمذی (۴۹۱) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الساعة التی ترجی فی یوم الجمعة۔ نسائی ۳/۱۱۴، ۱۱۵ فی الجمعة : باب ذکر الساعة التی یستجاب فیها الدعاء یوم الجمعة۔ مؤطا امام مالک ۱/۱۸۲ و ۱۸۳ میں بھی یہ روایت آئی ہے، سند صحیح ہے۔ اس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

۳۔ حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔ اس میں علت ہے۔

"قیامِ صلوٰۃ سے لے کر سلام پھیرنے تک کی گھڑی[1]"، مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابوعمر ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ میرے علم کی حد تک اس کے راوی صرف کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف ہیں جو اسے اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔ کثیر لائقِ احتجاج راوی نہیں ہیں۔ روح بن عبادہ نے عوف سے روایت کی ہے، وہ معاویہ بن قرہ سے وہ ابوبُردہ سے وہ ابوموسیٰ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے کہا "یہ وہی گھڑی ہے جو امام کے نکلنے سے صلوٰۃ کے ختم ہونے تک ہے۔" تو انھوں نے فرمایا "اللہ نے آپ کے ذریعہ راہِ صواب دکھا دی۔"

عبدالرحمٰن بن حُجَیرہ نے حضرت ابوذر سے روایت کی ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے بندۂ مومن کے حق میں جمعہ کے دن مقبولیت والی گھڑی کے بارے میں دریافت کیا تو انھیں جواب دیا "یہ گھڑی جب سورج کچھ بلند ہوتا ہے اس وقت ہوتی ہے، اب اگر اس کے بعد پوچھا تو تجھے طلاق۔"

یہ حضرات حضرت ابوہریرہ کے اس قول سے بھی استدلال کرتے ہیں "وھو قائم یصلی" (کھڑا ہو کر صلوٰۃ پڑھتا ہوا) اور معلوم ہے کہ عصر کے بعد اس وقت میں کوئی صلوٰۃ نہیں پڑھی جاتی۔ ظاہر حدیث ہی کا مفہوم اختیار کرنا زیادہ انسب ہے۔ یہ لوگ حضرت علی کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ "آفتاب ڈھل جائے، سائے مائل ہو جائیں اور ہوائیں خوشگوار ہو جائیں تو اس وقت اللہ سے اپنی مرادیں مانگو، کیونکہ یہ گھڑی اوّابین کی گھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا[2] (الاسراء : ۲۵)

وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگذر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویّہ کی طرف پلٹ آئیں۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جمعہ کے دن والی گھڑی صلوٰۃ عصر سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ سعید بن جبیر کا یہ معمول تھا کہ عصر پڑھ کر غروبِ آفتاب تک کسی سے بولتے نہیں تھے۔ اکثر سلف کا یہی قول ہے اور اسی کے مطابق اکثر احادیث بھی وارد ہیں اس کے بعد درجہ اس قول کا ہے کہ وہ صلوٰۃ کی گھڑی ہے۔ بقیہ سارے اقوال بے بنیاد ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ صلوٰۃ والی گھڑی بھی مقبولیت کی گھڑی ہے گو مخصوص گھڑی تو وہی بعد از عصر کی آخری گھڑی ہے مگر ہیں دونوں ہی مقبولیت کے اوقات۔ عصر کے بعد والی گھڑی معین ہے۔ مقدم و مؤخر نہیں ہو سکتی۔ مگر صلوٰۃ والی گھڑی صلوٰۃ کے مطابق مقدم و مؤخر ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا اجتماع، صلوٰۃ، تضرع، گریہ وزاری یہ ساری باتیں مقبولیت کے لیے انتہائی مؤثر ہیں۔ پس مسلمانوں کا اجتماع ایک ایسے وقت ہوتا ہے جس میں قبولیتِ دعا کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بنا بریں تمام حدیثیں ایک نکتہ پر مجتمع بھی ہو جاتی ہیں۔ یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں ہی اوقات میں امت پر دعا اور ابتہال الی اللہ کے لیے زور دیا ہوگا۔

اس کی شاہد حسبِ ذیل روایت ہے۔ اس مسجد کے بارے میں سوال کیا گیا جس کے متعلق اللہ کا ارشاد "اُسِّسَ

---

[1] تخریج گذر چکی ہے۔ یہ ضعیف ہے۔

[2] حافظ نے الفتح ۲/۳۴۷ میں لکھا ہے: ابن منذر نے اسے ابوعالیہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت علی سے ایک اور روایت میں اسی طرح کا مضمون بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں: سعید بن ابوعروبہ عن قتادہ کی سند سے ابن عساکر نے روایت کی ہے جس میں قتادہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال تھا کہ مقبولیت کی گھڑی جس میں دعا مقبول ہوتی ہے آفتاب ڈھلنے کے بعد ہے۔ اس بارے میں غالباً ان کا ماخذ یہ ہے کہ یہ وقت فرشتوں کے اجتماع، وقتِ جمعہ کے داخلہ، ابتداء اذان وغیرہ کا ہے۔

عَلَى التَّقْوٰی" (تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی مسجد) ہے تو آپ نے مدینہ کی مسجد کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے کہا "وہ تمھاری یہی مسجد ہے"[1] اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد قبا ایسی نہیں ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ دونوں کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔

اسی طرح آپ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "یہ گھڑی امام کے بیٹھنے سے لے کر اختتامِ صلوٰۃ تک ہے" آپ کا یہ ارشاد دوسری حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں آپ کا ارشاد ہے کہ "پس اسے بعد از عصر آخری گھڑی کے اندر تلاش کرو"

اسماء کے باب میں آپ کا یہ قول بھی اسی کے مشابہ ہے "تم رقوب کسے کہتے ہو؟" لوگوں نے کہا "جس کے کوئی اولاد نہ ہو" فرمایا "رقوب وہ ہے جس نے اپنی اولاد سے کما کر کوئی توشہ آگے کے لیے نہ بھیجا ہو"[2]

آپ نے رقوب کا مفہوم یہ بتایا کہ جسے اپنی اولاد سے کچھ ایسا نفع حاصل نہ ہو جو آگے کے لیے اس کے حق میں توشہ بنے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے جس کے کوئی اولاد نہ ہو وہ رقوب نہیں ہے۔

اسی طرح آپ کا یہ ارشاد بھی ہے "مفلس کسے سمجھتے ہو؟" لوگوں نے کہا "جس کے پاس پیسہ اور سامان نہ ہو" آپ نے فرمایا "مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن کوہساروں جیسی نیکیاں لے کر آئے مگر اس حال میں آئے کہ کسی کو طمانچہ مارا ہو، کسی کو زدوکوب کیا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، تو کوئی یہ نیکی لے لے کوئی وہ"[3] (الحدیث)

ایسا ہی آپ کا یہ ارشاد بھی ہے "مسکین وہ چکر لگانے والا نہیں ہے جو ایک یا دو لقمہ یا ایک یا دو کھجوریں پا کر واپس ہو جاتا ہے بلکہ وہ ہے جو لوگوں سے مانگتا نہیں، اور نہ ہی اس کا پتہ چلتا ہے کہ اسے صدقہ دیا جا سکے"[4]

یہ گھڑی جو بعد از عصر کی آخری گھڑی ہے تمام قومیں اس کی تعظیم و توقیر کرتی ہیں۔ اہل کتاب کے نزدیک بھی یہ مقبولیت کی گھڑی ہے، تحریف و تبدیل کا کوئی امکان بھی نہیں ہے کیونکہ اس سے ان کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہو سکے گی۔ علاوہ ازیں اہل کتاب میں جو اصحاب ایمان تھے انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

جو لوگ اس گھڑی کے منتقل ہونے کے قائل ہیں ان کے پیش نظر اصل میں شب قدر کی طرح حدیثوں کے درمیان تطابق پیدا کرنا ہے۔ مگر یہ کوئی ٹھوس بات نہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شب قدر کے بارے فرمایا ہے "اسے اکیسویں، تئیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو"[5] مگر ایسا جمعہ کی گھڑی کے بارے میں آپ کا کوئی

---

[1] مسلم (۱۳۹۸) فی الحج : باب بیان أن المسجد الذی أسس علی التقوی ہو مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ۔ حدیث ابو سعید خدری۔ مسند احمد ۵/۱۱۶ کے اندر حضرت ابی بن کعب سے بھی ایک روایت اس باب کی آئی ہے۔

[2] مسند احمد ۱/۳۸۲ و ۳۸۳۔ مسلم (۲۶۰۸) فی البر والصلۃ : باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔ حدیث عبداللہ بن مسعود۔

[3] مسند احمد ۲/۳۰۳ و ۳۳۴ و ۳۷۲۔ مسلم (۲۵۸۱) فی البر والصلۃ : باب تحریم الظلم۔ حدیث ابو ہریرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے : میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن صلوٰۃ وصوم اور زکوٰۃ کے اعمال لے کر آئے مگر اس حال میں کہ کسی کو گالی دیا ہو، کسی پر بہتان لگایا ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، کسی کو مارا ہو۔ چنانچہ اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دیدی جائیں اور جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو مظلوموں کی خطائیں اس پر تھوپ دی جائیں اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے۔"

[4] موطا امام مالک ۲/۹۲۳ فی صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم : باب ما جاء فی المساکین۔ بخاری ۳/۲۶۹، ۲۷۰ فی الزکوٰۃ : باب قول اللہ لا یسألون الناس الحافا و فی تفسیر سورۃ البقرۃ : باب لا یسألون الناس الحافا۔ مسلم (۱۰۳۹) فی الزکوٰۃ : باب المسکین الذی لا یجد غنی۔ نسائی ۵/۸۵ فی الزکوٰۃ : باب تفسیر المسکین۔

[5] بخاری ۱/۱۰۴، ۱۰۵ فی الایمان : باب خوف المؤمن من ان یحبط عملہ وھو لا یشعر، و فی صلاۃ التراویح : باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الأواخر، و فی الادب : باب ما ینہی من السباب واللعن۔ ابو داؤد (۱۳۸۱) میں یہ روایت حضرت ابن عباس سے آئی ہے۔

ارشاد نہیں ہے۔
علاوہ ازیں شب قدر کے بارے میں کوئی صریح حدیث ایسی موجود نہیں ہے جو تعین کے ساتھ بتا سکے کہ وہ یہی شب ہے۔ برخلاف اس کے جمعہ والی گھڑی تعین کے ساتھ بتادی گئی ہے۔ لہٰذا دونوں کا فرق بالکل واضح ہے۔
جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ گھڑی اب باقی نہیں رہی وہ ویسا ہی کہتے ہیں جیسا شب قدر کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہنے والوں کی مراد اگر یہ ہے کہ یہ گھڑی متعین تھی مگر اب اس کے تعین کا علم اٹھ گیا ہے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ تمام امت سے نہیں بلکہ کچھ لوگوں سے اس کا علم جاتا رہا۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ اس کی مقبولیت ختم ہو چکی ہے تو یہ بالکل باطل اور احادیث صریحہ کے بالکل خلاف ہے۔ لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

اس دن صلوٰۃ جمعہ ادا کی جاتی ہے

اکیسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن صلوٰۃ جمعہ ادا کی جاتی ہے جسے تمام فرض صلوات کے مقابلہ میں کچھ ایسی خصوصیات حاصل ہیں جو کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ مثلاً اجتماع، مخصوص تعداد، مقیم ہونے کی شرط، وطن ہونے کی شرط، باآواز بلند قرأت اور جمعہ کی صلوٰۃ کے بارے میں شدید تاکیدیں جن کی مثال عصر کی صلوٰۃ کے علاوہ اور کسی صلوٰۃ کے بارے میں نہیں ملتی۔ سنن اربعہ میں ابوجعد ضمری جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل تھی کی روایت سے آپ کا ارشاد منقول ہے کہ "غفلت سے جس نے تین جمعہ ترک کر دیئے اللہ اس کے دل پر مہر کر دیتا ہے"[1] ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور کہا ہے کہ میں نے محمد سے ابوجعد ضمری کا نام پوچھا تو فرمایا غیر معروف ہے، نیز یہ بھی فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی صرف یہی روایت مجھے معلوم ہے۔
سنن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت آئی ہے کہ صلوٰۃ جمعہ ترک کر دینے والے کو آپ نے ایک دینار صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ میسّر نہ ہو سکے تو نصف دینار صدقہ کرے۔ یہ روایت ابوداؤد اور نسائی میں آئی ہے۔ راوی قدامہ بن وبرہ ہیں جنھوں نے اس کی روایت سمرہ بن جندب سے کی ہے[2]۔ مگر احمد فرماتے ہیں قدامہ بن وبرہ غیر معروف ہیں۔ یحییٰ ابن معین نے انھیں ثقہ کہا ہے۔ بخاری سے ایک روایت کے مطابق قدامہ کا سمرہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔
مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی صلوٰۃ فرض عین ہے صرف ایک قول امام شافعی سے فرض کفایہ ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بیان کرنے والوں کی غلطی ہے اور یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ امام شافعی کا قول ہے کہ صلوٰۃ جمعہ جس پر واجب ہے اس پر صلوٰۃ عید بھی واجب ہے۔ بیان کرنے والے نے یہ سمجھ لیا کہ چونکہ عید فرض کفایہ ہے اس لیے جمعہ بھی فرض کفایہ ہے۔

---

[1] ترمذی (۵۰۰) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی ترک الجمعۃ من غیر عذر۔ ابوداؤد (۱۰۵۲) فی الصلاۃ : باب التشدید فی ترک الجمعۃ۔ نسائی ۳/۸۸ فی الجمعۃ : باب التشدید فی التخلف عن الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۱۲۵) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فیمن ترک الجمعۃ۔ مسند احمد ۳/۴۲۴ و ۴۲۵۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۵۵۴) اور حاکم ۱/۲۸۰ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔ ابن ماجہ (۱۱۲۶) میں حضرت جابر کی ایک روایت اس کی شاہد ہے۔ حافظ نے اسے حسن اور بوصیری نے اسے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد ۵/۳۰۰ میں حضرت ابوقتادہ کی روایت بھی شاہد ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] ابوداؤد (۱۰۵۳) فی الصلاۃ : باب کفارۃ من ترک الجمعۃ۔ نسائی ۳/۸۹ فی الجمعۃ : باب کفارۃ من ترک الجمعۃ من غیر عذر۔ مسند احمد ۵/۸ و ۱۴۔ سند میں قدامہ بن وبرہ مجہول ہیں۔ بایں ہمہ ابن حبان (۵۸۲) اور حاکم ۱/۲۸۰ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔ ابن ماجہ (۱۱۲۸) نے اس کی روایت حضرت حسن سے اور انھوں نے سمرہ سے کی ہے۔

اور یہ غلط ہے۔ کیونکہ شافعی کی نص باقاعدہ موجود ہے کہ عید سب پر واجب ہے۔ یہاں دو باتوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ جمعہ کی طرح صلوٰۃ عید بھی فرض عین ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فرض کفایہ ہے۔ فرض کفایہ بھی فرض عین کی طرح سب پر واجب ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب کچھ لوگ فریضہ ادا کر لیتے ہیں تو فرض ہونے کے باوجود بعض لوگوں سے یہ ساقط ہو جاتا ہے۔

اس دن خطبہ دیا جاتا ہے

بائیسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن خطبہ دیا جاتا ہے جس میں حسب ذیل مضمون ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی بزرگی کا بیان۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول کے رسالت کی گواہی۔
۳۔ بندوں کو اقوام گذشتہ پر عذاب الٰہی اور نعمت الٰہی کی تذکیر اور ترہیب و ترغیب۔
۴۔ بندوں کو ان باتوں کی وصیت اور حکم جو انھیں اللہ کی رضا سے قریب کرتی ہوں اور ان باتوں سے باز رہنے کی تاکید جو انھیں اس کی ناراضگی سے قریب تر کر دیتی ہوں۔

خطبہ اور اس کے لیے مسلمانوں کے اس اجتماع کے مقاصد یہی ہیں۔

جمعہ کے دن عبادت کے لیے فارغ رہنا مستحب ہے

تیئسویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دن ہے جس میں عبادت کے لیے فارغ رہنا مستحب ہے۔ اس دن کچھ واجب اور کچھ مستحب عبادتیں ایسی ہیں جن کی بدولت اسے دیگر ایام کے بمقابلہ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ملت کے اندر ایک دن عبادتوں اور دنیاوی مشغلوں سے الگ رہنے کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں جمعہ کا دن عبادت کا دن ہے۔ مہینوں میں جس طرح رمضان کا مہینہ ہے اسی طرح دنوں میں یہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی طرح رمضان میں جس طرح شب قدر ہے اسی طرح جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا جمعہ کا دن صحیح و سالم رہتا ہے اس کے آئندہ جمعہ تک کے تمام ایام، جس کا رمضان صحیح و سالم رہتا ہے اس کا پورا سال اور جس کا حج صحیح و سالم رہتا ہے اس کی پوری عمر صحیح و سالم رہتی ہے۔ لہٰذا جمعہ کا دن تمام ہفتہ، رمضان تمام سال اور حج تمام عمر کی میزان ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اس دن مسجد جانے میں عجلت اور صلوٰۃ کے لیے سویرے پہنچنا مستحب ہے

چوبیسویں خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ ہفتہ میں اس دن کا وہی مقام ہے جو سال میں عید کا ہوتا ہے اور عید میں صلوٰۃ اور قربانیوں کا اہتمام ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دن مسجد پہنچنے میں عجلت اختیار کرنے کو قربانیوں کا قائم مقام بنایا ہے۔ بنا بریں مسجد سویرے پہنچنے والے کو صلوٰۃ اور قربانی دونوں کا ثواب ملتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی مروی ہے ” جو پہلی گھڑی میں پہنچتا ہے اس نے گویا ایک اونٹ قربان کیا، جو دوسری گھڑی میں پہنچتا ہے اس

نے گویا ایک گائے قربان کی اور جو تیسری گھڑی میں پہنچتا ہے اس نے گویا ایک سینگ دار مینڈھا قربان کیا۔"[1]

اس گھڑی کے بارے میں فقہاء کے دو اختلافی قول ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ گھڑی دن کے آغاز سے شروع ہو جاتی ہے۔ امام شافعی، احمد اور ان کے علاوہ کا معروف مذہب یہی ہے۔

دوسرا یہ کہ بعد از زوال چھٹی گھڑی کے یہ مختلف اجزاء ہیں۔ یہ امام مالک کا معروف مذہب ہے۔ بعض شوافع کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس قول کی انھوں نے دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

ایک یہ کہ حدیث میں "راح" مصدر "رواح" (بعد از زوال روانگی) آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی جانب روانہ ہونے کی بات بعد از زوال ہی پیش آتی ہے۔ اس کے بالمقابل لفظ "غدو" ہے جس کے معنی قبل از زوال روانہ ہونے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا: ۱۲)

صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینہ کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینہ کی راہ تک۔

جوہری فرماتے ہیں: رواح بعد از زوال ہی ہوتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ بزرگانِ سلف خیر کے انتہائی دلدادہ تھے مگر پھر بھی جمعہ کو طلوع آفتاب ہی سے نہیں نکلتے تھے۔ دن کے آغاز میں جمعہ کو جانا امام مالک نے سختی سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اہل مدینہ کا عمل نہیں رہا ہے۔

پہلے قول کے جو لوگ قائل ہیں وہ حضرت جابر کی حدیث سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کرتے ہیں کہ "جمعہ کے دن بارہ گھڑیاں ہوتی ہیں۔"[2]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ متعین گھڑیاں یہی بارہ ہیں۔ اور دو قسم کی ہیں ایک تعدیلی دوسری زمنی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھڑیوں کا شمار کرتے ہوئے چھ تک پہنچے، اس سے آگے نہیں بڑھے۔ جس گھڑی جمعہ ہوتا ہے اگر اس کے چھوٹے چھوٹے اجزاء ہوتے تو وہ چھ جزوں میں منحصر نہ ہوتے، برخلاف اس کے متعین گھڑیاں ان چھ اجزاء میں منحصر ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کہ چھٹی گھڑی جب ختم ہو جاتی ہے اور ساتویں گھڑی آتی ہے تو امام باہر نکلتا ہے اور دفتر سمیٹ دیئے جاتے ہیں اور اس کے بعد کسی کے حق میں قربانی کا ثواب درج نہیں ہوتا۔ سنن ابوداؤد میں اس کی تصریح موجود ہے۔ حضرت علی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "جمعہ کا دن ہوتا ہے تو شیاطین اپنے پرچم لے کر بازاروں میں نکلتے ہیں اور لوگوں میں روک رکاوٹوں کی باتیں کرتے ہیں اور جمعہ میں شریک ہونے کے حوصلے پست کرتے ہیں اور ملائکہ صبح نکل کر مسجدوں کے دروازوں پر آبیٹھتے اور لکھتے ہیں کہ کون پہلی گھڑی آیا کون دوسری حتیٰ کہ امام خطبہ کے لیے نکل آتا ہے۔"[3]

ابو عمر بن عبدالبر فرماتے ہیں ان گھڑیوں کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ طلوع آفتاب سے یہ گھڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ افضل یہ ہے کہ جمعہ کو سویرے پہنچا جائے۔ ثوری، ابوحنیفہ، شافعی اور اکثر

---

[1] بخاری ۲/۳۰۴، ۳۰۵ فی الجمعۃ: باب فضل الجمعۃ۔ مسلم (۸۵۰) فی الجمعۃ: باب الطیب والسواک یوم الجمعۃ۔ مؤطا امام مالک ۱/۱۰۱ فی الجمعۃ: باب العمل فی غسل یوم الجمعۃ۔ ترمذی (۴۹۹) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی التکبیر الی الجمعۃ۔ ابوداؤد (۳۵۰) فی الطھارۃ، باب فی الغسل یوم الجمعۃ۔ نسائی ۳/۹۹ فی الجمعۃ: باب وقت الجمعۃ۔ تمام کتابوں میں روایت ابوہریرہ سے ہے۔ پوری حدیث یوں ہے "...... جو چوتھی گھڑی میں پہنچا تو گویا ایک مرغی قربان کی اور جو پانچویں گھڑی میں پہنچا تو گویا ایک انڈا قربان کیا۔ امام جب نکل آتا ہے تو فرشتے جمع ہو کر خطبہ سننے لگتے ہیں۔

[2] ابوداؤد (۱۰۴۸) فی الجمعۃ: باب الاجابۃ ایۃ ساعۃ ھی فی یوم الجمعۃ۔ نسائی ۳/۹۹ فی الجمعۃ: باب وقت الجمعۃ۔ سند قوی ہے۔

[3] اس کی تخریج گذر چکی ہے اور یہ ضعیف ہے۔

علماء کا یہی قول ہے بلکہ تمام علماء کے نزدیک مستحب بھی یہی ہے کہ سویرے مسجد جایا جائے۔
شافعی فرماتے ہیں: بعد از فجر اور طلوع آفتاب سے پیشتر ہی آدمی پہنچ جائے تو بہتر ہے۔ اثرم فرماتے ہیں: احمد بن حنبل سے جب یہ کہا گیا کہ مالک بن انس فرماتے ہیں جمعہ کے دن سویرے چلچلاتی دھوپ میں جانا مناسب نہیں تو فرمایا: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے خلاف ہے اور کہا کہ سبحان اللہ! اس باب میں ان کا کیسا مذہب ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ اس وقت جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اونٹ قربان کرنے والا (کالمُھدی جزُوراً) اثرم کہتے ہیں کہ حرملہ سے یحییٰ بن عمر نے روایت کی ہے کہ انھوں نے ان گھڑیوں کی ابن وہب سے وضاحت چاہی اور پوچھا کہ آیا مراد دن کے آغاز میں جانا ہے یا بعد از زوال؟ تو انھوں نے کہا " مالک سے میں نے یہ سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: میرے دل کو جو بات لگتی ہے وہ یہ ہے کہ مراد ایک ہی گھڑی ہے جس کے اندر یہ مختلف گھڑیاں منقسم ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جمعہ کی صلوٰۃ نویں گھنٹے عصر کے وقت یا اس سے قریب پڑھی جاتی۔ ابن حبیب امام مالک کا یہ قول نہیں مانتے۔ ان کا میلان پہلے قول کی جانب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مالک کا یہ قول حدیث کے مفہوم کی تحریف ہے اور یہ مختلف وجوہ سے محال ہے۔ کہتے ہیں کہ دلیل یہ ہے کہ ایک ہی گھڑی کے اندر مختلف گھڑیاں موجود نہیں ہوتیں، آفتاب کا زوال دن کے چھ گھنٹے میں ہوتا ہے جو اذان اور امام کے نکل کر خطبہ دینے کا وقت ہے۔ معلوم ہوا کہ حدیث میں مختلف گھڑیوں سے مراد دن کی مشہور و معروف گھڑیاں ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی گھڑی سے شروع فرمایا اور کہا کہ جو پہلی گھڑی نکلے گا گویا اس نے ایک اونٹ قربان کیا۔ اسی طرح پانچویں گھڑی میں نکلنے والے کے لیے ایک انڈے کی قربانی کے ثواب کا ذکر فرمایا۔ آگے تہجیر (دھوپ کی شدت) ختم ہو گئی، اب اذان کا وقت ہے۔ حدیث اپنے الفاظ میں بالکل واضح ہے مگر خواہ مخواہ تحریف کی جارہی ہے اور ایک امر محال سے اس کی تشریح کر دی گئی۔ اس طرح لوگوں کو دن کے آغاز میں چلچلاتی دھوپ میں نکلنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ترغیب فرمائی ہے اس سے روک دیا گیا اور یہ خیال قائم کر دیا گیا کہ زوال آفتاب سے قریب یہ اوقات سب کے سب ایک ہی گھڑی کے اندر مجتمع ہیں۔ ابن حبیب فرماتے ہیں کہ جمعہ کے لیے اول نہار میں چلچلاتی دھوپ میں نکلنے سے متعلق احادیث بھی وارد ہیں جنھیں اپنی کتاب "واضح السنن" میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان کے اندر کافی وشافی وضاحتیں موجود ہیں۔

ابو عمر نے ان کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ مالک پر ان کا یہ زبردستی کا حملہ ہے۔ یہ بھی تو اسی کے قائل ہیں جس کا انکار کرتے ہوئے محال اور اصل مفہوم کی تحریف قرار دے رہے ہیں۔ امام مالک کے قول کی تائید میں ائمہ کی روایت سے صحیح آثار بھی موجود ہیں نیز ان کے نزدیک یہ اہل مدینہ کا عمل بھی ہے۔ یہ مسئلہ انہی مسائل میں سے ہے جن پر عمل سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہر جمعہ کو پیش آتا ہے اور عام علماء سے مخفی نہیں رہ سکتا۔
مالک جن حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں ان میں ایک وہ حدیث ہے جس کی روایت زہری نے حضرت سعید بن مسیب سے اور انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے آنے والوں کو لکھتے ہیں، چنانچہ جمعہ کو چلچلاتی دھوپ میں آنے والا گویا ایک اونٹ قربان کرتا ہے پھر اس کے بعد آنے والا گویا ایک گائے قربان کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد آنے والا گویا ایک مینڈھا قربان کرتا ہے، حتیٰ کہ مرغی اور انڈے کا تذکرہ فرمایا۔ اور جب امام بیٹھ جاتا ہے تو دفتر بند ہو جاتا ہے اور فرشتے خطبہ سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں"[1] فرماتے ہیں دیکھیے آپ نے یہاں فرمایا ہے کہ فرشتے

(حاشیہ "۱" اگلے صفحہ پر)

پیچھے بعد دیگرے آنے والوں کو لکھتے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں آنے والے کا ایک اونٹ کا ثواب، اس کے بعد آنے والوں کے ثواب بتائے ہیں۔ اول آپ نے اسے قرار دیا جو دھوپ میں چل کر آتا ہے (مُھجّر) یہ لفظ ہاجرہ (دھوپ) اور تھجیر (دھوپ میں نکلنا) سے ماخوذ ہے۔ یہ وقت جمعہ کو جانے کا ہے طلوع آفتاب کا نہیں۔ کیونکہ اس وقت نہ دھوپ ہوتی ہے اور نہ اس وقت نکلنے کو دھوپ میں نکلنا کہتے ہیں۔ حدیث میں "پھر اس کے بعد جو نکلتا ہے، پھر اس کے بعد جو نکلتا ہے" آیا ہے۔ گھڑی کا تذکرہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں انہی الفاظ کی سندیں بکثرت وارد ہیں جو "التمہید" میں مذکور ہیں۔ بعض سندوں میں "جمعہ کو جلد جانے والے کی مثال ایک اونٹ قربان کرنے والے کی ہے" اور اکثر سندوں میں "دھوپ میں جانے والے کی مثال ایک نر اونٹ قربان کرنے والے کی ہے" آیا ہے۔ بعض سندوں کے مطابق یہ دلیل بھی موجود ہے کہ جمعہ کو پہلی گھڑی کے شروع میں جانے والے کی مثال ایک اونٹ قربان کرنے والے کی ہے۔ اسی طرح اس گھڑی کے آخر میں جانے والے کا بھی یہی حال ہے اور دوسری گھڑی کے شروع میں جانے والے کی مثال ایک گائے قربان کرنے والے کی ہے۔ اس گھڑی کے آخر میں جانے والے کا بھی یہی حال ہے۔ شافعی کے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "جمعہ کو مھجر (دھوپ میں جانے والے) کی مثال ایک اونٹ قربان کرنے والے کی ہے" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دھوپ میں نکل کر جانے والا بلکہ یہ ہے کہ جو اپنے دنیاوی اعمال و اشغال سے ہجرت اختیار کر کے جمعہ کو جاتا ہے اس کی مثال ایک اونٹ قربان کرنے والے کی ہے۔ یہ لوگ "مھجر" کو ہجرت سے ماخوذ بتاتے ہیں جو ترک وطن اور نکل کر دوسرے کے یہاں جانے کے مفہوم میں ہے۔ اسی سے مہاجرین کا لفظ نکلا ہے۔ شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے پسند یہ ہے کہ جمعہ کو سویرے حاضری دی جائے اور پیدل چل کر۔ اب تک کی گفتگو تمام کی تمام ابو عمر کی رہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابتدائے دن میں سویرے جمعہ کی حاضری کا جو انکار کیا جاتا ہے اس کا مدار تین باتوں پر ہے۔ ایک لفظ رواح پر، جس کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ بعد از زوال چلنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے لفظ تھجیر پر، یہ چلچلاتی دھوپ میں نکلنے کو کہتے ہیں جو انتہائی گرمی کا وقت ہوتا ہے۔ تیسرے عمل مدینہ پر، اہل مدینہ دن کی ابتدا میں مسجد نہیں آتے تھے۔

جہاں تک لفظ رواح کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ یہ لفظ بعد از زوال نکلنے کو کہتے ہیں مگر زیادہ تر اس مفہوم میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب اس کے ساتھ لفظ "غدو" بھی آئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا : ۱۲)

صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینہ کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینہ کی راہ تک۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من غدا الی المسجد وراح اَعَدَّ اللّٰهُ له نزلاً فی الجنة کلما غدا اَوْ راح[۲]

جو مسجد کو قبل از زوال و بعد از زوال جائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں جب بھی قبل از زوال یا بعد از زوال نکلے گا

---

[۱] بخاری ۲/۳۳۶ فی الجمعة : باب الاستماع الی الخطبة یوم الجمعة۔ مسلم (۸۵۰) فی الجمعة : باب فضل التھجیر یوم الجمعة نسائی ۳/۹۸ فی الجمعة : باب التبکیر الی الجمعة۔ ابن ماجہ (۱۰۹۲) فی اقامة الصلاة : باب ما جاء فی التھجیر الی الجمعة۔

[۲] مسند احمد ۲/۵۰۹۔ بخاری ۲/۱۲۴ فی الجماعة : باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاة و فضل المساجد۔ مسلم (۶۶۹) فی المساجد : باب المشي الی الصلاة تمحی به الخطایا و ترفع به الدرجات۔ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

ضیافت تیار کرے گا۔

اسی مفہوم میں شاعر کا یہ قول بھی ہے ؎

نزوح ونغدو لحاجاتنا　　وحاجة من عاش لاتنقضی[1]

(ہم صبح وشام اپنی ضرورتوں کے لیے نکلتے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ جو زندہ رہتا ہے اس کی ضرورت ختم نہیں ہوتی)

مگر رواح جانے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ لفظ غدو نہ آیا ہو۔

ازہری "التہذیب" میں فرماتے ہیں کہ بعض عربوں کو رواح کا لفظ کسی بھی وقت چلنے کے لیے استعمال کرتے ہوئے سنا ہے۔ کہتے ہیں "راح القوم" یعنی قوم روانہ ہوئی۔ اسی طرح غدو کا لفظ بھی رواح سے الگ ہو کر چلنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اپنے ساتھی کے بارے میں کہتے ہیں "تَرَوَّحَ" (چلا گیا) اور دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں "روحوا" (چلے جاؤ)۔ اسی طرح "الاتروحون" (کیا جاؤ گے نہیں) کہتے ہیں۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ صحیح حدیثوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی جمعہ کو جانا۔ شام کو جانے کے مفہوم میں نہیں[2]۔

تہجیر اور ہجر کا لفظ ہجیرہ اور ہاجرہ سے ہے۔ جوہری فرماتے ہیں ہاجرہ نصف النہار کو کہتے ہیں جب کہ گرمی سخت ہو جاتی ہے۔ اسی سے "ھجّر النہار" ہے یعنی دن سخت گرمی میں داخل ہو گیا۔ امرؤ القیس کہتا ہے :

فَدَعْهَا وَسَلِّ الْهَمَّ عَنْهَا بِجَسْرَةٍ　　ذَمُولٍ إِذَا صَامَ النَّهَارُ وَهَجَّرَا[3]

(اسے (محبوبہ کو) چھوڑو اور جو غم اس کا لاحق ہوا ہے اسے ایک تیز رفتار اونٹنی سے دور کر لو جو ایسی ہو کہ دن کھڑا ہو اور گرمی انتہائی سخت تو اس کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہو)

کہتے ہیں "اتینا اھلنا مھجرین" یعنی سخت گرمی میں ہم اپنے گھر آئے۔ تہجیر اور تہجر ہاجرہ (سخت گرمی) میں چلنے کو کہتے ہیں۔ اہل مدینہ کے قول کی یہی بنیاد ہے۔

دوسرے یہ کہتے ہیں کہ لفظ رواح میں جو بات ہے وہی لفظ تہجیر میں بھی ہے۔ چنانچہ یہ بھی مطلق ہے اور اس سے مراد سویرے جانا ہے۔

ازہری "التہذیب" میں فرماتے ہیں : مالک نے سُمَیّ سے روایت کی ہے، انھوں نے ابو صالح سے، انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ تہجیر (دھوپ میں نکلنا) میں کیا بات ہے تو اس کی جانب ضرور سبقت کرتے[4]"

---

[1] یہ شعر صلتان سعدی کے ایک قصیدہ کا ہے جسے جاحظ نے الحیوان ۳/۴۷۷ میں نقل کیا ہے۔ مطلع یہ ہے :

أشاب الصغیر وأفنی الکبیـ　　ـر کرُّ الغداة ومرّ العشی

اذا لیلة هرّمت یومها　　اتی بعد ذلك یوم فتی

نزوح . . . .

تموت مع المرء حاجاته　　وتبقی له حاجة ما بقی

دیکھیے اس کی تخریج اسی کتاب میں۔

[2] التہذیب ۵/۲۲۱، ۲۲۲۔

[3] یہ شعر اس کے دیوان ص ۶۳ کے ایک قصیدہ کا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

سما لك شوقٌ بعد ما كان اقصرا　　وحلّت سليمى بطن قوٍّ فعرعرا

[4] مؤطا مالک ۱/۶۸ فی الصلاۃ : باب ما جاء فی النداء للصلاۃ۔ بخاری ۲/۷۸ فی الأذان : باب الاستهام واقامتها۔

ایک دوسری مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ "جمعہ کو مہجر (دھوپ میں نکل کر جانے والا) کی مثال ایک اونٹ قربان کرنے والے کی ہے[1]" فرماتے ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان احادیث میں لفظ تہجیر ہاجرہ (چلچلاتی دھوپ) سے ہے جو زوال کے وقت ہوتی ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ صحیح اس کے بارے میں ابوداؤد مصاحفی کی روایت ہے جسے انھوں نے نضر بن شمیل سے بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تہجیر الی الجمعۃ وغیرھا کا مفہوم سویرے اور جلد کسی جگہ جانے کا ہے۔ فرماتے ہیں اس حدیث کی تفسیر کے سلسلہ میں خلیل کو یہی بتاتے ہوئے سنا ہے۔

ازہری فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ یہ اہل حجاز اور ان کے ہمسایہ قیس کی زبان کا لفظ ہے۔ لبید کہتے ہیں :

رَاحَ الْقَطِيْنُ بِهَجْرٍ بَعْدَ مَا ابْتَكَرُوْا فَمَا تُوَاصِلُهُ سَلْمٰى وَمَا تَذَرُ[2]

(گھر کے لوگ صبح کے بعد دھوپ میں روانہ ہوگئے سواب سلمیٰ کے وصل وفراق کی بات کیا رہ گئی)

یہاں ابتکار (صبح سویرے نکلنا) کے ساتھ لفظ ہجر (دھوپ) استعمال ہوا ہے۔ رواح ان کے یہاں روانہ ہونے اور جانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں "راح القوم" (قوم روانہ ہوگئی) یعنی کسی وقت بھی — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "لوگوں کو معلوم ہوتا کہ تہجیر میں کیا بات ہے تو اس کی جانب سبقت کرتے" کا مفہوم تمام صلوات کو سویرے جانے کا ہے۔ یعنی اول وقت میں صلوات کے لیے جانا۔ ازہری فرماتے ہیں: بقیہ عرب اس وقت "هجر الرجل" کہتے ہیں جب آدمی ہاجرہ میں نکلے۔ یہی قول ابوعبید نے ابوزید سے روایت کیا ہے۔ ہاجرہ نصف النہار کو کہتے ہیں۔ پھر ازہری فرماتے ہیں کہ مجھے منذری[3] نے جعثنہ بن جواس ربعی کے حسب ذیل اشعار اپنی اونٹنی کے متعلق سنائے جسے ثعلب نے ابن الاعرابی کے نوادر سے لیا ہے۔

هَلْ تَذْكُرِيْنَ قَسَمِيْ وَنَذْرِيْ أَزْمَانَ أَنْتِ بِعُرُوْضِ الْجَفْرِ
إِذْ أَنْتِ مِضْرَارٌ جَوَادُ الْحُضْرِ عَلَيَّ إِنْ لَمْ تَنْهَضِيْ بِوَقْرِيْ
بِأَرْبَعِيْنَ قُدِّرَتْ بِقَدْرِ بِالْخَالِدِيِّ لَا بِصَاعِ حَجْرِ
وَتَصْحَبِيْ أَيَانِقًا فِيْ سَفْرِ يُهَجِّرُوْنَ بِهَجِيْرِ الْفَجْرِ
ثُمَّتَ تَمْشِيْ لَيْلَهُمْ فَتَسْرِيْ يَطْوُوْنَ أَعْرَاضَ الْفِجَاجِ الْغُبْرِ

طَيَّ أَخِي التَّجْرِ بُرُوْدَ التَّجْرِ[4]

اے اونٹنی ! کیا تجھے یاد ہے ؛ جس وقت تو عروض جفر (نجد کا مقام) میں عمدہ گھوڑوں کی طرح اچھل کود رہی تھی تو میں نے اپنے اوپر قسم کھائی تھی اور نذر مانی تھی کہ اگر تو نے میرا بوجھ برداشت کرنے کے ساتھ ان ہمسفر اونٹنیوں کا ساتھ نہ دیا جن کے سوار فجر کے وقت سویرے روانہ ہو جاتے ہیں پھر ان کے ساتھ رات بھر نہ چلی جن کے سوار غبار آلود وادیوں کی وسعت کو اس طرح لپیٹ لیتے ہیں جس طرح تاجر اپنے کپڑوں کو تو میں تجھے خالدی پیمانے سے فروخت کر دوں گا نہ کہ حجری پیمانے سے۔

---

1. اس کی تخریج گذر چکی ہے۔
2. دیوان لبید ص ۴۵
3. محمد بن جعفر ابو الفضل منذری ہروی صاحب زبان ادیب گذرے ہیں۔ عربی زبان کی تحصیل ثعلب اور مبرد سے کی۔ ان کی کئی ایک تصنیفات ہیں جن کی روایت ازہری نے کی ہے۔ سن وفات ۳۲۹ ہجری ہے۔ معجم الأدباء ۱/۹۹۔
4. التہذیب ۶/۴۳، ۴۵۔

ازہری فرماتے ہیں مذکورہ بالا اشعار میں "یھجّرون بھجیر الفجر" سے مراد یہ ہے کہ وقت سحر سویرے روانہ ہو جاتے ہیں۔

باقی اہل مدینہ کا ابتدائے دن چل کر صلوٰۃ جمعہ کو نہ جانا مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں ان کا انتہائی عمل تھا، یہ دلیل نہیں بن سکتا، وہ لوگ بھی اسے دلیل ماننے کے لیے تیار نہیں جن کے نزدیک اہل مدینہ کا اجماع حجت ہے کیونکہ اس میں صرف یہ ہے کہ ابتدائے دن میں جمعہ کو نہیں جاتے تھے جو ضرورۃً جائز ہے۔ اپنی اور گھر والوں کی مصلحتوں اور معاشی ضرورتوں یعنی دینی اور دنیاوی امور کے پیش نظر رک جانا یقیناً ابتدائے دن میں جمعہ کو روانہ ہونے سے افضل ہو سکتا ہے۔ بے شک صلوٰۃ کے بعد دوسری صلوٰۃ کا انتظار اور مصلیٰ پر آدمی کا اس وقت تک بیٹھے رہنا کہ اگلی صلوٰۃ بھی پڑھ لے دوسری صلوٰۃ کے لیے آنے جانے سے بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جو صلوٰۃ کا انتظار کرتا ہے پھر امام کے ساتھ اسے ادا کرتا ہے اس شخص سے افضل ہے جو صلوٰۃ پڑھ کر گھر چلا جاتا ہے۔"[1]

نیز:

"آدمی جب تک مصلیٰ پر رہتا ہے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں۔"[2]

نیز:

"صلوٰۃ کے بعد دوسری صلوٰۃ کے انتظار سے اللہ تعالیٰ خطاؤں کو دھو دیتا ہے اور درجات بلند فرماتا ہے۔ یہی رباط کہلاتا ہے۔"[3]

نیز:

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو پیش کر کے فرشتوں سے فخر کرتا ہے جو فرض کی ادائیگی کے بعد بیٹھا دوسری صلوٰۃ کا انتظار کرتا ہے۔"[4]

مذکورہ بالا مضمون اس بات کی دلیل ہے کہ صبح کی صلوٰۃ پڑھ کر جو شخص بیٹھا جمعہ کا انتظار کرے وہ اس سے افضل ہے جو چلا جاتے اور پھر جمعہ کے وقت آتے۔ مگر اہل مدینہ وغیرہ کا اس پر عمل نہ ہونے کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ بالکل یہی صورت ابتدائے دن میں جمعہ کو پہنچنے کی بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] بخاری ۲/۱۱۹ فی الاذان : باب فضل صلاۃ الفجر فی جماعۃ۔ مسلم (۶۶۲) فی المساجد : باب فضل کثرۃ الخطا الی المساجد۔ روایت ابو موسیٰ اشعری۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے "سب سے زیادہ صلوٰۃ کا اجر و ثواب چل کر آنے میں ابعد فالابعد کے اصول پر ہے، جو شخص دوسری صلوٰۃ کا انتظار اس حد تک کرتا ہے کہ امام کے ساتھ ادا کرے تو اس کا اجر و ثواب اس شخص سے زیادہ ہے جو صلوٰۃ پڑھ کر سو رہتا ہے۔

[2] مؤطا مالک ۱/۱۶۰ فی قصر الصلاۃ : باب انتظار الصلاۃ والمشی الیھا۔ بخاری ۲/۱۱۹ فی الاذان : باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ۔ مسلم (۶۴۹) فی المساجد : باب فضل صلاۃ الجماعۃ وانتظار الصلاۃ۔ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[3] مؤطا مالک ۱/۱۶۱ فی قصر الصلاۃ : باب انتظار الصلاۃ والمشی الیھا۔ مسلم (۲۵۱) فی الطھارۃ : باب فضل اسباغ الوضوء علی المکارہ۔ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[4] ابن ماجہ (۸۰۱) فی المساجد والجماعات : باب لزوم المساجد وانتظار الصلاۃ۔ حدیث عبداللہ بن عمرو۔ بسند صحیح ہے۔ الزوائد میں بوصیری نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

جمعہ کے دن صدقہ کی فضیلت

پچیسویں[۲۵] خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے دنوں کے مقابلہ میں اس دن صدقہ کرنے میں فضیلت ہے۔ ہفتہ کے دیگر ایام کے مقابلہ میں اس دن صدقہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمام مہینوں کے بالمقابل رمضان میں صدقہ کیا جائے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ کو دیکھا کہ جمعہ کو جاتے ہوئے گھر سے روٹی وغیرہ جو کچھ مل جاتا راستہ میں اسے چپکے سے صدقہ کردیتے تھے۔ فرماتے: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناجات کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا ہے تو بلاشبہ خود اس سے مناجات سے پہلے صدقہ کرنا اور زیادہ افضل و اولیٰ ہوگا۔ احمد بن زہیر بن حرب فرماتے ہیں ہم سے والد نے، انھوں نے کہا ہم سے جریر نے بیان کیا، انھوں نے منصور سے، انھوں نے مجاہد سے، انھوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں: ابوہریرہ اور کعب کی باہم ملاقات ہوئی تو ابوہریرہ نے کہا: جمعہ میں ایک ایسی بھی گھڑی ہے کہ جو بندۂ مسلم صلوٰۃ کی حالت میں اللہ سے کچھ مانگتا ہوا اس گھڑی کو پالیتا ہے تو اللہ اسے دیکر رہتا ہے۔ کعب نے کہا "یوم جمعہ کے متعلق میں تمھیں بتاتا ہوں، جمعہ کا دن جب ہوتا ہے تو آسمان و زمین، بر و بحر، کوہسار و شجر اور تمام مخلوقات چونک پڑتی ہیں۔ صرف ابن آدم اور شیطانوں پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی، مسجد کے دروازوں پر فرشتوں کے پرے بندھ جاتے ہیں، آنے والوں کو وہ لکھتے جاتے ہیں۔ جو پہلے آتا ہے اسے پہلے اور جو بعد میں آتا ہے اسے بعد میں، حتیٰ کہ امام نکل آتا ہے۔ جب وہ نکل آتا ہے تو فرشتے اپنے دفتر سمیٹ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جو آتا ہے وہ اللہ کا حق یعنی اس پر جو فرض ہے اس کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ہر بالغ پر فرض ہے کہ جس طرح جنابت سے غسل کرتا ہے اسی طرح اس دن غسل کرے۔ اس دن صدقہ کرنا دیگر ایام میں صدقہ کرنے کے بمقابلہ عظیم تر ہے۔ جمعہ جیسے بہترین کسی اور دن پر آفتاب طلوع و غروب نہیں ہوتا۔" حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: یہ تو کعب اور ابوہریرہ کی گفتگو تھی۔ میرے خیال میں یہ بھی ہے کہ اگر گھر میں خوشبو ہے تو اسے بھی اس دن استعمال کرے[۱]۔"

اس دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے تجلی فرمائے گا

چھبیسویں[۲۶] خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہ دن ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ جنت میں مومن بندوں کے روبرو جلوہ افروز ہوگا اور مومن اس کی زیارت کریں گے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے قریب تر وہی ہوگا جو دنیا کے اندر جمعہ کے دن امام سے قریب تر رہتا ہے، نیز سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی زیارت اسی کو نصیب ہوگی جو جمعہ کو سب سے پہلے جاتا ہے۔ یحییٰ بن یمان کی روایت ہے وہ شریک سے، وہ ابو یقظان سے، وہ انس بن مالک سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ" (ق: ۳۵) (اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے) کی تاویل بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ ہر جمعہ کو ان کے سامنے جلوہ افروز ہوگا"[۲]۔

طبرانی نے اپنی معجم میں ابونعیم مسعودی کی حدیث ذکر کی ہے، وہ منہال بن عمرو سے وہ ابوعبیدہ سے روایت کرتے

---

[۱] - اس کے راوی ثقہ ہیں۔ سند صحیح ہے۔ المصنف (۵۵۵۸)۔

[۲] - یحییٰ بن یمان، شریک قاضی اور ان کے شیخ تینوں ضعیف ہیں۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۴/۲۲۸ میں اس کا ذکر بزار اور ابن ابی حاتم کی روایتوں سے کیا ہے۔

ہیں کہ حضرت عبداللہ کا ارشاد ہے "جمعہ کی جانب تیزی سے چلو کہ اللہ عزوجل ہر جمعہ کو جنتیوں کے رو برو کافور کے ایک ٹیلہ پر جلوہ افروز ہوگا۔ چنانچہ اس سے قربت اتنی ہوگی جتنی جلد جمعہ کو پہنچیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس دن انھیں ایسا اعزاز بخشے گا جو اس سے قبل ان کے دیکھنے میں نہیں آیا ہوگا۔ لوگ اپنے اہل میں واپس آکر اس کا تذکرہ کریں گے۔" اس کے بعد عبداللہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا دو آدمی پہلے سے موجود ہیں۔ فرمایا: دو میں تیسرا میں ہوں، اللہ تعالیٰ چاہے تو اس تیسرے کو بھی برکت دیدے۔[۱]

بیہقی نے الشعب میں علقمہ بن قیس سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں: عبداللہ بن مسعود کے ساتھ جمعہ کی صلوٰۃ کے لیے گیا۔ دیکھا کہ تین پہلے سے موجود ہیں، فرمایا کہ چوتھا میں ہوں اور چوتھا رحمت الٰہی سے دور نہیں۔ اس کے بعد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک جمعہ کو روانگی کے مطابق بیٹھیں گے۔ چنانچہ پہلے آنے والا سب سے قریب پھر دوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا۔ اس کے بعد فرمایا چاروں میں کا چوتھا دور از رحمت نہیں ہے۔[۲]

کتاب الرؤیہ میں دارقطنی فرماتے ہیں: ہم سے احمد بن سلمان بن حسن نے، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن عثمان بن محمد نے، انھوں نے کہا ہم سے مروان بن جعفر نے، انھوں نے کہا ہم سے نافع ابوالحسن مولی بنی ہاشم نے، انھوں نے کہا ہم سے عطاء بن ابو میمونہ نے بیان کیا۔ وہ انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جب قیامت کا دن ہوگا تو مومنین اپنے رب کو دیکھیں گے۔ سب سے پہلے اس پر نگاہ اسی کی پڑے گی جو ہر جمعہ کو سویرے مسجد پہنچے گا۔ مومن عورتیں اسے یوم الفطر اور یوم النحر کو دیکھ سکیں گی۔"[۳]

ہم سے محمد بن نوح نے، انھوں نے کہا ہم سے محمد بن موسیٰ بن سفیان سکری نے، انھوں نے کہا ہم سے عبداللہ بن جہم رازی نے، انھوں نے کہا ہم سے عمرو بن ابوقیس نے بیان کیا، وہ ابوطیبہ سے، وہ عاصم سے، وہ عثمان بن عمیر ابوالیقظان سے، وہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں۔

"جبریل میرے یہاں آئے، ان کے ہاتھ میں صاف سفید آئینہ جیسی کوئی چیز تھی جس میں ایک سیاہ نکتہ تھا۔ میں نے پوچھا، جبرئیل! یہ کیا ہے؟ فرمایا "یہ جمعہ ہے اللہ تعالیٰ اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے کہ آپ اور آپ کے بعد آپ کی قوم کے لیے یہ عید بن سکے۔" میں نے پوچھا، اس میں ہمارے لیے کیا ہے؟ فرمایا "آپ کے لیے اس میں خیر ہے، آپ اس باب میں اول ہیں اور یہود و نصاریٰ آپ کے بعد ہیں۔ آپ کے لیے اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اللہ عزوجل سے اس میں کوئی بندہ کچھ مانگے گا جو اس کے حصہ کی ہوگی تو ضرور عطا کرے گا ورنہ ہوگی تو اس سے عمدہ شے عطا کر دے گا اور اسے اللہ تعالیٰ مقدر کے شر سے بچائے گا ورنہ اسے بھی کسی بڑی مصیبت کو اس سے دفع فرما دے گا۔" فرمایا: پوچھا کہ یہ سیاہ نکتہ کیا ہے؟ فرمایا "یہ قیامت ہے، جمعہ کے دن آئے گی۔ ہمارے نزدیک جمعہ سید الایام ہے، آخرت کے لوگ اسے

---

[۱] مجمع الزوائد ۲/۱۷۸ میں ہیثمی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ طبرانی نے الکبیر میں اس کی روایت کی ہے اور ابوعبیدہ کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث منقطع ہے۔

[۲] ابن ماجہ (۱۰۹۴) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی التہجیر الی الجمعۃ۔ سند حسن ہے۔ الترغیب والترھیب میں منذری نے اور الزوائد میں بوصیری نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[۳] سند میں ایک راوی غیر معروف ہے۔

یوم مزید کہیں گے" فرمایا: پوچھا کہ جبرئیل! یہ یوم مزید کیا ہے؟ فرمایا "یہ ہے کہ جنت میں آپ کے رب نے سفید مشک کی ایک کشادہ وادی بنائی ہے۔ جمعہ کا دن ہوگا تو وہ اپنی کرسی پر اترے گا، کرسی نور کے منبروں سے گھری ہوگی، انبیاء آکر اس پر بیٹھیں گے، پھر یہ سارے منبر زریں منبروں سے گھرے ہوں گے جن پر صدیقین اور شہداء آکر بیٹھیں گے، بالاخانوں کے لوگ آکر ٹیلوں پر بیٹھیں گے۔ فرمایا: پھر پروردگار ان کے روبرو جلوہ افروز ہوگا۔ لوگ اسے دیکھیں گے۔ وہ فرمائے گا" میں وہ ہوں کہ تم سے کیا ہوا وعدہ میں نے پورا کیا۔ تم پر اپنی نعمت تمام کی۔ یہ دروازہ ہے، مانگو۔ لوگ اس سے رضا مانگیں گے۔ فرمایا کہ وہ ان کے حق میں رضا کی شہادت دے گا اس کے بعد وہ اس سے اتنا مانگیں گے کہ ان کی مانگ ختم ہو جائے گی، پھر اس وقت ان کے لیے ایسی چیزوں کے دروازے کھلیں گے جنھیں کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور کبھی آیا ہوگا۔ فرمایا: پھر رب العزت اوپر اٹھے گا، اسی کے ساتھ انبیاء اور شہدا بھی اوپر اٹھیں گے۔ بالاخانوں کے لوگ اپنے بالاخانوں پر آئیں گے۔ فرمایا: ہر بالاخانہ موتیوں کا بنا ہوگا جس میں کوئی جوڑ نہ ہوگا۔ ایک بالاخانہ سبز زمرد کا ہوگا جس کے دروازے، دوسری منزلیں، چھتیں اور کنجیاں سب اسی کی بنی ہوں گی، نہریں اس میں بہتی ہوں گی، میوے لٹکتے ہوں گے، بیویاں اور خدم وحشم اس میں ہوں گے"۔ فرمایا "بندے جمعہ کے دن سے زیادہ اور کسی شے کے محتاج نہیں ہیں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نوازشوں اور اس کے دیدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ہے یوم مزید"۔[1]
یہ حدیث مختلف سندوں سے بیان ہوئی ہے۔ ابو الحسن دارقطنی نے کتاب الرؤیہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

سورۂ بروج میں "شاہد" سے مراد بھی جمعہ کا دن ہے

ستائیسویں خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جس شاہد کی قسم کھائی ہے اس کی تفسیر اسی جمعہ کے دن سے کی گئی ہے۔ حمید بن زنجویہ فرماتے ہیں، ہم سے عبداللہ بن موسیٰ نے حدیث بیان کی، انھوں نے کہا ہمیں موسیٰ بن عبیدہ نے خبر دی، وہ ایوب بن خالد سے، وہ عبداللہ بن رافع سے، وہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"یوم موعود سے قیامت کا دن، یوم مشہود سے یوم عرفہ اور شاہد سے یوم جمعہ مراد ہے۔ جمعہ سے زیادہ افضل کسی دن پر سورج نہ طلوع ہوا ہے نہ غروب۔ اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ بندۂ مومن اس میں جس بھلائی کی دعا مانگتا ہے وہ قبول ہوتی ہے اور کسی شر سے پناہ مانگتا ہے تو وہ اسے ملتی ہے"۔[2]

---

[1] عثمان بن عمیر چونکہ ضعیف ہیں اس لیے حدیث کی سند بھی ضعیف ہے۔ یہ حدیث مسند شافعی ۱/۱۴۸ فی الجمعۃ: باب فضل یوم الجمعۃ وفی ساعۃ الاجابۃ میں اسی طرح آئی ہے۔ الدر المنثور ۶/۱۰۸ میں سیوطی نے اسے پیش کیا ہے اور اس کی نسبت ابن ابی شیبہ، بزار، ابویعلی، صفۃ الجنۃ میں ابن ابی الدنیا، ابن جریر، ابن منذر، الاوسط للطبرانی، ابن مردویہ، الشریعۃ للآجری، الرؤیۃ للبیہقی اور الابانۃ لابی نصر سجزی کی جانب بھی کی ہے۔

[2] ترمذی (۳۳۳۶) فی التفسیر: باب ومن سورۃ البروج۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کی روایت حارث بن ابواسامہ نے اپنی مسند میں روح سے، انھوں نے موسیٰ بن عبیدہ سے کی ہے۔
معجم طبرانی میں محمد بن اسماعیل بن عیاش کی حدیث وارد ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مجھ سے میرے والد نے، انھوں نے کہا مجھ سے ضمضم بن زرعہ نے حدیث بیان کی ہے۔ وہ شریح بن عبید سے، وہ ابو مالک اشعری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"یوم موعود یوم قیامت ہے، شاہد یوم جمعہ اور مشہود یوم عرفہ ہے۔ یوم جمعہ کو اللہ نے ہمارے لیے محفوظ رکھا تھا۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃ عصر ہے[1]"۔

اس کی روایت جبیر بن مطعم نے بھی کی ہے[2]

یہ تفسیر بظاہر واللہ اعلم حضرت ابو ہریرہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ امام احمد فرماتے ہیں، ہم سے محمد بن جعفر نے، انھوں نے کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہ میں نے علی بن زید اور یونس بن عبید کو عمار مولیٰ نبی ہاشم سے بیان کرتے ہوئے سنا، وہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔ علی بن زید نے تو اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کیا مگر یونس حضرت ابو ہریرہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس آیت (وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ) کے سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ شاہد یوم جمعہ اور مشہود یوم عرفہ ہے، موعود سے مراد روزِ قیامت ہے[3]۔

جمعہ کے دن سے تمام مخلوقات بجز انس وجن خائف رہتی ہیں

اٹھائیسویں[28] خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہ دن ہے جس سے انس وجن کے علاوہ ارض وسما، کوہسار و دریا اور تمام مخلوقات ہوشیار رہتی ہیں۔ ابو الجواب نے عمار بن رُزیق سے روایت کی ہے۔ وہ منصور سے، وہ مجاہد سے، وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ کعب اور ابو ہریرہ ایک ملاقات میں یکجا ہوئے تو ابو ہریرہ نے کہا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جمعہ میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ بندۂ مسلم اس میں دنیا و آخرت کی جو بھلائی بھی اللہ سے مانگتا ہے اسے وہ عطا کرتا ہے"۔ کعب نے کہا "جمعہ کے بارے میں تمھیں کچھ بتاؤں؟ جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو آسمان، زمین، پہاڑ، دریا اور تمام مخلوقات بجز ابن آدم اور شیاطین سب چونک اٹھتے ہیں۔ مسجدوں کے دروازوں پر فرشتوں کے پرے بندھ جاتے ہیں، وہ یکے بعد دیگرے آنے والوں کو ترتیب سے لکھتے ہیں یہاں تک کہ امام

(بقیہ صفحہ گذشتہ) صرف موسیٰ بن عبیدہ کی سند سے ملتی ہے اور یہ موسیٰ بن عبیدہ حدیث کے باب میں ضعیف قرار دیئے گئے ہیں۔ یحییٰ بن سعید وغیرہ نے حفظ کے پہلو سے انھیں ضعیف کہا ہے۔ ابن کثیر نے اس کا تذکرہ اپنی تفسیر ۴/۴۹۱ میں کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسی طرح یہ حدیث ابن خزیمہ نے موسیٰ بن عبید زبدی سے بمختلف طرق روایت کی ہے۔ مگر یہ ضعیف الحدیث ہیں۔ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے اس کی روایت موقوفاً کی ہے اور یہی زیادہ مشابہ ہے۔ سیوطی اسے الدر المنثور ۶/۳۳۱ میں لائے ہیں اور اس کی نسبت عبد بن حمید، الاصول میں ابن ابی الدنیا، ابن جریر ۳۰/۱۲۹، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور سنن بیہقی کی جانب بھی کی ہے۔

[1] محمد بن اسماعیل بن عیاش پر نکتہ رکھا گیا ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔ مجمع الزوائد ۷/۱۳۵۔ تفسیر سورۂ بروج کے اندر ہیثمی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں محمد بن اسماعیل بن عیاش ضعیف ہیں۔ سیوطی الدر المنثور ۶/۳۳۲ میں اسے لائے ہیں اور اسے ابن جریر ۳۰/۱۲۹، اور طبرانی کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔

[2] سیوطی نے اس کا تذکرہ ۶/۳۳۲ میں کیا ہے اور اس کی نسبت ابن مردویہ اور ابن عساکر کی جانب بھی کی ہے۔

[3] مسند احمد ۲/۲۹۸۔ حاکم ۲/۵۱۹ مرفوعاً و موقوفاً۔ مرفوع حدیث علی بن زید کے باعث ضعیف ہے اور موقوف کی سند قوی ہے۔

نکل آتا ہے، جب وہ نکل آتا ہے تو فرشتے اپنے دفتر سمیٹ لیتے ہیں، اس کے بعد جو آتا ہے وہ اللہ کا حق یعنی اپنا فرض ادا کرنے آتا ہے۔ ہر بالغ پر ضروری ہے کہ غسل جنابت کی طرح اس دن غسل کرے۔ اس دن صدقہ کرنا دیگر ایام کے بمقابلہ زیادہ افضل ہے، جمعہ سے بہتر کسی اور دن پر آفتاب کبھی طلوع ہوا ہے نہ غروب" ابن عباس فرماتے ہیں، یہ تو کعب اور ابوہریرہ کی حدیثیں رہیں۔ میرا خیال ہے کہ گھر میں اگر خوشبو ہو تو اس دن اسے استعمال بھی کرنا چاہیے[1]۔"

حضرت ابوہریرہ کی ایک اور روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ" آفتاب جمعہ سے زیادہ افضل دن پر طلوع وغروب نہیں ہوتا، جن وانس کے سوا جو جاندار ہیں وہ جمعہ کے دن سے چوکنا رہتے ہیں" یہ حدیث صحیح[2] ہے۔ یہی وہ دن ہے جس میں قیامت آئے گی، بساط عالم لپیٹ دیا جائے گا، دنیا ویران ہو جائے گی، لوگوں کو اس دن ان کے مقامات جنت یا جہنم کو روانہ کیا جائے گا۔

اللہ نے اس دن کو امت مسلمہ کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا

انتیسویں[۲۹] خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہ دن ہے جسے اللہ نے اس امت کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ ان سے پہلے اہل کتاب اسے نہ پا سکے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ "جمعہ کے دن سے بہتر دن پر آفتاب طلوع وغروب نہیں ہوا، اللہ نے ہمیں اس کی جانب رہنمائی فرمائی اور لوگ اسے نہیں پا سکے۔ لہذا یہ لوگ اس باب میں ہمارے پیچھے رہ گئے۔ جمعہ کا دن ہمارا، سنیچر کا دن یہود کا اور اتوار کا دن نصاریٰ کا[3] ہے" ایک دوسری روایت کے مطابق اس دن کو اللہ نے ہمارے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔

امام احمد فرماتے ہیں: ہم سے علی بن عاصم نے بیان کیا، وہ حصین بن عبدالرحمٰن سے، وہ عمر بن قیس سے، وہ محمد بن اشعث سے، وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں:

> "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک یہودی نے داخلہ کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دی تو اس نے کہا " السام علیك " (تم پر تباہی ہو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " وعلیك " (اور تم پر) فرماتی ہیں کہ میں نے بولنا چاہا مگر دوسرا آیا اور اس نے بھی وہی رویہ اختیار کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے جواب میں " وعلیك " (اور تم پر) فرمایا۔ فرماتی ہیں میں نے پھر بولنا چاہا مگر تیسرا داخل ہوا، اس نے بھی کہا " السام علیکم " (تم لوگوں پر تباہی ہو) فرماتی ہیں میں نے کہا " بلکہ تم پر تباہی ہو، اللہ کا غضب ہو، بندروں اور خنزیروں کی برادری والو! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سلام کرتے ہو جو اللہ نے نہیں کیا ہے" فرماتی ہیں کہ آپ نے میری جانب دیکھ کر فرمایا "خاموش رہو۔ اللہ تعالیٰ فحش اور اظہار فحش پسند نہیں کرتا۔ انھوں نے ایک بات کہی ہم نے اس کا جواب دیدیا، ہمیں تو کوئی نقصان نہ ہوا مگر قیامت تک کے لیے یہ مورد مصائب ہو گئے۔ انھیں اس جمعہ پر جس کی اللہ نے ہمیں ہدایت دی اور وہ اس سے محروم ہو گئے اور اس قبلے پر جس کی جانب اللہ نے ہماری رہنمائی فرمائی

---

[1] تخریج قریب ہی گذر چکی ہے۔ حدیث صحیح ہے۔
[2] تخریج گذر چکی ہے۔
[3] تخریج گذر چکی ہے۔

اور یہ اس سے محروم رہے اور امام کے پیچھے ہمارے آمین کہنے پر جتنا حسد ہے اتنا اور کسی چیز پر نہیں[۱]۔

صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ "ہم آخرین آئے مگر قیامت کے دن آگے ہوں گے۔ البتہ یہ ہے کہ ہم سے پہلے انھیں کتاب ملی اور ہمیں بعد میں، یہ ان کا دن تھا جسے اللہ نے ان پر فرض کیا تھا مگر اس کے باب میں انھوں نے اختلاف کیا، اللہ نے ہمیں توفیق بخشی، پس دوسرے لوگ اس باب میں ہمارے پیچھے ہیں۔ یہود کل اور نصاریٰ پرسوں[۲]"۔

اوپر حدیث کے اندر لفظ "بَيْدَ" آیا ہے۔ بَيْدَ ایک تو "باء" سے ہے اور یہی مشہور و معروف ہے اور ایک میم سے "مَيْدَ" ہے۔ ابوعبید نے اس لفظ کے دو معنی نقل کیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بمعنی "غیر" ہے اور یہی سب سے معروف ہے اور دوسرا معنی "علیٰ" ہے۔ ابوعبید نے اس کی نظیر میں ایک شعر پیش کیا ہے ؎

عَمْدًا فَعَلْتُ ذَاكَ بَيْدَ أَنِّي ۔۔۔ إِخَالُ لَوْ هَلَكْتُ لَمْ تَرِنِّي

میں نے ایسا قصدًا کیا بایں ہمہ یہ خیال بھی تھا کہ اگر ہلاک ہوگیا ہوتا تو نہ روتی[۳]۔

جمعہ کا دن اللہ کی جانب سے برگزیدہ ہے

تیسویں خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح تمام مہینوں میں رمضان کا مہینہ، تمام راتوں میں شب قدر، تمام روئے زمین پر مکہ اور تمام مخلوقات میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے برگزیدہ بنائے گئے اسی طرح تمام دنوں میں جمعہ کا دن بھی یہ شرف رکھتا ہے۔

آدم بن ابوایاس فرماتے ہیں ہم سے شیبان ابومعاویہ نے بیان کیا، انھوں نے عاصم بن ابی نجود سے، انھوں نے ابوصالح سے، انھوں نے کعب احبار سے روایت کی ہے کہ اللہ عزوجل نے مہینوں کا انتخاب کیا تو رمضان کا مہینہ، دنوں کا انتخاب کیا تو جمعہ کا دن، راتوں کا انتخاب کیا تو شبِ قدر، گھڑیوں کا انتخاب کیا تو صلوٰۃ کی گھڑی منتخب ہوئی۔ جمعہ آئندہ جمعہ نیز مزید تین اور دنوں تک کے گناہوں کا کفارہ ہے، رمضان آئندہ رمضان تک کا کفارہ بنتا ہے، حج آئندہ حج تک کا کفارہ اور عمرہ آئندہ عمرہ تک کا کفارہ بنتا ہے۔ آدمی دو نیکیوں کے درمیان مرتا ہے۔ ایک وہ نیکی جسے وہ انجام دے چکا ہے اور دوسری وہ جس کا اسے انتظار ہے یعنی دونوں صلوات۔ شیاطین رمضان میں زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے اے خیر کا طالب آگے بڑھ۔ رمضان سب سے جامع ہے اس کی دس راتوں کا عمل اللہ کو جتنا محبوب ہے اتنا اور راتوں کا نہیں۔

جمعہ کے دن مُردوں کا تعارف ہوتا ہے

اکتیسویں[۳۱] خصوصیت یہ ہے کہ جمعہ کے دن مُردوں کی روحیں اپنی قبروں سے قریب ہوتی ہیں۔ زیارت کرنے والوں

---

[۱]۔ احمد ۶/۱۳۴، ۱۳۵۔ سند حسن ہے۔ صحیح وغیرہ میں اس کے شواہد بھی ہیں۔

[۲]۔ تخریج گذر چکی ہے۔

[۳]۔ شعر لسان میں۔ مادہ (مَنْ، بید)۔ ابن ہشام نے المغنی ص ۱۵۶ میں اسے نقل کیا ہے۔ دیکھیے اس کی تخریج و تشریح بغدادی کی "شرح شواہد المغنی" ۲۳/۳ بتحقیق عبد العزیز رباح اور احمد الدقاق۔

اور پاس سے گذرنے والوں کو پہچانتی ہیں، انھیں سلام کرتی ہیں۔ دوسرے دنوں کے بمقابلہ اس دن وہ انھیں زیادہ پہچانتی ہیں۔ گویا یہ دن مردوں اور زندوں کے باہمی اجتماع اور ملاقات کا دن ہے، جمعہ کو قیامت آئے گی تو اگلے، پچھلے، اہل ارض، اہل سماء، پروردگار، بندے، عامل وعمل، ظالم ومظلوم، آفتاب وماہتاب سبھی اکٹھا ہوں گے۔ اس سے پیشتر ان دونوں اصناف کا اجتماع کبھی نہ ہوا ہوگا۔ لہٰذا یہ جمعہ اجتماع اور ملاقات کا دن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اور دنوں کے بہ نسبت اس دن دنیا میں لوگ زیادہ اکٹھا ہوتے ہیں، پس یہ باہمی ملاقات کا دن ہوتا ہے۔ ابوتیاح یزید بن حمید فرماتے ہیں، مطرف بن عبداللہ ہر جمعہ کو قبرستان چل کر پہنچنے میں عجلت فرماتے۔ ایک دن جب قبروں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ہر قبر والا اپنی قبر پر بیٹھا ہوا ہے، سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ دیکھو یہ مطرف ہر جمعہ کو یہاں آتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا "کیا تمھیں جمعہ کی خبر ہوتی ہے؟" بولے ہاں! آج کے دن چڑیاں جو کچھ کہتی ہیں وہ ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا "وہ کیا؟" بولے یہ کہتی ہیں کہ "ربّ سلم سلم یومٌ صالح" (پروردگار اسلامتی سلامتی آج کا دن کیا خوب ہے)[1]

ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب "المنامات" وغیرہ میں عاصم جحدری کے بعض اہل خاندان سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خواب میں عاصم جحدری کو مرنے کے دو سال بعد دیکھا تو کہا "آپ مرے نہیں ہیں؟" بولے "کیوں نہیں" میں نے کہا "کہاں ہیں آپ؟" فرمایا "واللہ میں اور میرے کچھ ساتھی جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری میں ہیں، ہر جمعرات اور جمعہ کی صبح کو بکر بن عبداللہ مزنی کے یہاں اکٹھا ہوتے ہیں اور وہاں تمھاری اطلاعات ہمیں پہنچتی ہیں" میں نے کہا "آپ کے جسم یا روحیں؟" بولے "ارے جسم تو گل سڑکر بوسیدہ ہوچکے ہیں، روحیں باہم ملاقات کرتی ہیں" فرماتے ہیں میں نے کہا "کیا آپ کو ہماری زیارتوں کا علم ہوتا ہے؟" فرمایا "جمعہ کی شام، جمعہ کے تمام دن اور سنیچر کی شب طلوع آفتاب تک اس کا ہمیں علم ہوتا رہتا ہے" کہتے ہیں میں نے کہا "اسی دن کیوں؟" فرمایا "یہ جمعہ کی فضیلت اور اس کی عظمت کی وجہ سے"

ابن ابی الدنیا نے محمد بن واسع سے بھی روایت کی ہے کہ وہ ہر شنبہ کی صبح جبّانہ جاکر قبروں کے پاس کھڑے ہوتے، سلام کرتے، ان کے حق میں دعا مانگتے اور پھر واپس ہوتے۔ اس سلسلہ میں جب ان سے یہ کہا گیا کہ آج کے بجائے دوشنبہ کو ایسا کیوں نہیں کرتے؟ تو فرمایا "مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ جمعہ کے دن اس کے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد مُردوں کو زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے"

سفیان ثوری سے انھوں نے روایت کی ہے کہ مجھے ضحاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے شنبہ کے دن کسی قبر کی زیارت کرے گا اس کی زیارت کا حال مُردے کو معلوم ہوگا۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ کیسے؟ تو فرمایا "یہ جمعہ کے دن کا مقام ومرتبہ ہے"[2]

صرف جمعہ کے دن صوم رکھنا مکروہ ہے

بتیسویں[۳۲] خصوصیت یہ ہے کہ صرف جمعہ کے دن صوم رکھنا مکروہ ہے۔ یہ امام احمد سے بطریق نص ثابت ہے۔ اثرم

---

[1] مصنف نے اپنی کتاب "الروح" ص ۵، ۶ میں کتاب القبور لابن ابی الدنیا کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے۔ خالد بن خداش کی سند سے یہ روایت ہے۔ انھوں نے کہا ہم سے جعفر بن سلیمان نے بیان کیا وہ ابوتیاح سے روایت کرتے ہیں۔

[2] مؤلف یہ واقعات اپنی کتاب "الروح" ص ۵ میں بیان کیے ہیں۔

فرماتے ہیں۔ ابوعبداللہ سے پوچھا گیا "جمعہ کے دن صوم رکھنا کیسا ہے؟" جواب میں آپ نے وہ حدیث بیان کی جس میں صرف جمعہ کے دن صوم رکھنے کی ممانعت وارد ہے۔ اس کے بعد فرمایا "صوم کا تسلسل ہو تو اور بات ہے باقی صرف اس دن صوم رکھنا صحیح نہیں" اثرم فرماتے ہیں میں نے کہا کہ ایک آدمی ایک دن صوم رکھتا ہے ایک دن نہیں اس طرح اگر جمعرات کو نہ رکھنے کی جمعہ کو رکھنے کی اور سنیچر کو نہ رکھنے کی باری آئی تو کیسا ہے؟ فرمایا "ٹھیک ہے۔ مکروہ صرف یہ ہے کہ خاص کر صرف جمعہ کو صوم رکھا جائے"

امام مالک اور ابوحنیفہ نے دیگر ایام کی طرح اس دن بھی صوم رکھنا مباح قرار دیا ہے، مالک فرماتے ہیں، اہل علم، اہل فقہ اور مقتدائے امت میں سے کسی کو میں نے جمعہ کے دن صوم رکھنے سے منع کرتے ہوئے نہیں سنا۔ اس دن صوم رکھنا بہتر ہے۔ بعض اہل علم اس دن صوم رکھتے رہے ہیں۔ میں نے اس کا اہتمام کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔

ابن عبدالبر فرماتے ہیں، جمعہ کے دن صوم رکھنے کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں مختلف ہیں۔ چنانچہ ابن مسعود نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین دن ہر مہینہ میں صوم رکھتے تھے۔ فرمایا کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ جمعہ کے دن صوم سے نہ رہے ہوں[1]۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن عمر سے مروی ہے، فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی جمعہ کے دن صوم ترک فرماتے نہیں دیکھا" ابن ابی شیبہ نے اس کی روایت حفص بن غیاث سے، انھوں نے لیث بن ابوسلیم سے، انھوں نے ابوعمر بن ابی عمیر سے، انھوں نے ابن عمر سے کی ہے[2]۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ اس دن صوم رکھتے تھے اور اس کی پابندی کرتے تھے۔

امام مالک نے جن کا تذکرہ کیا ہے کہا جاتا ہے کہ وہ محمد بن منکدر تھے یا صفوان بن سلیم۔

دراوردی نے صفوان بن سلیم سے، انھوں نے خاندان بنی جُشَم کے ایک فرد سے روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہ کو فرماتے سنا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جمعہ کے دن جو صوم رکھے گا ایام آخرت میں سے دس روشن اور تابناک دن اس کے لیے لکھ دیئے جائیں گے، دنیا کے دن ان کے مساوی نہ ہوں گے"[3]

جمعہ کے دن صوم رکھنے کی اصلیت یہ ہے کہ یہ ایک نیک کام ہے اسے غیر معارض دلیل ہی سے ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ایسی صحیح معارض دلیل موجود ہے جس کی صحت پر کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیحین میں محمد بن عباد سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں جابر سے پوچھا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن صوم رکھنے سے منع فرمایا ہے؟" فرمایا "ہاں"[4]

---

[1] مسند احمد ۱/۴۰۶۔ ترمذی (۷۴۲) فی الصوم: باب ماجاء فی صوم یوم الجمعة۔ نسائی ۴/۲۰۴ فی الصیام: باب صوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابوداؤد (۲۴۵۰) سند حسن ہے۔ یہ حدیث ان احادیث کے مخالف نہیں ہے جس میں جمعہ کے دن صوم رکھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ کیونکہ اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ آپ سلسلۂ صیام میں جب جمعہ پڑتا تھا تو اس دن صوم ترک نہیں فرماتے تھے نیز یہ حدیث خاص طور سے جمعہ کے دن صوم رکھنے کی کراہیت کے قول وفعل کے درمیان جمع کرنے کے پیش نظر خلاف بھی نہیں ہے۔

[2] لیث بن ابی سلیم ضعیف اور عمیر بن ابی عمیر مجہول ہیں۔ المجمع ۳/۲۰۰ میں ہیثمی نے اسی مفہوم میں ایک روایت ذکر کی ہے اور فرمایا ہے کہ ابویعلی اور بزار اس کے راوی ہیں۔ اس میں حسن بن ابوجعفر ضعیف ہیں۔

[3] دراوردی کا نام عبدالعزیز ہے۔ دوسروں کی کتابوں سے حدیث بیان کرتے تھے اور غلطیاں سرزد ہوتی تھیں۔ خاندان بنوجُشم کا وہ شخص مجہول ہے۔

[4] بخاری ۴/۲۰۳۔ مسلم (۱۱۴۳)۔

صحیح مسلم میں محمد بن عباد سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں، جابر بن عبد اللہ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اسی حالت میں میں نے ان سے پوچھا "جمعہ کے دن صوم رکھنے سے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے؟" فرمایا "ہاں، قسم ہے اس گھر کے رب کی"[۱]

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث وارد ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے "جمعہ کے دن کسی کو صوم رکھنا ہو تو ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی رکھے"۔ الفاظ بخاری کے ہیں[۲]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "قیام لیل کے لیے دوسری راتوں کے مقابلہ میں جمعہ کی رات کو خاص نہ کرو اور تمام دنوں کے مقابلہ میں خصوصیت سے جمعہ کے دن صوم نہ رکھو الا یہ کہ سلسلۂ صیام میں یہ جمعہ پڑتا ہو"۔[۳]

صحیح بخاری میں جویریہ بنت الحارث سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں جمعہ کے دن تشریف لائے اس دن وہ صوم سے تھیں۔ آپ نے فرمایا "کل صوم رکھا تھا؟" کہا "نہیں" فرمایا "کل رکھنے کا ارادہ ہے؟" کہا "نہیں" فرمایا "پھر توڑ دو"۔[۴]

مسند احمد میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"صرف جمعہ کے دن صوم نہ رکھو"[۵]

مسند احمد ہی میں جُنادہ ازدی سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں "خاندان ازد کے سات افراد کے ساتھ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آٹھواں شخص میں تھا، اس وقت آپ دوپہر کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "کھانا حاضر ہے"۔ ہم نے کہا "رسول اللہ! ہم صوم سے ہیں"۔ پوچھا "کل رکھا تھا؟" ہم نے کہا "نہیں"۔ پوچھا "کل رکھیں گے؟" کہا "نہیں"۔ فرمایا "توڑ دو"۔ جُنادہ ازدی کہتے ہیں کہ پھر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ آگے فرماتے ہیں، آپ یہاں سے اٹھ کر منبر پر رونق افروز ہوئے، وہاں ایک برتن میں پانی منگا کر منبر ہی پر بیٹھے بیٹھے پیا، لوگ دیکھتے رہے۔ مقصد یہ تھا کہ جمعہ کے دن صوم رکھنا آپ کا دستور نہیں ہے[۶]

مسند احمد ہی میں حضرت ابو ہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جمعہ کا دن عید کا دن ہے لہٰذا عید کا دن صوم کا دن نہ بنانا۔ ہاں اس سے پہلے یا بعد میں بھی صوم رکھو تو اور بات ہے"۔[۷]

ابن ابی شیبہ نے سفیان بن عیینہ سے، انھوں نے عمران بن ظبیان سے، انھوں نے حُکیم بن سعد سے، انھوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے ان کا ارشاد روایت کیا ہے کہ جسے مہینہ میں کچھ دن نفلی صوم رکھنا ہو تو جمعرات کو

۱۔ مسلم (۱۱۴۳) فی الصیام : باب کراهة صیام یوم الجمعة منفرداً۔
۲۔ بخاری ۲۰۳/۴ فی الصیام : باب صوم یوم الجمعة واذا أصبح صائماً یوم الجمعة فعلیه ان یفطر۔ مسلم (۱۱۴۴)
۳۔ مسلم (۱۱۴۴)۔
۴۔ بخاری ۲۰۳/۴ فی الصیام : باب صوم یوم الجمعة واذا أصبح صائماً یوم الجمعة فعلیه ان یفطر۔ ابو داؤد (۲۴۲۲) فی الصوم ، باب الرخصة فی ذلك۔
۵۔ مسند احمد ۲۸۸/۱۔ سند میں حسین بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن عباس ضعیف ہیں۔
۶۔ احمد اور حاکم ۶۰۸/۳۔ حدیث جُنادہ ازدی۔ سند میں حذیفہ بارقی یا ازدی مجہول ہیں۔ الاصابۃ (۱۱۹۸) میں حافظ نے اسے نسائی کی جانب منسوب کیا ہے۔
(حاشیہ "۷" اگلے صفحہ پر)

رکھے، جمعہ کو نہیں کیونکہ یہ کھانے پینے اور ذکرِ الٰہی کا دن ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو دن عمدہ اکٹھا فرما دیگا۔ ایک صوم کا اور ایک مسلمانوں کے ساتھ ذکر و عبادت کا۔[1]

ابن جریر مغیرہ سے اور وہ ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن لوگ صوم رکھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ ایسا اس لیے تاکہ صلوٰۃ کی قوت انھیں حاصل رہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس دن صوم رکھنے کی کراہیت کا ماخذ تین امور ہیں ایک تو یہی جو ابھی ذکر ہو چکا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک دن پہلے یا بعد میں صوم رکھ لینے سے صوم جمعہ کی کراہیت زائل نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ یہ یوم عید ہے۔ اسی کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ اس وجہ پر دو اشکال ہیں۔ ایک یہ کہ صوم جمعہ حرام نہیں ہے مگر صوم عید حرام ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر جمعہ کے ساتھ ایک دن کا صوم اور ملا لیا جائے تو کراہیت باقی نہیں رہتی۔ دونوں اشکالوں کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جمعہ کا دن سال کی نہیں ہفتہ کی عید ہے اور حرمت سال کی عید کے لیے وارد ہے۔ لیکن اس سے پہلے یا بعد کو صوم رکھ لینے سے تو یہ دن جمعہ اور عید کی خصوصیات سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی تخصیص سے جو خرابی لاحق ہوتی ہے وہ زائل ہو جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جمعہ کا دن صوم کے تسلسل میں آجاتا ہے۔ مسند احمد، نسائی اور ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی وہ حدیث اگر صحیح ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ "کم ہی ایسا ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن صوم نہ رکھتے ہوئے دیکھا ہو"[2] تو اسے مذکورہ صورت ہی پر محمول کریں گے۔ گویا اس دن آپ کا صوم رکھنا سلسلۂ صیام کے تحت تھا صرف اسی دن نہیں رکھتے تھے۔ صحیحین میں کہاں ممانعت کی ثابت حدیثیں اور کہاں جواز کی وہ حدیث جسے کسی صاحبِ صحیح نے روایت نہیں کی ہے۔ ترمذی نے اس کے غریب ہونے کا فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے پھر کیونکر اس حدیث سے وہ صحیح احادیث متعارض ہو سکتی ہیں جو صریح ہیں۔ اور کیونکر ان پر اسے تقدم حاصل ہو سکتا ہے۔

تیسرا ماخذ ذریعہ کا سدّباب ہے یعنی وہ ذریعہ جس کی بدولت دین میں کوئی ایسی شے داخل ہو جائے جو خارج از دین ہو اور دنیاوی اعمال سے ہٹ کر محض کسی خاص دن کو زہد و عبادت کے لیے مخصوص کر دینے کے باعث اہلِ کتاب سے مشابہت پیدا ہوتی ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے تو چونکہ جمعہ کا دن دیگر ایام پر یک گونہ فضیلت رکھتا ہے اس لیے اس دن صوم رکھنا اور زیادہ بہتر ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ اس بات کا مظنہ قرار پائے گا کہ لوگ ہمیشہ اس دن صوم رکھیں اور اس کا اہتمام دیگر ایام کے مقابلہ میں زیادہ کریں۔ اگر یہ دستور بن جائے گا پھر تو دین میں وہ شے داخل ہو جائے گی جو اس سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام راتوں کے بالمقابل شبِ جمعہ میں خصوصیت سے تہجد گذاری سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں اس بات کا اندیشہ تھا کہ مبادا عبادت کے لیے اس شب کو امتیاز حاصل ہو جائے۔ لہٰذا شارع علیہ السّلام نے اس ذریعہ کا سدّباب فرما دیا اور اس رات خصوصیت سے تہجد گذاری سے منع فرمایا۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ سوال ہو کہ دوسرے دنوں میں خصوصیت سے صوم رکھنا کیسا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ دوشنبہ، یوم عرفہ اور

[که] (حاشیہ "که" صفحہ گذشتہ) مسند احمد ۲/۳۰۳ و ۵۳۲۔ مستدرک حاکم ۱/۴۳۷۔ سند میں ابو بشر مؤذن مسجد دمشق اور عامر بن اشعری کو عجلی کے سوا اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی متفق علیہ حدیث گذر چکی ہے جو اسی مفہوم میں ہے۔

---

[1] عمران بن ظبیان ضعیف ہیں۔
[2] تخریج گذر چکی ہے۔ حدیث حسن ہے۔

یوم عاشوراء کے بارے میں شارع علیہ السلام نے خصوصیت سے صوم رکھنے کی جو تاکید فرمائی ہے تو وہ تو سنت ہے باقی اس کے علاوہ شنبہ، سہ شنبہ، اتوار اور چہارشنبہ کو صوم رکھنا مکروہ ہے۔ ان میں بالخصوص جو ایام کفار کی تعظیم اور صوم کے ہیں وہ تو اور زیادہ مکروہ اور حرمت سے قریب تر ہیں۔

جمعہ کا دن لوگوں کے اجتماع اور مبدأ و معاد کی تذکیر کا دن ہے

تینتیسویں[۳۳] خصوصیت یہ ہے کہ اس دن لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور اس میں مبداء و معاد کی تذکیر کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لیے ایک دن مخصوص فرمایا ہے جس میں وہ فارغ ہو کر اللہ کی عبادت کرتی ہے اور جمع ہو کر مبدأ و معاد اور ثواب و عقاب کی باتیں سنتی اور نصیحت پذیر ہوتی ہے۔ نیز اس اجتماع سے اس بڑے اجتماع کو چشم تصور میں لاتی ہے جس میں اسے رب العالمین کے روبرو پیش ہونا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے سب سے موزوں ومناسب دن وہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ مخلوقات کو جمع کرے گا اور یہ وہی جمعہ کا دن ہے۔ امت مسلمہ کے فضل وشرف کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ عظیم دن اس کے لیے ذخیرہ رکھا جائے۔ چنانچہ طاعت وعبادت کے لیے اس دن مسلمانوں کے اجتماع کو قانونی حیثیت دی گئی اور اس کی بے پایاں برکتوں اور کرامات سے مالا مال ہونے کے لیے اسی دن دیگر اقوام عالم کے ساتھ مسلمانوں کا اجتماع بھی رکھا گیا۔ پس یہ دن قانونی اعتبار سے اور آخرت میں تقدیری طور پر یوم اجتماع قرار پایا۔ نصف النہار جو خطبہ اور صلوٰۃ کا وقت ہے وہی جنتیوں اور دوزخیوں کے اپنے اپنے مقامات پر جانے کا وقت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت مختلف سندوں سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن نصف النہار ہی پر اہل جنت اور اہل جہنم اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچیں گے۔ آگے آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا (الفرقان : ۲۴)

بس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اس دن اچھی جگہ ٹھہریں گے اور دوپہر گذارنے کو عمدہ مقام پائیں گے۔

نیز یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔

ثُمَّ إِنَّ مَقِيلَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ [ل] پھر انھیں آرام کرنے کے لیے جہنم میں لایا جائے گا۔

اس آیت کی قرآت ان کے یہاں اسی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کی تعداد سات ہے جو صاحبان کتاب کے یہاں معروف ومشہور ہے۔ ورنہ یہاں کوئی ایسی حسی علامت موجود نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ دنوں کی تعداد سات ہے۔ برخلاف سن وماہ اور موسموں کے۔ اللہ تعالیٰ نے ارض وسما اور مخلوقات کو جب چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کی خبر انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ بندوں کو دی تو ہفتہ میں ایک دن ایسا مقرر فرمایا جس دن تخلیق ارض وسما، حکمتِ تخلیق، سببِ تخلیق، دنیا کی مدت، ارض وسما کی بساط لپیٹ دینے اور یہ تماشا ختم کر دینے کی مخلوق کو یاد دہانی کی جائے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدۂ برحق اور قولِ صادق ہے، اس سے سرمو انحراف نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر میں سورۂ (الم تنزیل) اور (هل أتى على الانسان) پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں سورتوں کے اندر ماضی ومستقبل میں مبداء ومعاد، مخلوقات کا حشر ونشر اور انھیں قبروں سے اٹھا کر جنت وجہنم کی جانب روانہ کرنے کی باتیں

[ل] اصل آیت "ثم ان مرجعهم لالى الجحيم" ہے۔ ابن مسعود کی قرآت تفسیر کے طور پر ہے۔ حدیث کا ذکر ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۳/۳۱۵ میں کیا ہے۔ سند میں انقطاع ہے۔

ہیں. سجدہ کی وجہ سے نہیں جیسا کہ بعض کم فہم اہل علم کا خیال ہے۔ چنانچہ ان کی جگہ وہ ایسی سورتیں بھی پڑھنے کے قائل ہیں جن میں سجدہ آیا ہے۔ ان کے خیال میں جمعہ کے دن فجر کو فوقیت اسی سجدہ کی وجہ سے حاصل ہے۔ چنانچہ جو ایسا نہیں کرتے ان کے خلاف نکیر بھی کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ عیدین اور دوسرے بڑے مجمعوں میں بھی وہی سورتیں پڑھتے تھے جن میں توحید، مبدأ و معاد، انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی حکایات اور ان پر عذاب و ثواب کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ عیدین میں سورہ (ق والقرآن المجید) اور (اقتربت الساعۃ وانشق القمر) پڑھتے تھے[1]، کبھی (سبح اسم ربك الاعلی) اور (هل اتٰك حديث الغاشية)[2]۔ جمعہ میں کبھی سورۃ الجمعۃ پڑھتے تھے[3]۔ کیونکہ اس کے اندر صلوٰۃ کا حکم، اس کے لیے بسرعت پہنچنے، کام کاج چھوڑ دینے، نیز کثرت سے ذکر الٰہی میں مصروف رہنے کی باتیں ہیں۔ لوگوں کو فلاح دارین کی منزل یوں ہی مل سکتی ہے۔ کیونکہ ذکر الٰہی کو فراموش کر دینے کے بعد دنیا و آخرت کی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری رکعت میں سورۂ (اذا جاءك المنافقون) پڑھتے تھے۔ کیونکہ اس میں امت کو تباہ کن منافقت اور اس بات سے خبردار کیا گیا ہے کہ مال و اولاد صلوٰۃ اور ذکر الٰہی سے انھیں غافل نہ کر دیں۔ اگر ایسا انھوں نے کیا تو ناکامی اور نامرادی یقیناً ان کا انجام ہو کر رہے گی۔ اس سورہ میں اس کے برعکس انھیں انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارا گیا جو سب سے بڑا ذریعۂ سعادت ہے۔ نیز ڈرایا بھی گیا ہے کہ کہیں ایسی حالت میں موت نہ آجائے کہ سدھرنے اور سبیل سعادت کی جانب واپسی کا ارادہ ہو رہا ہو مگر توفیق گریزاں ہو۔ کسی آنے والے وفد کو آپ قرآن سنانا چاہتے تو ایسا ہی کرتے تھے۔ اسی لیے صلوٰۃ کی جہری قرأت بھی بڑی لمبی فرماتے تھے۔ چنانچہ مغرب میں سورۂ اعراف، سورۂ طور، سورۂ ق تک پڑھی ہے اور فجر میں تقریباً سو آیتیں پڑھتے تھے۔

اسی طرح آپ کے خطبہ کے اندر بھی اللہ، ملائکہ، آسمانی کتابوں، رسولوں پر، آخرت پر ایمان، جنت و جہنم اور اطاعت شعاروں اور معصیت کے خوگروں کے لیے وہاں جو کچھ تیار ہے اس کے ذکر پر مشتمل اصولی مضامین کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ آپ کے خطبہ سے سینوں میں ایمان و توحید اور اللہ پر یقین و معرفت کی قندیل روشن ہو جاتی۔ نیز عذاب و ثواب کے جو واقعات ماضی میں گذر چکے ہیں ان کے تذکروں سے زندگی میں روحانیت کے ولولے پیدا ہو جاتے۔ عام تقریروں کی طرح آپ کے خطبے نہیں ہوا کرتے تھے۔ جن میں عام طور پر زندگی پر واویلا اور موت سے دہشت کی مشترک باتیں ہوتی ہیں۔ ان سے نہ تو دلوں میں ایمان باللہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، نہ توحید کی حرارت، نہ معرفت و یقین کی کوئی کرن نمودار ہوتی ہے، نہ عذاب کا خوف نہ ثواب کی امید نہ ہی سینوں میں محبت اور شوق الٰہی کا کوئی طوفان اٹھتا ہے۔ چنانچہ سامعین بے نیل

---

[1] مسند احمد ۵/۲۱۷ و ۲۱۸۔ مسلم (۸۹۱) فی صلاۃ العیدین : باب مایقرأبه فی صلاۃ العیدین۔ ترمذی (۵۳۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی العیدین۔ ابوداؤد (۱۱۵۴) فی الصلاۃ : باب مایقرء فی الاضحیٰ والفطر۔ نسائی ۳/ ۱۸۳، ۱۸۴ فی العیدین : باب القرأۃ فی العیدین۔ حدیث ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ۔

[2] مسلم (۸۷۸) فی الجمعۃ : باب مایقرء فی الجمعۃ۔ حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں سبح اسم ربك الاعلیٰ اور هل اتٰك حديث الغاشية پڑھا کرتے تھے۔ ترمذی (۵۳۳) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی العیدین۔ نسائی ۳/ ۱۸۴ فی العیدین : باب القرأۃ فی العیدین۔ سبح اسم ربك الاعلیٰ و هل اتٰك حديث الغاشية۔ ابن ماجہ (۱۲۸۱) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی صلاۃ العیدین۔

[3] مسلم (۸۷۷) ابوداؤد (۱۱۲۴) فی الصلاۃ : باب مایقرأ فی الجمعۃ۔ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

ومرام خالی ہاتھ واپس گھر آتے ہیں آگے بس مرتے ہیں تو ان کی دولتیں تقسیم ہو جاتی ہیں، جسم مٹی میں رل مل جاتے ہیں۔ نہ ایمان، نہ توحید، نہ معرفت نہ یقین ہر شے سے تہی دست و بے نیل ومرام۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے خطبوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں توحید، صفات الٰہی، ایمان کی بنیادی باتیں، دعوت الی اللہ اور محبت الٰہی کے مختلف محرکات، مثلاً: اللہ کے کرشموں، عذاب و ثواب کے واقعات اور ذکر و شکر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ سامعین کے سینوں میں اللہ کی عظمت اور اس کے اسماء وصفات کے تذکروں سے محبت الٰہی کا طوفان اٹھتا، ذکر و شکر اور اطاعت و نیکوکاری کی باتوں میں محبوبیت الٰہی کا روح پرور پیغام موصول ہوتا، خطبے سن کر واپس ہوتے تو ان پر محبت و محبوبیت کی فضائے خوشگوار طاری ہوتی مگر زمانہ آگے بڑھا، انوار نبوت کی جھلکیاں ماند پڑیں، شریعت اور احکام الٰہی حقائق و مقاصد کے مغز سے نکل کر رسوم و عادات کے چھلکوں تک محدود ہو گئے تو اس وقت صورتوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا، انہی کو مزین و آراستہ کیا گیا، رسوم و عادات کو سنتوں کا مقام دے دیا گیا کہ ان میں کوئی خلل نہ پڑے، مقاصد نظر انداز کر دیئے گئے جنھیں نظر انداز کرنا مناسب نہ تھا۔ چنانچہ خطبے اب سجع و قوافی، علم بدیع اور عبارت آرائیوں سے مرصع مگر سینوں کی غذا سے محروم بے مقصد ہو کر رہ گئے۔

ثابت ہے کہ آپ کے خطبے کثرت سے آیات قرآنی اور سورۂ ق پر مشتمل ہوتے تھے۔

ام ہشام بنت حارث بن نعمان فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سورۂ ق پڑھتے تھے حتی کہ سنتے سنتے مجھے یاد ہو گئی[1]

علی بن زید بن جدعان کی روایت سے آپ کا ایک خطبہ محفوظ ہے۔ مگر اس میں ضعف ہے۔ خطبہ ہے۔

"یاأیہا الناس توبوا الی اللہ عزوجل قبل اَنْ تموتوا وبَادِرُوا بالاعمال الصالحۃ قبل ان تُشْغلوا وصِلوا الذی بینکم وبین رَبِّکم بکثرۃ ذکرکم لہٗ وکثرۃ الصدقۃ فی السِّرِّ والعلانیۃ۔ تُوجروا وتُحمدوا وتُرزقوا واعلموا اَنَّ اللہ عزوجل قد فرض علیکم الجمعۃ فریضۃً مکتوبۃً فی مقامی ھٰذا، فی شہری ھٰذا، فی عامی ھٰذا الی یوم القیامۃ۔ مَنْ وَجَدَ الیہا سبیلا فمن ترکہا فی حیاتی اَوْ بعد مماتی جُحوداً بہا اَوْ استخفافاً بہا ولہ امامٌ جائر او عادل فلا جمع اللہ شملہ ولا بارك لہ فی امرہ، اَلا ولا صلاۃ لہٗ، اَلا ولا وُضُوءَ لہٗ، اَلا ولا صَوْمَ لہٗ، اَلا ولا زکوٰۃَ لہٗ، اَلا ولا حجَّ لہٗ، اَلا ولا بَرَکَۃَ لہٗ حتی یتوبَ، فان تاب، تاب اللہُ علیہ، اَلا ولا تؤمَّنَّ امْرَاَۃٌ رجلا، اَلا ولا یَؤمَّنَّ اعرابیٌ مہاجرًا، اَلا ولا یؤمن فاجرٌ مؤمنا اِلا ان یَقْہَرَہٗ سُلطانٌ فیخافَ سیفَہٗ وَسَوْطَہٗ"[2]

لوگو! مرنے سے پہلے توبہ کرو۔ مہلت ختم ہونے سے پہلے نیک اعمال کی جلدی کرو۔ کثرت سے ذکر الٰہی اور کھلے چھپے صدقہ کر کے اپنے اور رب کے درمیان رابطہ کو مضبوط تر کر لو۔ اس طرح اجر و ثواب کے مستحق بھی ہو گے، تمہارا اعتراف بھی ہو گا اور رزق بھی ملے گی۔ یاد رکھو کہ اللہ عزوجل نے اس جگہ، اس مہینہ اور اس سال تم پر جمعہ کی ادائیگی قیامت تک کے

---

[1] مسلم (۸۷۲) باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔ ابوداؤد (۱۱۰۲) و (۱۱۰۳) فی الصلاۃ: باب الرجل یخطب علی قوس۔ نسائی ۲/۱۵۷ فی افتتاح الصلاۃ: باب القرأۃ فی الصبح ب (ق)۔

[2] ابن ماجہ (۱۰۸۱) فی اقامۃ الصلاۃ: باب فی فرض الجمعۃ۔ حدیث عبداللہ بن محمد عدوی۔ بروایت علی بن زید بن جدعان سعید بن مسیب — جابر بن عبداللہ۔ عبداللہ بن محمد عدوی متروک ہیں۔ علی بن زید بن جدعان ضعیف ہیں۔ حدیث الترغیب والترہیب ۱/۲۶۰ میں منذری نے پیش کی ہے اور کہا ہے کہ الاوسط میں طبرانی نے بروایت ابوسعید خدری اس سے بھی مختصر بیان کی ہے۔

لیے فرض کی ہے۔ بشرطیکہ اس کی ادائیگی کے لیے راہ ملے۔ میری زندگی یا مرنے کے بعد انکار کے طور پر یا معمولی سمجھ کر ظالم یا عادل امام کی موجودگی میں جو اسے ترک کرے گا اللہ اس کا شیرازہ مجتمع نہ کرے گا، اسے برکت نہ دے گا۔ دیکھو اس کی نہ کوئی صلوٰۃ ہوگی، نہ وضو، نہ اس کا کوئی صوم ہوگا نہ زکوٰۃ نہ حج۔ دیکھنا! اس کے کاموں میں کوئی برکت بھی نہ ہوگی حتیٰ کہ توبہ کرے۔ توبہ کرے گا تو اللہ اس کی جانب رجوع ہوگا۔ دیکھنا! کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرے، کوئی اعرابی کسی مہاجر کی امامت نہ کرے۔ کوئی فاجر کسی مومن کی امامت نہ کرے۔ ہاں اگر سلطان کا دباؤ اور شمشیر و تازیانہ کا ڈر ہو تو اور بات ہے۔

آپ کا یہ خطبہ بھی ثابت ہے۔

الحمدُ لِلّٰہِ نستعینُہ ونستغفرُہ ونعوذُ باللہِ من شُرورِ أنفسنا، من یَھْدِ اللّٰہُ فلا مُضلَّ لہٗ ومَن یُّضْلِل فلا ھادیَ لہٗ، واَشْھَدُ اَن لَّآ اِلٰہ الا اللہ وحدَہٗ لاشریکَ لہٗ واَشْھدُ اَنَّ محمدًا عبدُہٗ ورسولُہٗ، ارسلہ بالحقِّ بشیرًا و نذیرًا بین یدَیِ الساعۃِ، من یُّطعِ اللّٰہَ ورسولَہ فقد رَشَدَ وَمَنْ یَّعصِھِما فانہ لایضُرُّ الا نفسَہٗ ولا یضرُّ اللہَ شیئًا۔

ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں ہم مدد و مغفرت اسی سے مانگتے ہیں اور اپنے نفسوں کی برائی سے اسی کی پناہ چاہتے ہیں جسے وہ راہ راست عطا کردے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت یاب نہیں کرسکتا۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ معبود برحق صرف اللہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ نیز شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جنھیں اللہ نے حق کے ساتھ قیامت تک کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ راہ یاب ہوگا اور جو ان کی نافرمانی کرے گا وہ صرف اپنے کو نقصان پہنچائے گا اور اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یہ ابوداؤد کی روایت ہے[1] خطبۂ حج کا تذکرہ بھی آگے انشاء اللہ آئے گا۔

خطبات نبوی کا طریقہ

خطبہ دیتے وقت آنکھیں سرخ، آواز بلند اور زیروبم ایسا ہوتا جیسے آپ کسی فوج کو ڈرا رہے ہوں۔ فرماتے صبحکم

---

[1] ابوداؤد (۱۰۹۷) فی الصلاۃ : باب الرجل یخطب علی قوس، حدیث عبداللہ بن مسعود۔ سند میں ابوعیاض مدنی مجہول ہیں نیز "ومن یعصھما" کا دوسروں نے انکار کیا ہے۔ مسلم (۸۷۰) ابوداؤد (۱۰۹۹)۔ نسائی ۶/۹۰۔ مسند احمد ۴/۲۵۶ و ۳۷۹ میں عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے خطبہ دیا اور اس میں جب یہ کہا کہ "من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوی" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیسے برے خطیب ہو؟ یوں کہو" من یعص اللہ ورسولہ" علماء کہتے ہیں کہ نکیر آپ نے اس لیے فرمائی کہ ضمیر سے اللہ و رسول کے درمیان مساوات کا پہلو نکلتا ہے، عطف کے ذریعہ آپ نے اپنے نام سے اللہ کے نام کو مقدم قرار دے کر اس کی تعظیم کا حکم دیا جیسا کہ دوسری حدیث میں ارشاد ہے۔ "کوئی اس طرح نہ کہے : ماشاء اللہ و شاء فلان، بلکہ یوں کہے : ماشاء اللہ ثم شاء فلان" نسائی کے حاشیہ پر سندی نے جو کچھ لکھا ہے اس پر شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں "آپ کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ آپ کے اور رب کے درمیان اجتماع ضمیر جائز ہے جب کہ دوسروں کے لیے ممنوع ہے۔ کیونکہ دوسروں کے ساتھ ضمیر کے اجتماع سے تو مساوات کا پہلو نکلتا ہے مگر آپ کا منصب گرامی ایسا ہے کہ اس طرح کا وہم خارج از امکان ہے۔

ومسّاکم" (بس صبح یا شام تم پر حملہ ہوا چاہتا ہے) اور فرماتے "بعثت انا والساعۃ کہاتین" (میری بعثت اس وقت ہوئی ہے کہ میں اور قیامت دونوں اس طرح ہیں) اور بیچ کی انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرماتے اور کہتے "اما بعد! فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة" (اما بعد! بہترین بات اللہ کی کتاب، بہترین راہ محمد کی راہ، سب سے برے کام ایجاد کردہ بدعتیں اور ہر بدعت گمراہی ہے)۔ اس کے بعد فرماتے "انا اولی بکل مؤمن من نفسه، من ترك مالا فلاهله ومن ترك دینا اوضیاعا فالی وعلی"[1] مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ یعنی میں ہر مسلمان کے ساتھ خود اس سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ ترکہ میں جو کوئی شخص مال چھوڑے گا تو وہ تو اس کے اہل کا ہے اور جو قرض یا بے یار و مددگار بچوں کو چھوڑے گا وہ میرے ذمہ ہے اور اس کی ادائیگی مجھ پر ہوگی۔

ایک روایت کے مطابق جمعہ کے دن آپ کا خطبہ اس طرح ہوتا کہ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد بآواز بلند مذکورہ باتیں فرماتے۔

دوسری روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد فرماتے "من یهد الله فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له وخیر الحدیث کتاب الله" (اللہ جسے ہدایت دے اسے کون گمراہ کرے اور جسے گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے۔ سب سے بہتر بات اللہ کی کتاب ہے)۔

نسائی کی ایک روایت کے مطابق یہ ہے "کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار" (ہر بدعت ضلالت اور ہر ضلالت جہنم میں لے جانے والی ہے) حمد و ثنا اور شہادت کے بعد خطبہ میں اما بعد کہتے تھے[2]

خطبہ مختصر، صلوٰۃ لمبی اور ذکر بکثرت فرماتے تھے۔ خطبہ میں جامع باتیں ہوتیں۔ فرمایا کرتے تھے "لمبی صلوٰۃ اور مختصر خطبہ آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے"[3]

خطبہ میں صحابہ کو اسلام کے بنیادی اصول اور قوانین سمجھاتے تھے۔ حکم یا ممانعت کی کوئی بات آجاتی تو خطبہ ہی میں فرما دیتے۔ چنانچہ خطبہ دیتے وقت ایک شخص مسجد کے اندر داخل ہوا تو اسے دو رکعتیں صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا[4] لوگوں کی گردنیں پھاندنے والے ایک شخص کو خطبہ ہی میں روکا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا[5]

---

[1] مسلم (۸۶۷) فی الجمعة : باب تخفیف الصلاة والخطبة۔ حدیث جابر بن عبداللہ۔ نسائی ۳/۱۸۸، ۱۸۹ فی العیدین : باب کیف الخطبة۔ اس میں "وکل ضلالة فی النار" کا اضافہ بھی ہے۔ سند صحیح ہے۔

[2] بخاری ۲/۳۳۴، ۳۳۵۔ حدیث عکرمہ بروایت عبداللہ بن عباس فی الجمعة : باب من قال فی الخطبة بعد الثناء اما بعد۔ مسور بن مخرمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے جو روایتیں انھوں نے کی ہیں ان میں بھی اما بعد آیا ہے۔

[3] مسند احمد ۴/۲۶۳۔ مسلم (۸۶۹) فی الجمعة : باب تخفیف الصلاة والخطبة۔ آخر میں "پس صلوٰۃ لمبی کرو، خطبہ مختصر رکھو، بعض خطبوں میں جادو ہوتا ہے" کا اضافہ ہے۔

[4] بخاری ۲/۳۴۲ فی الجمعة : باب من جاء والامام یخطب صلی رکعتین۔ حدیث جابر بن عبداللہ۔ فرماتے ہیں "ایک شخص جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے مسجد میں داخل ہوا تو آپ نے پوچھا "صلوٰۃ پڑھی ہے؟" انھوں نے کہا نہیں فرمایا "دو رکعتیں پڑھ لو"۔ مسلم (۸۷۵) فی الجمعة : باب التحیة والامام یخطب۔ ابو داؤد (۱۱۱۵) فی الصلاة : باب اذا دخل رجل والامام یخطب۔ نسائی ۳/۱۰۳ فی الجمعة : باب الصلاة یوم الجمعة والامام یخطب اور ابن ماجہ (۱۱۱۲) فی اقامة الصلاة : باب ما جاء فیمن دخل المسجد والامام یخطب میں یہ روایت آئی ہے۔

[5] ابو داؤد (۱۱۱۸) فی الصلاة : باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعة۔ نسائی ۳/۱۰۳ فی الجمعة : باب النهی عن تخطی رقاب الناس والامام علی المنبر یوم الجمعة۔ حدیث ابو الزاہریہ، نام حدیر بن کریب۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ضرورت کے تحت کبھی منبر سے اتر بھی آتے، پھر واپس جا کر خطبہ پورا فرمایا۔ جیسا کہ ایک بار آپ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو لینے کے لیے اترے اور انھیں لے کر منبر پر چڑھے، اس کے بعد خطبہ پورا کیا [1]

خطبہ میں پکار کر کہتے " فلاں آؤ، فلاں بیٹھ جاؤ، فلاں صلوٰۃ پڑھ لو۔

وقت کا جو تقاضا ہوتا اس کے مطابق خطبہ میں حکم دیتے، ضرورت مندوں کو دیکھتے تو لوگوں کو صدقہ کا حکم اور تاکید فرماتے [2]

ذکر و دعا کے موقعہ پر خطبہ میں شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے [3]

بارش رک جاتی تو خطبہ میں بارش کی دعا مانگتے [4]

جمعہ کے دن صلوٰۃ میں لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار فرماتے، مجمع ہوتا تو برآمد ہوتے مگر ساتھ نہ کوئی نقیب ہوتا اور نہ جسم مبارک پر لمبی چوڑی شالیں، نہایت سادگی سے تشریف لاتے، سلام کرتے اور لوگوں کی جانب اپنا رُخ کرتے پھر سلام کرتے اور منبر پر بیٹھ جاتے، حضرت بلال بلا توقف اٹھ کر اذان دیتے اس کے بعد آپ فوراً خطبہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اذان اور خطبہ کے درمیان کسی طرح کا کوئی فاصلہ نہ ہوتا۔

ہاتھ میں کوئی تلوار وغیرہ بھی نہ ہوتی۔ منبر بنائے جانے سے پہلے کسی کمان یا عصا کا سہارا لے لیتے جنگ میں کمان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فرماتے ہیں "جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عبداللہ بن بسر کے ساتھ ہم موجود تھے کہ ایک شخص لوگوں کی گردنیں پھاندتے ہوئے پہنچا۔ عبداللہ بن بسر نے کہا "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، ایک شخص لوگوں کی گردنیں پھاندتا ہوا آیا تو آپ نے فرمایا "بیٹھ جاؤ، لوگوں کو بڑی اذیت پہنچائی تم نے"۔ سند حسن ہے۔

[1] ترمذی (۳۷۷۶) فی المناقب : باب مناقب الحسن والحسین۔ ابوداؤد (۱۱۰۹) فی الصلاۃ : باب الامام یقطع الخطبۃ للامر یحدث۔ نسائی ۱۰۸/۳ فی الجمعۃ : باب نزول الامام عن المنبر قبل فراغہ من الخطبۃ۔ ابن ماجہ (۳۶۰۰) فی اللباس : باب لبس الاحمر للرجال۔ سند حسن ہے۔

[2] صحیح مسلم (۱۰۱۷) فی الزکوٰۃ : باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ۔ حدیث جریر بن عبداللہ بجلی۔ فرماتے ہیں "دن کے شروع وقت میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، کچھ لوگ ننگے پیر ننگے بدن، نمار یا عبا پہنے، تلواریں لٹکائے آپ کے پاس آئے ان میں عام بلکہ تمام لوگ قبیلہ مضر کے تھے۔ فاقہ سے ان کا جو حال تھا اسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ انور سرخ ہو گیا۔ آپ اندر گئے، باہر آئے۔ حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ صلوٰۃ پڑھی اور تقریر فرمائی۔ جس میں آپ نے کہا "لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو ...... (الحدیث)۔

[3] مسلم (۸۷۴) فی الجمعۃ : باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔ حدیث عمارہ بن رویبہ۔ فرماتے ہیں : بشر بن مروان کو منبر پر دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھا تو فرمایا "ان دونوں ہاتھوں کا برا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اس سے زیادہ اشارہ کرتے نہیں دیکھا" اور شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ ابوداؤد (۱۱۰۴) فی الصلاۃ : باب رفع الیدین علی المنبر۔ نسائی ۱۰۸/۳ فی الجمعۃ : باب الاشارۃ فی الخطبۃ۔

[4] بخاری ۳۴۲/۲ فی الجمعۃ : باب الاستسقاء فی الخطبۃ یوم الجمعۃ۔ حدیث انس بن مالک۔ فرماتے ہیں : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قحط پڑا۔ آپ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے تو ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر کہا : رسول اللہ! مویشی ہلاک ہو گئے، اہل و عیال بھوکے ہیں، دعا فرمائیں۔ آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے، آسمان میں بادل کا کوئی ہلکا ٹکڑا بھی نہ تھا۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے دونوں ہاتھوں کو نیچے لاتے ہی کوہسار جیسے بادل اٹھے اور منبر سے اترتے ہی دیکھا کہ آپ کی داڑھی پر بارش کے قطرے پڑ رہے تھے۔ اسی دن بارش ہوئی، دوسرے دن بھی، تیسرے دن بھی، حتیٰ کہ اگلے جمعہ تک اعرابی یا کسی دوسرے نے کہا : رسول اللہ! مکان گر گئے، مویشی ڈوب گئے۔ دعا فرمائیں۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی "اے اللہ! ہم پر نہیں ہمارے گرد و پیش"۔ بادل کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہی بادل چھٹ گیا اور مدینہ مثل وادی قناۃ ایک مہینہ تک بہتا رہا جس گوشہ سے آدمی آتے بارش کی خبر لاتے۔ مسلم (۸۹۷) فی الاستسقاء : باب الدعا فی الاستسقاء۔

اور جمعہ میں عصا ہاتھ میں ہوتی [1] تلوار کا سہارا لینا آپ سے ثابت نہیں ہے۔ بعض جاہلوں کا یہ خیال ہے کہ آپ ہمیشہ شمشیر بکف ہوتے اور یہ کہ ایسا کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دین بزورِ شمشیر قائم ہوا انتہائی جہالت پر مبنی ہے کیونکہ اس طرح کی کوئی صحیح روایت نہیں ہے کہ منبر بننے کے بعد شمشیر یا کمان وغیرہ کا سہارا لیا ہو اور پہلے بھی ہاتھ میں تلوار نہیں رکھی۔ البتہ عصا یا کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔

آپ کا منبر تین زینوں کا تھا۔ منبر بننے سے پہلے کھجور کے ایک تنہ سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ منبر استعمال کرنے لگے تو تنے سے پکار، شوق بلند ہوئی جسے اہل مسجد نے سنی۔ آپ نے اتر کر اسے سینے سے لگا لیا [2] حضرت انس فرماتے ہیں "وحی کی آواز اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتصال نہ پا کر وہ رو پڑا۔

منبر وسط مسجد میں نہیں بلکہ دیوار سے قریب مغربی جانب رکھا جاتا۔ درمیان میں صرف ایک بکری کے گذرنے کی جگہ ہوتی [3] جمعہ کے علاوہ کسی اور دن اس پر بیٹھتے یا جمعہ میں کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تو صحابہ اپنا رُخ آپ کی جانب کر لیتے۔ خطبہ کے وقت آپ کا رُخ صحابہ کی جانب ہوتا۔

کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ جاتے اور دوسرا خطبہ ارشاد فرماتے۔ فارغ ہو جاتے تو حضرت بلال اقامت کہتے، لوگوں کو قریب ہو جانے اور خاموش رہنے کا حکم دیتے۔ فرماتے کہ اگر کسی نے ساتھ والے سے یہ بھی کہہ دیا کہ خاموش رہو تو اس نے لغو حرکت کی [4] اور جس نے لغو حرکت کی اس کا جمعہ نہیں ہوتا [5] نیز فرماتے تھے "جمعہ کے دن خطبہ کے وقت کلام کرنے والے کی مثال اس گدھے کی ہے جو پشت پر کتابیں لادے پھرے اور اس سے جو شخص یہ کہے کہ خاموش رہو اس کا جمعہ نہیں ہوتا، امام احمد نے اس کی روایت کی ہے [6]

---

[1] ابوداؤد (۱۰۹۶) فی الصلاۃ : باب الرجل یخطب علی قوس۔ حدیث حکم بن حزن کلفی۔ اس میں آیا ہے کہ ہم نے یہاں چند دن قیام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھا۔ آپ کسی عصا یا کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ سند جیسا کہ تلخیص ۲/ ۶۵ میں حافظ نے کہا ہے حسن ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابو داؤد (۱۱۴۵) میں حضرت براء کی ایک روایت اور اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی شیخ ص ۱۵۵، ۱۵۶ میں ایک اور روایت اس کی شاہد بھی ہے۔

[2] بخاری ۶/ ۴۴۴ فی المناقب : باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ حدیث عبد اللہ بن عمر و جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما۔ ترمذی (۵۰۵) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الخطبۃ علی المنبر۔ حدیث ابن عمر۔ نسائی ۳/ ۱۰۲ فی الجمعۃ : باب مقام الامام فی الخطبۃ۔ ابن ماجہ (۱۴۱۷) حدیث جابر۔ ابن ماجہ (۱۴۱۵)۔ ترمذی (۳۶۳۱) حدیث انس (۱۴۱۶) حدیث سہل (۱۴۱۴) حدیث ابی بن کعب۔ دیکھیے شمائل الرسول مولفہ ابن کثیر ص ۲۳۹، ۲۵۱۔

[3] بخاری ۱/ ۴۷۵ فی الصلاۃ : باب قدر کم ینبغی ان یکون بین المصلی والسترۃ۔ مسلم (۵۰۹) فی الصلاۃ : باب دنو المصلی من السترۃ۔ ابو داؤد (۱۰۸۲) فی الصلاۃ : باب موضع المنبر۔ حدیث سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ۔ الفاظ یہ ہیں "منبر اور قبلہ کے درمیان ایک بکری کے گذرنے کی بھی جگہ ہوتی"

[4] بخاری ۲/ ۳۴۳ فی الجمعۃ : باب الانصات یوم الجمعۃ۔ مسلم (۸۵۱) فی الجمعۃ : باب فی الانصات یوم الجمعۃ للخطبۃ۔ ابو داؤد (۱۱۱۲) فی الصلاۃ : باب الکلام والامام یخطب۔ نسائی ۳/ ۱۰۴ فی الجمعۃ : باب الانصات للخطبۃ یوم الجمعۃ۔ ابن ماجہ (۱۱۱۰) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الاستماع للخطبۃ والانصات لھا۔

[5] ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے جو مسند احمد (۷۱۹) میں وارد ہے۔ آخر میں یہ ہے "جس نے کہا خاموش رہ اس نے بھی کلام کیا اور جو کلام کرے گا اس کا جمعہ نہ ہوگا" عطا خراسانی کی بیوی کا مولیٰ چونکہ مجہول ہے اس لیے حدیث ضعیف ہے۔ بایں ہمہ صحیح ابن خزیمہ میں (۱۸۱۰) میں حضرت عبد اللہ بن عمرو کی مرفوعاً روایت اس کی نظیر ہے جس میں آیا ہے کہ جو لغو حرکت کرے گا یا گردنیں پھاندے گا اس کو ظہر کا ثواب ملے گا۔ اس کی سند حسن ہے۔

[6] (۲۰۳۳) حدیث ابن عباس۔ سند میں مجالد بن سعید ضعیف ہیں۔ المجمع ۲/ ۱۸۴ میں ہیثمی نے اسے ذکر کیا ہے اور اسے بزار اور طبرانی الکبیر کی جانب منسوب بھی کیا ہے اور مجالد کے باعث اسے معلول قرار دیا ہے۔

ابی بن کعب فرماتے ہیں: جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر "تبارك الذی" پڑھی اور ہمیں اللہ کے عذاب و ثواب کی باتیں بتائیں۔ ابو درداء یا ابو ذر نے مجھے متوجہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ سورہ کب اتری ہے میں نے اب تک نہیں سنی۔ میں نے انھیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جب سب واپس ہوئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے تم سے اس سورہ کے نزول کے بارے میں پوچھا مگر تم نے بتایا نہیں" کہا "آج تمھاری صلاۃ بے کار ہو کر رہ گئی" وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اس کا ذکر کیا اور وہ بات بھی کہی جو ابی نے کہی تھی۔ سن کر آپ نے فرمایا "ابی نے سچ کہا"۔ [ا] ابن ماجہ اور سعید بن منصور نے اس کی روایت کی ہے۔ اصل مسند احمد میں ہے۔

آپ نے فرمایا: جمعہ میں تین طرح کے لوگ آتے ہیں۔ ایک لغو حرکتیں کرنے والا اور بس یہی اس کا حاصل ہے، ایک دعا کرنے والا۔ اس کی دعا اللہ نے چاہی تو مقبول ہوگی یا نامقبول۔ اور ایک تیسرا آتا ہے تو خاموش رہتا ہے، کسی مسلمان کی گردن نہیں پھاندتا نہ کسی کو اذیت پہنچاتا ہے، اس کا جمعہ آئندہ جمعہ تک کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، مزید تین دن کے گناہوں کا کیونکہ اللہ عز وجل کا ارشاد ہے۔

مَنْ جَاۤءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا [۲]

جو نیکی لائے گا اس کے لیے اس کا دس گنا بدلہ ہے۔

احمد اور ابو داؤد نے اس کی روایت کی ہے۔

حضرت بلال اذان سے فارغ ہوتے تو آپ خطبہ شروع کر دیتے۔ اس کے بعد کوئی بھی دو رکعت صلوٰۃ نہیں پڑھتا تھا۔ اذان بھی ایک ہی دی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ بھی عید کی طرح ہے جس کے پہلے کوئی سنت نہیں ہوتی۔ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ مگر سب سے صحیح مذکورہ بالا ہی ہے۔ سنت سے بھی یہی ثابت ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکل کر منبر پر چڑھتے تو بلال جمعہ کی اذان دیتے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا توقف خطبہ شروع فرما دیتے۔ یہ آنکھوں دیکھا حال ہے پھر سنت کب پڑھی جاتی؟ جس کا یہ خیال ہے کہ حضرت بلال اذان سے فارغ ہوتے تو سب کھڑے ہو کر دو رکعت صلوٰۃ پڑھتے تھے وہ سنت سے بالکل بے بہرہ ہے۔ ہم نے جو یہ بات کہی ہے کہ پہلے کوئی سنت نہیں ہے یہی امام مالک اور امام محمد کا مشہور مذہب بھی ہے۔ نیز شوافع کے نزدیک بھی ان کا ایک مذہب یہی ہے۔

جو حضرات جمعہ سے پہلے سنت پڑھنے کے قائل ہیں ان میں سے بعض کا استدلال یہ ہے کہ صلوٰۃ جمعہ دراصل ظہر کی قصر صلوٰۃ ہے۔ لہٰذا اس پر صلوٰۃ ظہر کے احکام عائد ہوں گے۔ یہ انتہائی کمزور دلیل ہے۔ کیونکہ جمعہ بجائے خود مستقل صلوٰۃ ہے اور ظہر کی صلوٰۃ کے بمقابلہ گو وقت ایک ہے مگر قرأت بالجہر، تعداد رکعت، خطبہ اور ضروری شرطوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ نزاعی مسئلہ کو اختلافی مقامات کے بجائے اتفاقی مقامات سے جوڑنا اولیٰ اور انسب نہیں ہے بلکہ انسب یہ ہے کہ اسے اختلافی مقامات سے جوڑا جائے۔ کیونکہ اتفاقی مقامات کم اور اختلافی زیادہ ہیں۔

مذکورہ گروہ کے بعض حضرات نے صلوٰۃ ظہر پر قیاس کرتے ہوئے جمعہ کے لیے سنت ثابت کیا ہے مگر یہ قیاس بھی غلط ہے۔ کیونکہ سنت تو وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا فعلاً ثابت ہو یا خلفاء راشدین کی سنت رہی ہو۔ مگر مسئلہ زیر بحث کے

[ا] مسند احمد ۵/۱۴۳ و ابن ماجہ (۱۱۱۱) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی الاستماع للخطبۃ۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۵۷۷) نے اسی طرح کی روایت حضرت جابر سے کی ہے مگر اس کی سند میں عیسیٰ بن جاریہ لین الحدیث ہیں۔ دیکھیے المجمع ۲/۱۸۴۔

[۲] مسند احمد ۲/۲۱۴۔ ابو داؤد (۱۱۱۳) فی الصلاۃ: باب الکلام والامام یخطب۔ بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ سند حسن ہے۔

اندر اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے مسائل میں سنتوں کا اثبات قیاس سے جائز نہیں۔ کیونکہ یہ وہ مسائل ہیں جن کے اسباب خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے۔ لہٰذا آپ نے اسے اختیار نہ کیا ہو یا اس کا حکم نہ دیا ہو تو اس کو ترک کر دینا ہی سنت ہے۔ اس مسئلہ کی نظیر یہ ہوگی کہ صلوٰۃ عید سے پہلے یا بعد میں از روئے قیاس سنت مشروع قرار دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مزدلفہ میں قیام، رمی جمار، طواف اور کسوف اور استسقاء میں غسل نہ کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے یہ عبادتیں انجام دینے کے باوجود غسل نہیں کیا ہے۔

کچھ حضرات نے بطور استدلال صحیح بخاری باب الصلاۃ قبل الجمعۃ وبعدھا کی وہ روایت پیش کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن یوسف نے حدیث بیان کی، انھوں نے کہا ہمیں مالک نے خبر دی، انھوں نے نافع سے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے، ظہر کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد گھر میں دو رکعتیں اور عشاء سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے بعد واپس آکر ہی دو رکعتیں پڑھتے تھے [1]

مگر یہ کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ بخاری یہ روایت جمعہ سے پہلے سنت کے اثبات کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لاتے ہیں کہ آیا صلوٰۃ جمعہ سے پہلے یا بعد میں اور کوئی سنت صلوٰۃ ہے۔ پھر اس کے بعد یہ حدیث ذکر کی ہے۔ ثابت کرنا مقصود یہ ہے کہ سنت آپ سے صلوٰۃ جمعہ کے بعد ہی ثابت ہے۔ پہلے کچھ بھی نہیں۔

کتاب العیدین میں بھی بخاری نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہاں بھی "باب الصلاۃ قبل العید وبعدھا" باندھا ہے۔ ابو معلی [2] فرماتے ہیں کہ میں نے سعید کو حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ وہ عید سے پہلے صلوٰۃ پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے [3]۔ اس کے بعد سعید بن جبیر کی اس حدیث کا تذکرہ کیا ہے جسے انھوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفطر کو باہر نکلے اور دو رکعتیں صلوٰۃ پڑھی۔ اس سے پہلے یا بعد میں کچھ نہیں پڑھا۔ بلال بھی ساتھ میں تھے [4]۔ آگے پوری حدیث بیان کی ہے۔

جس طرح بخاری نے جمعہ کا باب باندھا ہے اسی طرح عید کا بھی باندھا ہے اور عید کے سلسلہ میں وہ حدیث لائے ہیں جس کی رو سے پہلے یا بعد میں کوئی صلوٰۃ نہیں پڑھی جاتی۔ معلوم ہوا کہ جمعہ کے سلسلہ میں باب باندھنے کا مفہوم بھی ان کے یہاں یہی ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ چونکہ جمعہ صلوٰۃ ظہر کے بدلہ میں ہے اس لیے یہ بھی ظہر ہی کے مثل ہے۔ حدیث کے اندر

---

[1] - بخاری ۲/۳۵۴ فی الجمعۃ : باب الصلاۃ یوم الجمعۃ وقبلھا۔ حافظ فرماتے ہیں۔ جمعہ سے پیشتر دو رکعتیں پڑھنے کے بارے میں قوی تر دلیل ابن حبان کی بروایت عبداللہ بن زبیر وہ مرفوع حدیث ہے جسے انھوں نے صحیح قرار دیا ہے۔ "فرض صلوٰۃ جو بھی ہے اس سے پہلے دو رکعت سنت بھی ہے" اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت میں آیا ہے "دو اذانوں کے درمیان ایک صلوٰۃ ہے" ان روایتوں کا عموم دلیل بن سکتا ہے۔

[2] - نام یحییٰ بن میمون عطار کوفی۔ بخاری میں ان کا صرف اسی جگہ تذکرہ آیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں ابو العلاء تحریف ہے۔

[3] - بخاری ۲/۳۹۶ تعلیقاً فی العیدین : باب الصلاۃ قبل العید وبعدھا۔ الفتح میں حافظ فرماتے ہیں : ان کی اس حدیث کا موصول ہونا مجھے معلوم نہیں۔ البتہ حافظ الخطۃ بعد العید میں حضرت عبداللہ بن عباس کی مرفوع حدیث آگے کامل گذر چکی ہے جس میں یہ ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الفطر کو دو رکعتیں پڑھیں اس سے پہلے یا بعد میں کوئی صلوٰۃ نہیں پڑھی"۔ (الحدیث)۔

[4] - بخاری ۲/۳۹۶ فی العیدین : باب الصلاۃ قبل العید وبعدھا۔ مسلم (۸۸۴) فی العیدین : باب ترک الصلاۃ قبل العید وبعدھا فی المصلی۔ نسائی ۳/۱۹۳ فی العیدین : باب الصلاۃ قبل العیدین وبعدھا۔ ابوداؤد (۱۱۵۹) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ بعد صلاۃ العید۔ ابن ماجہ (۱۲۹۱) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ما جاء فی الصلاۃ قبل صلاۃ العید وبعدھا۔

ظہر سے پہلے اور بعد میں سنت پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ اور روایتوں میں جو یہ آتا ہے کہ جمعہ کے بعد آپ واپس آ کر ہی صلوٰۃ پڑھتے تھے تو یہ جمعہ کے بعد سنت کی ادائیگی کا مقام بتانے کے لیے آیا ہے۔ مگر یہ خیال بھی غلط ہے۔ کیونکہ بخاری نے باب التطوع بعد المکتوبۃ میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث بیان کی ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر کے بعد دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں، عشاء کے بعد دو رکعتیں اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں[1] اس سے بصراحت ثابت ہے کہ جمعہ صحابہ کے نزدیک ظہر کے علاوہ ایک مستقل صلوٰۃ تھی۔ اگر ظہر کے تحت ہوتی تو مستقلاً اس کے ذکر کی ضرورت نہ پڑتی۔ یہاں سنت کا تذکرہ اس کے بعد ہی آیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے سنت نہیں ہے۔

بعض حضرات نے سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر سے جو روایت آئی ہے اس سے استدلال کیا ہے۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ سلیک غطفانی مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ نے پوچھا "آنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ چکے ہو؟" انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا "پڑھ لو، ذرا ہلکی پڑھنا" سند ثقہ ہے[2]

ابوالبرکات ابن تیمیہ فرماتے ہیں: آپ کا ارشاد "آنے سے پہلے" اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں رکعتیں تحیۃ المسجد کی نہیں جمعہ کی سنت ہیں۔ ہمارے شیخ جن کے پوتے ابوالعباس ہیں، فرماتے ہیں: یہ غلط ہے، صحیحین میں مشہور حدیث حضرت جابر کی ہے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ آپ نے پوچھا "صلوٰۃ پڑھ لی ہے؟" انھوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا "دو رکعتیں پڑھ لو[3]" اور آگے فرمایا "جب خطبہ کے وقت کوئی جمعہ میں آئے تو دو رکعتیں پڑھ لے مگر ہلکی سے ہلکی ہوں[4]" اس حدیث کے اندر یہی ثابت ہے۔ ابن ماجہ کے اکثر راوی غیر صحیح ہیں۔ یہ ابوالبرکات ابن تیمیہ کی گفتگو کا حاصل رہا۔

ہمارے شیخ ابوالحجاج حافظ مزی فرماتے ہیں "یہ راویوں کی جانب سے تصحیف ہے۔ اصل یہ ہے "أَصَلَّيْتَ قَبْلَ أَنْ تَجْلِسَ" (بیٹھنے سے پہلے صلوٰۃ پڑھ لی ہے) مگر نوٹ کرنے والوں سے غلطی ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ ابن ماجہ کی کتاب کی جانب جن شیوخ نے توجہ فرمائی انھوں نے کچھ زیادہ اعتناء سے کام نہیں لیا۔ برعکس ازیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر شیوخ نے بڑی توجہ دے کر ضبط و تصحیح کا کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن ماجہ کے اندر غلطیاں اور تصحیفات زیادہ پائی جاتی ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جن فقہاء اور اصحاب سنن نے صلوٰۃ سے پہلے اور بعد کی سنتوں کو ضبط کرنے پر توجہ دی ہے اور اس مسئلہ میں کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ذکر نہیں کرتا کہ یہ حدیث جمعہ سے پہلے سنت کے بارے میں ہے۔ انھوں نے اس کا ذکر اس حیثیت سے کیا ہے کہ منبر پر امام ہو تو تحیۃ المسجد پڑھ لینا مستحب ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اس حالت میں اس سے روکتے ہیں ان کے خلاف اس حدیث سے احتجاج کرتے ہیں۔ اگر یہ جمعہ کی سنت ہوتی تو اس کا ذکر یہاں ضروری ہوتا، باب بھی اسی انداز کا ہوتا، محفوظ بھی ہوتی، مشہور بھی ہوتی۔ تحیۃ المسجد

---

[1] بخاری ۳/۴۱۱ فی التطوع: باب التطوع بعد المکتوبۃ۔
[2] ابن ماجہ (۱۱۱۴) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فیمن دخل المسجد والامام یخطب۔ ابوداؤد (۱۱۱۶) فی الصلاۃ: باب اذا دخل الرجل والامام یخطب۔
[3] بخاری ۲/۳۴۲ فی الجمعۃ: باب من جاء والامام یخطب صلی رکعتین خفیفتین۔ مسلم (۸۷۵) فی الجمعۃ: باب التحیۃ والامام یخطب۔
[4] مسلم (۸۷۵)۔ ابوداؤد (۱۱۱۷) فی الصلاۃ: باب اذا دخل الرجل والامام یخطب۔

کے بالمقابل یہ ساری باتیں اولیٰ تھیں۔ پھر اس کی یہ دلیل بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں رکعتوں کے پڑھ لینے کا حکم تحیۃ المسجد کے پیش نظر ہی داخل ہونے والے کو دیا ہے۔ اگر جمعہ کی سنت ہوتی تو بیٹھے ہوؤں کو بھی اس کا حکم فرماتے خصوصیت سے آنے والے ہی کو حکم نہ ہوتا۔

بعض حضرات نے سنن ابوداؤد کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں ہم سے مسدد نے، انھوں نے کہا ہم سے اسماعیل نے، انھوں نے کہا ہم سے ایوب نے حدیث بیان کی، انھوں نے نافع سے روایت کی ہے کہ جمعہ سے پہلے حضرت ابن عمر صلوٰۃ لمبی پڑھتے تھے اور اس کے بعد دو رکعتیں گھر میں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے[۱] اس میں بھی یہ دلیل موجود نہیں ہے کہ جمعہ سے پہلے کوئی سنت ہوتی ہے۔ آپ کے اس ارشاد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے تھے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دو رکعتیں جمعہ کے بعد گھر میں پڑھتے تھے، مسجد میں نہیں۔ اس بارے میں بہتر بات یہی ہے۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت ابن عمر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد دو رکعتیں گھر میں پڑھتے تھے۔ سنن میں ابن عمر سے روایت کی گئی ہے کہ جب مکہ میں آپ ہوتے اور جمعہ پڑھتے تو آگے بڑھ کر دو رکعتیں پھر آگے بڑھ کر چار رکعتیں پڑھتے تھے اور جب مدینہ میں ہوتے اور جمعہ ہوتا تو گھر آکر دو رکعتیں پڑھتے تھے، مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے تھے[۲] جمعہ سے پہلے حضرت ابن عمر کے لمبی صلاۃ پڑھنے کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ مطلق نفل ہے۔ اولیٰ یہی ہے کہ جمعہ سے پہلے آجانے والا امام کے نکلنے تک صلوٰۃ میں مصروف رہے۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ اور نُبیشہ ہذلی کی روایتوں میں پیشتر گذر چکا ہے۔

حضرت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "جمعہ کے دن جو غسل کرے پھر مسجد آئے اور حسب توفیق صلوٰۃ ادا کرے پھر امام کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموش رہے پھر اس کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرے تو آئندہ جمعہ تک کی اور تین دن کی مزید اس کی گناہیں بخش دی جاتی ہیں"[۳] نُبیشہ ہذلی کی روایت یہ ہے کہ "مسلمان جمعہ کے دن غسل کر کے مسجد آتا ہو، کسی کو اذیت نہ دیتا ہو، امام نہ نکلا ہو تو مرضی کے مطابق صلوٰۃ پڑھ لیتا ہو اور امام نکل چکا ہو تو بیٹھ کر خاموش رہتا ہو حتی کہ امام جمعہ اور خطبہ سے فارغ ہو جائے تو اس جمعہ کو اس کے تمام گناہ معاف ہوں نہ ہوں مگر آئندہ جمعہ تک کی گناہوں کا کفارہ ضرور ہو جاتا ہے"[۴]۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی اسوہ تھا۔

ابن منذر فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہوئے ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ جمعہ سے پہلے بارہ رکعتیں پڑھتے تھے[۵]

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے[۶] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب مطلق نفل کے طور پر پڑھی جاتی تھیں، اس لیے تعداد کے اندر اختلاف بھی ہوتا تھا۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ چار رکعتیں جمعہ سے پہلے اور چار جمعہ کے بعد پڑھتے تھے[۷] ابن مبارک اور ثوری کا یہی مذہب ہے۔

۱۔ ابوداؤد (۱۱۲۸) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ۔ نسائی ۳/۱۱۳ فی الجمعۃ : باب اطالۃ الرکعتین بعد الجمعۃ۔ سند صحیح ہے۔

۲۔ ابوداؤد (۱۱۳۰) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ۔ سند حسن ہے۔

۳۔ مسلم (۸۵۷) فی الجمعۃ : باب فضل من استمع وانصت فی الخطبۃ۔

۴۔ تخریج گذر چکی ہے۔ مسند ۵/۷۵۔

۵۔ تخریج صلوٰۃ تطوع میں گذر چکی ہے۔

۶۔ تخریج صلوٰۃ تطوع میں گذر چکی ہے۔

۷۔ حدیث (۵۲۳) کے بعد ترمذی نے اس کا ذکر فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعۃ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسحاق بن ابراہیم بن ہانی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ابوعبداللہ جمعہ کے دن اس حد تک صلوات پڑھتے کہ آفتاب قریب زوال ہو جاتا، اس کے بعد صلوۃ پڑھنا بند کر دیتے۔ مؤذن اذان دیتا، اذان شروع ہوتی تو کھڑے ہو کر دو چار رکعتیں پڑھتے، درمیان میں سلام پھیر کر فصل دیتے۔ فرض پڑھنے کے بعد مسجد میں تھوڑی دیر انتظار کرتے پھر باہر نکل کر جامع مسجد کے سامنے کسی مسجد میں چلے جاتے اور وہاں دو رکعتیں پڑھتے، پھر بیٹھ جاتے، کبھی چار رکعتیں پڑھتے پھر بیٹھتے پھر اٹھ کر دو دوسری رکعتیں ادا فرماتے۔ اس طرح حضرت علی کی حدیث کے مطابق چھ رکعتیں ادا کرتے تھے۔ چھ کے بعد گاہ دیگر چھ رکعتیں یا اس سے کم یا اس سے زیادہ بھی پڑھتے تھے۔ بنابریں آپ کے بعض اصحاب نے یہ روایت اختیار کی ہے کہ جمعہ سے پہلے دو یا چار رکعتیں سنت ہیں۔ مگر یہ نہ صرف یہ کہ صریح نہیں بلکہ ظاہر بھی نہیں ہے۔ کیونکہ امام احمد ممانعت کے وقت صلوۃ نہیں پڑھتے تھے بلکہ جب ممانعت کا وقت گذر جاتا تو کھڑے ہو کر امام کے نکلنے تک اپنی نفل صلوۃ کی تکمیل فرماتے تھے۔ چنانچہ کبھی چار اور کبھی دو ہی پڑھ پاتے تھے۔

جمعہ سے قبل سنت کے ثبوت میں بعض حضرات سنن ابن ماجہ کی روایت پیش کرتے ہیں۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن یحییٰ نے، انھوں نے کہا ہم سے یزید بن عبد ربہ نے، انھوں نے کہا ہم سے بقیہ نے حدیث بیان کی، انھوں نے مبشر بن عبید سے، انھوں نے حجاج بن ارطاۃ سے، انھوں نے عطیہ عوفی سے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے جن کے درمیان کوئی فصل نہیں فرماتے تھے۔

ابن ماجہ نے (باب الصلاۃ قبل الجمعۃ) کا باب باندھ کر اس حدیث کا تذکرہ کیا ہے[1]۔ حدیث کئی لحاظ سے ساقط الاعتبار ہے۔ ایک یہ کہ بقیہ بن ولید امام المدلسین ہے۔ اس نے روایت کو عن، عن کر کے پیش کیا ہے۔ صراحت سے سماع کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مبشر بن عبید منکر الحدیث ہے۔ عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں کہ والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک شیخ جن کا نام مبشر بن عبید ہے حمص میں گذرے ہیں۔ میرے خیال میں کوفی تھے۔ بقیہ اور مغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں۔ ان کی حدیثیں موضوع اور جھوٹی ہوا کرتی تھیں۔ دارقطنی فرماتے ہیں مبشر بن عبید متروک الحدیث ہے۔ اس کی حدیثیں اپنی نوعیت کی بالکل منفرد ہوتی ہیں۔ دیگر روایتوں سے ان کی تائید اور موافقت نہیں ہوتی۔ تیسرے یہ کہ حجاج بن ارطاۃ ضعیف اور مدلس ہے۔ چوتھے یہ کہ عطیہ عوفی کے بارے میں بخاری فرماتے ہیں کہ ہشیم نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے اور احمد وغیرہ نے انھیں ضعیف کہا ہے۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ عطیہ عوفی ناقابل استدلال ہیں۔ مبشر بن عبید حمصی کی جانب موضوع حدیثیں منسوب کی جاتی ہیں اور حجاج بن ارطاۃ ناقابل احتجاج ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وبعدھا میں کیا ہے اور کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ آپ جمعہ سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ عبدالرزاق (۵۵۲۴) میں معمر عن قتادہ سے مروی ہے کہ ابن مسعود جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ قتادہ کا حضرت ابن مسعود سے سماع ثابت نہیں ہے۔ عبدالرزاق (۵۵۲۵) نے ابوعبدالرحمن سلمی سے بھی روایت کی ہے کہ عبداللہ ہمیں جمعہ سے پہلے اور بعد میں چار چار رکعتیں پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ سند صحیح ہے۔

[1] ابن ماجہ (۱۱۲۹) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعۃ۔ سند بے حد ضعیف ہے۔ الزوائد میں بوصیری نے کہا ہے کہ سند کے اندر مسلسل ضعیف راوی آتے ہیں۔

وہ احادیث جن کے اندر راویوں کے بیانات الٹ گئے ہیں

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سند کے اندر تینوں ضعفاء کے حفظ وضبط کا جو حال ہے اس کے پیش نظر بعید از امکان نہیں کہ حدیث کے الفاظ الٹ گئے ہوں اور "جمعہ کے بعد" کے بجائے "جمعہ سے پہلے" کی روایت ہوگئی ہو۔ اگر یہ حقیقت مان لی جائے تو پھر صحیح بخاری سے جو ثابت ہے اس کے عین موافق یہ روایت ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال عبداللہ بن عمر عمری کی روایت "للفارس سہمان وللراجل سہم" (سوار کے دو حصے اور پیدل چلنے والے کا ایک حصہ ہے) میں ملتی ہے۔ شافعی فرماتے ہیں: ایسا لگتا ہے جیسے نافع سے "للفرس سہمان وللراجل سہم" (گھوڑے کے دو اور پیدل چلنے والے کا ایک حصہ ہے) کہتے سنا مگر "للفارس سہمان وللراجل سہم" کہدیا۔ اس طرح یہ حدیث ان کے بھائی عبیداللہ کی روایت کے عین مطابق ہو جاتی ہے۔ حفظ کا جہاں تک تعلق ہے اہل علم کے نزدیک اس باب میں عبیداللہ بن عمر بہر حال اپنے بھائی عبداللہ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوہریرہ کی ایک حدیث کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جو فرمایا ہے وہ بھی اس کی نظیر ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی اصل حدیث یہ ہے:

لَاتَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقىٰ فِيهَا وَهِيَ تَقُوْلُ: هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ؟ حتى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيهَا قَدَمَهُ فَيَزْوِيْ بَعْضُهَا إِلَىٰ بَعْضٍ وَتقول: قَطْ، قَطْ، وَأَمَّا الْجَنَّةُ: فَيُنْشِئُ اللهُ لَهَا خَلْقًا [۱]

جہنم ہمیشہ پُر کی جاتی اور کہتی رہے گی کہ اور بھی کچھ ہے؟ حتی کہ پروردگار اپنا قدم اس میں رکھ دے گا۔ جہنم کے اجزاء سکڑ کر ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں گے، اس وقت جہنم بولے گی بس بس۔ باقی جنت کے لیے اللہ تعالیٰ دوسری مخلوقات بھی پیدا کر دے گا۔

مگر بعض راویوں نے الٹ کر اسے یوں کر دیا ہے "اما النار فینشئ اللہ لہا خلقا" (باقی جہنم کے لیے اللہ تعالیٰ دوسری مخلوقات بھی پیدا کرے گا)۔

میرے نزدیک اس کی نظیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بھی ہے "بلال شب میں اذان دیں تو کھاؤ پیو حتی کہ ابن ام مکتوم اذان دیں"[۲] یہ صحیحین کی روایت ہے۔ مگر بعض راویوں نے اسے الٹ کر یوں کر دیا ہے "ابن ام مکتوم شب میں اذان دیں تو کھاؤ پیو حتی کہ بلال اذان دے دیں"۔ اس کی نظیر حضرت ابوہریرہ کی یہ حدیث بھی ہے۔

"جب کوئی صلوٰۃ پڑھے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے، بلکہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھے"[۳]

۱۔ بخاری ۸/۴۵۸ فی تفسیر سورۃ (ق): باب قولہ: وتقول ھل من مزید۔ مسلم (۲۸۴۶) فی الجنۃ: باب النار یدخلھا الجبارون۔ ترمذی (۲۵۶۰) فی الجنۃ: باب ماجاء فی خلود اھل الجنۃ واھل النار۔

۲۔ بخاری ۲/۸۷ فی الاذان: باب الاذان قبل الفجر، وفی الصوم: باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لایمنعنکم من سحورکم اذان بلال۔ مسلم (۱۰۹۲) فی الصیام: باب بیان ان الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر۔

۳۔ ابوداؤد (۸۴۰) و (۸۴۱) فی الصلاۃ: باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ۔ نسائی ۲/۲۰۷ فی الافتتاح: باب اول ما یصل الی الارض من الانسان فی سجودہ۔ ترمذی (۲۶۹) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود۔ مسند احمد ۲/۳۸۱۔ حدیث صحیح ہے۔ مؤلف نے غلط فہمی سے اسے وہم تصور کر لیا۔ اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

میرے خیال میں صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد " ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھے" کہ روایت میں وہم ہوگیا ہے۔ چنانچہ حضرت وائل بن حجر کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں سے پہلے زمین پر گھٹنے رکھتے تھے[1] خطابی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حضرت وائل بن حجر کی حدیث حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ اس مسئلہ پر اسی کتاب کے اندر مکمل بحث گذر چکی ہے۔ الحمد اللہ۔

آپ جمعہ کی صلوٰۃ کے بعد گھر جاکر دو رکعتیں سنت ادا کرتے تھے۔ امت کو حکم بھی فرمایا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں سنت ادا کریں۔ ہمارے شیخ ابو العباس ابن تیمیہ فرماتے ہیں "مسجد میں سنت ادا کرے تو چار اور گھر میں ادا کرے تو دو رکعتیں پڑھے"۔

اپنے علم کی حد تک احادیث کے اندر بھی یہی بات ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل مروی ہے کہ آپ مسجد میں سنت پڑھتے تو چار اور گھر میں پڑھتے تو دو رکعتیں ادا فرماتے تھے[2]

صحیحین میں حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے۔[3] صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی جمعہ پڑھے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے[4] واللہ اعلم۔

عیدین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی صلوٰۃ عیدگاہ میں پڑھتے تھے جو مدینہ کے مشرقی دروازہ پر وہاں واقع تھی جہاں حجاج کا محمل رکھا جاتا ہے۔ مسجد نبوی میں صرف ایک بار بارش کی وجہ سے عید کی صلوٰۃ پڑھی تھی۔ بشرطیکہ اس کی روایت صحیح ہو۔ یہ روایت سنن ابوداؤد[5] اور ابن ماجہ میں آئی ہے مگر ہمیشہ آپ کا دستور عیدگاہ میں صلوٰۃ ادا کرنے کا رہا ہے۔ عیدین کی صلوٰۃ کے لیے آپ بہترین لباس زیب تن فرماتے تھے۔ آپ کے پاس ایک خوبصورت جوڑا تھا جسے آپ عیدین اور جمعہ کی صلوٰۃ کے موقعوں پر پہنتے تھے۔ گاہ دو سبز چادریں گاہ ایک سرخ چادر جو خالص سرخ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے نہ

---

[1] ترمذی (۲۶۸) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود۔ ابوداؤد (۸۳۸) فی الصلاۃ : باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ۔ نسائی ۲/۲۰۷ فی الافتتاح : باب اول مایصل الی الارض من الانسان فی سجودہ۔ سند میں قاضی شریک سیئ الحفظ ہیں۔

[2] ابوداؤد (۱۱۳۰) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ۔ سند قوی ہے۔

[3] بخاری ۲/۳۵۴ فی الجمعۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ وقبلھا۔ مسلم (۸۸۲) فی الجمعۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ۔ ترمذی (۵۲۱) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعۃ وبعدھا۔ ابوداؤد (۱۱۳۲) فی الصلاۃ : باب الصلاۃ بعد الجمعۃ۔ نسائی ۳/۱۱۳ فی الجمعۃ : باب صلاۃ الامام بعد الجمعۃ۔

[4] مسلم (۸۸۱)۔

[5] ابوداؤد (۱۱۶۰) فی الصلاۃ : باب یصلی بالناس فی المسجد اذا کان یوم المطر۔ ابن ماجہ (۱۳۱۳) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی صلاۃ العیدین فی المسجد اذا کان مطر۔ سند میں عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ ایسے ہی اس کا شیخ ابویحیٰ عبیداللہ تیمی بھی۔

ہوتی پہنتے تھے۔ خالص سرخ ہوتی تو اسے چادر نہ کہتے۔ اصل میں اس کے اندر کچھ سرخ دھاریاں تھیں جیسا کہ بالعموم یمنی چادروں کا حال ہوا کرتا تھا۔ انہی دھاریوں کے سبب اسے سرخ کہا جاتا تھا ورنہ آپ سے زرد اور سرخ پوشاک استعمال کرنے کی ممانعت بلا کسی معارض حدیث کے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کو دو سرخ کپڑے زیب تن دیکھ کر آپ نے انھیں جلا ڈالنے کا حکم دیا[1]۔ اس حد تک ناپسند کرتے ہوئے آپ آخر سرخ لباس کیونکر استعمال کر سکتے تھے۔ دلیل سے تو ثابت یہی ہے کہ آپ نے سرخ پوشاک کو یا حرام ٹھہرایا ہے یا اسے انتہائی سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

عید الفطر میں نکلنے سے پہلے کچھ طاق کھجوریں کھا لیتے تھے۔ عید الاضحیٰ میں عیدگاہ سے واپس ہونے کے بعد ہی کھاتے تھے۔ کھانے میں یہی قربانی کا گوشت ہوتا تھا۔ عیدین کے لیے آپ غسل فرماتے تھے یہ حدیث سے ثابت ہے۔ گو اس بارے میں دو ضعیف حدیثیں ہیں، ایک حضرت عبداللہ بن عباس کی جسے جبارہ بن مغلس[2] نے اور ایک فاکہ بن سعد کی جسے یوسف بن خالد سمتی[3] نے روایت کی ہے۔ مگر پھر بھی حضرت عبداللہ بن عمر جو سنت کے نہایت سخت متبع تھے نکلنے سے پہلے عید کے دن غسل فرماتے تھے[4]۔

عیدگاہ کے لیے آپ اپنی چھڑی لے کر پیدل نکلتے تھے۔ عیدگاہ میں اس چھڑی کو نصب کر کے سترہ بنا لیتے تھے۔ کیونکہ یہاں اس وقت کوئی عمارت یا چہار دیواری نہ تھی۔ آپ کا چھوٹا نیزہ بھی سترہ کا کام دیتا تھا[5]۔ عید الفطر کی صلوٰۃ کچھ دیر میں اور عید الاضحیٰ کی صلوٰۃ سویرے پڑھتے تھے۔ اتباع سنت کے شدت سے پابند ہونے کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمر طلوع آفتاب سے پیشتر نہ نکلتے تھے اور گھر ہی سے عیدگاہ تک تکبیر کہتے جاتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ پہنچ کر اذان، اقامت اور الصلاۃ جامعۃ کہے بغیر صلوٰۃ شروع کر دیتے تھے[6]۔ صلوٰۃ عید سے پہلے یا بعد میں آپ یا اصحاب عیدگاہ پہنچ کر کوئی اور صلوٰۃ نہیں پڑھتے تھے[7]۔ خطبہ سے پہلے عید کی صلوٰۃ شروع کرتے اور دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت کے اندر افتتاحی تکبیر کے علاوہ مسلسل سات تکبیریں بلند فرماتے، ہر دو تکبیر کے درمیان تھوڑا سکتہ فرماتے۔ تکبیر کے مابین کوئی معین دعا آپ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت

---

[1] مسلم (۲۰۷۷)، (۲۲) فی اللباس : باب النهی عن لبس الرجل الثوب المعصفر۔ نسائی ۸/۲۰۳ فی الزینۃ : باب ذکر النهی عن لبس المعصفر۔

[2] ابن ماجہ (۱۳۱۵) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الاغتسال فی العیدین۔ حدیث یہ ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو غسل فرماتے تھے" جبارہ بن مغلس ضعیف ہے۔ اس کا شیخ حجاج بن تمیم بھی ضعیف ہے۔

[3] ابن ماجہ (۱۳۱٦) یوسف بن خالد سمتی کو کئی ایک نے کاذب کہا ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔

[4] مؤطا امام مالک ۱/۱۷۷ فی العیدین : باب العمل فی غسل العیدین۔ سند صحیح ہے۔ مصنف (۵۷۵۴)۔

[5] بخاری ۲/۳۸٦ فی العیدین : باب حمل العنزۃ او الحربۃ بین یدی الامام یوم العید۔ ابن ماجہ (۱۳۰۴) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الحربۃ یوم العید۔ الفاظ انہی کے ہیں بروایت ابن عمر۔

[6] بخاری ۲/۳۷۵، ۳۷۷۔ مسلم (۸۸٦) (٦) بروایت عطاء عن ابن عباس و جابر بن عبداللہ یہ دونوں فرماتے ہیں کہ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ کو اذان نہیں دی جاتی تھی۔" مسلم (۸۸۷) ابو داؤد (۱۱۴۸) ترمذی (۵۳۲) بروایت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بار بار عیدین کی صلوٰۃ بغیر اذان اور بغیر اقامت کے پڑھی ہے۔"

[7] بخاری ۲/۳۹٦ فی العیدین : باب الصلاۃ قبل العید و بعدها۔ ترمذی (۵۳۷) فی الصلاۃ : باب ماجاء لاصلاۃ قبل العید ولا بعدها۔ نسائی ۳/۱۹۳ فی العیدین : باب الصلاۃ قبل العیدین و بعدها۔ ابن ماجہ (۱۲۹۱) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الصلاۃ قبل صلاۃ العید و بعدها۔ سب کے یہاں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس باب میں ابو سعید خدری اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایتیں بھی آئی ہیں۔

ہے کہ ان کے درمیان اللہ کی حمد وثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جائے گا۔ خلال نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اتباع سنت کی پابندی کے باوجود ہر تکبیر پر رفع یدین فرماتے تھے۔

تکبیر پوری فرما لیتے تو قرأت شروع کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ "ق والقرآن المجید" اور دوسری میں "اقتربت الساعۃ وانشق القمر"[1] اور گاہ دونوں میں "سبح اسم ربك الاعلیٰ" اور "هل اتاك حديث الغاشية"[2] پڑھتے تھے، دونوں ثابت ہے۔ اس کے علاوہ اور سورتوں کا پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ قرأت سے فارغ ہوکر اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے، پہلی رکعت پوری ہوجاتی اور سجدہ سے اٹھتے تو پانچ مسلسل تکبیریں بلند فرماتے۔ تکبیروں کے بعد قرأت شروع کردیتے۔ دونوں رکعتوں میں سب سے پہلے تکبیر ہوتی پھر قرأت سے قریب رکوع ہوتا۔ یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قرأتوں کے درمیان قربت پیدا کی ہے۔ چنانچہ پہلے تکبیر پھر قرأت پھر رکوع اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد تکبیر فرمائی۔ مگر آپ سے یہ ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ سند میں محمد بن معاویہ نیشاپوری ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں، انھیں بہتوں نے کاذب کہا ہے۔

ترمذی نے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف سے روایت کی ہے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے دادا سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات اور دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں بلند فرمائیں[3]۔" ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد یعنی بخاری سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ اس باب میں اس سے صحیح تر کوئی اور حدیث نہیں ہے"۔ یہی میرا بھی قول ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس باب میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن طائفی کی حدیث بھی ہے جسے انھوں نے عمرو بن شعیب سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے اور وہ صحیح ہے۔

میرے خیال میں اس حدیث سے مراد وہ حدیث ہے جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید میں بارہ تکبیریں سات پہلی اور پانچ دوسری رکعت کے اندر بلند فرمائیں۔ اس سے پہلے یا بعد میں اور کوئی صلوٰۃ نہیں پڑھی۔ احمد فرماتے ہیں یہی میرا مسلک ہے۔ مگر مسند میں انہی کثیر بن عبداللہ بن عمرو کی حدیث پر انتہائی سخت تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی حدیث کسی شے کے مساوی نہیں ہے۔ ترمذی اسے گاہ صحیح گاہ حسن قرار دیتے ہیں۔ بخاری نے عمرو بن شعیب کی حدیث کو صحیح قرار دینے کے باوجود صراحت سے کہا ہے کہ یہ حدیث اس باب میں صحیح ترین حدیث ہے اور اسی کو اپنا مسلک بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] مسلم (۸۹۱) فی العیدین : باب ما یقرأ بہ فی صلاۃ العیدین۔ بروایت ابو واقد لیثی۔ نسائی ۳/۱۸۴ فی العیدین: باب القرأۃ فی العید بـ "ق، واقتربت"۔ ترمذی (۵۳۴) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی العیدین۔ ابن ماجہ (۱۲۸۲) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی القرأۃ فی صلاۃ العیدین۔

[2] مسلم (۸۷۸) فی الجمعۃ۔ عبدالرزاق (۵۷۰۶)۔ ترمذی (۵۳۳)۔ نسائی ۳/۱۸۴، ابن ماجہ (۱۲۸۱) بروایت نعمان بن بشیر۔

[3] ترمذی (۵۳۶) فی الصلاۃ : باب التکبیر فی العیدین۔ ابن ماجہ (۱۲۷۹) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی کم یکبر الامام فی صلاۃ العیدین۔ دارقطنی ۱/۱۸۱۔ طحاوی ۲/۳۹۹، بیہقی ۳/۲۸۶ بروایت کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ۔ سند ضعیف ہے، کثیر بن عبداللہ پر کلام کیا گیا ہے، ترمذی نے اسے حسن محض زیادہ شواہد کے پیش نظر قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں حضرت عائشہ سے روایت وارد ہے۔ ابوداؤد (۱۱۴۹)۔ ابن ماجہ (۱۲۸۰) طحاوی ۲/۳۹۹۔ حاکم ۱/۲۹۸۔ دارقطنی ۱/۱۸۱۔ سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہے۔ بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ احمد ۲/۱۸۰۔ ابوداؤد (۱۱۵۱) ابن ماجہ (۱۲۷۸) سند حسن ہے۔ دیکھیے نصب الرایۃ ۲/۲۱۶، ۲۱۹۔

صلوٰۃ سے فارغ ہوکر لوگوں کی جانب رخ کرکے کھڑے ہوجاتے، لوگ اپنی اپنی جگہوں پر صف بصف بیٹھے رہتے۔ آپ لوگوں کو وعظ ونصیحت فرماتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم دیتے، کوئی لشکر تیار کرنا ہوتا تو تیار کرتے، کوئی حکم دینا ہوتا تو دیتے[1]

عیدگاہ میں منبر

یہاں عیدگاہ میں کوئی منبر نہ ہوتا جس پر چڑھ کر آپ خطبہ دیتے۔ مدینہ کا منبر بھی باہر نکالا نہیں جاتا تھا بس زمین پر کھڑے ہوکر خطبہ دیتے حضرت جابر فرماتے ہیں "عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ میں شریک تھا، خطبہ سے پہلے آپ نے بلا اذان اور بلا اقامت صلوٰۃ شروع کی پھر حضرت بلال سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے اور تقویٰ اور طاعت الٰہی کا حکم دیا، لوگوں کو نصیحتیں فرمائیں پھر عورتوں میں آکر وعظ ونصیحت فرمائی" متفق علیہ ہے[2]

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ کو نکل کر عیدگاہ آتے، سب سے پہلے صلوٰۃ شروع کرتے پھر صلوٰۃ کے بعد لوگوں کے روبرو کھڑے ہوجاتے، لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے . . . ." پوری حدیث۔ مسلم نے اس کی روایت کی ہے[3]۔ ابوسعید خدری نے ایک اور روایت میں فرمایا ہے کہ "آپ عید کے دن نکل کر لوگوں کو دو رکعت صلوٰۃ پڑھاتے تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد لوگوں کے سامنے اپنے سواری پر کھڑے ہوتے، لوگ صفوں میں بیٹھے ہوتے، آپ فرماتے صدقہ کرو، چنانچہ سب سے زیادہ عورتیں بالیاں، انگوٹھیاں اور دوسری اشیاء صدقہ کرتیں۔ کسی ضرورت سے آپ لشکر بھیجنا چاہتے اس کا بھی ذکر کرتے، ورنہ واپس ہوجاتے"[4] میرے ذہن میں یہ بات آرہی تھی کہ یہاں وہم ہوگیا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے لیے پیدل نکلتے تھے اور چھڑی آپ کے سامنے ہوتی تھی اور سواری پر خطبہ آپ نے قربانی کے دن منیٰ میں دیا تھا حتیٰ کہ بقی بن مخلد حافظ پر نگاہ پڑی جنھوں نے اس حدیث کا تذکرہ اپنی سند میں ابوبکر بن ابوشیبہ سے فرمایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن نمیر نے، انھوں نے کہا ہم سے داؤد بن قیس نے، انھوں نے کہا ہم سے عیاض بن عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے حدیث بیان کی، انھوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کو باہر نکل کر لوگوں کو دو رکعت صلوٰۃ پڑھاتے تھے پھر سلام پھیر کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے اور فرماتے "صدقہ کرو" سب سے زیادہ عورتیں صدقہ کرتی تھیں۔ آگے پوری حدیث ذکر کی ہے پھر کہا ہے کہ ہم سے ابوبکر بن خلاد نے، انھوں نے کہا ہم سے ابو عامر نے، انھوں نے کہا ہم سے داؤد نے حدیث بیان کی ہے وہ روایت کرتے ہیں عیاض سے اور وہ ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفطر کو نکل کر لوگوں کو صلاۃ پڑھاتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے پھر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے، لوگ

---

[1] بخاری ۲/۴۷۳۔ بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔
[2] بخاری ۲/۴۷۷۔ مسلم (۸۸۵)
[3] (۸۸۹) فی اول صلاۃ العیدین۔
[4] سند صحیح ہے۔ قریب ہی مصنف رجال سند کا تذکرہ کریں گے۔

بیٹھے ہوتے۔ آپ فرماتے "صدقہ کرو" آگے مذکورہ حدیث کا مضمون بیان کیا ہے۔ یہ ابن ماجہ کی سند ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس کی روایت انھوں نے ابو کریب سے، انھوں ابو سامہ سے، انھوں نے داؤد سے کی ہے[۱]۔ غالباً حدیث کے اندر یوں ہے " ثم یقوم علی رجلیہ" (پھر آپ پیروں پر کھڑے ہو جاتے) جیسا کہ جابر کی روایت میں " قام متوکئًا علی بلال" (بلال سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے) آیا ہے مگر حدیث نگار نے " رجلیہ " کو " راحلتہ" غلطی سے لکھ دیا۔ واللہ اعلم۔

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ صلوٰۃ عید الفطر میں شریک ہوا وہ سب خطبہ سے پہلے صلوٰۃ پڑھتے تھے، پھر خطبہ دیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ کے نبی اترے جس وقت لوگوں کو اپنے ہاتھ کے اشارہ سے بیٹھا رہے تھے اس وقت کا منظر میری نگاہوں میں ہے۔ اس کے بعد صفیں چیرتے ہوئے عورتوں کے پاس آئے، ساتھ میں بلال تھے۔ آپ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا (الممتحنۃ: ۱۲)۔

اے نبی! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گی۔

پوری آیت تلاوت فرمائی[۲] آگے پوری حدیث بیان کی ہے۔

نیز صحیحین ہی میں حضرت جابر سے بھی روایت کی ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر صلوٰۃ شروع کی پھر بعد میں لوگوں کو خطبہ دیا، فارغ ہوئے تو اترے اور عورتوں کے پاس آکر انھیں وعظ و تذکیر فرمائی[۳]" پوری حدیث بیان کی۔
ان روایتوں میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ آپ عیدگاہ میں خطبہ منبر یا سواری پر ارشاد فرماتے تھے۔ غالباً اینٹ یا مٹی وغیرہ کا منبر آپ کے لیے یہاں بنایا گیا تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مسجد سے منبر باہر نکالا نہیں جاتا تھا۔ سب سے پہلے مروان بن حکم نے اسے نکالا جس کے خلاف احتجاج کیا گیا اور اینٹ اور مٹی کا منبر سب سے پہلے مدینہ میں مروان کی امارت کے زمانہ میں کثیر بن صلت نے بنایا۔ جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے[۴]۔
اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں کسی بلند جگہ یا کسی دکان پر کھڑے ہوتے رہے ہوں جسے "مصطبۃ"

---

[۱] ابن ماجہ (۱۲۸۸) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی الخطبۃ فی العیدین۔ سند صحیح ہے۔ مسند ۳/ ۳۶ و ۴۲ و ۵۴۔ مصنف (۵۶۳۴) سنن بیہقی ۳/ ۲۹۷۔

[۲] بخاری ۲/ ۳۸۸، ۳۸۹ فی العیدین: باب موعظۃ الامام النساء یوم العید۔ مسلم (۸۸۴) فی العیدین: باب صلاۃ العیدین۔ ابوداؤد ایضًا (۱۱۴۳) و (۱۱۴۴) فی الصلاۃ: باب الخطبۃ یوم العید۔ نسائی ۳/ ۱۸۴ فی العیدین: باب الخطبۃ فی العیدین بعد الصلاۃ۔ ابن ماجہ (۱۲۷۳) فی اقامۃ الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ العیدین بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

[۳] بخاری ۲/ ۳۸۸۔ مسلم (۸۸۵)۔ ابوداؤد (۱۱۴۱) بروایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

[۴] بخاری ۲/ ۳۷۴ فی العیدین: باب الخروج الی المصلی بغیر منبر۔ مسلم (۸۸۹) فی العیدین: باب صلاۃ العیدین۔ ابوداؤد ایضًا (۱۱۴۰) فی الصلاۃ: باب الخطبۃ یوم العید۔ ابن ماجہ (۱۲۷۵) فی اقامۃ الصلاۃ، باب ماجاء فی صلاۃ العیدین۔ بروایت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ۔ کثیر بن صلت بن معدی کرب کندی خطوط نویسی پر مامور عبدالملک بن مروان کا کاتب تھا۔

(چبوترہ) کہتے ہیں پھر اس سے اتر کر عورتوں میں خطبہ دیتے اور انھیں وعظ و نصیحت فرماتے۔ واللہ اعلم۔

تمام خطبے آپ الحمد للہ سے شروع فرماتے تھے۔ کسی حدیث سے بھی یہ ثابت نہیں کہ عیدین کے خطبے آپ تکبیر سے شروع کرتے تھے۔ سنن ابن ماجہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن سعد القرظ سے روایت ہے کہ آپ خطبہ کے بیچ میں تکبیر زیادہ کہتے تھے اور عیدین کے خطبوں میں خصوصیت سے تکبیریں زیادہ کہتے[۱] مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ خطبہ کا اسی تکبیر سے افتتاح بھی فرماتے تھے۔

عیدین اور استسقاء کے خطبوں کے افتتاح میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ دونوں کا افتتاح تکبیر سے کیا جائے گا۔ ایک قول کے مطابق استسقاء کا خطبہ استغفار سے شروع کیا جائے گا اور ایک قول کے مطابق دونوں خطبے حمد سے شروع کیے جائیں گے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں صحیح یہی ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اہمیت کا جو کام حمد الہٰی سے شروع نہ کیا جائے وہ نامکمل ہوگا"۔[۲]

عید میں آنے والے لوگوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے کہ وہ بیٹھ کر خطبہ سماعت کریں یا چلے جائیں اور یہ رخصت بھی دی ہے کہ جمعہ کے دن عید پڑ جائے تو صلوٰۃ عید پر اکتفا کرتے ہوئے جمعہ میں شریک نہ ہوں۔[۳] عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنے جانے میں راستہ بدل دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک راہ تشریف لے جاتے اور دوسری راہ واپس ہوتے۔[۴] اس کی کیا حکمت تھی۔ ایک خیال یہ ہے کہ دونوں راستوں کے لوگوں کو سلام ہو جائے۔ ایک یہ ہے کہ دونوں راستوں کے لوگ آپ کی برکت سے مالا مال ہوں۔ ایک یہ ہے کہ ان دونوں راہوں میں ضرورتمندوں کی ضرورت پوری فرما سکیں۔ ایک یہ ہے کہ تمام اطراف میں شعائر اسلامی کا اظہار ہو سکے۔ ایک یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں

۱۔ ابن ماجہ (۱۲۸۷) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فی الخطبۃ فی العیدین۔ سند میں عبدالرحمٰن بن سعد بن عمار بن سعد مؤذن ضعیف ہے اور سعد بن عمار مجہول ہے۔

۲۔ مسند احمد (۸۶۹۷) ابوداؤد (۴۸۴۰) فی الادب : باب الھدی فی الکلام۔ ابن ماجہ (۱۸۹۴) فی النکاح : باب خطبۃ النکاح۔ صحیح ابن حبان ۱/۱۳۵، تحقیق احمد شاکر۔ سند میں قرہ بن عبدالرحمٰن معافری کو احمد نے بے حد منکر الحدیث کہا ہے، ابن معین کے مطابق یہ ضعیف ہے۔ بروایت قرہ اس کی تخریج کرتے ہوئے ابوداؤد نے کہا ہے کہ اس کی روایت یونس، عقیل، شعیب اور سعید بن عبدالعزیز نے زہری سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً کی ہے۔ بایں ہمہ ابن صلاح اور نووی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

۳۔ ابوداؤد (۱۰۷۳) فی الصلاۃ : باب اذا وافق یوم الجمعۃ یوم عید۔ ابن ماجہ (۱۳۱۱) فی اقامۃ الصلاۃ : باب ماجاء فیما اذا اجتمع العیدان فی یوم بروایت ابوھریرۃ۔ آپ کا ارشاد "آج اس دن دو عیدیں جمع ہو گئی ہیں جو چاہے جمعہ نہ پڑھے ہم تو پڑھیں گے"۔ سند حسن ہے۔ الزوائد میں بوصیری نے اسے صحیح کہا ہے۔ اس باب میں احمد ۴/۳۷۲۔ ابوداؤد (۱۰۷۰)، نسائی ۳/۱۹۴۔ ابن ماجہ (۱۳۱۰) کے اندر زید بن ارقم سے روایت آئی ہے۔ سند میں ایاس بن ابورملہ شامی کو ابن حبان کے علاوہ اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔ ابن ماجہ (۱۳۱۲) میں ایک روایت حضرت ابن عمر سے وارد ہے۔ سند ضعیف ہے۔ المغنی ۲/۳۵۸ میں ابن قدامہ مقدسی نے کہا ہے کہ جمعہ کے دن اتفاقاً عید آجائے تو امام کے سوا عید کی صلوٰۃ میں حاضر ہونے والے ہر شخص سے جمعہ کی حاضری ساقط ہو جاتی ہے۔ امام اس لیے مستثنیٰ ہے کہ اسے جمعہ پڑھانا ہوتا ہے۔ البتہ اگر جمعہ پڑھنے والے نہ ہوں تو جمعہ کی حاضری اس سے بھی ساقط ہو جائے گی۔ امام پر جمعہ کے واجب ہونے کے باب میں دو روایتیں ہیں۔ ساقط ہونے کے قائل شعبی، نخعی اور اوزاعی ہیں۔ یہی مذہب حضرت عمر، عثمان، علی، سعید، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کا بھی کہا جاتا ہے۔ مگر اکثر فقہاء واجب ہونے کے قائل ہیں۔

۴۔ بخاری ۲/۳۹۲ فی العیدین : باب من خالف الطریق اذا رجع یوم العید۔ بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔ حدیث یہ ہے "عید کا دن ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم راستہ بدل کر چلتے تھے"۔ ترمذی (۵۴۱) ابن ماجہ (۱۳۰۱) بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ابوداؤد (۱۱۵۶) ابن ماجہ ایضاً (۱۲۹۹) بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ۔ ابن ماجہ (۱۳۰۰) بروایت ابو رافع رضی اللہ عنہ۔

کی عزت وشوکت اور شعائر اسلامی کا نظارہ کرکے منافقین حسرتوں کے سمندر میں غرق ہوسکیں۔ ایک یہ ہے کہ زمین کے زیادہ سے زیادہ حصے شاہد ہوسکیں کیونکہ مسجد اور عیدگاہ کو جانے والے کا ایک قدم ایک درجہ بلند کرتا ہے اور دوسرا ایک گناہ مٹاتا ہے حتی کہ وہ گھر واپس آجاتا ہے۔ ایک یہ ہے اور یہی صحیح تر بھی ہے کہ آپ کا یہ عمل مذکورہ بالا مصالح اور ان کے علاوہ دوسرے ان مصالح کی وجہ سے تھا جو آپ کے فعل میں ملحوظ رہتے تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ عرفہ کے دن صلوٰۃ فجر سے لے کر آخری ایام تشریق کی عصر تک آپ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد[1] کی تکبیر بلند فرماتے تھے۔

صلوٰۃ کسوف کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

سورج گرہن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا کر تیزی سے ردا گھسیٹتے ہوئے مسجد پہنچے۔ گرہن اس وقت لگا تھا جب سورج طلوع ہوکر بقدر دو یا تین نیزے بلند ہوا تھا۔ آپ نے آگے بڑھ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور ایک لمبی سورۃ جہری قرأت فرماتے ہوئے پڑھی پھر رکوع میں گئے اور دیر تک اس حالت میں رہے۔ پھر رکوع سے سر اٹھایا اور دیر تک قیام کی حالت میں رہے مگر پہلے قیام کے مقابلہ میں یہ قیام ذرا مختصر رہا۔ سر اٹھاتے ہوئے "سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد" کہا پھر قرأت شروع کی، پھر رکوع میں گئے اور دیر تک اسی حالت میں رہے مگر یہ رکوع پہلے رکوع کے مقابلہ میں مختصر رہا۔ پھر رکوع سے سر اٹھایا، پھر ایک لمبا سجدہ کیا اور دیر تک اسی سجدہ کی حالت میں رہے پھر ایسا ہی دوسری رکعت کے اندر بھی کیا۔ اس طرح ہر رکعت کے اندر دو رکوع اور دو سجدے رہے۔ دو رکعتوں میں آپ نے چار رکوع اور چار سجدے ادا کیے۔

سورج گرہن کی اسی صلوٰۃ میں آپ نے جنت اور جہنم کا مشاہدہ فرمایا۔ جنت سے ایک گچھا توڑ کر دکھانے کا ارادہ بھی فرمایا، دوزخیوں کو دوزخ کے اندر دیکھا۔ ایک عورت کو دیکھا کہ ایک بلی اسے پنجہ مار رہی ہے جسے اس نے باندھ رکھا تھا اور بھوکی پیاسی رہ کر وہ مرگئی تھی۔ عمرو بن مالک کو جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے دین ابراہیمی میں تبدیلی پیدا کی تھی۔ جہنم میں حاجیوں کے چور کو عذاب پاتے ہوئے دیکھا پھر سلام پھیرا اور ایک انتہائی مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کے حسب ذیل فقرے محفوظ ہیں:

"شمس و قمر اللہ کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت یا زندگی پر ان میں گہن نہیں لگتا۔ جب گہن دیکھو تو اللہ

---

[1] ابن ابی شیبہ ابوالاحوص سے، وہ ابواسحاق سے وہ ابوالاسود سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود عرفہ کے دن فجر کی صلوٰۃ سے قربانی کے دن صلوٰۃ عصر تک تکبیر کہتے تھے اور تکبیر یں "اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" پڑھتے تھے۔ راوی اس کے ثقہ ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے حسین بن علی سے بھی روایت کی ہے وہ زائدہ سے، وہ عاصم سے، وہ شقیق سے، وہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ عرفہ کے دن صلوٰۃ فجر کے بعد آخر ایام تشریق کی صلوٰۃ عصر تک تکبیر بلند کرتے تھے۔ سند صحیح ہے۔ المستدرک ۲۹۹/۱ میں حاکم نے کہا ہے کہ حضرت عمر، علی، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود کا جہاں تک تعلق ہے ان کے بارے میں یہ صحیح ہے کہ وہ عرفہ کی صبح سے آخر ایام تشریق تک تکبیر بلند کرتے تھے۔ سنن دارقطنی (۱۸۲) میں حضرت ابن عمر، ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور عثمان بن عفان سے متعدد سندوں سے آیا ہے کہ قربانی کے دن ظہر کی صلوٰۃ کے بعد آخر ایام تشریق کی صلوٰۃ ظہر تک یہ سب حضرات تکبیر بلند کرتے تھے۔

سے دعا کرو، تکبیر بلند کرو، صلوٰۃ پڑھو اور صدقہ کرو۔ اے محمد کی امت! اللہ کی قسم کوئی غلام یا کوئی لونڈی زنا کرتی ہے تو اللہ سے زیادہ کسی کو غیرت نہیں آتی۔ اے محمد کی امت! اللہ کی قسم اگر تمھیں وہ معلوم ہو جو مجھے معلوم ہے تو ہنسو کم اور روؤ زیادہ" فرمایا "اس جگہ میں نے وہ تمام چیزیں دیکھ لی ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ تم نے مجھے جس وقت آگے بڑھتے دیکھا اس وقت ارادہ کر رہا تھا کہ جنت کا ایک خوشہ لے لوں اور جس وقت تم نے مجھے دیکھا کہ پیچھے ہٹ رہا ہوں تو اس وقت جہنم کو ایک دوسرے سے پاش پاش ہوتے دیکھ رہا تھا۔"

دوسرے الفاظ میں یوں ہے:

"جہنم دیکھی اس سے زیادہ بھیانک منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ جہنم میں زیادہ تر عورتیں نظر آئیں"۔ لوگوں نے پوچھا "رسول اللہ! ایسا کیوں؟" فرمایا "ان کی نافرمانی کی وجہ سے"۔ پوچھا گیا "کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں"؟ فرمایا "شوہر کی ناشکری کرتی اور احسان پر پردہ ڈالتی ہیں، زمانہ بھر ان میں سے کسی کے ساتھ احسان کرتے رہو مگر اسے کسی وقت تمھاری طرف سے کوئی ناپسندیدہ چیز نظر آجائے تو وہ یہی کہے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی"۔ آپ نے اسی خطبے میں یہ بھی فرمایا:

"مجھے بذریعہ وحی خبر ملی ہے کہ قبروں میں تم قریب قریب دجالی فتنہ کے برابر فتنہ میں ڈالے جاؤ گے۔ ہر ایک شخص پیش ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ اس شخص کو کیسا جانتے ہو؟ پس اگر مومن رہا تو جواب دے گا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے، چنانچہ ہم نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا۔ اس سے کہا جائے گا آرام سے سو جاؤ ہمیں معلوم ہو گیا کہ تم مومن تھے۔ اور اگر منافق رہا تو جواب دے گا مجھے نہیں معلوم، لوگوں کو کچھ کہتے سنا تو میں نے بھی کہہ دیا"۔[1]

احمد ابن حنبل کی ایک دوسری سند میں آیا ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد حمد وثنا اور لا الٰہ الا اللہ ومحمد عبدہ ورسولہ کی شہادت کے بعد فرمایا:

"لوگو! اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اگر تمھارے علم میں میں نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں کچھ بھی کوتاہی کی ہو تو اسے مجھے بتا دو"۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغام

---

[1] بخاری ۲/۴۳۸، ۴۳۹ فی الکسوف: باب الصدقۃ فی الکسوف و باب خطبۃ الامام فی الکسوف و باب ہل یقول: کشف الشمس او خسفت، و باب لا تنکسف الشمس لموت احد ولا لحیاتہ و باب الجہر فی القرأۃ فی الکسوف۔ مسلم (۹۰۱) فی الکسوف: باب صلاۃ الکسوف و (۹۰۳) مؤطا ۱/۱۸۶، ۱۸۷ بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ بخاری ۲/۴۴۷ فی الکسوف: باب صلاۃ الکسوف جماعۃ، وفی الایمان: باب کفران العشیر، وکفر دون کفر۔ وفی المساجد: باب من صلی وقدامہ تنور او نار.. وفی صفۃ الصلاۃ: باب رفع البصر الی الامام فی الصلاۃ، وفی بدء الخلق: باب صفۃ الشمس والقمر، وفی النکاح: باب کفران العشیر۔ مسلم (۹۰۷) فی الکسوف: باب ما عرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلاۃ الکسوف۔ مؤطا ۱/۱۸۶، ۱۸۷ بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ مسلم (۹۰۴) بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ۔ بخاری ۱/۲۵۱ فی الوضوء: باب من لم یتوضأ الا من الغشی المثقل۔ مسلم (۹۰۵) مؤطا ۱/۱۸۸، ۱۸۹ بروایت حضرت اسماء رضی اللہ عنہا۔

پہنچائے اور امت کے حق میں خیر خواہی فرمائی اور اس حق کو ادا فرمایا جو آپ پر عائد ہوا تھا"، اس کے بعد آپ نے فرمایا: "امابعد! کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آفتاب اور ماہتاب میں یہ جو گہن لگتا ہے اور تارے جو اپنے مطلعوں سے زائل ہو جاتے ہیں وہ دنیا کے عظیم انسانوں کی موت پر ہوتا ہے وہ جھوٹے ہیں۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن سے اللہ کے بندے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ کون تائب ہوتا ہے۔ واللہ، جب سے صلوٰۃ پڑھنی شروع کی اس وقت سے میری نگاہوں کے سامنے ان چیزوں کی تصویریں گھوم رہی تھیں جو تمہیں دنیا و آخرت میں پیش آنے والی ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ جب تک تیس دجال ظاہر نہ ہو جائیں قیامت نہ آئے گی ان میں آخری کانا دجال ہوگا، اس کی بائیں آنکھ اس طرح غائب ہوگی جس طرح ابو تحیی کی آنکھ۔ تحیی انصار کا ایک بوڑھا تھا جو اس وقت موجود تھا۔ یہ جب بھی ظاہر ہوگا خود کو اللہ تصور کرے گا، جو بھی اس پر ایمان لائے گا، اس کی تصدیق اور اتباع کرے گا اس کا کوئی بھی پچھلا نیک کام اس کے کام نہ آئے گا اور جو اس کا انکار کرے گا، اس کی تکذیب اور نافرمانی کرے گا، اس کے کسی بھی پچھلے بدکام کی سزا اسے نہ ملے گی۔ وہ سوائے حرم اور بیت المقدس کے تمام روئے ارض پر نمودار ہوگا۔ وہ اصحاب ایمان کو بیت المقدس میں محصور کر دے گا۔ یہاں وہ انتہائی سخت مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے لشکر کو اس طرح تباہ کرے گا کہ دیوار کی بنیاد اور درخت کی جڑ بھی پکار کر کہے گی کہ "اے مسلمان! اے مومن! یہ رہا یہودی یا یہ رہا کافر آؤ اسے قتل کرو"۔ آپ نے فرمایا کہ یہ صورت اس وقت پیش آئے گی جب ایسے حادثے پیش آچکے ہوں گے جنہیں تم بڑی اہمیت دو گے اور آپس میں دریافت کرو گے کہ کیا نبی نے ان کا کچھ تذکرہ فرمایا ہے؟ پہاڑ اپنی جگہوں سے ہٹ جائیں گے پھر اس کے بعد قبض ہوگا۔[1]

صلوٰۃ کسوف میں رکوع کی تعداد

صلوٰۃ کسوف اور اس کا خطبہ کیسا ہوتا تھا۔ یہی آپ سے ثابت ہے، روایت ہے کہ آپ نے یہ صلوٰۃ اور طریقوں پر بھی ادا فرمائی ہے۔ ایک طریقہ پر آپ نے ہر رکعت کے اندر تین رکوع[2]، دوسرے طریقہ پر ہر رکعت کے اندر چار رکوع[3] ادا کیے۔ ایک اور طریقہ پر آپ نے تمام صلوات کی طرح ہر رکعت ایک رکوع کے ساتھ ادا کی۔ مگر امام احمد، بخاری اور شافعی جیسے ائمہ عظام اسے صحیح قرار نہیں دیتے بلکہ اسے غلط مانتے ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایک سائل نے ان سے سوال کرتے ہوئے کہا "بعض راویوں نے روایت کی ہے کہ

۱۔ احمد ۵/۱۶ سند میں ثعلبہ بن عباد عبدی کو ابن حبان کے سوا کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔ ابوداؤد (۱۱۸۴) مختصراً۔ نسائی ۳/۱۴۰۔

۲۔ مسلم (۹۰۱) فی الکسوف: باب صلاۃ الکسوف۔ ابوداؤد (۱۱۷۷) فی الصلاۃ: باب صلاۃ الکسوف۔ نسائی ۳/۱۲۹، ۱۳۰ فی الکسوف: باب نوع آخر من صلاۃ الکسوف بروایت عبید بن عمیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

۳۔ مسلم (۹۰۸) و (۹۰۹) فی الکسوف: باب ما عرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلاۃ الکسوف۔ ابوداؤد (۱۱۸۳) فی الصلاۃ: باب من قال اربع رکعات فی صلاۃ الکسوف۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر رکعت کے اندر تین رکوع کیے ہیں"۔ میں نے اس سے پوچھا "تم بھی اسی کے قائل ہو؟" اس نے کہا "نہیں"، مگر آپ اس کے قائل کیوں نہیں ہیں، آپ جو حدیث ذکر کرتے ہیں یعنی جس حدیث میں ہر رکعت کے اندر دو رکوع کی بات ہے اس پر یہ مزید اضافہ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ ایک اعتبار سے منقطع ہے اور جس منقطع حدیث میں کسی خاص پہلو کا الگ سے ذکر ہوتا ہے ہم اسے ثابت نہیں مانتے اور ایک اعتبار سے واللہ اعلم ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ منقطع سے شافعی کی مراد عبید بن عمیر کا یہ قول ہے "مجھ سے اس نے حدیث بیان کی جسے میں سچا سمجھتا ہوں"۔ عطاء فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی مراد عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔ آگے پوری حدیث ہے۔ اس میں آیا ہے کہ آپ نے ہر رکعت کے اندر تین رکوع اور چار سجدے کیے[1]۔ قتادہ نے عطاء سے، انھوں نے عبید بن عمیر سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے "چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ"[2]۔ عطاء نے حضرت عائشہ سے روایت محض ظن و تخمین کی بنیاد پر کیا ہے یقین کے ساتھ نہیں۔ آخر حضرت عائشہ سے کیسے ثابت ہو سکتا ہے جب کہ عروہ اور عمرہ کی روایتوں کے مطابق خود ان سے اس کے برعکس ثابت ہے[3]۔ عروہ اور عمرہ دونوں کو حضرت عائشہ سے عبید بن عمیر کے مقابلہ میں خاص خصوصیت حاصل ہے، پھر وہ دو ہیں اور عبید ایک۔ لہٰذا ان دونوں کی روایتیں ہی ثابت مانی جائیں گی۔

بیہقی فرماتے ہیں شافعی ایک پہلو سے جو اسے غلط کہتے ہیں تو میرے خیال میں یہ عطاء کی وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس دن ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، سورج میں گہن لگا تو لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کی موت پر سورج کو گہن لگا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر لوگوں کو چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ پڑھایا"۔ آگے پوری حدیث۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا جو واقعہ ہے اور ابو زبیر کی حدیث کے اندر جو واقعہ بیان ہوا ہے دونوں پر غور کرنے کے بعد دونوں ایک ہی واقعہ معلوم ہوتے ہیں۔ جس صلوٰۃ کی خبر دی گئی ہے۔ اصل میں اسے آپ نے ایک ہی بار پڑھی ہے اور اس دن پڑھی ہے جس دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کا انتقال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پھر اس کے بعد عبد الملک یعنی ابن ابی سلیمان کے جو عطاء سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں اور ہشام دستوائی کے درمیان جو ابو زبیر سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ ہر رکعت کے اندر رکوع کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ ہشام کی روایت ہمیں اولیٰ نظر آئی جس کے مطابق ہر رکعت کے اندر صرف دو رکوع آپ نے ادا فرمائے۔ کیونکہ ابو زبیر کے ساتھ مل کر یہ عبد الملک سے زیادہ قوی ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ان کی روایت کے مطابق رکوع کی جو تعداد ہے وہ عروہ اور عمرہ بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا اور کثیر بن عباس، عطاء بن یسار بروایت ابن عباس اور ابو سلمہ بروایت عبد اللہ بن عمرو اور یحییٰ بن سلیم وغیرہ کی روایتوں کے عین مطابق ہے۔

اور عبد الملک نے عطاء سے جو روایت کی ہے اس کے خلاف ابن جریج اور قتادہ نے عطاء عن عبید بن عمیر چار سجدوں میں چھ رکوع کی روایت کی ہے۔ لہٰذا ہشام کی روایت جو ابو زبیر بروایت جابر ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک کثیر تعداد اس کے موافق ہے عطاء کی ان دونوں روایتوں سے افضل و اولیٰ ہے جس میں ایک کی سند میں وہم ہے اور دوسری میں ان سے روایت کرتے ہوئے عبد الملک بن ابی سلیمان منفرد ہو جاتے ہیں اور یہ عبد الملک وہ شخص

۱۔ قریب ہی اس کی تخریج گذر چکی ہے۔
۲۔ تخریج گذر چکی ہے۔
۳۔ تخریج گذر چکی ہے۔
۴۔ تخریج گذر چکی ہے۔

ہیں کہ کئی حدیثوں کے اندر ان کی غلطی پکڑی گئی ہے۔

فرماتے ہیں کہ حبیب بن ابی ثابت کی حدیث جو طاؤس سے بروایت ابن عباس مروی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف پڑھی چنانچہ قرأت فرمائی پھر رکوع کیا پھر قرأت کی پھر رکوع کیا"۔ اور دوسری اسی جیسی روایت مسلم نے اپنی صحیح[1] کے اندر کی ہے تو واضح رہے کہ حبیب بن ابی ثابت ان روایتوں میں منفرد ہیں اور گو ثقہ ہیں مگر تدلیس سے کام لیتے تھے۔ پھر طاؤس سے ان کا سماع واضح بھی نہیں ہے۔ لہٰذا شبہ ہے کہ انھوں نے یہ حدیث غیر ثقہ سے لی ہو۔ اس کے متن اور مرفوع ہونے میں سلیمان کی احول نے ان کی مخالفت کی ہے چنانچہ اس کی روایت طاؤس سے، انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کی ہے جس میں ایک رکعت کے اندر تین رکوع کو حضرت ابن عباس کا عمل بیان کیا ہے۔ رکوع کی تعداد میں سلیمان کی بھی مخالفت کی گئی ہے چنانچہ ایک جماعت حضرت ابن عباس سے ان کا فعل ویسا ہی روایت کرتی ہے جیسا کہ عطاء بن یسار وغیرہ نے ان سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ یعنی ہر رکعت کے اندر دو رکوع۔ فرماتے ہیں کہ محمد بن اسماعیل بخاری نے ان تینوں روایتوں سے اعراض کیا ہے چنانچہ کسی بھی روایت کی تخریج انھوں نے صحیح کے اندر نہیں کی ہے کیونکہ یہ تینوں روایتیں اس روایت کے مخالف ہیں جو سند کے اعتبار سے صحیح تر، تعداد رواۃ کے اعتبار سے زیادہ اور رجال کے اعتبار سے زیادہ معتبر ہے۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے آپ سے جو روایت کی ہے اس کے بارے میں بخاری فرماتے ہیں کہ "صلوٰۃ کسوف کے بارے میں سب سے صحیح روایت میرے نزدیک "چار سجدوں میں چار رکوع" والی ہے"۔

بیہقی فرماتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ہر رکعت میں چار رکوع ہوتے تھے۔ مگر اس کی سند ضعیف[2] ہے۔ حضرت ابی بن کعب سے مرفوعاً روایت ہر رکعت کے اندر پانچ رکوعوں کی ہے[3]۔ ان کی حدیث کی جو سند ہے صاحبین نے اس طرح کی سند سے احتجاج نہیں کیا ہے۔

فرماتے ہیں اہل الحدیث کی ایک جماعت نے تعداد رکعات کے بارے میں وارد شدہ روایات کو صحیح قرار دیا ہے اور اسے اس حقیقت پر محمول کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صلوٰۃ بار بار پڑھی ہے۔ یہ ساری صورتیں جائز ہیں۔ یہ مذہب اسحاق بن راہویہ، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، ابو بکر بن اسحاق ضبعی اور ابو سلیمان خطابی کا ہے۔ اسے ابن منذر نے مستحسن قرار دیا ہے مگر بخاری اور شافعی نے احادیث کو ترجیح دینے کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اولیٰ و افضل ہے کیونکہ ایسی صورت میں تمام حدیثیں آپ کی اس صلوٰۃ سے متعلق ہو جاتی ہیں جس دن آپ کے صاحبزادہ نے وفات پائی۔

جہاں تک احمد بن حنبل کا تعلق ہے ان سے منصوص یہ ہے کہ وہ تنہا حضرت عائشہ کی حدیث اختیار کرتے ہیں جس میں ہر رکعت کے اندر دو رکوع اور دو سجدوں کا تذکرہ ہے۔ مروزی کی روایت کے مطابق فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ کسوف کے بارے میں میرا مذہب چار رکوعوں اور چار سجدوں کا ہے۔ ہر رکعت کے اندر دو رکوع اور دو سجدے۔ اس سلسلہ میں پیش نظر حضرت عائشہ کی حدیث ہے۔ اکثر احادیث اسی کے مطابق ہیں۔ یہی ابو بکر اور اصحاب قدیم کا بھی مذہب ہے۔ یہی ہمارے شیخ ابو العباس ابن تیمیہ کا بھی مذہب مختار ہے۔ ابن تیمیہ ہر اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے تھے جو اس مذہب کے مخالف ہوتی تھی اور فرماتے تھے کہ یہ غلط ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف صرف ایک بار پڑھی ہے اور اس دن

---

[1]۔ رقم (۹۰۹)

[2]۔ سنن کبریٰ للبیہقی ۳/۳۵۹۔ مجمع الزوائد ۲/۲۰۸ میں ہیثمی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ بزار نے اس کی روایت کی ہے۔ سند میں محمد بن ابی لیلیٰ ہیں جن پر کلام کیا گیا ہے۔ التقریب میں حافظ نے انھیں صدوق مگر بے حد سیئ الحفظ قرار دیا ہے۔

[3]۔ ابوداؤد (۱۱۸۲) فی الصلاۃ: باب من قال اربع رکعات۔ سند میں ابو جعفر رازی ضعیف ہے۔

پڑھی ہے جس دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کی وفات ہوئی۔ واللہ اعلم۔
آپ نے کسوف کے موقعہ پر ذکر و دعا، صدقہ، استغفار اور غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

صلوٰۃ استسقاء کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ

صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے لیے متعدد طریقوں سے دعا مانگی ہے۔

۱۔ جمعہ کے دن منبر پر اثنائے خطبہ آپ نے پانی کے لیے دعا کی۔
"اَللّٰهُمَّ اَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ اَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا، اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا"[1]
اے اللہ! ہم پر بارش فرما، اے اللہ! ہم پر بارش فرما، اے اللہ! ہمیں پانی دے، اے اللہ! ہمیں پانی دے۔

۲۔ آپ نے لوگوں سے ایک خاص دن کا تعین فرمایا کہ اس دن باہر عیدگاہ چلیں گے۔ چنانچہ اس دن طلوع آفتاب کے بعد نہایت تواضع، انکساری اور خشوع وخضوع کے ساتھ نکلے[2] عیدگاہ پہنچ کر منبر پر چڑھے (بشرطیکہ ثابت ہو، کیونکہ اس طرف سے دل میں کچھ کھٹک ہے) اللہ کی حمد وثناء اور اس کی کبریائی بیان فرمائی۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ دیا اور جو دعا فرمائی اس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ تَفْعَلُ مَا تُرِيْدُ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ، اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَهٗ عَلَيْنَا قُوَّةً لَنَا وَبَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ"۔
تمام تعریف اللہ رب العالمین کے لیے جو رحمٰن ورحیم ہے، جزا کے دن کا مالک ہے، سوائے اللہ کے کوئی الٰہ نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اے اللہ! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو جو چاہتا ہے کرتا ہے، اے اللہ! تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو غنی اور ہم محتاج ہیں، ہم پر بارش نازل فرما اور جو نازل فرما اسے ہمارے لیے ایک حد تک قوت وسہارا بنا۔
اس کے بعد آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انتہائی عجز وخاکساری سے دعا فرمائی۔ ہاتھوں کو اتنا اوپر اٹھایا کہ بغل کی

۱۔ بخاری ۲/۴۱۷ و ۴۲۱، ۴۲۳۔ مسلم (۸۹۷) فی الاستسقاء: باب الدعاء فی الاستسقاء۔ نسائی ۳/۱۶۰، ۱۶۱ فی الاستسقاء: باب ذکر الدعاء بروایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

۲۔ ابوداؤد (۱۱۶۵) فی الصلاۃ: باب جماع ابواب صلاۃ الاستسقاء۔ ابن ماجہ (۱۲۶۶) طحاوی ۱/۱۹۱، ۱۹۲۔ نسائی ۳/۱۵۶ فی الاستسقاء: باب الحال التی یستحب للامام إن یکون علیہا اذا خرج۔ ترمذی (۵۵۸) فی الصلاۃ: باب ماجاء فی صلاۃ الاستسقاء۔ سند حسن ہے، ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ ابن خزیمہ (۱۴۰۵) و (۱۴۰۸) اور ابن حبان (۶۰۳) نے اسے بروایت ابن عباس صحیح قرار دیا ہے۔

۳۔ ابوداؤد نے لمبی حدیث اور اسی جیسی (۱۱۷۳) میں بروایت حضرت عائشہ بیان کی ہے۔ سند میں یونس بن یزید ایلی کو التقریب میں ثقہ کہا گیا ہے مگر زہری کے علاوہ کسی سے ان کی روایت ہوتی ہے تو غلط ہوتی ہے اور یہ ایسی ہی روایتوں میں سے ہے پھر بھی ابن حبان (۶۰۴) اور حاکم ۱/۳۲۶ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے حاکم کی تائید کی ہے۔ ابوداؤد نے کہا ہے کہ حدیث غریب ہے مگر سند جید ہے۔ اس کے بعض حصہ کی روایت حاکم ۱/۳۲۶، دارقطنی ۲/۶۶ نے بروایت ابن عباس کی ہے۔ سند میں محمد بن عبدالعزیز کو بخاری نے منکر الحدیث، نسائی نے متروک الحدیث اور ابوحاتم نے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ ابوعبدالعزیز مجہول الحال ہے۔ صحیح بخاری ۲/۴۱۵ میں بروایت عبداللہ بن زید وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مصلیٰ پر تشریف لائے، بارش کے لیے دعا کی۔ چنانچہ قبلہ رو ہوئے، چادر الٹی اور دو رکعت صلوٰۃ ادا کی۔

سفیدی ظاہر ہوگئی۔ پھر لوگوں کی جانب پشت کرکے اور قبلہ رو ہوکر چادر پلٹ دی۔ داہنا حصہ بائیں جانب اور بایاں حصہ دائیں جانب۔ نیز بیرونی کو اندرونی اور اندرونی کو بیرونی کر دیا۔ چادر کیا تھی سیاہ کملی تھی۔ آپ اور صحابہ سبھی قبلہ رو ہوکر دعا کرنے لگے۔ پھر منبر سے اتر کر عید کی طرح بغیر اذان، بغیر اقامت اور بغیر کسی پکار کے دو رکعت صلوٰۃ پڑھائی۔ دونوں میں قرأت بآواز بلند فرمائی۔ پہلی میں سورہ فاتحہ کے بعد "سبح اسم ربّك الاعلیٰ" اور دوسری میں "هل اتاك حديث الغاشية" پڑھی۔

۳۔ مدینہ کے منبر پر جمعہ کے علاوہ ایک دن بارش کے لیے دعا فرمائی۔ اس استسقاء میں صلوٰۃ کا ثبوت نہیں ملتا[1]

۴۔ مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھائے اور پانی کے لیے دعا مانگی۔ اس وقت جو دعا فرمائی اس کے الفاظ حسب ذیل محفوظ ہیں۔

اللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُغِيثًا مَرِيعًا طَبَقًا عَاجِلًا غَيْرَ رَائِثٍ، نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ[2]

اے اللہ! ہمیں عام بارش عطا فرما جو سبزہ اگا دے، عمومی ہو، جلد ہو دیر میں نہ ہو، مفید ہو، نقصان دہ نہ ہو۔

۵۔ آپ نے مقام زوراء سے قریب احجار الزیت کے پاس بارش کی دعا فرمائی۔ یہ جگہ مسجد کے اس دروازہ کے باہر واقع ہے جو آج باب السلام کہا جاتا ہے۔ مسجد سے نکلتے ہوئے دائیں جانب اتنی دوری پر کہ پتھر پھینکنے والے کا پتھر پہنچ سکے[3]

۶۔ آپ نے بعض غزوات میں بھی بارش کی دعا فرمائی۔ مشرکین نے جب بڑھ کر پانی پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو سخت پیاس لگی تو انھوں نے آپ سے اس کی شکایت کی۔ بعض منافقوں نے کہا اگر یہ نبی ہوتے تو موسیٰ کی طرح اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کرتے۔ آپ نے یہ بات سنی تو پوچھا "ایسا کہا ہے انھوں نے؟ امید ہے اللہ تعالیٰ جلد بارش نازل فرمائے گا"۔ اس کے بعد آپ نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ دعا سے ہاتھ سمیٹا ہی تھا کہ بادل چھا گیا اور اتنی بارش ہوئی کہ وادی میں سیلاب آگیا۔ لوگ پی پی کر سیراب ہوگئے۔

اس دعا کے جو الفاظ محفوظ ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

اللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهَائِمَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَاَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ[4] اللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُغِيثًا مَرِيئًا مَرِيعًا نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ[5]

اے اللہ! اپنے بندوں اور جانوروں کو پانی پلا اور اپنی رحمت کھول دے، اپنی مردہ زمین کو زندہ فرما۔ اے اللہ! ہمیں عام بارش عطا فرما جو خوشگوار ہو، سبزہ اگا دے، مفید ہو، نقصان دہ نہ ہو، جلد ہو، دیر میں نہ ہو۔

آپ نے جب جب بارش کی دعا مانگی قبول ہوئی۔ ایک دفعہ بارش کی دعا کے موقعہ پر ابولبابہ نے کھڑے ہوکر کہا

---

[1] دیکھئے سنن ابن ماجہ (۱۲۷۰) فی اقامة الصلاة : باب ماجاء فی الدعاء فی الاستسقاء۔

[2] ابوداؤد (۱۱۶۹) فی الصلاة : باب رفع الیدین فی الاستسقاء۔ بیہقی ۳/۳۵۵ بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ۔ سند صحیح ہے۔ حاکم ۱/۳۲۷ نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے تائید کی ہے۔

[3] ابوداؤد (۱۱۶۸) فی الصلاة : باب رفع الیدین فی الاستسقاء۔ احمد ۵/۲۲۳ بروایت عمیر مولیٰ آبی اللحم۔ سند صحیح ہے۔ حاکم ۱/۳۲۷ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے تائید کی ہے۔ نسائی ۳/۱۵۹۔ ترمذی (۵۵۷) بروایت عمیر مولیٰ آبی اللحم عن آبی اللحم۔ یہ کسی ایک راوی کا وہم ہے۔

[4] ابوداؤد (۱۱۷۶) فی الصلاة : باب رفع الیدین فی الاستسقاء۔ بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ سند حسن ہے۔ موطا مالک ۱/۱۹۰، ۱۹۱ فی الاستسقاء : باب ماجاء فی الاستسقاء بروایت عمرو بن شعیب مرسلاً۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . . . . آگے پوری حدیث بیان کی ہے۔

[5] کچھ پیشتر گذر چکی ہے۔ سند صحیح ہے۔

"رسول اللہ! کھجور کھلیانوں میں ہیں" آپ نے فرمایا "اے اللہ! اتنی بارش برسا کہ ابو لبابہ ننگے ہو کر اپنے کھلیان کا سوراخ ازار سے بند کرنے پر مجبور ہو جائے" بارش ہوئی حتیٰ کہ لوگوں نے ابولبابہ سے آکر کہا "جب تک ننگے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنے کھلیان کا دہانہ ازار سے بند نہ کرو گے یہ بارش بند نہ ہوگی" چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بارش اور زیادہ ہونے لگی[1] اب بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں، جب بہت زیادہ ہوگئی تو لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ بارش رک جانے کی دعا فرمائیں۔ آپ نے یہ دعا اس طرح فرمائی۔

اَللّٰهم حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا، اللّٰهم علی الآکَامِ والجِبَالِ والظِرَابِ وبُطُونِ الأَوْدِیَة ومَنَابِتِ الشَّجَرِ[2]

اے اللہ! ہم پر نہیں ہمارے گرد و پیش میں۔ اے اللہ! ٹیلوں اور کوہساروں پر، بلندیوں پر، وادیوں میں، جہاں درختوں کے اگنے کے مقامات ہیں وہاں پر۔

بارش ہوتے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے

اَللّٰهم صَیِّباً نَافِعاً[3]

اے اللہ! یہ بارش ہمارے لیے نفع بخش بنا۔

اپنا کپڑا سمیٹ لیتے کہ بدن پر پانی کے قطرے گر سکیں۔ اس کی بابت دریافت کیا گیا تو فرمایا "یہ بارش ابھی ابھی اپنے پروردگار کے یہاں سے آئی ہے"[4]

امام شافعی فرماتے ہیں مجھے اس نے خبر دی ہے جسے میں متہم نہیں سمجھتا۔ انھوں نے برید بن الہاد سے روایت کی ہے کہ جب سیلاب آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے "ہم نکل کر اس کی جانب چلیں جسے اللہ نے باعث طہارت بنایا ہے، اس سے ہم پاکی حاصل کریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد کریں"[5]

مجھے اس نے بتایا ہے جسے میں متہم نہیں سمجھتا، انھوں نے اسحاق بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ جب سیلاب آتا تو حضرت عمر اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں جاتے اور فرماتے "اس کے آنے سے جو بھی آتے گا ہم اسے نہلائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل یا آندھی دیکھتے تو اس کا اثر چہرے پر نمایاں ہو جاتا، آپ آگے پیچھے ہٹنے لگتے، بارش ہو جاتی تو گھبراہٹ دور ہوتی۔ آپ کو اندیشہ ہوتا کہ مبادا یہ عذاب کے آثار ہوں۔ شافعی فرماتے ہیں، سالم بن عبداللہ سے مروی ہے وہ اپنے والد سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ پانی کے لیے دعا اس طرح فرماتے تھے۔

اللّٰهم اسْقِنا غَیثاً مُغیثاً، هَنِیئاً مَرِیئاً مَرِیعاً غَدَقاً مُجَلِّلاً عَاماً طَبَقاً سَحّاً دَائماً۔ اللّٰهم اسْقِنا الغَیثَ وَلَا تَجْعَلْنا مِنَ القَانِطِین، اللّٰهم إنّ العبادَ والبِلادَ والبَهائِمَ والخَلْقَ من اللأواءِ والجُهدِ والضَّنْكِ مالا نَشْکُوه إلّا إلَیكَ، اللّٰهم أَنبِتْ لَنَا الزَّرْعَ وأَدِرّ لنا الضَّرْعَ واسْقِنا مِن بَرَکاتِ السَّماءِ وأَنبِتْ لنا مِنْ بَرَکاتِ الأرْضِ، اللّٰهم ارفع عَنّا الجَهْدَ والجُوعَ والعُرْیَ واکْشِفْ عنّا مِنَ البَلَاءِ مَالا یَکْشِفُه غَیرُك،

---

[1] مجمع الزوائد ۲/۲۱۵ میں ہیثمی نے اس کی روایت کے بعد کہا ہے کہ الصغیر میں طبرانی نے اس کی روایت کی ہے۔ سند کے اندر ایک راوی غیر معروف ہے۔

[2] بخاری، مسلم، نسائی اور مالک میں یہ روایت حضرت انس بن مالک سے آئی ہے۔ اور اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

[3] بخاری ۲/۳۰۴ فی الاستسقاء: باب مایقال اذا مطرت۔ نسائی ۳/۱۶۴ فی الاستسقاء: باب القول عند المطر۔ بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[4] مسلم (۸۹۸) فی الاستسقاء: باب الدعاء فی الاستسقاء۔ ابوداؤد (۵۱۰۰) فی الادب: باب ماجاء فی المطر۔

[5] الام للشافعی ۱/۲۵۲، ۲۵۳ فی الاستسقاء۔ سنن کبریٰ للبیہقی ۳/۳۵۹۔ بیہقی نے اسے منقطع کہا ہے۔ اس میں حضرت عمر سے روایت ہے۔ سند منقطع ہے کیونکہ یزید بن عبداللہ ابن الہاد نے روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کی ہے

اللّٰھم اِنَّا نَستَغفِرُکَ اِنَّکَ کُنتَ غَفَّارًا، فَاَرسِلِ السَّمَاءَ عَلَینَا مِدرَارًا[1]

اے اللہ! ہمیں بابرکت خوشگوار بارش عطا فرما جو سبزہ اگائے، زوردار ہو، عام موسلا دھار اور مسلسل ہو۔ اے اللہ! ہمیں بارش عطا کر اور مایوس نہ فرما۔ اے اللہ! بندوں کو، زمین کو، جانوروں اور مخلوقات کو جو تنگی، سختی اور مشقت لاحق ہو چکی ہے اس کی ہم تجھی سے فریاد کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہمارے کھیت اگا دے ہمارے لیے تھنوں میں دودھ فراوان کر دے۔ ہمیں آسمان کی برکتیں پلا اور ہمارے لیے زمین کی برکتیں اگا۔ اے اللہ! جس مشقت، بھوک اور تنگی کی حالت میں ہم پہنچ چکے ہیں اسے رفع فرما دے۔ مصیبت دور فرما دے کہ اسے تیرے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اے اللہ! ہم تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں تو بے حد مغفرت کرنے والا ہے۔ لہٰذا ہم پر موسلا دھار بارش بھیج دے۔

امام شافعی فرماتے ہیں، میں پسند کرتا ہوں کہ امام یہی دعا مانگے۔ کہتے ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب استسقاء میں دعا فرماتے تو ہاتھ اٹھا کر فرماتے[2] ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ پہلی بارش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی کے قطرے اپنے جسم پر پڑنے دیتے۔ فرماتے ہیں، مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ بارش کی صبح اٹھتے تو کہتے "فتح کا چھتر برسا ہے" پھر یہ آیت پڑھتے۔

مَا یَفتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِن رَّحمَۃٍ فَلَا مُمسِکَ لَھَا[3] (فاطر: ۲)

اللہ جو اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے تو اس کے بعد کوئی اس کو روکنے والا نہیں۔

فرماتے ہیں اور مجھے اس نے خبر دی ہے جسے میں متہم نہیں سمجھتا، انھوں نے عبدالعزیز بن عمر سے، انھوں نے مکحول سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ کا ارشاد ہے "دعا کی مقبولیت فوجوں کی مڈبھیڑ، اقامت صلوٰۃ اور نزولِ بارش کے وقت طلب کرو[4]"۔ اور کئی راویوں سے میرے نزدیک ثابت ہے کہ بارش اور اقامت صلوٰۃ کے موقع پر دعا کی مقبولیت طلب کی جائے۔ بیہقی فرماتے ہیں، ایک موصول حدیث میں سہل بن سعد سے دعا کے بارے میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "پکار کے وقت، جنگ کے موقع پر اور بارش کے وقت دعا مسترد نہیں ہوتی[5]"۔ ابوامامہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ "چار موقعوں پر آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اور دعائیں مقبول ہوتی ہیں۔

۱۔ جنگی صفیں جب بھڑ جاتی ہیں۔

---

[1] الام ۱/۲۵۱ سند میں شافعی اور سالم بن عبداللہ کے مابین انقطاع ہے۔

[2] مؤطا مالک ۱/۱۹۲۔ الام بلاغاً ۱/۲۲۳۔ بخاری ۴/۴۲۹۔ مسلم (۸۹۵)۔ بروایت حضرت انس بن مالک "استسقاء کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہیں بھی دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ یہاں وہ اس حد تک اٹھاتے تھے کہ بغل کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی"۔ ابوداؤد (۱۱۷۱) بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ "اس طرح استسقاء کی دعا مانگتے تھے (ہاتھ بڑھا کر) دونوں ہاتھوں کا اندرونی حصہ زمین سے ملحق کر کے حتیٰ کہ بغل کی سفیدی ظاہر ہو جاتی سند صحیح ہے۔

[3] مؤطا امام مالک ۱/۱۹۲ فی الاستسقاء : باب الاستمطار بالنجوم بلاغاً۔ سند معضل ہے۔

[4] الام ۱/۲۲۳ فی الاستسقاء : باب طلب الاجابۃ فی الدعاء۔ مرسل ہے کیونکہ مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا تھا۔

[5] ابوداؤد (۲۵۴۰) فی الجھاد : باب الدعاء عند اللقاء۔ بیہقی ۳/۳۶۰ "دو موقعوں پر دعا مسترد نہیں ہوتی یا کم ہی مسترد ہوتی ہے، اذان کے وقت اور اس وقت جب گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۲۹۷) و (۲۹۸) نے اسے صحیح کہا ہے۔ تحت المطر کی روایت ابوداؤد اور بیہقی کی ہے۔ سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

۲۔ بارش کے وقت۔
۳۔ اقامت صلوٰۃ کے موقع پر۔
۴۔ کعبہ کو دیکھ کر[1]

سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور اس حالت میں آپ کی عبادت

آپ نے کل سفر صرف چار طرح کیے ہیں۔

۱۔ سفر ہجرت۔ ۲۔ سفر جہاد۔ ۳۔ سفر عمرہ۔ ۴۔ سفر حج۔

سفر کا ارادہ ہوتا تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے، جس کے نام قرعہ نکل آتا اسے ساتھ لے کر سفر فرماتے سفر حج میں تمام بیویاں ساتھ ہوتیں۔ دن کے آغاز میں سفر پر روانہ ہوتے۔ جمعرات کے دن سفر کرنا مستحب خیال فرماتے[2] تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ صبح سویرے سفر میں میری امت کے لیے برکت دے[3]۔ کوئی سریہ یا فوج روانہ کرنی ہوتی تو دن کے اول حصّہ میں روانہ فرماتے تھے۔ مسافروں کو حکم تھا کہ تین کی تعداد میں ہوں تو اپنے اندر کسی کو امیر مقرر کر لیں[4]۔ آدمی کو تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا ہے[5]۔ بتایا ہے کہ ایک سوار ایک شیطان اور دو سوار دو شیطان ہوتے ہیں باقی تین قافلہ بن جاتے ہیں[6]۔ آپ سے مذکور ہے کہ سفر کے لیے تیار ہوتے تو یہ دعا کرتے۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ تَوَجَّھْتُ وَبِكَ اعْتَصَمْتُ، اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ مَا اَھَمَّنِیْ وَمَا لَا اَھْتَمُّ بِہٖ، اَللّٰھُمَّ زَوِّدْنِی التَّقْوٰی وَ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَجِّھْنِیْ لِلْخَیْرِ اَیْنَمَا تَوَجَّھْتُ[7]

اے اللہ! تیری ہی جانب میرا رخ ہے، تجھی کو میں نے تھام لیا ہے۔ اے اللہ جو کچھ مجھے درپیش ہو اور جس کی مجھے فکر نہ ہو

---

[1] بیہقی (۳/ ۳۶۰) سند میں عفیر بن معدان ضعیف ہے۔

[2] بخاری ۶/ ۸۰ فی الجہاد : باب من اراد غزوۃ فوری بغیرھا و من احب الخروج الی السفر یوم الخمیس۔ بروایت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ۔

[3] صحیح حدیث ہے۔ دارمی ۲/ ۲۱۴۔ ابوداؤد (۲۶۰۶) ترمذی (۱۲۱۲) ابن ماجہ (۲۲۳۶) احمد ۳/ ۴۱۶، ۴۱۷ و ۴۳۱، ۴۳۲ و ۴/ ۳۸۴ و ۳۹۰، ۳۹۱ بروایت یعلی بن عطاء عن عمارہ بن حدید عن صخر الغامدی۔ بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ بہ نقل عبداللہ بن امام احمد (۱۳۱۹) و (۱۳۲۲) و (۱۳۲۸) و (۱۳۳۸) اور بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ و حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بہ نقل ابن ماجہ (۲۲۳۷) و (۲۲۳۸) کے اندر اس روایت کی شواہد موجود ہیں۔ اس باب میں حضرت ابن مسعود، بریدہ، ابن عباس، جابر، عبداللہ بن سلام، نواس بن سمعان اور عمران بن حصین سے بھی روایات آئی ہیں اور سب ضعیف ہیں۔ بایں ہمہ ان کے مجموعہ سے حدیث صحیح قرار پاتی ہے۔

[4] ابوداؤد (۲۶۰۸) و (۲۶۰۹) بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ سند حسن ہے۔

[5] بخاری ۶/ ۹۲۔ ترمذی (۱۶۷۳) بروایت حضرت ابن عمر مرفوعًا "لوگوں کو تنہا سفر کے باب میں اگر وہ بات معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو کوئی شخص رات میں تنہا سفر نہ کرے"۔

[6] مؤطا امام مالک ۲/ ۹۷۸ فی الاستئذان : باب ماجاء فی الوحدۃ فی السفر للرجال والنساء۔ ترمذی (۱۶۷۴) فی الجہاد: باب ماجاء فی کراھیۃ ان یسافر الرجل وحدہ۔ ابوداؤد (۲۶۰۷) فی الجہاد : باب فی الرجل یسافر وحدہ۔ سند حسن ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

[7] "عمل الیوم واللیلۃ" لابن السنی ص ۱۸۵۔ سند میں عمرو بن مساور ضعیف ہے۔ تخریج الاذکار میں حافظ نے اسے غریب قرار دیا ہے۔

ان سب میں میری کفایت فرما۔ اے اللہ! مجھے تقویٰ کا زادراہ عطا فرما۔ میرے گناہ بخش دے۔ جدھر بھی جاؤں مجھے خیر کی جانب لے چل۔

سواری کے لیے جانور حاضر کیا جاتا تو رکاب میں پیر رکھتے ہوئے بسم اللہ کہتے اور سوار ہو کر یہ دعا پڑھتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔

تمام تعریف اس اللہ کے لیے جس نے اسے ہمارے قابو میں دیا۔ جب کہ ہم اسے زیر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یقیناً ہم اپنے پروردگار کی جانب پلٹ جانے والے ہیں۔

اس کے بعد الحمد للہ، الحمد للہ، الحمد للہ پھر اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتے تھے۔ اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔

سُبحانكَ إني ظَلَمتُ نفسي فاغْفِرْ لي إنه لا يغفر الذنوبَ الّا انتَ[1]

پاک ہے تیری ذات، یقیناً میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے پس بخش دے۔ گناہوں کو صرف تو ہی بخشتا ہے۔

اور یہ دعا بھی پڑھتے۔

اللّٰهم انا نسألك في سفرنا هذا البرَّ والتقوىٰ ومن العمل ما ترضىٰ، اللّٰهم هَوِّنْ علينا سَفَرَنا هٰذا واطْوِ عنّا بُعدَه، اللّٰهم انت الصاحبُ في السفرِ والخليفةُ في الاهلِ، اللّٰهم إني اعوذُ بكَ من وَعْثاءِ السَفَرِ وكآبةِ المُنْقَلَبِ وسُوءِ المَنْظَرِ في الأهلِ والمالِ۔

الٰہی! ہم تجھ سے اس سفر میں نیکوکاری، تقویٰ اور ایسے عمل کے طالب ہیں جس سے تو راضی ہو۔ الٰہی! ہم پر ہمارا یہ سفر آسان کر دے، اس کی درازی کم کر دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر کا رفیق اور ہمارے پیچھے اہل و عیال کا نگہبان ہے۔ اے اللہ! سفر کی مشقت، واپسی کے غم اور اہل و عیال اور مال میں سوء منظر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

سفر سے واپسی پر مذکورہ دعا کے ساتھ مزید اضافہ فرماتے۔

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون[2]

ہم واپس ہو رہے ہیں، تائب ہیں، اپنے پروردگار کے لیے ثنا خواں ہیں۔

آپ اور صحابہ جب گھاٹیوں کے اوپر چڑھتے تو اللہ اکبر اور وادیوں میں نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے۔[3]

کسی ایسی بستی سے قریب ہو کر جس میں داخل ہونا چاہتے یہ دعا پڑھتے۔

اللّٰهم رَبَّ السماواتِ السَّبعِ وما أظْلَلْنَ وربَّ الارضِيْنَ السَّبعِ وما أقْلَلْنَ وربَّ الشَّياطِيْنِ وما

---

[1] ترمذی (۳۴۴۳) فی الدعوات: باب ماجاء مایقول اذا رکب دابۃ۔ ابوداؤد (۲۶۰۲) فی الجهاد: باب مایقول الرجل اذا رکب۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۲۳۸۰) و (۲۳۸۱) اور حاکم ۹۸/۲ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مسلم (۱۳۴۲) فی الحج: باب مایقول اذا رکب الی سفر الحج وغیرہ۔ ترمذی (۳۴۴۴) فی الدعوات: باب ماجاء مایقول اذا رکب دابۃ۔ ابوداؤد (۲۵۹۹) فی الجهاد: باب مایقول الرجل اذا سافر۔ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ۔

[3] حضرت ابن عمر کی سابقہ حدیث کے بعد ابوداؤد (۲۵۹۹) نے اس جملہ کی تخریج کی ہے۔ مسلم نے اس کی تخریج اس جملہ کے بغیر کی ہے۔ پہلی سند سے جو حدیث وارد ہے اس میں یہ جملہ مدرج ہے۔ المصنف ۱۶۰/۵ میں عبدالرزاق نے اس جملہ کی تخریج حضرت ابن جریج سے کرتے ہوئے کہا ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ....." یہ حدیث معضل ہے لہٰذا اس ادراج پر گہری نظر ہے کیونکہ بے حد باریک ہے۔ امام نووی نے سہواً اسے اپنی "ریاض" اور اپنے "اذکار" میں اسے حدیث کے اندر شامل کیا ہے۔ امالی الاذکار کے اندر حافظ نے اس کی تردید کی ہے جیسا کہ الفتوحات الربانیہ ۱۴۰/۵ میں ابن علان سے منقول ہے۔

أَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ، اسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ أَهْلِهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ أَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا [1]

اے اللہ! ساتوں آسمانوں اور ان کے زیر سایہ اشیاء کے پروردگار، ساتوں زمینوں اور ان کے سینوں پر موجود اشیاء کے پروردگار، شیطانوں اور ان کے ذریعہ گمراہ لوگوں کے پروردگار، ہواؤں اور ان کی منتشر کردہ اشیاء کے پروردگار! میں تجھ سے اس بستی اور بستی والوں کے خیر کا طالب ہوں، اس کے اور اس کے باشندوں اور جو کچھ کہ اس میں ہے ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

یہ دعا بھی آپ سے مذکور ہے۔

اللّٰهم إني أسألك من خير هٰذه القرية وخير ما جَمَعْتَ فيها وأعُوذُ بِكَ من شَرِّها وشَرِّ ما جَمَعْتَ فيها. اللّٰهم ارْزُقْنَا جَنَاهَا وَأَعِذْنَا من وَبَاهَا وَحَبِّبْنَا إلى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِي أَهْلِهَا إِلَيْنَا [2]

اے اللہ! میں تجھ سے اس بستی کا خیر اور جو کچھ کہ تو نے اس میں جمع کیا ہے اس کا خیر مانگتا ہوں۔ اور اس کے شر سے اور جو کچھ کہ اس میں جمع کیا ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ! ہمیں اس کا پھل عطا فرما، اس کی وبا سے ہمیں بچا، ہمیں اس کے باشندوں کا اور اس کے اندر جو صالح لوگ ہیں انھیں ہمارا محبوب بنا۔

سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ

قصر چار رکعت والی صلوٰۃ میں صرف دو رکعت پڑھتے۔ یہ عمل آغاز سفر سے مدینہ واپسی تک برابر رہتا۔ یہ ہرگز ثابت نہیں کہ سفر میں آپ نے کبھی صلوٰۃ پوری پڑھی ہو اور حضرت عائشہ کی حدیث کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر بھی کرتے تھے اور پوری بھی پڑھتے تھے، صوم رکھتے تھے نہیں بھی رکھتے تھے"، صحیح نہیں ہے [3] شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو

---

[1] ۔ عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ص ۱۹۷۔ ابن حبان (۲۳۷۷) اور حاکم ۲/۱۰۰ بروایت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ۔ سند حسن ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے تائید کی ہے۔ امالی الاذکار میں حافظ نے حسن کہا ہے۔

[2] ۔ عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ص ۱۹۶۔ بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ حافظ فرماتے ہیں کہ سند کے اندر ضعف ہے۔ مگر حضرت ابن عمر کی حدیث سے اسے قوت پہنچتی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کی سند ان تک پہنچا کر فرماتے ہیں سند کے اندر ایک راوی کو ضعیف کہا گیا ہے مگر اس کی متابعت ہوتی ہے۔ چنانچہ مبارک بن حسان نے نافع سے، انھوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ چنانچہ کوئی گاؤں دیکھ کر آپ داخل ہونا چاہتے تو تین بار "اللّٰهم بارك لنا فيها" پھر "اللّٰهم ارزقنا جناها وجنبنا وباها" پڑھتے تھے۔ بقیہ حدیث حضرت عائشہ جیسی بیان کی ہے۔ مبارک پر کلام کیا گیا ہے مگر ان سندوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوئی ہے۔

[3] ۔ مجمع الزوائد ۲/۱۵۷ میں ہیثمی نے بروایت حضرت عائشہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی روایت بزار نے کی ہے۔ سند کے اندر مغیرہ بن زیاد ہے جو قابل احتجاج ہونے میں مختلف فیہ ہے۔ احمد نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے اور کہا ہے کہ ان کی کچھ حدیثیں منکر ہیں۔ نسائی نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ ابو احمد حاکم فرماتے ہیں کہ ائمہ کے نزدیک یہ مضبوط نہیں ہے۔ شافعی ۱/۱۴۱۔ دار قطنی ۱/۲۴۲۔ بیہقی ۳/۱۴۲ نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کیا ہے۔ قصر بھی کیا ہے اور صلوٰۃ پوری بھی ادا کی ہے۔ سند کے اندر طلحہ بن عمرو مکی متروک ہے۔ دار قطنی نے اس کی روایت حضرت عائشہ سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فرماتے سنا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹا الزام ہے۔ یوں بھی روایت ہے "کان یقصر وتتم" یعنی آپ قصر فرماتے تھے اور خود عائشہ صلوٰۃ پوری پڑھتی تھیں، اور "یفطر وتصوم" یعنی آپ صوم نہیں رکھتے تھے اور عائشہ صوم سے رہتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جگہوں پر حضرت عائشہ عزیمت کی راہ چلتی تھیں۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ ام المؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کی مخالفت نہیں کرسکتی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ انھیں ہی سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ دو دو رکعت فرض کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے تو صلوٰۃ حضری میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ سفری اپنی اصلی حالت پر باقی رہی[۱]۔ اس روایت کی موجودگی میں کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے خلاف ان کا عمل رہا ہے۔

میرے علم کی حد تک حضرت ابن عباس وغیرہ کی روایتوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہ نے سفر میں صلوٰۃ پوری پڑھی ہے۔ حضرت عثمان کی طرح انھوں نے بھی تاویل کی تھی[۲]۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر فرمایا ہے۔ بعض راویوں نے دونوں حدیثوں کو ملا کر ایک بنا دی ہے اور یوں کہہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصر کرتے تھے اور وہ خود پوری پڑھتی تھیں۔ پھر بعض راویوں نے تصرف کرکے یوں کر دیا کہ "کان یقصر ویتم" یعنی آپ قصر بھی کرتے تھے اور پوری بھی پڑھتے تھے۔ جو تاویل حضرت عائشہ نے کی ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انھیں یہ خیال ہوگیا کہ قصر سفر میں خوف سے مشروط ہے، خوف نہ ہو تو قصر کا سبب بھی جاتا رہے گا۔ مگر یہ تاویل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کی حالت میں سفر کیا اور قصر فرماتے رہے۔

چنانچہ آیت کا مفہوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے لیے مشکل ہوگیا تو اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے پوچھا تو آپ نے جواب شافی دیا، فرمایا کہ اللہ کی جانب سے یہ صدقہ ہے[۳] اور ایک قانون ہے جسے امتِ محمدیہ کے لیے اس نے بنایا ہے۔" یہ اس حقیقت کی توضیح تھی کہ آیت سے جو مفہوم نکلتا ہے اس کا حکم مراد نہیں ہے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ایک اور سند سے کی ہے۔ مگر اس میں سعید بن محمد بن ثواب مجہول ہے۔

[۱] ۔ بخاری ۲/ ۴۷۰۔ مسلم (۶۸۵)۔

[۲] ۔ بخاری ۲/ ۴۷۰ فی التقصیر : باب یقصر اذا خرج من موضعہ۔ مسلم (۶۸۵) فی اول صلاۃ المسافرین۔ بروایت زہری عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا " صلوٰۃ شروع میں دو رکعتیں فرض ہوئیں۔ سفر کی صلوٰۃ تو برقرار رہی مگر حضر کی صلوٰۃ کی تکمیل ہوئی۔ زہری فرماتے ہیں میں نے عروہ سے پوچھا " آخر عائشہ سفر میں صلوٰۃ کیوں پوری ادا فرماتی تھیں؟" انھوں نے فرمایا عثمان کی طرح انھوں نے بھی تاویل کی تھی۔ حافظ فرماتے ہیں کہ منقول ہے کہ حضرت عثمان کے تکمیل کرنے کا سبب یہ تھا کہ ان کے خیال میں قصر اس مسافر کے لیے مخصوص ہے جو محو سیر ہو، باقی اثناء سفر جو مقیم ہو جائے تو اس کے لیے مقیم کا حکم ہے۔ اس کی دلیل بسند حسن، احمد ۴/ ۹۴ کی وہ روایت ہے جس میں انھوں نے عباد بن عبداللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ بغرض حج معاویہ جب ہمارے یہاں آئے تو مکہ میں ہمیں دو رکعت صلوٰۃ پڑھائی پھر دارالندوہ چلے گئے، یہاں ان کے پاس مروان اور عمرو بن عثمان آئے اور دونوں نے کہا " اپنے چچازاد بھائی کی آپ نے تنقیص کر دی ہے وہ صلوٰۃ پوری ادا فرماتے تھے۔" معاویہ نے فرمایا کہ مکہ آکر عثمان صلوٰۃ پوری پڑھتے تھے۔ یہاں انھوں نے ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ادا کی ہیں مگر منیٰ اور عرفہ جاتے تو قصر کرتے تھے۔ حج سے فارغ ہوکر منیٰ میں قیام کرتے تو صلوٰۃ پوری ادا کرتے تھے۔

[۳] ۔ مسلم (۶۸۶) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ المسافرین۔ ابوداؤد (۱۱۹۹)۔ ترمذی (۳۰۳۷) ابن ماجہ (۱۰۶۵) بروایت یعلی بن امیہ۔ فرماتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب سے پوچھا " لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلاۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا " (یعنی قصر صلوٰۃ میں کوئی حرج نہیں ہے اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں فتنہ میں ڈال دیں گے)، مگر اب تو لوگ مامون ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا " یہی حیرت مجھے بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا " ایک صدقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمھیں دیا ہے لہٰذا اس کا صدقہ قبول کرو۔"

نیز یہ کہ امن کی حالت ہو یا خوف کی بہرحال صلوٰۃ قصر کی جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ تخصیص مفہوم کی ایک نوع ہے یا یہ کہ مفہوم ہی سرے سے مقصود نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آیت کا اقتضاء ایسے قصر کا ہے جو قصر ارکان یعنی تخفیف اور قصر عدد یعنی دو رکعتوں کی کمی دونوں کو شامل ہے۔ اسے دو باتوں سے مقید رکھا گیا، سفر اور خوف۔ دونوں باتیں ہوں تو دونوں قصر جائز ہوگا۔ خوف کی صلوٰۃ قصر عدد اور قصر ارکان کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ دونوں باتیں مفقود ہوں یعنی امن اور اقامت کی حالت میسر ہو تو دونوں قصر جاتے رہیں گے ایسی صورت میں صلوٰۃ پوری پڑھی جائے گی۔ اگر دونوں میں سے ایک سبب موجود ہو تو اس پر صرف اس کا قصر مترتب ہوگا۔ خوف اور اقامت کی حالت ہو تو قصر ارکان کیا جائے گا اور تعداد پوری رکھی جائے گی۔ یہ آیت میں وارد قصر مطلق نہیں بلکہ قصر کی ایک نوع ہے۔ سفر اور امن کی حالت ہو تو قصر تعداد کیا جائے گا ارکان پورے ادا ہوں گے۔ اس کا نام صلوٰۃ امن ہے۔ یہ قصر مطلق نہیں قصر کی ایک نوعیت ہے۔ اس کا نام کمی تعداد کے باعث صلوٰۃ مقصورہ بھی ہے۔ ارکان کی کامل ادائے گی کے پیش نظر نیز اس حقیقت کے باعث کہ قصر آیت میں یہ داخل نہیں ہے اسے صلوٰۃ تامہ بھی کہتے ہیں۔ پہلی بہت سارے متأخرین فقہاء کی اصطلاح ہے، دوسری کا حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس وغیرہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "صلوٰۃ دو دو رکعت فرض کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہجرت فرما کر آئے تو حضر میں اضافہ کیا گیا اور سفر میں صلوٰۃ اصل پر باقی رکھی گئی"۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سفر کی صلوٰۃ حضر کی چار رکعتوں سے قصر نہیں کی گئی ہے، بلکہ جوں کی توں رہ گئی ہے، مسافر پر فرض یہی دو رکعتیں ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں "تمھارے نبی کی زبانی تم پر حضر میں اللہ تعالیٰ نے چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے"، حضرت عائشہ کی روایت سے متفق علیہ ہے اور حضرت ابن عباس کی حدیث میں مسلم منفرد[۱] ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "سفر کی صلوٰۃ دو رکعت، جمعہ کی دو رکعت، عید کی دو رکعت بارشاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکمل ہیں اس میں قصر نہیں اس کے خلاف جو کوئی افترا کرے گا وہ نامراد ہے[۲]"۔ یہی حضرت عمر ہیں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا "رسول اللہ! حالت امن میں آخر ہم قصر کیوں کرتے ہیں؟" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "یہ تم پر اللہ کا صدقہ ہے اسے قبول کرو"۔ ان کی دونوں حدیثوں میں کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں یہ جواب دیا کہ یہ اللہ کا تم پر صدقہ ہے اور دین کی سہولت اور کشادگی ہے تو عمر کو معلوم ہوگیا کہ آیت سے مراد قصر تعداد نہیں جیسا کہ بہت سارے لوگوں نے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ فرمایا: سفر کی دو رکعتیں پوری ہیں، قصر نہیں۔

بنابریں قصر تعداد کے مباح ہونے پر کہ مصلی چاہے تو قصر کرے یا چاہے پوری پڑھے آیت میں کوئی دلیل نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفروں میں ہمیشہ دو دو رکعتیں پڑھتے تھے چار کبھی نہیں پڑھی ہے۔ ایک موقع کی صلوٰۃ اس سے مستثنیٰ ہے جسے آپ نے خوف کی حالت میں ادا کی ہے۔ اس کا ذکر ہم اس کے موقع پر کریں گے اور وہیں اس کی وضاحت بھی کریں گے۔ انشاء اللہ۔ حضرت انس فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے، آپ نے دو دو رکعتیں مدینہ واپس ہونے تک پڑھیں"۔ حدیث متفق علیہ[۳] ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کو

---

[۱] - مسلم (۶۸۷)۔ ابوعوانہ ۲/۳۳۵۔ احمد (۲۱۲۴) و (۲۱۷۷) و (۲۲۹۳)۔ ابوداؤد (۱۲۴۷) نسائی ۳/۱۶۹۔

[۲] - نسائی ۳/۱۱۸ فی تقصیر الصلاۃ۔ ابن ماجہ (۱۰۶۴) فی اقامۃ الصلاۃ: باب تقصیر الصلاۃ فی السفر۔ احمد ۱/۳۷۔ طیالسی ۱/۱۲۴ "وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ" کے بغیر سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۵۴۴) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[۳] - بخاری ۲/۴۶۳ فی التقصیر: باب ماجاء فی التقصیر وکم یقیم حتی یقصر۔ مسلم (۶۹۳)۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جب معلوم ہوا کہ حضرت عثمان بن عفان نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھی ہیں تو ”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“ پڑھا اور فرمایا کہ منیٰ میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعتیں پڑھی ہیں، منیٰ میں ابوبکر کے ساتھ دو رکعتیں پڑھی ہیں، عمر بن خطاب کے ساتھ دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ کاش چار رکعتوں کا میرا نصیبہ دو ہی مقبول رکعتیں ہو جائیں متفق علیہ [1]۔ ابن مسعود نے اس بات پر اِنَّا لِلّٰہِ نہیں پڑھا تھا کہ حضرت عثمان نے دو جائز باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لیا جن کا انھیں اختیار حاصل تھا بلکہ ایک قول کے مطابق وہی اولیٰ بھی تھا۔ ان کے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے مشاہدہ کے خلاف تھا۔ کیونکہ سفر میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اسلام کو دو رکعتیں ہمیشہ پڑھتے ہوتے دیکھا تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، فرماتے ہیں ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا، سفر میں آپ دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، ابوبکر، عمر اور عثمان بھی ایسا ہی کرتے تھے“ [2] حضرت عثمان کی خلافت کا ابتدائی زمانہ مراد ہے ورنہ انھوں نے آخری زمانہ میں صلوٰۃ پوری پڑھنی شروع کر دی تھی۔ یہی ان اسباب میں سے ایک ہے جن کے باعث ان کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ آپ کے اس عمل کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔

۱ - بدوؤں نے اس سال حج کیا تھا چنانچہ آپ نے انھیں تعلیم دینی چاہی کہ صلوٰۃ میں فرض چار رکعتیں ہیں۔ مبادا انھیں وہم نہ ہو کہ حضر وسفر دونوں میں دو رکعتیں ہیں۔ اس تاویل کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موقعہ پر انھیں یہ بات سکھانی زیادہ سزاوار تھی کیونکہ وہ اس وقت نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور نئے نئے مصلی بنے تھے۔ بایں ہمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چار رکعتیں نہیں پڑھائیں۔

۲ - وہ لوگوں کے امام تھے۔ امام جہاں کہیں فروکش ہوتا ہے وہی اس کی عملداری ہوتی ہے، وہی اس کی جائے حکومت ہوتی ہے۔ گویا کہ یہ اس کا وطن ہوتا ہے۔ اس تاویل کا جواب یہ ہے کہ علی الاطلاق مخلوقات کے امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ حق تھا کہ وہ ایسا کرتے مگر امام مطلق ہوتے ہوئے بھی آپ نے چار رکعتیں نہیں پڑھیں۔

۳ - منیٰ تعمیر ہو چکا تھا اور آپ کے زمانہ میں یہاں بکثرت مکانات بن چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ خالی میدان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیوں نہ منیٰ میں آپ کے لیے ایک مکان بنالیں جو آپ کو گرمی سے بچا سکے؟ تو آپ نے فرمایا ”نہیں، منیٰ جائے قیام اس کی ہے جو پہلے آجائے“ [3] چنانچہ حضرت عثمان نے تاویل یہ فرمائی کہ قصر حالت سفر میں ہوتا ہے۔ حالت قیام میں نہیں۔ اس تاویل کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دس دن قیام فرمایا مگر صلوٰۃ قصر فرماتے رہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ المسافرین۔ ترمذی (۵۴۸) فی الصلاۃ : باب ماجاء فی کم تقصر الصلاۃ۔ نسائی ۳/۱۲۱ فی تقصیر الصلاۃ : باب المقام الذی یقصر بمثلہ الصلاۃ۔ ابن ماجہ (۱۰۷۷) فی اقامۃ الصلاۃ : باب کم یقصر الصلاۃ المسافر اذا اقام ببلدۃ۔

[1] بخاری ۲/۴۶۵ فی التقصیر : باب الصلاۃ بمنیٰ۔ مسلم (۶۹۵) فی تقصیر الصلاۃ : باب قصر الصلاۃ بمنیٰ۔ نسائی ۳/۱۲۰ فی تقصیر الصلاۃ : باب الصلاۃ بمنیٰ۔

[2] بخاری ۲/۴۷۶ فی تقصیر : باب من لم یتطوع فی السفر دبر الصلاۃ۔

[3] ترمذی (۸۸۱) فی الحج : باب ماجاء فی أن منی مناخ من سبق۔ ابوداؤد (۲۰۱۹) فی المناسك : باب تحریم حرم مکۃ۔ ابن ماجہ (۳۰۰۶) فی المناسك : باب النزول بمنی۔ حاکم ۱/۴۶۶، ۴۶۷۔ دارمی ۲/۷۳۔ احمد ۶/۱۸۷ و ۲۰۷۔ سب کے سب بروایت ابراہیم بن مہاجر عن یوسف بن ماھك عن امہ مسیکۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ ابراہیم بن مہاجر لین الحفظ ہیں۔ ام یوسف مسیکہ غیر معروف الحال ہیں، ان سے صرف ان کے صاحبزادہ کی روایت معروف ہے۔ بایں ہمہ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔

۴۔ آپ نے یہاں قیام تین دن فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مہاجر عبادت کی ادائے گی کے بعد تین دن قیام کرے گا"[1] آپ نے اسے مقیم کہا، مقیم غیر مسافر ہوتا ہے۔ اس تاویل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اثنار سفر کی یہ مقید اقامت ہے وہ اقامت نہیں جو سفر کی ضد ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دس دن رہے مگر قصر فرماتے رہے۔ عبادت حج کے بعد منیٰ میں آپ نے رمی جمار کے دنوں میں تینوں دن قیام فرمایا اور قصر فرماتے رہے۔

۵۔ منیٰ میں حضرت عثمان نے اقامت اختیار کرنے اور اسے اپنا وطن اور دار الخلافہ بنا لینے کا عزم فرما لیا تھا اس لیے آپ نے صلوٰۃ پوری پڑھی مگر بعد میں مدینہ واپس ہو جانے کا ارادہ فرمایا لیا۔ یہ تاویل بھی مضبوط نہیں کیونکہ عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار مہاجرین اولین میں ہے۔ فریضۂ حج کی ادائے گی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو مکہ میں قیام کرنے سے منع فرمادیا ہے، صرف یہاں تین دن قیام کرنے کی رخصت دی ہے۔ لہذا حضرت عثمان یہاں اقامت اختیار نہیں کرسکتے تھے۔ تین دن قیام کرنے کی رخصت صرف اس وجہ سے آپ نے دی تھی کہ صحابہ نے مکہ للٰہیت کی بنیاد پر ترک کیا تھا۔ جو شئی اللہ کے لیے ترک کردی جاتی ہے اس کی جانب دوبارہ واپس نہیں ہوا جاسکتا۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے کو اپنا صدقہ خریدنے سے منع فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "اسے نہ خریدو، دوبارہ اپنے صدقہ میں نہ آجاؤ"۔ حضرت عمر گو اسے قیمت ادا کرکے حاصل کرتے مگر پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صدقہ میں[2] واپس ہونے سے تعبیر فرمایا۔

۶۔ حضرت عثمان نے منیٰ میں شادی کرلی تھی اور مسافر جب کسی جگہ قیام کرلیتا ہے اور وہاں شادی بھی کرلیتا ہے یا وہاں اس کی بیوی ہوتی ہے تو وہ صلوٰۃ پوری ادا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ عکرمہ بن ابراہیم ازدی ابو ذباب سے، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان نے منیٰ والوں کو چار رکعتیں پڑھائیں اور فرمایا "لوگو! یہاں آکر میں صاحب اہل ہو چکا ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "آدمی جس شہر میں اہل وعیال سے ہو جائے وہاں وہ مقیم کی صلوٰۃ پڑھے گا"۔ امام احمد نے اس کی روایت مسند میں کی ہے[3]۔ عبداللہ بن زبیر حمیدی نے بھی اس کی روایت اپنی مسند میں کی ہے۔ بیہقی نے روایت میں انقطاع اور عکرمہ بن ابراہیم میں ضعف کے سبب اسے معلل سمجھا ہے۔ ابوالبرکات ابن تیمیہ فرماتے ہیں "ضعف کا سبب پوچھا جاسکتا ہے کیونکہ بخاری نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کیا ہے مگر مطعون نہیں کیا ہے حالانکہ ان کا طریقہ ہے کہ جرح اور مجروحین کا تذکرہ کردیتے ہیں۔ احمد اور حضرت ابن عباس ان سے پہلے صراحت کرچکے ہیں کہ مسافر جب شادی کرے تو اتمام صلوٰۃ لازم ہو جاتا ہے۔ یہی قول امام ابوحنیفہ، مالک اور ان کے اصحاب کا بھی ہے۔

حضرت عثمان کی جانب سے یہ سب سے عمدہ دفاع کیا گیا ہے۔ اس طرح کا دفاع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی

---

[1] بخاری ۲۰۸/۷ فی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم : باب اقامۃ المہاجر بمکۃ بعد قضاء نسکہ۔ مسلم (۱۳۵۲) فی الحج : باب جواز الاقامۃ بمکۃ للمہاجر۔ بروایت علاء بن حضرمی۔

[2] بخاری ۲۷۹/۳ فی الزکاۃ : باب ھل یشتری صدقتہ۔ مسلم (۱۶۲۱) فی الھبات : باب کراھۃ شراء الانسان ما تصدق بہ ممن تصدق علیہ۔ مؤطا ۲۸۲/۱ فی الزکوٰۃ : باب اشتراء الصدقۃ والعود فیھا۔ نسائی ۱۰۹/۵ فی الزکوٰۃ: باب شراء الصدقۃ۔ بروایت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔

[3] مسند احمد ۶۲/۱۔ سند ضعیف ہے۔

جانب سے کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ام المؤمنین تھیں جہاں کہیں فروکش ہو جاتیں وہیں ان کا وطن تھا۔ مگر یہ دفاع بھی کمزور ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ابو المؤمنین تھے، ازواج مطہرات کا ماں ہونا آپ کے باپ ہونے کی فرع ہے مگر اس سبب کے ہوتے ہوئے آپ صلوٰۃ پوری نہیں پڑھتے تھے۔ ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ سفر میں چار رکعتیں پڑھتی تھیں، ان سے میں نے کہا کہ دو رکعتیں کیوں نہیں پڑھتیں؟ تو فرمایا " بھانجے! یہ صلوٰۃ مجھ پر گراں نہیں گذرتی"[1]

امام شافعی فرماتے ہیں: مسافر پر فرض دو رکعتیں ہوتیں تو عثمان، عائشہ اور ابن مسعود پوری صلوٰۃ نہ پڑھتے۔ اور یہ بھی جائز نہ ہوتا کہ مقیم کے ساتھ مسافر اسے پوری پڑھے۔ حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی۔ چنانچہ شافعی نے ابراہیم بن محمد سے، انھوں نے طلحہ بن عمرو سے، انھوں نے عطاء بن ابی رباح سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کیا ہے۔ سفر میں صلوٰۃ قصر بھی کی ہے اور اتمام بھی[2]

بیہقی فرماتے ہیں، اسی طرح کی روایت مغیرہ بن زیاد کی عطاء سے ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح سند وہ ہے جس کی خبر ابو بکر حارثی نے دارقطنی سے اور انھوں نے محاملی سے دی ہے اور جس میں آیا ہے کہ ہم سے سعید بن محمد بن ثواب نے، انھوں نے کہا ہم سے ابو عاصم نے، انھوں نے کہا ہم سے عمر بن سعید نے حدیث بیان کی، انھوں نے عطاء سے اور انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر بھی کرتے تھے، اتمام بھی۔ صوم سے نہیں بھی رہتے تھے اور صوم بھی رکھتے تھے"، دارقطنی فرماتے ہیں یہ سند صحیح ہے[3]۔ اس کے بعد وہ ابو بکر نیشاپوری کی سند سے ایک روایت بیان کرتے ہیں وہ عباس دوری سے روایت کرتے ہیں کہ ابو نعیم نے ہمیں خبر دی، انھوں نے کہا ہم سے علاء بن زہیر نے حدیث بیان کی، انھوں نے کہا مجھ سے عبد الرحمٰن بن اسود نے حدیث بیان کی وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ " انھوں نے مدینہ سے مکہ چل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمرہ ادا کیا۔ مکہ پہنچیں تو فرمایا " اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے قصر کیا ہے اور میں نے اتمام۔ آپ نے صوم رکھا ہے اور میں نے نہیں" آپ نے فرمایا " عائشہ! اچھا کیا تم نے"[4] میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو فرماتے سنا ہے کہ یہ حضرت عائشہ پر جھوٹا الزام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے خلاف صلوٰۃ نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ تعجب ہے سب کو قصر کرتے ہوئے دیکھنے کے باوجود وہ بغیر کسی سبب کے تنہا کیونکر اتمام کر سکتی ہیں پھر یہی خود تو روایت بھی کرتی ہیں کہ صلوٰۃ دو دو رکعت فرض تھی بعد میں حضر میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ سفر اصل حالت پر رہ گئی۔ ایسی صورت میں فریضۂ الٰہی پر اضافہ کا خیال انھیں کیونکر آسکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کی مخالفت کیسے کر سکتی ہیں؟۔ عروہ نے یہ حدیث جب زہری سے بیان کی تو انھوں نے پوچھا " وہ صلوٰۃ آخر کیوں پوری پڑھتی تھیں؟" تو انھوں نے جواب دیا "حضرت عثمان کی طرح انھوں نے بھی تاویل کی تھی"[5]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے فعل کی جب تحسین فرما چکے تھے تو اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ایسی صورت

---

[1]۔ السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۴۳/۳ فی الصلاۃ : باب من ترک القصر فی السفر غیر رغبة عن السنة. سند صحیح ہے۔ زیلعی اور ابن حجر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2]۔ الام ۱۵۹/۱۔ سند ۱۱۴/۱۔ دارقطنی ۲۴۲/۱۔ بیہقی ۱۴۲/۳۔ طلحہ بن عمرو بن عثمان حضرمی متروک ہے۔

[3]۔ بیہقی ۱۴۱/۳۔ دارقطنی ۱۸۹/۲۔ سند جیسا کہ مصنف نے نقل کیا ہے دارقطنی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4]۔ بیہقی ۱۴۲/۳۔ دارقطنی ۱۸۸/۲۔ سند صحیح ہے۔ دیکھیے نصب الرایہ ۱۹۱/۲۔

[5]۔ تخریج گذر چکی ہے۔ روایت بخاری و مسلم کی ہے۔

ہیں تاویل کا سہارا لینا ہی صحیح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بتا چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہی ابوبکر نہ ہی عمر[1] سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ پڑھتے تھے۔ ان تمام لوگوں کو قصر کرتے دیکھنے کے باوجود کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا ان کی مخالفت کریں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عثمان کی طرح انھوں نے ضرور صلوٰۃ پوری پڑھی ہے اور دونوں نے اس کی تاویل کی ہے۔ دلیل کا پہلو ان کی روایت میں ہے نہ کہ کسی ایک شخص کی تاویل میں، جب کہ دوسرے اس کے مخالف بھی ہوں۔ واللہ اعلم۔

امیہ بن خالد نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ قرآن میں ہمیں صلوٰۃ حضر اور صلوٰۃ خوف کا ذکر تو ملتا ہے مگر صلوٰۃ سفر کا ذکر نہیں ملتا، تو انھوں نے جواب دیا "بھائی اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی اس وقت ہمیں کچھ نہ معلوم تھا ہم تو وہی کرتے ہیں جیسے کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے"[2]۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم چل کر مکہ گئے آپ مدینہ کو واپسی تک دو دو رکعتیں پڑھتے رہے"[3]۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا آپ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، اسی طرح ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی صحبتوں میں بھی دیکھا"[4]۔ یہ تمام حدیثیں صحیح ہیں۔

نفل سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ آپ فرض پر اکتفا کرتے تھے۔ وتر اور فجر کی سنت کے علاوہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے فرض صلوات سے پہلے یا بعد سنت بھی پڑھی ہے وتر اور فجر کی سنت سفر و حضر کسی حالت میں آپ نہیں چھوڑتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے اس کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا "سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت رہی مگر آپ کو سنت پڑھتے نہیں دیکھا" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[5] (احزاب: ۲۱)

تمھارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے بیان میں "یُسَبِّح" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی سنت راتبہ پڑھنے کے ہیں عام صلوٰۃ پڑھنے کے معنیٰ میں نہیں ورنہ آپ سے ثابت ہے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسبح علی ظہر راحلته حیث کان وجهه"۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری کی پشت پر جس جانب اس کا رخ ہوتا اسی جانب نفل صلوٰۃ پڑھ لیتے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فرائض کے علاوہ صلوٰۃ اللیل و ترسمیت سواری کی پشت پر جس جانب اس کا رخ ہوتا اسی جانب اشارے سے ادا کرتے تھے"[6]۔ شافعی فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ رات میں نفل پڑھتے تھے باوجود اس کے فرض کی صلوٰۃ قصر کرتے تھے۔ صحیحین

۱۔ تخریج گذر چکی ہے۔
۲۔ بیہقی، فی السنن ۳/۱۳۶۔ سند حسن ہے۔
۳۔ تخریج گذر چکی ہے۔
۴۔ تخریج گذر چکی ہے۔
۵۔ بخاری ۲/۴۷۶ فی التقصیر: باب من لم یتطوع فی السفر دبر الصلاۃ۔ مسلم (۶۸۹) فی صلاۃ المسافرین: باب صلاۃ المسافرین۔
۶۔ بخاری ۲/۴۰۷ فی الوتر: باب الوتر فی السفر۔ و ۴۷۴ فی التقصیر: باب ینزل للمکتوبۃ۔ مسلم (۷۰۰) فی صلاۃ المسافرین: باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر۔

میں عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر میں سواری کی پشت پر رات میں نفل پڑھتے دیکھا ہے[1] یہ تہجد کی صلوٰۃ تھی۔ امام احمد بن حنبل سے سفر میں نفل پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا "میرے خیال میں سفر کے اندر نفل پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے"

حضرت حسن سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سفر کی حالت میں فرض سے پہلے اور بعد میں نفل پڑھتے تھے"[2] یہی حضرت عمر، علی، ابن مسعود، جابر، انس، ابن عباس اور ابوذر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ عبداللہ بن عمر فرض سے پہلے نفل پڑھتے تھے نہ بعد میں، البتہ رات میں وتر سمیت صلوٰۃ اللیل پڑھتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے متعلق صحیح بات یہی ہے کہ آپ قصر کی گئی فرض صلوات سے پہلے نہ تو کچھ پڑھتے تھے نہ بعد میں، مگر پہلے اور بعد میں نفل پڑھنے سے منع بھی نہ فرماتے تھے لہٰذا اس کی حیثیت مطلق نفل کی تھی صلوٰۃ اقامت کی طرح سنت مؤکدہ کی نہیں تھی۔ اس کی تائید یہ حقیقت بھی کرتی ہے کہ چہار رکعتی مسافر کے لیے تخفیف کر کے دو رکعتی صلوٰۃ بنا دی گئی۔ فرض کا جب یہ حال ہے تو سنتِ مؤکدہ ضروری کیوں قرار پائے جس کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اگر مسافر کے حق میں تخفیف کا قصد نہ ہوتا تو اتمام ہی اولیٰ تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا "اگر سنت پڑھتا تو اتمام بھی کرتا"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے بوقت چاشت آٹھ رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ حالت آپ کے سفر کی تھی۔ باقی سنن ابو داؤد اور ترمذی میں صفوان بن سلیم کی روایت سے لیث کی حدیث آئی ہے، صفوان نے اسے ابوبسرہ غفاری سے، انھوں نے براء بن عازب سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے ساتھ اٹھارہ سفر کیے مگر ظہر سے قبل زوالِ آفتاب سے قریب آپ کو دو رکعتیں ترک کرتے کبھی نہیں دیکھا[3]، ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس کے متعلق امام بخاری سے دریافت کیا تو وہ اسے صرف لیث بن سعد کی سند سے بتا سکے۔ ابوبسرہ کا نام انھیں معلوم نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عائشہ کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں کبھی نہ چھوڑتے تھے۔ بخاری نے اس کو اپنی "صحیح" میں روایت کیا ہے[4]۔ لیکن یہ روایت صراحت نہیں کرتی کہ یہ عمل آپ کا حالتِ سفر میں بھی رہا ہے۔ غالباً حضرت عائشہ نے حالتِ اقامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر حالات کی خبر دی ہے۔ عورتوں کے مقابلہ میں سفر کا حال مردوں کو زیادہ معلوم رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بتا چکے ہیں کہ آپ دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پہلے یا بعد کو کچھ بھی نہ پڑھتے تھے۔ واللہ اعلم۔

سواری پر نفل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نفل سواری ہی پر خواہ اس کا رخ کسی جانب ہو ادا فرماتے تھے۔ رکوع اور سجدہ میں سر سے اشارہ

---

[1] بخاری ۲/۴۷۴ فی التقصیر : باب ینزل للمکتوبة۔ مسلم (۷۰۱) فی صلاة المسافرین : باب جواز صلاة النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجهت۔

[2] مرسل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ حسن نے نہیں پایا ہے۔

[3] ابوداؤد (۱۲۲۲) فی الصلاة : باب التطوع فی السفر۔ ترمذی (۵۵۰) فی الصلاة : باب ما جاء فی التطوع فی السفر۔ سند میں ابوبسرہ غفاری کو عجلی نے ثقہ کہا ہے۔ ابن حبان نے انھیں ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔ اس باب میں ترمذی (۵۵۲) میں ایک حدیث بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ آئی ہے جسے انھوں نے حسن قرار دیا ہے۔

[4] تخریج گذر چکی ہے۔ بخاری : ابواب التطوع۔

فرماتے تھے، سجدہ رکوع کے مقابلہ میں زیادہ پست ہوتا تھا۔ احمد اور ابوداؤد نے بروایت انس یہ مرفوع حدیث پیش کی ہے کہ "تکبیر تحریمہ پر آپ اونٹنی قبلہ رخ کر لیتے تھے پھر بقیہ صلوٰۃ جس جانب اس کا رخ ہوتا اسی جانب پڑھتے تھے"۔[1] یہ حدیث محل نظر ہے اور سواری پر جن لوگوں نے آپ کی صلوٰۃ کا تذکرہ کیا ہے جیسے عامر بن ربیعہ، عبداللہ بن عمر اور جابر بن عبداللہ ان سبھوں نے مطلقاً کہا ہے کہ سواری جس رخ ہوتی اسی رُخ آپ صلوٰۃ ادا کرتے، تکبیر تحریمہ وغیرہ کو انھوں نے مستثنیٰ نہیں کیا ہے۔ ان کی حدیثیں حضرت انس کی حدیث سے زیادہ صحیح ہیں۔ واللہ اعلم۔

آپ نے سواری پر اور گدھے پر بھی بشرطیکہ صحیح ہو صلوٰۃ ادا کی ہے۔ صحیح مسلم میں اس کی روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے ہے[2] کیچڑ کی وجہ سے بشرطیکہ ثابت ہو آپ نے سواریوں پر صحابہ کو فرض صلوٰۃ پڑھائی ہے۔ احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ایک گھاٹی میں پہنچے تو آسمان سے بارش ہو رہی تھی، نیچے زمین پر کیچڑ تھا، آپ اس وقت سواری پر تھے، صلوٰۃ کا وقت آگیا تو مؤذن نے اذان دی، اقامت کہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر آگے بڑھے اور صلوٰۃ پڑھائی۔ آپ نے اشارہ سے صلوٰۃ پڑھائی، سجدہ کا اشارہ رکوع سے پست کیا[3]۔ ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اس کی روایت میں عمر بن رماح منفرد ہیں۔ حضرت انس کی روایت سے بھی آپ کا یہ فعل ثابت ہے۔

جمع بین الصلاتین آپ کا اسوہ تھا کہ زوال آفتاب سے پیشتر سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر فرما دیتے، پھر اتر کر دونوں صلوٰۃ اکٹھا ادا فرماتے۔ سفر پر روانگی سے پہلے زوال ہو جاتا تو ظہر کی صلوٰۃ پڑھ کر سوار ہوتے۔ سفر میں عجلت ہوتی تو مغرب کی صلوٰۃ مؤخر فرما کر مغرب اور عشاء دونوں عشاء کے وقت پڑھتے۔ غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں آپ سے مروی ہے کہ آپ کوچ کرنے سے پہلے جب زوال آفتاب ہو جاتا تو ظہر و عصر ایک ساتھ پڑھ لیتے اور اگر زوال آفتاب سے پیشتر کوچ کرتے تو ظہر کو مؤخر فرما دیتے اور عصر کے وقت اتر کر دونوں صلوٰۃ ایک ساتھ ادا فرماتے۔ مغرب اور عشاء میں بھی آپ کا یہی طریقہ تھا۔ مگر حدیث کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ اسے صحیح کچھ حسن اور کچھ جیسے حاکم موضوع قرار دیتے ہیں۔ سند گو صحیح کی شرط پر ہے مگر اس پر عجیب و غریب الزام ہے۔ حاکم فرماتے ہیں ہم سے ابوبکر بن محمد بن احمد بن بالویہ نے، انھوں نے کہا ہم سے موسیٰ بن ہارون نے، انھوں نے کہا ہم سے قتیبہ بن سعید نے، انھوں نے کہا ہم سے لیث بن سعد نے حدیث بیان کی۔ وہ یزید بن ابی حبیب سے، وہ ابوطفیل سے، وہ

---

[1] مسند احمد ۳/۲۰۳۔ ابوداؤد (۱۲۲۵) فی الصلاة : باب التطوع علی الراحلة والوتر۔ سند حسن ہے۔ منذری نے اسے حسن اور کئی ایک نے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مسلم (۷۰۰) (۳۵) فی صلاة المسافرین : باب جواز صلاة النافلة علی الدابة۔ عن مالك عن عمرو بن یحیی المازنی عن سعید بن یسار عن ابن عمر رضی الله عنه۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گدھے پر سوار دیکھا، رُخ خیبر کی جانب تھا۔ دارقطنی وغیرہ کہتے ہیں کہ عمر بن یحییٰ مازنی کی یہ غلط بیانی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسی سواری یا اونٹ پر ادا کی ہے۔ گدھے پر صلوٰۃ ادا کرنا حضرت انس کا فعل ہے۔ جیسا کہ اس کا ذکر مسلم (۷۰۲) نے کیا ہے۔

[3] احمد ۴/۱۷۴۔ ترمذی (۴۱۱) فی الصلاة : باب ماجاء فی الصلاة علی الدابة فی الطین والمطر۔ سند میں عمرو بن عثمان بن یعلی بن مرہ مستور اور اس کا باپ عثمان بن یعلی مجہول ہے۔ جیسا کہ التقریب میں حافظ نے فرمایا ہے۔ ترمذی نے اسے غریب قرار دیا ہے۔ روایت میں عمر بن رماح بلخی منفرد ہیں اس کے نام کا پتہ اس کی حدیث سے لگتا ہے۔ اہل علم میں سے کئی ایک نے ان سے روایت کی ہے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ کیچڑ میں انھوں نے اپنی سواری پر صلوٰۃ ادا فرمائی۔ اہل علم کے نزدیک عمل بھی اسی پر ہے۔ احمد اور اسحاق اس کے قائل ہیں۔ ابوبکر بن عربی فرماتے ہیں کہ یعلی کی حدیث ضعیف السند مگر صحیح المعنی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جانور پر اشارہ سے صلوٰۃ ادا کرنا صحیح ہے جب کہ وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو اور تنگی مقام کے باعث اتر کر صلوٰۃ ادا کرنے کی گنجائش نہ ہو یا وہاں کیچڑ ہو۔

معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں زوال سے پہلے کوچ فرماتے تو ظہر کو مؤخر فرما کر عصر کے ساتھ ملا لیتے اور دونوں ساتھ پڑھتے۔ زوال کے بعد کوچ فرماتے تو ظہر اور عصر دونوں کو ایک ساتھ پڑھ لیتے اس کے بعد روانہ ہوتے مغرب سے پہلے روانہ ہوتے تو مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے ساتھ پڑھتے اور مغرب کے بعد کوچ کرتے تو عشاء کو مغرب کے ساتھ پڑھ لیتے"[1] حاکم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی گو ائمہ ثقہ ہیں مگر یہ سند اور متن دونوں اعتبار سے شاذ ہے۔ شاذ ہونے کے علاوہ اس حدیث میں ہمیں کوئی علت نہیں ملتی ہے جس سے ہم اسے معلول قرار دیں۔ اگر یہ حدیث لیث عن ابی الزبیر عن ابی الطفیل کے طریق سے مروی ہوتی تو اس کی وجہ سے ہم اسے معلول قرار دے دیتے، نیز یزید بن ابی حبیب اور ابوطفیل کے سلسلہ سے ہوتی تو بھی اسے معلول قرار دیا جا سکتا تھا مگر دونوں ہی علتیں اس میں موجود نہیں ہیں۔ لہذا معلول کے دائرہ سے خارج ہے۔ پھر جب ہم نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ابوطفیل سے یزید بن ابی حبیب کی کوئی اور روایت موجود نہیں ہے۔ نیز اس سیاق میں یہ متن نہ تو ابوطفیل کے کسی شاگرد نے بیان کی ہے اور نہ ہی معاذ بن جبل سے روایت کرنے والے کسی راوی نے، سوائے ابوطفیل کے۔ اس لیے ہم نے اس حدیث کو شاذ کہا۔ ابو عباس ثقفی سے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں "قتیبہ بن سعید ہم سے کہا کرتے تھے کہ اس حدیث پر احمد بن حنبل، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین، ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابوخیثمہ کی تصدیقات ثبت ہیں۔ حتی کہ سات ائمہ حدیث کا شمار کیا جنھوں نے یہ حدیث ان سے قلمبند کی ہیں اور ائمہ حدیث نے یہ حدیث قتیبہ سے اس کے متن اور سند پر متعجب ہو کر سنا مگر ہمیں یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ کسی نے اس پر کوئی نکتہ چینی کی ہے۔ آگے حاکم فرماتے ہیں کہ "مگر ہم نے اس پر غور کیا تو یہ حدیث موضوع نکلی۔ قتیبہ ثقہ اور محفوظ ہیں" پھر حاکم نے اپنی سند بخاری تک پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ "میں نے قتیبہ بن سعید سے پوچھا کہ یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل کی حدیث لیث بن سعد کی روایت سے کس کے ساتھ آپ نے قلمبند کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ خالد بن قاسم ابوالہیثم مدائنی کے ساتھ" بخاری فرماتے ہیں کہ خالد بن مدائنی شیوخ کی جانب حدیثیں منسوب کر دیا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو موضوع قرار دینا ناقابل تسلیم ہے کیونکہ ابوداؤد نے اس کی روایت یزید بن خالد بن عبداللہ بن موہب رملی سے کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم سے مفضل بن فضالہ نے حدیث بیان کی، انھوں نے لیث بن سعد سے، انھوں نے ہشام بن سعد سے، انھوں نے ابوزبیر سے، انھوں نے ابوطفیل سے، انھوں نے معاذ سے روایت کی ہے اور آگے حدیث کو ذکر کیا ہے[2]۔ چنانچہ مفضل نے قتیبہ کی موافقت کی ہے۔ قتیبہ کو مفضل کے مقابلہ میں بڑے درجہ

---

[1] حاکم نے اس کی روایت اپنی کتاب "علوم الحدیث" کے اندر کی ہے۔ احمد، ابوداؤد (۱۲۲۰) اور ترمذی (۵۵۳) نے اس کی تخریج کی ہے۔ الفتح ۲/۴۸۰ میں حافظ نے کہا ہے، ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے اسے معلول کہا ہے کیونکہ لیث سے روایت کرتے ہوئے قتیبہ منفرد ہو گئے ہیں۔ بخاری نے اشارہ کیا ہے کہ بعض ضعیف راویوں نے اسے قتیبہ کے سر ڈال دیا ہے۔ حاکم نے اسے علوم الحدیث کے اندر بیان کیا ہے۔

[2] ابوداؤد (۱۲۰۸) فی الصلاۃ : باب الجمع بین الصلاتین۔ ہشام بن سعد مختلف فیہ ہے۔ اصحاب ابوزبیر میں جو لوگ حفاظ تھے مثلاً مالک، ثوری اور قرہ بن خالد وغیرہ، انھوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور جمع تقدیم کا تذکرہ انھوں نے اپنی روایتوں کے اندر نہیں کیا ہے۔ اس باب کی ایک روایت حضرت ابن عباس سے شافعی ۱/۱۱۶، ۱۱۷-۱۱۷ اور احمد ۱/۳۶۷ میں وارد ہے۔ سند میں حسین بن عبداللہ بن عبیداللہ ضعیف ہے مگر حماد بن زید عن ایوب عن ابی قلابہ عن ابن عباس کے طریق سے اس کی شاہد بھی ہے جس کی روایت احمد (۲۱۹۱) اور بیہقی ۳/۱۶۴ نے کی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں مگر جیسا کہ حافظ نے کہا ہے اس کا مرفوع ہونا مشکوک ہے۔ ثابت موقوف ہونا ہے۔ بیہقی نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباس سے قطعی طور پر اسے موقوف روایت کیا ہے۔

کے ہیں اور حفظ میں بڑھ کر ہیں مگر قتیبہ کا تفرد ان کی متابعت کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے علاوہ ازیں قتیبہ نے سماع کی صراحت بھی کی ہے۔ چنانچہ "عن عن" کہنے کے بجائے انھوں نے "حدثنا" کہا ہے۔ ان کا سماع مجروح کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ اللہ نے انھیں حفظ، امانت، اعتماد اور عدالت کے جس مقام پر فائز فرمایا ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے بھی روایت کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے شبابہ نے، انھوں نے کہا ہم سے لیث نے حدیث بیان کی، انھوں نے عقیل سے، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہوتے تو زوال ہو جانے پر ظہر اور عصر دونوں پڑھ لیتے، پھر کوچ فرماتے۔[1] اور یہ ایسی اسناد ہے جیسا تم دیکھ رہے ہو، "شبابہ" یہ شبابہ بن سوار ہیں، یہ ثقہ ہیں اور ان کی حدیث بالاتفاق لائق احتجاج ہوتی ہے۔ مسلم نے اپنی "صحیح" میں لیث بن سعد سے اسی سند سے شیخین کی شرط پر روایت کی ہے۔ اس کا کم از کم مرتبہ یہ ہے کہ یہ معاذ بن جبل والی روایت کو تقویت پہنچا دیتی ہے۔ اس کی اصل صحیحین میں بھی موجود ہے مگر اس میں جمع تقدیم کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے بعد ابو داؤد فرماتے ہیں، ہشام نے عروہ سے، انھوں نے حسین بن عبداللہ سے، انھوں نے کریب سے، انھوں نے حضرت ابن عباس سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مفضل جیسی حدیث روایت کی ہے۔ یعنی جمع تقدیم کے باب میں حضرت معاذ کی حدیث۔ حدیث یہ ہے "عروہ نے حسین بن عبداللہ بن عبید اللہ بن عباس سے، انھوں نے کریب سے، انھوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا "سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ تمھیں بتاؤں؟ آپ منزل پر ہوتے اور آفتاب ڈھل جاتا تو ظہر اور عصر ملا کر پڑھ لیتے مگر زوال سے پہلے سفر پر روانہ ہو جاتے تو ظہر کو مؤخر کر کے ظہر اور عصر دونوں عصر کے وقت پڑھتے" فرماتے ہیں، میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "مغرب اور عشاء میں بھی آپ کا یہی طریقہ تھا۔" شافعی نے اس کی روایت بہ حدیث ابن ابی یحییٰ عن حسین اور بہ حدیث ابن عجلان عن حسین کی ہے۔[2]

بیہقی فرماتے ہیں، ایسے ہی ہشام بن عروہ وغیرہ اکابر نے بھی حسین بن عبداللہ سے روایت کی ہے۔ عبدالرزاق نے اس کی روایت جریج سے، انھوں نے حسین سے، انھوں نے عکرمہ اور کریب سے اور ان دونوں نے حضرت ابن عباس سے کی ہے۔ ایوب نے اس کی روایت ابو قلابہ سے، انھوں نے حضرت ابن عباس سے کی ہے۔ فرماتے ہیں مجھے اس حدیث کا مرفوع ہونا ہی معلوم ہے۔ اسماعیل بن اسحاق فرماتے ہیں ہم سے اسماعیل بن ابی ادریس نے بیان کیا ہے، انھوں نے کہا مجھ میرے بھائی نے بیان کیا ہے، وہ سلیمان بن مالک سے، وہ ہشام بن عروہ سے، وہ کریب سے، وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر میں جب جلدی ہوتی تو زوال سے پہلے روانہ ہو جاتے آگے منزل فرما کر ظہر اور عصر دونوں ایک ساتھ پڑھتے۔ اور اگر زوال سے پہلے روانہ نہ ہوتے تو ظہر اور عصر دونوں ایک ساتھ پڑھ کر سوار ہوتے۔ مغرب کے وقت سفر کا ارادہ ہوتا تو مغرب اور عشاء کی صلوٰۃ دونوں ایک ساتھ پڑھ لیتے۔"

ابو العباس ابن شریح فرماتے ہیں، یحییٰ بن عبدالحمید نے ابو خالد احمر سے، انھوں نے حجاج سے، انھوں نے حکم سے، انھوں نے مقسم سے، انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب زوال تک کوچ نہ فرماتے تو ظہر و عصر دونوں ایک ساتھ پڑھ لیتے اور زوال سے پہلے کوچ فرماتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے وقت دونوں ایک ساتھ پڑھتے۔"

---

[1] بیہقی ۳/۱۶۲، سند صحیح ہے۔

[2] سابقہ تعلیق میں اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں، جمع تقدیم کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے عرفہ میں مصلحت وقوف کے پیش نظر ظہر اور عصر اکٹھا پڑھی ہے تاکہ دعا کا وقت مسلسل رہے۔ اور صلوٰۃ عصر کے لیے منزل کرنے سے جس کا بلا مشقت امکان بھی تھا منقطع نہ ہوسکے۔ لہذا مشقت اور ضرورت دونوں کے سبب جمع کرنا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

شافعی فرماتے ہیں عرفہ میں عصر کی صلوٰۃ مقدم کردینا آپ کے حق میں زیادہ سہولت کا موجب تھا اس طرح دعا کا تسلسل باقی رہتا، عصر کی وجہ سے منقطع نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل مزدلفہ میں آپ کے لیے آسان یہ تھا کہ چلتے رہیں اور مغرب کے لیے منزل فرما کر اسے منقطع نہ کریں۔ کیونکہ اس میں لوگوں کے لیے تنگی تھی۔ واللہ اعلم۔

سفر میں سواری کی پشت پر ہوتے یا منزل فرماتے تو وہاں جمع بین الصلاتین آپ کا دستور نہ تھا۔ اکثر حضرات سفر کرتے ہوئے جمع بین الصلاتین کرنے لگتے ہیں، سفر کی عجلت ہوتی یا صلوٰۃ کے فوراً بعد روانگی ہوتی تو آپ جمع کرتے تھے۔ جیسا کہ واقعۂ تبوک میں پیش آیا۔ باقی منزل پر ہوں، سفر نہ کر رہے ہوں تو وقوف کا تسلسل باقی رکھنے کے لیے صرف عرفہ میں ایسا کرنا آپ سے منقول ہے۔ جیسا کہ امام شافعی اور ہمارے شیخ کا قول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اسے عرفہ کے ساتھ مخصوص مانا ہے اور اسے مجموعۂ نسک میں شمار کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہاں سفر سبب نہیں ہے۔ مگر امام احمد، مالک اور شافعی نے اس کا سبب سفر ہی مانا ہے۔ آگے ان میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام شافعی نے اور ایک روایت کے مطابق احمد نے بھی طویل سفر کو سبب قرار دیا ہے۔ مکہ والوں کے لیے دونوں نے جائز قرار نہیں دیا ہے اور امام مالک نے اور ایک دوسری روایت کے مطابق احمد نے بھی اہل مکہ کے لیے عرفہ میں جمع بین الصلوٰۃ اور قصر کرنا جائز کہا ہے۔ یہی قول ہمارے شیخ کا اور عبادات میں ابوخطاب کا بھی ہے۔ بعد میں ہمارے شیخ نے اسے چھوڑ کر سفر خواہ طویل ہو یا مختصر ہر حال میں قصر اور جمع بین الصلاتین کے جواز کی اصل قرار دے دی ہے جیسا کہ اکثر سلف کا مذہب ہے۔ مگر مالک اور ابوخطاب نے اسے اہل مکہ کے ساتھ مخصوص مانا ہے۔

آپ نے قصر اور صوم نہ رکھنے کے سلسلہ میں اپنی امت کے لیے سفر کی کوئی متعین مسافت مقرر نہیں فرمائی ہے بلکہ مطلق رکھا ہے جیسا کہ تیمم علی الاطلاق ہر سفر میں کرسکتے ہیں۔ ایک یا دو یا تین دنوں کی تعیین جن روایات کے اندر ملتی ہے ان میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

قرأت قرآن اور استماع قرآن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

قرآن پاک کا ایک حزب مقرر تھا جسے آپ ہمیشہ پڑھتے تھے، کبھی ناغہ نہ کرتے تھے۔ قرأت کے اندر ترتیل ملحوظ ہوتی، تیز اور جلد جلد نہ پڑھتے تھے، حرف حرف بالکل واضح ہوتا، آیت آیت علیحدہ معلوم ہوتی، حروف مد پر آواز کھینچتے چنانچہ الرحمٰن، الرحیم کھینچ کر پڑھتے۔ آغاز قرأت میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے۔ گاہ آغاز میں یہ بھی پڑھتے۔

اللّٰھم انی اعوذ بك من الشیطان الرجیم من ھمزہ و نفخہ و نفثہ [1]

---

[1] احمد ۴/ ۸۰، ۸۵۔ ابوداؤد (۷۶۴) فی الصلاۃ : باب ما یستفتح بہ الصلاۃ من الدعاء۔ ابن ماجہ (۸۰۷) فی اقامۃ الصلاۃ : باب الاستعاذۃ فی الصلاۃ بروایت جبیر بن مطعم۔ ابن حبان (۴۴۳) اور حاکم ۱/ ۲۳۵ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

الٰہی! میں شیطان مردود سے یعنی اس کے اشارہ بازی، وسوسہ اندازی اور القاء سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔
اور یہ تعوذ قرأت سے پہلے کرتے۔ دوسروں سے قرآن سننا پسند تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔ جب انھوں نے پڑھنا شروع کیا تو سن کر آپ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔[1] قرآن بجز جنابت کے ہر حال میں پڑھتے۔ عام اس سے کہ کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں، ٹیک لگائے ہوں، وضو سے ہوں یا بے وضو۔

نغمگی اور ترنم کے ساتھ تلاوتِ قرآن کی بحث

قرآن خوش الحانی اور لے سے پڑھتے۔ اکثر آواز میں ترجیع فرماتے جیسا کہ فتح مکہ کے دن اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا پڑھتے ہوئے آواز میں آپ نے ترجیع فرمائی تھی۔ عبداللہ بن مغفل نے آپ کی ترجیع کی نقالی آ آ آ تین دفعہ دہرا کر کی ہے۔ اس کا ذکر بخاری میں آیا ہے۔[2]

مذکورہ احادیث کے ساتھ آپ کے یہ ارشادات "قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو"[3]، "جو قرآن خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں"[4] اور "اللہ تعالیٰ قرآن کو ترنم سے پڑھنے والے خوش آواز سے جس طرح سنتا ہے اس طرح کسی سے نہیں"[5] ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ آپ کی یہ ترجیع اختیاری تھی نہ کہ اضطراری جو ناقہ کے ہچکولوں سے پیدا ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ احمد ۳/۵۰۔ ابوداؤد (۷۷۵) ترمذی (۲۴۲) بروایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، سند حسن ہے۔ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب میں صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے پھر یہ دعا پڑھتے۔ سبحانك اللهم وبحمدك . . . . پھر لا الٰہ الا اللہ تین بار پھر اللہ اکبر کبیرا تین بار پھر أعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه کہتے پھر قرأت کرتے"

1۔ بخاری ۹/۸۱ فی فضائل القرآن : باب من احب ان يستمع القرآن من غيره بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ" میں نے کہا "میں قرآن سناؤں حالانکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے" فرمایا "دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں"

2۔ بخاری ۹/۸۰ فی فضائل القرآن : باب الترجيع و باب القراءة على الدابة، و فی المغازی : باب این رکز النبی صلی الله عليه وسلم الراية يوم الفتح، و فی التفسیر سورة الفتح : باب اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا۔ و فی التوحيد : باب ذكر النبي صلى الله عليه وسلم و روايته عن ربه۔

3۔ ابوداؤد (۱۴۶۸) فی الصلاة : باب استحباب الترتيل فی القراءة۔ نسائی ۲/۱۷۹، ۱۸۰ فی الصلاة : باب تزيين القرآن بالصوت۔ سند صحیح ہے۔ دارمی ۲/۴۷۴۔ مسند احمد ۴/۲۸۳، ۲۸۵ و ۲۹۶ و ۳۰۴۔ ابن ماجہ (۱۳۴۲) بروایت براء بن عازب رضی اللہ عنہ۔ ابن حبان (۶۶۰) اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔

4۔ ابوداؤد (۱۴۷۱) فی الصلاة : باب استحباب الترتيل فی القراءة۔ سند قوی ہے۔ بروایت ابولبابہ رضی اللہ عنہ۔ ایضاً (۱۴۶۹) و (۱۴۷۰) فی الصلاة بروایت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ مسند احمد (۱۴۷۶) سند صحیح ہے۔ بخاری ۱۳/۴۱۸ فی التوحيد : باب قول الله تعالىٰ " واسروا قولكم او اجهروا به " بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

5۔ بخاری ۹/۶۰، ۶۱ فی فضائل القرآن : باب من لم يتغن بالقرآن، و فی التوحيد : باب قول الله تعالىٰ " ولا تنفع الشفاعة الا لمن اذن له " و باب قول الله تعالىٰ " واسروا قولكم او اجهروا به "۔ مسلم (۷۹۲) فی صلاة المسافرين : باب استحباب تحسين الصوت بالقرآن۔ ابوداؤد (۱۴۷۳) فی الصلاة : باب استحباب الترتيل فی القراءة۔ نسائی ۲/۱۸۰ فی الصلاة : باب تزيين القرآن بالصوت۔

اگر اس ترجیع کے سبب ناقہ کا ہچکولا ہوتا تو اختیار کے تحت داخل نہ ہوتا اور نہ عبداللہ بن مغفل اس کی نقل کرتے اور نہ اسے اسوہ ثابت کرنے کے لیے اس کو جان بوجھ کر کرتے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ناقہ کے ہچکولوں سے آپ کی آواز کٹ کٹ جاتی تھی پھر بھی کہتے ہیں کہ قرآت میں آپ ترجیع فرماتے تھے۔ ترجیع کو انھوں نے آپ کے اختیاری فعل کی جانب منسوب کیا ہے۔ اگر یہ سواری کی حرکت کے سبب تھی آپ کا فعل نہیں تھا تو اسے ترجیع کا عنوان دینے کی ضرورت نہ تھی۔
آپ نے ایک شب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قرأت سنی اور پھر اپنے سننے کی انھیں خبر دی تو ابوموسیٰ نے کہا اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ آپ سن رہے ہیں تو آپ کی خاطر اور خوبصورتی پیدا کرتا [1]

سنن ابوداؤد میں عبدالجبار بن ورد کی روایت آئی ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن ابی ملیکہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عبداللہ بن یزید نے کہا "ہمارے پاس سے ابولبابہ گذرے تو ہم ان کے پیچھے ہو لیے حتی کہ وہ اپنے گھر کے اندر چلے گئے وہاں ایک بوسیدہ حال شخص کو کہتے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے "جو ترنم سے قرآن نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں"، فرماتے ہیں "میں نے ابن ابی ملیکہ سے پوچھا "ابومحمد! اگر آدمی خوش آواز نہ ہو؟" فرمایا "حتی الامکان خوش الحانی سے کام لے" [2]

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو کھولنا اور یہ بتانا ضروری ہے کہ اس بارے میں لوگوں کے اختلافات اور ان کے دلائل کیا ہیں، نیز کس کے دلائل مضبوط اور کس کے کمزور ہیں، اور مسلک حق کیا ہے؟ وباللہ التوفیق۔
چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے، خوش الحانی سے قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔ احمد اور مالک کا یہی مسلک ہے۔ خوش الحانی کے باب میں علی بن سعید کی روایت کے مطابق امام احمد فرماتے ہیں "مجھے پسند نہیں ہے، یہ تو ایجاد ہے"۔ مروزی کے روایت کے مطابق خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرنا ان کے نزدیک بدعت ہے ایسی قرأت نہیں سننی چاہیے۔
عبدالرحمن متطبب کی روایت کے مطابق خوش الحانی کو بدعت کہتے ہیں۔ اپنے صاحبزادہ عبداللہ، یوسف بن موسیٰ، یعقوب بن حبان، اثرم اور ابراہیم بن حارث کی روایتوں کے مطابق ان کا قول ہے کہ خوش الحانی مجھے پسند نہیں، ہاں اظہارِ غم میں ایسا کر سکتے ہیں، جیسے ابوموسیٰ کی آواز تھی۔ صالح کی روایت کے مطابق انھوں نے "زینوا القرآن باصواتکم" کا معنی یہ بتایا کہ اسے خوبصورت بنایا جائے۔ مروزی کی روایت کے مطابق آپ کا ارشاد "ما اذن اللہ لشئ کا ذنہ لنبی حسن الصوت ان یتغنی بالقرآن" اور دوسرے ارشاد "لیس منا من لم یتغن بالقرآن" کے بارے میں امام احمد نے کہا کہ ابن عیینہ فرماتے تھے "یستغنی بہ" یعنی قرآن کے ذریعہ سے بے نیاز ہو جانا مراد ہے۔ اور شافعی فرماتے ہیں یتغن معنی میں "یرفع صوتہ" کے ہے۔ سورۃ الفتح کی قرأۃ کی واقعہ بروایت معاویہ بن قرۃ اور اس واقعہ میں ترجیع کی

---

[1] المجمع ۷/۱۷۰ میں ہیثمی نے بروایت حضرت ابوموسیٰ انہی الفاظ میں روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی روایت ابویعلی نے کی ہے۔ اس کی سند میں خالد بن نافع اشعری ضعیف ہے۔ الفتح ۹/۸۱ میں حافظ نے کہا ہے کہ بروایت حضرت انس مسلم کی شرط پر ابن سعد کی حدیث ہے کہ ایک شب ابوموسیٰ صلوٰۃ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے ان کی آواز سنی۔ یہ شیریں آواز تھے چنانچہ سننے کے لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ صبح کو جب انھیں اس کی خبر دی گئی تو فرمایا کہ اگر معلوم رہا ہوتا تو ان کی خاطر آواز میں اور خوبصورتی پیدا کرتا۔ رویانی بطریق مالک بن مغول عن عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث کے سیاق کی طرح بیان کرتے ہیں، اس میں آیا ہے کہ مجھے معلوم رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری قرأت سن رہے ہیں تو اور خوبصورت بناتا۔ بخاری ۹/۸۱۔ مسلم (۷۹۳) بروایت حضرت ابوموسیٰ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "گذشتہ شب میں تمھاری قرأت سن رہا تھا کاش دیکھتے (کہ میرا کیا حال تھا) حقیقت یہ ہے کہ آلِ داؤد کی ایک خوش آوازی تمھیں عطا ہوئی ہے۔

[2] تخریج گذر چکی ہے۔ حدیث صحیح ہے۔

خبر جب ابو عبد اللہ (شافعی) کو دی گئی تو انھوں نے اسے خوش الحانی کے معنی میں لینے سے انکار کر دیا اور ان احادیث کا انکار کیا جن کے ذریعہ خوش الحانی کی اجازت پر استدلال کیا گیا ہے۔

ابن قاسم امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے صلوٰۃ میں خوش الحانی کی بابت سوال ہوا تو فرمایا "مجھے پسند نہیں، یہ گانا ہے لوگ پیسوں کے لیے گاتے ہیں"۔

خوش الحانی کو جو لوگ مکروہ سمجھتے ہیں ان میں انس بن مالک، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قاسم بن محمد، حسن، ابن سیرین اور ابراہیم نخعی شامل ہیں۔ عبد اللہ بن یزید عکبری فرماتے ہیں میں نے ایک شخص کو احمد سے سوال کرتے ہوئے سنا "خوش الحانی سے قرآن پڑھنا آپ کے نزدیک کیسا ہے؟" انھوں نے پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟" اس نے کہا "محمد" فرمایا "کیا تجھے یہ پسند ہوگا کہ یا موحمد کہہ کر پکارا جائے؟" قاضی ابو یعلیٰ فرماتے ہیں "یہ کراہت میں مبالغہ ہے"۔ حسن بن عبد العزیز جروی فرماتے ہیں، ایک شخص نے میرے لیے ایک وصیت کی، جو ترکہ اس نے چھوڑا اس میں ایک خوش الحان کنیز بھی تھی، ترکہ کا زیادہ تر حصہ یہی کنیز تھی۔ میں نے احمد بن حنبل، حارث بن مسکین اور ابو عبید سے دریافت کیا کہ اسے کیسے بیچوں؟ ان سبھوں نے کہا "سادہ طور پر"۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس طرح بیچنے میں نقصان ہے، بولے "سادہ طور پر بیچو"۔ قاضی فرماتے ہیں "ایسا جواب انھوں نے اس لیے دیا کہ اس کی خوش آوازی سننا چونکہ مکروہ تھی اس لیے اس پر معاوضہ لینا جائز نہ تھا جیسا کہ گانے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

ابن بطال فرماتے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ تغنی بالقرآن کے معنی ہیں قرآن خوش آوازی سے پڑھنا اور قرأت میں ترجیع کرنا۔ نیز ابن بطال کہتے ہیں کہ "تغنی" کسی بھی آواز و لہجہ میں پڑھنا۔ عبد اللہ بن مبارک اور نضر بن شمیل کا یہ قول ہے۔ فرماتے ہیں قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے کی اجازت دینے والوں میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر ابو موسیٰ سے کہتے تھے "ہمیں ہمارے رب کی یاد دلاؤ"، چنانچہ وہ قرآن خوش آوازی سے پڑھتے۔ حضرت عمر نے کہا "ابو موسیٰ کی طرح جو ترنم سے قرآن پڑھ سکے وہ ضرور پڑھے"۔ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ قرآن سب سے عمدہ آواز سے پڑھتے تھے۔ حضرت عمر نے ان سے ایک بار کہا "فلاں سورۃ سناؤ"۔ انھوں نے وہ سورہ سنائی تو حضرت عمر رو پڑے اور فرمایا کہ "مجھے خیال نہ تھا کہ یہ بھی نازل ہوئی ہے۔

ابن بطال فرماتے ہیں کہ ابن عباس اور ابن مسعود نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے کہ عبد الرحمٰن بن اسود بن ابی یزید رمضان کے مہینہ میں مسجدوں کے اندر خوش آوازی کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے طحاوی نے ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ خوش الحانی سے قرآن سنتے تھے۔ محمد بن عبد الحکم فرماتے ہیں میں نے اپنے والد کو اور شافعی اور یوسف بن عمر کو خوش الحانی سے قرآن سنتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابن جریر طبری کا بھی یہی مذہب مختار ہے۔ جائز قرار دینے والوں کا کہنا ہے، الفاظ ابن جریر طبری کے ہیں حدیث کے معنی آواز میں عمدگی اور معقول غنائیت پیدا کرنے کے ہیں جو سننے والے پر غم کی کیفیت طاری کر دے، بالکل ایسے ہی جیسے ترنم سے شعر پڑھنا۔ وہ معقول غنائیت ہے جس سے سامع پر طرب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو سفیان نے زہری سے، انھوں نے ابو سلمہ سے اور انھوں نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "اللہ تعالیٰ عمدہ ترنم سے قرآن پڑھنے والے نبی سے جس طرح سنتا ہے اس طرح وہ کسی اور شے کو نہیں سنتا"۔ دانشور حضرات اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ترنم یہی ہے کہ آواز کو عمدہ بنا کر طرب و مستی کی فضا پیدا کر دی جاتے۔

اس حدیث کی روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں "اللہ تعالیٰ قرآن کو با آواز بلند ترنم سے پڑھنے والے خوش آواز نبی کو

جس طرح کان لگا کر سنتا ہے اس طرح کسی اور شے کو نہیں سنتا" طبری فرماتے ہیں یہ سب سے واضح اور روشن دلیل ہے کہ ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ فرماتے ہیں : اگر ابن عیینہ کے قول کے مطابق "تغنی بالقرآن" کا مفہوم قرآن کی تلاوت کرکے دوسری شے سے بے نیاز ہونا ہوتا تو حدیث میں خوش آواز اور بلند آواز کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ کلام عرب میں بھی "تغنی" کا معروف استعمال اس غنا کے مفہوم میں ہے جو ترجیع کے ساتھ حسن صوت کا نام ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

تَغَنَّ بِالشِّعْرِ اِمَّا کُنْتَ قَائِلَہٗ　　اِنَّ الْغِنَآءَ لِھٰذَا الشِّعْرِ مِضْمَارٗ[۱]

اگر پڑھنا ہی ہے تو شعر کو ترنم سے پڑھو۔ اس لیے کہ ترنم سے پڑھنا ہی شعر کا میدان ہے۔

طبری فرماتے ہیں یہ دعویٰ کہ "ان تغنیت" استغنیت" کے معنی میں ہے کلام عرب کو نہ سمجھنے کی فاش غلطی ہے۔ عربوں کے کلام سے جو واقف ہیں ان میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ اپنے قول کی صحت پر اعشٰی کے اس شعر ؎

وَکُنْتُ امْرَءًا زَمَنًا بِالْعِرَاقِ　　عَفِیْفَ الْمُنَاخِ طَوِیْلَ التَّغَنّ[۲]

عراق میں کسی زمانہ میں میں　　پاکیزہ مقام، لمبی اقامت رکھتا تھا

سے یہ استدلال کہ "طویل التغنی" طویل الاستغناء کے معنی میں ہے بالکل غلط ہے۔ اس جگہ اعشٰی نے "تغنی" سے مراد اقامت لیا ہے۔ عرب کہتے ہیں "غنی فلان بمکان کذا" یعنی اقامت اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : "کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا" (الاعراف : ۹۱) (گویا کہ وہ یہاں اقامت پذیر ہی نہ رہے ہوں)۔

اور دوسرے شاعر کے اس شعر ؎

کِلَانَا غَنِیٌّ عَنْ اَخِیْہِ حَیَاتَہٗ　　وَنَحْنُ اِذَا مِتْنَا اَشَدُّ تَغَانِیَا

ہم دونوں اپنے ساتھی سے زندگی بھر بے نیاز رہے اور مریں گے تو یہ بے نیازی ہماری شدید ہو جائے گی۔

سے استدلال بھی غفلت کی دلیل ہے کیونکہ "تغانی" "تغنی" کا باب تفاعل ہے جس کے معنی ہر ایک کا دوسرے سے بے نیاز

۱۔ شعر حسان کا ہے۔ دیوان حسان، ص ۴۲۰۔

۲۔ دیوان حسان، ص ۲۵۔ قیس بن معدی کرب کی مدح میں۔ مطلع حسب ذیل ہے۔

لعمرك ماطول هذا الزمن　　على المرء إلا عناء معن

قسم تیری زندگی کی، زمانہ کی یہ درازی آدمی کے حق میں بہت بڑی مصیبت ہے۔

۳۔ حماسہ بصریہ ۲/۵۵۔ الأغانی ۱۳/۱۲۷۔ ان کی روایت کے مطابق شعر ابیرد کا ہے۔ ذیل الامالی ص ۳۷ کے مطابق سیار بن ہبیرہ کا اور الکامل ۱/۱۸۴ کے مطابق عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب کا ہے۔ تمام اشعار حسب ذیل ہیں۔

رأيت فضيلاً كان شيئاً ملففا　　فكشفه التمحيص حتى بداليا

أأنت أخي مالم تكن لي حاجة　　فإن عرضت أيقنتُ الا أخاليا

فلا زاد مابيني وبينك بعدما　　بلوتك في الحاجات الا تماديا

فلست براءٍ عيب ذي الود كله　　ولا بعض مافيه اذا كنت راضيا

فعين الرضى عن كل عيب كليلة　　كما أن عين السخط تبدى المساويا

ترجمہ : فضیل لفافہ کے اندر بند ایک شے کے مانند تھا جستجو نے اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔
جب تک کوئی ضرورت نہ تھی تو میرا بھائی رہا مگر ضرورت پیش آئی تو یقین ہوا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔
ضرورتوں کے موقع پر آزمانے کے بعد میرے اور تمہارے درمیان اور زیادہ دوری پیدا ہو گئی۔
رضامندی کے عالم میں دوست کے تمام یا کوئی ایک عیب تمھیں نظر نہ آئے گا۔
کیونکہ نگہ رضا ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے جیسا کہ نگاہ غضب برائیوں کو کھولا کرتی ہے۔

ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ استعمال ہوتا ہے "تضارب الرجلان" ہر ایک نے دوسرے کو مارا۔ "تشاتما" ہر ایک نے دوسرے کو گالی دی۔ "تقاتلا" ہر ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ دو کے فعل میں ایسا کہنا جائز ہے مگر ایک کے فعل میں مثلاً تغانی زید، تضارب عمرو کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح "تغنّی زید" بمعنی استغنا کہنا جائز نہیں۔ الا یہ کہ کہنے والے کی مراد بہ تکلف اظہار استغنا سے ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے "تجلد فلان" یعنی فلاں نے استقلال کا اظہار کیا، حالانکہ وہ مستقل نہیں۔ اسی طرح "تشجّع" بہ تکلف اظہار شجاعت "تکرم" بہ تکلف اظہار شرافت۔ وغیرہ ہیں۔ اگر تغنی بالقرآن کا رخ کلام عرب کے مفہوم سے دور ہو جانے کے باوجود مذکورہ بالا مفہوم ہی کی جانب موڑ دیا جائے تو مصیبت اور بڑھ جائے گی کیونکہ اس مفہوم کی رو سے یہ واجب ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نبی کے مستغنی بالقرآن ہونے کو نہیں سنتا بلکہ اس بات کو سنتا ہے کہ حقیقت حال کے خلاف اپنے آپ کو ظاہر کرے اور اس مفہوم کا فساد غیر مخفی ہے۔

فرماتے ہیں، ابن عیینہ کی تاویل کی غلطی یوں بھی ظاہر ہوتی ہے کہ استغنا عن الناس بالقرآن کے ساتھ کوئی متصف ہو تو اس کی اس صفت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی اس صفت کو سنا جاتا ہے یا نہیں اس لیے کہ یہ کان لگانے یا نہ لگانے کی صفت نہیں ہے الا یہ کہ ابن عیینہ کے نزدیک "أَذِن" بمعنی "إِذْن" یعنی اجازت ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ دو حیثیتوں سے غلط ہے۔ ایک لغوی حیثیت سے دوسرے مفہوم کو اس کے رخ سے پھیر دینے کے اعتبار سے۔

لغوی حیثیت سے أَذِن مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے "أَذِن فلان لکلام فلان فھو یاذن لہ" یعنی فلاں نے فلاں کے کلام کا خاموشی کے ساتھ انتہائی غور سے سنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (الانشقاق: ۲) یعنی اس نے (زمین نے) اپنے رب کی سنی اور یہی اس کے لیے سزاوار تھا۔ عدی بن زید کا قول ہے "إن همّي فی سماعٍ وَأَذِنٍ"[1] یعنی میری توجہ سننے اور غور سے سننے میں ہے۔ بنا بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "ما اذن اللہ لشئ" کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ نے قرآن کو نغمہ سے پڑھنے والے نبی کو جس طرح سنا اس طرح لوگوں کا کوئی کلام نہیں سنا۔

مفہوم میں احالہ (پھیر دینا، گھما دینا) کی بات یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں سے مستغنی ہو جانا جائز نہیں ہے کہ اسے مسموع یا ماذون کے ساتھ متصف کیا جائے۔ یہاں طبری کی گفتگو ختم ہوئی۔

ابوالحسن ابن بطال فرماتے ہیں، ابن ابی شیبہ کی روایت سے بھی اس مسئلہ میں اشکال پیدا ہو گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زید بن حباب نے، انھوں نے کہا مجھ سے موسیٰ بن علی بن رباح نے بیان کیا، وہ اپنے والد سے، وہ عقبہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قرآن سیکھو، اسے ترنم سے پڑھو اور لکھ لو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ حاملہ اونٹنی کے رسی سے نکل جانے سے بھی زیادہ تیزی سے نکل بھاگتا ہے"[2]۔ فرماتے ہیں عمر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو عاصم نبیل کو جب بتایا گیا کہ ابن عیینہ نے آپ کے ارشاد "یتغنی بالقرآن" کا مفہوم "یستغنی بالقرآن" بیان کیا ہے تو فرمایا "ابن عیینہ نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے"۔

ہم سے ابن جریج نے بیان کیا ہے، انھوں نے عطاء بن عبید بن عمیر سے روایت کی ہے کہ "اللہ کے نبی داؤد علیہ الصلوٰۃ

---

[1] شعر کا پہلا مصرع "أَيُّهَا الْقَلْبُ تَعَلَّلْ بِدَدَنْ" ہے۔ (اے دل! لہو ولعب میں مصروف رہ) امالی ابن شجری ۳۶/۲ دیوان عدی، ص ۱۷۲۔

[2] سند قوی ہے۔ مسند احمد ۱۴۶/۴ بسند علی بن اسحاق عن ابن المبارک عن موسیٰ بن علی عن ابیہ عن عقبۃ۔ حدیث یہ ہے "کتاب الٰہی سیکھو، اس کی حفاظت کرو، اسے ترنم سے پڑھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ حاملہ اونٹنی کے رسی سے نکل بھاگنے سے بھی زیادہ تیز بھاگ جانے والا ہے"۔

والسّلام کے پاس ایک ساز تھا جس پر وہ نغمہ زن ہوتے تھے، روتے بھی تھے، رلاتے بھی تھے" داؤد علیہ السّلام زبور ستر لہجوں سے پڑھتے تھے، یہ زبور انہی ستر لہجوں میں تھی وہ اسے اس طرح پڑھتے کہ پورا مجمع جھوم اٹھتا" امام شافعی سے ابن عیینہ کی تاویل کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "ہمیں خوب معلوم ہے، اگر استغناء کا مفہوم ہوتا تو حدیث میں مَنْ لَمْ یَسْتَغْنِ بالقرآن کے الفاظ ہوتے۔ یتغنی بالقرآن آپ نے فرمایا تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ نغمہ اور ترنم سے پڑھنا مراد ہے"

نفسیاتی دلیل کے طور پر یہ لوگ فرماتے ہیں کہ قرآن کو خوش الحانی اور خوش آوازی سے پڑھنے اور اسے نغمگی کا انداز دینے سے دلوں پر اثر ہوتا ہے اور سننے کے لیے آدمی کے اندر جذب وکشش پیدا ہوتی ہے۔ یہ انداز الفاظ کو کانوں میں اور معانی ومفاہیم کو نہاں خانۂ قلب میں اتار دیتا ہے۔ گویا یہ مقصود تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے۔ نغمگی اور ترنم سے قرآن پڑھنے کی مثال ایسی ہے جیسے دوا کے اندر شیرینی ڈال کر اسے مقام مرض تک نفوذ کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے مصالحہ جات اور خوشبوئیں کھانوں میں ڈال دی جاتی ہیں کہ کھانے والوں میں رغبت پیدا ہو جائے اور طبیعت اسے جلد قبول کرے جیسے عورت زیب وزینت کے سامان استعمال کرکے اپنے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے کہ شوہر میں مقاصد نکاح کی تکمیل کا شوق ابھر جائے۔ کہتے ہیں کہ نفس انسانی کو طرب وغناء کی ضرورت بھی ہے۔ یہ ضرورت موسیقی کے آلات وغیرہ سے ہٹ کر طرب قرآنی سے پوری کی گئی۔ جیسے حرام اور مکروہ سے ہٹ کر اس کی ضرورت بہتر شئے سے پوری کی گئی جیسے تیروں کے ذریعہ قسمت کا حال معلوم کرنے کے عوض انسان کی ضرورت استخارہ سے پوری کی گئی جو توحید خالص اور توکل ہے اور جیسے زناکاری کے عوض ضرورت نکاح سے پوری کی گئی اور جیسے قماربازی سے ہٹ کر تیراندازی اور شہ سواری میں مقابلہ کرنے سے اور سماع شیطانی سے ہٹ کر سماع رحمانی قرآنی کا دل آویز وسیلہ دے کر انسان کا مطلوب پورا کیا گیا۔ اس کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔

کہتے ہیں کہ حرام میں خالص یا راجح مفسدہ کا ہونا ضروری ہے مگر خوش آوازی اور لَے سے پڑھنے میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کیونکہ ایسی صورت میں کلام نہ ہی اپنی وضع سے ہٹتا ہے اور نہ ہی سامع اور اس کے فہم کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ اگر بایں انداز ادائیگی قرأت سے حروف زیادہ ہو جائیں جیسا کہ مخالفت کرنے والوں کا خیال ہے تو کلمہ یقیناً اپنے مقام ومحل سے ہٹے گا اور سامع کو دشواری پیش آئے گی، وہ اس کا مفہوم ہرگز نہ سمجھ سکے گا۔ مگر حقیقت حال یہاں اس کے برعکس ہے۔ لہٰذا حرام کے کوئی معنی نہیں۔

خوش آوازی اور لَے سے قرأت کا تعلق سراسر کیفیت ادا سے ہے جو گاہ فطری انداز کی ہوتی ہے گاہ بہ تکلف۔ ادائیگی کلمہ وکلام کی جو کیفیت بھی ہو بہرحال اس سے کلام اپنے مفردات کی وضع سے خارج نہیں ہوتا بلکہ یہ تو آواز کی صفات ہیں جن میں رقت، فخامت، امالہ، مد طویل اور مد متوسط بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کیفیات کا تعلق حروف سے ہوتا ہے اور خوش آوازی ونغمگی کا تعلق آوازوں سے۔ چنانچہ آوازوں کے آثار کو منتقل کرنا ممکن نہیں۔ جب کہ ادائیگی حروف کی کیفیتیں منتقل کی جا سکتی ہیں اور عملاً الفاظ کے ساتھ منتقل کی بھی گئی ہیں۔ مگر خوش الحانی کی اداؤں کو منتقل کرنا ممکن نہ ہوا اور کہیں ممکن ہوا تو منتقل بھی کیا گیا جیسا کہ سورہ الفتح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجیع آآآ کی حکایت کی گئی۔

یہ لوگ کہتے ہیں، خوش الحانی کے اندر دو باتیں ہیں۔ ایک مد دوسرے ترجیع۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ قرأت فرماتے ہوئے آپ اپنی آواز کھینچتے تھے۔ چنانچہ الرحمٰن، الرحیم کھینچ کر پڑھتے تھے اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ترجیع آپ سے ثابت ہے۔

جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہماری دلیل کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک تو وہ حدیث ہے جس کی

روایت حذیفہ بن یمان نے کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"قرآن عربوں کے لہجوں اور ان کی آوازیں میں پڑھو، اہل کتاب اور ارباب فسق وفجور کے لہجوں سے ہوشیار رہو کیونکہ میرے بعد کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو غنا اور نوحہ کا ترجیعی انداز دیں گے، قرآن ان کے حلقوم سے آگے نہ بڑھے گا، ان کے دل اور ان کے دل جو ان کی حالت کو پسند کریں گے فتنہ کی آماجگاہ ہوں گے۔"[1]

اس کی روایت ابوالحسن اور رزین نے تجرید الصحاح میں اور ابوعبدالحکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں کی ہے۔ قاضی ابویعلی نے جامع میں اس سے اور ایک اور دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے آثار و شرائط بیان فرماتے ہوئے کچھ باتوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

"قرآن کو مزامیر بنا لیا جائے گا اور امامت کے لیے اسے بڑھائیں گے جو نہ اقرء ہوگا نہ افضل۔ اسے اس لیے بڑھائیں گے کہ گا گا کر انھیں سناتے۔"[2]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ زیاد نہدی قاریوں کے ساتھ انس کے پاس آیا، اس سے قرأت کے لیے کہا گیا تو اس نے باواز بلند خوش الحانی سے قرأت کی، یہ بلند آواز تھا۔ انس کے چہرے پر سیاہ کپڑے کا ایک ٹکرا پڑا ہوا تھا اس کو آپ نے ہٹاتے ہوئے فرمایا "ارے۔ اس طرح اگلے لوگ نہیں پڑھتے تھے"۔ انس کا معمول تھا کہ جب کوئی منکر چیز دیکھتے تو چہرے سے کپڑا ہٹا دیتے تھے۔ اذان خوش الحانی سے دینے والے مؤذن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا ہے۔ جیسا کہ ابن جریج نے عطاء اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مؤذن خوش آواز تھا آپ نے اس سے فرمایا "اذان سادہ اور آسان ہے۔ اگر اس میں سادگی اور سہولت پیدا کر سکو تو ٹھیک ورنہ اذان نہ دو"۔ اس کی روایت دارقطنی نے کی ہے۔[3]

عبدالغنی بن سعید حافظ نے قتادہ کی حدیث بیان کی ہے جسے انھوں نے عبدالرحمن بن ابوبکر سے، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت مد ہوتی تھی اس میں ترجیع نہیں تھی"۔

ترجیع اور خوش آوازی کا تقاضا یہ ہے کہ جو کلمہ مہموز نہ ہو اسے مہموز اور جو ممدود نہ ہو اسے ممدود پڑھا جائے۔ الف کئی الف

---

[1] الاوسط للطبرانی، شعب الایمان للبیہقی بروایت بقیۃ عن الحصین الفزاری عن ابی محمد عن حذیفۃ۔ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ بقیہ ضعیف راویوں سے تدلیس کرتے ہیں۔ انھوں نے عن عن کرکے بیان بھی کیا ہے۔ ابومحمد مجہول ہے۔

[2] حدیث صحیح ہے۔ احمد ۳/۴ ۴۹۴ بروایت شریک عن ابی الیقظان عثمان بن عمیر عن زاذان عن عُلیم عن عابس۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے "چھ باتیں ہوں تو جلد موت کو سینے لگا لو (۱) بیوقوف کی حکومت۔ (۲) بکثرت شرائط۔ (۳) انصاف کی بیع۔ (۴) خون کی ارزانی۔ (قطع رحمی۔ (۶) مستی۔ قرآن کو مزامیر بنا لیں گے۔ گا کر پڑھنے والے کو آگے بڑھائیں گے۔ خواہ فقہ میں کتنے کم درجہ کا کیوں نہ ہو"۔ شریک اور ابویقظان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے سند ضعیف ہے مگر حدیث صحیح ہے۔ اس کی روایت طبرانی اور ابن شاہین نے بطریق موسیٰ جہنی عن زاذان کی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے ساتھ جس کا نام عابس تھا۔۔۔۔۔ اس کی ایک شاہد احمد ۶/۲۲، ۲۳ میں بروایت عوف بن مالک اور دوسری مستدرک حاکم ۳/۴۴۳ میں بروایت حکم بن عمرو غفاری آئی ہے۔ ان دونوں سے حدیث صحیح اور قوی ہو جاتی ہے۔ اور الاصابہ میں عابس کے ترجمہ میں ابن شاہین نے بطریق قاسم عن ابی امامہ عن عابس الغفاری صاحب رسول صلی اللہ علیہ وسلم روایت کی ہے۔ آگے عادات کا ذکر ہے۔

[3] دارقطنی ۱/۲۳۹ سند کے اندر اسحاق بن یحییٰ کعبی کے بارے میں ذہبی نے "المیزان" میں کہا ہے کہ ظالم ہے۔ ثقہ راویوں سے منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ لہٰذا حدیث ضعیف ہے۔

واؤ کئی واؤ اور یا کئی یا بن جاتے ہیں۔ اس طرح قرآن میں اضافہ لازم آتا ہے جو جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جائز وناجائز کا کوئی خط کھینچا نہیں جاسکتا۔ کھینچا گیا تو اللہ کی کتاب اور اس کے دین میں ایک زبردستی کی بات ہوگی اور نہ کھینچا گیا تو قاریوں کو کھلی چھٹی مل جائے گی کہ جیسی اور جس طرح چاہیں آوازیں نکالیں، جتنی چاہیں ترجیعات اختیار کریں، سر لگالیں، گلوکاریاں فرمائیں۔ جیساکہ اشعار پڑھتے وقت گویوں کے اور جنازوں کے آگے قاریوں کے اور دیگر بہت سارے اہلِ قرأت کے انداز ہوا کرتے ہیں۔ اسی سے کتابِ الٰہی میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ نیز شعر وگیت کے طرز پر اور غناء کے سروں سے قرآن کا پڑھنا لازم آتا ہے جو اللہ اور اس کی کتاب کے خلاف ایک جسارت ہے، تلعب بالقرآن ہے اور تزیینِ شیطانی کی جانب میلان۔ علماء اسلام میں اسے کوئی جائز قرار نہیں دیتا۔ ظاہر ہے کہ خوش الحانی اور ترنم مذکورہ باتوں کا ایک قریبی ذریعہ ہے اس سے روکنا ویسا ہی ہے جیسے ذرائع حرام سے روکا جائے۔ یہ ہیں دونوں فریقوں کے موقف اور ان کے دلائل کے معیار۔

اس نزاعی مسئلہ میں قولِ فیصل یہ ہے کہ خوش آوازی اور غنائیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فطری جس میں تکلف، مشق وتمرین اور تعلیم کا دخل نہیں ہوتا انسان کو اگر اس کی طبیعت پر آزاد چھوڑ دیا جائے تو خود بخود اس کے اندر سے نغمہ پھوٹتا ہے۔ قرآن اس فطری نغمگی کے ساتھ پڑھا جائے تو جائز ہے۔ ایسی صورت میں طبیعت کو مزید تزیین وتحسین کے زیور سے آراستہ کردیا جائے تو بھی جائز ہے جیساکہ ابوموسیٰ اشعری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا۔ "اگر معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو تلاوت کو اور زیادہ مزین کردیتا۔"

غم واندوہ میں بھرا ہوا اور اسی طرح جس کے سینہ میں شوق ومحبت کا طوفان بپا ہوا س بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ کیفیت حزن اور طرب کو قرأۃ میں دفع کرسکیں۔ چونکہ یہ کیفیت فطرت کے مطابق ہوتی ہے اس لیے نفس اسے قبول کرتا اور نغمگی سے اسے آراستہ کردیتا ہے اس میں تکلف اور تصنع کا دخل نہیں ہوتا۔ لہذا یہ کیفیت طبعی ہے بناوٹی نہیں سلف کا یہی طریقہ تھا۔ اسی طریقہ پر وہ سنتے تھے۔ لہذا یہ غناء محمود اور لائقِ تعریف ہے۔ سامع اور تلاوت کرنے والے دونوں ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس مسلک کے جو ماننے والے ہیں ان کے تمام دلائل اسی منہج پر محمول ہوں گے۔

دوسری صورت وہ ہے جس نے ایک فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ فطرت میں اس کا گذر نہیں بلکہ حاصل بھی بہ تکلف ہوتا ہے۔ اس کے لیے مشق وتمرین کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے اسی طرح سیکھتے ہیں جس طرح گانے کی آوازیں مرکب اور بسیط راگوں کے ساتھ سیکھی جاتی ہیں۔ ان میں مخصوص سُر اور مختلف اختراعی اوزان ہوتے ہیں جو صرف تعلیم وتکلف ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس صورت کو سلف نے مکروہ سمجھا ہے، اس پر نکتہ چینی کی ہے، مذمت کی ہے، اسے اختیار کرنے سے منع کیا ہے اور اسے اختیار کرنے والوں کو ناپسند کیا ہے۔ اس مسلک کے ماننے والوں کے دلائل اسی پہلو سے ہیں۔ اس تفصیل سے مذکورہ بالا اشتباہ رفع ہوجاتا ہے اور حق وناحق کیا ہے دونوں کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ جن لوگوں کو بھی بزرگان سلف کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ سلف صالحین کا دامن موسیقائی راگوں پر قرآن پڑھنے سے پاک ہے۔ یہ راگ چند محدود اور موزوں سُروں اور حرکات کا نام ہیں۔ حاشا وکلّا انھوں نے اس انداز پر قرأت نہیں فرمائی ہے نہ اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ان کی قرأت میں سوز وساز کا عنصر ہوتا تھا، قرآن کو خوش آوازی سے پڑھتے تھے۔ کبھی سوزِ غم سے، کبھی سازِ طرب سے، کبھی شوق سے، یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ گویہ تقاضا شدید ہے مگر پھر بھی شارع نے اس سے روکا نہیں بلکہ اس کی دعوت بھی دی، رہنمائی بھی کی، خبر بھی دی کہ اس انداز پر پڑھنے والے کو اللہ سنتا ہے۔ اور ارشاد بھی فرمایا کہ "جو ترنم سے قرآن نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔"

اس ارشاد میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اس امر واقعہ کی خبر ہے جسے ہم سب اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس شخص کے طریقہ کی نفی ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔

مریضوں کی عیادت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ

صحابہ میں کوئی بیمار ہو جاتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ ایک یہودی لڑکا آپ کی خدمت کرتا تھا[1] بیمار ہوا تو عیادت کے لیے تشریف لے گئے نیز اپنے چچا جو کہ مشرک تھے ان کی عیادت کی[2] دونوں کو دعوتِ اسلام پیش کیا۔ یہودی نے قبول کیا مگر آپ کے چچا نے اسلام قبول نہیں کیا۔

عیادت کا طریقہ یہ تھا کہ بیمار کے پاس جا کر اس کے سرہانے بیٹھتے اور حال دریافت فرماتے۔ پوچھتے کہ اس وقت کیسے ہو؟ روایت ہے کہ مریض سے یہ بھی دریافت فرماتے کہ کھانے کی کچھ اشتہا ہے؟ اگر کوئی ایسی چیز بتاتا جو اس کے حق میں مضر نہ ہوتی تو فراہم کرنے کا حکم دیتے۔ دایاں ہاتھ مریض کے جسم پر پھیرتے ہوئے دعا فرماتے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ! اَذْهِبِ الْبَأْسَ وَاشْفِهٖ اَنْتَ الشَّافِیْ، لَاشِفَآءَ اِلَّا شِفَآؤُكَ شِفَآءً لَّا یُغَادِرُ سَقَمًا[3]

الٰہی! لوگوں کے پروردگار! بیماری دور فرما، شفا دے کہ تو ہی شافی ہے۔ شفا، تیری شفاء ہے۔ ایسی شفا، جو کچھ بھی بیماری نہ رکھے۔

یہ دعا بھی پڑھتے۔

اِمْسَحِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ بِیَدِكَ الشِّفَآءُ، لَاکَاشِفَ لَهٗ اِلَّا اَنْتَ۔

بیماری دور فرما لوگوں کے پرودگار! شفا تیرے ہاتھ ہے۔ صرف تو ہی اس کی یہ بیماری زائل کر سکتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ۱۷۶/۳ فی الجنائز: باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه۔ بروایت انس بن مالک۔ فرماتے ہیں: ایک یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، بیمار ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ سر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا "اسلام قبول کر لے"، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو پاس ہی موجود تھا، باپ نے اس سے کہا: ابو القاسم کی بات مان لو۔ چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے وہاں سے باہر نکلے "تعریف اس اللہ کی جس نے اسے جہنم سے بچا لیا" ابو داؤد (۳۰۹۵)

[2] بخاری ۱۷۶/۳۔ بروایت سعید بن مسیب عن ابیہ۔ باپ نے انھیں بتایا کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، یہاں ابوجہل بن ہشام اور عبد اللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چچا! لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجیے میں اس کلمہ کی اللہ کے یہاں آپ کے حق میں شہادت دوں گا" ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا "ابو طالب! کیا ملت عبد المطلب کو ناپسند کرو گے"، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمۂ توحید برابر پیش فرماتے رہے اور وہ دونوں بھی اپنی بات کہتے رہے۔ ابو طالب نے ان سے اپنی آخری بات یہ کہی کہ وہ ملت عبد المطلب پر قائم ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کروں گا الا یہ کہ روک دیا جاؤں"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی (مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ) اور اللہ تعالیٰ نے ابو طالب کے بارے میں آیت نازل فرمائی (اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ) مسلم (۲۴) فی الایمان۔

[3] بخاری ۱۷۶/۱۰ فی الطب: باب رقیة النبی صلی الله علیه وسلم۔ مسلم (۲۱۹۱) بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ دوسری روایت بھی بخاری کی ہے۔

مریض کو تین بار دعا دیتے۔ جیسا کہ آپ نے سعد کے حق میں تین بار فرمایا "الٰہی سعد کو شفاء دے، الٰہی سعد کو شفاء دے، الٰہی سعد کو شفاء دے[۱]" مریض کے پاس جا کر یہ بھی فرماتے " لَا بَأْسَ طُهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ"[۲] (اندیشہ نہیں، انشاء اللہ صحت ہوگی) گاہ یہ فرماتے تھے۔ " كَفَّارَةٌ وَّطُهُوْرٌ " (بیماری گناہوں کا کفارہ بن جائے گی اور صحت ہوگی) کسی کو پھوڑا، زخم یا تکلیف ہوتی تو آپ دم بھی فرماتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا کہ انگشتِ شہادت زمین پر رکھتے اور پھر اٹھا کر یہ دعا فرماتے:

بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفٰى سَقِيْمُنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا۔

اللہ کے نام سے، ہماری زمین کی مٹی ہم میں کسی کے تھوک سے گھل مل جائے، ہمارے پروردگار کے حکم سے ہمارا بیمار شفا پا جائے۔

یہ صحیحین کی روایت ہے[۳] اس سے جنت میں بلاحساب داخل ہونے والے ستر ہزار والی حدیث "اِنَّهُمْ لَا يَرْقُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ"[۴] میں آیا ہوا لفظ " لَا يَرْقُوْنَ " (جھاڑ پھونک نہیں کرتے) راوی کی غلطی قرار پاتا ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو ایسا ہی کہتے ہوئے سنا ہے۔ فرماتے ہیں حدیث یوں ہے " هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ " (یہ وہ لوگ ہیں جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے)۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جنت میں بغیر حساب اس لیے داخل ہوتے کہ ان کے اندر کمال درجہ کی توحید موجود تھی۔ اسی لیے ان سے استرقاء (جھاڑ پھونک کرانا) کی نفی کی گئی ہے اور اسی بناء پر فرمایا "وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" (اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں) پس وہ اپنے رب پر کمالِ توکل، کمالِ اعتماد، کمالِ اطمینان، کمالِ رضا اور کمالِ احتیاج کے سبب لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے۔ نہ تعویذ کراتے ہیں نہ گنڈا، اور بدشگونی ان کو ان کے عزائم و مقاصد سے نہیں روکتی کیونکہ بدشگونی عقیدۂ توحید میں ضعف و نقص پیدا کرتی ہے۔ فرمایا "دم کرنے والا صدقہ دینے والا محسن ہے اور دم کرانے والا سائل ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دم کیا ہے کروایا نہیں ہے۔ آپ کا ارشاد ہے "جو اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکے وہ ضرور پہنچائے[۵]"

اگر کہا جائے کہ صحیحین کی اس حدیث کا کیا جواب ہوگا جو حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر تشریف لاتے تو دونوں ہاتھوں کو اکٹھا کر کے اس میں دم فرماتے پھر " قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ " " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ " اور " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ " پڑھ کر دونوں ہاتھ جہاں تک پہنچتے جسم پر پھیرتے، سر اور چہرے سے شروع کرتے، جسم کے سامنے والے حصہ پر پھیرتے اور ایسا تین بار کرتے۔" حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تو مجھے ایسا کرنے کا حکم دیتے[۶]

۱ھ۔ بخاری ۱۰/۱۰۳ فی المرضیٰ : باب وضع الید علی المریض۔ مسلم ۳/۱۲۵۳ (۸) بروایت سعد رضی اللہ عنہ۔

۲ھ۔ بخاری ۱۰/۱۰۳۔ بروایت ابن عباس۔ دوسری روایت ابن السنی کی ہے۔

۳ھ۔ بخاری ۱۰/۱۷۶، ۱۷۷ فی الطب : باب رقیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ مسلم (۲۱۹۴) فی السلام : باب استحباب الرقیۃ من العین والنملۃ والحمۃ والنظرۃ۔ ابوداؤد (۳۸۹۵) فی الطب : باب کیف الرقی۔

۴ھ۔ بخاری ۱۰/۱۷۹ فی الطب : باب من لم یرق۔ مسلم (۲۲۰) فی الایمان : باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنۃ بغیر حساب۔ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

۵ھ۔ مسلم (۲۱۹۹) فی السلام : باب استحباب الرقیۃ من العین۔ بروایت جابر رضی اللہ عنہ۔

۶ھ۔ بخاری ۱۰/۱۷۸ فی الطب : باب النفث فی الرقیۃ، وفی فضائل القرآن : باب فضل المعوذات، وفی الدعوات : باب التعوذ والقرأۃ عند المنام۔ مسلم (۲۱۹۲) فی السلام : باب رقیۃ المریض بالمعوذات۔ ابوداؤد (۵۰۵۶) فی الأدب : باب مایقال عند النوم۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث تین طرح کے الفاظ سے مروی ہے۔ ایک تو وہی جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ ہیں کہ " اَنَّہٗ کَانَ یَنْفُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ " (آپ اپنے اوپر دم کرتے تھے)۔ تیسرے یہ ہیں " قَالَتْ : کُنْتُ اَنْفُثُ عَلَیْہِ بِھِنَّ وَاَمْسَحُ بِیَدِ نَفْسِہٖ لِبَرَکَتِھَا " (میں آپ پر ان سورتوں کو دم کرتی تھی اور برکت کے لیے خود آپ کا ہاتھ پھراتی تھی) اور ایک چوتھی حدیث بھی جس کے الفاظ یہ ہیں " کَانَ اِذَا اشْتَکٰی یَقْرَءُ عَلٰی نَفْسِہٖ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَیَنْفُثُ " (آپ جب بیمار ہوتے تو خود اپنے اوپر معوذات پڑھ کر دم کرلیا کرتے)۔

یہ تمام الفاظ ایک دوسرے کی توضیح کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے اوپر دم فرماتے تھے، درد وضعف سے ہاتھ پورے جسم پر نہ پہنچتا تو دم کرنے کے بعد حضرت عائشہ کو حکم دیتے کہ وہ آپ کا ہاتھ آپ کے پورے جسم پر گذاریں۔ یہ دم کرانا ہرگز نہیں ہے۔ حضرت عائشہ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے آپ دم کرنے کا حکم دیتے تھے بلکہ کہا یہ ہے کہ دم کرنے کے بعد آپ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی، اس کے بعد فرمایا، ایسا کرنے کا آپ مجھے حکم دیتے تھے۔ یعنی یہ کہ میں آپ کے جسم پر آپ کا ہاتھ پھیروں، جیسا کہ آپ خود کیا کرتے تھے۔

عیادت کے لیے آپ نے کوئی خاص دن یا وقت مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ امت کے لیے مریضوں کی عیادت شب وروز اور سارے اوقات میں جائز قرار دیا تھا۔ مسند میں آپ سے مروی ہے کہ " آدمی جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جنت کی نعمتوں میں چل رہا ہوتا ہے، یہاں تک کہ بیٹھ جائے اور جب عیادت کے لیے بیٹھ جاتا ہے تو رحمتِ ایزدی اس پر سایہ فگن ہوجاتی ہے۔ صبح کا وقت ہو تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں اور شام کا وقت تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں[1] "

دوسری روایت میں یوں آیا ہے " جو مسلمان بھی کسی مسلمان کی عیادت کو آتا ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے بھیجتا ہے، دن کے جس حصہ میں بھی وہ عیادت کرے فرشتے شام تک اس پر درود بھیجتے ہیں اور رات کے جس حصہ میں وہ عیادت کرے تو فرشتے اس پر صبح تک درود بھیجتے ہیں[2] "

آپ آشوب چشم وغیرہ کے مریضوں کی عیادت بھی کرتے تھے۔ گاہ مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے، پھر اس کے سینہ اور شکم پر مسح فرماتے ہوئے دعا پڑھتے " اَللّٰھُمَّ اشْفِہٖ[3] " (الٰہی! اسے شفا دے) مریض کے چہرہ پر بھی مسح کرتے، اور اگر اس سے مایوس ہوجاتے تو " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[4] " پڑھتے تھے۔

ھ[1]۔ مسند احمد (۶۱۲)۔ ابن ماجہ (۱۴۴۲) فی الجنائز : باب ماجاء فی ثواب من عاد مریضاً۔ سند قوی ہے۔

ھ[2]۔ احمد (۷۵۴) ترمذی (۹۶۹) فی الجنائز : باب ماجاء فی عیادۃ المریض۔ ابوداؤد (۳۰۹۸) فی الجنائز : باب فضل العیادۃ۔ ابوداؤد فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت علی اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ حاکم ۳/۳۴۱ نے اس کی ایک سند کو صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔

ھ[3]۔ تخریج گذر چکی ہے۔ حدیث بخاری ومسلم کی بروایت سعد رضی اللہ عنہ۔

ھ[4]۔ ان الفاظ میں ہمیں یہ حدیث نہیں ملی۔ مجمع الزوائد ۲/۳۳۱ میں ہیثمی اسی مفہوم کی حدیث بروایت ابن عباس لائے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " موت ایک خوفزدہ کرنے والی چیز ہے۔ جب تم میں سے کسی کو اپنے بھائی کی وفات کی خبر ملے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے۔ " فرماتے ہیں الکبیر میں طبرانی نے اس کی روایت کی ہے۔ سند کے اندر قیس بن ربیع اسدی پر کلام کیا گیا ہے۔

جنازہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیّبہ

جنازوں میں آپ کا اسوہ سب سے کامل اسوہ تھا۔ دنیا کی ساری قوموں کے دستور سے ہٹ کر آپ کا یہ اسوہ حسب ذیل امور پر مشتمل تھا۔

۱۔ میّت پر احسان، اور اس کے ساتھ ایسا سلوک جو قبر میں اس کے لیے نفع بخش ہو اور آخرت میں بھی۔
۲۔ مرنے والے کے اہل و اقارب پر احسان۔
۳۔ میّت کے ساتھ سلوک میں زندہ کی عبودیت کا لحاظ و قیام۔

جنازوں میں آپ کا اسوہ تھا کہ میّت کے ساتھ احسان اور اس کے پورے طور پر اللہ کا بندہ ہونے کا لحاظ فرماتے تھے۔ چنانچہ اسے اللہ کی بارگاہ میں افضل ترین حالات میں پہنچاتے۔ آپ اور آپ کے صحابہ صف بصف کھڑے ہو کر اللہ کی حمد کرتے، میّت کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے، اسے معاف کر دینے کی درخواست کرتے، پھر آگے آگے چل کر اسے اس کی قبر کے سپرد فرماتے، پھر آپ اور صحابہ قبر پر اس کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ اسے ثبات قدمی عطا فرمائے جس کا وہ اس گھڑی انتہائی محتاج ہوتا ہے، پھر اس کی قبر کی زیارت کے لیے آتے رہتے، اسے سلام کرتے اور اس کے حق میں دعا فرماتے۔ جیسا کہ زندگی کی حالت میں دنیا کے اندر اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے حالتِ مرض میں آ کر آخرت کی یاد دلاتے، وصیت اور توبہ کی ہدایت کرتے۔ لوگوں سے فرماتے کہ اس سے کلمۂ شہادت کہلاؤ تاکہ اس کی آخری گفتگو یہی ہو[1] جب موت واقع ہو جاتی تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والی قوموں کی طرح رخسار پیٹنے، کپڑے پھاڑنے، سر منڈانے اور میّت کی خوبیاں گنا کر دہاڑیں مار مار کر رونے وغیرہ سے منع فرماتے۔

میّت کے آگے سر جھکا کر رہنا، بلا آواز رونا، دل کا رنجیدہ ہونا، یہ سب خود آپ سے ثابت ہے۔ آپ پر بھی یہ کیفیت طاری ہوتی تھی۔ فرماتے ہیں: "تَدْمَعُ الْعَيْنُ وَيَحْزَنُ الْقَلْبُ وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يُرْضِي الرَّبَّ"[2] (آنکھ روتی ہے، دل غمگین

---

[1] صحیح مسلم (۹۱۶)۔ ترمذی (۹۷۶)۔ ابوداؤد (۳۱۱۷)۔ نسائی ۴/۵ بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو" ابوداؤد (۳۱۱۶)۔ حاکم ۱/۳۵۱، اور احمد ۵/۲۳۳ نے بسند حسن معاذ بن جبل سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللّٰہ ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا" ابن حبان (۷۱۹) میں بروایت ابوہریرہ اس حدیث کی ایک شاہد ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو، موت کے وقت جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللّٰہ ہوگا کسی نہ کسی دن وہ جنت میں داخل ہوگا خواہ اس سے پہلے کوئی بھی معاملہ رہا ہو"

[2] بخاری ۳/۱۳۹، ۱۴۰ فی الجنائز: باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم "إنا بك لمحزونون"، مسلم (۲۳۱۵) فی الفضائل: باب رَحْمَتِهِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم للصبیان والعیال۔ ابوداؤد (۳۱۲۶) فی الجنائز: باب البکاء علی المیت۔ بروایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

ہے، مگر ہم وہی کہیں گے جو رب کو پسند ہے۔)

ایسے موقع پر شکر ادا کرنا، إِنَّا لِلّٰهِ پڑھنا اور راضی برضا رہنا آپ نے امت کے لیے مسنون فرمایا۔ یہ رونے اور رنجیدہ ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ آپ کو اللہ کے فیصلہ پر سب سے زیادہ راضی اور اس کا سب سے زیادہ شکریہ ادا کرنے والے تھے مگر پھر بھی جب صاحبزادہ ابراہیم کی موت واقع ہوئی تو رأفت و رحمت اور رقت قلب سے رو پڑے۔ قلب اس عالم میں بھی رضائے الٰہی اور شکر و سپاس کے جذبہ سے معمور تھا، زبان ذکر و حمد کے کلمات سے تر تھی۔ یہ نازک مقام اور دونوں باتیں اکٹھا جب کسی عارف الٰہی کی سمجھ میں نہ آئیں تو اپنے بچے کی وفات کے دن ہنس پڑا۔ اس سے پوچھا گیا کہ "اس حالت میں ہنس رہے ہو؟" تو جواب دیا "اللہ نے ایک فیصلہ کیا اور میں اس فیصلہ پر خوش ہوں" اہل علم کی ایک جماعت اس موقع پر مشکل میں پڑ گئی۔ اس نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے صاحبزادہ ابراہیم کی موت پر رو پڑتے ہیں حالانکہ مخلوقات میں آپ سب سے زیادہ راضی برضا تھے" مگر یہ عارف رضا کے اس مقام پر جا پہنچا جہاں وہ ہنس رہا ہے۔ معاملہ کیا ہے؟ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو فرماتے سنا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس عارف کے اسوہ سے کامل تھا کیونکہ آپ نے عبودیت کا حق ادا فرمایا۔ چنانچہ آپ کے قلب کی وسعتوں میں رضائے الٰہی بھی اور بچے پر رحمت و رأفت بھی سبھی کچھ سما گیا۔ آپ نے اللہ کی حمد و ستائش کی، اس کے فیصلہ پر راضی رہے اور رحمت و رافت سے رو بھی پڑے، رافت نے انھیں رلایا، عبودیت اور محبت الٰہی نے حمد و ثنا کا پیام دیا مگر اس عارف کے دل میں دونوں باتیں ایک ساتھ سما نہ سکیں اس کے باطن کی وسعتوں میں دونوں کا شہود نہ ہو سکا۔ چنانچہ عبودیت رضا نے اسے رحمت و رأفت کی عبودیت سے غافل کر دیا۔

تجہیز میں عجلت اختیار کرنے کے بارے میں آپ کا اسوہ

آپ کا معمول تھا کہ میت کو پاک وصاف کر کے، خوشبو لگا کر اور سفید کپڑے میں کفنا کر اسے اللہ کی بارگاہ میں جلد پہنچا دینے کا سامان کرتے۔ اس کے بعد اسے آپ کے یہاں لایا جاتا، اس پر آپ صلوٰۃ جنازہ پڑھتے۔ اس سے پہلے شروع میں نزع کے وقت بھی آپ کو بلایا جاتا، آپ دم نکلنے تک اسی کے پاس رہتے، پھر تجہیز کے موقع پر حاضر ہوتے، پھر صلوٰۃ جنازہ پڑھتے اور اسے اس کی قبر تک پہنچاتے۔ بعد ازاں صحابہ نے دیکھا کہ ان تمام باتوں سے آپ مشقت میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب میت کا دم نکلتا اسی وقت آپ کو بلاتے۔ آپ تجہیز و تکفین اور غسل کے موقع پر حاضر ہوتے۔ صحابہ نے دیکھا کہ یہ بھی آپ پر گراں گزر رہا ہے تو خود ہی میت کی تجہیز و تکفین کر کے آپ کی خدمت میں اسے لاتے، مسجد سے باہر آپ اس پر صلوٰۃ جنازہ پڑھتے۔

مسجد میں صلوٰۃ جنازہ پڑھنا آپ کا دائمی طریقہ نہ تھا۔ بلکہ اس سے باہر ادا کرتے تھے۔ گاہ مسجد میں بھی پڑھی ہے۔ جیسا کہ سہیل بن بیضاء اور ان کے بھائی کا جنازہ آپ نے مسجد میں پڑھا ہے[1] مگر یہ آپ کی سنت و عادت نہ تھی۔ سنن ابو داؤد میں صالح مولی التوأمہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مَنْ صَلّٰی عَلٰی

---

[1] مسلم (۹۷۳) فی الجنائز : باب الصلاۃ علی الجنائز فی المسجد۔ ابو داؤد (۳۱۸۹) و (۳۱۹۰) فی الجنائز : باب الصلاۃ علی الجنائز فی المسجد۔ ابن ماجہ (۱۵۱۸) فی الجنائز : باب ماجاء فی الصلاۃ علی الجنائز فی المسجد۔ بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْءَ لَهُ[1] (جس نے مسجد میں جنازہ کی صلوٰۃ پڑھی اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے)۔

حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہے چنانچہ بروایت خطیب کتاب السنن کی اصل میں " فلا شيء عليه " (اس پر کچھ نہیں) ہے اور دوسرے " فلا شيء له " کی روایت کرتے ہیں۔ سنن ابن ماجہ میں بھی یہ روایت ہے۔ مگر یہاں الفاظ "فليس له شيء" کے ہیں۔ امام احمد وغیرہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں "اس کی روایت میں صالح مولی التوامہ منفرد ہو گئے ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ صالح کی منفرد روایتوں میں سے ہے اور اس سے صحیح حضرت عائشہ کی حدیث ہے۔ صالح کی عدالت میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان پر جرح کرتے ہیں اس کے باوجود انھوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے روایت کی ہے کہ دونوں بھائیوں کی صلوٰۃ جنازہ مسجد میں پڑھی گئی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ صالح فی نفسہٖ ثقہ ہیں جیسا کہ عباس دوری نے ابن معین کے واسطہ سے انھیں فی نفسہٖ ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن ابی مریم اور یحییٰ فرماتے ہیں کہ ثقہ اور حجت ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مالک نے انھیں ترک کر دیا ہے تو فرمایا، مالک کی ملاقات ان سے اس وقت ہوئی ہے جب وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ثوری نے بڑھاپے کے بعد ان سے سماع کیا ہے۔ لیکن ابن ابی ذئب نے بڑھاپے سے قبل ان سے سماعت کی ہے۔ علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں لیکن بوڑھے ہو چکے تھے، ثوری نے بڑھاپے کے بعد اور ابن ابی ذئب نے اس کے پہلے سماعت کی ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ ۱۲۵ سال کی عمر میں ان کے حافظہ میں فرق آگیا تھا چنانچہ ثقہ راویوں سے موضوع حدیثوں کے مشابہ روایتیں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی اخیر اور قدیم حدیثیں گڈمڈ ہو گئی ہیں اور انھیں امتیاز نہ ہو سکا۔ لہٰذا ترک کے مستحق ہیں۔

یہ حدیث حسن ہے۔ کیونکہ اس کی روایت صالح سے ابن ابی ذئب نے کی ہے، جنھوں نے حواس باختگی سے پہلے ان سے سماعت کی ہے۔ لہٰذا مسترد کیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ طحاوی نے حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث اور حضرت عائشہ کی حدیث کے بارے میں ایک اور مسلک اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں، مسجد میں سہیل بن بیضاء کی جو صلوٰۃ جنازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی وہ منسوخ ہے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری فعل نے ترک کر دیا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ عام صحابہ نے حضرت عائشہ کے خلاف اس کا انکار کیا ہے۔ انھوں نے ایسا اسی وقت کیا جب انھیں معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ مخالف حدیث نقل کر رہی ہیں۔ طحاوی کا ایک جماعت نے رد کیا ہے جن میں بیہقی وغیرہ ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں: اگر ابوہریرہ کے نزدیک عائشہ کی حدیث منسوخ ہوتی تو وہ اس کا ذکر اس دن کر دیتے جس دن ابوبکر کا جنازہ مسجد میں پڑھا گیا تھا اور جس دن عمر بن الخطاب کا جنازہ مسجد میں پڑھا گیا تھا اور وہ لوگ بھی اس کا ذکر کر دیتے جنھوں نے عائشہ کی حدیث کا انکار کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ اس وقت بھی ذکر کرتے جس وقت عائشہ نے اس حدیث کو بیان کیا۔ اس کا انکار انھیں لوگوں نے کیا ہے جن کو جواز کی جانکاری نہیں ہے۔ اسی لیے جب حضرت عائشہ نے جواز کے متعلق حدیث روایت کی تو لوگ خاموش رہے اور اس کا انکار نہیں کر سکے اور نہ ہی کوئی معارضہ کیا۔ خطابی فرماتے ہیں: یہ بات ثابت ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی صلوٰۃ جنازہ مسجد میں پڑھی گئی ہے اور معلوم ہے کہ عام مہاجرین و انصار ان دونوں کے جنازوں میں موجود تھے اور ان کا انکار نہ کرنا اس کے جواز کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ ابوہریرہ کی حدیث (بشرطیکہ ثابت ہو) کا معنی کی تاویل یہ ہے کہ اجر کم ہو جائے گا۔ کیونکہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ مسجد میں جو آدمی جنازہ پڑھ لیتا ہے وہ گھر چلا جاتا ہے، دفن میں شریک نہیں ہوتا۔ اور جو قبرستان میں جا کر پڑھتا ہے

---

[1] ابوداؤد (۳۱۹۱) فی الجنائز: باب الصلاة على الجنازة في المسجد۔ ابن ماجہ (۱۵۱۷)۔ احمد ۲/۴۴۴ و ۴۴۵۔ طحاوی ص ۲۸۴۔ بیہقی ۴/۵۱۔ سند قوی ہے کیونکہ ابن ابی ذئب کا صالح مولی التوامہ سے سماع حواس باختگی سے قبل کا ثابت ہے۔ جیسا کہ آگے مؤلف ذکر کریں گے۔

وہ دفن میں بھی شریک ہوتا ہے اور دو قیراط اجر کا مستحق ہوتا ہے، زیادہ چلنے کا ثواب اس پر مستزاد ہے۔ اس طرح مسجد میں جو شخص صلاۃ جنازہ پڑھتا ہے اس کا اجر اس شخص کے مقابلہ میں کم ہو جاتا ہے جو مسجد سے باہر پڑھتا ہے۔

آپ کے ارشاد " فلا شئی لہ " کے معنی کی تاویل کرتے ہوئے ایک گروہ نے " فلا شئی علیہ " کے مفہوم میں اسے رکھا ہے۔ تاکہ دونوں الفاظ کے معانی متحد ہو جائیں اور تضاد واقع نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ " وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا " (الاسراء : ۷) (یعنی اگر اعمال بد کروگے تو اس کا وبال بھی تمھاری ہی جانوں پر ہوگا) یہاں " فلھا " معنی میں " فعلیھا " کے ہے۔

یہ تفصیل ہے ان دونوں حدیثوں کے بارے میں لوگوں کے اختلافات کی۔

صحیح وہی ہے جس کا ذکر ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ سنت اور اسوہ آپ کا یہ ہے کہ صلوٰۃ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی جائے مگر کسی عذر سے۔ ویسے جائز دونوں ہیں مگر افضل مسجد سے باہر ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

مرنے کے بعد میت پر کپڑا ڈالنے کے بارے میں آپ کی سنتِ طیبہ

آپ کی سنت تھی کہ موت واقع ہونے کے بعد میت پر کپڑا ڈال دیتے۔ دونوں آنکھیں بند کر کے چہرہ اور جسم کو ڈھانک دیتے، گاہ میت کا بوسہ لے لیتے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون کا بوسہ لے کر رو پڑے تھے[۱] اسی طرح صدیق اکبر نے بھی آپ کی وصال کے بعد آپ کا جھک کر بوسہ لیا[۲]

آپ میت کو غسل دینے کا حکم فرماتے اور غاسل کو اختیار دیتے کہ وہ جیسا مناسب سمجھے تین یا پانچ یا اس سے زیادہ بار غسل دے۔ آخری غسل میں کافور استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ معرکہ میں شہید ہونے والوں کو غسل نہیں دلواتے تھے[۳] امام احمد نے روایت کی ہے کہ آپ نے انھیں غسل دینے سے منع فرمایا ہے۔ ان سے پوستین اور لوہے اتار کر انہی کے کپڑوں میں دفنا دیتے تھے[۴] ان پر جنازہ نہیں پڑھا ہے۔ حالتِ احرام میں کسی کا انتقال ہوا تو اسے پانی اور بیری کی پتی سے غسل دینے

---

[۱] حدیث حسن ہے۔ ابوداؤد (۳۱۶۳) ترمذی (۹۸۹) ابن ماجہ (۱۴۵۶) بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ ترمذی فرماتے ہیں: حدیث حسن صحیح ہے۔ بروایت معاذ ابن ربیعہ۔ المجمع ۲۰/۳ میں ہیثمی نے اس کی ایک شاہد پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بزار نے اس کی روایت کی ہے بسند حسن ہے۔

[۲] بخاری ۹۱/۳ فی الجنائز : باب الدخول علی المیت بعد الموت۔ بروایت عائشہ وابن عباس رضی اللہ عنہا۔

[۳] بخاری ۲۸۸/۷ فی المغازی : باب من قتل من المسلمین یوم أحد بروایت جابر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء احد میں سے دو کو ایک کپڑے کا کفن دے کر پوچھتے کہ ان میں کون قرآن سے زیادہ اخذ کرتا رہا ہے؟ کسی کی جانب اشارہ کیا جاتا تو لحد میں اسے پہلے داخل کرتے۔ فرمایا کہ قیامت کے دن میں ان کی گواہی دوں گا۔ ان کے خون ہی میں دفن کرنے کا حکم دیا، صلوٰۃ جنازہ ان پر نہیں پڑھی، نہ انھیں غسل دیا گیا۔

[۴] ابوداؤد (۳۱۳۴) فی الجنائز : باب فی الشھید یغسل۔ ابن ماجہ (۱۵۱۵) مصنف عبدالرزاق (۶۵۷۹) طحلوی ۲۴۸/۱، بیہقی ۱۵/۴ بروایت ابن عباس۔ وہ فرماتے ہیں: "شہداء احد کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان سے لوہے اور چمڑے اتار لیے جائیں اور ان کے خون اور کپڑوں ہی میں انھیں دفن کر دیا جائے۔" سند کے اندر عطاء بن سائب پر اختلاط کا الزام ہے۔ شہید پر صلوٰۃ جنازہ نہ پڑھنا مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔ کچھ لوگ پڑھنے کے قائل ہیں۔ یہ ثوری، اصحاب رائے اور اسحاق کا مذہب ہے۔ جو بطریق ابو حماد حنفی عن عبداللہ ابن محمد بن عقیل عن جابر اس روایت کی بنیاد پر ہے کہ حمزہ آپ کے پاس لائے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ پھر شہداء کو لایا گیا اور حمزہ کے پہلو میں رکھ دیا گیا چنانچہ ان پر بھی آپ نے صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اوراحرام ہی کے دونوں کپڑوں ازار اور چادر میں کفنانے کا حکم فرمایا۔ اس کا سر ڈھانکنے اور خوشبو لگانے سے منع فرماتے۔[1] میت کے ولی کو حکم فرماتے کہ اسے اچھا کفن دے، سفید کپڑے میں کفن دے، زیادہ مہنگے کپڑوں سے منع فرماتے۔ پورا کفن موجود نہ ہوتا تو سر ڈھانک کر پیروں پر گھاس ڈال دیتے۔

میت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃِ جنازہ

جنازہ کے لیے کوئی میت حاضر کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے یہ مقروض تو نہیں ہے؟ اگر نہ ہوتا تو جنازہ پڑھتے اور اگر ہوتا تو خود جنازہ میں شریک نہ ہوتے مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجازت دیدیتے۔ یہ اس لیے کہ آپ کی صلوٰۃ درحقیقت مردے کے حق میں شفاعت کا حکم رکھتی ہے اور آپ کی شفاعت کا لاگو ہونا ضروری ہے۔ بندہ اپنے قرض کے بدلے رہن ہوتا ہے جب تک اس کی ادائیگی نہ ہوگی وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ پر دولت کے دروازے کھول دیئے تو مقروض پر جنازہ پڑھنے لگے۔ اس کا قرض اپنے ذمہ لے لیتے اور اس کا مال وارثوں کے لیے چھوڑ دیتے۔[2]

جنازہ کی صلوٰۃ شروع کرتے تو تکبیر کہتے اور اللہ کی حمد وثنا کرتے۔ حضرت ابن عباس نے ایک صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ اس میں تکبیر اولیٰ کے بعد سورہ فاتحہ بآواز بلند پڑھی اور فرمایا یہ اس لیے کہ تمھیں معلوم ہوجائے یہ بھی سنت ہے۔[3] ابو امامہ بن سہل نے بھی فرمایا ہے۔ "تکبیر اولیٰ کے بعد سورۂ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے۔"[4] وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس باب میں احمد ۱/۴۶۳ میں حضرت ابن مسعود سے بھی ایک روایت آئی ہے۔ سند صحیح ہے۔ ابن ماجہ (۱۵۱۳) دارقطنی ۲/۴۴، حاکم ۳/۱۹۸، بیہقی ۴/۱۲، طحاوی ۱/۲۹۰ میں ابن عباس اور طحاوی ۱/۲۹۰ میں عبداللہ بن زبیر سے بھی روایتیں آئی ہیں۔ سند قوی ہے۔ اس میں آیا ہے کہ آپ نے حضرت حمزہ پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی، نو تکبیریں بلند کیں، پھر دوسرے شہداء کو لاکر ترتیب سے رکھ دیا گیا۔ ان سب پر اور انھیں کے ساتھ حمزہ پر بھی صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ تہذیب السنن ۴/۲۹۵ میں مؤلف رقم طراز ہیں کہ مسئلہ کا صحیح پہلو یہ ہے کہ دونوں طرح کی احادیث وآثار کے پیش نظر صلوٰۃ جنازہ شہیدوں پر پڑھنے نہ پڑھنے کا اختیار ہے۔ امام احمد کا بھی ایک روایت کے مطابق یہی مذہب ہے اور یہی ان کے اصول ومذہب کے مطابق بھی ہے۔

[1] بخاری ۴/۵۵ فی الحج : باب سنۃ المحرم إذا مات، مسلم (۱۲۰۶)(۹۹) فی الحج : باب مایفعل بالمحرم إذا مات۔ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ حالتِ احرام میں اونٹنی نے اس کی گردن توڑ دی چنانچہ وہ انتقال کرگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انھیں پانی اور بیری کا غسل دو اور ان کے دونوں کپڑوں ہی کا کفن دو، خوشبو نہیں لگانا، سر نہ ڈھانکنا۔ کیونکہ قیامت کے دن یہ لبیک کہتے ہوئے اٹھیں گے۔"

[2] بخاری ۹/۴۵۱ فی النفقات : باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلا أو ضیاعًا فإلی، مسلم (۱۶۱۹) فی الفرائض : باب من ترک مالاً فلورثتہ، ترمذی (۱۰۷۰) فی الجنائز : باب ماجاء فی الصلاۃ علی المدیون۔ ہر ایک نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ متوفی شخص کو جس پر قرض ہوتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں لایا جاتا چنانچہ دریافت فرماتے کہ قرض کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟ اگر کہا جاتا کہ ہاں اتنا چھوڑا ہے کہ قرض ادا کیا جاسکے تو جنازہ پڑھتے ورنہ مسلمانوں سے فرما دیتے تم اپنے رفیق کا جنازہ پڑھ لو۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتوحات دیں تو فرمایا: "میں مسلمانوں کا خود ان کے تئیں زیادہ مستحق ہوں، مسلمانوں میں جس کی وفات ہوجائے اور قرض چھوڑے تو اس کی ادائیگی مجھ پر ہے اور دولت چھوڑے تو اس کے ورثاء کی ہوگی۔"

[3] بخاری ۳/۱۶۴ فی الجنائز : باب قرأۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنائز، ترمذی (۱۰۲۷) فی الجنائز : باب ماجاء فی القرأۃ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب، ابوداؤد (۳۱۹۸) فی الجنائز : باب مایقرء علی الجنازۃ، نسائی ۴/۷۵ فی الجنائز : باب الدعاء۔

[4] مصنف عبدالرزاق (۶۴۲۸) بروایت ابی أمامۃ بن سہل بن حنیف، فرماتے ہیں : صلوٰۃ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تکبیر کہے پھر سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، پھر میت کے لیے دعا کرے، قرأت صرف تکبیر اولیٰ میں کرے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جنازہ پر سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں: صلوٰۃ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں سنت ہے۔ ابو امامہ بن سہل نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ صلوٰۃ جنازہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا چاہیے[1]۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے سعید مقبری سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے عبادہ بن صامت سے صلوٰۃ جنازہ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا" واللہ میں تمھیں بتاتا ہوں، پہلے تکبیر کہو گے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو گے، پھر یہ دعا پڑھو گے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّ عَبْدَكَ فُلَانًا كَانَ لَا يُشْرِكُ بِكَ، وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ، اِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِيْ اِحْسَانِهٖ، وَ اِنْ كَانَ مُسِيْئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ، اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ، وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهٗ[2]

الٰہی! تیرا فلاں بندہ مشرک نہ تھا، تو اسے بہتر جانتا ہے، اگر نیکوکار رہا ہے تو تو اس کی نیکی میں اضافہ فرما، بدکار رہا ہے تو اس سے درگذر فرما، الٰہی! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ رکھنا اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔

صلوٰۃ جنازہ سے مقصود

صلوٰۃ جنازہ سے مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے۔ اس بارے میں روایات اتنی ہیں جتنی سورہ فاتحہ اور درود کے بارے میں نہیں ہیں۔

آپ سے جو دعائیں ثابت ہیں ان میں ایک یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهٖ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهٖ، وَاَهْلًا خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهٖ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهٖ، وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ[3]

الٰہی! اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم کر، اسے عافیت دے، اسے معاف فرما، اس کی ضیافت عمدہ فرما، اس کے داخل کی راہ کشادہ کر، اسے پانی، برف اور اولے سے دھو دے، اسے اس کے گناہوں سے اس طرح صاف کر دے جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے گھر سے عمدہ گھر اور اس کے اہل و عیال سے عمدہ اہل و عیال اسے عطا کر، بدلہ میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پھر فی نفسہ دائیں جانب سلام پھیرے۔ سند جیسا کہ الفتح میں حافظ نے کہا ہے صحیح ہے حاکم نے مستدرک ۱/۳۶۰ میں اس کی روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[1] الأم للشافعی ۱/۲۷۰، حاکم ۱/۳۶۰، بیہقی ۴/۳۹ بروایت ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ۔ آپ کا شمار انصار کے علماء و اکابرین میں تھا، یہ ان لوگوں کے فرزندوں میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معرکۂ بدر میں شریک تھے۔ صلوٰۃ جنازہ کے باب میں کچھ صحابہ نے ان کو خبر دی تھی کہ امام تکبیر کہے گا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے گا اور باقی تینوں تکبیرات میں دعا کرے گا۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے اور بات بھی یہی ہے۔

[2] بیہقی ۴/۴۰۔

[3] مسلم (۹۶۳) فی الجنائز: باب الدعاء للمیت فی الصلاۃ، ترمذی (۱۰۲۵) فی الجنائز: باب مایقول فی الصلاۃ علی المیت، نسائی ۴/۷۳ فی الجنائز: باب الدعاء، ابن ماجہ (۱۵۰۰) فی الجنائز: باب ماجاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ، احمد ۶/۲۳ و ۲۸ بروایت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ۔

اس کے جوڑے سے عمدہ جوڑا اسے دے، اسے جنت میں داخل فرما، اور عذاب قبر اور جہنم سے اسے بچا۔

یہ دعا بھی ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَصَغِيْرِنَا، وَكَبِيْرِنَا، وَذَكَرِنَا، وَاُنْثَانَا، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا، اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهُ مِنَّا، فَاَحْيِهِ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا، فَتَوَفَّهُ عَلَى الْاِيْمَانِ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُ، وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ [1]

الٰہی! ہمارے زندہ، مردہ، چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، موجود اور غائب سب کو بخش دے، الٰہی! جسے تو زندہ رکھ اسے اسلام پر زندہ رکھ، جسے وفات دے اسے ایمان پر وفات دے۔ الٰہی! ہمیں اس کے ثواب سے محروم نہ رکھنا اور اس کے بعد ہمیں امتحان میں نہ ڈالنا۔

نیز یہ دعا بھی۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جِوَارِكَ، فَقِهِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ، فَاَنْتَ اَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ، فَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ [2]

الٰہی! فلاں کا بیٹا فلاں تیری پناہ اور تیرے رشتۂ جوار میں پہنچ گیا ہے، لہٰذا اسے قبر اور دوزخ کے عذاب سے بچا، تو وفا اور حق والا ہے۔ لہٰذا اسے بخش دے، اس پر رحم فرما، یقیناً تو انتہائی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

نیز یہ دعا بھی۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبُّهَا، وَاَنْتَ خَلَقْتَهَا، وَاَنْتَ رَزَقْتَهَا، وَاَنْتَ هَدَيْتَهَا لِلْاِسْلَامِ، وَاَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا، وَتَعْلَمُ سِرَّهَا وَعَلَانِيَتَهَا، جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهَا [3]

الٰہی! تو اس کا پروردگار ہے، تو نے ہی اسے پیدا کیا، رزق دیا، اسلام کی توفیق دی، اور تو نے ہی اس کی روح قبض کی۔ تو جانتا ہے کہ اس کا چھپا کیا ہے، کھلا کیا ہے، ہم شفاعت کے لیے آئے ہیں لہٰذا اس کی مغفرت فرما۔

میت کے حق میں خلوص سے دعا کرنے کا آپ حکم دیتے، عموماً چار تکبیریں کہتے، پانچ تکبیریں کہنا بھی آپ سے ثابت ہے۔ صحابہ آپ کے بعد چار، پانچ اور چھ تکبیریں کہتے تھے۔ زید بن ارقم نے پانچ تکبیریں کہیں اور ذکر کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تکبیریں کہی ہیں، یہ مسلم کی روایت ہے [4] علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سہل بن حنیف کے جنازہ پر چھ تکبیریں کہیں [5] بدریوں پر چھ، دیگر صحابہ پر پانچ اور

---

[1] ترمذی (۱۰۲۴) فی الجنائز: باب مایقول فی الصلاۃ علی المیت، ابوداؤد (۳۲۰۱) فی الجنائز: باب مایقول فی الصلاۃ علی المیت، نسائی ۴/۷۴ فی الجنائز: باب الدعاء، ابن ماجہ (۱۴۹۸) فی الجنائز: باب ماجاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ، بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ابن حبان (۷۵۷) اور حاکم ۱/۳۵۸ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے، بات بھی یہی ہے۔ اس کا مرسل ہونا مضر نہیں ہے کیونکہ موصولاً بیان کرنے والی ایک جماعت ہے لہٰذا ان کی روایت ارجح اور زیادہ ثابت ہے۔

[2] ابوداؤد (۳۲۰۲) فی الجنائز: باب الدعا للمیت، ابن ماجہ (۱۴۹۹)، احمد ۳/۴۹۱ بروایت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سند جیسا کہ حافظ نے تخریج الاذکار میں کہا ہے حسن ہے۔ ابن حبان (۷۵۸) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[3] ابوداؤد (۳۲۰۰) بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، سند میں علی بن شماخ کو سوائے ابن حبان کے اور کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔ ابن علان نے تخریج الاذکار میں کہا ہے کہ "الدعا" میں حافظ نے بطریق طبرانی اس کی تخریج کے بعد کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اور السنن الکبریٰ میں نسائی نے اس کی تخریج کی ہے۔

[4] مسلم (۹۵۷) فی الجنائز: باب الصلاۃ علی القبر، ترمذی ایضاً (۱۰۲۳) فی الجنائز: باب ماجاء فی التکبیر علی الجنازۃ، ابوداؤد (۳۱۹۷) فی الجنائز: باب التکبیر علی الجنازۃ، نسائی ۴/۷۲ فی الجنائز: باب عدد (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بقیہ سارے مسلمانوں پر چار تکبیریں کہتے تھے۔ دارقطنی اس کے راوی ہیں[1]

سعید بن منصور نے حکم بن عتیبہ سے روایت کی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اہل بدر پر پانچ، چھ اور سات تکبیریں کہتے تھے۔ یہ تمام حدیثیں صحیح ہیں اس لیے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سے زیادہ تکبیروں سے منع نہیں فرمایا ہے بلکہ خود اور آپ کے بعد صحابہ نے بھی ایسا کیا ہے۔

جو لوگ چار سے زیادہ تکبیروں سے منع کرتے ہیں ان میں سے بعض ابن عباس کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری جنازہ میں چار تکبیریں کہیں[2] کہتے ہیں یہ آپ کا آخری عمل تھا، اور اعتبار آخری ہی کا ہوتا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں خلال نے "العلل" میں کہا ہے کہ حرب نے مجھے بتایا کہ امام احمد سے ابو ملیح کی حدیث کے بارے میں پوچھا گیا جس کی روایت وہ میمون سے اور وہ ابن عباس سے کرتے ہیں، اور پھر حدیث بیان کی تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ جھوٹ ہے، اس کی کوئی بنیاد نہیں، اس کا راوی محمد بن زیاد طحان ہے جو حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ یہ حضرات میمون بن مہران کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جسے انھوں نے حضرت ابن عباس سے بیان کی ہے کہ "فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کا جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں اور کہا "آدم کی اولاد! یہ تمھاری سنت ہے"۔ اس حدیث کے بارے میں اثرم کہتے ہیں کہ محمد بن معاویہ نیشاپوری مکہ میں رہتے تھے، ان کا ذکر جب ہماری محفل میں چھڑا تو ابو عبداللہ کو فرماتے سنا" میں ان کی حدیثیں موضوع سمجھتا ہوں"۔ ان موضوعات میں ابو ملیح عن میمون بن مہران عن ابن عباس کی روایت کردہ حدیث " فرشتوں نے جب آدم کا جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں" کا ذکر کیا اور اسے ایک حادثہ تصور کرتے ہوئے فرمایا " ابو ملیح کی حدیثیں تو صحیح تر ہوتی ہیں وہ نہایت متقی انسان ہیں، پھر یہ روایت کیسے کر دی"؟ ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے بھی ہے جس کی روایت بیہقی نے یحییٰ عن ابی عن النبی صلی اللہ علیہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) التکبیر علی الجنازۃ، ابن ماجہ (۱۵۰۵) فی الجنائز : باب ماجاء فیمن یکبر خمسا۔

۵۔ السنن للبیہقی ۴/ ۳۶ سند صحیح ہے، صحیح بخاری فی المغازی : باب شھود الملائکۃ بدرًا، بروایت محمد بن عباد عن ابن عیینہ۔ فرماتے ہیں کہ ابن اصبہانی نے ہمیں یہ حدیث پہنچائی کہ انھوں نے عبداللہ بن معقل سے سنا ہے کہ حضرت علی نے سہل بن حنیف پر تکبیر کہی اور فرمایا کہ یہ معرکۂ بدر میں شریک تھے۔ انھوں نے تعداد کا تذکرہ نہیں کیا۔ الفتح ۷/ ۲۴۵ میں حافظ نے کہا ہے کہ المستخرج میں ابو نعیم نے بخاری کی سند سے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت علی نے پانچ تکبیریں کہی تھیں۔ معجم الصحابہ میں بغوی نے محمد بن عباد سے بایں سند روایت کی ہے۔ اور اسماعیلی، برقانی اور حاکم نے بھی اسی سند سے روایت کی ہے اس میں انھوں نے چھ تکبیرات کا ذکر کیا ہے۔ بخاری نے "التاریخ" کے اندر محمد بن عباد سے اور سعید بن منصور نے بروایت ابن عیینہ نقل کیا ہے مگر اس میں انھوں نے پانچ کا ذکر کیا ہے۔ حاکم نے اپنی روایت کے اندر یہ اضافہ کیا ہے "علی رضی اللہ عنہ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ بدری ہیں" حضرت علی کا یہ قول کہ معرکۂ بدر میں شریک تھے اس بات کا اشارہ ہے کہ معرکۂ بدر میں شریک ہونے والوں کا تمام لوگوں میں ایک مقام ہے حتیٰ کہ تکبیرات جنازہ کے اندر بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کے نزدیک مشہور چار تکبیریں تھیں۔ یہی اکثر صحابہ کا قول بھی ہے۔ بعض سے پانچ کی روایت ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت زید بن ارقم اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث آئی ہے، یہ گذر چکی ہے جس میں آیا ہے کہ انس نے فرمایا "جنازہ کی تکبیر تین ہے" پہلی افتتاحیہ ہے۔ ابن ابی خیثمہ نے ایک اور سند سے مرفوعًا بیان کیا ہے کہ آپ چار، پانچ، چھ، سات اور آٹھ تکبیریں کہتے تھے، نجاشی کی موت پر چار تکبیریں کہیں، اور وفات تک یہی عمل رہا۔ ابو عمر فرماتے ہیں، چار تکبیروں پر اجماع ہے اور ہمارے علم کی حد تک پانچ تکبیروں کے قائل فقہاء امصار میں صرف ابن ابی لیلیٰ ہیں۔ حنفیہ کی "مبسوط" میں ابو یوسف سے انھوں نے اسی طرح کی روایت کی ہے۔ شرح مہذب میں نووی فرماتے ہیں کہ صحابہ کے درمیان اختلاف تھا پھر یہ ختم ہو گیا اور سب کا چار تکبیروں پر اتفاق ہو گیا، لیکن اگر امام بھول کر پانچ تکبیریں کہدے تو صلوٰۃ باطل نہ ہوگی۔ مگر صحیح سنت یہ ہے کہ اگر قصدًا ایسا کرے تو بھی باطل نہ ہوگی، البتہ ایسی صورت میں مقتدی کا پیروی نہ کرنا ہی صحیح ہوگا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] دارقطنی ۲/ ۷۳، طحاوی ۱/ ۲۸۷، بیہقی ۴/ ۳۷، سند صحیح ہے۔

[2] بیہقی ۴/ ۳۷۔ سند میں نضر بن عبدالرحمٰن ابو عمر خزاز ہیں جو متروک ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ دیگر سندوں سے بھی مروی ہیں مگر یہ سب کے سب ضعیف ہیں۔ البتہ اکثر صحابہ کا جو چار تکبیروں پر اتفاق ہے اس کی یہ حدیث ایک دلیل کے طور پر ہے۔

وسلم کے طریق سے روایت کی ہے کہ "فرشتوں نے جب آدم کا جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں اور کہا کہ آدم کی اولاد! یہ تمھاری سنت ہے" مگر یہ صحیح نہیں ہے[۱] مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت ہوئی ہے۔

اصحاب معاذ پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ علقمہ فرماتے ہیں میں نے عبداللہ سے کہا "معاذ کے کچھ ساتھی شام سے آتے ہیں اور اپنی ایک میت پر پانچ تکبیریں انھوں نے کہیں" انھوں نے فرمایا "جنازہ پر تکبیروں کی کوئی تعیین نہیں، امام جتنی کہے اتنی کہو، امام سلام پھیرے تو تم بھی پھیر دو[۲]"۔

صلوٰۃ جنازہ سے سلام پھیرنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

صلوٰۃ جنازہ سے سلام پھیرنے میں آپ کے اسوہ کا جہاں تک تعلق ہے تو روایت ہے کہ ایک سلام پھیرتے تھے، یہی روایت ہے کہ دو سلام پھیرتے تھے۔ چنانچہ بیہقی وغیرہ نے ابوہریرہ کی حدیث بروایت مقبری بیان کی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں اور صرف ایک سلام پھیرا[۳]" مگر اثرم کی روایت کے مطابق امام احمد نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے۔ خلال نے "العلل" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابراہیم ہجری فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن ابی اوفی نے بیان کیا کہ انھوں نے اپنی بچی کا جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں، اس کے بعد کچھ رُکے ہم نے سمجھا کہ شاید پانچویں کہیں گے مگر پھر دائیں بائیں سلام پھیر دیا، صلوٰۃ ہو گئی تو ہم نے ان سے دریافت کیا "یہ کیا؟" فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کرتے دیکھا اس پر میں نے کچھ بھی اضافہ نہیں کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے[۴]"۔

ابن مسعود فرماتے ہیں "تین باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے مگر لوگوں نے انھیں ترک کر دیا ہے، ایک تو یہ کہ صلوٰۃ کی طرح جنازہ میں بھی سلام پھیرتے تھے[۵]"۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی روایت بیہقی نے کی ہے مگر ابراہیم بن عبدی ہجری کو یحییٰ بن معین، لنسائی اور ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے، مگر شافعی نے ان کی یہ حدیث کتاب حرملہ میں سفیان سے اور انھوں نے حرملہ سے روایت کی ہے اور کہا ہے "بچی کے جنازہ پر چار تکبیریں کہیں پھر تھوڑا وقفہ کیا تو پیچھے سے لوگوں نے سبحان اللہ کہا مگر انھوں نے سلام پھیر دیا اور کہا "تم چاہتے ہو کہ چار سے زیادہ کہوں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار تکبیریں کہتے دیکھا ہے"۔ اس روایت میں دائیں بائیں سلام پھیرنے کا ذکر نہیں ہے۔ ابن ماجہ نے محاربی کی سند سے ایسے ہی روایت کیا ہے، اس میں بھی "دائیں بائیں" کا ذکر نہیں ہے[۶]۔ دائیں بائیں

۱۔ بیہقی ۴/۳۶۔ سند میں عثمان بن سعد ہے جو ضعیف ہے۔ نیز اس میں حسن نے عن عن کر کے بیان کیا ہے۔

۲۔ مصنف عبدالرزاق (۶۴۰۳)، بیہقی ۴/۳۷۔ المحلی لابن حزم ۵/۱۲۶۔ سند صحیح ہے۔

۳۔ دارقطنی ۲/۷۲، حاکم ۱/۳۶۰، بیہقی ۴/۴۳ بطریق ابوعنبس عن ابیہ عن ابی ہریرہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ کی صلوٰۃ پڑھی اس میں چار تکبیریں کہیں اور ایک سلام پھیرا" سند حسن ہے، حاکم فرماتے ہیں، جنازہ میں ایک سلام پھیرنے کی روایت صحیح ہے، یہ ابن عمر، ابن عباس، جابر، ابن ابی اوفی اور ابوہریرہ سے مروی ہے، یہ سب جنازہ میں ایک سلام پھیرتے تھے۔ دیکھیے "مصنف" ۳/۴۹۳، ۴۹۴۔

۴۔ السنن للبیہقی ۴/۴۳ سند میں ابراہیم بن مسلم ابو اسحاق ہیں جو لین الحدیث ہیں۔ انھوں نے جیسا کہ حافظ نے "التقریب" میں کہا ہے موقوف روایتوں کو مرفوع کہا ہے، مگر بعد میں آنے والی ابن مسعود کی حدیث اس کی شاہد ہے۔

۵۔ السنن للبیہقی ۴/۴۳۔ سند حسن ہے، المجمع ۳/۳۴ میں ہیثمی نے اس کی روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "الکبیر" میں طبرانی نے اس کی روایت کی ہے۔ راوی اس کے ثقہ ہیں۔ نووی نے "المجموع" ۵/۲۳۹ میں اس کی سند کو جید کہا ہے۔ (حاشیہ "۶" اگلے صفحہ پر)

سلام پھیرنے کا تذکرہ صرف شریک تنہا کرتے ہیں، بیہقی فرماتے ہیں کہ پھر انھوں نے اسے فقط تکبیر یا تکبیر وغیرہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مشہور ابن ابی اوفی سے اس کے برعکس ہے، یعنی یہ کہ وہ صرف ایک سلام پھیرتے تھے۔ اس کا تذکرہ امام احمد نے ان سے کیا ہے کہ احمد بن قاسم کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ سے پوچھا گیا "کیا آپ جانتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی جنازہ میں دو سلام بھی پھیرتا تھا"؟ فرمایا "نہیں"۔ باقی چھ صحابہ سے روایت ہے کہ وہ دائیں جانب صرف ہلکا سا سلام پھیرتے تھے، اس کے بعد انھوں نے ابن عمر، ابن عباس، ابوہریرہ، واثلہ بن اسقع، ابن ابی اوفی اور زید بن ثابت کا نام لیا۔ بیہقی نے مزید علی بن ابی طالب، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، ابوامامہ بن سہل بن حنیف کے نام بھی گنائے ہیں۔ یہ کل دس صحابہ ہیں۔ حضرت ابوامامہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے، آپ نے ان کا نام ان کے نانا ابوامامہ اسعد بن زرارہ کے نام پر رکھا، صحابہ اور کبار تابعین میں ان کا شمار ہے۔

جنازہ میں رفع یدین کی بحث

صلوٰۃ جنازہ میں رفع یدین کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں، اثر کی رعایت اور طریقہ پر قیاس کرتے ہوئے رفع یدین کریں گے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ میں کھڑے کھڑے ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اثر سے ان کی مراد ابن عمر اور انس بن مالک سے ان کی وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ وہ دونوں جنازہ کی ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے[1] آگے امام شافعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ اول تکبیر میں رفع یدین فرماتے تھے اور بائیں پر دایاں ہاتھ رکھتے تھے"۔ بیہقی نے "سنن" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ترمذی میں ابوہریرہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ جنازہ میں اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا"۔ مگر یہ حدیث یزید بن سنان راوی کی وجہ سے ضعیف ہے[2]

یہی قول ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ بعض اہل علم کا قول یہ ہے کہ صرف پہلی بار رفع یدین کرے گا۔

قبر پر صلوٰۃ جنازہ

آپ کی سنت یہ تھی کہ صلوٰۃ جنازہ فوت ہو جاتی تو قبر پر جا کر پڑھتے[3] چنانچہ ایک دفعہ ایک رات، ایک دفعہ تین دن[4] اور ایک بار

(حاشیہ "۱۲" صفحہ گذشتہ)

۶۔ ابن ماجہ (۱۵۰۳) فی الجنائز: باب ماجاء فی التکبیر علی الجنازۃ أربعاً۔ سند میں ابراہیم ہجری جیسا کہ گزر چکا ہے ضعیف ہیں۔

۱۔ السنن للبیہقی ۴/۴۴، ابن عمر کے طریق سے سند صحیح ہے۔ فرماتے ہیں "انس سے روایت ہے کہ جنازہ پر جب وہ تکبیر کہتے تو رفع یدین کرتے" نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً یہ ثابت نہیں ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ اس باب میں اہل علم کا اختلاف ہے، صحابہ وغیرہم اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ جنازہ کی ہر تکبیر میں آدمی رفع یدین کرے گا۔ یہ ثوری اور اہل کوفہ کا قول ہے۔

۲۔ السنن للبیہقی ۴/۳۸، ترمذی (۱۰۷۷) فی الجنائز: باب ماجاء فی رفع الیدین فی الجنازۃ۔ سند میں یحییٰ بن یعلی اسلمی اور ابو فروہ یزید بن سنان دونوں ضعیف ہیں۔ المحلی ۵/۱۲۸ میں ابن حزم فرماتے ہیں کہ رفع یدین کا جہاں تک تعلق ہے یہ صرف پہلی تکبیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لہٰذا اس کے علاوہ رفع یدین جائز نہیں کیونکہ یہ صلوٰۃ جنازہ میں غیر منصوص عمل ہوگا۔ حنفیہ وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔

۳۔ بخاری ۳/۱۵۲، مسلم (۹۵۴) فی الجنائز: باب الصلاۃ علی القبر، بروایت ابن عباس۔ اس باب میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک مہینہ کے بعد[1] قبر پر صلوٰۃ جنازہ ادا کی۔ اس سلسلہ میں آپ نے کسی وقت کی تعیین نہیں فرمائی ہے۔ احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، قبر پر صلوٰۃ جنازہ کے بارے میں کسے شک ہو سکتا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ صلوٰۃ جنازہ فوت ہو جاتی تو قبر پر جا کر آپ یہ صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ یہ روایت چھ سندوں سے آئی ہے اور سب کی سب حسن ہیں۔ امام احمد نے قبر پر صلوٰۃ جنازہ کی حد ایک ماہ مقرر کی ہے کیونکہ روایت میں سب سے آخری مدت جس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر جنازہ پڑھی ہے یہی ہے، اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ میت جب تک بوسیدہ نہ ہو جائے تب تک پڑھ سکتے ہیں۔ مالک اور ابو حنیفہ نے اس سے روکا ہے اور صرف ولی کے لیے اجازت دی ہے کہ قبر پر بشرطیکہ موجود نہ رہا ہو جنازہ پڑھ سکتا ہے۔

آپ کی سنت یہ تھی کہ مرد کے سر اور عورت کی کمر کے پاس کھڑے ہو کر صلوٰۃ جنازہ پڑھتے تھے[2]

بچوں کے جنازہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ بچّہ کی صلوٰۃ جنازہ پڑھی جائے گی[3] سنن ابن ماجہ میں مرفوعاً روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "اپنے بچوں کا جنازہ پڑھو کہ یہ تمہارے اجر ہیں جو آگے جا چکے ہیں[4]" احمد بن ابو عبیدہ فرماتے ہیں "میں نے احمد سے پوچھا" کتنے دنوں کے ناتمام ساقط بچہ پر جنازہ پڑھنا پسند کرتے ہیں؟" فرمایا "جب چار ماہ کا ہو جائے، کیونکہ اس وقت روح پھونک دی جاتی ہے، میں نے کہا" اور مغیرہ بن شعبہ کی حدیث "بچّہ کی صلوٰۃ جنازہ پڑھی جائے گی" فرمایا صحیح اور مرفوع ہے، میں نے کہا اس میں چار ماہ کی قید نہیں ہے، فرمایا "سعید بن مسیب نے ایسا کہا ہے" "کیا رسول اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم کا جنازہ پڑھا تھا؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ چنانچہ سنن ابوداؤد میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے "نبی صلی اللہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بخاری ۱/۴۶۰، مسلم (۹۵۶) میں ابو ہریرہ سے، اور بیہقی ۴/۴۸ میں بعض صحابہ سے روایتیں آئی ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔

[4] بیہقی ۴/۴۷۔

---

[1] بیہقی ۴/۴۸، فرماتے ہیں کہ حدیث مرسل اور صحیح ہے۔ سوید بن سعید نے یزید بن زریع سے، انھوں نے شعبہ سے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے عکرمہ سے اور انھوں نے ابن عباس سے اس کی موصولاً روایت کی ہے۔

[2] اس باب میں دو صحیح حدیثیں ہیں، پہلی کی تخریج ابوداؤد (۳۱۹۴)، ترمذی (۱۰۳۴)، طحاوی ۱/۲۸۳، طیالسی (۲۱۴۹) اور احمد ۳/۱۱۸ و ۲۰۴ نے بروایت انس کی ہے۔ دوسری کی تخریج بخاری ۳/۱۶۲، مسلم (۹۶۴)، ابوداؤد (۳۱۹۵)، نسائی ۴/۷۰، ۷۱، ترمذی (۱۰۳۵)، احمد ۵/۱۴ و ۱۹، اور طیالسی (۹۰۲) نے بروایت سمرہ بن جندب کی ہے، فرماتے ہیں "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک عورت کا جنازہ پڑھا جس کا نفاس میں انتقال ہو گیا تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے لیے اس کے وسط میں کھڑے ہوئے"۔

[3] احمد ۴/۲۴۷ و ۲۴۸ و ۲۵۲۔ ابوداؤد (۳۱۸۰)، نسائی ۴/۵۵، ۵۶۔ ترمذی (۱۰۳۱)، ابن ماجہ (۱۴۸۱) و (۱۵۰۷) بروایت مغیرہ بن شعبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد! سوار جنازہ کے پیچھے چلیگا، پیدل چلنے والا پیچھے آگے اور دائیں بائیں قریب قریب چل سکتا ہے۔ حمل ساقط پر جنازہ پڑھا جائے گا۔ اور والدین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کی جائے گی" سند صحیح ہے، ترمذی، ابن حبان (۷۶۹) اور حاکم ۱/۳۵۵ و ۳۶۳ نے اسے صحیح کہا ہے ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔

[4] ابن ماجہ (۱۵۰۹) فی الجنائز: باب ما جاء فی الصلاۃ علی الطفل۔ سند کے اندر بختری بن عبید الطائی کلبی شامی ضعیف و متروک ہے۔

علیہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم جن کی عمر اٹھارہ مہینے ہو چکی تھی وفات پا گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جنازہ نہیں پڑھا[1]"۔ امام احمد فرماتے ہیں ہم سے یعقوب بن ابراہیم نے، انھوں نے کہا ہم سے ابی نے بیان کیا وہ ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا مجھ سے عبداللہ بن ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے بیان کیا، انھوں نے عمرہ سے اور انھوں نے عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے اس طرح کی حدیث روایت کی ہے۔ حنبل کی روایت کے مطابق امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث سخت منکر ہے، ابن اسحاق کو انھوں نے واہی کہا ہے۔ خلال فرماتے ہیں "عبداللہ کے یہاں حدیث پڑھی گئی کہ مجھ سے ابی نے کہا، انھوں نے کہا ہم سے اسود بن عامر نے، انھوں نے کہا ہم سے اسرائیل نے، انھوں نے کہا ہم سے جابر نے بیان کیا وہ عامر سے اور وہ براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم جن کی عمر سولہ مہینہ تھی جنازہ پڑھا ہے[2]"۔ ابو داؤد نے بہی سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی صلوٰۃ چوپال میں ادا کی[3]" یہ روایت مرسل ہے، بہی کا نام عبداللہ بن یسار کوفی ہے۔ عطاء بن ابی رباح سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم کا جنازہ پڑھا جب کہ وہ ستر دن کے تھے[4]" یہ بھی مرسل ہے، عطاء کو وہم ہو گیا ہے، ان کی عمر سال بھر سے زیادہ تھی۔ ان آثار میں لوگوں کا اختلاف ہے، کچھ لوگ ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی جانے کو ثابت مانتے ہیں، اور عائشہ کی حدیث تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ امام احمد وغیرہ کا خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مرسل حدیث براء کی حدیث کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کو قوت پہنچاتی ہیں مگر کچھ لوگ براء کی حدیث کو جابر جعفی کی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف قرار دیتے ہیں، اور ان مرسل حدیثوں کو بھی ضعیف کہتے ہیں ابن اسحاق کی حدیث ان احادیث کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے پھر اس سبب کے اندر بھی اختلاف ہے جس کے باعث آپ نے ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی تھی۔ چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ابن رسول اللہ ہونا کافی تھا۔ کیونکہ صلوٰۃ جنازہ کا مقصود شفاعت ہی ہوتا ہے، اور یہ آپ کو حاصل تھا، جیسا کہ شہداء کا حال ہوتا ہے، ان پر اسی وجہ سے جنازہ نہیں پڑھا جاتا۔ ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کی موت اس دن واقع ہوئی تھی جس دن آفتاب میں گہن لگا تھا۔ چنانچہ صلوٰۃ کسوف کی وجہ سے جنازہ کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ان احادیث میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ آپ نے ان پر جنازہ پڑھے جانے کا حکم دیا تھا چنانچہ کہا گیا ہے کہ ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی گئی مگر صلوٰۃ کسوف کے باعث آپ خود شریک نہ ہو سکے، ایک قول یہ ہے کہ جنازہ پڑھا ہی نہیں گیا۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ مثبت روایات منفی کے مقابلہ میں اولیٰ ہیں، کیونکہ ان سے مزید علم حاصل ہوتا ہے۔ اور جب نفی و اثبات کا تعارض ہوتا ہے تو مثبت مقدم ہوتا ہے۔

خودکشی اور مال غنیمت میں خیانت کرنے والوں پر جنازہ نہیں ہے

سنت یہ تھی کہ آپ خودکشی اور مال غنیمت میں خیانت کرنے والوں پر جنازہ کی صلوٰۃ نہیں پڑھتے تھے[5] سزا کے طور پر جو

1۔ ابو داؤد (۳۱۸۷)، احمد ۶/ ۲۶۷۔ راوی ثقہ ہیں۔ ابن اسحاق نے تحدیث کی صراحت کی ہے۔ الاصابہ میں حافظ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

2۔ مسند احمد ۴/ ۲۸۳۔ سند کے اندر جابر بن یزید جعفی ضعیف ہے۔

3۔ ابو داؤد (۳۱۸۸) فی الجنائز: باب فی الصلاۃ علی الطفل۔ جیسا کہ مصنف نے کہا ہے مرسل ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن یسار بہی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ دیکھیے نصب الرایۃ ۲/ ۲۷۹، ۲۸۰۔

4۔ ابو داؤد (۳۱۸۸)، بیہقی ۴/ ۹۔

5۔ مسلم (۹۷۸) فی الجنائز: باب ترک الصلاۃ علی القاتل نفسہ۔ ترمذی (۱۰۶۸) فی الجنائز: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لوگ قتل ہوئے ہیں مثلاً زانی وغیرہ ان پر آپ کے جنازہ پڑھنے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ آپ سے ثابت ہے کہ جہنی خاتون پر جنھیں آپ نے رجم کیا تھا آپ نے جنازہ کی صلوٰۃ پڑھی تھی" اس موقع پر حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا" رسول اللہ آپ اس پر جنازہ پڑھ رہے ہیں؟ اس نے تو زنا کیا تھا" آپ نے جواب دیا تھا کہ اس نے ایک ایسی توبہ کی ہے کہ مدینہ کے ستر آدمیوں میں اسے تقسیم کر دیا جائے تو بھی ان کے لیے کافی ہوگی" اس سے بڑھ کر توبہ اور کیا ہوگی کہ اللہ کی خاطر اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی" مسلم نے اس کی روایت کی ہے[1] بخاری نے اپنی صحیح کے اندر ماعز بن مالک کا قصہ نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں کلمۂ خیر کہا اور جنازہ کی صلوٰۃ پڑھی"[2]

ماعز کی صلوٰۃ جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، زہری سے جو روایات اس سلسلہ میں وارد ہیں وہ مختلف ہیں، چنانچہ محمود بن غیلان عبدالرزاق کے حوالہ سے ان سے روایت کرتے ہیں کہ پڑھی گئی، مگر عبدالرزاق کے آٹھ شاگرد (یعنی اسحاق بن راہویہ، محمد بن یحییٰ ذہلی، نوح بن حبیب، حسن بن علی، محمد بن متوکل، حمید ابن زنجویہ، احمد بن منصور رمادی اس کے مخالف ہیں۔ بیہقی فرماتے ہیں محمود بن غیلان کا یہ دعویٰ کہ ان پر جنازہ پڑھا گیا غلط ہے کیونکہ عبدالرزاق کے اصحاب بھی ان کے خلاف ہیں اور زہری کے اصحاب بھی۔

ماعز بن مالک کے قصہ میں اختلاف ہے چنانچہ ابوسعید خدری فرماتے ہیں، آپ نے نہ مغفرت کی دعا فرمائی نہ برا بھلا کہا۔ بریدہ بن حصیب کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا" ماعز بن مالک کے لیے مغفرت کی دعا کرو، چنانچہ صحابہ نے فرمایا اللہ ماعز بن مالک کی بخشش فرمائے" ان دونوں روایتوں کا ذکر مسلم نے کیا ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ یہ وہی عبدالرزاق کی معلّل حدیث ہے[3] ابو برزہ اسلمی فرماتے ہیں آپ نے ان پر جنازہ نہیں پڑھا اور نہ ہی روکا" یہ ابوداؤد کی روایت ہے[5]

مگر یہ حقیقت ہے کہ غامدی خاتون پر آپ کے جنازہ پڑھنے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے[6] ماعز کے بارے میں یا تو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) باب ماجاء فیمن قتل نفسہ۔ ابن ماجہ (۱۵۲۶) فی الجنائز : باب فی الصلاۃ علی اھل القبلۃ۔ نسائی ۶۶/۴ فی الجنائز : باب ترک الصلاۃ علی من قتل نفسہ۔ حاکم ۳۶۴/۱۔ ابوداؤد طیالسی (۷۷۹) احمد ۸۷/۵، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۶، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۷۔ بروایت جابر بن سمرہ۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے لمبے پھل والے تیر سے خودکشی کر لی تھی۔ آپ نے اس پر جنازہ نہیں پڑھا۔ داؤد (۳۱۸۵) فی الجنائز : باب الامام لا یصلی علی من قتل نفسہ مطولا۔ ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ اہل علم کا اس باب میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جو بھی قبلہ رو صلوٰۃ پڑھتا ہو اس پر جنازہ کی صلوٰۃ پڑھی جائے گی۔ خودکشی کرنے والے پر بھی۔ یہ قول ثوری اور اسحاق کا ہے۔ احمد فرماتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے کا جنازہ امام نہیں غیر امام پڑھائے گا۔ مؤطا مالک ۴۵۸/۲، نسائی ۶۴/۴، ابوداؤد (۲۷۱۰) ابن ماجہ (۲۸۴۸)، احمد ۱۱۴/۴ و ۱۹۲/۵۔ بروایت زید بن خالد جہنی۔ صحابہ میں ایک شخص کا خیبر کے دن انتقال ہو گیا تو آپ سے اس کا تذکرہ کیا گیا، آپ نے فرمایا اپنے رفیق کا جنازہ پڑھ لو۔ اس پر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے فرمایا" تمھارے رفیق نے مال غنیمت میں خیانت کی،" چنانچہ اس کے سامان کی تفتیش ہوئی تو اس میں یہودی کا ایک نگ ملا جس کی قیمت دو درہم کے مساوی نہ تھی۔ سند صحیح ہے، حاکم ۱۲۷/۲ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[1] مسلم (۱۶۹۶) فی الحدود : باب من اعترف علی نفسہ بالزنا۔ ترمذی ایضاً (۱۴۳۵) فی الحدود : باب تربص الرجم بالحبلی حتی تضع۔ ابوداؤد (۴۴۰)، النسائی ۵۱/۴، مسند احمد ۴۳/۴ و ۴۳۵ و ۴۳۷ و ۴۴۰ بروایت عمران بن حصین۔

[2] بخاری ۱۱۵/۱۲ فی استتابۃ المرتدین : باب الرجم بالمصلی۔

[3] (۶۱۹۴) فی الحدود : باب من اعترف علی نفسہ بالزنیٰ و (۱۶۹۵)

[4] تخریج گذر چکی ہے۔ بخاری کی روایت ہے۔

[5] ابوداؤد (۳۱۸۶) فی الجنائز : باب الصلاۃ علی من قتلتہ الحدود۔ رجال ثقہ ہیں۔

[6] مسلم (۱۶۹۵) (۲۳) فی الحدود : باب من اعترف علی نفسہ بالزنا۔ ابوداؤد (۴۴۴۲) فی الحدود : (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ کہا جائے گا کہ حدیث کے الفاظ میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ اس میں صلوٰۃ کے تذکرہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کی، اور ترکِ صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ تادیباً اور تحذیراً جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ یا پھر الفاظ کے تعارض کی صورت میں غامدی خاتون کی مثال پر اسے محمول کیا جائے گا۔

جنازہ کے ساتھ قبرستان تک آپ کا آگے پیدل چلنا

صلوٰۃ جنازہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم میت کے ساتھ قبرستان تک آگے آگے پیدل جایا کرتے تھے۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین بھی اسی سنت کے پابند تھے۔ ہدایت تھی کہ سوار جنازہ کے پیچھے، پیدل اس کے قریب یا آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں چلیں۔ جنازہ لے کر تیزی سے چلنے کا حکم دیتے۔ چنانچہ صحابہ کندھے ہلاتے ہوئے تیز چلتے تھے۔ آج اسے لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ حالانکہ یہ بدعت ہے، مکروہ ہے، خلاف سنت ہے اور یہود کی مشابہت ہے۔ حضرت ابوبکر ایسا کرنے والوں پر کوڑے برساتے تھے۔ اور کہتے تھے دیکھا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم جنازہ لے کر تیزی سے[1] چلتے تھے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "ہم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا "خبیب" (سرپٹ چال سے کم)۔ اہل سنن نے اس کی روایت کی ہے[2]۔

جنازہ کے ساتھ پیدل چلتے اور فرماتے "سوار ہو کر چلنا زیب نہیں دیتا، فرشتے پیدل[3] چل رہے ہیں" واپسی پر گاہ پیدل گاہ سوار ہو کر تشریف لاتے۔ جنازہ کے ساتھ آتے تو اس وقت تک نہ بیٹھتے جب تک رکھ نہ دیا جاتا[4]۔ اور فرمایا بھی کہ "جنازہ کے ساتھ آؤ تو جب تک رکھ نہ دیا جائے نہ بیٹھو"۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں زمین پر رکھنا مراد ہے۔

ابوداؤد فرماتے ہیں، اس حدیث کو ثوری نے سہیل سے، انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس میں "حتی توضع بالارض"، "حتی کہ زمین پر رکھ دیا جائے" کے الفاظ وارد ہیں، ابو معاویہ نے سہیل سے اس کی روایت کرتے ہوئے کہا ہے "یہاں تک کہ لحد میں رکھ دیا جائے"۔ فرماتے ہیں ابو معاویہ کے مقابلہ میں سفیان کا حافظہ زیادہ تیز رہا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے عبادہ بن صامت سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاوقتیکہ جنازہ لحد میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) باب المرأة التی أمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم برجمها من جهینة۔ بروایت عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ۔

[1] ابوداؤد (۳۱۸۲) فی الجنائز : باب الاسراع بالجنازة۔ نسائی ۴۳/۴ فی الجنازة : باب السرعة بالجنازة۔ طیالسی (۸۸۳) احمد ۳۶/۵ و ۳۸۔ طحاوی ۲۷۶/۱۔ سند صحیح ہے۔ حاکم ۳۵۵/۱ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ المجموع ۲۷۲/۵ میں نووی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مسند احمد ۳۹۴/۱ و ۴۱۵ و ۴۱۹ و ۴۹۲، ترمذی (۱۰۱۱) فی الجنائز : باب ما جاء فی المشی خلف الجنازة۔ ابوداؤد (۳۱۸۴) فی الجنائز : باب الاسراع بالجنازة۔ سند کے اندر یحییٰ بن عبداللہ تیمی لین الحدیث ہے اور ابو ماجد جن کا نام عائذ بن نفضلہ ہے جیسا التقریب میں حافظ نے کہا ہے مجہول ہے۔

[3] ابوداؤد (۳۱۷۷) فی الجنائز : باب الرکوب فی الجنازة۔ بروایت ثوبان رضی اللہ عنہ۔ سند صحیح ہے۔ حاکم نے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[4] بخاری ۱۴۳/۳ فی الجنائز : باب من تبع جنازة فلا یقعد حتی توضع، مسلم (۹۵۹) فی الجنائز : باب القیام للجنازة۔ ابوداؤد (۳۱۷۳) فی الجنائز : باب القیام للجنازة بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

نہ رکھ دیا جائے کھڑے رہتے تھے[1]۔ مگر اس کی سند میں بشر بن رافع ہیں جن کے بارے میں ترمذی فرماتے ہیں کہ حدیث کے باب میں وہ قوی نہیں ہیں۔ بخاری فرماتے ہیں ان کی حدیث پر متابعت نہیں کی جاتی۔ امام احمد نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن معین کے نزدیک وہ منکر حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ نسائی نے انھیں غیر قوی کہا ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں جیسے کہ جان بوجھ کر موضوع روایات بیان کرتے ہیں۔

غائبانہ صلوٰۃِ جنازہ کے باب میں آپ کی سنت اور اس میں اختلاف

ہر میت پر غائبانہ صلوٰۃ جنازہ آپ کی سنت نہ تھی۔ آپ کی عدم موجودگی میں بہت سے مسلمانوں کا انتقال ہوا مگر آپ نے ان پر غائبانہ جنازہ نہیں پڑھی۔ نہ یہ ثابت ہے کہ نجاشی کی موت پر آپ نے غائبانہ صلوٰۃ جنازہ پڑھی[2]۔ مگر اس بارے میں تین طرح کے اختلافات ہیں۔

۱۔ یہ آپ سے مشروع ہے لہٰذا غائبانہ صلوٰۃ پڑھنا امت کے لیے سنت ہے۔ یہ امام شافعیؒ امام احمد کا ایک قول ہے۔

۲۔ نجاشی کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ تھا۔ لہٰذا دوسروں کے حق میں نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا قول ہے۔

۳۔ ممکن ہے نجاشی کے جنازہ کی چارپائی اٹھالائی گئی ہو۔ اور آپ دیکھتے رہے ہوں۔ لہٰذا آپ نے غائب کا نہیں حاضر کا جنازہ پڑھا۔ صحابہ گو نہیں دیکھ رہے تھے مگر آپ کے تابع تھے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے اصحاب کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ نجاشی کے علاوہ آپ نے اور غائبوں کی صلوٰۃ جنازہ نہیں پڑھی، جس طرح پڑھنا سنت ہے، اسی طرح نہ پڑھنا بھی سنت ہے، آپ کے بعد اب کوئی بھی دور دراز کا تابوت نہیں دیکھ سکتا لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ آپ کے مخصوصات میں تھا۔ روایت ہے کہ معاویہ بن معاویہ لیثی کا آپ نے غائبانہ[3] جنازہ پڑھا، مگر ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ سند میں علاء بن زید ہیں انھیں ابن زیدل کہا جاتا ہے۔ علی بن مدینی فرماتے ہیں حدیثیں وضع کرتا تھا۔ اس کی روایت محبوب بن ہلال نے عطاء بن ابی میمون سے اور انھوں نے حضرت انس[4] رضی اللہ عنہ سے کی ہے، بخاری فرماتے ہیں ان کی متابعت نہیں کی جاتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے

۱۔ ابوداؤد (۳۱۷۶) فی الجنائز : باب القیام للجنازۃ۔ ترمذی (۱۰۲۰) فی الجنائز : باب ماجاء فی الجلوس قبل ان توضع۔ ابن ماجہ (۱۵۴۵) فی الجنائز : باب ماجاء فی القیام للجنازۃ۔ سند کے اندر عبد اللہ بن سلیمان بن جنادہ ضعیف اور اس کا باپ منکر الحدیث ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی سند کے اندر بشر بن رافع جیسا کہ مصنف نے کہا ہے ضعیف ہے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نجاشی کی صلوٰۃِ جنازہ پڑھنے کی روایت صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کی ہے۔ بخاری ۳/۱۶۳، مسلم (۹۵۱) ابوداؤد (۳۲۰۴)، طیالسی (۲۳۰۰)، ابن ماجہ (۱۵۳۴)، نسائی ۴/۷۰، ترمذی (۱۰۲۲) بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔
بخاری ۳/۱۶۳، مسلم (۹۵۲)، نسائی ۴/۶۹، طیالسی (۱۶۸۱)، احمد ۳/۲۹۵ و ۳۱۹ بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ۔
مسلم (۹۵۳)، نسائی ۴/۷۰، ابن ماجہ (۱۵۳۵)، طیالسی (۷۴۹)، احمد ۴/۴۳۱ و ۴۳۳، ترمذی (۱۰۳۹) بروایت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ۔ طیالسی (۱۰۶۸)، ابن ماجہ (۱۵۳۷)، احمد ۴/۷ بروایت حضرت حذیفہ بن اسید۔ ابن ماجہ (۱۵۳۶)، احمد ۴/۶۴ و ۵/۳۷۶ بروایت مجمع بن حارثہ انصاری، ابن ماجہ (۱۵۳۸)، بروایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔ احمد ۴/۶۰ ۲ و ۲۶۳ بروایت جریر بن عبد اللہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد! ”تمھارے بھائی نجاشی کا انتقال ہوگیا ان کے لیے دعائے مغفرت کرو“۔ سند حسن ہے۔

۳۔ سنن بیہقی ۴/۵۰ علاء بن زید کو التقریب میں حافظ نے متروک کی صفت سے یاد کیا ہے۔ اور ابو الولید نے ان کو کاذب کہا ہے۔

۴۔ سنن بیہقی ۴/۵۱، محبوب بن ہلال مجہول ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں غیر معروف ہے۔ اور اس کی حدیث منکر ہوتی ہے۔ اصل نسخوں میں محمود چھپا ہے اور وہ تحریف ہے۔

ہیں : صحیح یہ ہے کہ مرنے والا کسی ایسے ملک میں مرا ہو جہاں اس کا جنازہ نہ پڑھا جاسکے تو اس پر غائبانہ صلوٰۃ پڑھی جائے گی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کا غائبانہ پڑھا تھا۔ کیونکہ اس کی موت کافروں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان پر جنازہ نہیں پڑھا جاسکا تھا۔ لیکن اگر موت کے مقام پر جنازہ پڑھا جاچکا ہو تو پھر غائبانہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ فرض ادا ہوچکا ہے۔ مسلمانوں نے جنازہ پڑھ دیا ہے[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غائب کا جنازہ پڑھا بھی ہے۔ نہیں بھی پڑھا ہے۔ پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں سنت ہے۔ مگر ترک کا مقام اور ہے ، فعل کا اور۔ واللہ اعلم۔ امام احمد کے تین اقوال ہیں۔ ان میں صحیح تر وہی ہے جس کی ابھی تفصیل گذر چکی ہے۔ اور مشہور ان کے اصحاب کے نزدیک جنازہ غائبانہ مطلق جائز ہے۔

جنازہ کے استقبال اور میت کو دفن کرنے میں آپ کی سنت مطہرہ

آپ سے ثابت ہے کہ جنازہ گذرا اور اس کے استقبال میں آپ کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ بیٹھے رہے۔ لہٰذا اس بارے میں اختلاف ہے کہا گیا ہے کہ کھڑا ہونا منسوخ ہے، بیٹھے رہنا یہ آپ کا آخری عمل ہے[2]۔ ایک قول کے مطابق دونوں جائز ہے۔ آپ کا عمل استحباب اور ترک جواز کی دلیل ہے۔ دعویٰ نسخ کے مقابلہ میں یہی زیادہ اولیٰ اور انسب ہے۔

آفتاب کے طلوع وغروب اور کھڑی دوپہر میں میت دفن نہ کرنا آپ کی سنت تھی[3]۔ لحد کھودنا، قبر کو گہری بنانا، سر اور

۱۔ یہ تفصیل امام ابوسلیمان خطابی معالم السنن کے اندر بیان کرچکے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں "نجاشی مسلمان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاچکا تھا، آپ کی نبوت کی تصدیق بھی کی تھی۔ البتہ ایمان درپردہ تھا، اور مسلمان جب مرتا ہے تو اس کا جنازہ پڑھنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ الا یہ کہ وہ اہل کفر کے درمیان ہو۔ اور کوئی ایسا آدمی نہ ہو جو جنازہ پڑھ سکے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم تھا کہ آپ اس کی صلوٰۃ جنازہ پڑھیں کیونکہ آپ اس کے نبی اور ولی تھے۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ حقدار تھے۔ چنانچہ واللہ اعلم یہی وہ سبب تھا جو آپ کے غائبانہ جنازہ پڑھنے کا موجب ہوا۔ بنابریں کسی ملک میں کوئی مسلمان مرے اور اس پر صلوٰۃ جنازہ کا حق ادا کیا جاچکا ہو تو اس پر دوسرے ملکوں کے مسلمان غائبانہ جنازہ نہ پڑھیں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ کسی رکاوٹ کے باعث یا کسی عذر مانع کی وجہ سے اس پر صلوٰۃ جنازہ نہیں پڑھی جاسکی تو سنت یہ ہے کہ اس کی جنازہ پڑھی جائے، بُعد مسافت کے سبب ترک نہ کی جائے۔ اس شخص کی صلوٰۃ جنازہ پڑھتے وقت قبلہ رو ہوں گے، میت کے ملک کی جانب رُخ نہ کریں گے۔ خطابی نے جو مذہب اختیار کیا ہے رویانی نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔

۲۔ مسلم (۹۶۲)، ابن ماجہ (۱۵۴۴) طحاوی ۱/۲۸۳، طیالسی (۱۵۰) بروایت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ فرماتے ہیں، جنازہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے پھر بیٹھ گئے تو ہم بھی بیٹھ گئے۔ مالک ۱/۲۳۲، ابو داؤد (۳۱۷۵) حضرت علی سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں "جنازوں میں آپ کھڑے ہوتے تھے، پھر اس کے بعد بیٹھنے لگے"۔ احمد (۶۲۷) طحاوی ۱/۲۸۲ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ میں ہمیں کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا پھر اس کے بعد بیٹھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا"۔ بیہقی ۴/۲۷ میں یہ ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ رکھے جانے سے پہلے کھڑے رہے، لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے رہے، اس کے بعد آپ بیٹھ گئے اور لوگوں کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا"۔ طحاوی ۱/۲۸۲ بسند مسعود بن حکم زرقی۔ فرماتے ہیں کہ عراق کے ایک جنازہ کے اندر میں شریک تھا، چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کھڑے ہو کر جنازہ رکھے جانے کا انتظار کر رہے ہیں، علی کو دیکھا کہ لوگوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ فرما رہے ہیں اور فرما رہے ہیں "کیونکہ کھڑے ہونے کے بعد آپ نے ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا ہے"۔

۳۔ مسلم (۸۳۱)، ابو داؤد (۳۱۹۲)، نسائی ۴/۸۲، ترمذی (۱۰۳۰)، ابن ماجہ (۱۵۱۹)، طیالسی (۱۰۰۱)، احمد ۴/۱۵۲، بروایت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں، تین اوقات ایسے ہیں جن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صلوٰۃ پڑھنے یا میت کو دفن کرنے سے روکا ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت حتیٰ کہ خوب بلند ہو جائے، کھڑی دوپہر کے وقت حتیٰ کہ آفتاب مائل ہو جائے اور اس وقت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پیروں کے پاس کشادہ رکھنا سنت ہے، آپ سے روایت ہے کہ میت قبر میں رکھی جاتی تو کہتے :

بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔

اللہ کے نام سے، اللہ کی توفیق سے، اور اللہ کے رسول کے طریقہ پر۔

ایک روایت کے مطابق دعا کے الفاظ ذرا بدلے ہوئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ[1]

اللہ کے نام سے، اور اللہ کے راستے میں، اور اللہ کے رسول کے طریقہ پر۔

آپ سے یہ بھی مذکور ہے کہ دفن کے وقت قبر پر مٹی سر کی جانب سے تین بار ڈالتے تھے[2] تدفین سے فارغ ہونے کے بعد آپ اور صحابہ قبر پر کھڑے ہوتے، آپ اس میت کے ثابت قدم رہنے کی دعا کرتے اور اس کا صحابہ کو حکم دیتے تھے[3] مگر قبر کے پاس بیٹھ کر کچھ پڑھتے نہ تو میت کو تلقین کرتے جیسا کہ آج کا معمول ہے۔ معجم میں طبرانی نے بروایت ابوامامہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ "جب تمھارا کوئی بھائی مرے اور تم اس کی قبر برابر کر چکو تو تم میں سے کوئی اس کی قبر کے سرے پر کھڑا ہو کر کہے۔ "اے فلاں" وہ سنے گا مگر جواب نہ دے گا، مگر پھر کہے "اے فلانہ کے بیٹے فلاں" اب وہ اٹھ کر بیٹھ جائے گا، پھر کہے "اے فلانہ کے بیٹے فلاں" وہ کہے گا "رہنمائی کرو اللہ تم پر رحم فرمائے" مگر تم سنو گے نہیں۔ اب وہ کہے "جس آخری بات پر دنیا سے گئے ہو اسے یاد کرو، یعنی لا الٰہ الا اللہ اور محمد عبدہ ورسولہ کی شہادت، اور یہ کہ تم نے اللہ کو رب، اسلام کو دین، محمد کو نبی اور قرآن کو امام خوشی خوشی مانا ہے" یہ اس لیے کہ منکر نکیر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کہیں گے" چلو چلیں، وہاں نہ بیٹھیں جہاں کوئی اسے تلقین کر رہا ہے" مگر اللہ ان کے روبرو اس میت کا حامی ہوگا"۔ ایک شخص نے کہا "رسول اللہ! اگر اس کی ماں کا نام معلوم نہ ہو؟" فرمایا "حوا کا نام لے کر یوں کہیں گے" اے حوا کے بیٹے فلاں[4]!"

اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے مگر اثرم فرماتے ہیں میں نے ابوعبداللہ سے کہا "لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جب میت دفن ہو جاتی ہے تو ایک شخص کھڑا ہو کر کہتا ہے "فلانہ کے بیٹے فلاں! لا الٰہ الا اللہ کے جس کلمۂ شہادت پر تم دنیا سے جدا ہوئے ہو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جب آفتاب مائل بہ غروب ہو۔ معالم السنن ۴/ ۳۲۷ میں خطابی فرماتے ہیں کہ ان تینوں اوقات کے اندر صلوٰۃ جنازہ پڑھنے اور دفن کرنے کے بارے میں اختلاف ہے چنانچہ اکثر اہل علم کا یہ مسلک ہے کہ جن اوقات کے اندر صلوٰۃ مکروہ ہے ان میں جنازہ پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ یہ ابن عمر سے مروی ہے۔ اور یہی قول عطاء، نخعی، اور اوزاعی کا ہے۔ سفیان ثوری، اصحاب رائے، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ شافعی شب و روز کے کسی بھی وقت جنازہ پڑھنے کے قائل ہیں، اسی طرح تدفین کے بھی۔ یعنی کسی بھی وقت دن و رات میں دفن کر سکتے ہیں۔ میں (خطابی) کہتا ہوں کہ حدیث کی موافقت کے پیش نظر جماعت کا قول اولیٰ ہے۔

[1] ترمذی (۱۰۴۶) فی الجنائز: باب ماجاء مایقول إذا أدخل المیت فی القبر، ابن ماجہ (۱۵۵۰) فی الجنائز: باب ما جاء فی ادخال المیت القبر، ابوداؤد (۳۲۱۳) فی الجنائز: باب فی الدعاء للمیت إذا وضع فی قبرہ، احمد (۴۹۹۰) و (۵۲۳۳) و (۵۳۷۰) و (۶۱۱۱)، بیہقی ۴/ ۵۵ بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ۔ ترمذی نے اسے حسن اور ابن حبان (۷۷۳) اور حاکم ۱/ ۳۶۶ نے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے اور بات بھی یہی ہے۔ حاکم میں بروایت بیاضی اس کی ایک شاہد بھی ہے۔ سند حسن ہے۔

[2] ابن ماجہ (۱۵۶۵) بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ سند جید ہے جیسا کہ المجموع ۵/ ۲۹۲ میں نووی نے کہا ہے۔ اس کی کچھ شواہد بھی ہیں جن کا تذکرہ تلخیص الحبیر ۲/ ۱۳۱ میں حافظ ابن حجر نے کیا ہے

[3] ابوداؤد (۳۲۲۱) فی الجنائز: باب الاستغفار عند القبر للمیت، بیہقی ۴/ ۵۶، حاکم ۱/ ۳۷۰ نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی ہے۔ بات بھی یہی ہے۔ المجموع ۵/ ۲۹۲ میں نووی نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

[4] مجمع الزوائد ۳/ ۴۵ میں ہیثمی نے اس کی روایت کرتے ہوئے کہا کہ الکبیر میں طبرانی نے اس کی روایت کی ہے۔ سند کے اندر ایک پوری جماعت ہے جن سے میں واقف نہیں ہوں۔ امالی الأذکار کے اندر حدیث کی تخریج کے بعد حافظ نے کہا ہے کہ "الفتوحات الربانیۃ لابن علان" ۴/ ۱۹۶ کے مطابق یہ حدیث غریب ہے۔ دونوں طریقوں سے سند بے حد کمزور ہے۔

اسے یاد کرو" تو آپ نے کہا "ایسا کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا، مگر ابو مغیرہ کا انتقال ہوا تو شامیوں نے ایسا کیا، ایک شخص آیا اور اس نے مذکورہ کلمات کہے۔ ابو مغیرہ نے اس سلسلہ میں ابو بکر بن ابی مریم سے اور انھوں نے اپنے شیوخ سے روایت کی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے۔ ابن عیاش بھی اس کے راوی ہیں۔

امام احمد کی مراد اسماعیل بن عیاش کی اس حدیث سے ہے جسے طبرانی نے ابو امامہ سے روایت کی ہے۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن کے اندر راشد بن سعد، ضمرہ بن حبیب اور حکیم بن عمیر کا قول نقل کیا ہے کہ میت پر مٹی برابر کر دیئے جانے کے بعد واپسی پر مستحب سمجھتے تھے کہ قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت سے کہا جائے "اے فلاں! کہو" لا الٰہ الا اللہ، اشھد أن لا الٰہ الا اللہ" تین بار "اے فلاں! کہو" ربی اللہ ودینی الاسلام ونبیی محمد" اور پھر واپس ہوں۔

قبروں کو بلند اور پختہ کرنے کی ممانعت

قبروں کو بلند کرنا، اینٹ و پتھر سے ان کی تعمیر، لیپائی پوتائی اور ان پر قبہ سازی آپ کی سنت نہ تھی۔ یہ سب بدعت و مکروہ اور آپ کی سنت کے خلاف ہے۔ آپ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا کہ جو مجسمہ دیکھیں اسے مسمار کر دیں اور ابھری ہوئی جو قبر دیکھیں اسے برابر کر دیں[1] لہذا آپ کی سنت یہ ہے کہ تمام اونچی قبروں کو برابر کر دیا جائے۔

قبریں پختہ کرنے، ان پر کوئی عمارت بنانے اور کتبہ لکھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے[2] صحابۂ کرام کی قبریں نہ بلند تھیں نہ زمین سے چپکی ہوئی۔ یہی حال آپ کی قبر شریف کا اور صاحبین کی قبروں کا تھا۔ آپ کی قبر کوہان نما، میدان کے سرخ سنگریزوں سے ہموار کی گئی تھی، اس پر نہ کوئی عمارت بنائی گئی تھی نہ اسے لیپا گیا تھا۔ صاحبین کی قبریں بھی ایسی ہی تھیں[3] قبروں کی پہچان کے لیے بطور نشان ایک پتھر رکھ دیتے تھے[4]

---

[1]۔ مسلم (۹۶۹) فی الجنائز: باب تسویۃ القبر، ترمذی (۱۰۴۹)، ابوداؤد (۳۲۱۸)، نسائی ۴/۸۸، حاکم ۱/۳۶۹، طیالسی (۱۵۵) احمد (۷۴۱) و (۱۰۶۴) بروایت ابو ہیاج اسدی۔ فرماتے ہیں کہ علی نے مجھ سے فرمایا "جس مہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا اس پر تجھے نہ بھیج دوں؟ جس مجسمہ کو دیکھنا اسے مٹا دینا اور جس قبر کو اونچی پانا برابر کر دینا۔

[2]۔ مسلم (۹۷۰) بروایت جابر رضی اللہ عنہ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔ ابوداؤد (۳۲۲۶)، نسائی ۴/۸۶، ابن ماجہ (۱۵۶۳) اس میں مزید "کتبہ لگانے" کی ممانعت ہے۔ سند کے اندر سلیمان بن موسیٰ اور جابر کے درمیان انقطاع ہے مگر مستدرک حاکم ۱/۳۷۰ میں بطریق ابن جریج یوں روایت ہے کہ ہم سے ابن جریج نے حدیث بیان کی، انھوں نے ابو زبیر سے اور انھوں نے جابر سے روایت کی ہے۔

[3]۔ صحیح بخاری ۳/۲۰۳ فی الجنائز: باب ماجاء فی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر بروایت ابوبکر بن عیاش عن سفیان التمار۔ ابوبکر سے سفیان نے حدیث بیان کی کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو کوہان نما دیکھا ہے۔ سفیان تمار کا شمار تبع تابعین میں ہے، صحابہ کا زمانہ بھی پایا تھا۔ حافظ فرماتے ہیں کہ کسی صحابی سے ان کی روایت مجھے نہیں ملی۔ اس حدیث سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ قبروں کو کوہان نما بنانا مستحب ہے۔ ابوحنیفہ، مالک، احمد، مزنی اور شوافع کی ایک بڑی تعداد کا یہی مذہب ہے۔ قاضی حسین نے اصحاب کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔ ابوداؤد (۳۲۲۰) اور مستدرک حاکم ۱/۳۶۹ نے بروایت عمرو بن عثمان بن ہانی عن القاسم ابن محمد تخریج کی ہے۔ قاسم فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے پوچھا "ماں! بتایئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صاحبین کی قبریں کہاں ہیں" آپ نے تین قبروں کی نشاندہی فرمائی جو نہ ابھری تھیں نہ بالکل زمین سے چپٹی ہوئی تھیں۔ بلکہ میدانی سنگریزوں سے ہموار تھیں۔ عمرو بن عثمان بن ہانی مجہول الحال ہے۔

[4]۔ ابوداؤد (۳۲۰۶) انہی کی سند سے بیہقی ۳/۴۱۲ سند حسن ہے۔ بروایت مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ عنہ۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

قبروں کو مسجدیں بنانے کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو مسجدیں بنانے اور ان پر چراغ جلانے سے منع فرمایا ہے[1]۔ اس باب میں ممانعت کی شدت تو ملاحظہ کیجیے کہ آپ نے ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ آپ نے قبروں کی جانب رخ کر کے صلوٰۃ ادا کرنے اور امت کو اپنی قبر پر عرس لگانے سے روکا ہے، عورت پر قبروں کی زیارت کرنے پر لعنت بھیجی ہے۔ سنت یہ ہے کہ قبروں کی توہین نہ کی جائے، انھیں روندنا، ان پر بیٹھنا اور ان سے ٹیک لگانا ممنوع ہے[2]۔ قبروں کی تعظیم بھی ممنوع ہے۔ انھیں مسجدیں بنا لینا ان کے پاس یا ان کی جانب رخ کر کے صلوٰۃ پڑھنا، عرس لگانا، یہ ساری باتیں یہاں آکر کرنا ناروا ہیں۔

زیارتِ قبور کا مسنون طریقہ

قبورِ صحابہ کی زیارت دعا کے لیے فرماتے، ان پر ترس کھاتے اور ان کے لیے مغفرت کی درخواست کرتے۔ یہی وہ زیارت قبور ہے جو امت کے لیے مشروع و مسنون ہے۔ صحابہ کو حکم تھا کہ زیارت کریں تو یہ کہیں :

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فرماتے ہیں "عثمان بن مظعون کا انتقال ہوا تو جنازہ نکال کر دفن کیا گیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو پتھر لانے کا حکم دیا مگر وہ شخص پتھر نہ اٹھا سکا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود پتھر کے پاس گئے، اپنی باہیں کھولیں۔ مطلب فرماتے ہیں جس نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی روایت کی اس نے بتایا کہ آپ نے دونوں باہیں کھولیں اور پتھر اٹھا کر ابن مظعون کے سر کے پاس رکھ دیا اور فرمایا "اس پتھر سے اپنے بھائی کی قبر معلوم کر سکوں گا، میرے اہل و عیال میں سے جو شخص مرے گا انہی کے پاس دفن کروں گا" ہم کہتے ہیں کہ جہاں کثرت سے قبریں ہوں گی اور ایک دوسری کی تمیز مشکل ہو گی وہاں پتھر سے مقصود حاصل نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس وقت کسی تختی پر مردے کا نام لکھ کر آویزاں کرنا صحیح ہو گا تاکہ اقرباء واحباب اسے پہچان سکیں۔

[1] احمد ۱/ ۲۲۹ و ۲۸۷ و ۳۲۱ و ۳۳۷، ابوداؤد (۳۲۳۶)، ترمذی (۳۲۰)، نسائی ۴/ ۹۴، ۹۵، ابن ماجہ (۱۵۷۵)، ابن حبان (۷۸۸) بروایت حضرت ابن عباس "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی خواتین اور ان پر مسجدیں تعمیر کرنے اور چراغ جلانے والوں پر لعنت بھیجی ہے"۔ سند ضعیف ہے اس میں ابوصالح مولیٰ ام ہانی ضعیف ہے۔ مگر پہلے دونوں فقروں کے شواہد موجود ہیں۔ جن سے دونوں فقرے قوت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ایک حدیث حضرت ابوہریرہ کی ہے۔ جو احمد ۲/ ۳۳۷ و ۳۵۶۔ ترمذی (۱۰۵۶)، ابن ماجہ (۱۵۷۶)، ابن حبان (۷۸۹) میں وارد ہے۔ ایک حسان رضی اللہ عنہ کی ہے جو احمد ۳/ ۴۴۲، ۴۴۳، ابن ماجہ (۱۵۷۴)، حاکم ۱/ ۳۷۴ میں آئی ہے۔ آپ کا قول "لعن زوارات القبور" سے زیارت کرنے والیوں پر لعنت کی ہے" عورتوں کے لیے کثرت سے زیارت قبور کی کراہت کی دلیل ہے۔ باقی گاہے بگاہے زیارت کر لینا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق عورتوں کے لیے مشروع ہے۔ یہ حدیث حاکم ۱/ ۳۷۶، بیہقی ۴/ ۷۸ میں آئی ہے۔ سند صحیح ہے۔ یہ حدیث مسلم (۹۷۴) (۱۰۳) اور احمد و نسائی میں بھی آئی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت کیا "رسول اللہ! ان کے لیے کیسے دعا کروں؟" فرمایا "السلام علی اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستأخرین وانا ان شاء اللہ بکم للاحقون" اس لیے بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عورت کو اپنے بچے کی قبر کے پاس روتے دیکھا اس سے فرمایا تھا "اللہ سے ڈرو اور صبر کرو" بخاری وغیرہ نے اس کی روایت حضرت انس سے کی ہے۔ قبروں کو مسجدیں بنا لینے کی ممانعت کئی طرح سے مروی ہے۔ اس باب میں روایات گذر چکی ہیں۔

[2] مسلم (۹۷۱)، ابوداؤد (۳۲۲۸)، نسائی ۴/ ۹۵، ابن ماجہ (۱۵۶۶) بروایت ابوھریرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "انگارے پر کوئی بیٹھ جائے، اس کے کپڑے جل جائیں اور آگ کھال تک پہنچ جائے۔ یہ بہتر ہے اس بات سے کہ کسی قبر پر بیٹھے"

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔ نَسْأَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ۔[1]

اے دیارِ قبر کے مومن اور مسلم باشندو! تم پر سلامتی۔ ہم تم سے ان شاء اللہ آملیں گے۔ اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت کے طالب ہیں۔

سنت یہ تھی کہ جنازہ کے وقت میت کے حق میں دعا، ترحم اور استغفار جو کچھ ہوتا وہی قبروں کی زیارت پر بھی ہوتا، مگر مشرکین کا دستور یہ ہے کہ وہ مردے کو پکارتے ہیں، اسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس کی قسمیں کھاتے ہیں۔ اس سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اور توجہ کا اسے مرکز سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں توحید کی کارفرمائی ہے۔ اور میت کے ساتھ بھلائی پیش نظر۔ وہاں شرک ہے۔ اور خود اپنے اور میت کے حق میں بدی کی بات۔

یہ حضرات تین قسم کے ہیں۔ ۱۔ میت کے حق میں دعا کرنے والے۔ ۲۔ میت کے وسیلہ سے دعا کرنے والے۔ ۳۔ میت کے پاس دعا کرنے والے۔ یہ حضرات مسجدوں میں دعا کرنے کے بمقابلہ میت کے پاس دعا کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہیں زیادہ مستجاب ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اسوہ پر جو بھی غور کرے گا۔ اس پر دونوں سلوکوں کا فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

میت کے عزیز واقارب کی تعزیت

میت کے عزیز واقارب کی تعزیت فرماتے تھے مگر اس کے لیے نہ تو مجلس کرتے نہ قرآن خوانی کی محفل جماتے، نہ قبر کے پاس نہ قبر سے دور۔ یہ تمام باتیں بدعت ہیں مکروہ ہیں سکون وخاموشی، رضا بالقضائے الٰہی، الحمد للہ اور کلمۂ انا للہ وانا الیہ راجعون[2] پڑھنا سنت تھی۔ مصیبتوں پر جو کپڑے پھاڑے، دہاڑیں مارے، بال منڈوائے اس سے اظہار برأت فرماتے تھے۔[3]

---

[1] مسلم (۹۷۵)، نسائی ۴/۹۴، احمد ۵/۳۵۳ و ۳۵۹ و ۳۶۰ بروایت حضرت بریدہ۔ الفاظ یہ ہیں۔ صحابہ قبرستان جاتے تو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکھاتے۔ چنانچہ دعا کرنے والا یوں کرتا تھا۔ "السلام علیکم اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم اللاحقون۔ انتم لنا فرط ونحن لکم تبع۔ اسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ۔" اس باب میں بروایت حضرت عائشہ مسلم (۹۷۴) اور احمد ۶/۱۸۰ میں اور بروایت حضرت ابوہریرہ مسلم (۲۴۹) اور احمد ۲/۳۰۰ و ۴۰۸ میں بھی احادیث وارد ہیں۔

[2] اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل میں ایسا کرتے تھے (ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون) صحیح مسلم (۹۱۸)، ابن ماجہ (۱۵۹۸) بروایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے۔ "جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور یہ دعا پڑھے "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا"، تو اس مصیبت میں اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا اور اس سے بہتر بدل عطا فرمائے گا۔"

[3] بخاری ۳/۱۳۲، ۱۳۳ تعلیقاً۔ مسلم (۱۰۴) فی الایمان: باب تحریم ضرب الخدود وشق الجیوب والدعاء بدعوی الجاھلیۃ میں بروایت ابوموسیٰ اشعری اسے موصولاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالقہ، حالقہ اور شاقہ سے اظہار برأت فرمایا ہے" صالقہ نوحہ میں آواز بلند کرنے والی کو، حالقہ سر منڈا لینے والی کو اور شاقہ کپڑے پھاڑ لینے والی کو کہتے ہیں۔ بخاری ۳/۱۳۳، مسلم (۱۰۳) بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ہم میں سے وہ نہیں ہے جو چہرہ پیٹے گریبان پھاڑے اور جاہلانہ پکار پکارے"۔ مسلم (۹۳۴) بروایت ابو مالک اشعری، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میت والوں پر کھانے کا بار نہ ڈالتے بلکہ دوسرے گھروں کو حکم دیتے کہ ان کے یہاں کھانا پکوا کے بھیجیں[۱] مکارمِ اخلاق اور فضائل و محاسن کا یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں اسلام انسان کو پہنچا دیتا ہے، میت والوں کو جو مصیبت درپیش ہوتی ہے۔ اس کے تحت انھیں موقعہ کہاں کہ لوگوں کو کھلائیں۔ میت کی خبرِ مرگ نہ دینا آپ کی سنت تھی۔ بلکہ آپ اس سے روکتے بھی تھے۔ اور فرماتے کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے گھر کے لوگ مرنے پر ان کی موت کا اعلان کریں۔ فرماتے تھے مجھے اندیشہ ہے کہیں یہ از قسم نعی (خبرِ مرگ دینا) نہ ہو جسکی ممانعت آئی ہے[۲]

صلوٰۃِ خوف کے بارے میں آپ کی سنت

سنت یہ ہے کہ جب خوف اور سفر دونوں درپیش ہوں تو صلوٰۃ کے ارکان اور اس کی تعداد دونوں میں کمی کر دی جائے گی، اگر صرف سفر ہو اس کے ساتھ کوئی خوف نہ ہو تو تعداد میں اور اگر صرف خوف ہو اس کے ساتھ سفر نہ ہو تو ارکان میں کمی ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا، آیتِ قرآنی "ضرب فی الارض" اور "خوف" سے قصر کے مقید ہونے کی یہی حکمت ہے۔ صلوٰۃِ خوف میں اسوۂ نبوی یہ تھا کہ دشمن آپ کے اور قبلہ کے مابین حائل ہوتا تو تمام مسلمانوں کو اپنے پیچھے صف بصف کھڑا کر دیتے آپ تکبیر کہتے وہ بھی کہتے، آپ رکوع میں جاتے وہ بھی جاتے۔ پھر ساتھ ہی آپ اور سب سر اٹھاتے، اس کے بعد سجدہ صرف اگلی صف کرتی پچھلی صف دشمن کے مقابل کھڑی رہتی جب آپ پہلی رکعت سے فارغ ہو کر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو پچھلی صف سجدہ کرتی پھر کھڑی ہو جاتی پھر اگلی صف اپنی جگہ سے ہٹ جاتی اور یہ پچھلی صف اس کی جگہ لے لیتی تاکہ صف اوّل کی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) "میری امت چار باتیں جو جاہلیت کی ہیں جنھیں وہ چھوڑیں گے نہیں۔ حسب و نسب پر فخر، حسب و نسب پر طعنہ زنی، ستاروں سے بارش کی درخواست، نوحہ"۔ نوحہ میت کے اوصاف بآواز بلند بیان کرنا۔ جیسے یہ کہنا ہائے رے غار پناہ، ہاتے رے کوہسار۔ یہ حرام ہے خواہ اس کے ساتھ آہ و بکا شامل نہ ہو۔

۱۔ شافعی ۱/۲۰۸، احمد ۱/۲۰۵، ابوداؤد (۳۱۳۲)، ترمذی (۹۹۸)، ابن ماجہ (۱۶۱۰)، دارقطنی ص ۱۹۴ و ۱۹۷ بیہقی ۴/۶۱ بروایت عبداللہ جعفر۔ فرماتے ہیں شہادت کے بعد جب جعفر کی خبرِ مرگ موصول ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ انھیں معروفیت کی بات پیش آگئی ہے"۔ سند حسن ہے۔ ترمذی نے اسے حسن اور حاکم ۱/۳۷۲ نے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ احمد ۲/۲۰۴، ابن ماجہ (۱۶۱۲) بروایت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ۔ "دفن کے بعد اہلِ میت کے یہاں مجتمع ہونا اور کھانا بنانا ہم نوحہ تصور کرتے تھے"۔ سند صحیح ہے۔ المجموع ۵/۳۲۰ میں نووی اور الزوائد میں بوصیری نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ فتح القدیر ۱/۴۷۳ میں کمال بن ہمام نے اہلِ میت کی کھانے سے ضیافت کرنا مکروہ بتایا ہے۔ اور کہا ہے کہ سخت بدعت ہے۔ الانصاف ۲/۵۶۵ للمرداوی کے مطابق حنابلہ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔ احمد ۵/۴۰۶، ترمذی (۹۸۶)، ابن ماجہ (۱۴۷۶)، بیہقی ۴/۷۴۔ بروایت حذیفہ بن یمان "ان کے یہاں کوئی میت ہو جاتی تو فرماتے اس کی کسی کو خبر نہ دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نعی نہ ہو جائے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نعی سے روکتے ہوئے سنا ہے"۔ الفتح ۳/۹۲ میں جیسا کہ حافظ نے کہا ہے اس کی سند حسن ہے۔ ممنوعہ نعی اہلِ جاہلیت کے مشابہ نعی ہے۔ اس کے مطابق وہ گھروں کے دروازوں اور بازاروں میں باقاعدہ اعلانِ مرگ کرنے والے تھے۔ باقی اقرباء کو موت کی خبر دینا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق مباح ہے۔ یہ روایت شیخین نے کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی کی خبرِ مرگ جس دن اس کا انتقال ہوا تھا ملی۔ بخاری میں انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "علم زید نے لیا زید کے ہاتھ میں آیا وہ ہلاک ہو گئے تو جعفر کے ہاتھ میں آیا وہ ہلاک ہو گئے تو عبداللہ بن رواحہ کے ہاتھ آیا وہ ہلاک ہو گئے ..... دونوں حدیثوں کا ترجمۃ الباب بخاری نے اس طرح باندھا ہے" باب الرجل ینعی الی اھل المیت بنفسہ" (باب آدمی اہلِ میت کو خود خبرِ مرگ پہنچائے)۔

فضیلت دونوں صفوں کو حاصل ہو اور دوسری رکعت میں دوسری صف کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کرنا نصیب ہو جائے۔ جیسا کہ پہلی رکعت میں پہلی صف کو نصیب ہوا تھا۔ اس طرح دونوں گروہ اپنا مقصود پورا کرنے میں برابر ہو جاتے ہیں، یہ انتہائی انصاف کی بات ہے۔ اب اس کے بعد جب آپ رکوع میں جاتے تو دونوں گروہ بھی پہلی بار کی طرح رکوع میں چلے جاتے یہاں تک کہ تشہد کے لیے آپ بیٹھتے تو پچھلی صف دو سجدہ کر کے تشہد میں شریک ہو جاتی اور سب کے ساتھ سلام پھیرتے [۱]

لیکن اگر دشمن قبلہ کی سمت نہ ہوتے تو کئی طریقوں سے صلوٰۃ ادا کرتے، کبھی سب کو دو گروہ بنا دیتے، ایک دشمن کے سامنے ہوتا اور ایک آپ کے ساتھ صلوٰۃ پڑھتا ہوتا۔ چنانچہ ایک گروہ آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھتا پھر صلوٰۃ ہی میں گھوم کر دوسرے گروہ کی جگہ چلا جاتا۔ اور دوسرا گروہ اس کی جگہ لے لیتا جو آپ کے ساتھ دوسری رکعت پڑھتا۔ پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد دونوں گروہ باری باری ایک ایک رکعت پوری کر لیتے [۲]

کبھی ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھا کر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ گروہ اپنی ایک رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیتا اور آپ کھڑے رہتے پھر دوسرا گروہ آتا اور وہ آپ کے ساتھ دوسری رکعت پڑھتا پھر آپ تشہد میں پہنچتے تو بیٹھے رہتے اور یہ گروہ ایک رکعت پڑھتا اور تشہد پورا کر لیتا تو آپ ان کے ساتھ سلام پھیرتے [۳]

گاہ ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھاتے، وہ آپ سے پہلے سلام پھیر کر چلا جاتا، اب دوسرا گروہ آتا آپ اس کے ساتھ آخری دو رکعتیں پڑھتے اور اس کے ساتھ سلام پھیرتے۔ اس طرح آپ کی چار اور دونوں گروہوں کی دو دو رکعتیں ہوتیں [۴]

گاہ ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیتے، پھر دوسرا گروہ آتا اسے دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیرتے۔ اس طرح ہر ایک گروہ کو ایک الگ صلوٰۃ پڑھاتے [۵]

۱۔ ابوداؤد (۱۲۳۶) فی الصلاۃ : باب صلاۃ الخوف۔ نسائی ۳/۱۷۷، ۱۷۸ بروایت ابوعیاش زرقی۔ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عسفان میں تھے۔ مشرکین کے قائد خالد بن ولید تھے۔ یہاں ہم نے ظہر پڑھی تو مشرکین نے کہا "موقعہ مل گیا ہے، صلوٰۃ کی حالت میں ہوں تو ان پر حملہ کر دیں" اس موقعہ پر آیت قصر ظہر اور عصر کے درمیان نازل ہوئی۔ عصر کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو کھڑے ہو گئے، مشرکین سامنے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک صف کھڑی ہوئی — مسلم (۸۴۰) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ الخوف بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔

۲۔ بخاری ۷/۳۲۹ فی المغازی : باب غزوۃ ذات الرقاع فی اول ابواب صلاۃ الخوف وفی التفسیر فی سورۃ البقرۃ باب قولہ تعالی (فان خفتم فرجالا او رکبانا) مسلم (۸۳۹) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ الخوف۔ ابوداؤد (۱۲۴۳) ترمذی (۵۶۴)، نسائی ۳/۱۷۱ بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

۳۔ مؤطا مالک ۱/۱۸۳ فی صلاۃ الخوف، بخاری ۸/۳۲۵، ۳۲۶ فی المغازی : باب غزوۃ ذات الرقاع۔ مسلم (۸۴۲)، ابوداؤد (۱۲۳۸) بروایت صالح بن خوات۔ یہ روایت اس صحابی سے کرتے ہیں جنھوں نے غزوہ ذات الرقاع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔

۴۔ بخاری ۷/۳۳۱ فی المغازی : باب غزوۃ ذات الرقاع تعلیقاً۔ مسلم (۸۴۳) فی صلاۃ المسافرین : باب صلاۃ الخوف موصولاً۔ مسند ابوعوانہ ۲/۳۶۵ بروایت جابر بن عبداللہ۔ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل کر مقام ذات الرقاع پہنچے۔ فرماتے ہیں کہ کسی سایہ دار درخت کے پاس پہنچتے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑ دیتے۔ ایک مشرک آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ایک درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار قبضہ میں لے کر کھینچ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "ڈرتے ہو مجھ سے؟" آپ نے فرمایا "نہیں" اس نے کہا "تمھیں کون مجھ سے بچا سکتا ہے؟" فرمایا "اللہ مجھے تم سے بچائے گا" فرماتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اسے دھمکی دی۔ چنانچہ اس نے تلوار میان رکھ کر لٹکا دیا۔ فرماتے ہیں پھر صلوٰۃ کا اعلان ہوا۔ آپ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر وہ پیچھے ہٹ گئے، اب آپ نے دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ فرماتے ہیں اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار رکعتیں ہوئیں اور مسلمانوں کی دو۔

۵۔ نسائی ۲/۱۷۸، دارقطنی ۱/۱۸۶، بیہقی ۳/۲۹۵ بروایت جابر بن عبداللہ۔ راوی ثقہ ہیں۔ مگر اس میں حسن کا عنعنہ ہے۔

گاہ ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھا دیتے، وہ چلا جاتا، دوسرا گروہ آتا اسے ایک رکعت پڑھا دیتے دونوں باقی رکعت پوری نہ کرتے، اس طرح آپ کی دو اور ان کی ایک ایک رکعت ہوتی[1] صلوٰۃ الخوف کی یہ ساری صورتیں جائز ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں صلوٰۃ الخوف کے ابواب میں جتنی حدیثیں بھی مروی ہیں ان سب پر عمل کرنا جائز ہے۔ فرماتے ہیں چھ یا سات طریقے مروی ہیں اور یہ سب جائز ہیں۔ اثرم فرماتے ہیں "میں نے ابو عبداللہ سے کہا کہ" آپ فرماتے ہیں کہ تمام حدیثیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، مگر مسلک آپ کا صرف ایک کے مطابق ہے؟" فرمایا "میں کہتا ہوں کہ ان سب کو مذہب بنانا اچھا ہے۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ ہر گروہ امام کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھے اور آگے پوری نہ کرے یہی مذہب ابن عباس، جابر بن عبداللہ، طاؤس، مجاہد، حسن، قتادہ، حکم اور اسحاق بن راہویہ کا ہے۔ صاحب مغنی فرماتے ہیں امام احمد نے عمومی انداز کی جو بات کہی ہے اس کے مطابق تو مذکورہ صورت جائز ہے مگر ہمارے اصحاب اسے نہیں مانتے۔

صلوٰۃ الخوف کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور طریقے بھی مروی ہیں، مگر سب کا مرجع و مآخذ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ الفاظ میں اختلاف ہو سکتا ہے، بعضوں نے دس اور ابو محمد بن حزم نے تقریباً پندرہ طریقے ذکر کیے ہیں، مگر صحیح وہی ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ہوا یہ ہے کہ جب بھی کسی واقعہ میں راویوں کا اختلاف نظر آیا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے ایک عمل قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ الگ سے کوئی طریقہ نہیں بلکہ محض راویوں کا لفظی اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] نسائی ۲/۱۶۹ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ذی قرد میں صلوٰۃ پڑھائی۔ آپ کے پیچھے لوگ دو صفوں میں کھڑے ہوئے۔ ایک آپ کے پیچھے اور ایک دشمن کے روبرو۔ جو صف پیچھے کھڑی تھی اسے ایک رکعت پڑھائی۔ پھر یہ لوگ دوسری صف کے لوگوں کی جگہ چلے گئے اور دوسری صف والے آپ کے پیچھے آگئے۔ انھیں ایک رکعت پڑھائی۔ ان لوگوں نے قضا نہیں کی"، سند صحیح ہے۔ مسند احمد (۲۰۶۳) و (۳۳۶۴)، طحاوی ۱/۱۸۲، حاکم ۱/۳۳۵ — اس باب کے اندر بروایت حذیفہ احمد ۵/۳۸۵ و ۳۹۹ و ۴۰۴، ابوداؤد (۱۲۴۶)، نسائی ۳/۱۶۷ اور طحاوی ۱/۱۸۳ میں بھی حدیث وارد ہے۔ رجال اس کے ثقہ ہیں۔ حاکم ۱/۳۳۵ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے تائید کی ہے۔ نسائی ۳/۱۶۸ نے بروایت زید بن ثابت اس کو نقل کیا ہے۔ سند حسن ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

زکوٰۃ اور صدقات کا بیان

وقت، مقدار، نصاب، صاحبِ نصاب اور مصارف کے اعتبار سے زکوٰۃ کے باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ مکمل ترین اسوہ ہے۔ اس میں آپ نے مال داروں اور مسکینوں دونوں کی مصلحتوں کا لحاظ رکھا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مال اور صاحبِ مال کی طہارت اور پاکی کا اسے ذریعہ بنایا ہے، اور مال داروں کے حق میں مال کا نعمت ہونا اسی کے ساتھ مشروط رکھا ہے۔ چنانچہ ادائیگی زکوٰۃ کا جو شخص پابند ہے۔ اس کا مال اس کے حق میں ہمیشہ نعمت ہی رہتا ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ مال کے بقا و تحفظ، نشو ونما، ازالۂ آفات اور حفاظتِ حیاتِ حاصلہ کا ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی زکوٰۃ کو قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ جس مال پر فرض کی ہے اس کی چار قسمیں ہیں، اور یہ اقسام وہی ہیں جو انسانوں میں زیادہ تر گردش کرتی رہتی ہیں، اور ان سے انسان کی ضرورتیں وابستہ رہتی ہیں، ان میں سے ایک کھیتی اور باغ ہے۔ دوسری چوپائے، جانور، اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ، بکری۔ تیسری سونا، چاندی جن پر عالم کا مدار ہے اور چوتھی مختلف نوعیتوں کے مال تجارت۔ زکوٰۃ سال میں ایک مرتبہ واجب ہے۔ غلوں اور پھلوں کی زکوٰۃ اس وقت جب وہ تیار ہو جائیں اور پختگی کی صورت اختیار کر لیں، یہ انتہائی منصفانہ قانون ہے۔ کیونکہ ہر ماہ یا ہر جمعہ کو زکوٰۃ واجب کر دی جاتی تو اس میں اربابِ ثروت کا نقصان ہوتا، اور اگر پوری عمر میں ایک بار واجب کی جاتی تو اس میں مسکینوں کا نقصان ہوتا۔ مگر سال میں ایک بار کی واجب ادائیگی انتہائی منصفانہ قانون ہے۔ علاوہ ازیں حصول مال کے لیے جو سعی و کاوش اور تگ و تاز درکار ہے اس میں سہولت اور مشقت دونوں کا ہی اعتبار کرتے ہوئے مال زکوٰۃ کی واجبی مقداروں میں تفاوت بھی رکھا گیا ہے، چنانچہ جو دولت[1] بطور دفینہ

---

[1] موطا امام مالک ۸۶۸/۲، ۸۶۹۔ بخاری ۲۸۹/۳۔ مسلم (۱۷۱۰) ترمذی (۶۴۲)، (۱۳۷۷)۔ ابوداؤد (۳۰۸۵)۔ نسائی ۴۵/۵ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جانوروں کا زخم معفوعنہ ہے اس پر تاوان نہیں لیا جائے گا۔ اور اسی طرح کنویں اور کان کا نقصان بھی معفوعنہ ہے۔" (یعنی یہ مذکورہ چیزیں اگر کسی کی ملکیت ہوں اور ایک دوسرے شخص کو ان سے کسی طرح کا کوئی نقصان لاحق ہو جائے تو صاحبِ ملکیت پر کوئی تاوان نہیں نافذ کیا جائے گا یہاں تک کہ اگر وہ موت کا شکار ہو جائے تب بھی ضامن نہیں ہوگا۔) اور رکاز کے اندر زکوٰۃ کا پانچواں حصہ لاگو ہوتا ہے۔
زمین کے اندر دفن شدہ مال کو رکاز کہتے ہیں امام مالک نے موطا کے اندر اور انھیں سے روایت کرتے ہوئے ابو عبید نے "الاموال" صفحہ ۳۹۳ میں ذکر کیا ہے کہ رکاز جاہلیت کا وہ دفینہ ہے جو کسی مال کے عوض طلب کیے بغیر حاصل ہو گیا ہو نیز جس کے طلب میں زیادہ کد و کاوش نہ کرنی پڑی ہو۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اچانک اکٹھا حاصل ہو جائے اس میں کل دولت کا پانچواں حصہ زکوٰۃ رکھی گئی اسے ایک سال کی قید سے آزاد بھی رکھا گیا۔ یعنی جب بھی یہ دولت مل جائے اس پر پانچویں حصہ کی ادائیگی لازم قرار پائیگی مگر جس دولت کو حاصل کرنے میں اس سے زیادہ محنت و مشقت درکار ہے اس میں مذکورہ شرح کا نصف یعنی دسواں حصہ رکھا گیا۔ یہ ان غلوں اور پھلوں کی واجبی زکوٰۃ ہے جس میں آدمی کو کھیت جوتنا اور بونا پڑتا ہے۔ مگر آبپاشی اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ کاشتکار کو خود آبپاشی کی زحمتیں (مثلاً پانی کا لگان، کنویں اور چرخی کا استعمال وغیرہ) اٹھانی نہیں پڑتیں۔ لیکن جن غلوں اور پھلوں کی تیاری میں آبپاشی کی زحمتیں بھی کاشتکار ہی کو اٹھانی پڑتی ہیں ان میں مذکورہ شرح کا نصف یعنی بیسواں حصہ زکوٰۃ واجب کی گئی۔ اور جس دولت کو بڑھانے میں صاحبِ مال لگاتار محنت کرتا ہے، سفر کی صعوبتیں اٹھاتا ہے۔ مال کی کمائی کے لیے فکرمند رہتا ہے، انتظار کی مشقت اٹھاتا ہے۔ اس میں مذکورہ شرح کا نصف یعنی چالیسواں حصہ زکوٰۃ واجب کی گئی۔ تجارت کے لیے آدمی جو دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کرتا ہے، کھیتی باڑی کے مقابلہ میں وہ یقیناً زیادہ سخت ہے۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ہے کہ تجارتی کاروبار میں نشوونما اور ترقی کے مقابلہ میں کھیتی باڑی اور باغبانی کے کام زیادہ مفید اور نفع بخش ہوتے ہیں۔ اس سے کھیتی باڑی کی شرح زکوٰۃ مالِ تجارت کے مقابلہ میں زیادہ ہونی چاہیے۔ ایسے ہی جو زراعت آسمانی بارش سے تیار ہو جاتی ہے اس کی پیداوار نسبتہً کنوؤں اور چرخوں کے پانی سے تیار ہونے والی زراعت کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح دولت جو بطور دفینہ اکٹھا یکجائی طور پر حاصل ہو جاتی ہے وہ ان سب سے فائق ہوتی ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ کوئی دولت خواہ کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو امیر اور غریب کے باہمی اشتراک کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی، بلکہ امیر اور غریب کا باہمی معاشی اشتراک ہی کسی دولت کا بار اٹھا سکتا ہے لہٰذا جس دولت کو یہ اشتراک برداشت کرسکے اس کے لیے مقررہ نصاب متعین کر دیا گیا ہے، یہ اشتراک بھی صرف اس حد تک کہ سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ نہ پھینکے اور اس سے مسکینوں کی خاطر خواہ ضرورت پوری ہو جائے۔ چنانچہ چاندی کا نصاب دو سو درہم[1] (۵۲ ½ تولہ) سونے کا بیس مثقال[2] (۷ ½ تولہ) غلّہ اور پھلوں کا پانچ وسق[3] برابر پانچ عربی اونٹ (تقریباً ۷ ½ کوئنٹل) بھیڑ بکری کا چالیس

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

امام بیہقی نے اپنی کتاب "المعرفہ" کے اندر ربیع کی سند سے ان کا بیان نقل کیا ہے کہ امام شافعی کا ارشاد ہے: وہ رکاز جس میں زکوٰۃ کا پانچواں حصہ لاگو ہوتا ہے جاہلیت کا وہ حاصل شدہ دفینہ ہے جو کسی کی ملکیت نہ ہو۔
ابوداؤد نے حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا۔ الرکاز: الکنز العادی، یعنی پرانہ خزانہ۔ گویا اسے اس کے قدامت کے ناطے قوم عاد کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ لوگ ہر قدیم شئے کو عادی کہا کرتے ہیں۔

[1] ترمذی (۶۲۰) ابوداؤد (۱۵۷۴) ابن ماجہ (۱۷۹۰) حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میں نے غلام اور گھوڑوں کی زکوٰۃ کو معاف کر دیا ہے تو تم لوگ چاندی کا زکوٰۃ چالیس درہم پر ایک درہم ادا کرو، ۱۹۰ درہم پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے جب دو سو مکمل ہو جاتے تو اس میں پانچ درہم زکوٰۃ کے ہیں۔ فرائض زکوٰۃ کے سلسلے میں حضرت ابوبکر کی حدیث کے اندر جو بخاری ۳/۲۵۴ میں ذکر ہے کہ چاندی کے اندر چالیسواں زکوٰۃ ہے اگر صرف ۱۹۰ ہی درہم ہو تو اس میں کچھ نہیں ہے۔ الا یہ کہ صاحب مال چاہے۔ یہی اکثر اہل علم کا قول ہے کہ گھوڑوں اور غلاموں کے اندر زکوٰۃ نہیں ہے ہاں اگر یہ تجارت کے لیے ہوں تو البتہ اس میں زکوٰۃ ہے اور اس حالت میں اس کی قیمت کے اندر تجارت کی زکوٰۃ ہوگی۔
یہی حضرت عمر سے روایت ہے۔ سعید بن مسیب کا بھی یہی قول ہے نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، ابویوسف و محمد کا بھی یہی مذہب ہے۔

[2] علماء کا اس بات پر متفق فیصلہ ہے کہ سونے میں صرف اس وقت زکوٰۃ فرض ہے جب وہ بیس مثقال ہو۔

[3] مؤطا ۱/۲۴۴، بخاری ۳/۲۵۵، مسلم (۹۷۹) ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

راس، گائے بیل کا تیس اور اونٹ کا پانچ راس رکھا گیا۔ مگر اونٹوں کا نصاب چونکہ خود اپنی جنس سے معاشی مساوات کا متحمل نہ تھا اس لیے اس میں ایک بکری ادا کرنا واجب ہوا۔ اب اگر یہ بڑھ کر پانچ گنا یعنی پچیس کی تعداد میں ہو جائیں تو پھر ان میں ایک اونٹ ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورت میں نصاب ایک کا متحمل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہی واجب ٹھہرا۔

پھر کمی بیشی میں اس واجبی مقدار کی عمر کا اندازہ اونٹوں کی کثرت وقلت کے اعتبار سے ابن مخاض، بنت مخاض اور اس سے اوپر ابن لبون، بنت لبون اور اس سے اوپر حق، حقہ اور اس سے اوپر جذع اور جذعہ[1] کا شمار کیا گیا، پھر جیسے جیسے اونٹوں کی تعداد بڑھتی گئی عمریں بھی اضافہ کیا گیا حتیٰ کہ یہ اپنی انتہا تک پہنچی، اس وقت مال کی تعداد کے اضافہ کے مقابلہ میں واجبی زکوٰۃ کی تعداد کا اضافہ رکھا گیا۔ پس حکمتِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ مالوں کے اندر ایک ایسی مقدار متعین کردی جائے جو امیر و غریب کے باہمی اشتراک کا متحمل ہو سکے۔ اس مقدار سے یہ مال برباد نہ ہوں، اور مسکینوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس لیے اس مقدار کی موجودگی میں وہ کسی چیز کے محتاج بن کر نہ رہیں۔ چنانچہ اغنیاء کے مال میں وہ مقدار مقرر کردی گئی جو فقیروں کے لیے کافی ہو۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے دینے اور لینے والے دونوں کے درمیان مقدار کی عدم تعیین سے برپا ہونے والی اس ظالمانہ کشمکش کا خاتمہ کردیا، جس کا لازمی نتیجہ گلیوں اور کوچوں میں ادبار ونکبت، افلاس ومسکنت اور دریوزہ گری کے سایے جنم لیتا تھا۔ اس کشمکش کی موجودگی میں لازماً مسکینوں کو سخت دھکا پہنچتا، ان پر سخت فقر وفاقہ کی حالت طاری ہوتی جو انھیں دریوزہ گری کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے اختیار کرنے پر مجبور کرتی۔

صدقات کی تقسیم بھی خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمائی ہے۔ چنانچہ اس کے آٹھ حصے قرار دیتے ہیں جنھیں دو قسم کے لوگ حاصل کریں گے۔ ایک وہ ہیں جو ضرورت مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی ضرورت جیسی ہوگی ہلکی، سخت، کم یا زیادہ اسی کے اعتبار سے وہ زکوٰۃ کی مقدار بھی حاصل کریں گے۔ ان میں ایک فقیر، دوسرا مسکین، تیسرا غلام اور چوتھا مسافر ہے، دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس فہرست میں محصلین زکوٰۃ، مصلحین، مؤلفۃ القلوب، باہمی اصلاح کی کوشش کرنے والے، قرضدار اور مجاہدین فی سبیل اللہ داخل ہیں۔ باقی جو ضرورت مند نہ ہوں یا جنکی ذات سے مسلمانوں کا فائدہ وابستہ نہ ہو ان کا مالِ زکوٰۃ میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کا ارشاد ہے "کھجور کے اندر پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور چاندی کے اندر پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے"۔
وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور صاع بغدادی رطل سے ۵ $\frac{1}{3}$ رطل کا ہوتا ہے اور بغدادی رطل ۱۲۸ درہم کا ہوتا ہے۔

[1] بنت مخاض اونٹنی کے اس بچے کو کہتے ہیں جس پر ایک سال گذر چکا ہو اور اس نے دوسرے سال میں قدم رکھ دیا ہو۔ اسے بنت مخاض کہنے کی یہ وجہ ہے کہ اس کی ماں دوسرا بچہ جننے کے قریب ہوتی ہے۔ مذکر بچے کو ابن مخاض کہتے ہیں اور مخاض کے معنی حوامل کے آتے ہیں یعنی حمل والی اونٹنیاں۔
بنت لبون : اونٹنی کے اس مونث بچے کو کہا جاتا ہے جس پر دو سال گذر چکا ہو اور تیسرے میں قدم رکھ دیا ہو۔ اسے بنت لبون اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ بچہ جننے کی وجہ سے اس کی ماں دودھ والی ہو جاتی ہے۔ اور مذکر بچے کو ابن لبون کہتے ہیں۔
حقہ : اونٹنی کے اس مونث بچے کو کہتے ہیں جس پر تین سال مکمل ہو گئے ہوں اور چوتھے سال میں قدم رکھ دیا ہو۔ اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اونٹنی حمل اور جفتی کے لائق ہو جاتی ہے۔ مذکر کو حق کہتے ہیں۔
جذعہ : اس مونث بچے کو کہتے ہیں جس کا چار سال مکمل ہو گیا ہو اور وہ پانچویں میں قدم رکھ دے۔ اسے جذعہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ پانچویں سال دانت توڑتا ہے۔

زکوٰۃ لینے کے اہل

سنت یہ تھی کہ جس آدمی کا مستحق زکوٰۃ ہونا آپ کو معلوم ہوتا اسے دیتے اور جس کا مستحق ہونا معلوم نہ ہوتا مانگنے پر دیتے مگر فرمادیتے "دیکھنا اس مال کے اندر نہ مالداروں کا کوئی حصہ ہے نہ ہٹے کٹے کمائی کرنے والوں کا"[۱] اور زکوٰۃ مالداروں سے لے کر مستحقین میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔

سنت نبوی یہ تھی کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں کے مستحقین پر تقسیم کردی جاتی۔ جو بچ جاتی اسے آپ کے یہاں بھیج دیا جاتا جسے آپ تقسیم فرمادیتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ محصلین کو خانہ بدوش قبائل میں بھیجتے تھے بستیوں میں نہیں۔ حضرت معاذ بن جبل کو آپ نے ہدایت فرمادی تھی کہ یمن کی زکوٰۃ امراء سے لے کر فقراء میں تقسیم کردیں گے۔ آپ کے یہاں نہ بھیجیں گے، مویشی، غلہ اور پھل والوں کے علاوہ کے پاس زکوٰۃ کے لیے محصلین بھیجنا آپ کی سنت نہ تھی۔ کھجور مالکان کے یہاں اندازہ لگانے والوں کو بھیجتے جو اس بات کا اندازہ لگاتے کہ کتنا وسق کھجور ہوگا پھر اسی کے مطابق زکوٰۃ متعین کرتے تھے[۲]

۱۔ ابوداؤد (۱۶۳۳) فی الزکوٰۃ : باب من یعطی الصدقۃ۔ نسائی ۹۹/۵، ۱۰۰ فی الزکوٰۃ : باب مسئلۃ القوی المکتسب، عبیداللہ بن عدی بن الخیار روایت کرتے ہیں کہ مجھے دو ایسے آدمیوں نے باخبر کیا جو حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ صدقات تقسیم کررہے تھے، تو انھوں نے آپ سے صدقات میں سے اپنے لیے بھی طلب کیا تو آپ نے نظر اٹھائی اوپر نیچے دیکھا انھیں آپ نے بہت تندرست و توانا پایا پھر آپ نے کہا اگر تمھاری مرضی ہو تو تمھیں دے دوں لیکن اس میں کسی مالدار آدمی کا اور اسی طرح تندرست و توانا، کمانے والے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔
امام مسلم نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں اپنی صحیح کے اندر (۱۰۴۴) باب من تحل لہ المسئلۃ کے تحت نقل کیا ہے : قبیصہ بن مخارق الہلالی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا۔ دست سوال دراز کرنا صرف تین افراد کے لیے روا ہے ایک تو وہ شخص جو کسی کی کفالت اپنے ذمے اٹھالے (مثلاً دو قومیں آپس میں برسرپیکار ہیں دیرینہ عداوت ہے بغض و کینہ سے دونوں کے سینے بھرے پڑے ہیں، کہیں مال کا جھگڑا ہے تو کہیں جان کا ایک تیسرا شخص اپنی ہمدردی اور بھائی چارگی کے ناطے آپس کی اس رنجش کو دیکھ کر برداشت نہ کرسکا کچھ روپیہ بطریق دیت دے کر بغض کے اس آگ کو بجھانا چاہتا ہے تو دیت کے روپیہ کو ادا کرنے کے لیے وہ دست سوال دراز کرسکتا ہے اگرچہ وہ مالدار ہو، ہاں جب یہ دیت مکمل ہوجائے تو اس کے لیے مانگنا درست نہیں ہے۔
دوسرا وہ شخص جو ایسی آفت سے دوچار ہوگیا ہو جو اس کے مال کو ہلاک کرگئی اس کے لیے اس وقت تک لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا جائز ہے جب تک اس کی حالت درست نہ ہوجائے۔ یا جب تک وہ زندگی کی درستگی کو نہ پالے تیسرا وہ شخص جو فاقہ میں مبتلا ہو یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین باشعور افراد نے گواہی دی کہ واقعی وہ فاقہ سے ہے تو ایسے شخص کے لیے اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک اس کی حالت صحیح نہ ہوجائے یا زندگی کی درستگی کو نہ پالے۔ اے قبیصہ تم سن لو ان کے علاوہ اور لوگوں کا مانگنا حرام و ناروا ہے۔

۲۔ مسند شافعی ۲۳۱/۱، ۲۳۲، ابن شہاب زہری کی حدیث ہے وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں وہ عتاب بن اسید سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انگور کی زکوٰۃ میں ویسے ہی اندازہ لگایا جائے گا جیسے کہ کھجوریں، پھر اندازہ لگانے کے بعد کشمش زکوٰۃ میں دی جائے گی۔ جس طرح کھجور کا اندازہ کرکے خشک کھجور سے اس کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔
اور ابوداؤد (۱۶۰۳) ترمذی (۶۴۴) ابن ماجہ (۱۸۱۹) بیہقی ۱۲۲/۴ سعید بن المسیب کی لقاء عتاب بن اسید سے نہیں ہے۔ ابوداؤد کا اپنا بیان ہے کہ سعید نے عتاب سے سنا نہیں ابن قانع نے کہا کہ دونوں کے مابین لقاء ثابت نہیں ہے۔ منذری نے کہا کہ اس حدیث کا منقطع ہونا ظاہر ہے اس لیے کہ سعید کی ولادت حضرت عمر کے دور خلافت میں ہوئی جب کہ عتاب بن اسید کا انتقال اسی روز ہوچکا تھا جس دن کہ حضرت ابوبکر صدیق کی وفات ہوئی تھی، اور اسی طرح ابن عبدالبر نے بھی کہا ہے۔ ہاں بایں ہمہ بعض حضرات کا کہنا ہے انقطاع کے معنی ہیں مرسل ہونے کا دعویٰ واقدی کی اس بات پر مبنی ہے کہ عتاب کا انتقال ابوبکر کے انتقال کے دن ہوا۔ لیکن ابن جریر طبری نے بیان کیا ہے کہ عتاب ابن اسید حضرت عمر کے دور خلافت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مگر ساتھ ہی یہ حکم تھا کہ ایک ثلث یا ایک ربع چھوڑ کر اندازہ لگائیں۔ تاکہ آفات سماوی سے جو نقصان ہو وہ تخمینہ میں شامل نہ ہو[1] نیز پھلوں کو کھانے اور توڑنے سے قبل زکوٰۃ کی مقدار متعین ہو جاتے پھر ارباب اموال جس طرح چاہیں تصرف کریں اور بعد میں تخمینہ شدہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے ضامن ہوں۔ چنانچہ خیبر کی جو زمین بٹائی پر تھی اس کی پیداوار کا اندازہ کرنے کے لیے آپ آدمی بھیجتے وہ آ کر غلوں اور پھلوں کا تخمینہ لگاتا اور نصف پیداوار کا ضامن بنا کر چلا جاتا۔ ان کے یہاں بالعموم حضرت عبداللہ بن رواحہ کو آپ بھیجتے تھے۔ ان لوگوں نے انھیں رشوت دینی چاہی تو عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا: "تم مجھے حرام کھلاؤ گے؟ واللہ میں اپنے محبوب ترین انسان کی طرف سے تمھارے پاس آیا ہوں، تم سب میرے نزدیک بندروں اور خنزیروں سے بھی زیادہ بدتر ہو، پھر بھی اس ذات گرامی کی محبت اور تم سے شدید نفرت مجھے ظلم بھی نہ کرنے دے گی جو انصاف کی بات ہو گی وہی کروں گا۔ اس پر ان لوگوں نے کہا، ایسے ہی اصول پر آسمان و زمین قائم ہیں"[2]

گھوڑوں، غلاموں، خچروں، گدھوں، سبزیوں اور ناقابل ذخیرہ میوہ جات پر جو ناپے نہ جا سکیں زکوٰۃ لینا آپ کی سنت نہ تھی۔ مگر انگور اور کھجور خشک یا تر سب پر آپ زکوٰۃ لیتے تھے، ان میں کوئی تفریق نہیں فرماتے تھے۔

بقیہ صفحہ گذشتہ) میں ۲۱ھ میں مکہ کے اندر ان کے عامل مقرر تھے۔ اور سعید بن مسیب کی پیدائش حضرت عمر کے خلیفہ ہونے کے دو سال بعد ہوئی تو عتاب اور سعید کے مابین سماع ممکن ہو سکتا ہے لہٰذا کوئی انقطاع نہیں ہے۔ امام نووی نے فرمایا کہ یہ حدیث گرچہ مرسل ہے لیکن ائمہ کے اقوال سے اسے تقویت پہنچتی ہے۔ امام شافعی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پھلوں اور انگوروں کا اندازہ کرنے کے لیے آدمی روانہ کرتے تھے۔ بخاری ۳/۲۷۲، ابوحمید ساعدی سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک میں شرکت کے لیے ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے جب وادی قریٰ سے گذر ہوا تو اچانک ہم لوگوں نے ایک عورت کو اس کے باغ میں دیکھا آپ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا اس کا اندازہ لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے دس وسق کا اندازہ لگایا پھر آپ نے عورت سے مخاطب ہو کر فرمایا جو کچھ اس سے زکوٰۃ ہوا سے ادا کرو۔
الخرص: کھجور کے درخت پر تر کھجور کو کہتے ہیں۔ خشک کھجور کے مقابلے میں اس کا تخمینہ لگانا امام ترمذی نے بعض اہل علم کے ذریعہ اس کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ کھجور اور انگور جب پک جائے اور اس مقدار میں ہو کہ جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہو تو خلیفہ وقت تخمینہ لگانے والے کو روانہ کرے وہ جا کر کہے کہ اس سے اتنی اتنی خشک کھجوریں اور کشمش زکوٰۃ میں نکلیں گی، پس وہ اسے شمار کرے اور اس کے علاوہ کے اندر عشر کی مقدار دیکھ کر اس پر زکوٰۃ لاگو کرے، اور مالکان کو آزاد کر دے، جب کاٹنے کا وقت آئے گا تو اس سے عشر لیا جائے گا۔ پھلوں کے مالکان کو تخمینہ کا فائدہ یہ ہے کہ تصرف میں انھیں وسعت حاصل ہو گی۔ پکنے پر پھلوں کو بیچ سکے گا اور گھر کے لوگ پڑوسی اور فقراء کو بطور عطیہ دے بھی سکیں گے۔ روک دینے میں پھلوں کے مالکان کے لیے جو تنگی پیدا ہو گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

[1] ابوداؤد (۱۶۰۵) ترمذی (۶۴۳) نسائی ۵/۴۲ ابن حبان (۷۹۸) سہل بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ کر زکوٰۃ لو۔ اگر ایک تہائی نہ چھوڑو تو ایک چوتھائی چھوڑ دو۔ ان کی سند میں عبدالرحمن بن مسعود بن نیار ہیں جنھیں ابن حبان کے علاوہ کسی نے بھی ثقہ نہیں قرار دیا ہے اور باقی راوی ثقہ ہیں فتح الباری ۳/۲۷۴ میں حافظ نے اس سلسلے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لیث بن سعد، احمد اور اسحاق وغیرہ ظاہر حدیث کے قائل ہیں۔

[2] موطا مالک ۲/۷۰۳، ۷۰۴ فی المساقاۃ: باب ماجاء فی المساقاۃ ابن شہاب کی حدیث ہے جو وہ سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کی جانب روانہ کرتے تھے . . . . گرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ ابوداؤد (۳۴۱۰) ابن ماجہ (۱۸۲۰) ابن عباس کی حدیث سے ٹھیک ایسے ہی روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

شہد کی زکوٰۃ

شہد کا عشر لینے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں مختلف ہیں، چنانچہ ابوداؤد عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے والد سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ خاندان متعان کا ایک شخص ہلال اپنی شہد کا عشر لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس کی سلبہ نامی وادی کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ چنانچہ آپ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ حضرت عمر بن الخطاب جب خلیفہ ہوئے تو سفیان بن وہب نے اس بارے میں آپ کو لکھا۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ اپنے شہد کا جو عشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ادا کرتا تھا اگر ادا کرے تو اس کی وادی کی حفاظت کرو۔ ورنہ یہ خود رو نباتات کی کلیاں ہیں، جس کا جی چاہے ان کی پیداوار کھائے[1]۔" اس حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں "ہر دس مشکوں پر ایک مشک شہد[2]۔"

سنن ابن ماجہ میں انہی عمرو بن شعیب کی روایت ہے جو وہ اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے شہد کا عشر لیا ہے[3]۔"

مسند امام احمد میں ابوسیارہ المتعی سے روایت ہے، فرماتے ہیں، میں نے دریافت کیا "رسول اللہ! میرے پاس شہد ہے، فرمایا "عشر ادا کرو" میں نے کہا "رسول اللہ! اسے اپنی حفاظت میں لے لیں" آپ نے اس کی حفاظت فرمائی[4]۔" عبدالرزاق نے عبداللہ بن محرر سے، انھوں نے زہری سے، انھوں نے ابوسلمہ سے، انھوں نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو لکھا کہ شہد سے دسواں حصہ لیا جائے[5]۔

شافعی فرماتے ہیں ہمیں انس بن عیاض نے خبر دی، وہ حارث بن عبدالرحمن بن ابی ذباب سے، وہ اپنے والد سے، وہ سعد بن ابی ذباب سے، اپنا واقعہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، اور آپ سے کہا "رسول اللہ! میری قوم کی دولت وہی محسوب کی جائے جس پر انھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔" آپ نے میری یہ درخواست منظور فرمائی، اور مجھے ان کا عامل بنا دیا، حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی میں ان کا عامل رہا، پھر حضرت عمر نے بھی اس عہدہ پر مجھے باقی رکھا۔ راوی کہتے ہیں کہ سعد سرداروں میں سے تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی قوم سے شہد کے بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ اس پیداوار میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی جو پاک و صاف نہ ہو جائے۔ لوگوں نے کہا تمھارے خیال میں کتنی زکوٰۃ واجب ہے، میں نے کہا دسواں حصہ، چنانچہ شہد کا عشر لے کر حضرت عمر بن الخطاب کے پاس آیا اور پورا ماجرا بیان کیا، کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] - ابوداؤد (۱۶۰۰) و (۱۶۰۱) و (۱۶۰۲) فی الزکوٰۃ: باب زکوٰۃ العسل۔ نسائی ۵/۴۶ فی الزکوٰۃ: باب زکوٰۃ النحل۔ اس کی سند حسن ہے۔

[2] - ابوداؤد (۱۶۰۲) اور ابوعبید القاسم بن سلام نے "الاموال" کے اندر ص ۵۹۸ میں اس کی روایت کی ہے، سند حسن ہے۔

[3] - ابن ماجہ (۱۸۲۴) اس کی سند شواہد کے اعتبار سے حسن ہے۔

[4] - مسند امام احمد ۴/۲۳۶، ابن ماجہ (۱۸۲۳) فی الزکوٰۃ: باب زکوٰۃ العسل۔ طیالسی ۱/۱۷۴، ۱۷۵۔ بیہقی ۴/۱۲۶، عبدالرزاق (۶۹۷۳) سلیمان ابن موسیٰ کی حدیث ہے جو ابوسیارہ المتعی سے روایت کرتے ہیں، یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ سلیمان بن موسیٰ کی لقا کسی بھی صحابی سے ثابت نہیں ہے۔

[5] - مصنف عبدالرزاق (۶۹۷۲)۔ بیہقی ۴/۱۲۶ میں مذکور ہے کہ عبداللہ بن محرر متروک راوی ہیں۔

نے زکوٰۃ کی یہ شہد لے کر اس کی قیمت مسلمانوں کے صدقات میں داخل کر دی[1]۔ امام احمد نے بھی اس کی روایت کی ہے، مگر الفاظ شافعی کے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث اور ان سے مستنبط احکام کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بخاری فرماتے ہیں کہ شہد کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں کوئی بات صحیح نہیں ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بہت زیادہ ثابت نہیں۔

ابن منذر فرماتے ہیں شہد کی زکوٰۃ کا واجب ہونا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ اجماع سے۔ اس لیے اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ شافعی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کہ شہد میں عشر ہے ضعیف ہے۔ نیز یہ حدیث بھی کہ اس میں عشر نہ لیا جائے گا، ضعیف ہے۔ مگر جو روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز سے وارد ہے وہ ضعیف نہیں ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ شہد کے سلسلہ میں وجوب زکوٰۃ کی تمام حدیثیں معلول ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث صدقہ بن عبداللہ بن موسیٰ بن یسار کی روایت کردہ ہے جسے وہ نافع سے اور وہ عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں، صدقہ کو امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ بخاری فرماتے ہیں یہ حدیث نافع کی روایت کردہ ہے اور انھوں نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً بیان کیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں صدقہ کا کوئی اعتبار نہیں، یہ حدیث منکر ہے۔ ابوسیارہؓ المتعی کی حدیث کا جہاں تک تعلق ہے، ان سے اس کی روایت سلیمان بن موسیٰ نے کی ہے جن کے بارے میں بخاری فرماتے ہیں انھوں نے کسی صحابی کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ عمرو بن شعیب کی دوسری حدیث جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کا عشر لیا ہے۔ اس کی سند میں بھی اسامہ بن زید بن اسلم ہیں جو اس کی روایت عمرو سے کرتے ہیں اور عمرو سب کے نزدیک ضعیف ہیں۔ ابن معین فرماتے ہیں زید کے تینوں بیٹوں کی کوئی حقیقت نہیں، ترمذی فرماتے ہیں کہ زید بن اسلم کے بیٹوں میں کوئی بھی ثقہ نہیں ہے۔

بروایت ابوسلمہ عن ابی ہریرہ، جو حدیث زہری نقل کرتے ہیں اگر اس کی سند میں عبداللہ بن محرر جو زہری سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں نہ ہوتے تو خوب تر تھی۔ مگر امام بخاری ان کی اس حدیث پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن محرر متروک الحدیث ہیں، شہد کی زکوٰۃ میں اصلاً کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔

شافعی رحمہ اللہ کی حدیث پر بیہقی تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی روایت صلت بن محمد نے انس بن عیاض سے، وہ حارث بن عبدالرحمٰن یعنی ابن ابی الذباب سے، وہ منیر بن عبداللہ سے، وہ اپنے والد سے، وہ سعد بن ابی ذباب سے کرتے ہیں اور اسی طرح صفوان بن عیسیٰ اس کی روایت حارث بن ابی ذباب سے کرتے ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ منیر کے والد عبداللہ کا سعد بن ابی ذباب سے روایت کرنا صحیح نہیں ہے۔ علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ منیر کا نام ہم اسی روایت میں پاتے ہیں، ایسا ہی انھوں نے مجھ سے فرمایا ہے، شافعی فرماتے ہیں: سعد بن ابی ذباب ایک ایسی حکایت بیان کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں شہد کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ خود انھوں نے رضا کارانہ طور پر وصول کیا تھا۔ شافعی کہتے ہیں کہ میرا مذہب مختار یہ ہے کہ شہد سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی کیونکہ جن اشیاء سے زکوٰۃ وصول کرنا واجب ہے سنن و آثار ان کے بارے میں بالکل واضح و ثابت

---

[1] مسند شافعی ۱/ ۲۴۰، ۲۴۱۔ کتاب الام ۲/ ۳۳، عبدالرحمٰن کے علاوہ تمام رجال ثقہ ہیں۔ عبدالرحمٰن کو ابن حبان کے سوا کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ مسند احمد ۴/ ۷۹۔ بیہقی ۴/ ۱۲۷۔ ابن ابی شیبہ ۳/ ۲۰۔ وابو عبید فی الاموال (۴۹۹) و (۴۹۷) اس کی سند میں منیر بن عبداللہ کو کئی ایک نے ضعیف کہا ہے۔

ہیں، مگر شہد کے باب میں ان کے اندر کوئی ثبوت نہیں ملتا گویا اسے اس کی زکوٰۃ سے معاف کیا گیا ہے۔
علاوہ ازیں یحییٰ بن آدم کی ایک روایت بھی ہے، وہ فرماتے ہیں ہم سے حسین بن زید نے بیان کیا، وہ جعفر بن محمد سے، وہ اپنے والد سے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "شہد میں زکوٰۃ نہیں ہے"[1]
یحییٰ فرماتے ہیں: حسن بن صالح سے شہد کے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں، آگے حضرت معاذ سے ایک روایت کا تذکرہ بھی فرمایا کہ انھوں نے شہد کی کچھ بھی زکوٰۃ وصول نہیں کی تھی۔ حمیدی فرماتے ہیں، ہم سے سفیان نے، انھوں نے کہا ہم سے ابراہیم بن میسرہ نے بیان کیا، وہ طاؤس سے، وہ معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے یہاں نصاب سے کم گائیں اور شہد زکوٰۃ کے لیے پیش کیے گئے، تو فرمایا: ان دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم نہیں دیا ہے[2]
شافعی فرماتے ہیں ہمیں مالک نے خبر دی وہ عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا ایک مکتوب میرے والد کو جب کہ منیٰ میں تھے موصول ہوا۔ اس میں انھیں حکم تھا کہ گھوڑوں اور شہد کی زکوٰۃ نہ وصول کریں[3] گے۔ یہی امام مالک اور شافعی کا مذہب ہے۔
امام احمد، ابوحنیفہ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ شہد میں زکوٰۃ ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مذکورہ آثار و روایات ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں، ان کی تخریجات بھی متعدد ہیں اور سندیں بھی مختلف، روایات جو مرسل وارد ہیں ان کی تائید مسند سے ہو جاتی ہے۔ منیر کے والد عبداللہ کے بارے میں ابوحاتم رازی سے دریافت کیا گیا کہ ان کی سعد بن ابی ذباب سے روایت کیا صحیح ہوتی ہے؟ تو فرمایا "ہاں" یہ حضرات دلیل کے طور پر یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ شہد پھولوں اور کلیوں سے نکلتا اور ناپا تولا اور ذخیرہ کیا جا سکتا ہے اس لیے اس کے اندر غلوں اور پھلوں کی طرح زکوٰۃ واجب ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شہد کی وصولیابی میں غلوں اور پھلوں کے بالمقابل کم زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کے بعد امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، عشری زمین سے اگر شہد حاصل کیا گیا ہے تو اس کے اندر عشر واجب ہوگا، مگر خراجی زمین سے حاصل کردہ شہد کے اندر کچھ بھی زکوٰۃ نہ ہوگی۔ کیونکہ خراجی زمینوں کے مالکان پر خراج پھلوں اور غلوں کی پیداوار کے باعث واجب ہوتا ہے لہٰذا اس پیداوار کے علاوہ کوئی اور دوسرا حق واجب نہ ہوگا۔ برعکس ازیں عشری زمینوں سے متعلق کوئی اور حق اس کے ذمہ واجب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس سے جو پیداوار ہوگی اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام احمد دونوں زمینوں کو یکساں قرار دیتے ہیں، چنانچہ یہ عشری ہوں یا خراجی، پیداوار مملوکہ آراضی سے حاصل کی گئی ہو یا غیر مملوکہ سے، بہرحال زکوٰۃ واجب ہوگی۔
شہد کے اندر زکوٰۃ کے جو حضرات قائل ہیں ان میں اختلاف ہے کہ اس کا کوئی نصاب ہے یا نہیں، ایک قول یہ ہے کہ کم ہو یا زیادہ بہرحال زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا ایک معین نصاب ہے، آگے مقدار نصاب میں اختلاف ہے، چنانچہ ابویوسف دس رطل کے قائل ہیں اور محمد بن حسن پانچ فرق یعنی ۱۸۰ رطل عراقی اور امام احمد ۱۰ فرق یعنی ۳۶۰ رطل عراقی مانتے ہیں۔ فرق کے بارے میں امام احمد کے اصحاب میں اختلاف

---

[1] اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں، مگر یہ مرسل ہے۔
[2] مصنف عبدالرزاق (۶۹۶۴) بیہقی ۴/۱۲۷ رجال ثقہ ہیں مگر حدیث مرسل ہے، اور مصنف میں اس طرح ہے "لوگوں نے ان سے تیس سے کم گایوں کے بارے میں پوچھا"
[3] موطا امام مالک ۱/۲۷۷ و ۲۷۸ فی الزکوٰۃ: باب ماجاء فی صدقۃ الرقیق والخیل والعسل، سند صحیح ہے۔

ہے۔ چنانچہ ایک قول کے مطابق یہ ۶۰ رطل، دوسرے قول کے مطابق ۳۶ رطل اور تیسرے قول کے مطابق ۱۶ رطل کا ہوتا ہے۔ امام احمد نے اس سلسلہ میں جو کلام کیا ہے اس سے اسی آخری شرح کا پتہ چلتا ہے۔ واللہ اعلم۔

زکوٰۃ حاضر کرنے والے کو رسول اللہ علیہ وسلم کی دعا

سنت یہ تھی کہ جب آپ کی خدمت میں کوئی زکوٰۃ لے کر آتا تو اسے کبھی یہ دعا دیتے۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِیْہِ وَفِیْ اِبِلِہٖ[1] بارالٰہی! اسے اور اس کے اونٹوں کو مبارک فرما۔

اور کبھی یہ دعا دیتے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ[2] اے اللہ! اس پر رحمت نازل فرما۔

زکوٰۃ میں عمدہ نہیں بلکہ متوسط درجہ کا مال لینا آپ کا دستور تھا۔ حضرت معاذ کو عمدہ مال لینے سے آپ نے روکا ہے۔[3]

اپنے صدقہ کی خریداری کی ممانعت

صدقہ ادا کرنے والے کو اپنا صدقہ خریدنے سے آپ روکتے تھے[4] مالدار کو اجازت تھی کہ اگر کسی فقیر نے صدقہ کا مال اسے بطور ہدیہ دیا تو اسے استعمال کرے۔ حضرت بریرہ نے صدقہ کا گوشت آپ کی خدمت میں بھیجا تو آپ نے اسے تناول فرمایا، اور فرمایا کہ یہ اس کے لیے تو صدقہ مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے[5] مسلمانوں کی مصلحتوں کے کاموں میں خرچ کرنے

۱۔ نسائی ۵/۳۰ فی الزکوٰۃ : باب الجمع بین المتفرق والتفریق بین المجتمع جو وائل ابن حجر کی حدیث سے نقل کیا ہے اس کی سند صحیح ہے۔

۲۔ بخاری ۳/۲۸۶ فی الزکوٰۃ : باب صلاۃ الامام ودعائہ لصاحب الصدقۃ۔ مسلم (۱۰۷۸) فی الزکوٰۃ : باب الدعاء لمن اتی بصدقتہ۔ ابوداؤد (۱۵۹۰) فی الزکوٰۃ : باب دعاء المصدق لاھل الصدقۃ۔ نسائی ۵/۳۱ فی الزکوٰۃ : باب صلاۃ الامام علی صاحب الصدقۃ عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے کہ جب بھی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقات لے کر آیا کرتے تھے تو آپ فرماتے "اللھم صل علیھم" اے اللہ! انھیں سلامت رکھیو۔ ایک بار میرے والد محترم ابواوفی آپ کی خدمت میں اپنا صدقہ لے کر پیش ہوئے تو آپ نے کہا "اللھم صل علی آل ابی اوفی" الٰہی! تو ابواوفی کے خاندان کو سلامت رکھ۔ اور آل ابی اوفی سے مراد خود ابواوفی ہی ہیں۔

۳۔ بخاری ۳/۲۵۵۔ مسلم (۱۹) ابن عباس کی حدیث ہے کہ حضرت معاذ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجتے وقت مجھ سے ارشاد فرمایا۔ اے معاذ تم ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو صاحب کتاب ہے۔ لہٰذا تم انھیں لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی دعوت دو اور اس بات کی دعوت دو کہ میں اللہ کا رسول ہوں اگر وہ اسے تسلیم کر لیں تو انھیں یہ بتلا دو کہ دن و رات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر پانچ وقت کی صلوٰۃ فرض کی ہے۔ اگر وہ اسے بھی مان لیں تو انھیں باخبر کرو کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو انھیں کے مالداروں سے وصول کر کے انھیں کے غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے گا۔ پس اگر وہ اسے بھی تسلیم کر لیں تو سن لو تم ان کے عمدہ مال سے دور رہو اور ایک مظلوم کی بد دعا سے بچو کیونکہ ایک مظلوم کی بد دعا اور اللہ کے مابین کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔

۴۔ امام مالک ۱/۲۸۲۔ بخاری ۵/۳۰۴۔ مسلم (۱۶۲۱) ابن عمر کی حدیث ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے ایک گھوڑا اللہ کے راستے میں بطور صدقہ دیا آپ نے اسے بکتے ہوئے دیکھا تو اسے خریدنا چاہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے خریدنے سے منع فرمایا اور کہا اپنے صدقہ کے اندر مت پلٹو۔

۵۔ مسند امام احمد ۶/۱۲۳ و ۱۷۹۔ بخاری ۹/۴۸۲ فی الاطعمہ : باب الأدم۔ مسلم (۱۵۰۴) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے لیے کبھی کبھی آپ صدقہ سے قرض لیتے تھے، جیساکہ ایک دفعہ آپ نے لشکر کی تیاری میں اونٹ کم ہو جانے پر حضرت عبداللہ بن عمرو کو حکم دیا کہ صدقہ کے اونٹ لے لیے جائیں[۱]

صدقہ کے اونٹوں پر نشان آپ[۲] خود اپنے ہاتھوں سے لگاتے تھے یہ نشان آپ کانوں پر لگاتے تھے۔ کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو ارباب ثروت سے پیشگی صدقہ بطور قرض لے لیتے جیساکہ آپ نے حضرت عباس سے دو سالوں کا صدقہ پیشگی[۳] قرض کے طور پر لیا تھا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی العتق : باب انما الولاء لمن اعتق۔ موطا ۲/۵۶۲ فی الطلاق : باب ماجاء فی الخیار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ یہ ایک طویل حدیث کا خلاصہ ہے۔

۱۔ ابوداؤد (۳۳۵۷) فی البیوع : باب فی الرخصۃ فی بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃ۔ احمد (۷۰۲۵) حاکم ۳/۵۶، ۵۷ عبداللہ بن عمرو کی حدیث ہے۔ اس کی سند میں جہالت اور اضطراب ہے۔ لیکن دارقطنی نے ص ۳۱۸ میں ابن وہب کے طریق سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اخبرنی ابن جریج ان عمرو بن شعیب اخبرہ عن ابیہ عن جدہ ..... اس کی سند حسن ہے بیہقی نے اسے ۵/۲۸۷، ۲۸۸ میں دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اس کی طرف حافظ نے بھی الفتح ۴/۳۴۷ میں اشارہ کیا ہے۔

۲۔ بخاری ۳/۲۹۰ فی الزکوٰۃ : باب وسم الامام ابل الصدقۃ۔ انس بن مالک کی حدیث سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا ایک بار صبح صبح عبداللہ بن ابی طلحہ کو لے کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ آپ ان کی تحنیک فرمادیں میں نے آپ کو ایسے حال میں پایا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک آلہ تھا جس سے آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے تھے ان کی ایک دوسری روایت الذبائح ۹/۵۸۰، میں مذکور ہے کہ آپ اپنی قربانی کی بکری کو داغ رہے تھے۔ راوی نے بیان کیا یعنی اس کے کان میں۔ نیز بخاری ۱۰/۲۳۷ کی ایک دوسری روایت میں ہے۔ مسلم (۲۱۱۹) کہ آپ اس اونٹنی کو داغ رہے تھے فتح مکہ کے موقع پر جس پر آپ سوار ہو کر آئے تھے۔

۳۔ ابوداؤد (۱۶۲۴) احمد ۱/۱۰۴ ترمذی (۶۷۹) ابن ماجہ (۱۷۹۵) دارقطنی ۲/۱۲۳ بیہقی ۴/۱۱۱ حدیث حجاج بن دینار کی ہے وہ روایت کرتے ہیں حکم بن عتیبہ سے، وہ روایت کرتے ہیں حجیہ بن عدی سے، وہ روایت کرتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہ حضرت عباس نے سال آنے سے پہلے ہی اپنی زکوٰۃ پیش کرنے کے بارے میں دریافت کیا یعنی ایک سال کی پیشگی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس بارے میں چھوٹ دی۔ ابوداؤد نے بیان کیا کہ اس حدیث کو ہشیم نے منصور بن زاذان سے، انھوں نے حکم سے اور حکم نے حسن بن مسلم سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور ہشیم کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں حکم کے سلسلے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور حسن بن مسلم سے جو صحیح ہے وہ مرسل ہے۔ دارقطنی کے اندر موسیٰ بن طلحہ کے سلسلے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چونکہ ہمیں ضرورت تھی اس لیے ہم نے حضرت عباس سے دو سال کی زکوٰۃ لینے میں جلدی برتی، یہ مرسل ہے۔ اس میں طلحہ کے ذکر کے ساتھ اسے موصولاً بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی مرسل سند زیادہ صحیح ہے۔ اس میں ابن عباس کی بھی حدیث ذکر کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا تو آپ حضرت عباس کے پاس گئے انھیں کچھ سخت و سست کہا انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کیا تو آپ نے فرمایا "ہم نے عباس سے اس سال اور آنے والے دونوں سالوں کی زکوٰۃ لے لیا ہے" اس کی سند میں ضعف ہے۔ اس طرح دارقطنی اور طبرانی دونوں نے ابورافع کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ اور ابن مسعود کی بھی حدیث کو نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے دو سال کی زکوٰۃ پہلے ہی لے لی۔ اس کی سند میں محمد بن ذکوان ہیں جو ضعیف ہیں۔ حافظ نے الفتح ۳/۲۶۴ میں مذکورہ بالا باتوں کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ جملہ طرق کے پیش نظر حضرت عباس کے جلد صدقہ دینے میں کوئی بعد نہیں ہے۔

صدقۂ فطر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

صدقۂ فطر رسول اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے نیز اس کے زیر کفالت چھوٹے بڑے، مرد، عورت اور آزاد و غلام سب پر ایک صاع کھجور یا جو، یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع منقی عائد کیا ہے۔[۱] ایک روایت کے مطابق ایک صاع آٹا اور ایک روایت کے مطابق نصف صاع گیہوں فرض کیا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے نصف صاع گیہوں کو مذکورہ بالا اشیاء کے بجائے ایک صاع کے برابر قرار دیا ہے۔ اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے۔[۳] مگر صحیحین کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ تعیین حضرت معاویہ نے فرمائی تھی۔[۴] اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل اور مسند دونوں طرح کی روایتیں وارد ہیں۔ جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ عبداللہ بن ثعلبہ یا ثعلبہ بن عبداللہ بن ابی صعیر کی روایت ان کے والد سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "ایک صاع گیہوں ہر دو اشخاص پر ہے۔" اس کی روایت احمد اور ابوداؤد[۵] نے کی ہے۔

عمرو بن شعیب اپنے والد سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی وادیوں میں بھیج کر یہ منادی کروائی کہ صدقۂ فطر ہر مسلمان پر مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، چھوٹا ہو یا بڑا سب پر واجب ہے۔ دو مد گیہوں یا اس کے علاوہ دوسرے غلوں میں سے ایک صاع۔ ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے[۶] اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر کے سلسلہ میں عمرو بن حزم کو حکم دیا

۱۔ مؤطا مالک ۱/۲۸۴۔ بخاری ۳/۲۹۲۔ مسلم (۹۸۴) ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے صدقۂ فطر کو تمام مسلمانوں پر خواہ غلام ہوں یا آزاد، مذکر ہوں، یا مونث ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو فرض قرار دیا ہے۔ مؤطا مالک ۱/۲۸۴۔ بخاری ۳/۲۹۴۔ مسلم (۹۸۵) میں ابوسعید الخدری کی حدیث ہے کہ ہم لوگ صدقۂ فطر گیہوں سے یا جو سے یا کھجور سے یا پنیر سے یا منقی سے ایک ایک صاع ادا کیا کرتے تھے۔

۲۔ یہ ابوداؤد کی روایت کردہ حدیث کا ایک حصہ ہے (۱۹۱۸) نسائی ۵/۵۲، اور یہ جملہ "او صاعاً من دقیق" یعنی آٹے سے ایک صاع۔ سفیان بن عیینہ کا اپنا وہم ہے جیسا کہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ نسائی کا قول ہے "ثم شك سفيان، فقال دقيق أو سلت۔" یعنی پھر سفیان نے شک کے ساتھ آٹا یا بغیر چھلکے کا جو دینے کا ذکر کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ سفیان کے سوا کسی نے آٹے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی کو دارقطنی نے سلیمان بن ارقم کے طریق سے روایت کیا ہے۔ وہ زہری سے، وہ قبیصہ بن ذویب سے اور وہ زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا اس سند سے سلیمان بن ارقم کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا ہے اور سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہیں۔

۳۔ ابوداؤد (۱۶۱۴)۔ سند حسن ہے۔

۴۔ بخاری ۳/۲۹۵، ۲۹۷ فی الزکوٰۃ: باب صاع من زبیب۔ مسلم (۹۸۵) فی الزکوٰۃ: باب زکوٰۃ الفطر علی المسلمین من التمر و الشعیر۔ ابوداؤد (۱۶۱۶)۔ نسائی ۵/۵۳ فی الزکوٰۃ: باب الشعیر۔ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

۵۔ مسند امام احمد ۵/۴۳۱، ۴۳۲۔ ابوداؤد (۱۶۱۹) (۱۶۲۰) (۱۶۲۱)۔ طحاوی ۲/۴۵۔ دارقطنی ۲/۱۴۷۔ عبدالرزاق (۵۷۸۵) حاکم ۳/۲۷۹۔ زیلعی نے اپنی کتاب "نصب الرایۃ" ۲/۴۰۸ کے اندر بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے معلول ہونے کا دارومدار صرف دو باتوں پر ہے، ایک تو ابوصعیر کے نام میں اختلاف۔ دوم الفاظ حدیث کے اندر لوگوں کا اختلاف۔ پھر انھوں نے ۲/۴۲۴ میں کہا کہ بیہقی نے ذکر کیا کہ ثابت شدہ خبروں کے پیش نظر یہ بات درجۂ یقین تک پہنچتی ہے کہ گیہوں سے دو مد دینے کا رواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہوا۔

۶۔ ترمذی (۶۷۴) فی الزکوٰۃ: باب ماجاء فی صدقۃ الفطر۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

کہ نصف صاع گیہوں ادا کریں[1] سند کے اندر سلیمان بن موسیٰ ہیں ان کو بعض نے ثقہ کہا ہے اور بعض نے ان پر نقد کیا ہے۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ بصرہ کے منبر پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آخر رمضان میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ "اپنے صوم کا صدقہ نکالو" ایسا معلوم ہوا کہ یہ بات لوگ جانتے نہ تھے، چنانچہ فرمایا یہاں اہل مدینہ میں سے کون ہے؟ وہ جاکر اپنے بھائیوں کو بتائے، کیونکہ انھیں معلوم نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ ایک صاع کھجور یا جَو یا نصف صاع گیہوں ہر آزاد، غلام، مرد، عورت اور چھوٹے بڑے سب پر عائد فرمایا ہے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ نرخ گر گیا ہے لہذا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب کشادگی فرمادی ہے لہذا ہر چیز سے ایک صاع نکالتے تو بہتر ہوتا۔ اس کی روایت ابو داؤد نے کی ہے اور یہ انھیں کے الفاظ ہیں نسائی نے بھی اس کی روایت کی ہے مگر ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا جب کہ اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمادی ہے تم بھی وسعت پیدا کرو، اور گیہوں وغیرہ سے ایک صاع نکالا کرو[2] ہمارے شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مذہب کو قوی بتاتے تھے کہ کفاروں کے بارے میں امام احمد کا قول اسی قیاس پر مبنی ہے یعنی یہ کہ کفاروں میں گیہوں کی جو واجبی مقدار ہے وہ دوسری اشیاء کی واجبی مقدار کا نصف ہے۔

صدقۂ فطر کی ادائیگی کا وقت

صلوٰۃ عید سے پہلے صدقۂ فطر نکال دینا آپ کی سنت تھی۔ سنن میں آپ کا ارشاد مروی ہے "جس نے اسے صلوٰۃ سے پہلے ادا کر دیا وہ تو مقبول مگر جس نے بعد از صلوٰۃ ادا کیا وہ بس ایک صدقہ ہوگا"[3]

صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کے لیے نکلنے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کر دینے کا حکم دیا ہے[4]

ان دونوں حدیثوں کا اقتضاء یہ ہے کہ صدقۂ فطر کو صلوٰۃ عید سے موخر کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز یہ کہ صلوٰۃ سے فراغت کے بعد اس کا وقت جاتا رہتا ہے۔ یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ کوئی حدیث ان دونوں حدیثوں کی معارض ہے نہ ناسخ۔ اور نہ ہی

---

[1] دار قطنی ۲/۱۴۵، اس کی سند میں بھی محمد بن شرحبیل الصنعانی ہیں جنھیں دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] ابو داؤد (۱۶۲۲) فی الزکوٰۃ : باب من روی نصف صاع من قمح۔ نسائی ۵/۵۲ فی الزکوٰۃ : باب الحنطۃ۔ اس کے رجال تمام کے تمام ثقہ ہیں لیکن حسن نے ابن عباس سے اپنے سماع کی صراحت نہیں کی ہے۔

[3] ابو داؤد (۱۶۰۹) ابن ماجہ (۱۸۲۷) کلاھما فی الزکوٰۃ : باب صدقۃ الفطر، دار قطنی ص ۲۱۹۔ حاکم ۱/۴۰۹۔ ابو یزید خولانی کی حدیث ہے وہ روایت کرتے ہیں سیار بن عبد الرحمٰن سے، وہ عکرمہ سے اور عکرمہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر ایک صائم کو لغویات و فحاشی سے پاک کرنے کے لیے اور غرباء و مساکین کے کھانے کے لیے فرض کیا ہے۔ جس نے صلوٰۃ عید سے پہلے پہلے اسے ادا کر دیا تو وہ ایک مقبول اور عظیم الشان صدقہ ہے اور جس نے صلوٰۃ عید کے بعد ادا کیا تو وہ جملہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے اور اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے ابو یزید خولانی کا نام یزید بن مسلم ذکر کیا ہے جو ان کا وہم ہے۔

[4] بخاری ۳/۲۹۱ فی الزکوٰۃ : باب صدقۃ الفطر۔ مسلم (۹۸۶) فی الزکوٰۃ : باب الأمر باخراج زکوٰۃ الفطر قبل الصلاۃ۔ ترمذی (۶۷۷)۔ ابو داؤد (۱۶۱۰) نسائی ۵/۵۴ جمہور کے نزدیک قبل صلوٰۃ کا حکم استحباباً ہے۔ ابن حزم نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حکم وجوب کے لیے ہے اس سے تاخیر کرنا ناجائز و ناروا ہے۔

کوئی اجماع ہے جو ان دونوں حدیثوں کو رد کر دیتا ہو، ہمارے شیخ اسی مذہب کو قوی بتاتے رہے ہیں۔ اور اسی کی تائید فرماتے تھے، اس کی نظیر یہ ہے کہ قربانی کے جانور کی ترتیب امام کی صلوٰۃ کے مطابق ہے نہ کہ وقتِ صلوٰۃ کے، چنانچہ جو شخص امام کی صلوٰۃ سے پہلے ذبح کر دے اس کا ذبیحہ قربانی نہیں بلکہ گوشت قرار پاتا ہے، یہ ایک دوسرے مسئلہ کا صحیح پہلو بھی ہے۔ دونوں مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی اسوہ رہا ہے۔

صدقۂ فطر کی خصوصی تقسیم

سنت نبوی یہ تھی کہ صدقۂ فطر مسکینوں کے لیے مخصوص تھا۔ صدقہ و زکوٰۃ کی آٹھوں اقسام کے مطابق نہ اس کی تقسیم فرمائی، نہ اس کا مسلمانوں کو حکم دیا ہے، نہ کسی صحابی کا اور نہ ہی ان کے بعد کسی اور کا عمل ہی ایسا رہا۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایک قول کے مطابق صدقۂ فطر نکالنا صرف مسکینوں کی خاطر جائز ہے۔ آٹھوں اقسام کے مطابق تقسیم کرنے کے مقابلہ میں یہ قول زیادہ راجح ہے۔

نفلی صدقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں جو کچھ آتا اسے نفلی صدقہ کے طور پر خرچ کر دینے میں آپ اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ جو چیز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہوتی اسے نہ زیادہ سمجھتے نہ کم، آپ کے پاس کوئی شئی موجود ہوتی اور مانگنے والا آجاتا تو خواہ کم ہوتی یا زیادہ اسے کل کا کل عطا کر دیتے۔ آپ کی عطا و بخشش کا یہ عالم تھا کہ جیسے آپ کو فقر و فاقہ کا کوئی اندیشہ ہی نہ ہو۔ عطا و بخشش اور صدقہ و خیرات کرنا آپ کا محبوب ترین عمل تھا۔ کوئی چیز دے کر آپ کو جو مسرت حاصل ہوتی وہ لینے والے کی مسرت سے بھی زیادہ ہوتی۔ آپ سب سے زیادہ فیاض تھے، آپ کا دایاں ہاتھ تند ہوا کے مانند تھا۔ کوئی محتاج آجاتا تو اسے خود پر ترجیح دیتے، کبھی اپنا کھانا دیدیتے، کبھی اپنا لباس پہنا دیتے۔ صدقہ و بخشش کے انداز بھی مختلف تھے کبھی صدقہ دیتے کبھی ہدیہ کرتے کبھی سامان خرید کر بائع کو قیمت اور سامان دونوں عطا کر دیتے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ کے باب میں پیش آیا تھا[1] کبھی قرض لیتے اور اس سے زیادہ و افضل واپس فرما دیتے[2] گاہ کوئی چیز خرید کر اس کی قیمت سے زیادہ ادا فرماتے۔ ہدیہ قبول فرماتے تو اس سے زیادہ داد و دہش سے کام لے کر ہدیہ کرنے والے کو لوٹاتے۔ غرض مختلف طریقوں سے صدقہ اور احسان فرماتے۔ صدقہ اور احسان اپنی مملوکہ اشیاء سے بھی کرتے اور

---

[1] بخاری ۴/۳۹۵۔ مسلم ۳/۱۲۲۱، ۱۲۲۲۔ خاص حدیث کا نمبر (۱۱۰) جابر بن عبد اللہ کی حدیث ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میں آپ کی خدمت میں ایک اونٹ لے کر حاضر ہوا آپ نے اس کی قیمت دینے کے ساتھ ساتھ اونٹ کو بھی مجھے واپس کر دیا۔

[2] بخاری ۵/۴۲ فی الاستقراض: باب استقراض الابل، ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کیا اور آپ کو بہت سخت و سست کہا اس پر آپ کے صحابہ کرام نے اس کے ساتھ کچھ کرنا چاہا، آپ نے کہا اسے چھوڑ دو کیونکہ صاحب حق کو کہنے کا حق ہے اس کے لیے ایک اونٹ خرید کر اس کے حوالے کر دو صحابہ نے عرض کیا اللہ کے رسول! ہمیں تو اس کے اونٹ سے بہتر مل رہا ہے آپ نے کہا وہی خرید کر دیدو کیونکہ تم میں کا بہترین آدمی وہ ہے جو قضا دینے میں اچھا ہو۔

زبان حال اور زبان قال سے بھی، جو کچھ آپ کے پاس ہوتا اسے صدقہ کر دیتے، اور صدقہ کا حکم دیتے، اس پر لوگوں کو ابھارتے، زبان حال اور زبان قال سے اس کی دعوت دیتے۔ جب کوئی بخیل سامنے آتا تو اپنے حال سے عطا و بخشش کی اسے دعوت دیتے۔ آپ کی صحبت میں رہ کر جو بھی آپ کے اسوہ کا مشاہدہ کرتا وہ فیاضی کیے بغیر نہ رہتا، آپ کا اسوۂ حسنہ لوگوں کو احسان و صدقہ اور معروف کی جانب مائل کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا سینہ سب سے زیادہ کھلا ہوا اور قلب سب سے زیادہ نرم و نازک اور پاکیزہ تھا، سینوں کو کھولنے میں صدقہ اور نیکی کا اثر عجیب و غریب ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت اور اس کے جملہ خصائص و لوازمات کے لیے آپ کا سینہ خصوصیت کے ساتھ پہلے ہی کھول دیا تھا۔ شرح صدر آپ کا حسی اعتبار سے تھا، شیطان کا نصیبہ اس سے خارج ہو چکا تھا۔

شرح صدر کے اسباب

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درجۂ کمال کی حد تک حاصل تھے

شرح صدر کا سب سے بڑا سبب توحید ہے۔ چنانچہ توحید میں جس قدر کمال، قوت اور افزائی ہوگی اسی قدر بندے کا سینہ بھی کھلے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر: ۲۲)

جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

نیز

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ (الانعام: ۱۲۵)

اللہ تعالیٰ کو جسے ہدایت کا ارادہ ہوتا ہے تو اسلام کے لیے اس کے سینے کو کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ ہوتا ہے تو اس کے سینے کو تنگ اور بند کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

بنا بریں توحید اور ہدایت شرح صدر کا، اور شرک و ضلالت تنگی صدر کا سب سے بڑا محرک ہے۔

شرح صدر کا دوسرا سبب وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ بندہ کے دل میں ڈالتا ہے۔ یہ نور ایمانی ہے جو سینہ کو کھولتا اور کشادہ کرتا ہے نیز قلب میں فرحت پیدا کرتا ہے اور جب بندہ کے دل سے یہ نور غائب ہو جاتا ہے تو سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو انتہائی تنگ قید خانہ میں محسوس کرتا ہے۔ جامع ترمذی میں روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "دل میں جب نور داخل ہوتا ہے تو قلب کشادہ ہو کر پھیل جاتا ہے" لوگوں نے پوچھا اللہ کے رسول! اس کی علامت کیا ہے۔ فرمایا: "جنت الخلد کی جانب توجہ، دنیا سے گریز اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری"[1]

---

[1] ترمذی نے اسے نہیں روایت کیا ہے جیسا کہ مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ طبری ۸/ ۲۷، ابن مسعود کی حدیث ہے جیسا کہ امام سیوطی نے الدر المنثور ۳/ ۴۴ میں اسے نقل کیا ہے۔ اور ابن ابی شیبہ، ابن ابی الدنیا، ابو الشیخ، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پس جس حد تک بندہ کو یہ نور حاصل ہو گا اسی حد تک اس کا سینہ بھی کھلے گا۔ یہی حال حسی نور وظلمت کا بھی ہے، چنانچہ حسی نور سے سینہ کھلتا اور حسی ظلمت سے تنگ ہو جاتا ہے۔

شرح صدر کا تیسرا سبب علم ہے، علم سے سینہ کشادہ ہو کر دنیا سے بھی زیادہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل جہل انتہائی تنگی اور حبس پیدا کرتا ہے۔ بندہ کا علم جیسے جیسے وسیع ہوتا جاتا ہے اس کا سینہ بھی کھل کر وسیع ہوتا جاتا ہے، یہ حال تمام علم کا نہیں بلکہ اس علم کا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملتا ہے، یہی وہ علم نافع ہے جسے کوئی حاصل کرلے تو اس کا سینہ سب سے زیادہ کشادہ، اخلاق سب سے عمدہ، اور زندگی سب سے زیادہ خوشگوار اور پرمسرت ہوتی ہے۔

شرح صدر کا چوتھا سبب انابت الی اللہ، پورے دل سے اللہ کی محبت اور اس کی جانب توجہ، اور اس کی عبادت میں سرور وراحت کا شعور واحساس پیدا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ شرح صدر کے لیے مؤثر کوئی اور شئی نہیں۔ حتیٰ کہ اس حالت میں بندہ اکثر کہا کرتا ہے کہ اگر جنت میں بھی میرا یہ حال ہوا تو میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی بڑی ہی خوشگوار ہوگی۔ شرح صدر، یا پاکیزگیٔ نفس اور قلبی راحت پیدا کرنے میں محبت الٰہی جو مؤثر عامل ہے وہ عجیب وغریب ہے۔ اس کا مزہ کچھ اسی کو معلوم ہے جو اسے محسوس کرتا ہے۔ محبت جس قدر شدید ہوگی سینہ بھی اتنا ہی کشادہ ہوگا، تنگی کا احساس اسے اس وقت ہوگا جب محبت الٰہی سے یکسر غافلوں کو دیکھے گا، ان کا مشاہدہ اس کی آنکھوں کا تنکا اور ان کی صحبت اس کے حق میں سوہان روح ثابت ہوگی۔

تنگیٔ صدر کا سب سے بڑا سبب اعراض عن اللہ اور غیر اللہ سے قلب کا تعلق، اس کے سوا دوسروں کی محبت اور ذکر الٰہی سے غفلت ولاپرواہی ہے۔ اللہ کے ماسوی جس چیز سے بھی آدمی محبت کرتا ہے وہ اس کے عذاب میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اس کا قلب اس غیر کی محبت میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا بدبخت، اس سے بڑا بدحال، اس سے بڑا کبیدہ خاطر، اور اس سے زیادہ دل کا تھکا ہارا انسان اور کوئی نہ ہوگا۔ محبتیں دو ہوتی ہیں۔ ایک وہ جسے دنیا کی جنت کہیے، نفس کا سرور کہیے، دل کی لذت کہیے، روح کا انبساط، روح کی غذا، روح کی دوا، بلکہ روح کی زندگی اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیجیے۔ یہ نام ہے اللہ وحدہ کی تمام دل سے محبت، میلان وارادہ اور محبت کی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کی جانب کھنچ اٹھنے کا۔

دوسری محبت وہ ہے جسے روح کا عذاب، نفس کا الم، قلب کا زنداں اور سینہ کی تنگی کہیے۔ یہ سرچشمہ ہے تمام آلام ومصائب کا، یہ نام ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ماسوا دوسروں سے محبت کرنے کا۔

شرح صدر کا پانچواں سبب ہر حال میں اور ہر جگہ ذکر الٰہی سے زبان کو تر رکھنا ہے۔ راحتِ قلب اور شرح صدر کے اندر ذکر الٰہی کی بھی عجیب وغریب تاثیر ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس ذکر الٰہی سے غفلت بھی سینہ کے حبس وعذاب پر عجیب اثر رکھتی ہے۔

شرح صدر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خلق الٰہی کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا جائے، دولت واقتدار، اور جسم کی تمام ممکنہ طاقتوں سے انھیں نفع پہنچایا جائے، انواع واقسام کے احسانات میں دلچسپی رکھی جائے، کیونکہ محسن کا سینہ سب سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ابن مردویہ، حاکم اور بیہقی "الشعب" کی جانب اس روایت کی نسبت متعدد طرق سے کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے ۲/۱۷۴، ۱۷۵، عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم، ابن جریر سے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد ذکر کیا ہے کہ یہ اس حدیث کے مرسل اور متصل طرق ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

زیادہ کشادہ، اس کا نفس سب سے زیادہ پاکیزہ اور قلب سب سے زیادہ راحت میں ہوتا ہے اور بخیل جو احسان کی صفت سے عاری ہوتا ہے سب سے زیادہ تنگ دل، بدحال اور سب سے زیادہ غم و آلام کا شکار ہوتا ہے۔ صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان دونوں کی مثال دو ایسے آدمیوں کی ہے جن پر لوہے کی دو ڈھالیں ہوں چنانچہ صدقہ کرنے والا جب بھی صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی ڈھال کشادہ ہو کر پھیل جاتی ہے حتی کہ وہ اپنے کپڑے گھسیٹنے لگتا ہے اور اپنے آثار مٹانے لگتا ہے، مگر بخیل جب بھی صدقہ کا ارادہ کرتا ہے اس کی ڈھال کا ہر حلقہ اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے اور کشادہ نہیں ہوتا[ل] یہ ہے مثال صدقہ کرنے والے مومن کے شرح صدر اور بخیل کے تنگئ صدر کی۔

شرح صدر کا ایک سبب شجاعت ہے۔ مرد شجاع کا سینہ کھلا ہوا، باطن کشادہ اور قلب وسیع ہوتا ہے۔ مگر بزدل آدمی سینے کا سب سے زیادہ تنگ اور دل کا یتیم ہوتا ہے۔ نہ اسے فرحت ملتی ہے نہ سرور نہ لذت، نہ کوئی اور راحت، جو کچھ حاصل ہوتا ہے بس وہی جو کسی جانور کو حاصل ہوتا ہے، روحانی سرور و لذت اور نعمت و راحت سے بخیل ہی کی طرح بزدل اور ہر وہ شخص قطعا محروم ہوتا ہے جو ذکر الٰہی سے غافل، اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات سے بے بہرہ اور اس کے دین سے ناواقف ہو اور اس کا دل محبت غیر اللہ میں گرفتار ہو۔ دنیا میں بندہ کو جو سرور و نعمت حاصل ہوتی ہے قبر میں اس کے لیے وہی روح و ریحان ہو جاتی ہے، مگر ضیق نفس اور انقباض قلب عذاب و زندان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ قبر میں بندہ کا حال وہی ہوتا ہے جو سینہ میں اس کے دل کا ہوتا ہے۔ عارضی طور پر سینوں کی کشادگی اور تنگی کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ اسباب کے زوال سے یہ عوارض خود بخود زائل ہو جاتے ہیں، اصل اعتبار اس صفت کا ہے جو دل میں قائم ہو کر شرح و حبس کا موجب بنتی ہے۔ یہی صفت میزان کا حکم رکھتی ہے۔ واللہ المستعان۔

شرح صدر کا ایک عظیم سبب یہ ہے کہ دل کی کینگاہ کو ان مذموم اوصاف سے پاک و صاف رکھا جائے جو ضیق و زحمت کے موجب اور بندہ کی روحانی شفاء کی راہ میں حائل ہوتے ہوں کیونکہ انسان جب مذکورہ اسباب شرح کو اختیار کرنا چاہے اور دل کو مذموم اوصاف سے پاک نہ کرے تو شرح صدر کا کوئی ذرہ بھی اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زندگی بھر وہ انہی دونوں متضاد مادوں کی باہمی کشمکش کی آماجگاہ رہے گا اور ان میں جس صورت کا غلبہ ہو گا وہ اسی کا ہو کر رہے گا۔

شرح صدر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فضول غور و فکر، ضرورت سے زائد گفتگو، سماعت، صحبت، کھانا اور سونا ترک

[ل]۔ بخاری ۳/۲۴۱، ۲۴۲، مسلم (۱۰۲۱) حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بخیل اور انفاق کرنے والے کی مثال دو ایسے آدمیوں کی ہے جن پر لوہے کی دو ڈھالیں پستانوں سے لے کر ہنسلی کی ہڈیوں تک ہوں، انفاق کرنے والا جب بھی انفاق کرتا ہے اس کی ڈھال اس کی کھال پر پھیل یا بڑھ جاتی ہے، حتی کہ اس کے پوروں کو چھالیتی اور اس کے نشان مٹا دیتی ہے۔ مگر بخیل جب بھی انفاق کا ارادہ کرتا ہے اس کی ڈھال کا ہر حلقہ اپنی جگہ چپک جاتا ہے، وہ اسے کشادہ کرنا چاہتا ہے مگر کشادہ نہیں ہوتی۔" خطابی فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال بخیل اور صدقہ کرنے والے کی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ دونوں کو دو ایسے آدمیوں سے تشبیہ دی ہے جن میں ہر ایک نے اپنے دشمن کے ہتھیار سے محفوظ رہنے کے لیے زرہ پہننا چاہا چنانچہ اسے اپنے سر پر ڈال لیا ہو۔ زرہ سب سے پہلے سر پر ڈالی جاتی ہے، حتی کہ پستانوں تک پہنچ جاتی ہے، اور آدمی دونوں ہاتھ اس کی آستینوں میں داخل کر سکتا ہے، انفاق کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کشادہ زرہ پہنے ہو اور اس زرہ نے پھیل کر اسے پورے جسم کو ڈھانک لیا ہو اور بخیل کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی جس نے اپنے دونوں ہاتھ گردن تک باندھ رکھے ہوں، چنانچہ جب بھی وہ زرہ پہننے کا ارادہ کرے وہ سمٹ کر گردن تک رہ جاتے اور ہنسلی کی ہڈی سے آگے نہ بڑھے۔ مفہوم یہ ہے کہ فیاض جب صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ اور انفاق میں کشادہ دستی سے کام لیتا ہے، مگر بخیل کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا ہے تو اس کے ہاتھ سمٹ جاتے ہیں اور سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔

کر دیا جائے کیونکہ فالتو باتیں غم وآلام میں تبدیل ہو کر قلب کے لیے باعث عذاب و زحمت بن جاتی ہیں، بلکہ دنیا وآخرت کے اکثر عذاب انھیں کے باعث ہوا کرتے ہیں۔ سبحان اللہ وہ شخص کس قدر سینہ تنگ ہوگا اور کس قدر بدحال و نامراد شوق ہوگا جو مذکورہ آفتوں میں سے کسی آفت میں مبتلا ہو جائے اور سبحان اللہ! کس قدر زندگی آرام و راحت میں ہوگی اس شخص کی جو مذکورہ بالا اچھی خصلتوں سے کسی ایک کا پابند ہو جائے، اس کی فکرمندیوں کا محور بس وہی ہو۔ گردش کرے تو اسی کے اردگرد۔ یقیناً اس کا نصیبہ وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (انفطار: ۱۳) نیک لوگ ہمیشہ آسائش میں ہوں گے۔

جب کہ پہلے کا نصیبہ

إِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (انفطار: ۱۴) بدکار بیشک دوزخ میں ہوں گے۔

دونوں کے درمیان کچھ مراحل اور منزلیں ایسی ہیں جنھیں شمار صرف اللہ ہی کر سکتا ہے۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس صفت میں باکمال تھے جو شرح صدر، وسعتِ قلب، قرۃ عین اور حیات روحانی کا موجب ہے۔ بایں ہمہ آپ کو شرح حسی کا کمال حاصل تھا۔ مخلوقات میں سب سے زیادہ کامل آپ کا متبع ہوگا۔ شرح صدر، لذت، خوشی اور مسرت میں بھی سب سے کامل ہوگا۔ اتباع واطاعت ہی کے مطابق شرح صدر اور روحانی لذت بھی حاصل ہوگی۔ کیونکہ آپ کی ذات گرامی شرح صدر، رفع ذکر اور وضع وِزر کے نقطۂ عروج پر تھی۔ لہذا متبعین کو بھی حسبِ اتباع یہ مقام حاصل ہوگا۔ والله المستعان۔

اسی اطاعت واتباع کے مطابق اللہ کی جانب سے حفاظت، دفاع، نصرت و اعانت کا نصیبہ ملے گا۔ لہذا کچھ کو یہ نصیبہ زیادہ، کچھ کو کم ملے گا۔ اب جسے خیر ہی خیر حاصل ہو وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو محروم رہ جائے وہ صرف اپنی ذات کو ملامت کرے[1] کیونکہ اس کا باعث خود ہی اس کی اپنی ذات ہے۔

صوم کے باب میں آپ کا اسوۂ حسنہ

صوم کا مقصد یہ ہے کہ نفس کو خواہشات سے روکا جائے، مالوف اشیاء سے اسے جدا رکھا جائے، اور اس کی شہوانی قوت کے اندر اعتدال اور توازن پیدا کیا جائے تاکہ ان باتوں کی طلب واستعداد پیدا ہو جن کے اندر انسان کی حد درجہ سعادت وخوش بختی کا راز پنہاں ہے۔ نیز یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر ان امور کو قبول کر لینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے

---

[1] ایک طویل حدیث قدسی کا اقتباس ہے جسے امام مسلم نے (۲۵۷۷) میں ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے جس میں ہے کہ "اے میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں جسے میں تمھارے لیے شمار کرتا ہوں پھر میں تمھیں اس کا پورا پورا حق دوں گا، پس جو بہتری پائے تو اسے اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور جو ایسا نہ پائے تو اسے چاہئے کہ اپنے ہی نفس کو ملامت کرے"۔ اس حدیث سے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ امام نووی نے اپنی کتاب اذکار کے آخر میں اس حدیث کو ابو ذر کی سند سے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ صحیح حدیث ہے، ہم نے صحیح مسلم وغیرہ میں اسے روایت کیا ہے اس کے رجال کا سلسلہ مجھ سے ہو کر ابو ذر سے جا ملتا ہے۔ تمام کے تمام دمشقی ہیں اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ اہل شام کے لیے اس حدیث سے زیادہ مہتم بالشان کوئی حدیث نہیں ہے۔ ابو ادریس خولانی جو اس حدیث کو ابو ذر سے روایت کرتے ہیں جب بھی اسے بیان کرتے تو اپنے زانو کے بل بیٹھ جایا کرتے تھے۔

جو اسے پاک وصاف کر دینے کے ذمہ دار ہیں اور جن پر نفس کی حیات سرمدی کا دار و مدار ہے۔ بھوک اور پیاس دراصل نفس کی حدت کو توڑ کر یاد دلاتی ہے کہ ان فاقہ مستوں کا کیا حال ہے جو ہمیشہ بھوک پیاس کی جلتی ریت پر تپتے رہتے ہیں۔ ماکولات ومشروبات کی گذر گاہوں کے تنگ ہو جانے سے بندہ کی شیطانی گذر گاہیں بھی تنگ ہو جاتی ہیں، فطری طور پر اعضا کی طاقتیں معاش و معاد کے مضرت رساں مرغزاروں میں داخل ہونے سے گریز کرتی ہیں۔ انسان کے ہر عضو اور ہر طاقت کے اندر سرکشی کا جو مادہ موجود ہے بھوک پیاس اسے ساکت کر دیتی ہے۔ اور اسے ایک لگام لگا دیتی ہے۔ گویا یہ متقیوں کی لگام مجاہدوں کی ڈھال اور نیکو کار و مقرب بندوں کی ریاضت ہے، تمام اعمال میں صوم ہی اللہ رب العالمین کا ہے، کیونکہ صائم کچھ نہیں کرتا بس صرف اپنے معبود کی خاطر کھانا پینا اور شہوت رانی ترک کر دیتا ہے، گویا اللہ کی محبت و خوشنودی میں نفس کے تمام محبوبات و مرغوبات کو ترک کر دینے کا نام صوم ہے، یہ بندے اور پروردگار کے مابین ایک راز ہوتا ہے۔ جس سے واقف صرف اللہ ہی ہوتا ہے۔ انسان صرف ظاہری طور پر بندہ کو کھانے پینے کی اشیاء ترک کرتا ہوا دیکھ سکتا ہے مگر حقیقتاً اس کا کھانا، پینا اور شہوت ترک کر دینا اپنے معبود کے لیے ہے، اس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے کسی انسان کو نہیں۔ اور یہی صوم کی خصوصیت ہے۔

صوم کے فوائد

ظاہری اعضاء وجوارح اور باطنی قوتوں کی حفاظت میں نیز ان اعضاء وقویٰ کو ایسے اختلاط سے مامون رکھنے میں صوم کو کمال حاصل ہے جو فاسد مواد کے موجب ہوتے ہیں یہ فاسد مادے اگر مسلط ہو گئے تو اعضاء وقویٰ کے اندر فساد پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں مانع صحت، ردی مواد اگر بدن انسانی کے اندر پہلے سے موجود ہوں تو صوم سے ان کا استفراغ ہو جاتا ہے۔ پس یہ قلب وجوارح کی صحتوں کا ضامن ہے، شہوات وخواہشات کے ہاتھوں جو طاقتیں زائل ہو چکی ہوتی ہیں صوم ان کا اعادہ کرتا ہے، لہٰذا صوم تقویٰ پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرۃ: ۱۸۵)

اے ایمان والو! تم پر صوم فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ[۱]

صوم ڈھال ہے۔

جسے جماع کی سخت خواہش ہوئی مگر نکاح کی قدرت نہ تھی اسے آپ نے صوم کا حکم دیا اور اس طرح صوم کو آپ نے

---

[۱] بخاری ۴/۸۷، ۹۴ فی الصوم: باب فضل الصوم، مسلم (۱۱۵۱) (۱۶۳) حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے انھوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ابن آدم کے تمام اعمال ان کے لیے ہیں سوائے صوم کے، کیونکہ صوم میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔ اور صوم ڈھال ہے جب تم میں سے کوئی صوم سے ہو تو اسے چاہیے کہ اس دن فضول اور گندی باتوں سے بچے اور شور و غوغا نہ کرے اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا حجت وتکرار کرے تو صائم کو کہنا چاہیے میں صوم سے ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے یقیناً ایک صائم کے منہ کی بو قیامت کے دن اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے کہیں زیادہ عمدہ ہوگی۔ ایک صائم کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک تو افطار کے وقت اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے۔ دوم جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا تو اپنے صوم سے خوش ہوگا۔ موطا مالک ۱/۳۱۰، ابوداؤد (۲۳۶۳)، نسائی ۴/۱۶۳۔

اس خواہش کا سپر قرار دیا[1]

الغرض صوم کی مصلحتیں چونکہ عقل اور فطرت دونوں کی بارگاہ میں بالکل مسلم ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے بربنائے رحمت و رافت اور بربنائے حفاظت و دفاع اسے بندوں کے لیے مشروع فرمایا۔ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اکمل ترین اسوہ نیز تحصیل مقصود کا سب سے اعلیٰ اور نفس انسانی کے لیے سب سے آسان وسیلہ ہے۔

چونکہ نفوس انسانیہ کی گہرائیوں پر مرغوبات و خواہشات کا اس حد تک تسلط ہوتا ہے کہ ان سے انھیں الگ کر دینا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں بلکہ انتہائی دشوار ہے۔

لہٰذا سینوں کے اندر توحید کے تمغے جب اچھی طرح روشن ہو گئے صلوٰۃ کی حقیقتوں پر طبیعتیں جم گئیں، اور اوامر قرآنی پر پورا پورا اعتماد حاصل ہو گیا تب ہی صوم فرض کیا گیا، چنانچہ اس کی فرضیت ابتدائے اسلام میں نہیں ہجرت کے بعد وسط اسلام میں ہوئی۔ اس طرح تدریجی مراحل سے گذر کر طبیعتوں کو صوم کا پابند بنایا جا سکا۔

۲ھ ہجری میں صوم فرض ہوا۔ رمضان کے نو ماہ صوم رکھنے کے بعد آپ کی وفات ہوئی، اول اول صوم کی فرضیت اختیاری طور پر ہوئی۔ چنانچہ آزادی دی گئی کہ چاہے تو صوم سے رہے یا ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ پھر یہ تخییر وجوب صوم کی طرف منتقل ہو گئی اور کھانا کھلانا بوڑھے مرد اور عورتوں کے لیے خاص ہو گیا کہ جب انھیں صوم رکھنے کی طاقت نہ ہو تو ان کے لیے حکم ہے کہ وہ صوم توڑ دیں اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائیں[2] مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ صوم سے نہ رہیں اور قضا کریں۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو بھی یہی حکم ہوا بشرطیکہ انھیں اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو۔ اگر اپنی اولاد کا خوف لاحق ہو تو قضا کے ساتھ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا بھی ضروری ہے[3]۔ کیونکہ ان

---

[1] بخاری ۴/۱۰۱ و ۹/۹۲ و ۹۵۔ مسلم (۱۴۰۰) ابو داؤد (۲۰۴۶) ترمذی (۱۰۸۱) نسائی ۴/۱۶۹، ۶/۵۶، ۵۷۔ عبداللہ بن مسعود کی حدیث ہے فرمایا کہ اللہ کے نبی کا ارشاد ہے "اے جوانوں کی جماعت! سن لو تم میں کا جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ شادی کرلے کیونکہ وہ نظروں کو نیچی کرنے والی ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی ہے اور جو نکاح کی طاقت نہ رکھے تو وہ صوم کو لازم پکڑ لے کیونکہ وہ قاطع شہوت ہے۔

[2] بخاری ۸/۱۳۵۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد (وعلى الذين يطوّقونه فدية طعام مسكين) منسوخ نہیں ہے، بلکہ مراد وہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہے جو صوم نہیں رکھ سکتے، یہ ہر صوم کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں گے۔ "يطوّقونه" یہ ابن مسعود کی قرأت ہے۔ عام قرأت "يطيقونه" ہے۔ نسائی کے یہاں "يطوقونه" یعنی تکلف اختیار کرنے کے ہیں، حافظ فرماتے ہیں یہ نہایت عمدہ تفسیر ہے، یعنی جو لوگ صوم رکھنے کی بہ تکلف طاقت رکھتے ہیں۔ ابو داؤد (۲۳۱۸) اور طبری ۳/۴۲۷ میں حضرت ابن عباس سے روایت (وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين) کے بارے میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ بوڑھے مرد اور عورت کے لیے رخصت تھی کہ صوم کی طاقت رکھتے ہوئے بھی صوم سے نہ رہیں اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کا بھی یہی حکم تھا بشرطیکہ انھیں خوف لاحق ہو۔ ابو داؤد فرماتے ہیں "یعنی اپنی اولاد کے لیے خوف ہو۔ وہ صوم توڑ دیں گی۔ سند قوی ہے۔ جمہور کا یہ خیال ہے کہ آیت "وعلى الذين يطيقونه" منسوخ ہے، چنانچہ شروع میں صوم کی طاقت رکھنے والے کو آزادی تھی رکھے یا نہ رکھے اور فدیہ دیدے مگر اللہ تعالیٰ کے اس قول "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ اس کی روایت حضرت ابن عمر اور سلمہ بن اکوع سے کی جاتی ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری ۴/۱۶۴، و ۸/۱۳۶ و مسلم (۱۱۴۵)۔

[3] مسند احمد ۴/۳۴۷ و ۵/۲۹۔ ترمذی (۷۱۵)۔ ابو داؤد (۲۴۰۸)۔ نسائی ۴/۱۸۰، ۱۸۱۔ ابن ماجہ (۱۶۶۷)۔ طحاوی ۱/۲۴۶۔ طبری (۲۷۹۲) انس بن مالک کعبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسافر سے آدھی صلوٰۃ اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے صوم اتار دیئے ہیں"۔ سند قوی ہے، ترمذی فرماتے ہیں حدیث حسن ہے اور اس حدیث کے علاوہ انس بن مالک کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی اور حدیث کا علم ہمیں نہیں ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کا صوم نہ رکھنا کسی مرض کے اندیشہ سے نہیں بلکہ بحالت صحت تھا اس لیے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا کر کسر پوری کردی گئی۔ ایسے ہی جیسے ابتدائے اسلام میں تندرست آدمی صوم نہ رکھتا تو اسے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلانا لازم تھا۔

صوم کی فرضیت

صوم تین مرحلوں میں فرض ہوا۔ پہلا مرحلہ اختیاری تھا۔

دوسرے مرحلہ میں اسے قطعی فریضہ کی حیثیت دی گئی، مگر اس میں صائم کھانے سے پہلے سوجاتا تو دوسری رات تک کھانا پینا اس پر حرام ہوتا۔

تیسرے[1] مرحلہ میں اس صورت حال کو منسوخ کر دیا گیا اور اب اس کی وہی صورت ہے جو قیامت تک کے لیے مشروع ہے۔

ماہ رمضان میں آپ کی بہ کثرت عبادتیں

سنت یہ تھی کہ رمضان کے مہینہ میں مختلف عبادتیں بکثرت انجام دیتے تھے۔ چنانچہ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی رمضان میں آپ کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ فرماتے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آپ سے ملاقات ہوتی تو آپ ہوائے تند سے بھی زیادہ فیاض ہوجاتے، یوں تو آپ انتہائی فیاض تھے ہی، مگر رمضان میں جود وسخا کی کیفیت کہیں زیادہ افزوں ہوجاتی۔[2] رمضان میں کثرت سے صدقہ وانفاق فرماتے۔ تلاوت قرآن، صلوٰۃ، ذکر ودعا اور اعتکاف کا اہتمام فرماتے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اہل علم کے یہاں عمل بھی اسی کے مطابق ہے کہ اگر حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کو اپنی اولاد کا اندیشہ ہو تو وہ صوم نہ رکھیں اور بعد میں قضا کریں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ کھانا کھلائیں گی یا نہیں۔ ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ قضا کے ساتھ کھانا بھی کھلائیں گی۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ مجاہد، شافعی اور احمد کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف قضا کریں گی، مریض کی طرح ان پر کھانا کھلانے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کے قائل حسن، عطاء، نخعی اور زہری ہیں۔ اوزاعی، ثوری اور اصحاب رائے کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں حاملہ قضا کرے گی، کھانا نہیں دے گی، کیونکہ صوم رکھنے کا ضرر مریض کی طرح خود اسی کو پہنچتا ہے۔ باقی دودھ پلانے والی قضا بھی کریگی اور کھانا بھی دے گی۔

[1] بخاری ۴/۱۱۱ فی الصوم۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آدمی صوم سے ہوتا اور افطار کے وقت افطار سے پہلے سوجاتا تو اس شب میں اور اگلے دن کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا حتی کہ شام ہوجاتی۔ قیس بن صرمہ انصاری صوم سے تھے، افطار کے وقت بیوی سے آکر پوچھا "کھانے کو کچھ ہے؟" بولیں نہیں، مگر میں جاکر آپ کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ وہ اس پورے دن کام کرتے رہے۔ چنانچہ نیند کا غلبہ ہوگیا۔ بیوی آئی اور دیکھ کر کہا "ناکامی" جب سورج نصف النہار پر پہنچا تو ان پر غشی طاری ہوگئی۔ اس کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو حسب ذیل آیت نازل ہوئی: "احل لکم لیلة الصیام الرفث الی نسائکم" چنانچہ بے حد خوشی منائی گئی۔ پھر یہ آیت بھی نازل ہوئی "کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" قیس بن صرمہ کے نام میں اختلاف ہے۔ الفتح میں اس کی تحقیق دیکھیے۔

[2] بخاری ۴/۹۹۔ مسلم (۲۳۰۷) حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

رمضان میں جو عبادتیں مخصوص تھیں وہ دوسرے مہینوں میں نہ ہوتیں۔ حتیٰ کہ آپ صوم وصال رکھتے تاکہ شب و روز کی گھڑیاں زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے میسر ہو سکیں، صحابہ کو وصال سے منع فرماتے وہ کہتے رسول اللہ! آپ تو وصال فرماتے ہیں؛ فرماتے "میرا حال ویسا نہیں ہے جیسا تمھارا ہے، میں تو شب بسر کرتا ہوں، یا ایک روایت کے مطابق میں تو دن گذارتا ہوں اپنے رب کے پاس، وہ مجھے کھلاتا ہے پلاتا ہے[1]"

کھانے پینے کی مذکورہ بالا کیفیت کے باب میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حسی طور پر منہ سے کھانا پینا ہے، الفاظ کی حقیقت یہی ہے اس سے ہٹنے کے کوئی معنی نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد معرفت الٰہی، لذت مناجات، سرخوشی، محبت اور شوق الٰہی کی باتیں ہیں جو دلوں کے لیے بمنزلہ غذا، ارواح کے لیے راحت و نعمت، اور آنکھوں کے لیے ٹھنڈک کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہاں نفس و روح اور قلب کو ایک ایسا سرور حاصل ہوتا ہے جس کی غذائیت اور انفعیت کا کیا پوچھنا۔ یہ غذائیت اپنے مواد میں ایسی فراواں ہوتی ہے کہ جسمانی غذا سے بھی ایک مدت تک انسان کو بے نیاز کر دیتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

لَهَا أَحَادِيثُ مِنْ ذِكْرَاكَ تَشْغَلُهَا ‏ ‏ ‏ عَنِ الشَّرَابِ وَتُلْهِيهَا عَنِ الزَّادِ

یہ تمھاری یاد کے کچھ نقوش ہیں جو اسے (اونٹنی کو) کھانے پینے سے غافل کیے دیتی ہیں

لَهَا بِوَجْهِكَ نُورٌ تَسْتَضِيءُ بِهِ ‏ ‏ ‏ وَمِنْ حَدِيثِكَ فِي أَعْقَابِهَا حَادِي

تیرے رخ انور سے اسے روشنی مل رہی ہے اور تیری بات ہی ہے جو اس کے پیچھے حدی بن گیا ہے

إِذَا شَكَتْ مِنْ كَلَالِ السَّيْرِ أَوْعَدَهَا ‏ ‏ ‏ رُوحُ الْقُدُومِ فَتَحْيَا عِنْدَ مِيعَادِ

جب چلتے چلتے تھک جاتی ہے تو قدوم کی روح اس کے یہاں آنے کا وعدہ کرتی ہے تو اس کے ساتھ اس میں زندگی کا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جسے بھی معمولی تجربہ اور لذتِ شوق حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ قلب و روح کی غذا پا کر بکثرت حیوانی غذاؤں سے انسان کا جسم بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بالخصوص فرحت و انبساط سے بھرپور وہ انسان جو اپنا مطلوب پا چکا ہو، جس کی آنکھیں اپنا محبوب دیکھ کر ٹھنڈی ہو چکی ہوں، جس نے قرب کی لذت اور رضا کی راحت محسوس کر لی ہو اور محبوب کے الطاف و عنایات جسے ہمہ آن پہنچ رہے ہوں، اور جسے محبوب ہمہ وقت اپنی آغوش رحمت میں لیے پوری محبت سے مائل بہ کرم ہو، کیا ایک عاشق کے لیے اس سے بھی بڑھ کر کوئی غذا ہو سکتی ہے؟ پھر اس محبوب کا کیا حال ہو گا جس کے عاشق کا دل اس کی محبت سے ہمہ آن سرشار و سرمست ہو۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور منزل ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت محبوب جتنے احسانات کرے کم ہے۔ پھر کیا خیال ہے ایسا عاشق اپنے محبوب کے یہاں شب و روز غذا نہ پائے گا؟ آپ کے ارشاد "اپنے پروردگار کے یہاں مجھے خورد و نوش کا سامان ملتا رہتا ہے" کا مفہوم یہی ہے۔ یہاں براہ دہن کھانے پینے کی بات ہوتی تو صوم وصال تو کجا خود صوم بھی نہ رکھ پاتے۔ نیز یہ کیفیت اگر شب کو حاصل ہوتی تو آپ کا صوم صوم وصال بھی نہ ہوتا، اور صحابہ نے جب آپ سے دریافت کیا ہوتا کہ کیا آپ صوم وصال رکھتے ہیں؟ تو اس پر آپ کا جواب نفی میں ہوتا۔ آپ یہ نہ فرماتے کہ "میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے" اس کے برعکس آپ نے اپنے اور ان کے درمیان وصال کی نسبت باقی

---

[1] موطا مالک ۱/۳۰۱ فی الصیام: باب النهی عن الوصال فی الصیام، بخاری ۴/۱۷۹ فی الصوم: باب التنكيل لمن أكثر الوصال۔ مسلم (۱۱۰۳) (۵۸) فی الصیام: باب النهی عن الوصال فی الصوم۔ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

رکھی، اور فرق ظاہر کرتے ہوتے باہمی ربط ختم کر دیا۔ جیساکہ صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمر وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں صومِ وصال رکھتے تھے، لوگوں نے بھی رکھنا شروع کیا تو آپ نے منع فرما دیا۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ بھی تو صومِ وصال رکھتے ہیں، فرمایا "میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے، مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے[1]"۔

بخاری میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال سے منع کیا تو لوگوں نے کہا "آپ بھی وصال فرماتے ہیں" فرمایا "میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے۔ مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے[2]"۔ اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت یوں ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال سے منع فرمایا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا "رسول اللہ! آپ بھی تو وصال فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں کون مجھ جیسا ہے۔ رات میں پروردگار مجھے کھلاتا پلاتا ہے[3]"۔

یہ روایت بھی ہے کہ صومِ وصال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روکا، مگر نہ مانے۔ چنانچہ آپ نے ان کے ساتھ مسلسل دو روز وصال کیا، اس کے بعد ہلال نظر آگیا۔ آپ نے فرمایا "ہلال مؤخر ہو گیا ہوتا تو وصال بھی باقی رہتا"۔ یہ بطور سزا کے آپ نے فرمایا تھا۔ کیونکہ صومِ وصال کے باب میں انھوں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی[4]۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ "اگر مہینہ اور دراز ہو جاتا تو ہم ایسا وصال کرتے کہ ان لوگوں کا اصرار باقی نہ رہتا۔ میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے[5]"۔ آپ نے بتایا کہ گو وصال سے رہتا ہوں مگر مجھے خورد و نوش ملتا رہتا ہے، آپ نے سزا کے طور پر ان کا یہ طرزِ عمل یعنی وصال اختیار کر کے ثابت کر دیا کہ اگر آپ کھاتے پیتے ہوتے تو یہ سزا نہ دیتے، بلکہ وصال بھی آپ کا باقی نہ رہتا اور بحمداللہ یہ بات بالکل واضح ہے۔

بربنائے رحمت و شفقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو صومِ وصال سے منع فرمایا ہے، اور سحر تک اس کی اجازت دی ہے، صحیح بخاری کے اندر حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے "صومِ وصال نہ رکھو، اگر کسی کو رکھنا ہی ہے تو سحر تک رکھے[6]"۔

اس موقع پر اگر سوال ہو کہ پھر اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے کہ وصال جائز ہے یا حرام ہے یا مکروہ؟ تو واضح رہے کہ مسئلہ کے اندر تین اقوال ہیں۔

ایک یہ کہ اگر قدرت ہو تو جائز ہے۔ یہ عبداللہ بن زبیر وغیرہ بزرگانِ سلف سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر صومِ وصال رکھتے تھے۔ اس مسلک کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود منع کرنے کے صحابہ کے ساتھ صومِ وصال رکھا۔ جیساکہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے وصال سے منع فرمایا اور فرمایا کہ "میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے" مگر لوگ نہ مانے تو آپ ان کے ساتھ دو دن وصال سے رہے[7]"۔ وصال سے منع کرنے

---

[1] مسلم (۱۱۰۲)۔
[2] بخاری ۴/۱۷۷ فی الصوم: باب الوصال۔
[3] اس کی تخریج قریب ہی گذر چکی ہے۔
[4] بخاری ۴/۱۷۹۔ مسلم (۱۱۰۳)۔
[5] مسلم (۱۱۰۴) (۶۰) فی الصیام: باب النھی عن الوصال۔ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔
[6] بخاری ۴/۱۸۱ فی الصیام: باب الوصال الی السحر۔ اس حدیث سے احمد، اسحاق، ابن منذر، ابن خزیمہ اور مالکیہ کی ایک جماعت نے سحر تک وصال کے جواز پر استدلال کیا ہے۔
[7] بخاری ۴/۱۷۹۔ مسلم (۱۱۰۳)۔

کے باوجود آپ نے ان کے ساتھ مسلسل صوم رکھا، اگر یہ ممانعت حرام کے پیش نظر ہوتی تو صحابہ یقیناً رک جاتے، آپ انھیں اس حالت پر باقی نہ رہنے دیتے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ کی ممانعت کے باوجود صحابہ نے وصال رکھا، آپ کے علم میں یہ بات تھی، آپ نے انھیں اس حالت پر باقی بھی رکھا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ آپ کا مقصود رحمت وشفقت اور تسہیل پیدا کرنا تھا، حضرت عائشہ کا بھی قول ہے کہ آپ نے بربنائے رحمت صوم وصال سے منع فرمایا ہے[1]۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ایک گروہ جس میں امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی اور ثوری ہیں کے نزدیک وصال جائز نہیں ہے۔ ابن عبدالبر نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے کسی کو اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ امام شافعی سے منصوص اس کی کراہیت ہے، آگے ان کے اصحاب میں اختلاف ہے کہ یہ کراہیت تحریمی ہے یا تنزیہی۔ حرام کرنے والوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت سے استدلال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ نہی کا اقتضا تحریم ہے۔ ان کے مطابق حضرت عائشہ کا قول "رحمۃً لہم" (بربنائے رحمت) حرمت کی راہ میں حائل نہیں بلکہ مؤکد ہے۔ کیونکہ آپ کی یہ شفقت ہی تو تھی کہ آپ نے ان پر حرام کر دیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امت کو جن جن باتوں سے آپ نے منع فرمایا ہے بربنائے شفقت ورحمت منع فرمایا ہے۔ باقی منع کرنے کے باوجود صحابہ کے ساتھ آپ کے صوم وصال رکھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے انھیں اس فعل پر باقی رکھا ہے، آخر ایسا کیسے، روکیں بھی اور باقی بھی رکھیں، آپ نے یہ طرز عمل محض بربنائے سزا اختیار فرمایا تھا۔ ممانعت کے باوجود ان کا وصال جو آپ نے گوارا فرمایا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ زجر وتوبیخ کی مصلحت سامنے آجائے نیز یہ حقیقت کھل جائے کہ ممانعت کی حکمت اس مفسدہ پر پابندی باندھنا تھا جس کے پیش نظر آپ نے وصال سے روکا تھا۔ چنانچہ وصال کا مفسدہ کھل کر سامنے آگیا اور ممانعت کی حکمت بھی عیاں ہو گئی، تو ممانعت اور زیادہ مؤثر ہو گئی۔ انھوں نے قطعاً اسے ترک کر دیا۔ آگے ہوا بھی یہی کہ وصال کے جو مفاسد تھے انھیں صحابہ نے اچھی طرح محسوس کر لیا، چنانچہ وصال کے بعد ایسا ہوا کہ عبادت کے دیگر امور سے انھیں بیزاری لاحق ہونے لگی، دین کے دوسرے کاموں میں جو قوت، یکسوئی، خشوع اور خضوع درکار تھا اس میں کمی واقع ہونے لگی، ظاہری اور باطنی احکام وحقوق کی ادائیگی میں جو توانائی مطلوب تھی وہ کمزور پڑنے لگی۔ سخت بھوک وپیاس کا عالم بندہ اور دین کے درمیان حائل ہو گیا، اس وقت ان کی نگاہوں کے سامنے ممانعت وصال کی حکمت اور وہ مفسدہ بھی ظاہر ہو گیا جو وصال کے اندر ان کے لیے تو تھا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہ تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا مصلحت کے تحت صحابہ کو صوم وصال پر آپ کا باقی رکھنا مصلحت تالیف کے پیش نظر اور اس لیے بھی کہ اسلام سے متنفر نہ ہو جائیں۔ اعرابی کو مسجد میں پیشاب کرنے کی حالت پر[2] چھوڑے رکھنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز ان کی اس واقعہ سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جس میں آپ نے غلط صلوٰۃ پڑھنے والے

---

[1] بخاری ۴/۱۷۷ فی الصوم : باب الوصال، ومن قال : لیس فی اللیل صیام۔ مسلم (۱۱۰۵) فی الصیام : باب النہی عن الوصال۔

[2] بخاری ۱/۲۷۸ فی الطہارۃ : باب ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم والناس الاعرابی حتی فرغ من بولہ فی المسجد، ۱۰/۳۷۵ فی الادب : باب الرفق فی الامر کلہ۔ مسلم (۲۸۴) فی الطہارۃ : باب وجوب غسل البول وغیرہ من النجاسات۔ حضرت انس بن مالک کی روایت ہے، فرماتے ہیں ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو کچھ لوگ اسے روکنے کے لیے آگے بڑھے آپ نے فرمایا "چھوڑ دو اسے اس کا پیشاب نہ روکو، جب وہ فارغ ہو گیا تو ایک بالٹی پانی آپ نے منگوایا اور پیشاب کی جگہ انڈیل دیا۔ مسلم نے ایک روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر کہا، یہ مسجدیں اس طرح کے پیشاب اور گندگی کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ ذکر الٰہی، صلوٰۃ اور تلاوت قرآن کے لیے ہیں، ایک روایت میں یہ ہے کہ "اسے چھوڑ دو۔ اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی گرا دو۔ تمھیں آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے نہ کہ تنگی پیدا کرنے کے لیے"۔

کو صلوٰۃ پڑھنے دیا اور بعد میں فرمایا کہ صلوٰۃ نہیں ہوئی، اس طرح کی صلوٰۃ پڑھنے والا مصلی نہیں ہے۔ صلوٰۃ گو اس کی باطل تھی پھر بھی آپ نے محض تعلیمی مصلحت کے پیش نظر صلوٰۃ پر باقی رکھا۔ کیونکہ تعلیم و تعلم کے باب میں یہی انداز زیادہ مؤثر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: "تمھیں جب کوئی حکم دوں تو حتی الامکان اس کی تعمیل کرو۔ اور کسی بات سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو"۔[1]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث کے اندر اس بات کی دلیل موجود ہے کہ وصال آپ کی خصوصیات میں داخل ہے، چنانچہ فرمایا "میرا حال تمھارے جیسا نہیں ہے" اگر وصال اوروں کے لیے جائز ہوتا تو اس کا شمار آپ کی خصوصیات میں نہ ہوتا۔ یہ لوگ صحیحین کی وہ روایت بھی پیش کرتے ہیں جس میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ "جب شب یہاں سے آگے بڑھے اور دن پیچھے ہٹے اور آفتاب غروب ہو جائے تو صائم صوم سے نہیں رہتا"[2] اور صحیحین میں اسی طرح کی روایت حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے بھی وارد ہے۔ بنا بریں وہ کہتے ہیں کہ وقت افطار کے داخلہ پر آپ نے صائم کو گو وہ افطار نہ کرے پھر بھی بے صوم قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت وصال کو شرعی اعتبار سے محال قرار دیتی ہے۔ آگے یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی پیش کرتے ہیں کہ "میری امت برابر فطرت پر یا میری امت ہمیشہ بھلائی پر رہیگی جب تک وہ افطار میں جلدی کرے گی"[3] اور سنن میں حضرت ابو ہریرہ سے آپ کا ارشاد منقول ہے کہ "جب تک لوگ افطار میں عجلت کریں گے، دین غالب رہے گا، یہود و نصاریٰ اسے مؤخر کر دیتے ہیں"[4]، اور سنن ہی میں آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ عز وجل نے فرمایا: "میرے محبوب ترین بندے وہ ہیں جو افطار میں عجلت کرتے ہیں"[5]۔ ان احادیث کا اقتضاء تو یہ ہے کہ افطار میں تاخیر مکروہ ہو، پھر ترک افطار کی حالت کیا ہوگی؟" جب تاخیر تک مکروہ ہے تو ترک کر دینا عبادت کیونکر قرار پاسکتا ہے، کیونکہ عبادت کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ مستحب ہو۔

تیسرا قول جو سب سے متوازن ہے یہ ہے کہ صوم وصال سحر سے لے کر سحر تک جائز ہے۔ امام احمد اور اسحاق سے یہی ثابت ہے۔ اس کی بنیاد حضرت ابو سعید خدری کی وہ روایت ہے جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ "صوم وصال نہ رکھو، اگر رکھنا ضروری ہی ہو تو سحر تک رکھو" امام بخاری نے اس کی روایت کی ہے[6]۔ یہ سب سے معتدل وصال ہے۔ اس میں صائم کے لیے بے انتہا سہولت ہے اور یہ حقیقت میں بمنزلہ عشائیہ کے ہے۔

---

[1] بخاری ۱۳/۲۲۰ فی الاعتصام : باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مسلم (۱۳۳۷) فی الحج : باب فرض الحج مرۃ فی العمر، وفی الفضائل : باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم وترک اکثار سؤالہ عما لا ضرورۃ الیہ۔ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[2] بخاری ۴/۱۷۱ فی الصوم : باب متی یحل فطر الصائم۔ مسلم (۱۱۰۰) فی الصوم : باب بیان وقت انقضاء الصوم وخروج النہار۔ حدیث عبداللہ ابن ابی اوفی اس کی تخریج بخاری نے ۴/۱۷۲، اور مسلم نے (۱۱۰۱) میں کی ہے۔

[3] بخاری ۴/۱۷۳۔ مسلم (۱۰۹۸) روایت سہل بن سعد، حدیث یہ ہے "لوگ جب تک افطار میں عجلت کریں گے تب تک بخیر رہیں گے"۔ ابن خزیمہ (۲۰۶۱) اور ابن حبان (۸۹۱) میں یہ روایت اس طرح ہے "میری امت ہمیشہ میری سنت پر باقی رہے گی جب تک وہ افطار کے لیے تاروں کا انتظار نہ کرے گی۔ سند صحیح ہے۔

[4] ابو داؤد (۲۳۵۳) فی الصیام : باب ما یستحب من تعجیل الفطر، مسند احمد ۲/۴۵۰۔ ابن ماجہ (۱۶۹۸) اس کی سند حسن ہے، صحیح ابن خزیمہ (۲۰۶۰) ابن حبان (۸۸۹)۔

[5] ترمذی (۷۰۰)۔ احمد ۲/۳۲۹۔ ابن خزیمہ (۲۰۶۲)۔ ابن حبان (۸۸۶)۔ ابو ہریرہ کی حدیث ہے اس کی سند میں قرۃ بن عبدالرحمن بن حیوئیل ہیں جو اپنے حافظے کے اعتبار سے ضعیف ہیں۔

[6] ۴/۱۸۱۔

فرق صرف یہ ہے کہ ذرا مؤخر ہو گیا ہے۔ اس طرح صائم شب و روز میں صرف ایک بار کھاتا ہے۔ وقتِ سحر کھانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنا کھانا آخر شب تک کے لیے مؤخر کر دیا واللہ اعلم۔

صومِ رمضان قطعی رویت سے یا ایک شاہد کے بیان پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ قطعی رویت یا ایک شاہد کی شہادت پر ہی آپ رمضان کے صوم رکھنا شروع کرتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر[1] کی اور ایک بار اعرابی[2] کی شہادت پر آپ نے صوم شروع کیے، صرف ان دونوں کی اطلاعات ہی پر آپ نے اعتماد فرمایا اور انھیں لفظ شہادت کے اصطلاحی مفہوم کا مکلف قرار نہیں دیا۔ اگر اس اطلاع کا مفہوم آگاہی تھا تو آپ نے صرف ایک شخص کی اطلاع پر اکتفاء فرمایا اور اگر شہادت کا تھا تو لفظ شہادت کا مکلف شاہد کو نہیں بنایا۔ قطعی رویت یا شہادت نہ ملتی تو ماہِ شعبان کے تیس دن پورے کرتے اور تیسویں شب میں مطلع ابر آلود ہوتا یا کوئی شہادت نہ ملتی تو ماہِ شعبان کے تیس دن پورے کر کے صوم شروع کرتے۔ مطلع ابر آلود ہوتا تو صوم رکھتے نہ اس کا حکم دیتے بلکہ حکم یہ دیتے کہ مطلع صاف نہ ہونے پر شعبان کے تیس دن پورے کیے جائیں۔ عمل بھی آپ کا ایسا ہی تھا یہ تھی آپ کے عمل اور آپ کے حکم کی نوعیت۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "تم پر مطلع جب ابر آلود رہے تو اندازہ لگاؤ[3]" مذکورہ صورتِ حال کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اندازہ سے مراد یہاں متعینہ حساب ہے۔ یعنی مہینہ کی تکمیل کی جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "گنتی پوری کرو" گنتی پوری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مہینہ پورا کیا جائے جس میں مطلع صاف نہ رہے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں وارد ہے "شعبان کی گنتی پوری کرو[4]" نیز فرمایا "اسے دیکھ کر صوم رکھو اور اسے دیکھ کر عید الفطر مناؤ اگر مطلع نا صاف رہے تو گنتی پوری کرو[5]" آپ نے گنتی پوری کرنے کا جو حکم دیا ہے یہ اسی مہینہ کی گنتی

---

[1] ابوداؤد (۲۳۴۲) فی الصوم ؛ باب شہادۃ الواحد۔ دارقطنی ۲۲۷۔ ابن عمر سے روایت ہے کہ "لوگوں نے ہلال دیکھا میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے، تو آپ نے خود صوم رکھا اور لوگوں کو صوم رکھنے کا حکم دیا" اس کی سند قوی ہے، ابن حبان (۸۷۱)۔ حاکم ۱/۴۲۳ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس کی تائید کی ہے۔

[2] ترمذی (۶۹۱)۔ ابوداؤد (۲۳۴۰)۔ نسائی ۴/۱۳۱، ۱۳۲۔ ابن ماجہ (۱۶۵۲)۔ ابن حبان (۸۷۰)۔ حاکم ۱/۴۲۴۔ ابن خزیمہ (۱۹۲۳) سماک کی حدیث ہے جو عکرمہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ "ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے آپ نے کہا کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں ؟ اس نے جواب دیا "جی ہاں" آپ نے کہا بلال لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل سے صوم رکھیں۔ عکرمہ سے سماک کی روایت میں اضطراب ہے۔ لیکن ابن عمر کی مذکورہ حدیث اس پر شاہد ہے۔ لہذا اس کی وجہ سے اسے تقویت ملتی ہے۔

[3] بخاری ۴/۱۰۲، ۱۰۴ فی الصوم : باب اذا رأیتم الھلال فصوموا۔ مسلم (۱۰۸۰) فی الصیام : باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الھلال۔ اصحاب سنن عبداللہ بن عمر کی حدیث سے نقل کرتے ہیں۔

[4] بخاری ۴/۱۰۶ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[5] مالک ۱/۲۸۷ فی الصیام : باب ماجاء فی رؤیۃ الھلال۔ ابن عباس کی حدیث ہے جس کے اندر انقطاع ہے اور ابوداؤد نے (۲۳۲۷) میں اسے موصول روایت کیا ہے اور ترمذی (۶۸۸) روایت کرتے ہیں سماک بن حرب کے طریق سے، وہ روایت کرتے ہیں عکرمہ سے اور عکرمہ ابن عباس سے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ امام مسلم نے (۱۰۸۱) میں اس کے مثل ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

پوری کرنے کا حکم ہے جس میں مطلع صوم اور عید الفطر کے موقع پر ناصاف رہے۔ اس سے بھی زیادہ واضح قول آپ کا یہ ارشاد ہے کہ "مہینہ ۲۹ دنوں کا بھی ہوتا ہے، لہذا چاند دیکھ کر صوم رکھو، اگر مطلع ناصاف رہے تو گنتی پوری کرو"[1]۔ یہاں الفاظ میں اعتبار شروع مہینہ کا اور معنی میں آخر کا کیا گیا ہے۔ لہذا لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے جو مفہوم نکلتا ہے عمل اس کے برعکس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا یہ ارشاد بھی ہے "مہینہ تیس دن کا بھی ہوتا ہے اور انتیس دن کا بھی، پس اگر مطلع ناصاف رہے تو تیس دن پورے کر لو"[2]۔ نیز یہ بھی ہے کہ "رمضان سے پہلے صوم نہ رکھو، چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر عید الفطر مناؤ، چاند کے سامنے کوئی بادل حائل ہو جائے تو تیس دن پورے کر لو"[3]۔ یہ بھی ارشاد ہے "ہلال نظر آنے سے پہلے یا گنتی پوری کرنے سے پہلے مہینہ کے لیے پیش قدمی نہ کرو۔ اس کے بعد ہی صوم رکھو حتی کہ چاند نظر آجائے یا گنتی پوری کر لو"[4]۔

حضرت عائشہ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنا اہتمام ہلال شعبان کا کرتے کسی اور کا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ہلال دیکھ کر صوم رکھتے، مطلع ناصاف ہونے کی صورت میں شعبان کے تیس دنوں کا شمار فرماتے اس کے بعد صوم رکھتے"[5]۔ دارقطنی اور ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے "چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر عید الفطر مناؤ، مطلع ناصاف رہے تو تیس دنوں کا حساب پورا کرو"[6]۔ نیز یہ بھی "چاند دیکھے بغیر صوم نہ رکھو نہ عید الفطر مناؤ، اگر مطلع ناصاف رہے تو حساب پورا کرو"[7]۔ نیز یہ بھی[8] "رمضان کے لیے ایک روایت کے مطابق رمضان کے روبرو ایک یا دو دنوں کی پیش قدمی نہ کرو، ہاں اگر کوئی پہلے سے صوم رکھ رہا ہو تو وہ رمضان سے دو ایک روز پہلے کا رکھ سکتا ہے"[8]۔

اس دعویٰ کی دلیل کہ مطلع ناصاف والا دن مذکورہ نہی کے اندر شامل ہو جاتا ہے، حضرت ابن عباس کی حسب ذیل مرفوع حدیث ہے "رمضان سے پہلے صوم نہ رکھو، چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر عید الفطر مناؤ، اگر چاند کے سامنے بادل حائل ہو تو تیس دن پورے کرو"۔ اس روایت کا تذکرہ ابن حبان نے اپنی صحیح کے اندر کیا ہے[9]۔ روایت کے اندر صراحت

---

[1] - بخاری ۴/۱۰۴، ۱۰۵۔ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ۔

[2] - صحیح مسلم (۱۰۸۰) (۱۵) ابن عمر کی مرفوع حدیث ہے جس کے معنی یہ ہیں مہینہ اتنے کا ہوتا ہے۔ اتنے کا ہوتا ہے۔ اتنے کا ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے انگوٹھے کو تیسری انگلی پر رکھا اور مہینہ اتنے کا ہوتا ہے۔ اتنے کا ہوتا ہے۔ آپ اس بات سے تیس دن کی تکمیل مراد لیتے تھے۔

[3] - ترمذی (۶۸۸)۔ ابوداؤد (۲۳۲۷)۔ نسائی ۴/۱۳۶۔ سماک کے طریق سے مروی ہے جو عکرمہ سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔

[4] - ابوداؤد (۲۳۲۶)۔ نسائی ۴/۱۳۵، ۱۳۶۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کی اسناد صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۹۱۱) اور ابن حبان (۸۷۵) نے اسے صحیح کہا ہے۔

[5] - احمد ۶/۱۴۹۔ ابوداؤد (۲۳۲۶)۔ ابن خزیمہ (۱۹۱۰)۔ حاکم ۱/۴۲۳۔ ابن حبان (۸۶۹)۔ بیہقی ۴/۲۰۶۔ دارقطنی ۲/۱۵۶، ۱۵۷۔ اس کی سند صحیح ہے حاکم نے اسے صحیح کہا ہے ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اور دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ اسناد حسن صحیح ہے۔

[6] - بخاری ۴/۱۰۶۔ مسلم (۱۰۸۱) (۱۹) حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[7] - امام مالک ۱/۲۸۶۔ بخاری ۴/۱۰۲، ۱۰۴۔ مسلم (۱۰۸۰) حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ۔

[8] - بخاری ۴/۱۰۹۔ فی الصوم : باب لا یتقدم رمضان بصوم یوم ولا یومین۔ مسلم (۱۰۸۲) حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[9] - ابن حبان (۸۷۳)۔ ابوالاحوص کی حدیث ہے جو روایت کرتے ہیں سماک سے اور وہ عکرمہ سے اور عکرمہ ابن عباس سے۔ اس کی سند حسن ہے اور دوسری جگہ وہی (۸۷۴) اور ابن خزیمہ (۱۹۱۲) سماک سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا "میں ایسے روز عکرمہ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ رمضان کے چاند کے بارے میں شک کیا گیا تھا اور عکرمہ کھانا تناول فرما رہے تھے، تو انھوں نے کہا تشریف لایئے کھانا تناول فرمایئے میں نے کہا کہ میں صوم سے ہوں، تو انھوں نے کہا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ یہ بات کہی جا رہی ہے کہ بغیر دیکھے اور بغیر تیس دن پورا کیے ناصاف مطلع کے دن کا صوم، صوم قبل از رمضان کا حکم رکھتا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد بھی ہے "ہلال دیکھے بغیر یا گنتی پوری کرنے سے پہلے، مہینہ کے لیے پیش قدمی نہ کرو، اسی طرح ہلال دیکھے بغیر یا گنتی پوری کرنے سے پہلے افطار نہ کرو"[1] اور یہ ارشاد بھی ہے کہ "چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر تمھارے اور چاند کے درمیان بادل آجائے تو گنتی تیس دن کی پوری کرو اور مہینہ کا قبل از وقت استقبال نہ کرو"[2] ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

نسائی میں یونس کی حدیث وارد ہے جسے انھوں نے بروایت سماک عن عکرمہ عن ابن عباس مرفوعًا نقل کیا ہے کہ "چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر مطلع ناصاف رہے تو تیس دن شمار کرو، پھر صوم رکھو، اس سے ایک روز پیشتر صوم نہ رکھو، اگر تمھارے اور چاند کے درمیان بادل آجائے تو گنتی یعنی شعبان کی گنتی پوری کرو"[3]

سماک نے بروایت عکرمہ عن ابن عباس روایت کی ہے کہ ایک دفعہ ہلال رمضان کی روایت کے باب میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ چنانچہ کچھ لوگ آج اور کچھ کل کی بات کرنے لگے، اس موقعہ پر ایک اعرابی نے آکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اس نے چاند دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا "کیا تو لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی شہادت دیتا ہے" اس نے کہا "ہاں" چنانچہ آپ نے حضرت بلال کو لوگوں میں صوم کی منادی کا حکم دے دیا، اور فرمایا "چاند دیکھ کر صوم رکھو، چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر مطلع ناصاف رہے تو تیس دنوں کا حساب پورا کرو، پھر صوم رکھو اور ایک دن پہلے صوم نہ رکھو"[4] یہ تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ بعض صحیحین میں آئی ہیں بعض صحیح ابن حبان اور حاکم وغیرہ میں وارد ہیں۔ بعض احادیث میں گو کچھ علتیں ظاہر کی گئیں ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی ان سے استدلال کرنا صحیح ہے۔ یہ ایک دوسرے کی تفسیر پیش کرتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کو صادق قرار دیتی ہیں۔ ان احادیث کا مفہوم متفق علیہ ہے۔ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ جب ایسا تھا تو پھر حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوہریرہ، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت حکم بن ایوب غفاری، حضرت عائشہ اور اسماء بنت ابی بکر، سالم بن عبداللہ، مجاہد، طاووس، ابوعثمان نہدی، مطرف بن شخیر، میمون بن مہران، بکر بن عبداللہ مزنی، اور امام اہل حدیث وسنت احمد بن حنبل نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی؟ ان بزرگان سلف کے اقوال حسب ذیل ہیں۔ جو مستند ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب :- ولید بن مسلم فرماتے ہیں ہمیں ثوبان نے خبر دی ہے وہ اپنے والد سے اور وہ مکحول سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر جس شب آسمان ابر آلود ہوتا صوم رکھتے اور فرماتے کہ یہ پیش قدمی نہیں بلکہ اولیٰ کی جستجو ہے۔[5]

حضرت علی بن ابی طالب :- شافعی فرماتے ہیں کہ عبدالعزیز بن محمد دراوردی نے ہمیں بتایا وہ محمد بن عبداللہ بن

(بقیہ صفحہ گذشتہ) واللہ پھر تو ضرور آئیے۔ میں نے کہا آپ ہم سے حدیث بیان کیجیے، انھوں نے کہا "ابن عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مہینے کے لیے تم پیش قدمی نہ کرو، چاند دیکھ کر صوم رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر تمھارے اور چاند کے مطلع کے درمیان کوئی بادل یا بادل کا ٹکرا حائل ہو تو تیس دن مکمل کرو"۔

[1] - اس کی تخریج گذر چکی ہے، حذیفہ کی روایت ہے اور صحیح ہے۔

[2] - اس کی تخریج گذر چکی ہے، نیز بیہقی ۴/۲۰۷، اور ترمذی (۶۸۸)۔

[3] - نسائی ۴/۱۵۳، ۱۵۴ فی الصوم : باب صیام یوم الشك ۔ سند حسن ہے۔

[4] - سنن دار قطنی ۲/۱۵۷، ۱۵۸، اور اس کی تخریج گذر چکی ہے، جس میں ثم قال ۔۔۔۔ نہیں ہے۔

[5] - مکحول کا لقاء حضرت عمر بن خطاب سے ثابت نہیں ہے لہذا حدیث منقطع ہے۔

عمر بن عثمان سے اور وہ اپنی ماں فاطمہ بنت حسین سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا "شعبان کے ایک دن کا صوم رکھ لینا میرے نزدیک اس بات سے بہتر ہے کہ رمضان کا ایک دن صوم سے نہ رہوں[1]"

حضرت عبداللہ بن عمر :۔ مصنف میں عبدالرزاق فرماتے ہیں کہ ہمیں معمر نے بتایا۔ وہ ایوب سے، وہ حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ جب آسمان ابر آلود ہوتا تو آپ صوم رکھ لیتے تھے اور نہ ہوتا تو صوم سے نہ رہتے[2]۔ صحیحین میں انہی حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جب چاند دیکھ لو تو صوم رکھو، اور چاند دیکھ لو تو افطار کرو اور اگر مطلع ناصاف ہو تو حساب پورا کرو[3]"۔ امام احمد نے بسند صحیح حضرت نافع سے روایت کرتے ہوئے مزید اضافہ فرمایا ہے کہ شعبان کے انتیس دن پورے ہو جاتے تو حضرت عبداللہ کسی کو چاند دیکھنے کے لیے بھیجتے۔ اگر اس نے دیکھ لیا تو فبہا ورنہ سامنے کوئی بادل یا دھواں حائل نہ رہا تو صوم نہیں رکھتے۔ بصورت دیگر صوم رکھتے تھے[4]۔

حضرت انس بن مالک :۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ ہم سے اسماعیل بن ابراہیم نے، انھوں نے کہا ہم سے یحییٰ بن ابی اسحاق نے بیان فرمایا کہ "ہیں نے ظہر کے وقت یا اس کے لگ بھگ چاند دیکھ لیا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے صوم توڑ دیا۔ اس پر ہم حضرت انس بن مالک کے پاس آئے اور انھیں چاند دیکھ لیے جانے اور کچھ لوگوں کے صوم توڑ دینے کی خبر دی۔ آپ نے فرمایا "آج میرے اکتیس دن پورے ہو رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ حکم بن ایوب نے لوگوں کے صوم رکھ لینے سے پہلے میرے یہاں کہلا بھیجا کہ میں کل صوم سے رہوں گا۔ مجھے ان کی مخالفت گوارا نہ ہوئی، چنانچہ میرا بھی صوم رہا۔ آج کا دن شب تک پورا ضرور کروں گا"۔

حضرت معاویہ :۔ احمد فرماتے ہیں ہم سے مغیرہ نے، انھوں نے کہا ہم سے سعید بن عبدالعزیز نے، انھوں نے کہا مجھ سے مکحول اور یونس بن میسرہ بن حلبس نے بیان کیا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان فرمایا کرتے تھے کہ شعبان کا ایک دن صوم رکھ لینا میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے اس بات سے کہ رمضان کا کوئی دن بے صوم ہی رہوں[5]"۔

عمرو بن العاص :۔ احمد فرماتے ہیں ہم سے زید بن حباب نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہمیں ابن لہیعہ نے بتایا، وہ عبداللہ بن ہبیرہ سے، وہ عمرو بن العاص سے نقل کرتے ہیں کہ وہ رمضان کے مشکوک دن کا صوم رکھتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ :۔ احمد فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے، انھوں نے کہا ہم سے معاویہ بن صالح نے بیان کیا، وہ ابو مریم مولیٰ ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابوہریرہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ "رمضان کا صوم ایک دن پہلے رکھ لینا میرے نزدیک اس بات سے زیادہ اولیٰ ہے کہ تاخیر سے کام لوں، کیونکہ پہلے رکھ لوں گا تو یہ صوم فوت نہ ہوگا، اور مؤخر کروں گا تو فوت ہو سکتا ہے۔

حضرت عائشۃ :۔ سعید بن منصور فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، وہ یزید بن خمیر سے اور وہ اس قاصد سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عائشہ کے یہاں رمضان کے مشکوک دن میں آیا تھا کہ حضرت عائشہ کا ارشاد

---

[1]۔ شافعی ۱/۲۵۱۔ اس میں بھی انقطاع ہے۔
[2]۔ مصنف عبدالرزاق (۷۳۲۳) سند صحیح ہے۔
[3]۔ اس کی تخریج گذر چکی ہے۔
[4]۔ مسند احمد ۲/۵۔ ابوداؤد (۲۳۲۰)
[5]۔ منقطع روایت ہے۔ عمرو بن العاص کی روایت بھی منقطع ہے۔ اس میں ابن لہیعہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت وجوب کی نہیں بلکہ احتیاط اور استحباب کی دلیل ہے۔

ہے "شعبان کا ایک دن صوم رکھ لینا میرے نزدیک اس بات سے زیادہ بہتر ہے کہ رمضان کا ایک دن صوم سے نہ رہوں"۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر :۔ سعید بن منصور ہی فرماتے ہیں ہم سے یعقوب بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا وہ ہشام بن عروہ سے اور وہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں کہ جب بھی رمضان کا چاند پوشیدہ رہا اسماء ایک دن پہلے صوم شروع کر دیتی تھیں۔ اور اس بات کا حکم بھی دیتی تھیں۔ احمد فرماتے ہیں ہم سے روح بن عباد نے بیان کیا، وہ حماد بن سلمہ سے، وہ ہشام بن عروہ سے، وہ فاطمہ سے، وہ حضرت اسماء سے روایت کرتی ہیں کہ رمضان کا وہ دن صوم سے رہتی تھیں جس دن انھیں شک ہو جاتا"۔

اوپر جو آثار بروایت احمد ہم نے نقل کیا ہے وہ سب فضل بن زیاد کے مسائل سے ہیں۔ اثرم کی روایت کے مطابق امام احمد جب آسمان پر بادل ہوتا یا کوئی اور صورت ہوتی تو صوم رکھ لیتے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو صوم سے نہ رہتے۔ آپ کے دونوں بیٹوں صالح اور عبداللہ نیز مروزی اور فضل بن زیاد وغیرہ نے بھی ایسی ہی روایتیں آپ سے کی ہیں۔

مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہم مختلف پہلوؤں سے دیں گے۔

۱۔ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ سے اس بات میں جو آثار منقول ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس سے اس دن صوم رکھنا واجب اور نتیجۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کی خلاف ورزی ثابت ہوتی ہو۔ صحابہ سے جو کچھ منقول ہے اس کا مقصد صرف احتیاط ہے۔ حضرت انس نے تو بصراحت کہہ بھی دیا ہے کہ وہ اس دن صوم اس لیے رکھ لیتے ہیں کہ امراء کی مخالفت نہ ہو۔ امام احمد کا ایک روایت کے مطابق ارشاد یہ ہے کہ صوم وافطار میں لوگ امام کے تابع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے جو نصوص ہم نے بیان کیے ہیں ان میں دلیل صرف اس بات کی ہے کہ یوم شک کا صوم واجب نہیں ہے۔ حرام ہونے کی دلیل ان میں نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ صوم سے نہیں رہے انھوں نے جواز کا اور جنھوں نے رکھا انھوں نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا۔

۲۔ بعض صحابہ بلاشبہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اس دن صوم رکھ لیتے تھے لیکن کچھ صحابہ نہیں بھی رکھتے تھے بسند صحیح اور صراحت سے جن کے صوم رکھنے کی روایت ہے وہ حضرت عبداللہ بن عمر ہیں۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں طاووس یمانی اور احمد بن حنبل کا بھی یہی مسلک رہا ہے۔ حضرت ابوبکر کی دونوں صاحبزادیوں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء کے بارے میں بھی یہی منقول ہے۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر کا مذہب کسی اور کا بھی رہا ہے۔ یہ ہمیں نہیں معلوم۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں یوم شک کے صوم کا مکروہ ہونا جن سے مروی ہے ان میں حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

میرے نزدیک حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عمار، حضرت حذیفہ اور حضرت ابن مسعود سے منقول یہ ہے کہ وہ شعبان کے آخری دن نفلی صوم رکھنے سے منع کرتے تھے۔ اور اسی جانب حضرت عمار کا اشارہ ہے کہ جس نے مشکوک دن صوم رکھا اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی[۱]

بدلی کے دن کا صوم اس احتیاط پر کہ اگر رمضان کا رہا تو فرض ورنہ نفل ہے۔ اس باب میں صحابہ سے منقول روایتوں

---

[۱] ۔ ابوداؤد (۲۳۳۴)۔ ترمذی (۶۸۶)۔ نسائی ۴/۱۵۳۔ ابن ماجہ (۱۶۴۵)۔ دارمی ۲/۲۔ بخاری تعلیقاً ۴/۱۰۲ بصیغۂ جزم۔ ابن خزیمہ (۱۹۱۴)۔ ابن حبان (۸۷۸) اور حاکم ۱/۴۲۳، ۴۲۴ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

کا تقاضا یہ ہے کہ اسے جائز سمجھا جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ کا عمل بھی اسی کے مطابق رہا ہے۔ حضرت عائشہ کا یہ عمل خود ان کی اس روایت کے باوجود بھی رہا ہے جس میں ہے کہ جب شعبان کا چاند پوشیدہ رہتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیس دن شمار کرتے اس کے بعد صوم رکھتے۔ اس حدیث کی تردید میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر یہ صحیح ہوتی تو حضرت عائشہ کا عمل اس کے مخالف نہ ہوتا۔ چنانچہ آپ کے عمل ہی کو حدیث کے معلول ہونے کی دلیل بتائی گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے، کیونکہ صوم آپ نے واجبی طور پر نہیں محض احتیاطاً رکھا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فعل سے آپ نے یہی سمجھا کہ جب تک تعداد پوری نہ ہو جائے صوم واجب نہیں ہوتا۔ انھوں نے یا حضرت ابن عمر نے یہ ہرگز نہیں سمجھا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں سب سے معتدل موقف یہی ہے کیونکہ اس نقطہ پر تمام حدیثیں مجتمع ہو جاتی ہیں، دلیل معمر کی اس حدیث میں ہے جسے انھوں نے ایوب سے، انھوں نے نافع سے اور انھوں نے حضرت ابن عمر سے بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال رمضان کے بارے میں فرمایا "جب اسے دیکھ لو تو صوم رکھو اور جب دیکھ لو تو افطار کرو، اگر پوشیدہ رہے تو تیس دنوں کا حساب کرو" ابن ابی رواد نے نافع سے اور انھوں نے حضرت ابن عمر سے اس کی روایت یوں کی ہے "اگر تم پر وہ پوشیدہ رہے تو تیس کی گنتی پوری کرو" مالک اور عبیداللہ نے نافع سے اور انھوں نے حضرت ابن عمر سے جو روایت کی ہے اس میں ہے کہ "اس کا حساب کرلو" اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر نے حدیث سے تیس دنوں کی تکمیل واجب نہیں بلکہ جائز بھی ہے وہ تیسویں دن صوم رکھتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ احتیاطاً انھوں نے دو جائز باتوں میں سے ایک کو اختیار کیا۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ نے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "انتیس دنوں کا حساب کرو، اس کے بعد صوم رکھو" کا مفہوم وہی سمجھا ہوتا جو اس دن صوم واجب تصور کرنے والے سمجھتے ہیں۔ تو آپ اپنے گھر والوں کو اور دوسروں کو اس کا حکم بھی دیتے، اور صوم کو صرف اپنی ذات کی حد تک محدود نہ رکھتے اور نہ اس کا حکم دیتے بلکہ واضح فرماتے کہ اس دن صوم رکھنا تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ حضرت ابن عباس اس دن صوم نہیں رکھتے تھے، اور استدلال میں آپ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے کہ "ہلال دیکھے بغیر صوم رکھو نہ افطار کرو" "اگر پوشیدہ رہے تو تیس کی تعداد پوری کرو" اور حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث کا ذکر کرنے کے بعد موطا میں امام مالک نے مذکورہ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ گویا انھوں نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر کی حدیث کی تفسیر قرار دی ہے، جس کے اندر آپ کا یہ قول ہے۔ "فاقدروا له" (اس کا حساب کرلو) اور حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو ایک یا دو دن پہلے مہینہ کے لیے پیش قدمی کرتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "رمضان کے لیے ایک دن پہلے پیش قدمی کرو نہ دو دن" اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر پر انھوں نے اعتراض کیا ہے۔

ان دونوں بزرگ اماموں کا حال یہی تھا۔ ایک مائل بہ شدت اور ایک مائل بہ رخصت۔ کئی مسئلوں کے اندر ان بزرگوں کا یہی حال تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر تو کچھ باتیں اتنی شدت سے اختیار فرماتے کہ صحابہ ان کی موافقت نہ کرپاتے تھے۔ چنانچہ وضو میں دونوں آنکھوں کے اندرونی حصے دھویا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اسی وجہ سے اندھے بھی ہو گئے، سر کا مسح کرتے تو کانوں کے لیے نیا پانی استعمال کرتے۔ حمام میں داخل ہونے سے رو کتے تھے۔ کبھی داخل ہو گئے تو اس کے سبب غسل ضرور کیا۔ برعکس ازیں حضرت ابن عباس حمام میں داخل ہوتے تھے۔ حضرت ابن عمر دو ضربوں سے تیمم کرتے۔ ایک ضربہ چہرہ کے لیے اور ایک ضربہ دونوں ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔ ایک ضرب پر اکتفا کرتے نہ دونوں ہتھیلیوں

پر حضرت ابن عباس کا عمل ان کے مخالف تھا۔ فرماتے تیمم میں چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے لیے ایک ضرب کافی ہے۔ بیوی کا بوسہ لینے پر حضرت ابن عمر وضو کرتے اور اسی کا فتویٰ بھی دیتے تھے، بچوں کا بوسہ لیتے تو کلی کرتے پھر صلوٰۃ پڑھتے۔ مگر حضرت ابن عباس فرماتے "بوسہ لوں یا کوئی پھول سونگھوں دونوں میں آخر کیا فرق ہے"، صلوٰۃ کے اندر اگر مصلی کو یاد آجاتا کہ اس پر ایک صلوٰۃ اور بھی ہے تو حضرت ابن عمر اسے حکم دیتے کہ جو صلوٰۃ پڑھ رہا ہے پہلے اسے پوری کرے۔ پھر یاد آئی ہوئی صلوٰۃ پڑھے۔ پھر یہ دوسری صلوٰۃ بھی دہرائے، ابویعلیٰ موصلی اس باب میں اپنی مسند کے اندر ایک مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر پر موقوف ہو جاتی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً مروی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عباس سے مرفوعاً منقول ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

غرض یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمر کا مسلک شدت اور حد درجہ احتیاط کا تھا۔ معمر نے ایوب سے اور انھوں نے نافع سے اور انھوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ امام کے ساتھ اگر ایک رکعت انھیں مل جاتی تو اس کے ساتھ دوسری کا بھی اضافہ کرتے اور صلوٰۃ سے فارغ ہو کر دو سجدۂ سہو کر لیتے۔ زہری فرماتے ہیں، میرے علم میں ان کے علاوہ کسی نے ایسا نہیں کیا ہے۔

مذکورہ صورت کے اندر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک رکعت کے بعد جو جلسہ انھیں ملا سجدہ اس کا ہوا حالانکہ موقع اس کا دو رکعتوں کے بعد ہوتا ہے۔

صحابہ نے اس دن صوم فرض کے طور پر نہیں رکھا تھا۔ دلیل ان کا یہ قول ہے کہ شعبان کا ایک صوم رکھ لینا اس بات سے زیادہ بہتر ہے کہ رمضان کا ایک صوم جاتا رہے، اگر یہ دن حتمی طور پر ماہ رمضان کا ہوتا تو یقیناً وہ یہ فرماتے کہ یہ رمضان ہے لہٰذا صوم نہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

انھوں نے استحباب کے طور پر یہ صوم بربنائے تحری رکھا تھا۔ دلیل یہ ہے کہ ان سے اس دن صوم نہ رکھنے کا جواز منقول ہے۔ حضرت ابن عمر ہی کے ضمن میں حنبل اپنے "مسائل" میں فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن حنبل نے، انھوں نے کہا ہم سے وکیع نے بیان کیا، وہ سفیان سے اور وہ عبدالعزیز بن حکیم حضرمی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عمر کا یہ ارشاد سنا ہے کہ "اگر میں پورے سال صوم رکھتا ہوتا تو بھی مشکوک دن کا صوم نہ رکھتا۔"[1]

حنبل کا ارشاد ہے: ہم سے احمد بن حنبل نے، انھوں نے کہا ہم سے عبیدہ بن حمید نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہمیں عبدالعزیز بن حکیم نے بتایا کہ لوگوں نے حضرت ابن عمر سے پوچھا، ہم کیوں نہ رمضان سے پہلے سبقت کریں تاکہ اس مہینہ کا کوئی ثانیہ چھوٹنے نہ پائے؟ تو انھوں نے فرمایا "اُف، اُف، جماعت کے ساتھ صوم رکھو۔" حضرت ابن عمر کا ارشاد یہ بھی ثابت ہے "تم میں کوئی بھی مہینہ کے لیے پیش قدمی نہ کرے۔" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے "ہلال دیکھ کر صوم رکھو، اور ہلال دیکھ کر افطار کرو، اور اگر یہ پوشیدہ رہے تو تیس دن شمار کرو۔" حضرت علی ابن ابی طالب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے "ہلال دیکھ لو تو صوم رکھو، اور ہلال دیکھ لو تو عیدالفطر مناؤ اور اگر پوشیدہ رہے تو تعداد پوری کرو۔" حضرت ابن مسعود کا ارشاد ہے "اگر پوشیدہ رہے تو تیس دن شمار کرو۔"

مذکورہ آثار اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ صحابہ سے منقول آثار کے معارض ہیں تو ہم یہاں واضح طور پر بتا دینا چاہتے ہیں

---

[1] سند صحیح ہے۔ اسی طرح اس کے بعد آنے والی حدیث کی بھی سند صحیح ہے۔

کہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے یہی آثار نصوص مرفوعہ کے موافق بھی ہیں اور اگر ان آثار کے درمیان کسی طرح کا تعارض نہیں مانتے تو پھر جمع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان آثار کو بدلی ہونے کے علاوہ کسی اور بات پر یا مہینہ کے آخر میں بدلی ہونے کی حالت پر محمول کر لیا جائے۔ جیسا کہ صوم واجب تصور کرنے والوں کا خیال ہے۔

دوسری صورت یہ کہ صحابہ سے صوم رکھنے کے جو آثار مروی ہیں انھیں طلب اولی اور احتیاط پر محمول کیا جائے اور واجب کے بجائے استحباب کا درجہ دیا جائے۔ یہ تمام آثار صراحت کے ساتھ وجوب کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ طریقہ نصوص حدیث اور اصولِ شریعت کے مابین تطبیق کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں اس تفریق اور امتیاز کا کوئی سوال بھی باقی نہیں رہتا جو دو مساویانہ طور پر مشکوک دنوں کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے، جن میں ایک کو یوم شک اور ایک کو یوم یقین کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس دوسرے دن کا بھی مشکوک ہونا قطعی ہوتا ہے اور بندہ کو مکلف قرار دینا کہ حتمی طور پر اس دن کو رمضان کا دن شمار کرے۔ حالانکہ اس کے نزدیک وہ مشکوک ہوتا ہے۔ یہ تکلیف مالا یطاق ہے اور دو ہم جنسوں کے درمیان تفریق ہے۔ واللہ اعلم۔

رویتِ ہلال کی شہادت

سنت یہ تھی کہ محض ایک مسلمان مرد کی شہادتِ رویت پر آپ صوم رکھنے کا حکم دے دیتے اور ہلالِ عید کے موقع پر دو مسلمان مردوں کی شہادت پر عید کا حکم دیتے تھے۔

اسی طرح یہ سنت بھی تھی کہ اگر رویتِ ہلال کی گواہی وقتِ عید نکل جانے کے بعد دو گواہ پہنچاتے تو خود بھی صوم توڑ دیتے اور لوگوں کو بھی توڑ دینے کا حکم دیتے، پھر دوسرے دن عید کے وقت[1] صلوٰۃ دوگانہ ادا فرماتے۔ افطار میں عجلت فرماتے[2] اور اسی کی تاکید بھی کرتے۔ سحری کھاتے، سحری کی ترغیب دیتے۔ سحری میں تاخیر کرتے اور اسی کی ترغیب بھی دیتے۔ لوگوں کو افطار کھجور یا پانی سے کرنے کی تاکید فرماتے۔ امت کے حق میں یہ بات کمالِ شفقت اور خیر خواہی کی دلیل

---

[1] ابوداؤد (۲۳۳۹) فی الصوم: باب شہادۃ رجلین علی رؤیۃ ہلال شوال۔ احمد ۴/۱۴ و ۵/۳۶۲، ۳۶۳۔ دارقطنی ۲/۱۶۹ بروایت ربعی بن خراش؛ وہ ایک صحابی سے روایت فرماتے ہیں کہ رمضان کے آخری دن کے باب میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہو گیا تو دو اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اللہ کی قسم کھانے کے بعد شہادت دی کہ انھوں نے کل شام چاند دیکھا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم توڑنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ سب عیدگاہ چلیں۔ سند صحیح ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح کہا ہے۔ صحابی کا نام نامعلوم ہونے سے کوئی حرج نہیں کیونکہ صحابہ سب ثقہ ہیں۔ اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ صوم توڑنے کی بات ہو تو گواہی دو شخصوں کی معتبر ہو گی۔ اور یہ بات مخفی نہیں کہ ایک واقعہ کے اندر دو آدمیوں کی گواہی ایک آدمی کی گواہی کے عدمِ قبولیت کی دلیل نہیں قرار دی جا سکتی۔

[2] بخاری ۴/۱۷۳۔ مسلم (۱۰۹۸) بروایت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "لوگ جب تک افطار میں جلدی کریں گے بخیر رہیں گے"۔ بخاری ۴/۱۲۰ اور مسلم (۱۰۹۵) نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ "سحری کھاؤ، سحری کھانے میں برکت ہے"۔ مسلم (۱۰۹۶)۔ ترمذی (۷۰۸)۔ ابوداؤد (۲۳۴۳)۔ نسائی ۴/۱۴۶ بروایت عمرو بن العاص، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اور اہلِ کتاب کے صوم میں فرق سحری کھانا ہے۔ بخاری ۴/۱۱۸، ۱۱۹۔ مسلم (۱۰۹۷) بروایت زید بن ثابت، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی۔ اس کے بعد آپ صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہو گئے، میں نے دریافت کیا، اذان اور سحری میں وقفہ کتنا تھا؟ فرمایا "پچاس آیتوں کے برابر"۔ دیکھیے مجمع الزوائد ۳/۱۵۴، ۱۵۵۔ "باب تعجیل الافطار و تاخیر السحور"۔

ہے۔ کیونکہ خلو معدہ کی حالت میں طبیعت مدبرہ بدن میٹھی شے جلد قبول کر لیتی ہے، اور جسمانی قوتیں بالخصوص باصرہ کو اس سے بے حد قوت حاصل ہوتی ہے۔ مدینہ کی شیرینی یہی کھجور تھی۔ کھجور ہی پر باشندگان مدینہ کی پرورش اور معیشت کا مدار تھا۔ یہی ان کا غلہ اور یہی ان کا سالن تھا۔ اور تر کھجور ان کا میوہ تھا۔ پانی سے افطار کرنے کی حکمت یہ ہے کہ صوم سے جگر میں جو خشکی پیدا ہو جاتی ہے وہ پانی سے دور ہو جاتی ہے۔ اور بعد میں دوسری غذاؤں سے فائدہ اٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بھوکے پیاسے کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ کھانے سے پہلے تھوڑا پانی پی لے پھر کھائے۔ علاوہ ازیں قلب کی صلاح و تعمیر میں کھجور اور پانی کا کیا خاص اثر ہے اسے قلبی امراض کے ماہر اطباء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

افطار میں آپ کا اسوۂ مبارک

صلوٰۃ سے پہلے کچھ تر کھجوریں، اگر یہ نہ ملیں تو خشک ہی کھجوریں اور یہ بھی نہ ملیں تو پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتار کر صوم افطار کرتے تھے[1]

روایت ہے کہ افطار پر یہ دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ، فَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔[2]

اے اللہ! میں نے تیرے لیے صوم رکھا، تیرے رزق پر افطار کیا، پس یہ صوم ہم سے قبول فرما۔ تو ہی سننے جاننے والا ہے۔

مگر یہ دعا ثابت نہیں ہے۔

آپ سے یہ دعا بھی منقول ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ۔

اے اللہ! میں نے تیرے لیے صوم رکھا اور تیرے رزق پر افطار کیا۔

ابوداؤد نے اس کی روایت معاذ بن زہرہ سے کی ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ انھیں یہ خبر ملی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہی دعا پڑھتے تھے[3]

---

[1] مسند احمد ۳/۱۶۴۔ ترمذی (۶۹۶)۔ ابوداؤد (۲۳۵۶) حدیث انس بن مالک۔ سند قوی ہے۔ ابن خزیمہ (۲۰۶۶) نے اس کی تخریج انہی کی روایت سے حسب ذیل معانی میں کی ہے "جسے کھجور مل جائے اس سے افطار کرے، اور جو نہ پائے تو پانی سے افطار کرے، اس لیے کہ یہ پاک ہے" اس کی سند صحیح ہے۔ عبدالرزاق (۷۵۸۶)۔ احمد ۴/۱۷، ۱۸ و ۲۱۳، ۲۱۴۔ ابوداؤد (۲۳۵۵) ترمذی (۶۹۴) اور ابن ماجہ (۱۶۹۹) نے سلمان بن عامر ضبی کی روایت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا ہے "جو کھجور پائے تو اس سے افطار کرے اور جو کھجور نہ پائے تو پانی سے افطار کرے کیونکہ پانی پاکی کا ذریعہ ہے۔" ابن خزیمہ (۲۰۶۷) ابن حبان (۸۹۳)۔ حاکم ۱/۴۳۱، ۴۳۲ نے اسے صحیح کہا ہے، ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ حدیث کے اندر امر استحباب پر محمول کیا گیا ہے مگر ابن حزم نے منفرد راہ اختیار کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کھجور سے ورنہ پانی سے افطار کرنا واجب ہے۔

[2] عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (۴۸۱) سند میں عبدالملک بن ہارون بن عنترہ ہیں جسے احمد اور دارقطنی نے ضعیف کہا ہے۔ یحییٰ انھیں کذاب اور ابوحاتم متروک، ذاہب الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

[3] ابوداؤد (۲۳۵۸) ابن السنی (۴۷۳) اور معاذ بن زہرہ تابعی، ابن حبان کے علاوہ انھیں کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ اس لیے حدیث مرسل ہے۔

اور افطار کے بعد آپ کا یہ دعا پڑھنا مروی ہے۔

ذَهَبَ الظَّمأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى۔

پیاس بجھی، رگیں تر ہو گئیں، انشاء اللہ تعالیٰ اجر واقع ہوا۔

اس کی روایت ابو داؤد نے حسین بن واقد سے، انھوں نے مروان بن سالم المقفع سے اور انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے کی ہے[1]

آپ کا ارشاد مروی ہے کہ "افطار کے وقت صائم کی دعا مسترد نہیں ہوتی" اس کی روایت ابن ماجہ نے کی ہے[2]۔ اور آپ کا یہ ارشاد گرامی بھی ثابت ہے "جب رات یہاں سے آگے بڑھے اور دن رخصت ہو تو اس کا مطلب ہے کہ صائم دائرۂ افطار کے اندر آ گیا"[3] تشریح اس کی یہ کی گئی ہے کہ گو نیت نہ ہو مگر حکماً صائم نے افطار کر لیا۔ نیز اس کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "افطر" یعنی اس کے افطار کا وقت ہو گیا۔ افطر اصبح اور امسیٰ کی طرح کا فعل ہے۔ آپ نے صائم کو سب وشتم، شور وہنگامہ، بیہودہ باتوں اور گالی گلوچ کا جواب دینے سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے حکم دیا ہے کہ صائم کو گالی دی جائے تو وہ کہدے میں صوم سے ہوں۔ یہ بات دل میں کہا جائے یا زبان سے اس بارے میں اختلاف ہے؛ ایک قول یہ ہے کہ زبان سے اور یہی زیادہ درست ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ چپکے سے دل میں کہہ لیا جائے۔ اس سے خود کو صوم کی تذکیر مقصود ہے۔ ایک اور قول کے مطابق یہ ہے کہ فرض صوم میں زبان سے اور نفل صوم میں چپکے سے کہا جائے کیونکہ نمود وریا سے دور بات یہی ہو گی۔

سفر میں صوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں سفر کیا ہے۔ چنانچہ سفر میں صوم رکھا بھی ہے اور نہیں بھی رکھا ہے۔ آپ نے صحابہ کو دونوں باتوں کا اختیار مرحمت فرمایا تھا۔ دشمن سے قریب ہوتے وقت آپ صحابہ کو صوم نہ رکھنے کا حکم دیتے تاکہ ان کے خلاف جنگ کرنے کی طاقت وتوانائی حاصل رہے۔ بالفرض سفر کے بجائے حضر میں جنگی صورت حال پیش آ جائے، اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیش از پیش قوت کی ضرورت ہو تو کیا اس موقع پر بھی صوم توڑ دینے کا حکم دیا جائے گا؟ اس بارے میں دو اقوال ہیں۔ دلیل کے اعتبار سے صحیح تر یہ ہے کہ ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ امام ابن تیمیہ

---

[1] - ابو داؤد (۲۳۵۷)۔ دار قطنی ۲/۱۸۵۔ حاکم ۱/۴۲۲۔ ابن السنی (۴۷۹)۔ مروان بن سالم المقفع کو ابن حبان نے ثقہ اور دار قطنی اور ابن حجر نے ان کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ اس کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ حاکم کا یہ قول کہ بخاری نے مروان سے استدلال کیا ہے ان کا اپنا وہم ہے۔ کیونکہ بخاری نے جس مروان سے استدلال پیش کیا ہے وہ مروان اور ہیں۔

[2] - ابن ماجہ (۱۷۵۳) فی الصیام : باب فی الصائم لا ترد دعوته، حدیث عبد اللہ ابن عمرو بن العاص۔ سند میں اسحاق بن عبید اللہ ہیں جن کا تذکرہ ابن حبان نے ثقہ حضرات کے ضمن میں کیا ہے۔ باقی رجال بخاری کی شرط پر ہیں۔ اس کی شاہد "المختارۃ" میں ضیاء مقدسی کے یہاں حضرت انس کی یہ روایت ہے کہ "تین دعائیں مسترد نہیں ہوتیں۔ باپ[1] کی دعا بیٹے کے حق میں۔ [2]صائم کی دعا۔ [3]مسافر کی دعا۔ ابو ہریرہ کی حدیث ترمذی (۳۵۹۵) اور ابن ماجہ (۱۷۵۲) میں بایں معنیٰ وارد ہے "تین آدمیوں کی دعائیں مسترد نہیں ہوتیں۔ افطار کے وقت صائم کی دعا، امام عادل کی دعا، مظلوم کی دعا۔ ابن حبان (۲۴۰۸) نے اسے صحیح اور حافظ ابن حجر نے حسن کہا ہے۔

[3] - بخاری ۴/۱۷۱ فی الصیام : باب متی یحل فطر الصائم۔ مسلم (۱۱۰۰) فی الصیام : باب بیان وقت انقضاء الصوم وخروج النهار۔ حدیث عمر رضی اللہ عنہ۔

کا مذہب ہے۔ بیرون دمشق جب دشمن سے جنگ ہو رہی تھی تو انھوں نے اسلامی افواج کو یہی فتویٰ دیا تھا[1]

لاریب مجرد سفر کے باعث صوم نہ رکھنے کے بالمقابل مذکورہ مقصد کے تحت صوم نہ رکھنا زیادہ اولیٰ وانسب ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سفر میں صوم نہ رکھنے کا جواز پیدا کر کے اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ مذکورہ حالت کے اندر صوم نہ رکھنے کا جواز موجود ہے بلکہ یوں کہیے کہ جواز کی مستحق زیادہ تر یہی حالت ہے کیونکہ سفر میں طاقت کی بقا صرف مسافر کے لیے ہے۔ مگر زیر بحث ضرورتِ حال کے اندر اسلامی افواج اور مسلمانوں دونوں کے لیے مطلوب ہے۔ نیز جہاد کی مشقت سفر کی مشقت سے بڑھ کر ہے۔ مجاہد کے صوم نہ رکھنے میں جو مصلحت پوشیدہ ہے وہ مسافر کے مقابلہ میں عظیم تر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (انفال : ۶۰)

یعنی ان کے لیے جتنی قوت ہو سکے فراہم کرو۔

اور جنگ کے موقع پر صوم نہ رکھنا فراہمیٔ طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوت کی تفسیر رمی[2] (تیر اندازی) سے کی ہے۔ تیر اندازی کے اندر کمال اور پیش نظر منزل تک انسان پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ مطلوبہ غذائی مواد سے بھرپور طاقت بہم نہ پہنچائی جائے۔ اس لیے صحابہ جب دشمن سے قریب ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا " دشمن سے اب تم قریب ہو چکے ہو۔ لہٰذا صوم نہ رکھنا تمھارے لیے زیادہ تقویت کا باعث ہے " یہ رخصت تھی مگر جب ایک اور منزل پر صحابہ پہنچے تو آپ نے فرمایا " اب صبح سویرے تم دشمن کے مقابلہ پر ہوگے، صوم نہ رکھنا تمھارے حق میں زیادہ باعث تقویت ہوگا۔ لہٰذا صوم نہ رکھنا "، چنانچہ صحابہ نے صوم نہیں رکھا۔ یہ عزیمت کا پہلو تھا[3] یہاں علت دشمنوں سے قریب ہونا اور مقابلہ کے لیے مطلوبہ قوت کا حصول قرار دیا گیا ہے۔ جنگی مہم کے اندر ایک سبب تو سفر ہے ہی اور دوسرا سبب یہ بھی ہوا۔ سفر تو اپنی جگہ ایک مستقل سبب ہے۔ اس لیے یہاں آپ نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کی جانب کوئی اشارہ فرمایا۔

۱۔ یہ جنگ ۷۰۲ھ بمقام مرج الصُّفَر دمشق قبلی میں پیش آئی تھی۔ جو جنگ شقحب کے نام سے مشہور ہے، اس جنگ میں تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد قتل ہوئی اور ایک جماعت گرفتار ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح ونصرت سے نوازا اور ظالموں کی جڑ کاٹ دی۔ اس معرکہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ خود جان وزبان سے شریک تھے۔ لوگوں کو ثابت قدم رہنے کا حکم دیتے، فتح ونصرت کا یقین دلاتے، کامیابی اور غنیمت کی خوشخبری دیتے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کی فوج کو عزت بخشی، تاتاریوں کو تنہا شکست دیدی۔ اور مسلمانوں کے سر پر فتح ونصرت کا تاج رکھا۔ بعض امراء نے جو معرکہ میں شریک تھے بیان کیا کہ شیخ الاسلام نے ان سے معرکہ کے دن مرج الصُّفَر میں جب کہ دونوں فوجیں آمنے سامنے آچکی تھیں کہا " جہاں موت کی جگہ ہے وہاں مجھے کھڑا کر دو " چنانچہ میں انھیں دشمنوں کے روبرو لایا۔ دشمن سیلاب کی طرح بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا " یہ ہے موت کا مقام اور یہ ہے دشمن " فوجی افسر کہتا ہے کہ شیخ نے یہاں نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی اور دیر تک لگائے رکھی۔ ہونٹ دیر تک ہلتے رہے۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر حملہ آور ہوتے، گھمسان کا رن پڑا۔ شیخ اور ہم ایک دوسرے سے اوجھل ہوگئے۔ اور پھر اسی وقت ان پر نگاہ پڑی جب ہماری فتح ونصرت کا نقارہ بجا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے " العقود الدریۃ " ص ۱۷۵ و ۱۹۴، لابن عبدالہادی۔

۲۔ مسلم (۱۹۱۷) عقبہ بن عامر جہنی سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے۔ آپ منبر سے فرما رہے تھے " واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ " دیکھو رمی (تیر اندازی) ہی قوت ہے، تیر اندازی ہی قوت ہے، تیر اندازی ہی قوت ہے۔

۳۔ مسلم (۱۱۲۰) فی الصیام : باب أجر المفطر فی السفر اذا تولی العمل۔ ابوداؤد (۲۴۰۶) فی الصوم : باب الصوم فی السفر۔ روایت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ۔

پس معلوم ہوا کہ تعلیل مذکورہ علت کے تحت کرنا دراصل اس اعتبار سے تھا کہ اس مخصوص حالت میں شارع علیہ السّلام نے اور باتوں کا لحاظ نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح مذکورہ طاقت جس کے ذریعہ دشمنوں کا مقابلہ ہوتا ہے اس کا ازالہ اور مجرد سفر کا اعتبار یہ معنی رکھتا ہے کہ شارع علیہ السّلام نے جس علت کا اعتبار فرمایا ہے اسے القط کر دیا گیا ہے۔

الغرض شارع علیہ السّلام کی بیان کردہ حکمت کا تقاضا ہے کہ اس موقع پر جہاد کے پیش نظر صوم نہ رکھنا مجرد سفر کے مقابلہ میں زیادہ اولیٰ ہے۔ ایسا کیوں نہیں جب کہ خود شارع علیہ السّلام نے علت کی جانب اشارہ فرمادیا ہے اور صراحت سے اس کی حکمت بیان فرمادی ہے۔ نیز حکم دیا ہے کہ اس کے باعث صوم نہ رکھیں۔ اس کی دلیل عیسیٰ بن یونس کی وہ حدیث بھی ہے جسے انھوں نے شعبہ سے، اور انھوں نے عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "میں نے حضرت عبداللہ ابن عمر کو فرماتے سنا ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن صحابہ سے ارشاد فرمایا "آج جنگ کا دن ہے۔ لہٰذا صوم سے نہ رہو"[1] ان کی متابعت سعید بن ربیع نے بھی بروایت شعبہ کی ہے۔

یہاں صوم نہ رکھنے کی علت آپ نے جنگ قرار دی ہے اور اسی بنا پر صوم نہ رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فطر (صوم نہ رکھنا) جنگ کی وجہ سے تھا۔ باقی جنگ وجدال سے الگ مجرد سفر کا مسئلہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں صوم نہ رکھنے کو اللہ کی ایک رخصت قرار دیا ہے۔ جو اس رخصت کو قبول کرے تو بہتر اور جو نہ قبول کرے وہ صوم بھی رکھ سکتا ہے۔ کوئی گناہ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے دو عظیم معرکوں میں بحالت سفر رہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں "ہم نے رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو جنگیں لڑیں، ایک بدر اور ایک فتح مکہ، ہم نے ان دونوں میں صوم نہیں رکھا"[2] دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ کی یہ روایت "عمرہ کے لیے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں نکلی، آپ نے صوم نہیں رکھا مگر میں صوم سے رہی، آپ نے قصر فرمایا مگر میں نے صلوٰۃ پوری ادا کی"[3] بالکل ہی غلط ہے، یہ غلط بیانی ان پر تھوپی گئی ہے۔ اس باب میں جتنے تبصرے کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح یہی ہے۔ باقی غلط بیانی خود حضرت عائشہ کی جانب سے تسلیم کرلی جائے تو ان کے اس بیان کا حشر بھی وہی ہے جو حضرت ابن عمر کے بیان کا ہے، ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ ادا کیا اس پر حضرت عائشہ نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابوعبدالرحمٰن پر اللہ رحم کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عمرہ کیا وہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے کبھی بھی رجب میں عمرہ نہیں کیا[4] اسی طرح رمضان میں بھی آپ نے کبھی عمرہ نہیں کیا۔ آپ کے سب عمرے ذی قعدہ میں پیش آئے۔

---

[1] اس کے راوی سب ثقہ ہیں۔

[2] ترمذی (۷۱۴) فی الصوم : باب ماجاء فی الرخصۃ للمحارب فی الافطار۔ مسند احمد (۱۴۰) سند میں ابن لہیعہ سیئ الحفظ ہیں۔ مگر ابوسعید خدری کی مذکورہ بالا حدیث اس کی شاہد ہے، ترمذی فرماتے ہیں "حضرت عمر بن خطاب سے اسی طرح روایت ہے جس میں آپ نے دشمن سے مقابلہ کے وقت صوم نہ رکھنے کی رخصت دی ہے۔ یہی بعض اہل علم کا بھی مسلک ہے۔

[3] دارقطنی ۲/۱۸۸۔ سند صحیح ہے۔

[4] مسلم (۱۲۵۵) (۲۲۰) فی الحج : باب بیان عدد عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وزمانھن۔

صوم نہ رکھنے کے لیے مسافت کی تحدید آپ کی سنت نہ تھی

صوم نہ رکھنے کے لیے مسافت کی تحدید آپ کی سنت نہ تھی۔ اس باب میں آپ سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔ تین میل کی مسافت پر حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی نے صوم نہیں رکھا اور جن لوگوں نے صوم رکھ لیا تھا ان کے بارے میں فرمایا "ان حضرات نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کیا"۔[1]

صحابہ جب سفر شروع کرتے تو مقام سفر ہی سے صوم نہ رکھتے۔ وہ اس بات کا لحاظ نہ کرتے تھے کہ گھروں سے آگے جاکر افطار کریں۔ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کا اسوہ یہی ہے۔ چنانچہ عبید بن جبر کا ارشاد ہے، میں رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو بصرہ غفاری کے ساتھ فسطاط سے ایک کشتی پر سوار ہوا، آپ نے آگے بڑھنے سے پہلے ہی توشہ دان منگایا، فرمایا قریب آؤ، میں نے کہا "گھر ابھی نظر آرہے ہیں" فرمایا "کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کروگے؟" اس کی روایت ابو داؤد اور احمد نے کی ہے۔[2] احمد کی حدیث یہ ہے "میں ابو بصرہ کے ساتھ فسطاط سے اسکندریہ کے سفر پر ایک کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہوا، فسطاط کے بندرگاہ سے قریب ہوتے ہی انھوں نے توشہ دان منگایا۔ وہ حاضر کر دیا گیا تو آپ نے مجھے کھانے پر مدعو کیا اور یہ واقعہ رمضان کا ہے۔ میں نے کہا "ابو بصرہ! بھئی ابھی ہمارے گھر تو نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے"۔ فرمایا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کروگے؟" میں نے کہا "نہیں" فرمایا "تو پھر کھاؤ" چنانچہ ہم منزل تک کھاتے پیتے رہے۔

محمد بن کعب فرماتے ہیں: میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کے یہاں آیا وہ اس وقت سفر کا ارادہ کر رہے تھے۔ سواری کسی جاچکی تھی اور آپ سفر کے کپڑے پہن چکے تھے۔ کھانا منگایا اور کھایا۔ میں نے کہا "کیا یہ سنت ہے؟" فرمایا "سنت ہے" پھر سوار ہوئے۔[3] ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ دارقطنی میں اتنا اور اضافہ ہے "آپ نے کھایا آفتاب اس وقت غروب ہونے کے قریب تھا"۔

یہ تمام آثار صریح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ رمضان کے دنوں میں جس وقت بھی سفر درپیش ہو صوم توڑ دینے کی اجازت ہے۔[4]

۱۔ ابوداؤد (۲۴۱۳) فی الصوم: باب قدر مسیرة ما یفطر فیہ۔ سند میں دحیہ سے روایت کرنے والے منصور بن سعید کلبی مجہول ہیں۔

۲۔ ابوداؤد (۲۴۱۲) فی الصوم: باب متی یفطر المسافر اذا خرج۔ مسند احمد ۶/ ۳۹۸۔ بیہقی ۴/ ۲۴۶۔ سند میں کلیب بن ذہل حضرمی مجہول ہیں۔ باقی رجال ثقہ ہیں۔ حضرت انس کی آنے والی روایت اس کی شاہد ہے۔ جس سے اسے تقویت ملتی ہے۔

۳۔ ترمذی (۷۹۹) و (۸۰۰) فی الصوم: باب من اکل ثم خرج یرید سفرًا۔ دارقطنی ۲/ ۱۸۷-۱۸۸۔ بیہقی ۴/ ۲۴۶۔ سند قوی ہے۔ ترمذی اور ان کے علاوہ بہتوں نے اسے حسن کہا ہے۔ ابو بصرہ کی مذکورہ بالا حدیث نیز ابوداؤد اور مسند احمد میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کی حدیث بھی اس کی شاہد ہے۔ لہٰذا شواہد کے اعتبار سے حسن ہے۔

۴۔ مسائل اسحاق بن منصور مروزی، ورق ۳۶/ ۲ میں یہ عبارت ہے۔ میں نے (امام احمد سے) پوچھا "مسافر کب سے صوم نہ رکھے؟" فرمایا "جب گھر سے نکلے اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں بلکہ جس وقت پیر رکھے اسی وقت صوم توڑ دے جیسا کہ حضرت انس بن مالک کا عمل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی یہی ہے۔ شرح السنۃ للبغوی جو ہماری تحقیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۶/ ۳۱۲ میں آیا ہے "ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مقیم صوم سے ہو پھر سفر کا ارادہ کرے تو اس کے لیے صوم توڑ دینا جائز ہے۔ یہ شعبی کا قول ہے اور یہی امام احمد کا بھی مذہب ہے۔

بحالتِ جنابت صوم اور بحالتِ صوم بیوی کا بوسہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ بیوی سے مجامعت کے بعد صلوٰۃ فجر کا وقت ہو جاتا پھر بھی جنبی ہی رہتے بعد از طلوع فجر غسل فرماتے اور صوم رکھتے[1] رمضان میں بحالتِ صوم بیوی کا بوسہ لیتے[2] اور صائم کے بوسہ کو کلی سے تشبیہ دیتے تھے[3]

بروایت مصدع بن یحییٰ ابو داؤد میں حضرت عائشہ کی روایت ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ صوم ان کا بوسہ لیتے اور زبان چوستے تھے[4]" اس روایت کو مختلف فیہ قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مصدع کے باعث ایک گروہ نے ضعیف کہا ہے، مصدع کی شخصیت مختلف فیہ ہے۔ سعدی فرماتے ہیں۔ وہ گمراہ اور راہ سے ہٹا ہوا انسان تھا، ایک گروہ نے اسے عمدہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مصدع ثقہ اور صدوق تھے۔ صحیح مسلم میں ان سے روایت آئی ہے۔ حدیث کی سند میں محمد بن دینار طاحی بصری بھی مختلف فیہ ہے۔ یحییٰ فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ ایک روایت کے مطابق فرماتے ہیں، ان کی روایت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرے لوگ صدوق کہتے ہیں۔ ابن عدی فرماتے ہیں "آپ ان کی زبان چوستے تھے"۔ یہ صرف محمد بن دینار کا قول ہے۔ یہی اس قول کے راوی ہیں۔ سند میں سعد بن اوس مختلف فیہ ہے۔ یحییٰ فرماتے ہیں۔ بصری ضعیف ہے اور دوسرے انھیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کا ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے۔ احمد اور ابن ماجہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیز میمونہ کی روایت وارد ہے۔ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کوئی بیوی کا بوسہ لے اور دونو بحالتِ صوم ہوں تو کیسا ہے"؟ آپ نے فرمایا "مرد کا صوم ٹوٹ گیا"[5] یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ سند میں ابو یزید ضنی نے میمونہ سے اس کی روایت کی ہے اور یہ سعد کی بیٹی ہیں۔ دار قطنی فرماتے ہیں ابو یزید ضنی معروف شخص نہیں ہے۔ یہ حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ بخاری فرماتے ہیں میں یہ حدیث بیان نہیں کر سکتا یہ منکر حدیث ہے۔ ابو یزید ایک مجہول شخص ہے۔

---

[1]۔ مؤطا مالک ۱/۲۹۱، بخاری ۴/۱۲۳، مسلم (۱۱۰۹) (۷۸) حدیث حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔

[2]۔ مؤطا مالک ۱/۲۹۲، بخاری ۴/۱۳۰، ۱۳۱، مسلم (۱۱۰۶) فی الصیام : باب بیان ان القبلۃ فی الصوم لیست بمحرمۃ علی من لم تحرک شھوتہ۔ روایت حضرت عائشہ اس میں وارد ہے کہ "وہ اپنی خواہش پر تم سے زیادہ کنٹرول رکھتے تھے"۔ ترمذی فرماتے ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ صائم کو ضبط ہو تو بیوی کو بوسہ دے سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ تاکہ صوم اس کا محفوظ رہ سکے۔ یہ سفیان، شافعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ حافظ الفتح ۴/۱۳۱ میں رقمطراز ہیں۔ صائم مباشرت کرے، بوسہ لے یا دیکھے، اور پھر انزال ہو جائے یا مذی اتر آئے۔ اس سے صوم کے ٹوٹنے میں اختلاف ہے اہل کوفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دیکھنے کے علاوہ میں انزال ہوا ہو تو قضاء کرے اور مذی میں کوئی قضاء نہیں۔ امام مالک اور اسحاق فرماتے ہیں کہ صوم کی قضاء کرے گا اور کفارہ ادا کرے گا۔ مذی میں صرف قضاء ضروری ہوگی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں بوسہ کے بعد انزال ہو جائے تو بلا اختلاف صوم ٹوٹ جاتا ہے۔

[3]۔ ابو داؤد (۲۳۸۵) روایت حضرت عمر فرماتے ہیں "نشاط میں آکر میں نے بحالت صوم بوسہ لے لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا" رسول اللہ! آج میں نے ایک بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ صوم کی حالت میں بوسہ لے لیا ہے۔ آپ نے فرمایا بحالت صوم پانی سے کلی کر لینا کیسا ہے؟ میں نے کہا کوئی حرج نہیں، آپ نے فرمایا پھر چھوڑو" سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۹۹۹)۔ ابن حبان (۹۰۵) اور حاکم ۱/۴۳۱ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[4]۔ ابو داؤد (۲۳۸۶)۔ ابن خزیمہ (۲۰۰۳) سند ضعیف ہے۔ اس میں محمد بن دینار اور سعد بن اوس ہیں۔ دونوں کے بارے میں کلام ہے۔ ابو داؤد اور ابن حجر وغیرہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

[5]۔ احمد ۶/۴۶۳، وابن ماجہ (۱۶۸۶) سند ضعیف ہے۔ جیسا کہ مؤلف نے ذکر کیا ہے۔

جوان اور بوڑھے میں تفریق کرنا بھی آپ سے ثابت نہیں۔ اس باب میں کسی طرح کے ثبوت کا سراغ نہیں ملتا سب سے عمدہ اس بارے میں ابوداؤد کی حدیث ہے جسے انھوں نے نصر بن علی سے اور انھوں نے ابواحمد زبیری سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اسرائیل نے بیان کیا، وہ ابوالعنبس سے، وہ اغر سے، وہ ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ صائم کے لیے مباشرت کرنا کیسا ہے؟ تو آپ نے اس کے لیے رخصت بیان کی۔ ایک اور شخص آیا اور اس نے بھی یہی سوال کیا تو آپ نے اسے منع کیا۔ جسے آپ نے رخصت دی تھی وہ بوڑھا تھا۔ اور جسے روکا وہ جوان تھا[1] گو بخاری، مسلم اور بقیہ چھ ائمہ نے اسرائیل سے استدلال کیا ہے۔ مگر اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسرائیل اور اغر کے درمیان ابوالعنبس عدوی کوئی آیا ہے اس کا نام حارث بن عبید ہے تمام ائمہ نے اس کے باب میں سکوت اختیار کیا ہے[2]

بھول کر کھاپی لینا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ بھول کر کھاپی لینے سے قضا نہیں۔ کھلایا پلایا اللہ سبحانہ نے، انتساب بندے کی جانب کیوں؟ پھر کیوں اس کا صوم ٹوٹے، ٹوٹتا ہے تو جان بوجھ کر کھاپی لینے سے، بھول کر کھاپی لینا ایسا ہی ہے جیسے خواب میں اپنے آپ کو کھاتا پیتا دیکھے، خوابیدہ یا بھول کر کوئی کام کرنے والا انسان مکلف نہیں ہوا کرتا۔

صوم کے نواقض

صائم کا صوم جن چیزوں سے ٹوٹتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ کھانا، پینا، حجامت[3] (سینگی لگوانا)، قی[4] قرآن کے مطابق کھانے

---

[1] ابوداؤد (۲۳۸۷) فی الصوم، باب کراھیۃ القبلۃ للشاب، سند حسن ہے۔ مؤطا مالک ۱/۲۹۳ میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ "آپ سے صائم کے بوسہ کے بارے میں سوال ہوا تو بوڑھے کو رخصت دی اور جوان کے لیے مکروہ کہا"۔ سند صحیح ہے۔ مصنف عبدالرزاق (۸۴۱۸) میں بسند معمر عن عاصم بن سلیمان عن ابی مجلز یہ روایت ہے کہ ایک شخص (بوڑھا) حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور بحالت صوم بوسہ کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے اسے اجازت دی۔ پھر ایک نوجوان آیا تو اسے روک دیا"۔ اس کے راوی سب ثقہ ہیں۔ طحاوی ۱/۳۴۶ نے بسند حریث بن عمرو شعبی عن مسروق عن عائشہ روایت کی ہے۔ جس میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں، بحالت صوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بوسہ بھی دیا اور مباشرت (چمٹایا) بھی فرمائی، لیکن تمھارے بارے میں یہ کہوں گی کہ بوڑھے کمزور کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[2] مؤلف کا خیال محل نظر ہے، کسی امام جرح و تعدیل نے انھیں مطعون نہیں کیا ہے اور ابن حبان نے انھیں ثقہ بھی کہا ہے۔ شعبہ، مسعر، اسرائیل اور ابوعوانہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں، لہٰذا وہ حسن الحدیث ہیں۔

[3] شافعی ۱/۲۵۷۔ ابوداؤد (۲۳۶۹)۔ دارمی ۲/۱۴۔ عبدالرزاق (۷۵۲۰)۔ ابن ماجہ (۱۶۸۱)۔ حاکم ۱/۴۲۸۔ طحاوی ص ۳۴۹۔ بیہقی ۴/۲۶۵۔ روایت شداد بن اوس فرماتے ہیں "فتح مکہ کے زمانہ میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ نے ۱۸ رمضان کو ایک شخص کو پچھنے لگواتے دیکھا۔ آپ نے فرمایا اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا۔ پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں کا صوم نہیں رہتا"۔ سند صحیح ہے۔ کئی ائمہ حدیث نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس باب میں عبدالرزاق (۷۵۲۳)۔ ترمذی (۷۷۴) اور بیہقی ۴/۲۶۵ میں رافع بن خدیج سے بھی ایک روایت آئی ہے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ ابن حبان (۹۰۲) اور حاکم ۱/۴۲۸ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابوداؤد (۲۳۶۷)۔ ابن ماجہ (۱۶۸۰)۔ دارمی ۲/۱۴، ۱۵۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر، نیز حاشیہ "۴")

پینے کی طرح جماع سے بھی صوم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سرمہ لگانے کے بارے میں صحت کے
ساتھ کوئی چیز آپ سے ثابت نہیں۔

بحالتِ صوم مسواک[1] کرنا آپ سے ثابت ہے۔

امام احمد نے روایت کی ہے کہ بحالتِ صوم آپ سر پر پانی انڈیلتے تھے[2] بحالتِ صوم کلی بھی کرتے تھے، ناک میں
پانی بھی چڑھاتے تھے۔

بایں ہمہ صائم کو ناک میں شدت سے پانی چڑھانے سے منع فرمایا ہے[3] ثابت نہیں ہے کہ بحالتِ صوم آپ نے پ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) طحاوی ۱/۳۴۹۔ ابن جارود ص ۱۹۸۔ بیہقی ۴/۲۶۵۔ اور عبدالرزاق (۷۵۲۳) میں ثوبان سے روایت
ہے۔ ابن حبان (۸۹۹)۔ حاکم ۱/۴۲۷۔ بخاری، علی بن مدینی اور نووی نے اسے صحیح کہا ہے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی منسوخی
ثابت ہے۔ الفتح ۴/۱۵۵، میں حافظ نے ابن حزم کا قول نقل کیا ہے۔ حدیث "افطر الحاجم والمحجوم" پچھنہ لگانے اور لگوانے
والے دونوں کا صوم نہیں رہا۔ بلاشبہ صحیح ہے۔ مگر حضرت ابو سعید خدری کی ایک روایت ملتی ہے جس میں آپ نے اس کی
رخصت دی ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ لہٰذا اس پر عمل ضروری ہے۔ کیونکہ رخصت عزیمت کے بعد ہی آتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حجامت
سے صوم کا ٹوٹ جانا خواہ لگانے والا ہو یا لگوانے والا منسوخ ہے۔ مذکورہ بالا حدیث کی روایت نسائی، ابن خزیمہ (۱۹۶۷) و (۱۹۶۹)
اور دارقطنی ص ۲۳۹ نے کی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ سند صحیح ہے۔ دارقطنی ص ۲۳۹ میں حضرت انس کی ایک روایت ا
کی شاہد بھی ہے۔ جس کا معنی حسب ذیل ہے۔ "ابتدا میں صائم کے لیے حجامت کا مکروہ ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ جعفر بن ابی طالب
بحالتِ صوم پچھنہ لگوا رہے تھے۔ اس کے تمام راوی معتبر اور بخاری کے رجال ہیں۔ البتہ متن میں ایک غیر معروف بات آئی ہے۔ کیونکہ
کہا جا رہا ہے کہ ایسا فتح مکہ کے زمانہ میں واقع ہوا تھا مگر حضرت جعفر کی شہادت اس سے پہلے ہو چکی تھی، اس سلسلہ میں سب سے عمدہ
روایت وہ ہے جو مصنف عبدالرزاق (۷۵۳۵) اور ابو داؤد (۲۳۷۴) میں بسند عبدالرحمٰن بن عابس آئی ہے۔ اس میں
عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ صائم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنہ لگوانے
اور صوم وصال سے منع فرمایا ہے اس پر حرام نہیں کیا ہے۔ یہ بربنائے شفقت و رحمت تھا" اس کی سند صحیح ہے۔ صحابی کا نام نامعلوم
ہونے سے کوئی نقصان نہیں۔

۴۔ عمداً قے کرنے سے صوم ٹوٹتا ہے، باقی خود بخود قے آگئی ہو تو اس سے صوم نہیں ٹوٹتا۔ ترمذی (۷۲۰)۔ ابو داؤد (۲۳۸۰)۔ ابن ماجہ
(۱۶۷۶)۔ دارقطنی ص ۲۴۰ میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جسے خود بخود قے آگئی ہو اس
پر قضا نہیں ہے۔ اور جو عمداً قے کرے وہ قضا کرے، اس کی سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۹۶۰) و (۱۹۶۱)۔ ابن حبان (۹۰۷)
حاکم ۱/۴۲۷ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

---

[1] ترمذی (۷۲۵)۔ احمد ۳/۴۴۵۔ ابو داؤد (۲۳۶۴)۔ ابن خزیمہ (۲۰۰۷) روایت عامر بن ربیعہ سے فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کو بے شمار بار بحالتِ صوم مسواک کرتے دیکھا ہے۔ سند میں عاصم بن عبیداللہ ضعیف ہیں۔ بخاری، ابن معین، ذہلی اور بہتیرو
نے اسے ضعیف کہا ہے۔ مگر اکثر اہلِ علم کے نزدیک عمل اسی کے مطابق ہے۔ دن کا آغاز ہو یا آخر کسی وقت بھی مسواک کرنے میں
وہ کوئی حرج تصور نہیں کرتے۔ صحیح ابن خزیمہ ۳/۲۴۷ میں آیا ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا "اگر امت پر گراں نہ سمجھتا تو ہر صلوٰۃ
کے وقت انھیں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔" اور صائم وبغیر صائم کے درمیان فرق نہ کرنا صاف دلیل اس بات کی ہے کہ ہر صلوٰۃ کے وقت
مسواک کرنا جس طرح صوم نہ رکھنے والے کے لیے فضیلت ہے اسی طرح صائم کے لیے بھی ہے۔

[2] احمد ۵/۳۷۶ و ۳۸۰ و ۴۰۸ و ۴۳۰۔ ابو داؤد (۲۳۶۵)۔ روایت ایک صحابی رسول کی ہے کہ اس نے پیاس یا گرمی کے باعث
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالتِ صوم سر پر پانی انڈیلتے دیکھا" سند صحیح ہے۔

[3] شافعی ۱/۳۰، ۳۱، ابو داؤد (۱۴۲) و (۱۴۳)۔ احمد ۴/۳۳۔ ابن ماجہ (۴۰۷)۔ نسائی ۱/۶۶۔ روایت لقیط بن صبرہ، ارشاد ہے میں
نے کہا "رسول اللہ! مجھے وضو کے بارے میں بتائیں فرمایا "خوب اچھی طرح کرو، انگلیوں کا خلال کرو، اچھی طرح ناک میں پانی
چڑھاؤ، بشرطیکہ تم صوم کی حالت میں نہ ہو" اس کی سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۱۵۰)۔ ابن حبان (۱۵۹) اور حاکم ۱/۱۴۷، ۱۴۸
ذہبی، ابن قطان، نووی اور ابن حجر نے اسے صحیح کہا ہے۔

لگواتے۔ یہ امام احمد کا قول ہے۔ بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی روایت بھی کی ہے۔ احمد فرماتے ہیں ہم سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا کہ حجامت کے بارے میں حکم نے مقسم سے سعید کی وہ حدیث نہیں سنی۔ جس میں یوں وارد ہے کہ یحییٰ نے حکم سے، انھوں نے مقسم سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے"[1]۔

مہنا فرماتے ہیں میں نے حبیب بن شہید کی حدیث کے بارے میں امام احمد سے دریافت کیا جسے وہ میمون بن مہران سے اور وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ تو انھوں نے فرمایا یہ صحیح نہیں ہے۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے میمون بن مہران کی جو حدیثیں مروی ہیں ان کی کل تعداد پندرہ سے آگے نہیں پہنچتی۔

اثرم فرماتے ہیں میں نے ابوعبداللہ کو یہ حدیث ضعیف کہتے سنا ہے۔ مہنا فرماتے ہیں کہ میں نے قبیصہ کی حدیث کے بارے میں احمد سے دریافت کیا جسے وہ سفیان سے، وہ حماد سے، وہ سعید بن جبیر سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے، تو فرمایا یہ قبیصہ کی جانب سے غلط بیانی ہے۔ قبیصہ بن عقبہ کے متعلق میں نے یحییٰ سے پوچھا تو فرمایا سچا آدمی ہے۔ جس حدیث کو انھوں نے سفیان سے، انھوں نے سعید بن جبیر سے بیان کی ہے وہ ان کی غلط بیانی ہے۔ احمد فرماتے ہیں اشجعی کی کتاب میں وارد ہے، وہ سعید بن جبیر سے مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ احرام کی حالت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے۔ اس میں صوم کی حالت کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا ہے۔

مہنا فرماتے ہیں۔ میں نے احمد سے حضرت ابن عباس کی روایت کے بارے میں پوچھا جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم اور احرام کی حالت میں پچھنہ لگوایا۔ تو فرمایا اس میں "صائم" نہیں بلکہ صرف "محرم" (احرام کی حالت میں) کا لفظ آیا ہے۔ اس کی روایت سفیان نے عمرو بن دینار سے، انھوں نے طاؤس سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس سے کی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ احرام سر میں پچھنہ لگوایا۔ عبدالرزاق نے اس کی روایت معمر سے، انھوں نے ابن خثیم سے، انھوں نے سعید بن جبیر سے، انھوں نے ابن عباس سے کی ہے کہ احرام کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنہ لگوایا۔ نیز روح نے زکریا بن اسحاق سے، انھوں نے عمرو بن دینار سے، انھوں نے عطاء اور طاؤس سے اور ان دونوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ احرام کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنہ لگایا۔ یہ تمام حضرات ابن عباس کے شاگرد ہیں مگر حالتِ صوم کا ذکر نہیں کرتے۔

حنبل فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوعبداللہ نے، انھوں نے کہا ہم سے وکیع نے بیان کیا، وہ یاسین زیات سے، وہ ایک شخص سے، وہ حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں اپنے اس ارشاد "افطر الحاجم

---

[1] بخاری ۴/۱۵۵ فی الصوم: باب الحجامۃ والقئی۔ روایت وھیب عن ایوب عن عکرمۃ عن ابن عباس۔ حافظ فرماتے ہیں بروایت ایوب عبدالوارث نے بھی موصولاً ان کی متابعت کی ہے۔ جیسا کہ طب کے بیان میں باب ای ساعۃ یحتجم کے اندر آئے گا۔ ابن علیہ اور معمر نے اس کی روایت عن ایوب عن عکرمہ مرسلاً کی ہے۔ موصول اور مرسل ہونے کے سلسلہ میں حماد بن زید پر اختلاف ہے۔ نسائی نے اس کی وضاحت کی ہے۔ مہنا فرماتے ہیں "میں نے احمد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا "اس میں "صائم" کا لفظ نہیں ہے۔ صرف "وھو محرم" کے الفاظ ہیں، اس کے بعد اسے مختلف طرق سے عبداللہ بن عباس کی سند سے اسے پیش کیا۔ مگر اس میں ایوب کی یہ سند نہیں ہے۔ مگر حدیث بلاشبہ صحیح ہے

والمحجوم" کے باوجود پچھنہ لگوایا" ابوعبداللہ فرماتے ہیں ایک شخص سے مراد ابان بن ابی عیاش ہیں جو ناقابل احتجاج ہیں[1]

اثرم فرماتے ہیں۔ میں نے ابوعبداللہ سے کہا کہ محمد بن معاویہ نیشاپوری ابوعوانہ سے، وہ سدی سے، وہ حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم کی حالت میں پچھنہ لگوایا" تو انھوں نے اس کا انکار کیا۔ پھر پوچھا: کیا سدی حضرت انس سے روایت کرتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ احمد فرماتے ہیں، آپ کا ارشاد "افطر الحاجم والمحجوم" ثابت نہیں ہے۔

اسحاق فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت پانچ سندوں سے ثابت ہے۔ غرض یہ کہ صوم کی حالت میں آپ کا پچھنہ لگوانا ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ آپ نے صائم کو دن کے شروع میں یا آخر میں مسواک کرنے سے روکا ہے۔ بلکہ روایت اس کے برعکس ہے۔

آپ سے روایت ہے کہ "صائم کے بہترین معمولات میں مسواک کرنا ہے" اس کی روایت ابن ماجہ نے مجالد سے کی ہے۔ مگر اس کے اندر ضعف ہے[2]

صوم کی حالت میں سرمہ لگانا

روایت ہے کہ صوم کی حالت میں آپ نے سرمہ لگایا۔ رمضان کے مہینہ میں ایک بار آپ صحابہ کے پاس تشریف لائے اس وقت آپ کی آنکھیں سرمہ سے پر تھیں۔ مگر یہ ثابت نہیں ہے۔ نیز روایت ہے کہ سرمہ کے بارے میں آپ نے فرمایا "صائم کو اس سے بچنا چاہیے"[3]

مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں یحییٰ بن معین نے مجھ کو بتایا کہ یہ حدیث منکر ہے۔

نفلی صوم کے بارے میں اسوۂ نبوی

آپ نفلی صوم رکھتے تھے حتیٰ کہ خیال ہوتا کہ آپ کبھی صوم نہ توڑیں گے۔ اور نہیں رکھتے تو خیال ہوتا کہ اب کبھی نہ رکھیں گے۔ رمضان کے علاوہ کوئی اور مہینہ مکمل صوم سے نہیں رہے۔ شعبان کے مہینہ میں جس قدر صوم رکھا ہے اتنا اور کسی مہینہ میں نہیں، رکھا[4]

---

[1] تقریب میں ابان بن ابی عیاش فیروز بصری کو متروک کہا گیا ہے اور یاسین زیات جو ابان سے روایت کرتے ہیں کہ بخاری کے مطابق منکر الحدیث اور نسائی کے مطابق متروک ہیں۔ ابن حبان فرماتے ہیں "وہ موضوعات روایات کرتے ہیں"۔

[2] ابن ماجہ (۱۶۷۷) فی الصیام : باب ماجاء فی السواك والكحل للصائم۔ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[3] ابوداؤد (۲۳۷۷) فی الصوم : باب فی الكحل عند النوم للصائم۔ حدیث ہوذہ۔ سند میں عبدالرحمٰن بن نعمان بن معبد بن ہوذہ ہیں جن کے باب میں کلام ہے۔ ان کے والد مجہول ہیں۔ حدیث "صوم کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرمہ لگایا" کی تخریج ابن ماجہ (۱۶۷۸) نے حضرت عائشہ سے کی ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

[4] مؤطا مالک ۱/۳۰۹۔ بخاری ۴/۱۸۶۔ مسلم (۱۱۵۶) (۱۷۵) حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔ مسلم کی ایک روایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کوئی مہینہ آپ کا صوم سے خالی نہ گذرتا۔
مسلسل تین مہینے جیسا کہ بعض حضرات کا دستور ہے آپ صوم نہیں رکھتے تھے۔ رجب کا صوم کبھی نہ رکھا۔ اور نہ اس کے اندر صوم رکھنا مستحب تصور فرمایا، بلکہ آپ سے اس مہینہ میں صوم رکھنے کی ممانعت وارد ہے۔ ابن ماجہ نے اس کا ذکر کیا ہے[1]

دوشنبہ اور جمعرات کا صوم آپ کا مطلوب ہوتا[2]
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر وحضر کی حالت میں بھی ایام بیض (ہر ماہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ) کے صوم نہیں چھوٹتے تھے[3] نسائی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان دنوں میں صوم رکھنے کی آپ ترغیب دیتے تھے[4]
ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینہ کے شروع میں تین دن صوم رکھتے تھے۔ ابوداؤد اور نسائی نے اس[5] کا ذکر کیا ہے۔
حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ آپ اس بات کا لحاظ نہ کرتے کہ مہینہ کے کس حصہ میں ان دنوں کا صوم رکھیں۔ مسلم نے اس کی روایت کی ہے[6] مذکورہ بالا آثار کے اندر کوئی تناقض وتضاد نہیں ہے۔
عشرہ ذی الحجہ کا صوم البتہ مختلف فیہ ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ آپ کو کبھی اس عشرہ میں صوم رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مسلم نے اس کی روایت کی ہے[7]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میں آیا ہے جو (۱۱۵۶) (۱۷۶) میں درج ہے کہ میں نے آپ کو ماہ شعبان کے مقابلہ میں اور کسی ماہ زیادہ صوم رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چند دنوں کو چھوڑ کر پورا شعبان صوم سے گذرتا۔ بلکہ پورا شعبان صوم رکھتے تھے۔

[1] (۱۷۴۳) فی الصیام: باب صیام اشھر الحرام۔ سند میں داؤد بن عطاء بالاتفاق ضعیف ہیں۔

[2] ترمذی (۷۴۵)۔ نسائی ۴/۲۰۲۔ ابن ماجہ (۱۷۳۹) روایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ سند صحیح ہے۔ اس باب میں ترمذی (۷۴۷) کے اندر ایک روایت ابو ہریرہ سے بھی ہے۔ نسائی ۴/۲۰۱، اور ابن خزیمہ (۲۱۱۹) میں اسامہ بن زید کی ایک حدیث اس کی شاہد ہے۔ جس سے یہ صحیح کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

[3] نسائی ۴/۱۹۸ فی الصوم: باب صوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سند میں یعقوب بن عبداللہ القمی ضعیف ہیں۔ اسی طرح ان سے روایت کرنے والے جعفر بن مغیرہ القمی بھی ضعیف ہیں۔

[4] احمد ۵/۱۵۲۔ نسائی ۴/۲۲۲ روایت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو مہینہ میں تین دن صوم رکھنا چاہے وہ تین دن بیض کے رکھے۔ سند حسن ہے۔ ابن حبان (۹۴۳) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد ۵/۱۵۰، اور نسائی ۴/۲۲۳ میں بسند سفیان روایت ہے کہ انھوں نے کہا ہم سے دو شخصوں محمد اور حکیم نے بیان کیا وہ موسیٰ بن طلحہ سے، وہ ابن حوتکیہ سے، وہ ابوذر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخوں کا صوم رکھنے کا حکم دیا۔ ابن خزیمہ (۲۱۲۸) نے ایک اور روایت سے بسند حسن اس کی تخریج کی ہے۔ ترمذی (۷۶۲) نے ابوذر کی روایت بسند قوی پیش کی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جس نے ہر ماہ تین دن صوم رکھا تو یہی صیام دہر ہے۔ اس کی تصدیق کے طور پر اللہ نے اپنی کتاب کے اندر ذیل کی آیت نازل فرمائی" من جاء بالحسنة فله عشر امثالها" (الانعام: ۱۶۰) ایک دن برابر دس دن کے ہے۔ اس باب میں ایک روایت بخاری ۴/۱۹۷، اور مسلم (۷۲۱) میں حضرت ابو ہریرہ سے آئی ہے کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کی وصیت کی ہے۔ ان میں ہر ماہ تین صوم رکھنے کی ایک وصیت ہے، صحیح مسلم (۷۲۲) میں یہ روایت ابو درداء سے بھی آئی ہے۔

[5] ابوداود (۲۴۵۰)۔ نسائی ۴/۲۰۴۔ ترمذی (۷۴۲) سند حسن ہے۔

[6] (۱۱۶۰) فی الصیام: باب استحباب صیام ثلاثة ایام من کل شهر۔ ابن خزیمہ (۲۱۳۰)۔

[7] (۱۱۷۶) فی الاعتکاف: باب صوم عشر ذی الحجة۔

حضرت حفصہ فرماتی ہیں۔ چار معمولات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترک نہیں فرماتے تھے۔ ایک یوم عاشوراء کا صوم دوسرے عشرہ ذی الحجہ کا صوم، تیسرے ہر ماہ تین دنوں کا صوم، چوتھے فجر کی دونوں رکعتیں[1]۔ امام احمد نے اس کی روایت کی ہے۔

امام احمد نے بعض ازواج مطہرات سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ۹ ذی الحجہ، عاشوراء، ہر مہینہ میں تین دنوں یا دو دنوں، جمعرات، اور ایک روایت کے مطابق دونوں جمعراتوں کا صوم رکھتے تھے۔ اگر حدیث ثابت ہے تو بہرحال مثبت کو منفی پر فوقیت حاصل ہے۔

شوال کے چھ صوم کے باب میں آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے: "رمضان کے ساتھ یہ صوم مل کر صیام دہر ہو جاتے ہیں[3]"۔
یوم عاشوراء کے صوم کا جہاں تک تعلق ہے۔ آپ کو تمام دنوں کے مقابلہ میں اس کی طلب زیادہ رہتی تھی۔ چنانچہ جب مدینہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ اس دن صوم رکھتے اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہم ہیں" چنانچہ آپ نے اس دن صوم رکھا۔ اور اس کا حکم دیا۔ یہ رمضان کی فرضیت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب رمضان کے صوم فرض ہوئے تو آپ نے فرمایا "اب جو چاہے یہ صوم رکھے جو چاہے نہ رکھے[4]"۔

بعض حضرات کو یہاں ایک مشکل پیش آگئی ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مدینہ ماہ ربیع الاوّل میں تشریف لائے، پھر حضرت ابن عباس کیسے فرماتے ہیں کہ آپ مدینہ تشریف لائے تو یہود کو عاشوراء کا صوم رکھتے پایا؟
یہاں ایک اشکال اور ہے۔ وہ یہ کہ صحیحین میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں "زمانہ جاہلیت میں قریش عاشوراء کا صوم رکھتے تھے اور نبی علیہ السلام نے بھی رکھا۔ جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت بھی رکھا۔ اور اس کا حکم دیا۔ جب ماہ رمضان کا صوم فرض ہوا تو فرمایا "جو چاہے اس دن صوم رکھے جو چاہے نہ رکھے[5]"۔

ایک اور اشکال ہے۔ صحیحین کی روایت ہے کہ اشعث بن قیس حضرت عبداللہ بن مسعود کے یہاں آئے، اس وقت آپ کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "ابو محمد! آؤ قریب آؤ، کھانا کھاؤ" بولے "کیا آج عاشوراء کا دن نہیں؟" فرمایا "جانتے ہو عاشوراء کا دن کیا ہے؟" بولے کیا ہے؟" فرمایا "رمضان کی فرضیت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] - احمد ۶/۲۸۷۔ روایت ابو اسحاق اشجعی کوفی۔ یہ عمرو بن قیس ملائی سے، یہ حر بن صیاح سے، یہ ہنیدہ بن خالد خزاعی سے، یہ حضرت حفصہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابو اسحاق کوفی اشجعی مجہول ہیں اور باقی راوی ثقہ ہیں۔

[2] - احمد ۶/۲۸۸۔ ابوداؤد (۲۴۳۷)۔ نسائی ۴/۲۰۵ بسند حر ابن صیاح۔ یہ ہنیدہ بن خالد سے، وہ اپنی بیوی سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی بیوی فرماتی ہیں "مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں نے بیان کیا"۔

[3] - مسلم (۱۱۶۴) فی الصیام: باب استحباب صوم ستۃ ایام من شوال اتباعًا لرمضان۔ احمد ۵/۴۱۷ و ۴۱۹۔ ابوداؤد (۲۴۳۳)۔ ترمذی (۷۵۹)۔ ابن ماجہ (۱۷۱۶) روایت سعد بن سعید وہ عمر بن ثابت انصاری سے، وہ ابو ایوب سے کرتے ہیں۔ سعد بن سعید برادر یحییٰ بن سعید سوء حفظ کے باعث ضعیف ہیں۔ مگر ابوداؤد دارمی ۲/۲۱ میں صفوان بن سلیم نے ان کی متابعت کی ہے۔ اسی طرح نسائی "کبریٰ" میں جیسا کہ مؤلف رحمہ اللہ نے "تہذیب السنن" ۳/۳۰۸ میں نقل کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید نے بھی اس کے موافق روایت کی ہے۔ اس باب میں حضرت ثوبان کی بھی ایک حدیث ہے جس کی تخریج دارمی ۲/۲۱، اور ابن ماجہ (۱۷۱۵) نے کی ہے۔ سند صحیح ہے۔ ابن حبان (۹۲۸) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد ۳/۳۰۸ و ۳۲۴ و ۳۴۴ میں جابر سے اور زوائد بزار ص ۱۰۳ میں ابوہریرہ سے بھی روایتیں موجود ہیں۔

[4] - بخاری ۴/۲۱۳ فی الصوم: باب صوم یوم عاشوراء۔ مسلم (۱۱۲۵) (۱۱۵) فی الصیام: باب صوم یوم عاشوراء۔ روایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[5] - یہ حدیث اور اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

ایک دن صوم رکھتے تھے۔ جب رمضان کے صوم فرض ہوئے تو آپ نے اسے ترک فرما دیا[1] (یہی عاشوراء ہے)۔"

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عاشوراء کا صوم رکھا اور اس کا حکم دیا تو صحابہ نے کہا "رسول اللہ! یہ وہ دن ہے جس کی یہود و نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں"۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آئندہ سال انشاء اللہ نویں کو بھی صوم رکھیں گے"۔ مگر اگلا سال آنے سے پیشتر ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔[2]

مذکورہ بالا احادیث کی رو سے اس دن آپ کا صوم رکھنا اور اس کا حکم دینا وفات سے ایک سال پیشتر تھا۔ مگر سابق حدیث میں یہ ہے کہ مدینہ تشریف لائے جب یہ صوم رکھا اور اس کا حکم دیا۔ پھر ابن مسعود خبر دیتے ہیں کہ یوم عاشوراء رمضان کے باعث متروک ہو گیا۔ یہ بات حضرت ابن عباس کی مذکورہ حدیث کے خلاف ہے۔ یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس کی فرضیت ترک کر دی گئی کیونکہ سرے سے یہ فرض تھا ہی نہیں۔ صحیحین میں معاویہ بن ابی سفیان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے "یہ عاشوراء کا دن ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا صوم تم پر فرض نہیں کیا تھا۔ میں اس دن صوم رکھتا ہوں جو چاہے رہے جو چاہے نہ رہے"[3]۔ حضرت معاویہ نے یہ حدیث قطعی طور پر فتح مکہ کے بعد ہی سنی ہے۔

ایک اور اشکال ہے۔ وہ یہ کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کہا گیا کہ یہود و نصاریٰ اس دن کی تعظیم کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا آئندہ زندہ رہا تو نواں ضرور رکھوں گا"۔ مگر اگلا سال آنے سے پیشتر ہی آپ کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد صحیح مسلم میں حکم بن اعرج سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ابن عباس کے یہاں پہنچا وہ زمزم پر اپنی چادر کا تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا مجھے صوم عاشوراء کے باب میں بتائیں فرمایا محرم کا چاند دیکھو تو شمار کرو۔ نویں دن صوم رکھو۔ میں نے کہا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ صوم رکھتے تھے؟ فرمایا "ہاں"۔[4]

ایک اور اشکال ہے۔ وہ یہ کہ اس دن کا صوم اگر ابتدائے اسلام میں واجب تھا تو اس کی قضا کا حکم کیوں نہیں دیا گیا۔ رات میں اس کی نیت بھی نہیں کی جا سکی اور اگر یہ صوم فرض نہ تھا تو جس نے کھا پی لیا تھا اسے تمام دن رکھے رہنے کا

---

[1] - بخاری ۱۳۴/۸ فی تفسیر : باب یاایھاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام ۔ مسلم (۱۱۲۷)

[2] - مسلم (۱۱۳۴)

[3] - مؤطا مالک ۲۹۹/۱ ۔ بخاری ۲۱۳/۴، ۲۱۴ ۔ مسلم (۱۱۲۹) حافظ فرماتے ہیں "اس میں یہ دلیل نہیں ہے کہ یوم عاشوراء کا صوم فرض نہ تھا۔ کیونکہ یہاں اس مفہوم کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کی طرح یہ صوم دائمی طور پر فرض نہیں کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ عام ہے اور بیشتر وجوب پر دلائل کے اعتبار سے خاص ہوگا۔ یا مراد یہ ہے کہ یہ اللہ کے اس ارشاد "کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم" میں داخل نہیں ہے، پھر اس کی تفسیر اس طرح کر دی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ سابقہ صوم کا حکم جو منسوخ ہو چکا اس کے متضاد نہیں۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں فتح مکہ سے رہے جو لوگ یوم عاشوراء کے صوم کا حکم دیتے وقت موجود رہے ہیں وہ لوگ پہلے سال میں دوسرے سال کے بالکل اوائل میں موجود رہے ہیں۔ مجموعہ احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صوم واجب تھا۔ کیونکہ اس دن صوم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بعد میں اس حکم پر زور دیا گیا۔ پھر منادی کر کے اس کو اور مؤکد کیا گیا، پھر اس دن کھانے والوں کو روک کر اور زیادہ اسے طاقت دی گئی، پھر ماؤں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس دن بچوں کو دودھ نہ پلائیں، پھر ابن مسعود کا مسلم کی روایت کے مطابق ارشاد بھی ہے کہ "رمضان فرض ہوا تو عاشوراء اس علم کے باوجود ترک کر دیا گیا کہ اس کا مستحب ہونا متروک نہیں ہے۔ بلکہ یہ باقی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ متروک اصل میں اس کا وجوب ہی ہے۔

[4] - مسلم (۱۱۳۳)۔

حکم کیوں دیا گیا۔ جیسا کہ سنن اور مسند میں متعدد سندوں سے وارد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کھا پی لینے والے کو حکم دیا کہ بقیہ دن صوم سے رہے[1] ایسا تو واجب حکم میں ہوتا ہے۔ پھر حضرت ابن مسعود کا یہ قول کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ رمضان فرض ہوا تو عاشوراء ترک کر دیا گیا۔ مگر اس کا مستحب ہونا متروک نہ ہوا؟

ایک اور اشکال ہے۔ وہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے یوم عاشوراء کی تصریح نویں تاریخ کے لیے کی ہے اور خبر دی ہے کہ اسی طرح آپ صوم رکھتے تھے۔ مگر یہی حضرت ابن عباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "عاشوراء کے دن صوم رکھو اور یہود کی مخالفت کرو، ایک دن اس کے پہلے یا ایک دن اس کے بعد صوم رکھو"[2] احمد نے اس کی روایت کی ہے، اور یہی عبداللہ بن عباس روایت فرماتے ہیں "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں کو عاشوراء کا صوم رکھنے کا حکم دیا"۔ ترمذی نے اس کی روایت کی ہے[3]

ان اشکالات کے جوابات بعون اللہ و بتوفیقہ حسب ذیل ہیں۔

اشکال اول کا جواب: پہلا اشکال یہ ہے کہ آپ جب مدینہ تشریف لائے تو یہود کو اس دن صوم رکھتے ہوئے پایا۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ جس روز آپ نے مدینہ کے اندر قدم رکھا انھیں اسی دن صوم رکھتے ہوئے پایا۔ کیونکہ آپ تو مدینہ میں داخل دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو ہوئے۔ اور اس واقعہ کا علم مدینہ میں آپ کی آمد کے دوسرے سال ہوا، اس دن اہل کتاب کا صوم اگر قمری تاریخ کے حساب سے تھا تو مکہ کے اندر آپ کو یہ علم نہ ہوا۔ اور اگر شمسی حساب سے تھا تو اشکال قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ جس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی وہ محرم کی پہلی تاریخ تھی اور یوم عاشوراء کہلاتا تھا۔ اہل کتاب نے اس کا حساب اگر شمسی حساب سے رکھا تھا تو ٹھیک ربیع الاول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ وارد ہونے کے موقعہ ہی پر یہ پڑا۔ اہل کتاب کا صوم شمسی حساب سے مگر مسلمانوں کا قمری حساب سے ہوتا ہے۔ اسی طرح حج بھی ہوتا ہے اور واجبات و مستحبات سارے احکامات بھی اسی طرح انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہم ہیں"۔ پس اس دن کی تعظیم و تعیین میں اولیت کا راز کھل جاتا ہے، شمسی حساب سے اس دن کی تعیین میں اہل کتاب سے غلطی ہوئی تھی۔ نصاریٰ نے بھی اپنے صوم کی تعیین میں غلطی کی۔ کیونکہ انھوں نے اپنا صوم سال کے ایک خاص موسم میں قرار دیا تھا جس میں مہینے مختلف ہو جایا کرتے ہیں۔

دوسرا اشکال: دوسرا اشکال یہ ہے کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں عاشوراء کا صوم رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رکھتے تھے۔ بلاشبہ قریش اس دن کی تعظیم کرتے تھے۔ اس دن وہ خانہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے تھے۔ اس دن صوم رکھنا ان کے یہاں سب سے بڑی تعظیم تھی۔ مگر ان کا حساب قمری تھا۔ لہٰذا یہ دن ان کے نزدیک محرم کی دسویں تاریخ کا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد ہوئی تو اہل کتاب کو بھی آپ نے اس دن کی تعظیم کرتے اور اس کا صوم رکھتے ہوئے پایا۔ چنانچہ اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ جواب میں کہا گیا کہ یہ وہی دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ

---

[1] احمد ۴/۳۸۸۔ نسائی ۴/۱۹۲۔ ابن ماجہ (۱۷۳۵) روایت محمد ابن صیفی رضی اللہ عنہ۔ سند حسن ہے۔ بخاری ۴/۲۱۶۔ مسلم (۱۱۳۵) روایت سلمہ بن اکوع سے۔ کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ جس نے کھا لیا ہے وہ بقیہ دن صوم رکھے اور جس نے نہیں کھایا ہو وہ صوم سے رہے۔ کیونکہ آج کا دن عاشوراء کا دن ہے۔

[2] مسند احمد ۱/۲۴۱۔ ابن خزیمہ (۲۰۹۵) سند میں ابن ابی لیلیٰ سئ الحفظ ہیں۔ عبدالرزاق (۷۸۳۹) اور انہی کی سند سے بیہقی ۴/۲۸۷ میں حضرت ابن عباس سے بایں معنی موقوفاً روایت ہے کہ نویں اور دسویں کو صوم رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[3] ترمذی (۷۵۵) فی الصوم: باب ماجاء فی عاشوراء ای یوم ھو۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ مگر اس میں حسن کا عنعنہ ہے۔

علیہ السّلام اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہم ہیں" اس دن آپ نے صوم رکھا اور اس کا حکم بھی دیا۔ آپ کا یہ طریقۂ کار اس دن کی تعظیم کو برقرار رکھنے کے لیے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ اور آپ کی امت یہود کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کی زیادہ حقدار ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے شکرانے کے طور پر اس دن صوم رکھا تو یہود کے مقابلہ میں ہم موسیٰ علیہ السّلام کی اتباع کے زیادہ حقدار ہیں۔ خاص کر جب یہ کہیں کہ "ہم سے پہلے کے لوگوں کی جو شریعت تھی اگر ہماری شریعت کے مخالف نہیں ہے تو وہی ہماری بھی شریعت ہے"

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے معلوم کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس دن صوم رکھا تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ ایک عظیم دن ہے، اس دن اللہ نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور فرعون کی قوم کو غرق کیا تھا۔ چنانچہ شکرانہ کے طور پر موسیٰ نے اس دن صوم رکھا۔ ان کی اتباع میں ہم بھی اس دن صوم رکھتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو ہم تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہیں[1]"۔ چنانچہ آپ نے اس دن صوم رکھا اور صحابہ کو بھی صوم رکھنے کا حکم دیا اس عمل پر جب آپ نے انھیں باقی رکھا اور ان کی تکذیب نہیں فرمائی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے شکرانے کے طور پر اس دن کا صوم رکھا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے اس دن کی جو تعظیم تھی اس میں اس اعزاز کا اور اضافہ ہوگیا۔ آگے مزید اس کی تاکید اس طرح ہوئی کہ ایک منادی بھیج کر تمام دیار میں اعلان کروایا کہ اس دن صوم رکھا جائے جس نے کھا پی لیا تھا اسے رک جانے کا حکم دیا۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوم مسلمانوں پر آپ نے قطعی طور پر لاگو فرمایا تھا۔ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

تیسرا اشکال: تیسرا اشکال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء کا صوم رمضان کے صوم کی فرضیت سے پہلے رکھتے تھے پھر جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تو آپ نے اسے ترک کر دیا۔ یہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ رمضان سے پہلے یہ صوم فرض تھا۔ ایسی صورت میں متروک اس کا وجوب ہوگا نہ کہ اس کا استحباب۔ یہ بات یقینی طور پر متعین ہے کیونکہ وفات سے ایک سال پہلے جب آپ سے کہا گیا کہ یہود اس دن صوم رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا "اگر آئندہ میں زندہ رہا تو نویں کو صوم رکھوں گا" یعنی اس دن کے ساتھ (نویں کا صوم رکھوں گا) آگے فرمایا "یہود کی مخالفت کرو، ایک دن پہلے یا ایک دن اس کے بعد صوم رکھو[2]" یعنی اس دن کے ساتھ پہلے یا بعد میں۔ بلاشبہ یہ بات آپ کے آخری زمانہ کی ہے۔ شروع میں آپ اہل کتاب کی موافقت ہی پسند فرماتے تھے بشرطیکہ کوئی مخصوص بات مستثنیٰ نہ کر دی گئی ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس صوم کا مستحب ہونا متروک نہیں ہوا۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ اس دن کا صوم واجب نہیں تھا۔ اسے دو باتوں میں ایک ماننا ضروری ہے۔ یا یہ کہ ترک استحباب کا قائل ہو، چنانچہ اس کے نزدیک اس دن صوم رکھنا مستحب نہ رہا۔ یا یہ کہ عبداللہ بن مسعود نے یہ بات اپنی رائے سے کہی تھی اور اس دن صوم رکھنے کے استحباب کا مسئلہ ان سے پردۂ خفا میں تھا، لیکن یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن صوم رکھنے کی ترغیب دی ہے، اور فرمایا ہے کہ اس دن کا صوم گذشتہ سال کا کفارہ ہے[3]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک صحابہ برابر اس دن صوم رکھتے تھے۔ اس کی ممانعت یا کراہیت کے باب میں آپ سے ایک حرف بھی وارد نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو شے متروک ہوئی وہ اس کا وجوب ہے نہ کہ استحباب۔

---

[1]۔ اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

[2]۔ اس کی تخریج گذر چکی ہے۔ مرفوع کی صورت میں یہ ضعیف ہے۔

[3]۔ مسلم (۱۱۶۲) حدیث ابوقتادہ فی الصیام: باب استحباب الصیام ثلثة ایام من کل شهر وصوم یوم عرفة وعاشوراء۔

اگر یہ کہا جائے کہ معاویہ کی حدیث جس کی صحت پر اتفاق ہے عاشوراء کی عدم فرضیت کے باب میں صریح ہے اور یہ کبھی بھی فرض نہ تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاویہ کی حدیث صراحت سے وجوب کے تسلسل کی نفی کر رہی ہے کسی سابقہ منسوخ وجوب کی نفی نہیں کر رہی ہے۔ کیونکہ جو واجب ہوا اور اس کا وجوب منسوخ ہو جائے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر فرض نہیں کیا تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا مقصود ماضی وحال میں نفی کا عام ہونا ہے۔ پس وجوب کے دلائل کو ماضی کے ساتھ اور ترک نفی کے دلائل کو تسلسل وجوب کے ساتھ خاص کیا جائے گا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی اس بات کی فرمائی ہے کہ اس کا فرض اور واجب ہونا قرآن سے ثابت ہو۔ اس کی دلیل آپ کا یہ ارشاد ہے "ان اللہ لم یکتبہ علینا" یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر فرض نہیں کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے یہ واجب ہے تو اس کی نفی کی جا رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو فرض کیا ہے، وہ وہی ہے جس کی اس نے اپنی کتاب کے اندر خبر دی ہے۔ جیسے "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" (بقرة: ۱۸۳) آپ نے بتایا کہ عاشوراء کا صوم اس فرض شدہ صوم کی فہرست میں داخل نہیں ہے۔ مقصود رفع وہم ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جو صوم ہم پر فرض ہوئے ہیں ان میں یہ بھی داخل ہے۔ لہٰذا اس کے درمیان اور اس حکم سابق کے درمیان جو اس صوم سے متعلق تھا پھر صوم رمضان کی فرضیت کی وجہ سے منسوخ ہو گیا کوئی تضاد نہیں۔ اس کی وضاحت یوں بھی ہوتی ہے کہ معاویہ نے یہ بات آپ سے فتح مکہ کے بعد نیز رمضان کی فرضیت اور اس کی وجہ سے عاشوراء کے منسوخ ہو جانے کے بعد سنی ہے۔ جو حضرات اس دن صوم رکھنے کا حکم دیتے وقت موجود رہے ہیں، اس کی نداء اور کھانے والوں کو روکے جانے کی بات سنی ہے۔ دراصل وہ رمضان کی فرضیت سے پہلے کی بات ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ رمضان کے صوم ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئے، نو سال رمضان کے صوم رکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ پس اس دن صوم رکھنے کا حکم دراصل فرضیت رمضان سے پہلے کا تھا۔ اس کی عدم فرضیت کی خبر فرضیت رمضان کے بعد آخر میں دی گئی۔ یہ مسلک اختیار نہ کیا گیا تو احادیث میں تضاد واضطراب پیدا ہو گا۔

اگر یہ اعتراض ہو کہ یہ صوم فرض کیسا جب کہ اس کی نیت رات کو نہیں کی گئی۔ حالانکہ آپ کا ارشاد ہے "جو رات کو صوم کی نیت نہ کرے اس کا صوم نہیں ہوتا"[1] تو جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مختلف فیہ ہے۔ اس معنی میں کہ آیا یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابو داؤد (۲۴۵۴)۔ نسائی ۱۹۶/۴۔ ترمذی (۷۳۰)۔ ابن ماجہ (۱۷۰۰)۔ دارمی ۲/ ۶، ۷۔ احمد ۶/ ۲۸۷۔ دار قطنی ص ۲۳۴۔ طحاوی ص ۳۲۵۔ بیہقی ۴/ ۲۰۲ روایت عائشہ۔ سند صحیح ہے۔ مگر ائمہ حدیث اس کے مرفوع اور موقوف ہونے کے سلسلہ میں مختلف ہیں، اکثر اسے موقوف قرار دیتے ہیں، چنانچہ ابن ابی حاتم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "نہیں معلوم دونوں میں صحیح تر کون ہے۔ مگر موقوف ہونا زیادہ قرین صواب ہے۔" ابو داؤد فرماتے ہیں "اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے، اور ترمذی فرماتے ہیں "موقوف ہونا صحیح تر ہے" العلل میں بخاری فرماتے ہیں یہ غلط ہے۔ اس حدیث کے اندر اضطراب ہے اور صحیح یہ ہے کہ ابن عمر پر موقوف ہے۔ نسائی فرماتے ہیں میرے نزدیک صحیح اس کا موقوف ہونا ہے، مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے، اور احمد فرماتے ہیں "اس حدیث کی میرے یہاں یہ سند نہیں ہے۔ بیہقی فرماتے ہیں اسما کے راوی گو ثقہ ہیں مگر موقوف ہے۔ تاریخ صغیر ص ۶۸ میں امام بخاری نقل کرنے والوں کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "غیر مرفوع ہونا صحیح تر ہے"، طحاوی فرماتے ہیں کہ "ابن شہاب سے جو حافظین حدیث اس کی روایت کرتے ہیں وہ اسے مرفوع نہیں کرتے اور ان سے روایت کرتے ہوئے وہ اس باب میں اس قدر اختلاف کرتے ہیں کہ حدیث اس سے مضطرب ہو جاتی ہے۔ اور عائشہ کی حدیث دار قطنی ۲/ ۱۷۲، اور بیہقی ۴/ ۲۰۳ نے پیش کی ہے۔ اس کی سند میں عبد اللہ بن عباد غیر مشہور اور یحییٰ بن ایوب غیر قوی ہیں۔

کا کلام ہے یا عائشہ وحفصہ کا؛ حفصہ کی حدیث کو معمر، زہری، سفیان بن عیینہ اور یونس بن یزید ایلی نے زہری سے روایت کرتے ہوئے حفصہ ہی پر موقوف کر دیا ہے اور کچھ لوگوں نے مرفوعاً بھی بیان کیا ہے۔ مگر اکثر اہل حدیث کا کہنا یہ ہے کہ صحیح اس کا موقوف ہونا ہی ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ نافع نے روایت عبداللہ بن عمر سے ان کے قول کی کی ہے، اور یہی صحیح ہے۔ کچھ لوگ راوی کے معتبر اور عادل ہونے کے سبب اس کا مرفوع ہونا صحیح خیال کرتے ہیں۔ عائشہ کی حدیث بھی موقوف و مرفوع دونوں مروی ہے۔ مگر مرفوع کی صحت میں اختلاف ہے اگر اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں تو پھر کلام کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ثابت ہے تو ظاہر ہے آپ کا یہ ارشاد رمضان کی فرضیت کے بعد ہی کا ہے۔ اور یہ زمانہ یوم عاشوراء کے صوم سے بعد کا ہے یہ یعنی رات میں نیت کرنا ایک واجب حکم کی تجدید ہے۔ کسی ثابت حکم کا اس سے نسخ ثابت نہیں ہوتا لہذا یوم عاشوراء کا صوم فرضیت رمضان اور رات میں فرضیت نیت سے پہلے محض دن کی نیت سے پورا ہو جاتا رہا ہے اس کے بعد رمضان کی فرضیت سے اس کا واجب ہونا منسوخ ہوا پھر رات میں وجوب نیت کی بات بھی زیادہ ہوئی۔ پس یہ ایک راستہ ہے اور ایک راستہ وہ بھی ہے جسے اصحاب ابو حنیفہ اختیار کرتے ہیں وہ یہ کہ عاشوراء کے دن صوم کا واجب ہونا دو باتوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ اس دن صوم واجب ہے، دوسرے یہ کہ دن میں نیت کر لینے سے صوم کا پورا ہو جانا منسوخ نہیں ہے، اس کا حکم باقی ہے۔

ایک تیسری راہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ واجب علم کے تابع ہوتا ہے اور عاشوراء کے واجب ہونے کا علم دن میں ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں پھر رات کو نیت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ نیت واجب تب ہی ہوتی ہے جب واجب ہونے کا علم ہوتا ہے ورنہ تکلیف مالایطاق کی بات ہوگی جو محال ہے۔ بنابریں دن کے اثناء میں رویت کی دلیل مل جائے تو اس دن کا صوم وجوب کے علم سے قریبی نیت کرنے پر پورا ہو جائے گا۔ اس حقیقت کی اصل ہمیں یوم عاشوراء کے صوم میں نظر آتی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز ہمارے شیخ کا ہے اور یہ جیسا کہ صاف ظاہر ہے سب سے صحیح، درست اور شریعت کے اصول وضوابط سے قریب تر راہ ہے۔ احادیث میں بھی اس کی دلیل موجود ہے، یہاں حدیث کے سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور سب ایک نقطہ پر مجتمع ہو جاتی ہیں۔ دعویٰ نسخ کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ جاتی اور اس کے علاوہ بقیہ جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان میں شرعی ضابطوں میں سے کوئی نہ کوئی ضابطہ مجروح ضرور ہو جاتا ہے۔ یا احادیث ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتی ہیں۔ اہل قباء نے بعض صلوات قبلہ منسوخ کی جانب رُخ کرکے پڑھی تھیں مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ انھیں تحویل قبلہ کے واجب ہونے کا علم نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح جسے فرضیت صوم کے واجب ہونے کی خبر نہ پہنچے یا اس کے سبب وجوب سے واقفیت بہم نہ ہو سکے تو اسے قضا کا حکم نہ دیا جائے گا اور نہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے رات کی واجبی نیت ترک کر دی کیونکہ رات کی نیت کا واجب ہونا فریضۂ شب کے واجب ہونے کے علم کے تابع ہے۔ یہ حقیقت انتہائی کھلی ہوئی، روشن اور واضح ہے۔

بلاشبہ یہ طریقہ اس شخص کے طریقے سے صحیح تر ہے جو یہ کہتا ہے کہ عاشوراء فرض تھا اور دن میں نیت کر لینے سے اس کا صوم ہو جاتا تھا پھر اس کے وجوب کا حکم منسوخ ہو گیا۔ چنانچہ اس کے متعلقات بھی منسوخ ہوئے اور متعلقات میں صوم کے لیے دن کی نیت بھی داخل ہے۔ کیونکہ اس کے متعلقات اس کے تابع ہیں۔ متبوع نہ رہے گا تو توابع اور متعلقات بھی باقی نہ رہیں گے۔ کیونکہ دن کی نیت سے واجب صوم کا پورا ہونا اس دن کے خصوصی متعلقات میں نہیں بلکہ صوم واجب کے متعلقات میں ہے اور صوم واجب زائل نہیں ہوا، محض اس کی تعیین زائل ہوئی۔ چنانچہ وجوب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا اور بس۔ باقی دن کی نیت سے صوم کا پورا ہونا نہ ہونا اصل صوم کے توابع میں ہے نہ کہ اس کی تعیین کے۔

یہ طریقہ اس شخص کے طریقہ سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ یوم عاشوراء کا صوم قطعاً واجب نہ تھا، حالانکہ دیکھیے

تو پورے ثبوت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے، عام منادی بھی اس کی کرائی اور کھا پی لینے والوں کو بقیہ دن صوم سے رہنے کی تاکید بھی فرمائی۔ یہ ساری باتیں وجوب کے حق میں بالکل روشن اور قوی ہیں۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ "جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کا صوم ترک کر دیا گیا"۔ ظاہر ہے گذشتہ دلائل کی روشنی میں اس کا مستحب ہونا متروک نہیں ہوا۔ پس متعین طور پر یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ متروک اس کا وجوب تھا۔ اس باب میں یہ پانچ طریقے ہیں جو لوگوں نے اختیار کیے ہیں۔ واللہ اعلم۔

چوتھا اشکال: چوتھا اشکال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اگر آئندہ باقی رہا تو نویں تاریخ کو بھی صوم رکھوں گا"، مگر اگلا سال آنے سے پہلے ہی آپ کی وفات ہو گئی۔ ابن عباس کا یہ قول بھی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نویں تاریخ کا صوم رکھتے تھے"۔ یہی دونوں حدیثوں کے راوی ہیں اور دونوں ان سے ثابت ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے آپ نے نویں تاریخ کا صوم رکھا ہو اور بتایا ہو کہ آئندہ سال زندہ رہوں گا تو اس تاریخ کو صوم رکھوں گا۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ ابن عباس نے آپ کے عزم و ارادہ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کے فعل کی خبر دی ہو۔ اس طرح مشروط خبر دینا بھی صحیح ہے۔ یعنی یہ کہ زندہ رہا تو ایسا کروں گا۔ اور مطلق خبر دینا بھی صحیح ہے بشرطیکہ حالت کا علم ہو۔ ان میں سے جو بھی احتمال ہو بہرحال دونوں حدیثوں کے اندر کوئی تضاد نہیں ہے۔

پانچواں اشکال: اس اشکال کا جواب شافی و کافی گذر چکا ہے۔

چھٹا اشکال: چھٹا اشکال ابن عباس کا یہ قول ہے "شمار کرو[1]، اور نویں تاریخ کو صوم سے رہو"۔ ابن عباس سے اس ضمن میں جو روایات وارد ہیں ان کے مجموعہ پر جو بھی غور کرے گا اس کے نزدیک یہ اشکال باقی نہ رہے گا۔ نیز اسے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ابن عباس کس قدر وسعت علمی کے حامل انسان گذرے ہیں۔ آپ نے عاشوراء کا دن نویں تاریخ کو نہیں بتایا بلکہ سائل سے یہ کہا کہ نویں تاریخ کو صوم رکھو۔ انھیں سائل پر اعتماد تھا کہ وہ عاشوراء کا دن دسویں تاریخ ہی کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہی دسویں تاریخ ہی عاشوراء شمار ہوتی تھی اس کے ساتھ سائل کو آپ نے رہنمائی فرمائی کہ نویں تاریخ کو بھی صوم رکھے۔ اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح صوم رکھتے تھے۔ بایں طور صوم رکھنے کو یا تو اولیٰ مانا جائے یا یہ مطلب لیا جائے کہ آپ نے اس کا حکم دیا ہے اور آئندہ اس پر باقی رہنے کا عزم فرمایا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خود ابن عباس ہی یہ روایت کرتے ہیں کہ "اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد صوم رکھو[2]" اور پھر وہی یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دسویں تاریخ کو عاشوراء کا صوم رکھنے کا حکم دیا۔ یہ تمام آثار و احادیث جو آپ سے مروی ہیں ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

بنا بریں یوم عاشوراء کے بارے میں آپ کے صوم رکھنے کے تین مراتب سامنے آئے۔

۱۔ سب سے کامل مرتبہ: یہ کہ اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد بھی صوم رکھا جائے[3]

۲۔ دوسرا مرتبہ: یہ کہ نویں اور دسویں دونوں تاریخوں کو صوم رکھا جائے۔ جیسا کہ اکثر حدیثوں سے واضح ہوتا ہے۔

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں "اعدد تسعًا" (نو شمار کرو) آیا ہے مگر یہ غلط ہے، حدیث میں اس طرح روایت نہیں ہے۔ غالبًا نقل نویسوں سے یہ غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے پیشتر حدیث میں "تسعًا" کا لفظ نہیں آیا ہے۔

[2] یہ روایت حسب ذیل الفاظ میں ہے، "یومًا قبلہ و یومًا بعدہ" ایک دن اس سے پہلے اور ایک دن اس کے بعد۔ بیہقی ۲۸۷/۴۔ سند جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے ضعیف ہے۔

[3] حضرت ابن عباس، جیسا کہ گذر چکا ہے آپ کا یہ قول ہے "نویں اور دسویں دن روزہ رکھو"۔

۳۔ تیسرا مرتبہ: یہ کہ صرف دسویں تاریخ ہی کو صوم رکھا جائے۔
باقی جو لوگ صرف نویں تاریخ کو صوم رکھنا عاشوراء تصور کرتے ہیں انھوں نے دراصل آثار و روایات کو سمجھا نہیں اور نہ ہی انھوں نے الفاظ اور سندوں پر غور کیا ہے اور یہ لغت کے اعتبار سے بھی اور شریعت کے رو سے بھی بالکل ناممکن ہے۔ واللہ المؤفق للصواب۔

اور بعض اہل علم نے ایک اور مسلک اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اس عبادت کو انجام دینے کے باوجود آپ کا مقصود اہل کتاب سے مخالفت کرنا تھا۔ چنانچہ یہ دو ہی صورتوں سے ممکن تھا۔ یا تو دسویں کو نوویں تاریخ قرار دے دی جاتی یا دونوں دنوں کا صوم معًا رکھا جاتا۔ اور آپ کا یہ ارشاد کہ "آئندہ سال ہم نویں کو صوم رکھیں گے" دونوں باتوں کا متحمل ہے۔ مگر آپ کا مفہوم کیا تھا آپ کی وفات ہو جانے سے یہ واضح نہ ہو سکا۔ لہذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں دنوں کا صوم ایک ساتھ رکھا جائے۔ اس بارے میں ہم نے جس طریقہ کی نشاندہی کی ہے وہ انشاء اللہ زیادہ صائب اور درست نظر آئے گی اور ابن عباس کی روایات بھی بحیثیت مجموعی اسی طریقہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کیونکہ احمد کی روایت کے مطابق آپ کا یہ ارشاد گرامی کہ "یہود کی مخالفت کرو، ایک دن اس سے پیشتر یا ایک دن اس کے بعد بھی صوم رکھو"[1] نیز ترمذی کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس کا یہ بیان کہ "عاشوراء کا صوم ہمیں دسویں تاریخ میں رکھنے کا حکم دیا گیا" ہمارے اس مسلک کی صحت کی دلیل ہے۔ جسے ہم نے مذکورہ بالا مسئلہ میں اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

یوم عرفہ کو عرفہ میں حاجیوں کا صوم نہ رکھنا اور غیر حاجیوں کا رکھنا سنت ہے

سنت نبوی یہ تھی کہ عرفہ میں یوم عرفہ کو صوم نہ رکھتے تھے۔ صحیحین[2] سے یہ ثابت ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے عرفہ کے دن عرفہ میں صوم رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ روایت اہل سنن نے کی ہے[3]۔ آپ سے ثابت ہے کہ اس دن کا صوم گذشتہ اور آئندہ سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ مسلم نے اس کی روایت کی ہے[4]۔

عرفہ میں صوم نہ رکھنے کی حسب ذیل کچھ حکمتیں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ تاکہ ذکر و دعا کے لیے کچھ طاقت رہے۔
۲۔ یہ حالت سفر کی ہے، حالت سفر میں فرض صوم بھی نہ رکھنا افضل ہے اور عرفہ کا صوم نفل ہے اس کا توڑ دینا بدرجۂ اولیٰ افضل ہوگا۔
۳۔ یہ دن جمعہ کا تھا۔ تنہا جمعہ کے دن صوم رکھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ آپ نے پسند یہ فرمایا کہ لوگ آپ کو

---

[1] جیسا کہ گذر چکا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔

[2] بخاری ۴/۲۰۶، ۲۰۷ فی الصوم: باب صوم یوم عرفۃ۔ مسلم (۱۱۲۳) فی الصوم: باب استحباب الفطر للحاج۔ حدیث ام فضل بنت حارث "کچھ لوگوں نے ان کے یہاں عرفہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صوم رکھنے کے بارے میں اختلاف کیا، چنانچہ کچھ لوگوں کا دعویٰ تھا کہ آپ صوم سے ہیں اور کچھ لوگوں کا دعویٰ تھا کہ صوم سے نہیں ہیں، تو ام فضل نے ایک پیالہ دودھ آپ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ اس وقت اپنے اونٹ پر سوار کھڑے تھے۔ دودھ آپ نے نوش فرما لیا۔

[3] احمد ۲/۳۰۴ و ۴۴۶۔ ابو داؤد (۲۴۴۰)۔ ابن ماجہ (۱۷۳۲) روایت ابو ہریرہ سند میں مہدی عبدی ہجری غیر معروف ہیں۔

[4] مسلم (۱۱۶۲) فی الصیام: باب استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شہر وصوم یوم عرفۃ۔ روایت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ۔

اس دن صوم نہ رکھتے ہوئے دیکھ سکیں، تاکہ خصوصیت سے جمعہ کے دن صوم رکھنے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ اور زیادہ موکد ہو جائے۔ گو اس دن صوم رکھنے کی بات یوم عرفہ کے پیش نظر تھی نہ کہ یوم جمعہ کے۔ (مگر بہرحال یہ بھی ایک حکمت تصور کی جا سکتی ہے۔) ہمارے شیخ (ابن تیمیہ رحمہ اللہ) کا اس بارے میں ایک دوسرا مسلک ہے۔ وہ یہ کہ ایک عظیم اجتماع کے سبب یہ دن اہلِ عرفہ کا یوم عید ہے۔ اس دن عرفہ میں جو لوگ موجود ہوتے ہیں تمام دنیا والوں کے مقابلہ میں ان کا یہ اجتماع خصوصی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جانب اہلِ سنن کی روایت کردہ حدیث کے اندر اشارہ فرمایا ہے کہ "یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام منٰی ہم اہلِ اسلام کے عید کے دن ہیں"[1] اور ظاہر ہے یہ عید کا دن ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ اس دن عرفہ وغیرہ میں مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

شنبہ، یکشنبہ اور جمعہ کے دن صوم رکھنے کا حکم

روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر شنبہ اور یکشنبہ کو صوم سے رہتے تھے۔ اس سے مقصود آپ کا یہود ونصاریٰ کی مخالفت کرنا تھا۔ جیسا کہ مسند اور سنن نسائی میں کریب مولیٰ ابن عباس سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ "ابن عباس اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابیوں نے مجھے ام سلمہ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ کن دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر صوم رکھتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ سنیچر اور اتوار کے دن، آپ کہتے تھے کہ یہ دن مشرکوں کی عید کے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں"[2]۔ روایت کی صحت محلِ نظر ہے۔ کیونکہ سلسلۂ سند میں محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب ہیں جن کی بعض حدیثیں منکر قرار دی گئی ہیں۔ عبدالحق نے اپنی کتاب "الاحکام" میں ابن جریج کی روایت پیش کی ہے، جسے انھوں نے عباس بن عبداللہ بن عباس سے اور انھوں نے اپنے چچا فضل سے روایت کی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہمارے ایک گاؤں میں عباس سے ہوئی" پھر کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ ابن قطان فرماتے ہیں کہ عبدالحق نے جس طرح ذکر کیا ہے ضعیف ہے، محمد بن عمر غیر معروف ہیں، اور ابن قطان نے سنیچر اور اتوار کے صوم کے باب میں حضرت ام سلمہ کی اس حدیث کا جس کی محمد بن عمر نے ان سے روایت کی ہے تذکرہ فرمایا ہے اور کہا ہے کہ عبدالحق

---

[1] ترمذی (۷۷۳) فی الصوم : باب ماجاء فی کراهیة الصوم فی ایام التشریق۔ ابوداؤد (۲۴۱۹) فی الصوم : باب صیام ایام التشریق۔ نسائی ۵/۲۵۲ فی الحج : باب النهی عن الصوم یوم عرفة۔ روایت عقبہ بن عامر۔ پوری حدیث یوں ہے "یہ دن کھانے اور پینے کے ہیں" سند صحیح ہے۔ ترمذی، ابن حبان (۹۵۸) اور حاکم ۱/۴۳۴ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے موافقت کی ہے۔

[2] احمد ۶/۳۲۳، ۳۲۴۔ ابن خزیمہ (۲۱۶۷)۔ ابن حبان (۹۴۱)۔ حاکم ۱/۴۳۶۔ بیہقی ۴/۳۰۳۔ روایت ابن مبارک، وہ عبداللہ بن محمد بن عمر سے وہ اپنے والد سے وہ کریب سے وہ ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں۔ سند حسن ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن عمر اور ان کے والد کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے۔ ان دونوں سے بکثرت راویوں نے روایت کی ہیں۔ حافظ الفتح میں فرماتے ہیں "یوما عید" سے اشارہ اس جانب ہے کہ سنیچر کا دن یہودیوں اور اتوار کا دن عیسائیوں کا یوم عید ہے اور عید کے دنوں میں صوم نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ صوم رکھ کر آپ نے ان کی مخالفت کی۔ اس سے یہ افادہ بھی ملتا ہے کہ بعض شوافع نے تنہا سنیچر کے دن اور اسی طرح تنہا اتوار کو صوم رکھنا مکروہ قرار دیا ہے۔ یہ بہتر نہیں ہے بلکہ یہ بات صرف جمعہ کے باب میں کہی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں صحیح حدیث بھی وارد ہے۔ مگر سنیچر اور اتوار کا جہاں تک تعلق ہے ان دونوں دنوں میں ایک ساتھ اور تنہا دونوں طریق پر صوم رکھا جا سکتا ہے کیونکہ مقصود یہاں اہلِ کتاب کی مخالفت ہے جو بہرحال حاصل ہو جاتی ہے۔

نے اس حدیث کے بارے میں جو سکوت اختیار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث کو صحت کا رخ دینا پسند کرتے ہیں۔ محمد بن عمر کا حال غیر معروف ہے، ان سے حدیث کی روایت ان کے صاحبزادہ عبداللہ بن محمد بن عمر نے کی ہے اور ان کا حال بھی غیر معروف ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں حدیث حسن کا درجہ رکھتی ہے۔ واللہ اعلم۔

امام احمد اور ابو داؤد نے عبداللہ بن بسر سُلمی سے اور انھوں نے اپنی بہن صمّاء سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "سنیچر کے دن صوم بس فرض حالت ہی میں رکھو، (اس دن) اگر کسی کو انگور کا چھلکا یا درخت کی چھال ہی میسر ہو تو چاہیے کہ چبائے[1]

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ یعنی عبداللہ بن بسر کی حدیث جھوٹ ہے۔ اس کی روایت ان سے ابو داؤد نے کی ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ ابو داؤد فرماتے ہیں یہ حدیث منسوخ ہے اور نسائی فرماتے ہیں یہ مضطرب حدیث ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت کہتی ہے کہ اس حدیث میں اور ام سلمہ کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ ممانعت کا تعلق دراصل تنہا جمعہ کے دن صوم رکھنے سے ہے۔ بنابریں ابو داؤد نے صراحت کے ساتھ باب باندھتے ہوئے لکھا ہے۔" باب النهي ان يخص يوم السبت بالصوم" یعنی مخصوص طور پر سنیچر کے دن صوم رکھنے کی ممانعت۔ باقی اس دن صوم رکھنے والی حدیث تو اس میں اس کے ساتھ اتوار کا دن بھی ملا کر ہے۔ ہاں اس سے ایک روز پیشتر یا ایک روز بعد بھی صوم رکھا جائے تو جائز ہو جاتا ہے۔ بایں طور ان لوگوں کا اشکال دور ہو جاتا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ اس کا صوم تعظیمی نوعیت کا ہے۔ چنانچہ اشکال میں کہا گیا ہے کہ اس اعتبار سے یہ اہل کتاب کی موافقت ہوئی۔ گو صوم رکھنے میں یک گونہ اہل کتاب کی مخالفت موجود ہے مگر پھر بھی اس سے ان کی موافقت کا پہلو نکلتا ہے۔ تعظیمی پہلو اس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے جب خصوصیت کے ساتھ اس دن صوم رکھ لیا جائے۔ بلاشبہ تنہا اس دن صوم رکھنے کی بات حدیث کے اندر نہیں آئی۔ ہاں اگر اس دن کے ساتھ دوسرے دن کا بھی صوم رکھ لیا جائے تو یقیناً پھر تعظیم کا کوئی پہلو باقی نہ رہے گا۔ واللہ اعلم۔

صیام دہر خارج از سنّت ہے

مسلسل صوم سے متعلق وارد شدہ ممانعت

مسلسل صوم رکھنا اور صیام دہر آپ کی سنت نہ تھی بلکہ آپ کا ارشاد ہے "جو صیام دہر رکھے گا اس کا صوم اور افطار کچھ نہیں ہو گا"[2] مطلب یہ نہیں کہ حرام دنوں میں جو صوم رکھے گا اس کا کوئی صوم نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ بات آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمائی اور وہ سوال یہ تھا" صیام دہر رکھنے والے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ظاہر ہے حرام دنوں

---

[1] ۔ احمد ۶/۳۶۸۔ ترمذی (۷۴۴)۔ ابو داؤد (۲۴۲۱)۔ ابن خزیمہ (۲۱۶۴)۔ بیہقی ۴/۳۰۲۔ سند قوی ہے۔ مضطرب قرار دینے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ یہ حدیث دیگر محفوظ سندوں سے بھی مروی ہے۔

[2] ۔ بخاری ۴/۲۰۳۔ مسلم (۱۱۴۴) روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[3] ۔ احمد ۴/۲۴۔ نسائی ۴/۲۰۷ فی الصوم ؛ باب النهي عن صيام الدهر۔ ابن ماجہ (۱۷۰۵) فی الصیام ؛ باب ما جاء فی صیام الدهر۔ روایت عبداللہ بن شخیر۔ سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۲۱۵۰) اور حاکم ۱/۴۳۵ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔

کے بارے میں سوال کا جواب یہ نہیں ہو سکتا کہ نہ اس کا صوم نہ افطار۔ کیونکہ تعبیر کے اندر جواب کی جہت یہ ہے کہ ایسے شخص کا صوم رکھنا نہ رکھنا برابر ہے نہ تو اسے اس پر ثواب ملے گا نہ عذاب۔ اللہ تعالیٰ نے جو صوم حرام کیے ہیں ان کے بارے میں سوال کا مذکورہ انداز جواب مطابق نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ صیام دہر کو جو مستحب سمجھتا ہے اس کے نزدیک یہ صوم مستحب اور حرام دونوں اعتبارات کا حامل ہے۔ مستحب ایام کی نسبت سے تو یہ صوم ہو گا مگر ایام حرمت کے اعتبار سے نہ ہو گا۔ دونوں ہی صورتوں میں بہر حال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "اس نے نہ صوم رکھا نہ افطار کیا"۔ لہذا آپ کے اس ارشاد کو مذکورہ بالا حقیقت پر محمول کرنا کھلی ہوئی غلطی ہے۔

نیز یہ حقیقت بھی ہے کہ ایام حرمت شرع کے اعتبار سے مستثنیٰ ہیں ان میں شرعاً صوم رکھنا درست نہیں ہے۔ یہ شرعی اعتبار سے بمنزلہ شب اور بمنزلہ ایام حیض ہیں۔ لہذا صحابہ ایسے صوم کے بارے میں سوال نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان دنوں میں صوم مقبول نہیں ہوتا اور اگر انھیں حرمت کے بارے میں معلوم نہ ہوتا تو آپ کا جواب اس طرح نہ ہوتا کہ "نہ اس نے صوم رکھا نہ افطار کیا"۔ کیونکہ ایسا طریقہ تعبیر حرمت کی وضاحت کے لیے نہیں ہوا کرتا۔

پس ہر شک وشبہ سے بالاتر سنت آپ کی یہ تھی کہ ایک دن صوم رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا صیام دہر کے مقابلہ میں افضل تر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔ مسلسل صیام دہر مکروہ ہے۔ اگر مکروہ نہ ہوتا تو حسب ذیل تین ناممکن باتوں میں سے کوئی ایک لازم آتی۔

۱۔ صیام دہر ایک دن صوم رکھنے اور ایک دن نہ رکھنے کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہوتا کیونکہ اس طرح عمل کچھ زیادہ ہو جاتا ہے، مگر یہ بات اس صحیح حدیث کی رو سے مسترد ہو جاتی ہے کہ "اللہ کے نزدیک محبوب ترین صوم داؤد کا صوم ہے[1]"۔ مذکورہ بالا صوم اس صوم سے افضل کیسے قرار پا سکتا ہے۔

۲۔ فضل و شرف میں دونوں صوم یکساں حیثیت کے حامل قرار پائیں یہ بھی ناممکن ہے۔

۳۔ صوم دہر مساوی طور پر مباح ہو، نہ استحباب کا پہلو ہو نہ کراہت کا۔ یہ بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ عبادت کا حال یہ نہیں ہوتا بلکہ راجح اور مرجوح کا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر اعتراض ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو شخص رمضان کے صوم رکھے، پھر اس کے بعد شوال کے چھ صوم بھی رکھ لے تو گویا اس نے صیام دہر رکھا[2]"۔ نیز آپ نے ہر ماہ تین دن صوم رکھنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ "اس کا یہ صوم صیام دہر کے برابر ہے[3]"۔ ان ارشادات کا مقصود یہ ہے کہ صیام دہر اپنے مدمقابل سے زیادہ افضل ہے اور مطلوب بھی یہی ہے۔ اور اس کا ثواب دیگر صائمین کے ثواب سے زیادہ بھی ہے۔ یہاں تک کہ صوم دہر رکھنے والے کی دیگر صائمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ تشبیہ بذات خود مستحب کیا خود اس کے جواز کی دلیل بھی نہیں ہے اگر صوم رکھنا

---

[1] بخاری ۳/۱۴ فی التہجد : باب من نام عند السحر۔ مسلم (۱۱۵۹) (۱۸۹) فی الصیام : باب النہی عن صوم الدھر۔ روایت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ۔

[2] مسلم (۱۱۶۴) فی الصیام : باب استحباب صوم ستة ایام من شوال اتباعاً لرمضان۔ ابوداؤد (۲۴۳۳)۔ ترمذی (۷۵۹)۔ ابن ماجہ (۱۷۱۶) حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔

[3] بخاری ۴/۱۹۲ فی الصیام : باب صوم الدھر۔ مسلم (۱۱۵۹) حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاص۔ مسلم (۱۱۶۲) حدیث ابوقتادہ رضی اللہ عنہ۔

مستحب ہوتا تو یہ تشبیہ ثواب کے ضمن میں ہو سکتی تھی۔ اس کی دلیل خود حدیث کے اندر موجود ہے۔ حدیث میں ہر ماہ کے تین دنوں کے صوم کو بمنزلہ صیامِ دہر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ہوتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بارہ مہینوں کے ۳۶ دنوں کا صوم برابر ہو ۳۶۰ دنوں کے ثواب کے۔ ظاہر ہے ۳۶۰ دن صوم رکھنا قطعاً حرام ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ۳۶ دن کے صوم کا مقصد مشروع طریقہ سے ۳۶۰ دنوں کے صیام کا ثواب حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح شوال کے چھ صوم کے بارے میں آپ کا یہ ارشاد ہے کہ رمضان کے ساتھ مل کر پورے سال کے برابر ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۔ (الانعام: ۱۶۰)

جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے۔

پس یہ ۳۶ دنوں کے صوم ۳۶۰ صوم کے برابر ہوئے۔ اور ۳۶۰ دنوں کا صوم رکھنا بالاتفاق ناجائز ہے۔ بلکہ اس طرح کی تعبیر گاہ وہاں ظاہر کی جاتی ہے جہاں مشبہ بہ کا فعل بالعموم ناممکن بلکہ محال ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ اس مفروضہ کی بنیاد پر دی گئی ہے کہ ۳۶۰ دنوں کا صوم ممکن ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ کون سا عمل جہاد کے برابر ہے؟ تو آپ نے فرمایا "مجاہد جب میدانِ جہاد کی جانب نکلے تو کیا تم اس عرصہ میں برابر صلوٰۃ پڑھ سکتے ہو، اس طرح سے کہ ذرا بھی سستی نہ برتو؟ اور کیا تم مسلسل صوم رکھ سکتے ہو، اس طرح کہ کہیں بھی افطار کی منزل نہ آئے؟"[1] ظاہر ہے ایسا کرنا عموماً ناممکن ہے۔ جس طرح شرعاً ۳۶۰ دنوں کا صوم رکھنا ناممکن ہے۔ آپ نے عمدہ عمل کی تشبیہ دونوں ہی باتوں سے دی ہے، اس کی وضاحت آپ کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ "اللہ کے نزدیک محبوب ترین قیام، قیامِ داؤد ہے۔" یہ قیام سنتِ صحیحہ سے بصراحت ثابت ہے کہ تمام شب کے قیام سے افضل ہے۔ مگر بایں ہمہ عشار اور فجر کی صلوٰۃ جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کی تشبیہ پوری رات صلوٰۃ پڑھنے والے[2] سے آپ نے دی ہے۔

اگر یہ اعتراض ہو کہ پھر ابو موسیٰ اشعری کی اس حدیث کا کیا ہو گا جس میں آیا ہے "جو صیامِ دہر رکھے گا اس پر جہنم سمٹ کر اس طرح ہو جائے گی۔ اور آپ نے اپنی مٹھی سمیٹ[3] کر بتایا۔" روایت مسند احمد کی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا مفہوم مختلف بیان ہوا ہے۔ ایک یہ کہ جہنم کے شکنجہ میں اسے کس دیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے نفس پر بڑی سختی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کیا۔ اور یہ سمجھتا رہا کہ سنت نبوی کے برعکس جو کچھ ہے وہی افضل ہے۔ دوسرا مفہوم اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ جہنم اس حد تک تنگ کر دی جائے گی کہ اس میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ اس دوسرے مفہوم کے قائلین اپنی اس تاویل کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ صائم صوم رکھ کر چونکہ اپنے اوپر نفسانی خواہشات کی تمام راہیں بند کر دیتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس پر آتش کے تمام دروازے بند کر دے گا چنانچہ اس

---

[1] بخاری ۳/۶ فی أول کتاب الجهاد۔ نسائی ۱۹/۶۔ حدیث ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ "ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آکر کہا "کوئی ایسا عمل بتائیں جو جہاد کے برابر ہو؟" آپ نے فرمایا "ایسا کوئی عمل مجھے نہیں ملتا" پھر فرمایا "مجاہد جب نکلے تو کیا تم اپنی مسجد میں داخل ہو کر بغیر سستی و کاہلی کے، برابر صلوٰۃ میں مشغول رہ سکتے ہو اور بغیر افطار کے مسلسل صوم رکھ سکتے ہو؟ اس شخص نے کہا ایسا کون کر سکتا ہے؟" مسلم (۱۸۷۸) فی الإمارة : باب فضل الشهادة فی سبیل الله۔ حدیث یہ ہے "جہاد فی سبیل اللہ کرنے والے کی مثال صائم مصلی کی ہے جو مسلسل صوم رکھتا اور صلوٰۃ ادا کرتا ہو تا وقتیکہ مجاہد میدان سے واپس نہ آ جائے۔

[2] صحیح مسلم (۶۵۶) فی المساجد : باب فضل صلوٰة العشاء والصبح بجماعة۔ حدیث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

[3] مسند احمد ۴/۴۱۴۔ بیہقی ۴/۳۰۰۔ سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ (۲۱۵۴) اور (۲۱۵۵) نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

میں اس کے لیے کوئی جگہ موجود نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام دروازوں کو بند کرچکا ہوگا۔ پہلا گروہ اپنی تاویل کی تائید و ترجیح میں یہ کہتا ہے کہ اگر مفہوم وہی ہے جیسا کہ اور حضرات فرماتے ہیں تو حدیث میں "ضُيِّقَتْ عَلَيْهِ" کے بجائے "ضُيِّقَتْ عَنْهُ" کے الفاظ وارد ہوتے۔ تضییق علیہ تو خود جہنم ہی میں ہونے کی کیفیت کا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صیام دہر کی کراہت کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں یہ حدیث بھی انہی کے عین مطابق ہے۔ صیام دہر رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے صوم نہ رکھنے والا۔ واللہ اعلم۔

نفلی صوم رکھنے والا اگر صوم توڑ دے تو قضا واجب ہے یا نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں آتے تو دریافت فرماتے "تمہارے پاس کچھ ہے؟" جواب ملتا "نہیں" تو فرماتے "پھر تو میرا صوم ہے" چنانچہ نفلی صوم کی نیت دن سے کرتے اور کبھی نیت کرکے بعد میں توڑ دیتے۔ عائشہ نے ان دونوں باتوں کی روایتیں بہم پہنچائی ہیں، پہلی حدیث صحیح مسلم میں اور دوسری کتاب نسائی[۲] میں آئی ہے۔ باقی سنن میں حضرت عائشہ کی روایت کہ "میں اور حفصہ دونوں صوم سے تھیں ہمارے سامنے ایک لذیذ کھانا آیا تو ہم نے کھا لیا۔ اس عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، مجھ سے پہلے حفصہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئیں۔ وہ اپنے باپ ہی کی تو بیٹی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا "رسول اللہ! ہم دونوں صوم سے تھیں۔ مگر ایک لذیذ کھانا آگیا چنانچہ ہم لوگوں نے کھا لیا۔ آپ نے فرمایا "اس کی جگہ ایک دن کی قضا کرو[۳]" تو یہ معلول ہے۔

ترمذی فرماتے ہیں اس کے راوی مالک بن انس، معمر، عبداللہ بن عمر، زیاد بن سعد اور بہتیرے حفاظ حدیث ہیں جو زہری سے اور وہ حضرت عائشہ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں، درمیان میں انھوں نے عروہ کا نام نہیں لیا ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ مگر ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت حیوہ بن شریح سے، انھوں نے ابن الہاد سے، انھوں نے زمیل مولیٰ

---

[۱] الفتح ۴/۱۹۳ میں حافظ اس حدیث کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ بظاہر مفہوم تو یہی ہے کہ چونکہ صائم نے اپنے نفس پر بڑی سختی کی، سنت نبوی سے گریز کیا اور غیر سنت کو افضل تصور کیا اس لیے جہنم کے شکنجہ میں کس دیا جائے گا اور یہ تعبیر سخت وعید کی حامل ہے چنانچہ یہ صوم حرام ہوگا۔ مصنف عبدالرزاق (۷۸۷۱) میں ابن عیینہ کی حدیث وارد ہے جسے انھوں نے ہارون بن سعد سے، انھوں نے ابوعمرو شیبانی سے روایت کی ہے کہ ہم عمر بن خطاب کے پاس موجود تھے، آپ کے لیے کھانا حاضر کیا گیا تو ایک شخص کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا "ایسا کیوں؟" لوگوں نے کہا "وہ صوم سے ہیں" آپ نے فرمایا "کیسا صوم؟" کہا گیا "صوم دہر" راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر اپنے نیزے سے اس کا سر ٹھونک ٹھونک کر فرمانے لگے "کھا اے صوم دہر! کھا اے صوم دہر! حافظ نے الفتح ۴/۱۹۳ میں اس کی روایت ابوعمرو شیبانی (یہ تحریف ہے) سے کرتے ہوئے کہا ہے کہ "عمر کو معلوم ہوا کہ ایک شخص صوم دہر رکھتا ہے تو آپ اس کے یہاں آتے اور درّے سے اس کی خبر لی، اور فرمانے لگے "کھا اے دہری" انھوں نے اسے ابن ابی شیبہ کی جانب بسند صحیح منسوب کیا ہے۔

[۲] پہلی حدیث مسلم (۱۴۵۱) فی الصیام: باب جواز صوم النافلة بنية من النهار قبل الزوال اور دوسری حدیث نسائی ۴/۱۹۴) میں اور یہ صحیح مسلم میں بھی آئی ہے جو پہلی حدیث کا تکملہ ہے۔

[۳] ترمذی (۷۳۵) فی الصیام: باب ایجاب القضاء علیہ۔ احمد ۶/۲۶۳ حدیث کثیر بن ہشام، یہ جعفر بن برقان سے، وہ زہری سے، وہ عروہ سے، وہ عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حزم نے المحلی ۶/۲۷۰ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اسے قوی قرار دیا ہے۔ طحاوی ۱/۲۰۹، اور ابن حبان (۹۵۱) نے اس کی تخریج جریر بن حازم کی روایت سے کی ہے۔ جسے وہ یحییٰ بن سعید سے، وہ عروہ سے، اور وہ عائشہ سے روایت کرتی ہیں۔ بسند صحیح ہے۔ ابوداؤد (۲۴۵۷) نے اس کی تخریج حیوہ بن شریح کی حدیث سے کی ہے جس کی روایت وہ ابن الہاد سے، وہ زمیل مولیٰ عروہ سے، وہ عروہ بن زبیر سے، وہ عائشہ سے کرتے ہیں۔ مالک نے اس کی تخریج موطا ۱/۳۰۶ میں ابن شہاب زہری کی روایت سے مرسلاً کی ہے۔ دیکھیے نصب الرایہ ۲/۲۶۴ و ۲۶۷۔

عروہ سے، انھوں نے عروہ سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے موصولاً کی ہے۔ نسائی فرماتے ہیں "زمیل معروف نہیں ہیں۔ بخاری فرماتے ہیں عروہ سے زمیل کا اور نہ ہی زمیل سے یزید بن الہاد کا سماع معروف ہے۔ لہٰذا لائق استدلال نہیں ہے۔

آپ جب صوم سے ہوتے اور اتفاقاً کسی قوم کے یہاں بطور مہمان وارد ہوتے تو صوم پورا فرماتے، توڑتے نہیں، جیساکہ ایک بار آپ ام سلیم کے یہاں آئے۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں کھجور اور گھی حاضر کیا آپ نے فرمایا "گھی کو برتن میں اور کھجور کو تھیلہ میں رکھو میں صوم سے ہوں[1]" مگر یہ حقیقت بھی ہے کہ ام سلیم آپ کے نزدیک بمنزلہ اہل بیت تھیں۔ صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ "اگر بحالت صوم تم میں سے کسی کو دعوتِ طعام دی جائے تو کہدے کہ میں صوم سے ہوں[2]" باقی وہ حدیث جس کی روایت ابن ماجہ، ترمذی اور بیہقی نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً کی ہے کہ "بطور مہمان کوئی کہیں آئے تو میزبانوں کی اجازت کے بغیر نفلی صوم نہ رکھے[3]" تو اس کے باب میں ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے، کوئی ثقہ راوی ہمارے علم میں نہیں آیا جس نے اس کی روایت ہشام بن عروہ سے کی ہو۔

خاص کر جمعہ کے دن صوم رکھنا مکروہ ہے

آپ کا اسوہ یہ تھا کہ عملاً اور قولاً خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے دن صوم رکھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ تنہا جمعہ کے دن صوم رکھنے کی ممانعت حضرت جابر بن عبداللہ[4]، ابوہریرہ، جویریہ بنت حارث، عبداللہ بن عمرو اور جنادہ ازدی وغیرہ کی روایتوں سے ثابت ہے۔ جمعہ کے دن منبر پر آپ نے پانی منگا کر اس لیے پیا تاکہ لوگوں کو جمعہ کے دن آپ کا صوم سے نہ رہنا معلوم ہو جائے۔ اس کا تذکرہ امام احمد نے کیا ہے اس دن صوم کی ممانعت کا سبب آپ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ دراصل عید کا دن ہے۔ چنانچہ امام احمد نے بروایت ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا ہے کہ "جمعہ کا دن عید کا دن ہے لہٰذا عید کے دن صوم کا دن قرار نہ دو، البتہ ایک دن پہلے یا بعد کو بھی صوم رکھو تو اور بات ہے[5]"

اگر یہ اعتراض ہو کہ عید سے پہلے یا بعد میں صوم نہیں رکھا جاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ جمعہ کا دن عید کے مشابہ ہے لہٰذا اس مشابہت سے اس دن صوم رکھنے کو اولیٰ سمجھنے سے روکا گیا ہے۔ ایک دن پہلے یا بعد میں صوم رکھ لینے سے اس دن کو اولیٰ سمجھنے کا شبہ جاتا رہتا ہے۔ اور اس کا حکم مہینہ کے صوم، یا دس دنوں کے صوم یا ایک دن کے صوم رکھنے یا ایک دن نہ رکھنے یا جمعہ کے دن واقع ہونے والے عرفہ اور عاشوراء کے صوم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا کسی بھی صورت میں صوم رکھنا مکروہ نہیں ہے۔

---

[1] احمد ۳/۱۰۸ و ۱۸۸ و ۲۴۸۔ بخاری ۴/۱۹۸ فی الصوم : باب من زار قوما فلم یفطر عندهم۔ حدیث انس رضی اللہ عنہ۔

[2] مسلم (۱۱۵۰) فی الصیام : باب الصائم یدعی لطعام فلیقل : إنی صائم۔

[3] ترمذی (۷۸۹) سند میں ایوب بن واقد کوفی ہے جو متروک ہے، ابن ماجہ (۱۷۶۳) اس کی سند میں ابوبکر مدنی ہے وہ بھی ضعیف ہے۔

[4] حضرت جابر کی حدیث کی تخریج بخاری ۴/۲۰۲، ۲۰۳۔ مسلم (۱۱۴۳) ابوہریرہ کی حدیث ہے۔ بخاری ۴/۲۰۳۔ مسلم (۱۱۴۴) ابوداؤد (۲۴۲۰)۔ ترمذی (۷۴۳) جویریہ کی حدیث۔ بخاری ۴/۲۰۳۔ ابوداؤد (۲۴۲۲) عبداللہ بن عمرو کی حدیث۔ ابن خزیمہ (۲۱۶۴) اور ابن حبان (۹۵۷) اور جنادہ کی حدیث احمد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

[5] احمد ۲/۳۰۳ و ۵۳۲۔ ابن خزیمہ (۲۱۶۱) حاکم ۱/۴۳۷ حدیث عامر بن لدین اشعری، بروایت ابوہریرہ، سند میں ابوبشر شامی ہے جو مجہول ہے۔ ہیثمی اسے المجمع ۳/۱۹۹ میں لائے ہیں، حدیث عامر بن لدین اشعری کی ہے انھوں نے اسے بزار کی جانب منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

پھر بھی اعتراض ہو کہ عبد اللہ بن مسعود کی اس حدیث کا کیا ہو گا جس میں وہ فرماتے ہیں "میں نے رسول اللہ صلی اللہ وسلم کو جمعہ کے دن صوم نہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، اس کی روایت اہل سنن[1] نے کی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ہم اسے مان لیں گے مگر بایں ہمہ ہم یہ بھی کہیں گے آپ ضرور اس سے ایک دن پہلے یا بعد میں صوم رکھتے رہے ہیں، اور اگر صحیح اور ثابت نہیں ہے تو ہم اسے مسترد کر دیں گے، کیونکہ یہ غرائب میں سے ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اعتکاف کے باب میں سنن نبوی

چونکہ قلب کی تعمیر و اصلاح اور توجہ الی اللہ کی شاہراہ پر استقامت سراسر موقوف ہے اس بات پر کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات پر جمعیت خاطر رہے۔ اقبال علی اللہ کے ذریعہ پراگندہ فکری کا بالکلیہ ازالہ ہو جائے۔ کیونکہ صرف اسی سے پریشانی خاطر دور بھی ہو سکتی ہے۔ نیز چونکہ فالتو کھانا، پینا، فالتو معاشرت، فالتو گفتگو، فالتو خوابیدگی، یہ ساری باتیں پریشانی قلب میں اضافہ کا موجب ہیں، یہ قلب کو ہر وادیٔ فکر و خیال میں پہنچاتی نیز توجہ الی اللہ کا رشتہ منقطع یا کمزور یا موقوف کر سکتی ہیں۔ لہٰذا بندوں پر رحمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ صوم کی عبادت میں ایک وہ رسم بھی داخل کر دی جائے جو فالتو کھانے پینے کا ازالہ کرے، اور قلب سے ان خواہشات اور مرغوبات کو دور کر دے جو توجہ الی اللہ کی راہ میں حائل ہوں۔ اس رسم کو اس نے بقدر مصلحت رکھا بایں طور کہ بندہ دنیا اور آخرت دونوں میں اس سے مستفید ہو سکے، نہ کہ بندہ کے حق میں مضر ہو اور اسے دنیا اور آخرت کی مصلحتوں سے جدا کر دے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا طریقہ رکھا جس کا مقصود اور جس کی روحانیت یہ ہے کہ بندہ کا دل اللہ تعالیٰ کی جانب جھک جائے، اللہ کی ذات پر جمعیت خاطر حاصل ہو، اللہ کی خلوت نصیب ہو، مخلوقات سے مصروفیت کا خاتمہ ہو اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مصروفیت پیدا ہو جائے۔ بایں طور کہ اللہ کا ذکر، اس کی محبت اور اس کی جانب توجہ یہ ساری باتیں قلب کے افکار کا مرکز بن جائیں۔ دیگر تمام فکر مندیوں کے بجائے مذکورہ امور ہی میں بندہ کو دلچسپی ہو، اس کی ساری توجہ بس انہی باتوں کے لیے ہو کر رہ جائے۔ اس کے سارے احساسات اسی کے ذکر پر مرکوز ہوں، اسے بس یہ فکر پیدا ہو جائے کہ کس طرح اللہ کی مرضی ملے اور اس کی قربت حاصل ہو۔ مخلوقات سے انسیت کے عوض اللہ تعالیٰ سے انسیت پیدا ہو تا کہ قبروں میں وحشت کے دن جب کہ کوئی ہمدرد و غمگسار نہ ہو گا اسے مکمل انسیت حاصل ہو۔ یہ ہے اعتکاف کا سب سے بڑا مقصود و مطلوب۔

چونکہ یہ مقصود صوم کی موجودگی میں پایۂ کمال کو پہنچ سکتا تھا اس لیے اعتکاف صوم کے سب سے افضل ایام یعنی عشرہ اخیرہ رمضان میں رکھا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے اعتکاف عدم صوم کی حالت میں رکھا ہو۔ بلکہ خود عائشہ کا ارشاد ہے: "اعتکاف کا تعلق صرف صوم سے ہے"[2]۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا تذکرہ صوم ہی کے

---

[1] ۔ ترمذی (۷۴۲) فی الصوم : باب ماجاء فی صوم یوم الجمعۃ۔ سند حسن ہے۔

[2] ۔ عبد الرزاق (۸۰۳۷) الفاظ حسب ذیل ہیں: "جو اعتکاف کرے اس پر صوم ضروری ہے"۔ حدیث ثوری، انھوں نے حبیب بن ابی ثابت سے، انھوں نے عطاء سے، انھوں نے عائشہ سے روایت کی ہے۔ ابوداؤد (۲۴۷۳) فی الصوم : باب المعتکف یعود مریضا۔ بیہقی ۴/۳۱۵۔ دار قطنی ص ۲۴۷ عائشہ کا قول "اعتکاف کرنے والے پر سنت یہ ہے کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ساتھ کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعتکاف بحالت صوم ہی کیا ہے۔
دلیل کے اعتبار سے راجح قول وہی ہے۔ جس پر جمہور سلف ہیں۔ یعنی یہ کہ اعتکاف کے لیے صوم شرط ہے اسی قول کو شیخ الاسلام ابوالعباس بن تیمیہ نے بھی ترجیح دی ہے۔

گفتگو اور کلام کا جہاں تک تعلق ہے اس بارے میں حقیقت یہ ہے کہ امت کے لیے مشروع ہی یہی ہے کہ زبان کو ان تمام باتوں سے روکا جائے جس سے آخرت میں کوئی نفع نہ ہو۔ اور فالتو نیند کے بارے میں مشروع یہ ہے کہ شب میں صلوٰۃ تہجد پڑھی جائے جو انجام کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ درجہ کی بیداری ہے، یہ وہ متوازن اور معتدل بیداری ہے جس سے قلب اور جسم دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ نیز بندہ کو مصلحت کے اپنے کاموں سے باز رہنے کی تعلیم بھی نہیں دیتا۔ ارباب سلوک و ریاضت کی ریاضتوں کا تمام تر مدار مذکورہ ارکان اربعہ ہی پر ہے۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ خوش بخت اور فیروز مند وہ ہے جو اس ریاضت کو اختیار کرنے میں خالص طریق محمدی کا پیرو ہو اور جو غلو کی حد تک انحراف کرتا ہو نہ کوتاہی۔ صوم و صلوٰۃ اور گفتگو کے باب میں ہم آپ کا اسوہ بیان کر چکے ہیں، یہاں اسوۂ اعتکاف بھی بیان کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔

آپ ہر سال رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے۔ یہی معمول زندگی بھر رہا[1]۔ ایک سال موقع نہ ملا تو شوال میں اس کی قضا فرمائی[2]۔ اعتکاف آپ نے ایک دفعہ رمضان کے پہلے عشرہ، پھر درمیانی عشرہ، پھر آخری عشرہ میں بہ جستجوئے شب قدر فرمایا۔ بعد میں یہ واضح ہو گیا کہ شب قدر اخیر عشرہ[3] میں آتی ہے اس لیے وفات تک اسی عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف فرماتے رہے۔

اعتکاف کے لیے مسجد میں چھوٹا سا خیمہ لگا دیا جاتا اور تنہائی میں رب العزت کے حضور آپ بیٹھے رہتے تھے۔ جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو صلوٰۃ فجر کے بعد خیمہ میں داخل ہو جاتے۔ ایک بار خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ نصب کر دیا گیا۔ پھر بیویوں کے خیمے بھی نصب کرنے کا حکم دیا تو یہ بھی نصب کر دیئے گئے۔ پھر صلوٰۃ فجر کے بعد ان خیموں کا معائنہ فرمایا اور اپنے خیمہ کو اٹھا دیئے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس سال ماہ رمضان میں آپ نے اعتکاف نہ کر کے شوال کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا[4]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کسی مریض کی عیادت کو جائے نہ کسی جنازہ میں شریک ہو، نہ عورت کو چھوئے نہ اس سے مباشرت کرے اور ناگزیر ضرورتوں کے علاوہ کسی اور ضرورت سے باہر نہ نکلے۔ اعتکاف کا تعلق صرف صوم سے ہے، اعتکاف بھی صرف جامع مسجد میں کیا جائے گا" اس کی سند قوی ہے۔ اعتکاف کو صوم سے مشروط رکھنے کے قائل ابن عمر اور ابن عباس ہیں۔ مصنف عبدالرزاق (۸۰۳۳) میں ان دونوں بزرگوں سے روایتیں موجود ہیں۔ راوی سب معتبر ہیں۔ امام مالک، اوزاعی اور حنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام احمد اور اسحاق سے اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ دیکھیے "تہذیب السنن" ۳/۳۴۴ و ۳۴۹ للمؤلف۔

[1] بخاری ۴/۲۳۵، ۲۳۶ فی الاعتکاف: باب الاعتکاف فی العشر الأواخر من رمضان۔ مسلم (۱۱۷۲) فی الاعتکاف: باب اعتکاف العشر الأواخر من رمضان۔ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[2] بخاری ۴/۲۴۴، ۲۴۵ فی الاعتکاف: باب الاعتکاف فی شوال۔ مسلم (۱۱۷۳)۔ یہ بھی عائشہ کی حدیث ہے۔

[3] مسلم (۱۱۶۷) (۲۱۵) فی الصیام: باب فضل لیلۃ القدر والحث علی طلبھا و بیان محلھا وارجی اوقاتھا۔ حدیث ابوسعید خدری۔

[4] بخاری ۴/۲۳۸، ۲۳۹ فی الاعتکاف: باب اعتکاف النساء۔ مسلم (۱۱۷۳) (۶) فی الاعتکاف: باب متی یدخل من أراد الاعتکاف فی معتکفہ۔

اعتکاف ہر سال دس دن ہوتا تھا مگر وصال کی سال بیس دن رہا۔ حضرت جبرئیل کے ساتھ ہر سال قرآن کا مذاکرہ ایک بار ہوتا تھا مگر وصال کی سال دو بار ہوا[1]

اعتکاف کے وقت اپنے قبہ کے اندر تنہا داخل ہوتے۔ گھر میں بلا کسی خاص ضرورت کے نہ جاتے مگر ایسا برابر ہوتا کہ اپنا سر عائشہ کے حجرہ کی طرف کر دیتے اور وہ حیض کی حالت میں ہونے کے باوجود اسے دھوتیں اور بالوں میں کنگھی کرتیں[2] بیویوں میں سے بعض خیمہ میں بھی آجاتی تھیں (مگر بجز ضروری بات چیت کے ان سے اور کوئی سروکار نہ ہوتا) واپسی پر ان کی مشایعت بھی کرتے تھے۔ ایسا شب میں پیش آیا کرتا تھا[3] حالتِ اعتکاف میں آپ نے اپنی کسی بیوی کے ساتھ مباشرت کی نہ بوسہ وغیرہ لیا۔ اعتکاف کے وقت خیمہ کے اندر آپ کا بستر اور تخت ڈال دیا جاتا۔ کسی ضرورت سے باہر نکلتے تو اگر راستہ میں کوئی مریض ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے نہ جاتے نہ اس کے بارے میں دوسروں سے کچھ پوچھتے[4] ایک بار ایک چھوٹے سے ترکی قبہ میں اعتکاف کیا، اس کے دروازہ پر آپ نے چٹائی ڈال دی تھی[5]۔ یہ تمام اہتمامات صرف اس لیے کہ اعتکاف کا مقصود اور اس کی روحانیت حاصل ہو۔ جہلاء کا طریقہ اس کے برعکس ہے۔ یہ حضرات مقام اعتکاف کو عشرت کدہ بنا دیتے ہیں، یہاں ملاقاتیوں کی بھیڑ لگتی ہے۔ اور انواع و اقسام کی باتیں ہوتی ہیں، یہ ایک طریقہ ہے، اور ایک طریقہ وہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ واللہ الموفق۔

---

[1] بخاری ۹/۴۲ فی فضائل القرآن : باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، و ۴/۲۴۵ فی الاعتکاف : باب الاعتکاف فی العشر الاوسط من رمضان۔ دارمی ۲/۲۷۔ احمد ۲/۳۳۶، ۳۵۵۔ ابن ماجہ (۱۷۶۹) حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

[2] مالک ۱/۳۱۲۔ بخاری ۴/۲۳۶۔ مسلم (۲۹۷) فی الحیض : باب جواز غسل الحائض رأس زوجها۔

[3] بخاری ۴/۲۴۰، ۲۴۲ فی الاعتکاف : باب هل یخرج المعتکف لحوائجه إلی باب المسجد، و باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافه۔ مسلم (۲۱۷۵) فی السلام : باب بیان أنه یستحب لمن رئی خالیا بامرأة أن یقول : هذه فلانة۔ حدیث صفیہ، فرماتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے میں شب میں آپ سے ملنے آئی۔ آپ سے بات چیت کی۔ پھر واپسی کے لیے مڑی تو آپ نے مشایعت فرمائی" ان کا مسکن اسامہ بن زید کے گھر میں تھا۔ اس اثناء میں انصار کے دو شخص وہاں سے گذرے، انھوں نے آپ کو دیکھا تو تیز تیز چلے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " رکو، دیکھو یہ صفیہ بنت حی ہیں" انھوں نے کہا " سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول!" آپ نے فرمایا " اصل میں شیطان انسان کی رگوں میں خون کی مانند دوڑتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ تمھارے دلوں میں کچھ بدی نہ ڈال دے"۔ یا فرمایا " کوئی شے نہ ڈال دے"۔

[4] ابوداؤد (۲۴۷۲) فی الصوم : باب المعتکف یعود المریض۔ حدیث عائشہ۔ سند میں لیث بن ابی سلیم ضعیف ہیں۔

[5] مسلم (۱۱۶۷) (۲۱۵) حدیث ابوسعید

طباعت، زیروگرافی: محمد خالد برقی
ناز یہ پرنٹرز ۲۱۷۲، رودگران لال کنواں دہلی ۶ فون: ۷۳۸۴۷۲ ـ ۷۳۴۳۹۰

رد المحتار علیٰ الدرالمختار

المعروف بہ

فتاویٰ شامی

عربی کامل ۱۲/ جلدیں

مطبوعہ بطرز بیروت مع اضافہ تقریرات رافعی

کی چند اہم خصوصیات

(۱) اسلامی دنیا کا سب سے معتبر اور اعلیٰ ترین خوبصورت ایڈیشن ہے۔ (۲) تین عالموں کے حاشیہ سے مزین ہے جو کسی شامی میں نہیں ہے۔ (۳) علاماتِ ترقیم لگائی گئی ہیں نیز اشعار صحیح اعراب سے آراستہ کئے گئے ہیں (۴) متن کو جلی کیا گیا ہے (۵) دارالکتب المصریہ میں محفوظ قلمی نسخہ سے ملاکر تصحیح کی گئی ہے۔ (۶) آیات کریمہ اور احادیث کی تخریج اور مشہور رجال کا حاشیہ میں مختصر تعارف کرایا گیا ہے اور بعض جگہ مسائل پر تحقیقی حواشی لکھے ہیں۔ (۷) ہر صفحہ پر کتاب اور باب بیان کیا گیا ہے، تاکہ قارئین کو کتاب اور باب تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔ (۸) تقریرات رافعی کی ہر جلد کے آخر میں لگادی گئی ہے۔ (۹) اس ایڈیشن کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ شامی کے ہر صفحہ کے حاشیہ پر شامی کے صفحات کے نمبرات لکھوائے گئے ہیں تاکہ بسہولت استفادہ کیا جاسکے۔ (۱۰) اصل کتاب مع تکملہ ۱۲/ خوبصورت جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔

اس فتاویٰ کو شائع کرنے میں جس قدر اہتمام وانصرام کیا جاسکتا تھا وہ سب کیا گیا ہے۔ برصغیر ہندوپاک میں ان خصوصیات کا حامل ایڈیشن پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے۔